

بابا صاحب

بابا صاحب

اشفاق احمد

اشفاق احمد

<http://farhanalizeeshan.blogspot.com/>

بانوقدسیہ کی کتابیں

پتھر اور نہیں	راجہ گدھ
آدھی بات	حاصل گھاٹ
دست بستہ	توجہ کی طالب
آتش زیر پا	ناقابل ذکر
تماشیل	چہار چمن
سدرہاں	دوسرا دروازہ
آے پاس	امرتیل
دوسرا قدم	بازگشت
خدا کے نام	مردا بریشم
سورج منکھی	سامان وجود
پیانام کاویا	شہر بے مثال
لگن اپنی اپنی	ایک دن
پھر اچانک یوں ہوا	فٹ پاتھ کی گھاس
چھوٹا شہر بڑے لوگ	پڑوا
	موم کی گلیاں



Rs. 1200.00



بابا صاحب

اشفاق احمد

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

اشفاق احمد کی کتابیں

- | | |
|-----------------------------|---------------------------|
| سفر در سفر | کھٹیا وٹیا |
| مُجھانے فسانے | زاویہ |
| ایک ہی بولی (پہلاوی) | زاویہ ۲ |
| ایک محبت سوا فسانے | زاویہ ۳ |
| ایک محبت سوڈراے: نئی ہی سیر | گلدان (تین شاہ) |
| من چلے کا سودا | حسرتِ تعمیر (تین شاہ) |
| شاہلا کوٹ | جنگِ جنگ (تین شاہ) |
| حیرت کدہ | دھینگا مستی (تین شاہ) |
| سفرِ مینا | شورا شوری (تین شاہ) |
| طلسمِ ہوش افزا (ساتر گھنٹ) | ڈھنڈورا (تین شاہ) |
| وداعِ جنگ | آشیانے (تین شاہ) |
| گڈ ریا (اچھے بول) | پڑاؤ (تین شاہ) |
| ننگے پاؤں | آسودگی (تین شاہ) |
| بندگی (درے) | بندہ زمانہ (تین شاہ) |
| کھیل تماشا | زخمِ تعلق (تین شاہ) |
| اُچے برجِ لہورے | ذکرِ شہاب (بندہ وقت شہاب) |
| ناہلی تھلے | عرضِ مصنف |
| تو تاتا کہانی | شیر آرزو |
| اور ڈراے | ایک اور دستک |
| مہا نسرانے | |

”بابا صاحبہ..... ایک واجبی ساتعارف“

”بابا صاحبہ“ ایک مختلف قسم کا ادب ہے جو آسانی سے تحریر میں نہیں آ سکتا۔ اس ادب پارے پر خاں صاحب کی یادوں کی برسات موسلا دھار نہیں بلکہ رات کے پچھلے پہر بوند باندی کی صورت ادھ کھلے درپچوں پر جھنکار بن کر توجہ طلب رہتی ہے۔

یاد کا بھی کچھ کرباتی سلسلہ ہے۔ عام طور پر ایسے واقعات اور حالات آدمی کی یاد میں رہ جاتے ہیں جن کا تعلق ناکامی، ٹریجڈی، احساس کمتری اور احساس جرم سے ہوتا ہے۔ خوشی کے واقعات قوس قزح کی طرح انسان کے ذہنی آئینے پر ابھرتے ہیں اور پھر جلد محو ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی سو فیصد والا اصول نہیں بلکہ ان ہی یادوں کی رنگارنگی سے ان کے جدا گانہ تجربے سے زندگی کا تار و پود بنتا ہے۔ میں نے خاں صاحب کے ساتھ رہ کر دیکھا کہ ان ہی یادوں نے ان کی تلاش کے راستے کھولے۔ وہ اپنی ناکامیوں سے جاننا چاہتے تھے کہ انسان کا اصل مقصد کیا ہے؟ وہ یہاں کیوں ہے اور کیا حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اس تلاش کے سلسلے میں ہی وہ بابوں کے پیچھے بھاگے۔ کبھی افسانے لکھے، کبھی ڈرائے، کبھی زاویے میں جاسر نکالا۔ عام انسان اپنی تلاش کو اپنی ذات پر سوار نہیں کرتا۔ وہ زندگی کے معنی تلاش کرنے پر بھند نہیں ہوا کرتا۔ لیکن خاں صاحب کی یادیں سوہان روح تھیں۔ وہ اُس تلاش کو چھوڑ نہیں سکتے تھے جس نے ان کا شافی سے سونا جاگنا حرام کر دیا تھا۔

میں تو ان کے قریب رہنے کے ناطے آپ کو تھوڑا سا جھانک کر اندازے لگا کر ہی بتا سکتی ہوں۔ سالم پورے اشفاق احمد کا سراغ شاید آپ کو ”بابا صاحبہ“ سے حاصل ہو۔ تو سفر جاری کیجئے۔ آپ بھی شاید کچھ نہ کچھ تلاش کر لیں! دعائیں.....

بانو قدسیہ

داستان سرائے

07-07-2008

370 Ashfaq Ahmad
Baba Sahba / Ashfaq Ahmad.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications,
2010.
668pp.
1. Urdu Literature - Mysticism.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز / مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا اگر اس قسم کی کوئی بھی صورت حال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے

2010

نیا زا احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2172-2
ISBN-13: 978-969-35-2172-6

Sang-e-Meel Publications

25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف ایڈیٹرز پرائیویٹ، لاہور

(1)

کوئی خاص بات نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی ارادہ یا اہتمام تھا۔ نہ ہی کوئی باقاعدہ پروگرام تھا۔ بس ایسے ہی ایک چالوسی بات ہو رہی تھی جو پھیلتے پھیلتے یہاں تک پھیل گئی۔ جس طرح کسی پرانے پن کو دھوئے ہوئے اور اس کے اندر کی دبیز سیاہی کو فلش کرتے ہوئے اس سیاہی کا کوئی قطرہ پانی کی سطح پر گر جاتا ہے اور پھر پھیلتے پھیلتے، رگیں چھوڑتے، تر مرے بناتے، رنگ بدلتے اور تک پھیل جاتا ہے ایسے ہی میرے ساتھ ہوا۔ میں اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا جیسے پانی کی سطح دھبہ وصول کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوتی یا گاڑھی تیلیا پرانی سیاہی کا قطرہ باہر نکلنے پر رضاء مند نہیں ہوتا لیکن نکل آتا ہے اور سطح آب پر پھیل جاتا ہے، کچھ ایسی ہی مجھ پر گزری اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس نرغے میں آ گیا۔

ہم روم کی درس گاہ میں اپنی اپنی کلاسیں پڑھا کر شاف روم میں آ کر بیٹھے ہی تھے کہ دانیلو نے روحانیت پر بات شروع کر دی۔ پروفیسر رام سنگھ تو مرنے اس میں دو چار آڑی ترچھی پچریں لگائیں لیکن دانیلو کی گفتگو میں جھول بڑھتے ہی گئے۔ اس کی بات کا باندہ معلومات کے فریم میں اچھی طرح سے تن نہ سکا۔ انہوں نے کہا ”تم سے زیادہ روحانیت کے بارے میں تو میں جانتا ہوں لیکن یہ فضول کھیل ہے۔ ہمارے جاپان نے اس کی صندوقچی بند کر دی ہے۔ صرف اس کو سیل کرنا باقی رہ گیا ہے، لاکھ کی پکی مہر لگا کر۔ سو وہ بھی ایک دن ہو جائے گا۔“

اس گفتگو میں کوئی سات آٹھ لوگ شریک تھے: دانیلو، پروفیسر توامر، پروفیسر اتو، آنا لوکرچو، سٹی مردیاتی، سوربو بڈروپو، لوچانا گابریلی، ایدا اور ایک سڑیل سا جاپانی پروفیسر جس کے ساتھ میری کبھی بھی نہ بنی اور ہم نے ایک دوسرے کو مکمل طور پر رد کر کے صرف معمولی سی علیک سلیک رکھی۔

آنا کہنے لگی ”تم مشرق سے آئے ہو اور بڑی دلچسپ گفتگو کرتے ہو اور تمہارے پاس بے شمار رنگ برنگی کہانیاں ہیں، کیا تمہارے پاس وزڈم آف دی ایسٹ بھی ہے؟“

میں نے احمقوں کی طرح چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو ایدا کہنے لگی ”تم یوگا جانتے ہو؟“

سٹی مردیاتی نے کہا ”یوگا تو کوئی بھی جان سکتا ہے لیکن جو بات آنا پوچھ رہی ہے، وہ یوگا سے بڑی ہے۔ بہت

بڑے پھیلاؤ والی۔ اس میں سب کچھ آ جاتا ہے۔

ایدا کہنے لگی۔ "تم بھی تو ہیں سے آئی ہو۔ کیا تمہارے اندر وہ نیٹیاں ہیں جو نہیں ہے؟"

"فردر ہے اور بالکل ہے۔" پروفسر تو سر نے کہا "اٹھنا کا سارا فلسفہ، ساری دیانت سارا پیار، پورے کا پورا اور اپنی اصل حالت میں اندر وہ نیٹیاں موجود ہے۔ سنی مرد دنیا کی کاس کا علم ہو چاہے کہ یہ اس کا کلچر اور دشب ہے۔"

میں نے اردو میں کہا "اوتے رائے سنگھ یہ سالانا فلسفہ تیرے پاس بھی تو ہوگا۔ تو بہت دیر سے ہے اور بدستانی بھی۔ تیرے پاس بھی تو دیانت کے کچھ پتے ہوں گے۔ وہ نکال، دکھا سب۔" آنا پنی چندرا رنگ کے پیچھے گول گول دیکھ رہا تھا کہ کہنے لگا "انالین پائیز انالین۔ انالین میں بات کریں تاکہ سب کی سمجھ میں آئے۔ یہ قافلوں ہے اور ہم اس کی اجازت نہیں دیں گے۔"

سب نے انالین انالین کا نعرہ لگا دیا اور پروفسر رام سنگھ تو میری بات کا جواب دینے سے آزاد ہو گیا۔

یہ سن کر تینوں کی بات ہے۔ ہمیں اتنا تیرا کہ اور تاریخ مجھے اب یاد نہیں رہی۔

لوچانا سب لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ وہ جوہاں بھی تھی، صرف انہیں میں سے نہیں بلکہ یونیورسٹی کی دوسری لڑکیوں میں بھی سب سے افضل تھی۔ اس کے جسم کی حسین ترین چیز اس کا قد تھا۔ ایک خوبصورت لڑکی کے قد کو جس مقام پر آ کر رک جاتا چاہے لوچانا کا قد ٹھیک اس مقام پر پہنچ کر رک گیا تھا۔ اس کی ذکاوت اور لوہے کی ذکاوت بھی مالاٹیکہ موثر ایسی پیدا بھی نہ ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں ان ہسپانوی لڑکیوں جیسی تھیں جو چہرے پر سیاہ جاتی کا جھرمٹ ڈال کر "اوتے" چا کر تھیں اور جن کی آنکھیں سیاہ جالی کے پیچھے کالی روشنی کے نگوں کی طرح جھلک کر تھیں۔

ہم سب وی دی دل میں لوچانا کے حقائق تھے اور دوسری لڑکیاں ہمارے اس رویے کی شدید مزاحمت کرتی تھیں۔ ان ساری خبیثوں کے باوجود لوچانا ڈارسی ایف تھی۔ ہوا پر اترتی تھی، وہ دو پہلیوں کی اس حد پر کھڑی تھی جہاں سے ذرا آگے صاف کئی داری شروع ہوتی ہے۔ اس کے پاس تو فارسی کی کتب کے اندر تھکے لہباقد ہونے کے وجہ سے کئی مرتبہ اس کا اوپر کا دھڑ آگے جھک جاتا تھا جس سے دیکھنے والے کو بھی سب سے پہلے اس کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کا دھڑ لوہے کی ہے۔ وہ سادہ لوہے کی تھی لیکن اس کے پاؤں ہمیشہ چمکداری کی کرکس کے اندر رہتے تھے۔ اس لیے کوئی بھی آج تک اسے شبہ نہیں کر سکا تھا۔

جرمن پروفسر کہنے لگا کہ یہ روحانیت اور اصل ایک قسم کی ذہنی کج روی ہے۔ مشرق کے لوگوں نے اس نفسیاتی بیماری کو عزت عطا کر کے ایک خاص تلاش تحقیق میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ سب روتو موں اور چمروہ معاشروں کا سب سے جس میں وہ کامل حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ ہمارے جرنی میں ایسی ایبریشن آپ کو بھی نظر نہیں آئے گی۔

گواس کی بات کافی دیر تھی لیکن کسی نے اس کو پسند نہ کیا اور ہم پھر دانیلو کی بات سننے پر مجبور ہو گئے۔ دانیلو نے ارضیات میں ایم اے کیا تھا لیکن چند برس پچھلے تھیں کہیں کہیں میں اس کا کمرے کے بعد وہ پروفسر تو جی کے گروہ میں شامل

ہو گیا تھا۔ اس کو چارقد میری کھدائی کا ایسا چکا کر دیا کہ وہ گیس اور آئل فیلڈ کی کھدائیوں سے منموذ کر پے آباد ہو گیا اور پرائیڈیاں اور ڈھانچے لگانے پر مامور ہو گیا تھا۔ حال ہی میں وہ پروفسر تو جی کے ساتھ جنت کے دورے سے لوٹا تھا اور ان کی ہم دہاں سے تاریخی نوادرات کے گھارہ بڑے بکسے لے کر لوٹی تھی۔

پروفسر تو جی ہم سب کے پاس تھے۔ وہ اور شیل انسیٹیوٹ کے صدر تھے۔ ہم سب کی جان ان کی مٹھی میں تھی اور ان کی جان ان کی کیکری فرانچسکا کی مٹھی میں تھی۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ پر فرانچسکا کی خوشامد اور اس کی جھوٹی جگہ میں مصروف رہتے تھے۔ میں نے اس کی ماں کو درمیاں اور سے خطرناک گھوڑا کر دیا تھا اور اس نے پروفسر تو جی سے کہہ کر میری تنخواہ بھی برصغیر میں تھی۔ کوسب کچھ ملتا تھا اگر کل اسے دیکھے گا تو اٹھائیں اس نے اسے اسے بھی بہت تھے۔ تو یہ جو دانیلو تھا اور جو جی صاحب کی کم میں ابھی ابھی جنت سے لوٹا تھا، اس کو روحانیت سے کچھ دیکھ کر پیدا ہوا مٹی تھی۔ اس نے تہی زبان کے دوسرے بھی کچھ لکھے تھے جن کا وہ وقت سے وقت جا چکا تھا۔

علم روحانیت کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے والا بہت جلد اس پر عادی ہو جاتا ہے۔ چند کتابیں چار بیٹے کے ساتھ پڑھنے کے بعد کوئی شخص بھی اس علم کی ابھی خاص جان کا پید کر لیتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کو کرا کر فریڈریری ایک بیٹے کی نیشنل مل جائے تو وہ اس فن میں طاق ہو جاتا ہے۔ اس صدمہ ماہر کو دینا ایک چھوٹا سا طوطی پنڈت کیلئے چلا سکتا ہے اور اس کے گرو سوسوامو پید بھی اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ آگے اس کی زبان کی مٹاس اور حسن سلوک کا کمال ہے۔ سال گزرنے سے پہلے پہلے اس کے پاس مریدوں اور چاہنے والا ایک جم غفیر اکٹھا ہو جاتا ہے جن میں سے ابھی خاص تعداد ان کو پنی ہے جو ملک سے باہر آباد ہوتے ہیں اور جو پنی کٹ سمجھ کر اپنے سرحد کو پانی ملتے رہتے ہیں۔ دوسرے سارے کام مشکل ہیں۔ گنا چھپانے، گناہوں کا نئے اور پھنسی گناہوں کی برسی لگانے کا فن اس کی گیارہ بیٹے سے کم کی مدت میں آتا۔ کالے سنگھاڑے، سفید چیلے اور پیلے مٹی کے دانے بھوننے کا علم بھی سال کی مدت میں آتا ہے۔ انگریزی، دھات کاری، فٹل سازی، گداگری، گورکھی، دکا خداری، چوب کاشی، تیر اندازی، آتش بازی، پہلوانی، جیب تراش اور بلڈنگ وغیرہ کا کام کھینے پر سالانہ سال لگ جاتے ہیں لیکن پھر بھی اس میں مہارت پیدا نہیں ہوتی۔ ہر روز وہ کھانے اور ہر وقت پھل جانے کا دھڑ کا لگو ہوتا ہے لیکن روحانیت کا کاروبار پہلے دن سے جتنا شروع ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی گناہی چھپانے تھی ہے۔ اس میں خبردو کا کاروبار شامل ہے بھی اہم ہو جاتا ہے اور نفس حقیقت سے بڑھ کر مشورہ ہو جاتی ہے۔ لیکن.....!

یہ کاروبار ہمیشہ بے ایمانی، بدعتی یا عیاری مکاری پر مبنی ہوتا بلکہ اس میں ایک عجیب طمس گل کاؤلی پر مشتمل ہے کہ اس علم کو ہی امر واقعہ اور اصلیت کہلایا جاتا ہے۔ یوں تو دوسرے بھی کئی علوم ایسے ہیں جن کو امر واقعی سمجھ کر کہہ کے سوائے کہ کہتے ہیں لیکن ان کی حقیقت جلد سامنے آ جاتی ہے۔ مثلاً دھات کا علم ہے کہ سال کھنڈل کو ہی اصل سمجھ کر اسے حق مان کر اس کا سودا کر لیتا ہے یا جب کا علم ہے کہ مریش اس علم سے متاثر ہو کر ہی جان غیب کے حوالے کر جاتا ہے لیکن یہ ساروں ایسے اور بہت سے علوم جب آڑ لگائیں گے، مٹی جڑے ہیں تو ان کی فوراً پڑتال ہو جاتی ہے۔ علم دھات

کی عدالت میں جانچ پڑتال ہو جاتی ہے اور علم طب کا بیمارستان میں ٹیٹ ہو جاتا ہے لیکن روحانی علم کی پرکھ کسی مقام پر بھی نہیں ہو پاتی۔ نہ بیچنے والے کے مقام پر نہ خریدنے والے کے موقع محل پر۔ دونوں ہی اپنی اپنی بد پر راضی رہتے ہیں۔ بیچنے والا یہ سمجھتا رہتا ہے کہ میں واقعی سامنے کا تیل بیچ رہا ہوں اور اس کے پاس سامنا نہیں ہوتا اور خریدنے والا یہ دیکھتا رہتا ہے کہ میں تیل کی شیشی بھرا کر دسی سے لٹکا کر خود گھر لے جا رہا ہوں۔ دونوں کے پاس تیل نہیں ہوتا۔ تیل کا علم سامنے کی قسمیں، تیل نکالنے کے طریقہ، شیشی بھرنے کے اصول اور لینے دینے کے طور طریقے ہوتے ہیں، تیل نہیں ہوتا!

روح اور روحانیت کا کسب کرنے والے اور باطن کے سفر کے اسرار بتانے والے شاذ و نادر ہی عیار، مکار یا بد دیانت لوگ ہوتے ہیں۔ جو لوگ بنا دیکھے بھالے ان پر اثر ام دھرتے ہیں وہ زیادتی کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے کبھی ان کو دور سے بھی نہیں دیکھا، وہ خواخواہ ان پر بہتان دھرتے ہیں جو کبھی ان سے ملے ہی نہیں، وہ ان کے کچے چھتے چھاپ چھاپ کر مفت تقسیم کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

روح اور روحانیت کی دنیا کا چرچا کرنے والے اگر کبھی کسی کوتاہی کے ذمہ دار ٹھہرائے جاسکتے ہیں تو وہ صرف اسی قدر ہوتی ہے کہ وہ ایسی دوائی کا پرچہ ترکیب استعمال بانٹ رہے ہوتے ہیں جس کو نہ تو انہوں نے کبھی استعمال کیا ہوتا ہے اور نہ ہی کبھی اس کی شیشی دیکھی ہوتی ہے۔ ان کے پاس صرف اس دوا کا علم ہوتا ہے..... ڈھیروں ڈھیر..... بے پناہ..... فراوان علم..... کثیر علم..... بسیار علم بلکہ کسی حد تک زائد علم لیکن انہوں نے یہ دوا دیکھی نہیں ہوتی نہ چکھ کر، نہ سونگھ کر نہ چھو کر نہ پی کر..... وہ بڑی محبت، بے حد ایمان داری، بے پناہ عقیدت اور بے پایاں لگن کے ساتھ اس کیفیت کا تذکرہ کرتے ہیں جو ان کا حال نہیں ہوتی۔ اس جذبے کا ذکر کرتے ہیں جو ان پر کبھی طاری ہوا نہیں ہوتا۔ اس حالت کا بیان کرتے ہیں جس کے پاس پھٹکے نہیں ہوتے۔ اس عالم کا نقشہ کھینچتے ہیں جس سے گزرے نہیں ہوتے اور اس روش کی کہانی سناتے ہیں جس پر کبھی قدم نہیں رکھا ہوتا۔ لیکن وہ جھوٹے نہیں ہوتے، اس رنگ ڈھنگ اس وضع قطع اور اس طور طریقے کے بچاری ضرور ہوتے ہیں۔ آگے بچاری کی قسمت کہ ساری عمر بچاری رہتا ہے یا غلبہ حال کی وادی میں اتر مندر کی حدود سے دور نکل جاتا ہے۔

یہی حال اس وقت دانیو کا تھا۔ وہ روحانیت کے بارے میں ٹھیک ٹھیک باتیں کر رہا تھا۔ اسے بدھ کا مارگ معلوم تھا لیکن وہ اس راستے کا مسافر نہیں تھا۔ گودڑی کی مختلف قسمیں جانتا تھا لیکن صوفی نہیں تھا۔

ستی مردیاتی سور یو ہڈیوں نے میری طرف محبت سے دیکھ کر عقیدت بھری آواز میں کہا "اشفاق! ان کو بتاؤ ناں کچھ۔ دانش مشرق کے بارے میں۔ ہماری روحانیت کے بارے میں، ہمارے مذہب کے بارے میں..... تم شرماتے کیوں ہو؟"

میں نے کہا "میں شرم نہیں رہا ستی، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ واقعی کچھ معلوم نہیں۔ اگر کچھ معلوم ہوتا تو میں ضرور کرتا۔ مجھے نہ اپنے مذہب کا کوئی علم ہے نہ روحانیت کا۔ نہ مشرق کا، نہ دانش کا۔ میں تو ایک پڑھا لکھا شخص ہوں اور پڑھے لکھے لوگوں کا ایسی چیزوں سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔"

میں اور ستی کوئی ایک سال سے ایک دوسرے کو جانتے تھے اور ایک دوسرے کے اچھے دوست تھے لیکن وہ ایسی

بیوقوف تھی کہ اس نے اپنے بارے میں مجھے تفصیل سے کچھ نہیں بتایا تھا (اور اگر ایمان داری سے دیکھا جائے تو میں نے بھی تفصیل سے اسے کچھ نہیں بتایا تھا)۔ ہم دونوں اپنے بارے میں حال ہی کے حوالے سے بات کرتے تھے اور روم ہی کی زندگی کی تفصیلات بیان کرتے رہتے تھے۔ اپنے اپنے ماضی کے بارے میں ہمیں صرف اتنا معلوم تھا کہ ستی انڈونیشیا کی رہنے والی تھی اور میں پاکستان کا..... وہ تو کوئی ایک مہینہ پہلے جب میرے اپارٹمنٹ میں ٹائی نما سفید برنی، کھوپرے کی مٹھائی اور موٹے آنے کا گلچا حلوہ سالے کر آئی تو میں نے رکابی سے رومال اٹھا کر پوچھا، یہ سب کیا ہے تو وہ اپنی غریبی اور غریب الوطنی سے فحش سی ہو کر سر جھکائے بولی "آج ہماری کرسمس ہے اور یہ میں تمہارے لیے تحفے کے طور پر لائی ہوں۔"

"کرسمس!" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

تو ستی نے بڑی بڑی آنکھیں جھپکا کر کہا "یہاں کی کرسمس نہیں، انڈونیشیا کی کرسمس! میرے ملک کی کرسمس۔ ہم اس کو عید الفطری کہتے ہیں۔"

"عید الفطری!" میں نے یقین اور بے یقینی کے درمیانی لُحْن سے پکار کر کہا۔

اس نے کہا "ہاں عید الفطری! ہم پورا ایک مہینہ بھوکے رہتے ہیں۔ دن بھر نہ کھاتے نہ پیتے ہیں۔ نہ سوکھ کرتے ہیں۔ پھر شام کو سورج غروب ہونے پر یہ عہد ختم کر دیتے ہیں۔ اگلے دن پھر بھوکے!"

میں نے ستی کی رکابی اور رکابی کے معمورات کی پروا کیے بغیر اسے گھٹ کے چھٹی ڈال لی اور اس کے سر کو بوسہ دے کر اونچے اونچے عید الفطری، عید الفطری مبارک کہنا شروع کر دیا۔ وہ جواب میں مبارک کے بجائے کچھ اور کہتی تھی لیکن اس کا مطلب یہی تھا۔ ہماری اس عید ملن سے اس کی رکابی کا آدھا سامان فرش پر گر گیا۔ اس نے رکابی میز پر رکھ دی اور پھر ددون ہاتھوں کی کلائیوں کو بوسہ دے کر درود شریف پڑھنا شروع کر دیا۔

میرا اسلام سنی مردیاتی سور یو ہڈیوں کے مقابلے میں کافی کمزور تھا۔ اس لیے اس کے درود شریف کے مقابلے میں میں نے پوری الحمد شریف سنا کر اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت ہم کیا۔ میں تو اسے التحیات بھی سنانے لگا تھا لیکن میرے ہونٹوں پر اس نے اپنی چھوٹی سی انگلی رکھ کر مجھے یقین دلادیا کہ اس نے میرے مسلمان ہونے کو تسلیم کر لیا ہے۔

جب ہم عید الفطری شیرینی کھا چکے تو میں نے کہا "تم بھی کمال کی امتی لڑکی ہو کہ مجھے آج تک بتایا ہی نہیں تم مسلمان ہو!"

اس نے ہنس کر کہا "تمہارے پاس پوچھنے کے لیے وقت ہی کہاں تھا جو میں بتاتی۔"

میں نے کہا "اور میں پوچھ بھی کیسے سکتا تھا۔ جس لڑکی کا نام سنی مردیاتی سور یو ہڈیوں ہوا وہ مسلمان کس طرح سے ہو سکتی ہے بھلا؟"

اس نے میری اس احقناہ بات کا کوئی جواب نہ دیا اور مسکراتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی..... اور اب جو اس نے کہا..... اشفاق! ان کو بتاؤ ناں کچھ، دانش مشرق کے بارے میں۔ ہماری روحانیت اور ہمارے مذہب کے بارے میں، تم شرماتے کیوں ہو؟ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ان سارے لوگوں کو پتہ چل جائے کہ ہم مسلمانوں نے بھی روحانیت کے

کوئی حد نہ رہی کہ وہ سینے کی کوڑی سے چل کر بہت ہی نیچے پہنچ گیا تھا بلکہ کسی حد تک اس سے بھی نیچے پہنچ گیا تھا۔

کئی سال بعد اس بھولے بسرے کو جب میں نے لوچانا کے گھر پھر سے بنا کر دکھایا تو اس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وقت کم تھا، مجھے یونیورسٹی پہنچنا تھا۔ میرا سکوڑمس کرتا تھا لیکن لوچانا اپنے گھر میں ایک مہایوگی کی موجودگی سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اپنی سہیلیوں اور اپنی چھوٹی بہن کو آنکھوں دیکھا حال بتانا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے جلدی سے کوٹ اتارے بغیر اپنی قمیض پتلون سے کھینچ کر ٹھوڑی تلے دبا لی اور نیم عریاں پیٹ پر سے کاہولا سا بنا کے لوچانا کو یقین دلایا کہ میں صرف علم ہی نہیں عمل بھی ہوں۔ گفتار ہی نہیں کردار بھی ہوں۔ بات ہی نہیں ہوت بھی ہوں!

ان دنوں ہمارے روم میں آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کا بڑا چرچا تھا۔ ہم جو سائنس کے شعبے سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے تھے، ہر اس بحث میں گھسے رہتے تھے جہاں آئن سٹائن کا یا اضافیت کا ذکر ہوتا۔ اخباروں اور رسالوں میں اسی نظریے پر وضاحتی مضمون شائع ہو رہے تھے۔ خوبصورت رنگین تصویریں اور چارٹ چمپ رہے تھے۔ گھروں میں اس کا تذکرہ تھا۔ ہسپتالوں، بار و روموں، درس گاہوں اور کلیساؤں میں اس کا ذکر تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ لوچانا نے پیٹ کے رسے کا ذکر بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ نظریہ اضافیت اور پیٹ کا رسہ اس عہد کی دو بڑی ڈسکوریاں ہیں جن پر انسانیت جتنا بھی فخر کر سکے گا ہے!

یہ اسی رسہ گیری کا شاخسانہ تھا جس نے مجھے یونیورسٹی کے بیس منٹ میں مختصروں کے کٹہرے میں لاکھڑا کیا دیا۔ میں نے نائی اتاری، کوٹ اتارا، قمیض اور بنیان اتاری۔ پھر پتلون کی پٹی ڈھیلی کر کے اسے انڈر وئیر کی حد تک نیچے کھسکایا اور دونوں ہاتھ گھٹنوں سے چھواتے ہوئے ایک ہچکے کے ساتھ باطنی رسہ جو ابھارا تو سب نے بے اختیار ہو کر تالیاں بجانیں۔ لچانانے اپنا سر فخر سے اونچا اٹھالیا۔ رام سنگھ تو مرغھے اور نفرت سے بھنا اٹھا اور اس کا چہرہ کر دھ سے اور بھی سنولا گیا۔

میرے سارے ساتھی، دوست، ہم عصر اور لنگوٹھے لندن میں تھے اور مجھے روم کا حکم ہو گیا تھا۔ اس عبور دیاے شور کی سزا کی سب سے خشن منزل یہاں کی زبان تھی۔ لندن چلے جانے والے تو پہلے ہی سے انگریزی زبان اور انگریزی محاورے سے مانوس تھے۔ اک ذرا سی مشکل ان کو لینڈ لینڈی کے طور طریقوں سے واقفیت حاصل کرنے کی تھی، سو دو چار لینڈ لینڈیاں تبدیل کر کے سارے مسئلے حل ہو جاتے تھے لیکن جس دیس میں ایک بھی اپنا گرائیں اور وطنی نہ ہو، بات سمجھ میں نہ آتی ہو۔ کھانے پینے کی چیزوں سے حرام حلال کا خوف بندھا ہو اور سفارتخانے کا عملہ آپ کو اپنانے پر مائل نہ ہو، وہاں کوئی دیر تک کس طرح سے زندہ رہ سکتا ہے!

لیکن روم ایک ابدی شہر ہے۔ چنانچہ تیرنا اور انٹرنل سٹی، اس میں رہتے ہوئے کوئی مرنے نہیں سکتا۔ میں مرنا تو نہیں لیکن ایسا زندہ بھی نہ رہا۔ جس طرح پاکستان کے لوگ آدمی صدی گزر جانے کے بعد بھی زندہ ہی چلے آتے ہیں اور زندہ ہی کہلاتے ہیں اور مردم شماری میں ان کا نام حاضر مال میں ہی درج ہوتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال میرا تھا۔ کھانے پینے کی آسانی تھی، رونے پینے بکے بڑبڑانے کی آزادی تھی۔ گھر والوں کا خوف نہ تھا۔ معاشرے میں ڈوبنے مرنے تباہ ہونے کی فکر نہ

تھی کہ اپنا نہ تھا۔ لیٹر ٹو دی ایڈیٹر لکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ نہ ملک اپنا تھا نہ اس کی سیاست۔ مدرخوں سے اختلاط کے لیے مصوری سیکھ لی تھی اور ان کے گھر کھلا آنا جانا ہو گیا تھا۔ میری مصوری چونکہ خطوں اور رنگوں کی مصوری نہ تھی، باتوں کی اور کہن سخن کی مصوری تھی، اس لیے میں نے اسی بول بچن میں مدرخوں کے والدین کو بھی شامل کر لیا تھا۔ ہر کارنامی اور کارنامیاں سے منہ موڑ کر سارا زور زبان سیکھنے پر لگا دیا تھا اور روزمرہ کی گرفت کے لیے صرف گفتگو کی زبان پر زور دیا تھا۔

عام ضرب الامثال، محاورے، چالو تشبیہیں، فنش استعارے اور گندی گالیاں گفتگو کی کڑی کمان سے نکل کر ٹھیک نشانے پر بیٹھتی تھیں اور بات بات پر تالی نچ جاتی تھی لیکن اتنے خوبصورت شہر کی ایسی شاندار تاریخ میں اتنے سارے عجیبی آثار کے اندر رہتے ہوئے بھی میں دل زندہ نہیں تھا۔ ایک اداسی کی کیفیت ہر وقت طاری رہتی اور ہر لمحہ بھاگ جانے کو مٹی چاہتا۔

اس بے چینی کے عالم میں پوری ٹولی نے ”وزم آف دی ایٹ“ کا شوشہ چھوڑ دیا۔ اب مجھے اس کا کوئی پتہ نہ تھا اور سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیا گیا۔ میں نے اپنے گاؤں میں لوگوں کو ہیر پڑھتے ضرور سنا تھا اور بابے نور سے تیلی سے یہ بھی سنا تھا کہ یہ سارا معرفت کا کلام ہے لیکن مجھے نہ معرفت کا علم تھا نہ کلام کا نہ ہیر کا نہ وارث شاہ کا۔ سارے علاقے میں لے لے کے ایک مزار تھا۔ بابا میر سنگ کا مزار۔ وہاں شام کے وقت ایک دیا جلتا کچھ مٹے مشنڈے بھنگ گھوٹ کے مٹی کے پیالوں میں ٹھنڈائی پیا کرتے یا پھر سال کے سال وہاں کہیں سے قوال آ کر قوالی کرتے اور مسلسل تین دن تک چوکی بھر کر دلوں چلے جاتے۔

ہمارا سارا گھرانہ سرسید کا عاشق تھا، اس لیے ہم ہر وقت ترقی، فارغ البالی اور خوشامی کی باتیں کیا کرتے۔ پیری مریدی، عرس میلے، ذحول وصال اور قبر پرستی ہمارے گھرانے میں غلط اور لنگ بازی سمجھی جاتی تھی۔ میری دونوں آپائیں اس کے سخت خلاف تھیں اور نماز، روزے، حج، زکوٰۃ کے علاوہ ہر دوسری چیز کو بدعت سمجھتی تھیں۔ بڑی آپا تہذیب النسواں، معیشت، بنات، اور زیب النساء کی باقاعدہ قلم کار تھیں اور ان کی ڈاک گھر میں سب سے زیادہ آتی تھی۔ میری والدہ اس ڈاک ڈیلیوری میں کبھی کبھی تھوڑی سی تاخیر بھی کر دیتی تھیں تاکہ بیٹیاں باورچی خانے میں ماں کا ہاتھ بنا سکیں لیکن اباجی کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ وہ آزادی نسواں کے زبردست حامی تھے اور اپنی بیٹیوں کو آلو چھیلنے، پیاز کترتے یا بگھار لگاتے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اکثر کسی عورت کا نام لے کر یہ کہا کرتے تھے کہ میری بیٹیاں تو سرورجنی نائیڈ وینس گی۔ پھر جب ترکی سے ایک اور مشہور خاتون ہندوستان آئی تو اباجی سرورجنی نائیڈو کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی لینے لگے۔ میری ماں کو یہ دونوں نام زہر لگتے تھے لیکن وہ ان کے خلاف زبان نہیں کھول سکتی تھیں۔ آزادی نسواں والے گھر میں میری ماں کی حالت روٹی پکانے والی ایک ملازمہ کی سی تھی۔

ہمارے قصبے کے قصائیوں کے گھر چاکا ایک ایسا لڑکا پیدا ہو گیا تھا جس کا بدن ڈھنسل کی طرح نازک، راکھیں سیاہ، رنگت سفید اور ناک نوکیلی تھی۔ وہ بچے پھیننے والے ریشمی کرتے پہنتا تھا اور تہہ کے بجائے لٹھے کی شلوار زیب تن کر کے باہر نکلتا تھا۔ سکول تو وہ آٹھویں جماعت کے بعد چھوڑ گیا تھا لیکن اپنے ساتھ سکول کی ایک علت مستقل طور پر گھر

لے گیا تھا۔ اس نے اچانک اردو بولنا شروع کر دی تھی جس سے اس کے گھر والے شرمندہ شرمندہ سے رہتے تھے۔ جس قصبے میں تحصیلدار تھا نیدارحتی کہ ہیڈ ماسٹر نے بھی کبھی اردو نہ بولی ہو، وہاں قصائیوں کا ایک لڑکا ٹھیک دہلوی بکھنوی انداز میں یہ زبان بولنے لگے، اس علاقے کے لوگوں کے لیے تو یہ مر جانے کا مقام تھا۔

”مجھے“ میرے بڑے بھائی کا کلاس فیلو تھا اور اس کا ہمارے گھر آنا جانا بھی تھا لیکن بہت کم۔ قصبے کے لوگوں نے اس کا نام ”مجھے“ اس لیے رکھ دیا تھا کہ وہ ”میںوں“ کے بجائے مجھے کہا کرتا۔ مجھے کا لفظ چونکہ گاؤں والوں نے پہلی مرتبہ سنا تھا، اس لیے ان کو اس کا صوتی تاثر اتنا اچھا لگا کہ انہوں نے صدیق کا نام ”مجھے“ رکھ دیا۔ وہ اسی نام پر بولتا تھا، اسی نام سے پکارا جاتا تھا اور اسی نام سے مشہور تھا۔

مجھے کو کوڑا لگا کے چڑیاں پکڑنے، اخباروں پر رنگ میں انگلی ڈبو کے بھٹنے بنانے اور پکارا گانے کا بڑا شوق تھا۔ وہ ہر گانے کو ایسے گاتا جیسے طیرے کا مربض گارہا ہو اور تیز بخار کی وجہ سے اس کی تھر تھری چھوٹی ہوئی ہو۔ گانے کو کپکا کپکا کر گانے سے اس میں واقعی کپے راگ کا انگ پیدا ہو جاتا اور ہم چھوٹوں کے علاوہ کئی بڑے بوڑھے بھی اس کے فن کی داد دینے پر مجبور ہو جاتے۔

”مجھے“ ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلاتا۔ غمناک نظمیں پڑھتا اور مونچے کا ہار کلائی سے لپیٹ کے رکھتا۔ میری ادبی، معاشرتی اور ثقافتی ٹریننگ ”مجھے“ کی معیت میں ہوئی اور میں اسی کو اپنا ہیر و مان کر دانش کی قلمرو میں داخل ہوا۔ وہاں سے نکل کر میں سیدھا روم آ گیا اور اب روم میں میرے ساتھی مجھے ”دانش مشرق“ پر گفتگو کی ایک سیریل پر اکسار ہے تھے اور یہ توقع کرتے تھے کہ میں اپنے بول چل کے زور پر ان کے سوکھے ذہنوں اور پڑمرہ روح کی جھولیاں بھردوں گا۔ انہیں مشقت سے نکال کر آسانیاں عطا کروں گا اور انہیں تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آؤں گا۔

اب روم سے بھاگ کر میں اور کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا کہ میری نوکری روم میں تھی اور وہاں سفارش وغیرہ نہیں چلتی..... لیکن خدا جب کسی کی مدد کرنے پہ آتا ہے تو لا معلوم سے کوئی سبب پیدا کر دیتا ہے اور نہ ہونے میں سے ہونا نکال دیتا ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ولایت میں علوم شرقیہ کی لائبریریاں ملاحظہ کرنے کو آئے تو روما کی لائبریریوں کے لیے انہوں نے پورا ایک ہفتہ مختص کیا۔ اللہ کیا مستبب الاسباب ہے کہ اس نے بیٹھے بٹھائے اتنا بڑا آدمی میری مدد کو روانہ فرما دیا۔

علامہ علاؤ الدین صدیقی سے میری یوں بھی نیاز مندی تھی کہ وہ لاہور میں ہمارے سانجھی دیوار کے ہمسائے تھے اور ہماری مسجد میں جمعہ کی نماز بھی پڑھایا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ہمارے اتنے قریبی تعلقات تھے کہ ہم نے سانجھی دیوار کے جھکڑے میں ایک دوسرے پر مقدمے کر دیے تھے۔ وہ اپنی ضد پر قائم تھے۔ میرے ابا جی اپنی ہٹ کے کپے تھے، اس لیے جھکڑا بڑا طول کھینچ گیا تھا۔ ان قریبی تعلقات کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سے جانتے تھے۔ اس مقدمے بازی میں میری والدہ نے خفیہ طور پر فٹل دے کر معاملہ اور آگے بڑھا دیا۔ وہ ایک لمبی سی چادر لے کر علامہ

علامہ علاؤ الدین صدیقی کے گھر چلی گئیں اور انہی کے ڈرائنگ روم میں ان کی چوٹی کرائی۔ علامہ صاحب سر جھکا کر میری والدہ کے سامنے بیٹھے رہے اور جی جی کرتے رہے۔ اماں نے کہا ”علامہ الدین تم اپنے ابا جی کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہو اور ان کے مزاج کو خوب سمجھتے ہو۔ پھر تم نے اس دیوار کے تین انچ ادھر یا چار انچ ادھر ہونے پر کیا مقدمے بازی شروع کر رکھی ہے!“ علامہ صاحب نے سر کو مزید جھکا کر اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا ”اماں جی جو آپ کا حکم ہوگا، اسی طرح سے ہوگا۔“ ہم تو علامہ صاحب کے ساتھ کھڑکڑا کے مقدمہ لڑتے رہے لیکن وہی بیچ میں سے دم دبا کر بھاگ گئے۔

جب وہ روما کی لائبریریاں دیکھنے ہمارے شہر آئے تو میں نے ان کے ہوٹل سے انہیں اچک لیا۔ اس وقت میرے پاس ایک نیا لمبریا سکوتر تھا جسے میں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ جھلا جھلا کے چلایا کرتا تھا اور اس پر اپنے محلے کے آوارہ گرد لڑکوں کے ساتھ مل کر لوک گیتوں کی تانیں اڑایا کرتا تھا۔ لمبریا چاہے دائیں انڈیل کے چلتا چاہے بائیں، اس کے پائیدان کی رٹ سے پرانی رومن سڑکوں پر چنگاریاں ضرور اڑا کرتی۔ یہ میری شام کے بعد کی زندگی تھی۔ صبح کے وقت یونیورسٹی میں اور بعد دوپہر ریڈیو روم میں ایک ایک بڑی سنجیدہ اور پروقار زندگی کا چلن قائم تھا۔

علامہ صاحب نے پہلے تو سکوتر پر بیٹھنے سے انکار کر دیا لیکن جب میں نے ان کو نزام اور بس کے ٹکٹ اور ٹیکسی کے کرائے بتائے تو انہوں نے میری بات مان لی اور سکوتر پر بیٹھنے ہوئے کہا ”اشفاق میاں! سکوتر لو ہے اور بڑکا امتزاج ہے اور بے جان چیزیں کسی کے اختیار میں نہیں ہوتیں۔ اس لیے ذرا آہستہ ہی چلانا۔“

ریڈیو سے فارغ ہو کر میں علامہ صاحب کو سیدھا ساحل سمندر پر لے گیا جہاں غسل آفتابی کی عاشق ہزاروں ریت پر اوندھی سیدی لیتی تھیں۔ امتیا کا ساحل پاپا کی گمری کے قریب ہونے کی وجہ سے سخت قسم کی اخلاقی اقدار کا پابند تھا۔ یہاں ہر عورت کو کم از کم دو کٹوں کا لباس پہن کر سن بیدگی کی اجازت تھی لیکن کچھ شوخ و شنگ لڑکیاں ریت پر اوندھی ریت کر اپنے اوپر کا پڑ کھول کر اس کے دونوں بند دائیں بائیں ریت پر ڈال دیتی تھیں۔

علامہ صاحب نے اس لعنتی انبوہ پر دور دور تک نظر دوڑائی اور بڑے دکھ کے ساتھ مجھے مخاطب کر کے بولے ”اشفاق! یہ تہذیب اپنی ہی خنجر سے بہت جلد خودکشی کرنے والی ہے۔ تم دیکھو گے کہ ایسے معاشروں کا نام و نشان تک مٹ جائے گا اور تاریخ دان ان کے بارے میں اسی طرح سے بتایا کریں گے جس طرح آسانی کتابیں عادی خودکے بارے میں بیان کرتی ہیں۔“ انہوں نے چاروں طرف پھر نظر دوڑائی اور مجھ سے پوچھنے لگے۔ ”کیا تم ہر روز یہاں آتے ہو؟“

میں نے کہا ”ہر روز تو نہیں علامہ صاحب۔ البتہ جب کبھی وقت ملتا ہے تو میں اکثر شہر کے پر شور ہنگاموں سے اکٹھا کر سکون کی جستجو میں بیٹھ جاتا ہوں یہاں آ کر۔“

”یہاں آ کر سکون ملتا ہے؟“ انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

میں نے کہا ”سر سکون حاصل کرنے کے اپنے اپنے طور طریقے ہیں۔ افریقی لوگوں کو جنگلوں، دریاؤں، صحراؤں میں گھومنے سے سکون ملتا ہے۔ ہم لوگوں کو یا خدا سے تسکین قلب حاصل ہوتی ہے۔ اسکیموؤں کو برف پر پھسلنے میں آند ملتا ہے۔ ان کو دھوپ میں بیٹھنے اور بدن کھولنے سے راحت ملتی ہے۔“

علامہ صاحب کی گفتگو چونکہ مذہب کا موزک ٹکٹ تھی، اس لیے مجھے اندیشہ ہوا کہ اب بات جمعہ والے خطبہ کا رنگ اختیار کر لے گی۔ اسی لیے بہتر یہی ہے کہ موضوع بدل دیا جائے۔ میں نے کہا ”علامہ صاحب یہ ہزاروں عورتیں جو اس طرح پرے جاکر لیٹی ہیں، دراصل اپنا رنگ تبدیل کرنا چاہتی ہے۔ یہ اپنے گورے رنگ کو سانولے میں اور سانولے کو کالے میں ڈھالنا چاہتی ہیں۔ وقتی طور پر تو ان کی خواہش پوری ہو جاتی ہے لیکن مہینے دو مہینے بعد وہی بد قسمت سفید رنگ لوٹ کر آ جاتا ہے اور یہ کجخت پھر گوری نشوونما ہو جاتی ہے۔ ان کا کیا کریں؟“

وہ میری یہ درد مند درخواست سن کر ہنس پڑے اور ہاتھ کو عجیب انداز میں جھٹک کر بولے۔ ”تو گدھی کہہ رہی تھی رام سے کام! انہیں موج کرنے اور بٹلے لوٹنے دے۔ تو قاضی بن کر ان کے لیے کیوں دہلا ہو رہا ہے۔ دیکھ تو سہی کیا دنیا و مافیہا سے بے فکر لیٹی ہیں کہ اپنے ستر تک کا ہوش نہیں۔“ پھر انہوں نے اپنی نظروں کا ٹیلی شاٹ بین کر کے ان کے ستر کو معائنہ کیا اور کہا ”ان بد نصیبوں کا معاملہ تو بے حیائی کی حدود سے بھی آگے نکل گیا ہے۔“..... یہ ان دنوں کی بات ہے جب ”زمیندار“ اور ”انقلاب“ کے بند ہو جانے کے بعد نئے پاکستان کے اردو اخباروں نے ولایت کی غم برہنہ ماڈلوں کی لمبی لمبی تصویریں شائع کر کے ان پر ”بے حیائی کے محسنے“ ”انسانیت کی تذلیل“ اور ”بد اخلاقی کے پرچم“ وغیرہ کے عنوانات دینے شروع کر دیئے تھے۔ جس اخبار میں بد اخلاقی کے ایسے پرچموں کی تعداد زیادہ ہوتی، اس اخبار کی اشاعت بھی اسی نسبت سے بڑھ جاتی۔

جانے سے پہلے ردما کے چامپو ایئر پورٹ پر علامہ علاؤ الدین صدیقی صاحب نے تصوف اور رہبانیت کو ملا جلا کر ایک تفصیلی لیکچر دیا اور مجھے یقین دلادیا کہ تصوف اور روحانیت بے معنی اور لالچنی سوچ ہے جسے بادشاہوں، بے عملوں، بددیانتوں اور کابلوں نے ایک طرف اور ملٹوں، بنشیوں، بھنگوڑوں اور بد فکروں نے دوسری طرف اپنی مطلب براریوں کے لیے منع کر کے لوگوں کو اجاق بنارکھا تھا۔ جب بھی بنارکھا تھا اور آج بھی بنارکھا ہے۔

پھر انہوں نے بڑی محبت سے چکار کر کہا ”تم نے ایسی واہیات باتوں میں دخل نہیں دینا۔ ایسے اداروں کا ممبر نہیں بننا۔ تھیا سوئی، میڈی ٹیشن، یوگا یا سپر چونکرزم وغیرہ کے لیکچرز میں شمولیت نہیں کرنی اور اس قسم کے سیمینارز اٹینڈ نہیں کرنے۔ بس.....! اپنے ایمان پر نظر رکھنی ہے اور ساری توجہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر مرکوز کر کے اپنے لیے اور اپنے وطن کے لیے مستقبل کی راہیں روشن کرتے چلتا ہے..... اس کے علاوہ تمہارا یہاں آنے کا اور کوئی مقصد نہیں۔ اگر تم نے میرے اس کہے سے روگردانی کی تو میں جا کر ڈاکٹر صاحب سے شکایت کر دوں گا اور تم کو فوراً واپس بلا لیا جائے گا۔“

پھر مجھے اچانک یاد خدا سے یاد آیا کہ مجھے تو علامہ صاحب سے مشرق کی اس دانش کے بارے میں استفسار کرنا ہے جو ہمارے خطے کا مخصوص علم ہے اور جس میں پیروں، پیغمبروں، ولیوں، صوفیوں اور نسیا سیوں کا بڑا حصہ ہے۔

علامہ صاحب نے کہا ”یہ تو درست لیکن اب اس علم کا دور نہیں رہا۔ ہم نے بڑی مشکلوں سے پاکستان بنایا ہے اور اب اس کو ترقی دے کر باقاعدہ عروج تک پہنچانا ہے۔ یہ ترقی پرانے علوم اور مشرق کی دانش سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لیے اپنے پرانے، سوکھے پیڑ پر ایک نیا پیوند لگانے کی ضرورت ہے۔ یہ پیوند سائنس اور ٹیکنالوجی کا پیوند ہے جس کے باندھنے کو مغرب کے علوم اقتصاد کی رسی درکار ہوگی۔ جس پسماندہ ملک نے یہ راز پالیا، وہ تو ترقی اور جوانی پرانی طرز پر اڑا رہا، اس کا نام و نشان اس کردار ارض سے مٹ گیا۔ اب سوچ لو اور فیصلہ کرو کہ تم کو کیا کرنا ہے۔“

میں نے کہا ”سر میں تو اس غرض سے یہاں آیا ہوں کہ اسی ترقی کو واپس اپنے وطن لے جا کر اس کا پیوند لگانے کا خواہشمند ہوں لیکن یہاں کے کچھ پڑھے لکھے لوگ ایسے ہیں جو میری جان کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“

”کیوں؟“ انہوں نے چونک کر کہا اور میری وجہ سے کچھ پریشان سے ہو گئے۔

”یہاں کے لوگ سمجھتے ہیں کہ مشرق کے پاس خوشگوار اور خورسند زندگی بسر کرنے کا ایک نسخہ کیا ہے جس سے انسان اپنی تینوں منزلوں کو ایک ساروشن کر سکتا ہے اور ایک سا توازن عطا کر سکتا ہے۔“

علامہ صاحب میری یہ بات سن کر فکر مند سے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ارد گرد برہنہ اور غم برہنہ عورتوں کے کھیتوں اور کھلیانوں پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا ”اس بیچاری مخلوق کا کیا بن سکتا ہے جو لوگ مذہب سے اور اخلاق سے اس قدر دور ہو جائیں، اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے حیوانوں کی سی زندگی بسر کرنے لگیں، ان کی رہنمائی کون کر سکتا ہے؟“

”یہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ اہل مشرق اپنی دانش پارینہ کے زور پر ہماری مدد کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اس راز کو انھیں نہ رکھیں اور بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے اسے عام کر دیں..... کیا ہمارے پاس واقعی ایسا راز ہے علامہ صاحب!“

”ہمارا دین.....“ انہوں نے جمعہ والے جوش خطابت سے کہا۔ ”ہمارا مذہب، ہمارے خدا کا فرمان جو ان کے نبیوں کے ذریعے ان تک بھی پہنچا لیکن انہوں نے اس میں تحریف کر لی۔ اس کی شکل بدل ڈالی اور اب یہ پوچھتے ہیں..... ہمیں وہ راز بتاؤ اور اس بھید کی تفصیلات.....“

میں نے علامہ صاحب کی بات کا نئے ہوئے بڑے ادب سے درخواست کی کہ ”کیا ہم اپنے دین کے ذریعے انسانیت کے اس بلند مقام پر پہنچ گئے ہیں جس کا ہم سے وعدہ کیا گیا تھا؟“

”وعدہ کبھی یکطرفہ نہیں ہوتا شفاق میاں!“ انہوں نے سر جھٹک کر کہا۔ ”اس میں دونوں طرف سے کچھ اقرار و اثبات ہوتے ہیں۔ آپ لوگوں نے عمل سے انحراف کر کے زبانی اسلام کو پکڑ لیا۔ اسے ڈھیل دینے کے بجائے طناب میں کھینچ لیں۔ اب تم مایہ بے آب کی طرح ترپ رہے ہو اور یہ سمجھنے سے قاصر ہو کہ ایسی افتاد تم پر کیوں پڑی اور اس کا اصل ذمہ دار کون ہے؟“

تھا اور میرے اندر جوئل بجاتھا، اس کی گونج اور گھمکار صرف میرے پاس تھی۔ وہ سن سکتے تھے، سنانہ سکتے تھے۔ بج سکتے تھے۔

جب لڑکیوں نے فاختاؤں کی سی آواز نکال کر کہا ”سینور پروفیسور“ آپ مری رمزم سے چھپا رہے ہیں اور لڑکی پتھی گپتار ہے ہیں تو میں نے اپنی چھین چھپائی کے انداز نہشتہ میں اور اضافہ کر دیا اور اپنے بدن کے اشاروں سے ان پر واضح کر دیا کہ اس میں بہت ساری مشکلات ہیں۔ بتانے کی مشکل، سمجھنے کی مشکل، ابلاغ کی مشکل اور آخر میں مشکل کی مشکل۔ جب آدمی کے پاس کچھ نہ ہو، کھیسہ خالی ہو، روح خالی اور بدن بے حضور ہو تو اسے پکڑے جانے کے خوف سے کئی مرتبہ خود جھڑپ کر کے اپنا کاسہ خالی دکھانا پڑتا ہے۔ اس سے نہ صرف بھرم نہیں کھلتا بلکہ تالی بھی بجتی ہے اور بڑے دور کی بجتی ہے۔

(2)

مجھے یونیورسٹی لائبریری سے، انگریزی زبان میں، اپنشد پر ایک بڑی اچھی کتاب مل گئی۔ اس میں ترجمے کے ساتھ ساتھ وضاحتی نوٹ بھی تھے۔ رگ وید پر ایک طویل مقالہ تھا لیکن باوجود اس کے کہ رگ وید میرے اپنے علاقے، میرے ملک پاکستان میں رقم ہوا تھا، وہ میرا کام نہیں دیتا تھا۔

ایلی اپنشد میں لکھا تھا ”ذات ہر جگہ ہے، ہر مقام پر ہے۔ نہ اس کا کوئی جسم ہے نہ ہی اس کی کوئی چھب ہے۔ کامل، سراسر، عاقل، دانایا، علیم مطلق، درخشاں، ماورائے زمان و مکان جوازی جلوس میں ہر عہد اور ہر زمان کو اس کا فرض اور ماموریت عطا کرتا ہے۔“

کیون اپنشد کہتا ہے ”وہ جو کہتا ہے کہ روح شناخت میں نہیں آتی۔ بھید سے واقف ہے۔ پر وہ جس کا خیال ہے کہ وہ جانتا ہے، مگر اہے، مورکھ ہے! نادان یہ سمجھتا ہے کہ روح بدھی میں ہے، گیان ہے لیکن گیانی سمجھتا ہے کہ وہ بدھی یا سے آگے کی چیز ہے۔ روح سے شناسائی وحی اور الہام کے زور پر تو ہو سکتی ہے اور کسی طرح سے نہیں اور جو اپنی زندگی میں اس کو پا گیا، وہ حق سے اور حقیقت سے آشنا ہو گیا۔“

یہاں مجھے رہ رہ کر قرآن کا فرمان یاد آتا ہے ”کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کا ایک امر ہے۔“ لیکن میں اس کا ذکر کرنے سے جان بوجھ کر اجتناب کرتا تھا کہ وہ قرآن کا حوالہ سن کر بدگ جائیں گے اور تحس کی ساری راہیں چھوڑ کر واپس اپنی پتھروں والی رومن روڈ پر آ جائیں گے۔

ولایت میں سکا رلشپ کے علاوہ تقابلی مذاہب پر جس قدر مواد شائع ہوتا ہے، اسی میں اسلام کا ذکر واجبی سا ہوتا ہے، صرف تاریخ کے حوالے سے۔ قرآن کا اشارہ ایک سطر میں اور حضور ﷺ کا حوالہ بالکل مفقود۔ وہ لوگ بدھ مت، جین مت، ہندو دھرم، پارسی مذہب اور سکھ پنٹھ کے مقابلے میں اس کو ایک باقاعدہ مذہب قرار نہیں دیتے۔ بس ایک لڑاکے سے گروہ کے درحرب و ضرب کا تذکرہ کر کے آگے گزر جاتے ہیں۔

مجھے محنت تو کافی کرنی پڑتی تھی اور میں نے رات کو اپنی نیند کا ایک گھنٹہ بھی کم کر دیا تھا لیکن یہ درس کافی مفید ثابت ہو رہے تھے۔ سننے والوں کے بارے میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا البتہ سنانے والے کو بڑا لطف آ رہا تھا۔ شمع میرے

علامہ صاحب تو یہ دھمکی دے کر چلے گئے لیکن میں ان کے چلے جانے کے بعد کچھ زیادہ ہی ڈر گیا۔ اس زمانے کے ابا جی واقعی ابا جی ہوتے تھے اور اپنے بچوں کے دوست نہیں کہلاتے تھے۔ بڑی محبت، بڑی شفقت والے اور غایت درجہ کے عاشق قسم کے ابے لیکن اپنے اور بچوں کے درمیان ایک فاصلہ رکھ کر زندگی بسر کرتے تھے۔ جب ابا جی نے ”ہاں“ کر دی تو اس کا مطلب ”ہاں“ ہوتا تھا اور جب ”نہ“ کر دیا تو پورا ”نا نہ“ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ! ہماری تہذیبی روایت میں ماں سے محبت کا سلسلہ اس وقت سے چلا آ رہا ہے جب ابالوگ سخت ہوتے تھے اور مٹی جون کے سورج کی طرح دیکھتے تھے۔ مانس زندگی کے جھلسے ہوئے ریگستان کی پھواریں تھیں۔ بچے کو ذرا سا تکلیف میں دیکھا، ساری کی ساری ٹار ہو گئیں۔ شبنم کی سی ٹھنڈک ہو گئی۔ زندگی کے خلستان میں اور کئی چشمے پیدا ہو گئے۔ رنگارنگ پرندے دل بہلانے کو آ گئے۔ لیکن جب کسی آدمی سے علم کے اظہار کو کہا جاتا ہے اور سننے والے نیم دائرے کی شکل میں اس کے سامنے بیٹھ کر علم کی بھیک مانگنے کو جھولیاں پھیلاتے ہیں تو پھر علم والے سے رہا نہیں جاتا۔ وہ اپنی جان کی بازی لگا کر اظہار کرتا ہے اور پھر کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ کئی مرتبہ یوں بھی ہوا کہ سننے والے اٹھ کر چلے بھی گئے۔ اپنی بیزاری کا اظہار بھی کر گئے لیکن کہنے والا کہتا چلا گیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ شراب کا نشہ چھوٹ جاتا ہے، بہروئن کی لت ختم ہو جاتی ہے۔ چور چوری چھوڑ دیتا ہے لیکن سنانے والا سنانے سے نہیں رُک سکتا۔ منبر پر ہو، مشاعرے میں ہو، اسمبلی میں گھس جائے، سلامتی کونسل میں پہنچ جائے، بولنے والا بولے گا اور دبا کے بولے گا۔ مہاراجہ پتیالہ تو بجلی کی پٹی لگانے کے باوجود اوندھے منہ گر کر ہانپنے لگتا تھا مگر اپنی دانش کا اظہار کرنے والا نہ کبھی تھکتا ہے نہ ہانپتا ہے نہ اس کو اگٹھ آتی ہے نہ اس کی آواز گرتی ہے، نہ تھکاوٹ کے آثار نظر آتے ہیں۔ بس کہے چلا جاتا ہے، بتائے جاتا ہے، بولے جاتا ہے۔

مجھے میرے ساتھیوں نے، دوستوں نے، ہم کاروں اور شاگردوں نے سامنے بٹھا کر اپنا ہم دائرہ بنالیا تھا تو میں کیا کرتا؟ ساتھ ہی موضوع کچھ ایسا تھا کہ جس میں کہیں سے بھی پکڑے جانے کا احتمال نہ تھا۔ وہ لوگ مشرق کے بارے میں بہت کم جانتے تھے اور میں حسن اتفاق سے ان سے بھی کم جانتا تھا لیکن خطرہ یوں نہیں تھا کہ میں مشرق کا خاص سومناقی

سامنے تھی اور میں جھوم جھوم کر غزلے، دو غزلے اور سہ غزلے سنار ہاتھ۔ اک سلسلہ گفتگو تھا جو ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ بات خود بخود آگے بڑھتی چلی جاتی تھی۔

بات میں بھی اللہ نے کیا جادو رکھا ہے کہ جب ایک مرتبہ شروع ہو جائے تو پھر بڑھتی، پھیلتی، لپکتی جاتی ہے۔ رکنے لگتی ہے تو کئی کاٹ کر ایک اور رخ پر نکل جاتی ہے۔ پھر کھلا میدان ہوتا ہے اور بات ہوتی ہے۔ تکلم ہوتا ہے اور بیان ہوتا ہے۔ بیان فوک مواملاات کی پرانی گاڑی پر بھی ٹھیک چلتا ہے اور بلٹ ٹرین کی تیز رفتاری کا مقابلہ بھی کرتا ہے۔ بی ایم ڈبلیو کی کھڑکی سے ہاتھ لہراتا بھی گزرتا ہے اور سطح آب سے اوپر اٹھ کر ہوور کرافٹ کی شان میں بھی چلتا ہے لیکن سب سے ملائم، بے ٹکان اور رواں گفتگو برف کی سٹیج کی چال چلتی ہے۔ نرم نرم!! نرم!!

میری کتابوں سے چرائی ہوئی باتوں سے وہ سب لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اچھی طرح سے پہچان لیا کہ میں مشرق کی سزی رمز کو چھپا رہا تھا اور اب میں نے بقدر توفیق اسے کھولنا شروع کر دیا ہے۔

آہستہ آہستہ اس سوانگ کا مجھ پر ایک عجیب سا اثر ہونے لگا۔ بھرا تو میں نے بہرہ ور تھا اور وہ بھی ان لوگوں کے دباؤ میں آ کر مگر وہ بہرہ ور ایک عجیب سا روپ اختیار کرنے لگا۔ وہ جو کہتے ہیں ناں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے تو کچھ ایسی ہی کیفیت میری ہو گئی۔ اس جھوٹے ناک کا میری سچی زندگی پر ایک عجیب طرح کا اثر پڑنے لگا۔ زمین سے اکھڑے ہوئے پاؤں نہ چ کی زمین پر پڑتے تھے نہ جھوٹ کے فرش پر اترتے تھے۔ سارا کچھ پائے خان کی پتلی کی طرح ہوا میں معلق ہو گیا تھا۔

اب مجھے ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں یہ جھوٹا ڈرامہ بیک سٹیج سے نکل کر سچ کے بھرپور اکھاڑے میں ہی نہ جا نکلے کیونکہ.....

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شاہی بھنگی تھا۔ وہ جو پاخانہ صاف کرنے کے لیے محل میں گیا تو اتفاقاً اس کی نظر شہزادی پر پڑ گئی اور وہ بھنگی ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا مگر اپنے کمینہ پن اور شہزادی کے علوم مرتبہ کو دیکھ کر کہ یہ وصل تو ناممکن ہے، ناامید ہو گیا!

مرض عشق نے جب غلبہ کیا تو وہ بہت بیمار ہو گیا اور بجائے بھنگی کے اس بھنگی کی عورت پاخانہ کمانے لگی۔ کشت دل کا اثر مشہور ہے۔ شہزادی کے دل میں بھی اس کا اثر ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد اس بھنگی کی عورت سے شہزادی کہنے لگی کہ ”اب تیرا خداوند کیوں نہیں آتا؟“ اس نے کہا ”وہ بیمار ہے۔“

شہزادی نے کہا ”ہم شاہی طبیب اس کے معاملے کے واسطے بھیج دیں؟ اس کو کیا بیماری ہے؟“

بھنگن شہزادی کا یہ سوال سن کر خاموش رہی لیکن جب شہزادی نے بہت اصرار کیا اور بھنگن کو سخت دھمکی دی کہ بتلا اس کو کیا بیماری ہے؟ تو بھنگن نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور اگر جان کی امان ملے تو عرض کروں؟

شہزادی نے امان دی تو اس نے کہا ”حضور! اصل بات تو یہ ہے کہ بیماری اسے کچھ نہیں۔ وہ حضور کو دیکھ کر آپ کا عاشق ہو گیا ہے لیکن اب چونکہ دوبارہ دیدار ممکن نہیں، اس لیے غم سے لاچار ہو کر قریب المرگ ہو گیا ہے اور چند ہی روز

میں اس دنیا سے کوچ کیا جاتا ہے۔“

شہزادی نے کہا ”یہ اختیاری بات نہیں لیکن اگر میرے دیکھنے سے اس کی جان بچ جائے تو میرا کوئی نقصان نہیں مگر مشکل یہ ہے کہ میرا مرتبہ مجھے اس کے سامنے آنے سے مانع ہے کیونکہ اس سے میری، بادشاہ سلامت کی اور ساری سلطنت کی بدنامی ہوگی۔ البتہ ایک ترکیب بتاتی ہوں۔ اگر وہ اس پر عمل کرے تو شاید مجھے دیکھ سکے اور اس کی جان بچ جائے۔“

بھنگن نے ہاتھ باندھ کر کہا ”آپ کا کہا سراسر آنکھوں پر۔ جو آپ فرمائیں گی وہی ہماری زندگی کا کارن بن جائے گا۔“

شہزادی بولی ”ترکیب یہ ہے کہ وہ فقیرانہ شکل بنا کر دریا کے کنارے بیٹھ جائے اور رات کو تو اسے روٹی وغیرہ کھلا دیا کر۔ وہ تمام دن اللہ تعالیٰ کا نام لیتا رہے اور آنکھیں بند کر کے اللہ اللہ کرتا رہے اور کسی طرح کا خیال اپنے دل میں نہ رکھے۔ بس ایک ہی طرف لوگا کر بیٹھا رہے۔ اگر کوئی اس کو فندی یا کھانے کی کوئی چیز نذر کرے تو ہرگز نہ لے۔ لوگ یہ چیزیں وہاں چھوڑ جائیں تو مطلق توجہ نہ کرے اور اگر کوئی یہ چیزیں اٹھا کر لے جائے تو اس کو منع نہ کرے۔ چند روز میں جب اس کی شہرت دور دور تک ہو جائے تو امیر غریب، متعدي سپاہی، وزیر سالار سب اس کی زیارت کو جائیں گے۔ پھر بادشاہ بھی جائے گا اور جب بادشاہ ان کی زیارت کر کے لوٹ آئیں گے تو میں بھی ان سے اجازت لے کر اس کے پاس چلی جاؤں گی۔ اسے اپنے درس دکھاؤں گی۔ یوں اسے ملنے اور بات چیت کرنے کا خوب موقع مل جائے گا۔“

بھنگن نے ہاتھ جوڑ کر اور سیس نوا کر شہزادی کا شکریہ ادا کیا اور گھر آ کر یہ بات بھنگی کو سنائی۔ بھنگی کی ویران دنیا میں بہار آ گئی۔ اسی وقت ایک بوریا اٹھا کر دریا کنارے جا بیٹھا اور نام خدا میں مشغول ہو گیا۔ پھر ایسی حالت بنائی کہ اگر کوئی نذر دیتا تو اس کی طرف توجہ نہ کرتا اور جو کوئی رکھ جاتا اور دوسرا اٹھا لے جاتا تو اسے منع نہ کرتا۔ رفتہ رفتہ عام شہر میں اس کی شہرت ہو گئی۔ لوگ اس کے پاس آنے لگے اور نذریں وغیرہ بھی لانے لگے مگر اس نے کسی کی طرف دھیان نہیں کیا اور اللہ اللہ کرتا رہا۔

ہوتے ہوتے خبر بادشاہ تک پہنچی۔ بادشاہ نے اپنے وزیر کو اس کا حال دریافت کرنے کے لیے روانہ کیا کہ کیا واقعی وہ فقیر سچا ہے اور دنیا سے بے تعلق ہے۔

وزیر حکم پاتے ہی سیدھا دریا کنارے پہنچا اور جا کر فقیر کو نذر پیش کی۔ اس نے کچھ توجہ نہ کی۔ نہ اس کی طرف دیکھا، نہ اس سے کوئی بات کی۔ بس اسی طرح آنکھیں موندے اللہ سے لوگائے بیٹھا رہا۔

وزیر نے یہ حال بادشاہ کو سنایا کہ واقعی اس کا رجحان ایسا ہی ہے کہ دنیا کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ لوگوں کی بات کا جواب نہیں دیتا۔ ذات میں گم بیٹھا ہوا ہے۔

اگلے روز بادشاہ خود گیا۔ نذر نیاز دی، سلام کیا لیکن فقیر ملتفت نہ ہوا، اسی طرح بیٹھا جا پ کرتا رہا۔

رات کو شہزادی نے پوچھا ”سنا ہے آج آپ کسی فقیر کے پاس تشریف لے گئے تھے، اس کو کیسا پایا؟“

بادشاہ نے کہا ”وہ فقیر بہت ہی سچا اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہے۔ کوئی مادی یا دنیوی غرض اس کو چھوٹک نہیں گئی۔ ہمیں فخر ہے کہ ہماری مملکت میں اللہ کے کسی نیک بندے نے قیام فرمایا اور ہماری فکرو کی عزت افزائی کی۔“

شہزادی نے عرض کیا ”اگر آپ اجازت دیں تو کیا میں بھی اس کی زیارت نہ کر لوں؟“

بادشاہ نے کہا ”بالکل ٹھیک ہے۔ جب دل چاہے، ان کو سلام کر آنا اور ان کی خدمت میں کوئی نذر بھی لے جانا۔ شاید تمہاری نذر قبول کر لیں۔“

شہزادی نے اس کی عورت بھنگن کو بلا کر کہا کہ ”اس سے کہہ دینا کہ میں کل صبح آؤں گی۔ اور اپنے دیدار کے شربت سے تم کو سیر کر دوں گی۔ کل تمہاری برسوں کی دلی مراد برآئے گی اور حسرت دیدار پوری ہو جائے گی۔“

اس بھنگن نے جا کر اپنے گھر والے کو یہ مژدہ سنایا کہ جس کے لیے تو کئی سال سے بہرہ بھر کر بیٹھا ہے، وہ خود چل کر تیرے پاس آ رہی ہے اور تیرے سامنے بیٹھ کر اپنا مومنہ کھڑا خود تجھ دکھلا رہی ہے۔

بھنگی خوشی کی یہ خبر سن کر تڑپ کر گر ا اور بے ہوش ہو گیا۔

جب ہوش میں آیا تو دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا، میں نے یہ کام آج تک جھوٹ موٹ محض ایک نفسانی غرض کے لیے کیا تھا اور اس کا ایسا مثبت نتیجہ سامنے آ گیا۔ جب اس کے نام میں اس قدر تاثیر ہے کہ میرے جیسے ناجیز اور حقیر کے پاس بڑے سے بڑے مرتبے اور اعلیٰ رتبے والے بادشاہ کو بھیج دیا تو اگر میں سچے دل سے اس کا نام لوں، پھر معلوم نہیں اس سے بھی زیادہ اور کسی کسی نعمتیں ملیں۔

اس خیال کے آتے ہی وہ زار زار رونے لگا اور اپنے پہلے ارادے سے نہایت عاجزی کے ساتھ توبہ کر کے اس نے دعا کی کہ خداوند مجھے اپنا دیدار دکھادے۔ جب تیرے نام میں اتنا اثر ہے کہ بادشاہ اور وزیر اور شہر کے امراء و رؤسا میرے بورے پر آنے لگے تو خبر نہیں تو خود کس قدر سوہنا ہوگا اور جب میں نے جھوٹ موٹ مکر و فریب سے تیرا نام لیا تو ملک کے بادشاہ کو میرے پاس بھیج کر میری عزت افزائی کرادی تو اب جب کہ میں سچے دل سے تجھے پکارتا ہوں تو ایسا رحیم و کریم ہے کہ خود بھی ضروری میرے پاس آ جائے گا اور مجھے اپنا دیدار دکھادے گا۔ اسی طرح تمام رات روتار ہوا اور گریہ و زاری کرتا رہا۔

جب پچھلی رات ہوئی تو اس کی عجز و زاری بارگاہ الہی میں مقبول ہو گئی اور فرشتے سے عرش تک اس کو انکشاف ہو گیا اور بہشت کی حوریں اس کو دکھائی دینے لگیں۔ دیکھتے دیکھتے ایسا معاملہ پلٹا کہ پہلے یوں تھا، پھر یوں ہو گیا۔

صبح کو جب شہزادی اس کے پاس پہنچی تو وہ مطلق اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ حوران بہشت اس کی طرف نظر اٹھا کر زیارت کر رہی تھیں اور تجلیات ذات الہی اس پر وارد ہو رہی تھی اور وہ مشاہدہ حق میں مستغرق ہوا جا رہا تھا۔

باندیوں نے اس کا کندھا ہلا کر کہا ”مملکت کی شہزادی تشریف لائی ہیں اور یہاں تمہارے سامنے بیٹھی ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ بات چیت کرو اور مدعا اپنے منصوبے کا بیان کرو۔“

اس نے بڑی دیر کے بعد جواب دیا کہ ”اب مجھے شہزادی کی کچھ پروا نہیں، شہزادی سے ہزار ہا درجہ حسین و جمیل حوریں اس وقت میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہیں اور میں جو نظارہ آرام سے اس حسن الافانی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔“

شہزادی نے یہ سن کر کھینچ کر ایک طمانچہ اس کے منہ پر مارا اور کہا ”بے وفا! بے ایمان! تیری مرشد تو میں ہوں اور تو حوروں اور بہشت کے قماشے میں مشغول ہوا بیٹھا ہے۔ خود تو وہاں تک چلا گیا اور میں یہیں رہ گئی۔ مجھ کو بھی تو اپنے ساتھ لے جاتے دکھلا اور مجھے بھی اس دنیا کی سیر کرا۔“

اس نے شہزادی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے واصل بہ حق ہو گیا۔ وہ بد نصیب روتی پینتی نالہ و شیون کرتی اپنی باندیوں اور کنیزوں کے جھرمٹ میں واپس محل کو روانہ ہو گئی۔

سوالند کا نام لینا ہر طرح سے فائدہ ہی فائدہ رکھتا ہے۔ چاہے جھوٹ ہو چاہے سچ۔ اس کام میں کبھی جھوٹا بھی سچا ہو جاتا ہے۔

جھوٹے کھینڈوں سچا ہو
سچا تے کوئی درلا ای ہو

میں تو اس وقت ایک جھوٹا نام دھاری بھی نہیں تھا۔ بس دوستوں یاروں کے ساتھ ایک لیلا رچا رکھی تھی اور اس کے مزے لے رہا تھا۔ اگر یہ جھوٹی کھینڈ ہوتی شاید کبھی اس کا کوئی سچا انعام بھی مل جاتا لیکن میں تو کھیل سے بہت پرے تھا۔ نہ کھلاؤں نہ تماشا شانی۔ بس اس علاقے کا باشندہ تھا جہاں بہت سی کھیلیں کھیل جا رہی تھیں۔

روما کے چار بڑے گرجوں میں سے ایک سانٹا ماریا مجودے میرے مرکزی دفتر ”ازمیو“ سے بہت ہی قریب تھا۔ یونیورسٹی جاتے ہوئے ریڈیو سٹیشن پہنچنے کے لیے ریلوے سٹیشن جانے کے لیے، اٹھاسی نمبر اور سولہ نمبر کی بس پکڑنے کے لیے، سانٹا ماریا مجودے کے اس پہلو سے یا اس پہلو سے ہو کر گزرتا پڑتا تھا۔ انہی دنوں میرے دل میں خیال آیا کہ باہر سے گزرنے کے بجائے کیوں نہ اندر سے گزرا جیا کروں۔ فاصلہ بھی قطع ہوگا۔ سر پر مسلسل چھت بھی ملے گی اور روح کو ہالیدی بھی حاصل ہوگی۔

گرچے کے اندر سے گزرتے ہوئے، پرانے بزرگوں، صوفیوں، راہبوں کی شیشے کے بمسوں میں رکھی ہوئی حوط شدہ متیوں کے سامنے رکھتے ہوئے، اعتراف کے چوٹی ڈربوں کے سامنے دوڑاؤ گنگناہروں کو آہستہ آہستہ دھیمی آواز میں اعتراف گناہ کرتے ہوئے اور جنگ و تارک ڈربے کے اندر چھپے ہوئے پادری کو اپنے خیالوں میں اجالتے ہوئے جب میں تین چار مرتبہ گرچے کے اندر سے گزرتا تھا تو میرا سارا وجود ایک جھنجھٹائی ہوئی جھانجھ بن جاتا تھا۔ اس مسلسل ارتعاش اور توازن کی آمد و رفت سے پہلے میرے بدن میں، پھر ذہن میں اور آخر میں روح کے اندر کچھ عجیب سی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔

مجھے اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر یہ سب کچھ اسی طرح ہوتا رہا تو میں عیسائی ہو جاؤں گا اور کیتھولک مذہب اختیار کر لوں گا۔

لوگوں کا عشائے ربانی کی ادائیگی میں ایک ساتھ مل کر کھانا، کمرہ بھر ساز کے بڑے آرگن کا بجنا، رنگدار شیشوں سے باہر کی روشنی کا اندر داخل ہونا، مریم اور یسوع کے مجسموں میں حرکت کے آثار پیدا ہونا، مرنے کی خوشبو سے

سارے کلیسا کا دھیسے دھیسے منکبتہ جانا اور خوبصورت اطالوی لڑکیوں کا سفید سفید گھٹنوں کے بل ہو کر رنگارنگ ریشمی سکارف سروں پر باندھ کر اعتراضی ڈربوں کے سامنے اپنے احوال بیان کرنا، دل و دماغ کو اور روح و بدن کو کچے دھاگوں سے باندھ کر وہیں کیل دیتا تھا۔

میرے اندر ایک بہت بڑی تبدیلی پیدا ہونے لگی تھی۔ آخر عیسائیت بھی تو خدا ہی کا عطا کردہ ایک مذہب ہے۔ اہل کتاب کا خدا بڑی کریمی کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کا جس قدر تفصیلی تذکرہ قرآن پاک میں موجود ہے، انجیل میں بھی نہیں۔ پھر اسلام اور عیسائیت ایک ہی ندی کے دو کنارے ہیں، ان میں بظاہر کوئی خاص فرق بھی نہیں۔

اصل میں سیاہ و سفید لبادوں میں ملبوس پادری اور ڈھکے ہوئے سروں والی گوری چٹنیخوں کی تقدیس نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں اپنا کنارہ چھوڑ کر دوسرے کنارے کی طرف زقند لگانے پر تیار ہو گیا۔ مجھے ان راہبوں کے حسن لباس اور حسن سلوک نے گھائل کر دیا تھا اور میں صبح و شام ایک ہی بات سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ یہ کتنے بڑے لوگ ہیں جو اپنا وجود بھانے کو شادی نہیں کرتے اور ساری زندگی ازدواجی ملاپ کا لطف اٹھائے بغیر گزار دیتے ہیں۔

میرے ساتھ اردو سیکشن میں پادری سائتریلی بھی کام کرتے تھے۔ وہ دھنکن کی طرف سے اردو براڈ کاسٹ پر مامور تھے۔ بھاری بھر کم وجود، گورا رنگ، صحت مندی کے شہابی خون نے ان کے سارے بدن پر کیمرہ سائل رکھا تھا۔ آستینیں چڑھا کر کام کرتے تو سونے جیسے بازو ڈنک مارتے۔ بوٹ اتار کر سامنے کی کرسی پر پاؤں پھیلاتے تو خون کے دباؤ سے پشت پاشنگری ہو جاتی۔ سگریٹ پیتے تو صفائی کے ساتھ، سگار سلگاتے تو سلیقے اور سلوک کے ساتھ۔ سارا سگار سلگ کر خاستہ ہو جاتا مگر اکھڑ زمین پر نہ گرتی۔

پنجابی بہت اچھی بولتے تھے مگر اردو پر دسترس ذرا کم تھی۔ گرامر کے اصول خوب جانتے تھے مگر ادائیگی کے وقت رکتے تھے۔ ہفتے میں ایک مرتبہ پوری اردو ٹرانسمیشن ان کی ذمہ داری تھی۔ بھلا تو لیتے مگر سنوڈیو کی سرخ بقی آ جانے پر کانی نروں ہو جاتے اور پھر آخر وقت تک ویسے ہی رہتے۔

میرا ان کا گہرا ایلانہ تھا۔ تھے بھی شریک کار، ہمارا کمرہ بھی سانجھا تھا۔ کام بھی ایک ساتھ اور زیادہ وقت بھی ایک دوسرے کے ساتھ گزارتا تھا۔ کہتے تھے جب میں پہلی مرتبہ ملتان مشن کے اسٹنٹ کی حیثیت سے ملتان پہنچا تو سٹیشن پر مجھے لینے کے لیے کوئی بھی موجود نہ تھا۔ مشن والوں کو میرا تار نہیں مل سکا تھا اور میں پلیٹ فارم پر کچھ بوکھلایا سا کھڑا تھا۔ اتنے میں کسی نے زور سے میرا نام لے کر آواز لگائی سائتریلی..... سائتریلی..... تو میں نے تقریباً تین ہی اوپچی آواز میں جواب دیا۔ ”میں یہاں ہوں، اس بچ کے پاس!“ لیکن پانچ سات، دس منٹ گزرنے پر کوئی بھی نہ آیا تو گھبرا سا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر کسی نے اوپچی آواز میں مجھے پکارا ”سائتریلی..... سائتریلی.....“ تو میں نے بھروسے ہی ایڑیاں اوپر اٹھا کر جواب دیا۔ ”میں یہاں ہوں..... میں یہاں ہوں..... میں سائتریلی بول رہا ہوں..... آپ کہاں ہیں؟“ لیکن بجائے اس کے کہ کوئی میری طرف آتا۔ ہاتھ ہلا کر مجھے بلاتا یا میری طرف رجوع کرتا۔ اس نے پھر میرا نام لے کر زور سے پکارا سائتریلی..... سائتریلی.....

پادری سائتریلی نے کہا ”اب نیا ملک، نئے لوگ۔ ایک عجیب طرح کا ریلوے سٹیشن۔ مقامی زبان سے ناشائی لیکن مجھے پکارنے والا میرا صحیح نام لے کر پکار رہا ہے اور اوپچی آواز میں بلکہ بہت ہی اوپچی آواز میں مجھے مخاطب کر رہا ہے۔ بلا تو رہا ہے مگر نظر نہیں آتا، دکھائی نہیں دیتا۔“ کہنے لگے، میں نے اس غیب کی آواز کو روحانیت کا ایک اچھا شگون سمجھا اور خوش خوش ملتان ریلوے سٹیشن سے باہر نکل آیا..... چند دن بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرے نام ”سائتریلی“ کی غیب سے آنے والی آواز دراصل پلیٹ فارم کی ایک ریزم سے آ رہی تھی جہاں ایک نومسند ریزم فروشی اوپچی آواز میں صدا لگا رہا تھا ”سنترے لوڈ..... سنترے لوڈ“ اور دور سے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی میرا نام لے کر پکار رہا ہو ”سائتریلی..... سائتریلی!!“

جن دنوں سانسانا ماریا مجھوے کے گرجے کے اندر سے بار بار گزرنے پر میری روحانی طلب میں اضافہ ہو گیا اور میں اہل کتاب اور ان کے راہبوں، گوشہ نشین مرشدوں، تارک الدنیا پادریوں کے گہرے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ کیا لوگ تھے اور کس سلیقے اور سلوک کے ساتھ روحانیت کے سمندر میں تیرتے پھرتے تھے اور لہروں سے جھکڑتے نہیں تھے۔

ایک روز پادری سائتریلی نے کہا ”اشفاق! کام کر کے تھک گئے اور نائیک پر بول بول کر ہزار ہو گئے۔ اب اس بھلے زندگی میں کچھ میری دفتر تفریح بھی ہونی چاہیے۔“

میں نے خوش ہو کر اثبات میں سر ہلایا تو انہوں نے کہا ”کل پکنک پر نہ چلیں؟ یہاں سے اٹھائیں کلو میٹر دور ایک اٹھتا ہوا سا میدان ہے۔ وہاں زیتون کے درختوں کے لیے سلسلے میں ایک چشمہ اور چھوٹا سا سبزہ زار ہے۔ بڑی پاکیزہ لگا اور روحانی ماحول ہے۔ بہت ہی کم لوگ اس مقام سے واقف ہیں اور جو واقف ہیں وہ ادھر آتے نہیں ہیں۔ اگر تم پسند کرو تو کل وہاں چلیں۔“

میں نے کہا ”اور یڈیو ٹرانسمیشن کا کیا بنے گا؟“

بولے ”چار بجے تمہاری ٹرانسمیشن ختم ہو جائے گی۔ گرمیوں کے دن میں سورج سات بجے غروب ہوتا ہے۔ تین گھنٹے میں ہم قلب شمالی سے واپس آ سکتے ہیں۔ تم ریلوے سیدھے کلوٹیم کے پاس دیا آ بیوا والی سائڈ کے بس شاپ پر کھجی جانا۔ میں تمہارا منتظر ہوں گا۔ ہنستے کھیلتے چل پڑیں گے اور پکنک منا کر چلے آئیں گے۔“

میں نے کچھ پوچھنا چاہا تو انہوں نے کہا ”بس تمہارے ذمے صرف پہنچنا ہے۔ کھانے پینے کا سامان میں لاؤں گا جس میں تمہارے پسندیدہ مشروب کافی ایسپر سو کی پوری سلائی ہوگی۔ گھاس پر بچھانے کی ایک پھولدار چادر بھی میرے پاس ہے۔ آج تک کبھی استعمال ہی نہیں ہوئی، وہ بھی لاؤں گا۔ بڑا مزار ہے گا۔“

گرمیوں میں دوپہر کے وقت روم کی سڑکیں سنسان ہوتی ہیں۔ لوگ قیلولہ کرتے ہیں اور سڑکوں پر ٹریفک کا رش نہیں ہوتا۔ اس عرصے میں کمیٹی کے کارندے، فائر بریگیڈ کے بڑے بڑے سپوز پائپ لگا کر ساری سڑکیں دھوتے ہیں اور سارا ماحول شہیں سا ہو جاتا ہے۔ اصل میں ”ٹھنڈی سڑک“ روم میں ہوتی ہے یہاں نہیں۔ یہ سلسلہ شام کے چار بجے تک رہتا ہے اور اس کے بعد ٹریفک کی یورش دوبارہ شروع ہو جاتی ہے۔

مردی ہے۔ کچھ دن ایک سکول میں ملازمت کی تھی لیکن بچہ پڑھانا اس کو پسند نہیں آیا۔ اس لیے اب گھر پڑی رہتی ہے۔
اور پور ہوا کرتی ہے۔“

میں نے کہا ”یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔ ہمیں بھی کہنی ہو جائے گی اور دسترخوان بچھانے اور اس پر قریے سے چیزیں لگانے اور آخر میں پس خوردہ سامان کو گھڑا پے سے سیٹھنے کے لیے ایک خاتون بھی میسر آ جائے گی۔ یوں تو ساری دنیا ہی عورت کے دم قدم سے آباد ہے لیکن پکک تو اسکے بغیر جی ہی نہیں سکتی۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو اپنی کو جینا کو بھی مدعو کر لیا۔“

پادری صاحب کی کزن اپنے پرس کو جھلاتی رہی اور میری باتوں پر شکریہ شکر یہ کی چکر لگاتی اپنے بڑے سے چہرے کو اور برا کرتی رہی۔ پادری جی نے کہا ”اب چلنا چاہیے نہیں تو اور دیر ہو جائے گی۔“

میں نے پائلٹ جیسا انگوٹھا اٹھا کر کہا ”حاضر۔ تیار“ اور ٹانگ گھما کر اپنے سکوتر پر بیٹھ گیا۔ پادری جی نے کہا ”اور یا تاہمارے پیچھے بیٹھے گی۔“

میں نے کہا ”ٹھیک ہے جی، مجھے معلوم ہے۔“
کوئی تارک اندنیا، مرتاض پادری کسی بھی صورت میں کسی اکیلی عورت کے ساتھ اکیلا کوئی رابطہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کو درمیان میں تلوار رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ طعن اغیار کا نشانہ بھی بن جاتا ہے اور اس کی جواب طلبی بھی ہو جاتی ہے۔

پادری جی کی کو جینا میرے ساتھ، میرے سکوتر پر میرے پیچھے بیٹھی تھی اور ہم طرارے بھرتے چلے جا رہے تھے۔ پادری جی اپنا سکوتر ہم سے دور دور رکھ کر چلتے تھے حالانکہ اس خوف کی اب چنداں ضرورت نہ تھی۔ عورت تو میرے ساتھ تھی اور پادری صاحب کا اس سے کوئی علاقہ نہ تھا لیکن وہ پھر بھی الگ الگ سے جا رہے تھے۔

اونچی زمین اور زمینوں کے لاتناہی درختوں کی جدولوں میں ہمیں ایسے مقام کی تلاش تھی جو بالکل الگ تھلک ہو اور دور سڑک سے گزرتی ہوئی کوئی سواری یا سوار نظر نہ آئے۔ ہم دور سے آنے والے کو دیکھ سکیں لیکن کوئی ہمیں قریب سے آ کر بھی نہ دیکھ سکے۔ جلد ہی ایسی جگہ کا انتخاب ہو گیا اور ہم نے سکوتر سے سامان اتارنا شروع کر دیا۔

جب ہم تینوں نے اپنے اپنے سینڈوچ کو کھپکھپائی دندی کاٹی تو پادری جی نے مجھ سے پنجابی میں کہا ”میں اک خاص وجہ پاروں اور یا نانوں اتھے بلایا اے عی ابدھے نال اوہ نیڑا نیڑے جیو ہا ایدھی ماں تے ماسے نے ساڈے گل پایا ہونیا۔“

مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ پادری صاحب کا اپنی کو جینا سے یا اس کی ماں اور ماموں سے کوئی جھگڑا ہے۔ انہوں نے پہلے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ اس کے بیڑے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

جب میں نے ان سے اس جھگڑے کی تفصیل پوچھی تو انہوں نے کہا ”نیپلز کے قریب ایک گاؤں میں ہمارا ایک جدی مکان ہے۔ مکان کیا ہے ایک بڑی سی قدیم جوہلی ہے جو میرے پڑدادا نے اٹھارہویں صدی کے شروع میں بنائی

ریڈ پوٹر انسٹیشن ختم ہوتے ہی میں دود و بیڑھیاں پھلانگتا سنوڈیو سے نیچے اترا اور سکوتر فل سپیڈ پر دوڑاتا، جھلاتا، موڑ کا ٹائپس سٹاپ پر پہنچ گیا۔ پادری صاحب سائیکل پر اپنے نیلے جرمس سکوتر پر میرا انتظار کر رہے تھے اور ان کے کیریز پر ایک بڑی سی نوکری بندھی تھی۔ انہوں نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا ”کمال کر دیا، بڑی جلدی پہنچ گئے!“
میں نے کہا ”سڑکیں ویران تھیں، نیلگی پٹرول سے بھری تھی۔ سکوتر کل ہی سروس ہو کر آ یا تھا۔ میں نے کلی دبا دی اور اپنے اندازے سے بھی پہلے یہاں پہنچ گیا۔“

انہوں نے مسکرا کر نوکری کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ اس میں ساری چیزیں تقریباً میری مرضی اور میری پسند کی ہیں اور جو سینڈوچ پادری صاحب نے خود تیار کیے ہیں، ان میں بھی ایک چھٹا کاو یا کر دیا ہے، گو چھٹا بہت برا ہے اور کاو یا کر بھی دوسرے درجے کی ہے، یعنی ایرانی نہیں۔

میں نے گھڑی دیکھ کر کہا ”اب چلیں پادری جی، پھر بڑی دیر ہو جائے گی۔ اٹھائیس کلومیٹر کا فی ہوتے ہیں۔“
انہوں نے مسکرا کر کہا ”بس ابھی چلتے ہیں، دس پندرہ منٹ کے اندر۔“ پھر وہ زار سا آگے ہو کر ہسٹو کو آتے جاتے دیکھنے لگے اور وقت گزرنے کے احساس سے ذرا سے بے چین بھی ہو گئے۔

میں بس سٹاپ شیلٹر سے ڈھونگ کر سکر بیٹھ بیٹھ لگا۔
جب چھتیس نمبر کی بس چھوٹی چھوٹی کر کے اپنے دروازے کھلتی، بس سٹاپ پر آ کر رکی تو پادری جی بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھے اور سواریاں اترنے والے دروازے کے پاس باادب کھڑے ہو گئے۔ اندر سے پرس جھلاتی اور پورے دہانے سے مسکراتی ان کی کو جینا برآمد ہوئی۔

پادری صاحب سائیکل کی کو جینا کو میں نے پہلے بھی تین چار مرتبہ دیکھا تھا لیکن اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اس کا چہرہ سا ہیوال کی بکری اور کاٹھیاواڑی گھوڑی کے چہروں کا امتزاج تھا اور اس کے بال ہر وقت جڑے جڑے سے رہتے تھے۔ بات تو ٹھیک ٹھاک کرتی تھی مگر ہر فقرے کے آخر میں ایک ایسا جھلکا تھا جس سے انداز ہوتا تھا کہ دماغی توازن ہے تو ٹھیک مگر کبھی کبھی ٹھونگا مار جاتا ہے۔ ہنستی بہت تھی اور یوں لگتا تھا کہ اگر اس قدر ہنستی ہے تو پھنستی بھی ضرور ہوگی!

پادری صاحب کی کزن مجھے کچھ زیادہ پسند نہ آئی لیکن میں نے اپنے چہرے پر کسی قسم کے اظہار کے آثار پیدا ہونے نہیں دیے۔ بس پادری صاحب اور ان کی کزن کے درمیان مسکراتی رہا۔ لیکن ایک مرتبہ جب وہ بھرگرمیوں میں پادری جی سے ملنے ہمارے دفتر آئی تو میں اس کے صوفیہ لورین والے بدن کی ساخت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اب تک تو میں اسے سمور کی بیٹی والے لمبے کوٹ میں ہی دیکھتا رہا تھا مگر اب جو وہ کچھلی اتار کر آئی تو میں نے اس کی ساری صورتی خامیوں کے باوجود صدق دل سے اسے معاف کر دیا اور کرسی کھینچ کر قریب سے اس سے باتیں کرنے لگا۔

اب وہی گرمیوں والی کو جینا ہلکا سا ہاتھ ہلاتی بس سے برآمد ہوئی اور میرے ساتھ مصافحہ کر کے اس روز کی گرمی کا ذکر کرنے لگی جو واقعی معمول سے زیادہ تھی۔ پادری جی نے قریب آ کر کہا ”میں نے سوچا اور یا تا کو بھی پکک پر لے چلیں۔ اس لیے میں نے اسے بھی فون کر دیا۔ سارا دن گھر پڑی رہتی ہے۔ پہلے پینٹنگ کیا کرتی تھی، اب اس نے وہ بھی

نے میری طرف اشارہ کر کے کہا ”اس کے سامنے نہیں کر سکتے یہ ضروری بات۔“
 ”نہیں بالکل نہیں۔“ انہوں نے غصے سے پیر شیخ کر کہا ”یہ ہمارا گھریلو معاملہ ہے اور ہمارا خاندانی تنازعہ اس میں نہ تو کسی کو شریک کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی کے سامنے اظہار کیا جاسکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اور یانا نے آہستگی سے کہا اور وہ دونوں زیتون کے خط کشیدہ بیڑوں کے پیچھے چلے گئے!
 گھریلو ڈرامے بھی عجیب دوڑنے ہوتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے کھیلے نہیں جاتے۔ لوگوں کو دکھائے نہیں جاتے۔ ان کی الجھنیں اور پیشیاں پردہ میں ظہور پذیر ہوتی ہیں سب کے سامنے نہیں۔ لیکن انہی گھریلو معاملات میں الجھے ہوئے لوگ جب ایک ایک کر کے اپنے دوستوں یاروں، بہنوؤں اور ہمدردوں سے ملتے ہیں تو تمام واقعات بلا کم و کاست ان کے سامنے پیش کر کے ان سے سہارے کے منتہی ہوتے ہیں۔ لوگ عملی طور پر تو کوئی مدد نہیں کرتے البتہ ان کے پاس ”اے ہائے“ ”تو بہ تو بہ“ ”تھو تھو“ ”صریح زیادتی“ ”ظلم و ظلم“ ”لعنت لعنت“ ”شیم شیم“ کی چھوٹی چھوٹی بیڑیاں ہوتی ہیں جنہیں وہ متعلقہ شخص کے سامنے بچھا کر اس کے بیان کو مناسب بیڑی پر بٹھائے جاتے ہیں۔ لوگ ان سہاروں کو عملی مدد کے مطالبے میں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ عملی مدد میں تو کوئی نہ کوئی غلطی بھی ہو جاتی ہے، زبانی تھاپڑے میں کسی قسم کی کوئی گستاخی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔

جب بہت دیر ہو گئی تو مجھے ذرا سی پریشانی لاحق ہوئی۔ میں نے پینک کا سامان اکٹھا کر کے اپنی دانش کے مطابق کچن کیا اور پھر اسے نوکری میں ڈال کر اوپر چھوڑا چادر کی گدی جمادی۔ نوکری گود میں چھوڑ کر میں ان کی تلاش میں نکلا تو مجھے کچھ زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔

پادری صاحب ایک کھال میں اپنی کوچینا کو لٹا کر اسے پرات کے آٹے کی طرح گوندھ رہے تھے اور اس پر دو ہاتھ ہاتھوں کے کچے چلا رہے تھے۔ پادری میرا بار تھا اور میں حویلی کے معاملے میں پورا پورا اس کے ساتھ تھا لیکن دیوانی معاملے میں کسی کے ساتھ فوجداری کرنا اور اس پر جسمانی تشدد کر کے اپنی راہ پر لگانا مجھے پسند نہ تھا۔ میں اور یانا کو اس بھاری جسم کو دوڑتے بچانے کے لیے آگے بڑھا تو مجھے فوراً پلٹ کر بجلی کی سی تیزی سے اس پینک مقام پر پہنچ جانا پڑا جہاں میں نوکری پیک کر کے چھوڑ آیا تھا۔ میرے اندر مہینوں کی جمع شدہ خالص رومانی گیس جسم کے ساتوں سوراخوں سے لیکر نکلنے لگی اور جب وہ دونوں واپس میرے پاس پہنچے تو میں ویسا ہی تودے کا تودہ بیٹھا تھا جیسا سانا مارا یا مجھ دے کے اندر سے نکلنے والے تھے۔ بے جان اور غیر ذی روح!

تھی۔ وہ حویلی چلتے چلتے کسی طرح سے اور یانا کی ماں اور اس کے باپ کے قبضے میں آ گئی۔ ہم سب، اس حویلی کے اصل اور جائز وارث، اپنے اپنے کاموں سے ملک کے دوسرے حصوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہم نے اس تاریخی مکان کو بغیر کسی کرائے یا معاوضے کے اور یانا کے باپ کی نگہداشت میں دے دیا۔ جب تک تو وہ زندہ رہا، اس حویلی کی سہ ماہی رپورٹ کاربن پیپر رکھ کر ہم سب کو بھیجتا رہا لیکن جب وہ فوت ہوا تو میری اس کوچینا کی ماں نے اپنے بھائی کو اپنے پاس بلالیا اور بلڈنگ کی نگہداشت اس کے حوالے کر دی۔ اس نے ہماری حویلی میں غشکی کرایہ دار بٹھالیے اور اندر مچن میں نیل کی ایک بھٹی لگالی۔ اب وہ اس سے کافی پیسہ کماتا رہا ہے اور ہماری جائیداد کو نقصان پہنچاتا رہا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اپنی ماہ بہ ماہ یافت سے ہم کو کوئی حصہ نہیں دیتا۔ اب اس جائیداد کے دوسرے وارثوں نے مقدمے کے کاغذات تیار کر لیے ہیں، صرف میں نے انہیں مقدمہ دائر کرنے سے روکا ہوا ہے۔“

”اور اس کی ماں؟ آپ کی کوچینا کی، وہ کیا کہتی ہے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”اس نے کیا کہنا ہے۔“ پادری صاحب نے کہا ”وہ اپنے بھائی کے پیچھے لگی ہوئی ہے، جو کچھ وہ کہتا ہے اسی پر عمل کرتی ہے لیکن آج میں اس سے فیصلہ کر کے چھوڑ دوں گا۔“ انہوں نے قدرے غصے سے کہا ”یا تو وہ ہماری حویلی سے کنارہ کش ہو جائیں گے نہیں تو ہم ان پر نالاش کر دیں گے۔“

میں نے ہاتھ ہلا کر کہا ”تاں تاں پادری صاحب ایسے نہ کرنا، اس سے دلوں میں جسے پڑ جاتے ہیں اور معاملات ہمیشہ کے لیے خراب ہو جاتے ہیں۔“

ہماری گفتگو میں گرجوٹی کا ذرا تیز عنصر دیکھ کر پادری صاحب کی کوچینا نے گھبرا کر کہا ”تم دونوں کیا باتیں کر رہے ہو اور کس زبان میں کر رہے ہو؟“

پادری جی نے کہا ”ہم مذہب کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں اور پنجابی میں کر رہے ہیں۔ اشفاق یسوع مسیح کو خداوند پاک کا بیٹا نہیں سمجھتا اور میں اس کو سمجھا رہا ہوں۔ قائل کر رہا ہوں کہ حضرت مریم یسوع کی والدہ تھیں اور خداوند قدوس اس کے والد تھے۔“

اس نے کسی قدر حیرت سے میری جانب دیکھا اور آنکھوں میں آنکھوں میں کہا ”تم بھی کیسے گدھے ہو جو ایک حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہو!“

پھر ہم کھانے پینے اور موج میلہ کرنے لگے۔ میں نے اور اور یانا نے بہت اونچی آواز میں ایک ڈسٹ گایا جو ان دونوں بہت ہی مقبول تھا اور جس کے توے دکانوں پر پہنچتے ہی بک جاتے تھے۔ ہمارے گانے اور شور مچانے کے دوران پادری جی بالکل خاموش رہے۔ ان کو ایسے ہلے گئے اور دھینکا مشتی میں شامل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ویسے وہ لگ چھپ کر اور کپڑے تبدیل کر کے ایسی محفلوں میں ضرور شریک ہو جاتے ہیں!

جب میں قہر موم سے گرم گرم اسپر یو کی دوسری پیالی نکال رہا تھا تو پادری جی اٹھ کر کھڑے ہو گئے انہوں نے اپنی کوچینا سے کہا ”اور یانا ذرا میرے ساتھ ادھر چلو، تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔“ اور یانا اٹھ کر کھڑی ہو گئی لیکن

کہ مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ امید ضرور تھی کہ میرا یہ عارضہ آہستہ آہستہ دور ہو جائے گا اور طویل صحبت کی بنا پر مجھ میں یہاں کی توانائیاں در آئیں گی اور میں موجودہ تقاضوں کے مطابق رو بہ صحت ہو جاؤں گا لیکن ابھی وہ وقت دور تھا۔ کافی دور اور مجھے صبح و شام ایسے انکشن کی ضرورت تھی جو دیدانت، روحانیت، تصوف وغیرہ کے چالوں کو ذہن سے صاف کر کے مجھے ایک نارمل انسان بنا سکے۔

اب سوچتا ہوں تو اس معمولی سے واقعے پر ڈھیر ساری ہنسی آتی ہے۔ کچھ بھی نہیں تھا اور میں نے کیسارائی کا پرہیز نہ کیا تھا۔ لیکن شاید اس کی ایک وجہ تھی۔ میں اپنوں سے دور تھا اور اس قدر اکیلا تھا کہ تنہائی نے مجھے خوفزدہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ دفتر میں، یونیورسٹی میں اور ریڈیو پر تو اچھا وقت گزر جاتا لیکن اس کے بعد کی طویل مدت اور تنہائی کا وقت اور لمبی راتیں کافی مشکل سے گزرتیں۔

پادری سائمنٹلی کا واقعہ بالکل خواہناو، اپنی مرضی سے اور بلا شرکت غیرے میری جان کا عذاب بن گیا تھا۔ وہ بات جس سے مجھے لطف اندوز ہونا چاہیے تھا، مزالینا چاہیے تھا۔ جسے ادھر ادھر بنا کر دماغ طلب کرنی چاہیے تھی، وہ الٹا میرے گلے کی پھانس بن گیا تھا۔ ویسے اسے بننا بھی چاہیے تھا کہ ہم ایک اور ڈرامہ میں پلے بڑھے تھے اور ہم نے ایک اور تناظر میں اب تک کی زندگی بسر کی تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے ہمارے قصبے کستور میں گھڑسوار پولیس کا ایک دستہ سوڈھی کرپال سنگھ کی حویلی میں آ کر متمکن ہوا۔ ہم سکول کے بڑے لڑکے گھوڑوں کو دیکھنے کے لیے حویلی کے بڑے دروازے پر جمع ہو گئے۔ بارہ خوبصورت، صحت مند اور چمکدار گھوڑے اپنے اپنے تھان پر بندھے تھے اور ان کے منہ پر خوراک کے بھاری توبڑے پڑھے تھے۔ جب وہ اپنے سر جھٹکتے کر اور تھیں تو بڑے کی دیواروں سے مار کر اپنے راتب کو اندر ہی اندر منہ میں پکڑتے تو ان کی آنکھوں میں اطمینان کی ایک غنڈی سی لہر دوڑ جاتی۔

گھوڑا اور ہاتھی دو ایسی شاہی سواریاں ہیں کہ انسان اگر ان کو گھنٹوں دیکھتا رہے تو اس کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ سال کے سال جب ہمارے ماگھی کے میلے پر بڑا سرکس آتا تو ہم سکول جانے کے بجائے بڑے تینو کے پیچھے ان چھو لدا ریوں میں پہنچ جاتے جہاں گھوڑے بندھے ہوتے اور ان کے بالکل ساتھ، ایک پردے کی اوٹ شیروں، ہانکوں اور بکھیروں کے بدبودار بچھرے ہوتے۔

ہاتھی باہر کھلے میں کھڑے سوکھی چربی، کما دے آک اور درختوں کے جھاڑ اپنے اپنے زانوؤں پر چمڑک جھٹک کر نہ نظر آنے والے منہوں میں ڈال رہے ہوتے۔ ان کے اگلے پیروں میں لوہے کے بڑے بڑے کڑے موٹے موٹے سنگھوں سے ویلڈ کیے ہوتے اور یہ سنگل زمین میں گہری گڑی پلٹیں اور لوہے کے کھنٹوں سے بندھے ہوتے۔ ہر شخص جو ان ہاتھیوں کا نظارہ کرنے لحد بھر کو بھی وہاں رکتا وہ قریب کھڑے آدی سے یہ ضرور کہتا کہ ہاتھی بھائی جو ہر لمحہ جھاڑ جھٹک کر منہ میں ڈالتے ہیں تو چیونٹی سے خوفزدہ ہیں۔ اتنے بڑے جانور کو اک ذرا سی چیونٹی آن واحد میں ڈھیر کر سکتی ہے۔ وہ سوئڈ کے راستے ہاتھی کے دماغ میں پہنچ کر ایک ایسے مقام پر کھاتی ہے جو ہاتھی کا نازک ترین مقام ہے اور جہاں ہیرا من طوطے کی

(3)

چھبیس برس کے ایک نا تجرب کار نوجوان پر جب اس قسم کی افتاد پڑتی ہے تو اس کے دماغی نتیجے ہر آمد ہوتے ہیں یا تو وہ بے راہ رو ہو کر عمر بھر کے لیے بھٹک جاتا ہے یا پھر اس میں بے یقینی، بے اعتمادی اور بے عملی کی ایسی بھڑکی لگ جاتی ہے جس سے ہر مشکل موسم میں حزن و ملال، خوف و ہراس اور تشویش و خفاصت کی ناقابل برداشت فصلیں تیار ہونے لگ جاتی ہیں۔ ایسے اکھڑے اور بد کے ہوئے بکھیرے سیدھی راہ اختیار کرنے کے بجائے تھان پر کھڑے کھڑے کانپ کانپ کے جان دے دیتے ہیں۔

ایسا تو کوئی مہلک حادثہ یا جان لیوا واقعہ نہیں گزرا تھا لیکن میرا اپنے بڑوں اور پاکیزہ ہستیوں پر سے ایمان اٹھ گیا تھا۔ وطن سے دور، گھر سے دور، اپنے عزیز واقارب سے دور، ساتویں منزل پر اکیلے کمرے میں رہتے ہوئے مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ گھر والے بھی جھوٹے ہیں، باہر والے بھی مکار ہیں، پاکستان بھی دھوکا ہے، ولایت بھی فراڈ ہے۔ ساری دنیا دغا باز ہے اور ہر شخص جھلسا ہے۔ دین، مذہب، تصوف، روحانیت سب انسانی جھٹکنڈے ہیں جو اس نے اپنی فریب کاریوں کے لیے تیار کر رکھے ہیں۔ جہاں جہاں ضرورت پڑتی ہے اور جب جب موقع آتا ہے، انسان اپنا کام دکھا جاتا ہے اور ہر کام پر جھوٹے دعوؤں کی مہر لگا جاتا ہے۔

وہ محفلیں اور وہ نشستیں جو ہم ہفتہ میں دوبار بڑے انہماک سے جمایا کرتے تھے، میری وجہ سے بے قاعدگی کا شکار ہو گئیں۔ لوچا نا کو مجھ سے ایک بھر پور شکایت تھی کہ میں مزاجاً ایک محفل کش آدمی تھا۔ رونق میلے میں حاضر ضرور ہوتا تھا لیکن اس کا حصہ نہیں بنتا تھا۔ جدھر کو سب کا رخ ہوتا، اس سے دوسری طرف منہ کر کے بیٹھتا تھا اور اپنا آپ پورے کا پورا دوستوں کے حوالے نہیں کرتا تھا۔ اید اور آنا کہتی تھیں، ہم عورت ہو کر اپنا آپ پورے کا پورا یاروں کے حوالے کر دیتی ہیں، تم مرد ہو کر اس قدر حسابی کتابی ہو، کیا ہو گیا ہے؟

اب اگر میں ان کو بتاتا کہ کیا ہو گیا ہے تو وہ سب لوگ بھی پرہیزتے۔ مجھی کو نا سمجھ، پسماندہ اور پینڈ و گردانے اور میری ذہنی اور فکری پستی پر تنقید کرتے۔ لیکن اس میں میرا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ میری تربیت ہی ایسے ماحول میں ہوئی تھی

طرح اس کی جان ہوتی ہے۔ چیونٹی کی پہلی دندی کاٹنے سے ہی ہاتھی ایک چیخ مارتا ہے اور دھاڑ کر زمین پر گر جاتا ہے۔ دوسرا سانس نہیں لیتا اور اس کی لاش زہر سے پھولنے لگتی ہے۔ ہاتھی کے اتنے بڑے دماغ پر اس کے نازک ترین حصے کا صرف چیونٹی کو علم ہے اور چیونٹی کو دیکھ لیجئے، نظر ہی نہیں آتی۔ اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔

ہم سکول کے لڑکے سارا سارا دن ہاتھیوں کے قریب اس آس میں کھڑے رہتے کہ شاید ہاتھی اگلا قلعہ زانو پر مار کر جھاڑ نادر جھٹکنا بھول جائے۔ اس کے اندر چیونٹی ہو اور چیونٹی سوڈ کے اندر چلتی چلتی اس کے دماغ میں پہنچ جائے اور اس مقام مخصوص پر کاٹے جہاں ذرا سی دقتی کٹنے سے ہاتھی دھاڑ کر گرتا ہے۔ لیکن ایسا کبھی ہوا۔ میں نے اور میرے سکول کے دوستوں نے کوئی دس سال تک، ہر میلے پر، اس واردات کا انتظار کیا لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ ہاتھی آتے رہے اور جاتے رہے۔ کئی مرتبہ چیونٹیوں کے بھون کے پاس بھی بندھتے رہے لیکن ہماری حسرت کسی صورت بھی پوری نہ ہو سکی۔ کوئی چیونٹی ہاتھی کے دماغ میں مقام مخصوص تک نہ پہنچ سکی۔ اس کی کھردری جلد میں اثر کر دینے والے اور پیشے کتر سے ضرور نکال لاتی رہیں اور اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ ضرور پالتی رہیں۔

ہاتھی عجیب الخلق، قوی الجذہ اور عظیم البہت ضرور تھے لیکن انہوں نے کبھی مجھے زیادہ دیر تک اپنی طرف متوجہ نہیں کیا تھا۔ مجھے گھوڑے زیادہ پسند تھے۔ ان کے جسموں اور ان کے دانے کی خوشبو، قطار میں بندھے ہوؤں کا ایک مجموعی ڈسپلن، پھر ہر ایک کا اپنا اپنا ٹھانڈا اور اپنی اپنی شخصیت، ہر ایک کا اپنا انداز اور اپنا غرہ، مختلف قد، مختلف لون، مختلف چہرے، خوبصورت بدن، معتبر وجود، شہزادیوں کا حسن اور ماڈل گرلز کی سی دعوت نگارہ۔ چڑھے ہوئے پٹھے، جھومتی ہوئی ایال اور پھرتی ہوئی کنوتیاں، ساغر سم، لمبی گاچی، ستا ہوا چہرہ، ہر دقت مستعد، ہر گھڑی تیار اور ہر لمحہ بالما حظ ہوشیار۔

گھوڑے اور انسان کا تعلق بڑا پرانا ہے۔ میرا اور گھوڑے کا رشتہ بھی بڑا پرانا ہے۔ ہم نے کئی جنگیں جیتی ہیں۔ کئی معرکے سر کیے ہیں، کئی میدان مارے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھی اور ایک دوسرے کے غمخوار ہیں۔ ہم دو مختلف (SPECIES) ہیں لیکن ہماری سانسیں ایک ہے۔ تاریخ کے لمبے دور میں ہم نے جسمانی، روحانی اور اخلاقی طور پر ایک دوسرے کا بڑا ساتھ دیا ہے۔ انسانوں نے گھوڑے کی خاطر سفید قام محبوباؤں اور سیاہ چشم باندیوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وسیع سلطنتوں اور شاداب علاقوں کو منظور نظر گھوڑوں کی خاطر چھوڑ دیا۔ گھوڑوں نے اپنے بستے رستے جنگلوں، پہاڑوں اور ہری بھری گھاٹیوں میں اپنی دل و جان سے پیاری کا بھین ماداؤں کا ساتھ چھوڑ کر شہسواروں کی سنگت اختیار کر لی تھی۔ جنگلوں میں اپنے پیاروں سے یاری نبھائی تھی۔ اتہاسی پنڈت کہتے ہیں کہ سنسار میں جتنی بھی جنگیں ہوئیں، سوراؤں کے مقابلے میں گھوڑے زیادہ مارے گئے۔ تیری جے ہو تیرے انوراگیوں کی جے ہوا

ہنجاہ میں جب کوئی علاقہ جرائم پیشہ لوگوں کا گڑھ بن جاتا تھا اور اس کے گرد و نواح میں جرائم تیزی سے پھیلنے لگتے تھے تو انگریز سرکار وہاں گھڑسوار پولیس کا ایسا خصوصی دستہ تعین کر دیتی تھی جو متاثرہ علاقوں میں راؤنڈ کر کے یا تو جرائم پیشہ لوگوں کو وہاں سے بھگا دیتا یا ان کو اپنا روڈ بلیڈرل کرنے پر مجبور کر دیتا۔ گھڑسواروں کے اس دستے کو ”ڈرلی جھتہ“ کہہ کر پکارتے تھے اور اس کے سارے جوان میانوالی کے پٹھان یا اعوان ہوتے تھے۔ خوبصورت سیاہ داڑھیوں اور تیل لگے پٹوں

والے سپاہی۔ ہیڈ کانسٹیبل اور حوالدار۔ گھڑسواری کی وجہ سے یہ لوگ خاکی برجس پہنتے تھے۔ پنڈلیوں پر سیاہ چڑے کے مضبوط دلائی گاڑے، بدن پر ٹول سے موٹی اور زین سے قدرے پتلی پوری آستھیوں کی خاکی قمیص، کمر پر کالی سیاہ لس کرتی جینی، جینی کے آنکڑے میں پھنسی ہوئی دلائی دسل، سر پر طرے دار پگڑی اور پاؤں میں موٹے چڑے کے سیاہ بوٹ، کندھے سے گزرتی ہوئی چڑے کی ایک براؤن جینی تھری ناٹ تھری گولیوں سے بھری ہوئی۔ اسی جینی کے آخر میں خاکی رنگ کی ڈوری، انگریزوں کے آٹھے جیسے سلیقے کے ساتھ لپٹی ہوئی، مضبوط اور کافی لمبی۔

زین کے پیچھے سفر میں کام آنے والی ضرورت کی مختصر سی چیزوں کا پٹو اور زین کے بائیں جانب پتھر جیسے مضبوط چڑے کی ایک کھلی سی میان۔ اس میں نال کے بل کھڑی تھری ناٹ تھری کی رائفل، دستہ باہر باقی ساری رائفل مستور۔ کاٹھی کی دائیں طرف سواری پٹھ کے پیچھے، ایک مضبوط سے ہک میں فٹ نیلگوں سپاٹ کی جھٹھڑی!

گھوڑے کے منہ میں سیدی راڈ کا دہانہ، ٹھوڑی پیچھے سفید دھات کی موٹی زنجیر، دہانے میں ریشم جیسے چڑے کی ڈبل راس، چاندی جیسی رکائیں اور سوار کے فل بوٹ پر چاندی جیسی سیدی ہمیز کسی ستارے بھری کٹارے کے بغیر۔

کیل کاٹنے سے لیس، سچے سچے بارہ بھاری بھر کم تھارو بریڈ گھوڑے ڈکلی چال کی ٹاپ دیتے جرائم گمر کا رخ کرتے تو سارے علاقے میں اونچی آواز میں خبر پھیل جاتی ”ڈرلی جھتہ آگیا! ڈرلی جھتہ آگیا!“ بھاگنے والے بھاگ جاتے، چھپنے والے چھپ جاتے۔ سفید پوش نمبر دار استقبال کے لیے باہر نکل کر گاؤں کے دہانے پر کھڑے ہو جاتے۔ عورتیں ڈرلی جھتہ کے جمال کا نظارہ کرنے پھتوں پر چڑھ جاتیں۔ لڑکے بالے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ بھاگنے کے لیے دو دو یہ کھڑے ہو جاتے۔

ڈرلی جھتہ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ایک ایک راؤنڈر فل کا چلاتا اور پھر کہنے سنے، بولے چالے بغیر گاؤں کے اندر گھوم کر ان آماجگاہوں کی طرف نکل جاتا جہاں اس کے خیال میں ڈکیت، بد معاش، رہزن اور تھیا چاری چھپے ہوتے لیکن ان کے آنے سے پہلے ایسی ساری آماجگاہیں سنسان اور ویران پڑی ہوتیں۔

ڈرلی جھتہ کے لوگ جس جگہ قیام کرتے تھے وہاں کسی سے ملتے نہیں تھے۔ روسائے شہر، والیان جاگیر، صاحبان جائیداد، علاقے پر گھنے کے دوسرے لوگ ان کے ساتھ بات چیت کرنے، میل جول بڑھانے اور ربطا بھمی پیدا کرنے کے بڑے خواہش مند ہوتے مگر یہ ان کو سلام سلام کر کے ہاتھ ہلاتے، مسکراتے گزر جاتے، گھوڑا روک کر بات نہ کرتے۔ تھانے کی نفری اور ڈرلی جھتہ کے جوانوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ دونوں ایک ہی جگہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک ہی ایس پی کے ماتحت تھے۔ ایک ہی جگہ سے ان کی تنخواہیں آتی تھیں۔ ایک سی ڈیوٹی تھی مگر ڈرلی جھتہ کا حوالدار نہ تو تھانے جاتا تھا اور نہ کبھی تھانیدار سے ملتا تھا۔ بس ایک پہلی تاریخ کی مجبوری تھی کہ ان کی تنخواہ کی تھیلی خزانے کا فوطے دار سر بھر کر کے تھانے بھجواتا تھا اور حوالدار صاحب کو وہ تھیلی اسی تھانے سے آکر لینا پڑتی تھی جس علاقے میں ان کا جھتہ قیام پذیر ہوتا تھا۔ چونکہ ڈرلی جھتہ کا واحد مقصد علاقے میں امن قائم کرنا ہوتا تھا۔ ایف آئی آر کاٹنا اور زمینیاں بھرنانہیں ہوتا تھا، اس لیے ان پر ہر قسم کی رشوت کے دروازے آپ سے آپ بند تھے۔ اس

لیے جتھے کے سارے جوان شام کو گھڑے بنیو پر میانوالی موسیقی کی دھنیں بجایا کرتے تھے جو پشتو، سرانگی اور پنجابی کے استراچی حسن سے مالا مال ہوتی تھیں۔

جس درلی جتھے نے میری روح اور میرے دل کے سویدہ پر اپنا بھرپور دار کیا، اس کا حوالہ درسیہ پٹوں اور چھوٹی سی کالی داڑھی والا ایک دراز قد نو جوان سمند خان نیازی تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے سات آٹھ سال بڑا ہوگا۔ تقریباً میرے جتنا ہی پڑھا ہوگا اور کچھ میرے جیسے حالات و واقعات سے گزرا ہوگا لیکن ایک نہایت ہی ذمہ دار پوسٹ پر ہونے اور بارہ منہ زور جوانوں کو کمانڈ کرنے کی وجہ سے اس میں مقدونیہ کے سکندر جیسا حسن پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جابر نہیں تھا مگر ٹھوڑی ضرورت سے زیادہ اوپر اٹھا کر چلتا تھا۔ منکبہ نہیں تھا لیکن کم آمیز اور کم گو تھا۔ نامزد نہیں تھا لیکن عورتوں کی طرف گردن گھما کر نہیں دیکھتا تھا۔ مجھے تو اس نے بالکل ہی مار دیا!

مجھے کیا ہمارے شہر کے سارے بزرگوں پر سمند خان نے ایسا دار کیا کہ کوئی بھی جابر نہ ہو سکا۔ بڑے بڑے کلغیوں والے سوڈھی سردار تھے۔ روپ وان مان گھرانہ تھا۔ پھر لمبی چوڑی جاگیروں اور پرگنوں والے بیدی سردار تھے۔ اس علاقے کے جدی پشتی مالک لیکن سب سمند خان نیازی سے ہاتھ ملانے، سلام کرنے اور فتح بلانے میں پہل کرتے تھے۔ وہ بھی دونوں ہاتھوں سے ہاتھ ملا کر اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر کھڑا ہو جاتا۔ غور سے بات سنتا لیکن جواب دینے میں ہمیشہ کسر نفسی سے کام لیتا۔ ”ہاں جی“ ”ناں جی“ کہہ کر بات ختم کر دیتا۔ ڈانچوں پر چڑھتی اور بھلیوں سے نکلتی سردار زادیوں نے کبھی کسی سے ذکر تو نہیں کیا لیکن اپنی نوکرائیوں کی زبانی سمند خان اور اس کے درلی جتھے کے بہت سے قصے سن کر انہیں گھول کے پھیلا کر تھا۔ میرا خیال ہے اتنی باتیں شہزاد کے زمانے میں الف لیلہ کی بھی نہ ہوتی ہوں گی جتنے قصے ہمارے شہر سکستر میں درلی جتھے کے ہوتے تھے۔

میں آٹھویں پاس کر کے نویں جماعت میں داخل ہو گیا تھا اور میں نے اپنے طور پر ایک مرتبہ ”سرمایہ کرد“ ساری ختم کر لی تھی۔ حصہ نظم کی بہت سی چیزیں مجھے زبانی یاد ہو گئی تھیں اور میں اردو اور فارسی کے آخری پیریڈ چھوڑ کر کراچی کے کھلی حویلی پر گھوڑے دیکھنے آ جاتا تھا۔ حوالہ درسمند خان نیازی کے دو سپاہی اسحاق خان اور سر بلند خان میرے واقف بن گئے تھے۔ یہ دونوں پٹوں خیل قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بڑے عالی حوصلہ اور دلیر سپاہی تھے۔ تچا سنگھ ڈاکو کے ڈیرے کی چھت پر انہی دونوں جوانوں نے اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال کر تیجے کو اپنے ساتھیوں سمیت ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا تھا۔ ڈاکوؤں نے چھت کے نیچے سے گولیاں چلا کر ان دونوں کو زخمی بھی کیا لیکن یہ اپنے ارادے سے باز نہ آئے اور پھونس کے گٹھے اور سوکھی جوار کے پولے آگ لگا کر روشن دان کے اندر پھینکتے رہے۔

سمند خان نے اپنے دوسرے ساتھیوں سمیت ڈیرے کے گرد گھیر ڈال رکھا تھا اور وہ اپنے ہر نعرے کے ساتھ گھیرا تنگ کرتا جا رہا تھا۔ گھیرے کی تنگی اور دھوکے کی شدت سے تنگ آ کر تیجے ڈاکو نے اپنے چاروں ساتھیوں کی معیت میں ہتھیار ڈال دیئے۔

جب درلی جتھے کے سوار ان پانچوں ڈاکوؤں کو الٹی جھکڑی لگا کر گاؤں سے باہر ان کو اپنی حویلی پر لے جا

رہے تھے تو تیجے ڈاکو نے منہ اوپر اٹھا کر اونچی آواز میں حوالہ درسمند خان سے کہا ”اوائے پٹھاناں! کیسے ہم کو معافی مل سکتی ہے؟“

حوالہ دار نے گھوڑا روک کر کہا ”ماں کے بچے اور سورے مرد کے اس وعدے پر کہ آئندہ مخلوق خدا کو تنگ نہیں کرے گا اور داگوروا کال پر کھ کے نام پر سنتوں کی زندگی بسر کرے گا۔“

تیجے سنگھ ڈاکو نے کہا ”میں وعدہ کرتا ہوں اور یہ ایک مرد کا دوسرے مرد سے وعدہ ہے۔ ایک دھرتی سوار منکھ کا گھڑ سوار منکھ کے ساتھ۔“

مقدونیہ کے شہزادے نے پورا ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا ”سلطان خان تچا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی جھکڑیاں کھول دو اور ان کے ساتھ وہی سلوک کرو جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے کرنا چاہیے۔“

ڈاکوؤں کی جھکڑیاں کھول دی گئیں۔ حوالہ درسمند خان گھوڑے سے نیچے اترا۔ ہر ایک سے بغلگیر ہو کر ان کی پیٹھ ٹھوکی اور کہا ”میں بات اس لیے دہرا کر پکی نہیں کروں گا کہ یہ مردوں کا مردوں سے اور دلیروں کا دلیروں سے وعدہ ہے۔ وقت ملے تو ہمارے ڈیرے ضرور آنا۔“

درلی جتھے چلا گیا تو پانچوں ڈاکو بڑی شان سے گاؤں میں داخل ہوئے۔ لوگوں نے دھڑا دھڑاپے دروازے بند کر لیے اور کواڑوں کی جھریوں سے سنسان گلیوں کو دیکھنے لگے۔ ڈاکوؤں نے اپنی پٹھیاں اتار کر گلی میں ڈال لیں اور ہاتھ باندھ کر اونچے چوہاروں کے سامنے سر جھکا کر بولے ”ہم توبہ کرنے اور پنت میل کے لیے آپ کے دروازے آئے ہیں۔ جو کوئی دروازہ کھول کر ہم تریہاؤں کو پانی پلائے گا داگوروا کا بھلا کرے گا۔“

کرپونے گا گراٹھا کر اپنے استیجھا جیسے کوہلے پر رکھی اور بھڑا کر چمن سے دروازہ کھول کر نکل گئی۔ اس کا باپو کھلے دروازے میں کھڑا سر پٹتارہ گیا کہ ”ہائے میری کرپو گئی۔ میری کرپو اٹھ گئی۔ کرپو چکی گئی۔“

ڈاکوؤں نے نیم دائرے کی شکل میں زمین پر گھٹنے ٹیک دیئے اور پیاسے لبوں سے اوک لگا کر انتظار کرنے لگے۔ کرپو باری باری پانی کی دھار ہر اوک میں اتارتی گئی اور ان کے ننگی میں سر ہلانے پر گاگر کا منہ اٹھاتی رہی۔

ڈاکوؤں نے کہا ”بی بی ادا گوروتراست جگلوں میں بھلا کرے۔ ماں وڈیا یاں ارپن کرے۔ تیرے نام کی کلا جگے۔“

جب کرپو خالی گاگر لے کر واپس اپنے گھر میں داخل ہوئی تو اس کے باپو کے دروازہ بند کرتے ہی سارے گاؤں کے باسیوں نے اپنے دروازے کھول دیئے۔

یہ جو مقدونیہ کا شہزادہ ہمارے شہر میں آیا تھا تو اس پر صرف عورتیں ہی غش نہ تھیں بلکہ بڑے بڑے بزرگ مرد بھی اس کو بڑا مان دیتے تھے اور اس کے قریب ہو کر بیٹھنے کی خواہش کرتے تھے مگر ان سب کو مقامی لوگوں سے زیادہ اپنے گھوڑے پسند تھے۔ بیٹھ کر باتیں کرنے کے بجائے دوش پسند تھی اور گھومنے پھرنے کے بجائے ورد و خیفہ پسند تھا۔ درلی جتھے بھی عجب تھا اور درلی جتھے کے جوان بھی عجیب تھے۔ جس طرح درلی جتھے ایک صحیح کس لاسمعلوم سے برآمد ہو گیا تھا، اسی طرح ایک روز اپنا مشن پورا کر کے اسے واپس بھی چلے جانا تھا۔ کسی ناشاختہ اور ناشناس مقام کی طرف..... میرے خیال

میں درلی جتھ ایک حقیقت نہیں تھا، مایہا لوجی تھی!

بارہ کے بارہ گھوڑوں کے الگ الگ نام تھے۔ کسی کا دلیر، کسی کا بجلی، کسی کا جوجی، کسی کا ہیرا مگر سند خان کے کالے سیاہ شبرنگ گھوڑے کا نام دوسروں سے مختلف تھا۔ کاغذوں میں اس کا نام ہیچ فورڈ (Hitch ford) تھا اور وہ تھا روڈ بریڈ کی اس فیملی سے تعلق رکھتا تھا جس کے آباؤ اجداد آسٹریلیا کھیت کے تھے لیکن پھر نقل مکانی کر کے آئرلینڈ آ گئے تھے۔ سند خان نے اسے کبھی بھی اس کے اصل نام سے نہیں پکارا تھا ہمیشہ ”ہے گھوڑا“ کہہ کر آواز دیتا اور ہمیشہ اسی نام پر ہیچ فورڈ چہنبا کر اسے جواب دیتا۔

دو روپے تھا نوں پر بندے منہ زور اور مستعد گھوڑے اہلیق، ابرص، چنے، سرنگ، کیت اور شرٹے بادامی گھوڑے نہیں تھے، حسن کے جتنے تھے۔ ہر جوان اپنے اپنے گھوڑے کے کھریے، مالش، صفائی اور سنگار کا ذمہ دار تھا لیکن اپنے والے کے ساتھ ساتھ اس کی نظر دوسرے گھوڑوں پر بھی ہوتی۔ درلی جتھے کے گھوڑے تھان پر ننگے بدن نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ ہر ایک جسم پر نیلے رنگ کا بال پوش یا خاکی کپڑے کا جھول ہوتا۔ کہتے ہیں آنکھ کتنی بھی پاک کیوں نہ ہو گھوڑے کو سب سے پہلے نظر لگتی ہے۔ اس کے بعد بچے کو، پھر دلہن کو اور اس کے بعد پہلوان کو۔ سب کو اپنا آپ ڈھانپ کر اور بچا کر رکھنا چاہیے۔

جب حوالدار سند خان نیازی گھر معائنے کے لیے ہر گھوڑے کے پاس جا کر اس کے پٹھے پر گونجدار تھپکی دیتا اور پھر اس کی گردن چھو کر ہاتھ کی تھپک سے سہلاتا تو گھاس سے منہ اٹھا کر کنڈا کر کے گردن کو توس نما بنا لیتا۔ ہر گھوڑے کو پتہ تھا کہ حوالدار صاحب اس کے سوار کے پاس ہیں اور یہ سارا میلہ انہی کے دم قدم سے ہے۔ شام کو سارے گھوڑوں کی آنکھ سے اوچھل، حویلی کی ڈیوڑھی میں جب حوالدار صاحب مغرب کی نماز پڑھتے تو دعا مانگنے کے بعد چوکی سے اٹھ کر اونچی اور گونجدار میں لہرا کر کہتے:

والعدیت صبحانہ فاعلموینت قدحانہ قسم ہے ان فرمائے بھرتے سر پٹ دوڑتے گھوڑوں کی

قسم ہے ان کی (جو سوں سے ٹاپ مار کر) چنگاریاں چھوڑتے ہیں

اور صبح ہوتے ہی دشمن پر یلغار کر دیتے ہیں۔

اور اس سے ہر طرف گردوغبار ہی گردوغبار کر دیتے ہیں۔

اور یکا یک دشمن کے دل بادل میں جا گھستے ہیں

یہاں رک کر حوالدار صاحب فرش پر زور کا پاؤں مارتے اور ہاتھوں سے لپکتی تالی بجا کر اونچی آواز میں کہتے ”ہے گھوڑا“ تو بارہ کے بارہ گھوڑے اپنے دائیں سوں سے زمین کھدیز کر اس زور سے نہناتے کہ پورے شہر کے گھر لوٹے ہوئے پرندے ایک مرتبہ پھڑپھڑا کر پھر گھونسلوں سے نکل جاتے۔ حوالدار صاحب تالی بجا کر کہے جاتے ”ہے گھوڑا“ ”پاکباز گھوڑا“ ”معصوم گھوڑا“ ”سرشار گھوڑا“..... پھر وہ اچانک خاموش ہو کر کھلے چپلوں سے پاؤں نکال کر دو بارہ چوکی پر بیٹھ جاتے۔ ساری فضا خاموش ہو جاتی اور وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر جلال کے چمیل سلسلے سے جمال کی وادی میں داخل ہو کر

ایک اور ہی لحن میں پکار کر کہتے:

انسان اپنے رب کا بڑی ناشکر ہے

اور بے شک وہ خود بھی اپنی اس بات کو خوب جانتا ہے۔

اور بلاشبہ وہ مال سے سخت محبت کرنے والا ہے۔

کیا نہیں جانتے اس وقت کو جب قبروں سے مردے اٹھائے جائیں گے

اور سینوں کے سب راز ظاہر کر دیے جائیں گے

بے شک ان کا رب اس دن ان کے حال سے خوب واقف ہوگا۔

آخری آیت پر نو جوان سند خان نیازی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے بہنے لگتے۔ حالانکہ نہ وہ مال

سے محبت کرتا تھا، نہ اس کے پاس مال تھا اور نہ ہی اس کے سینے میں کوئی منفی راز تھا۔ وہ بس اپنے خدا کی بات سے اور اپنے

اللہ کے خوف سے روتا تھا اور اپنی چھوٹی سی سیاہ داڑھی کو آنسوؤں سے بھگوتا تھا۔

جس طرح دنیا بھر کے نورس بنگم پیلس پر گارڈز کی تبدیلی کا سماں دیکھنے آتے ہیں، اسی طرح میرے قصبے

کے ڈھیر سارے لوگ مغرب کے وقت حویلی کر پال سنگھ کے دروازے پر جمع ہو جاتے اور اس فینہ کرم ادھیائے کا انتظار

کرتے جس کی گونج بڑی سہادتی تھی۔

سند خان نیازی دراصل گھوڑے کو انسان ہی کا ایک روپ سمجھتا تھا۔ ایک باوقار اور جاں نثار انسان کا روپ۔

ایسا انسان جو سواری نہ ہونے کے باوجود غزوات میں شریک ہوا اور یکا یک دشمن کے دل بادل میں گھس گیا۔ حوالدار سند

خان کہتا تھا جس طرح ایک شہسوار گھوڑے کے بغیر شہسوار نہیں کہلا سکتا، اسی طرح ایک گھوڑا بھی سوار کے بغیر گھوڑا نہیں

ہوتا۔ ایک جانور ہوتا ہے۔ جنگلی جانور، چراگاہوں کا چریا۔ ایک بے قابو عفریت جس کے پاس اپنی بے راہ رودی کے

خلاف کبھی ہوئی راس یا چپٹی چھوڑ لگام نہ ہو۔ وہ بندہ کیا جو اپنی جبلت کے منہ میں کانٹے دار دہانہ دے کر گردن توڑاں نہ

کھینچ سکے اور وہ گھوڑا ہی کیا جو ”ہے گھوڑا“ کا کاشن سن کر انہی قدموں پر نہ رک جائے۔

ایک روز صبح کے وقت حوالدار صاحب اپنے ہیچ فورڈ کی بیری کر کے ہتی چڑھائے اس کی مالش کر رہے تھے کہ

میں سکول جاتا ہواڑک کر ان کے گھوڑے کو دیکھنے لگا۔ حوالدار صاحب نے اپنے محبوب کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے

والے کی طرح پیار بھری نظروں سے دیکھا تو میں نے ان کا قرب اور خوشنودی حاصل کرنے کو انہی کی طرح تالی بجا کر ویسی

ہی اونچی آواز میں کہا:

پیکاں میں یا کنوتیاں ہنگام دار و کیر

حلقے سے یوں لٹکتا ہے جیسے کمان سے تیر

چالاکیاں بھی عقیف بھی، غربت بھی جنگ بھی

بالادری براق کی دلدل کا ڈھنگ بھی.....!

حوالدار صاحب نے داد دینے کے انداز میں زڑہ پھینک کر ”ہے گھوڑا“ کہا تو بیچ فورڈ والیوم کا شن کو جان کر اور مالک کو قریب پا کر ہلکے سے ہنہنایا اور گردن گھما کر اپنا بوتھا مالک کے مونڈھے پر رکھ دیا۔ حوالدار صاحب نے میری طرف دیکھ کر جواب میں کہا:

دونوں کنوئیاں ہیں کہ پیکان تیر ہیں
چاروں سم اس کے غیرت بدر منیر ہیں
آنکھوں پہ کیجئے جو نظر بے نظیر ہیں
بال ایسے جس کے بیچ میں ہریاں اسیر ہیں
سرعت میں اس سے طیر کو نسبت نہ تیر کو
زری یہ جلد میں کہ خیالت حریہ کو!

یہ کہہ کر انہوں نے بیچ فورڈ کے کھلے پر بوسہ دیا اور اس کے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”سارے کا سارا بوکی کا تھان ہے۔“

اب ادھر تو درلی جتھہ کا حسین و جمیل لیڈر اپنے ساتھیوں سمیت ہوا کے گھوڑے پہ اپنے گھوڑے چڑھا چاروں کھونٹ دوڑی مارتا تھا اور ادھر قدرت نے اس کے لیے ایک ایسا پھندہ تیار کر دیا تھا جس سے بیچ کر نکل جانا اس کے اختیار میں نہ تھا۔

گلابی نامی ایک باور یا نی تھی جس نے اپنی پسند سے میتو باورے سے شادی کی اور ایک ہفتے بعد اسے چھوڑ دیا۔ میتو بے قد اور مضبوط بدن کا باور یا تھا۔ بہت لمبکا اور تیز رفتار جیسے افریقہ کے شکار ہوتے ہیں۔ جب بلا پکڑنے اور خرگوش کا شکار کرنے کے لیے وہ اپنے دونوں تجازی کتے ایک ساتھ چھوڑتا اور خود بھی ان کے پیچھے بھاگتا تو تینوں تقریباً برابر کی دوڑ میں بڑھتے تھے۔

باورے قبیلے کے مرد کہتے ہیں کہ میتو نے ہر روز ایک جنگلی بلیا پکڑ کر لانے اور اپنے ہاتھ سے اس کے نکلے بنا کر گلابی کو کھلانے کا وعدہ کیا تھا اور اس لیے گلابی نے شادی کی ہامی بھری تھی لیکن کماد کٹ گئے تھے اور جنگلی بلیے نیا یوں میں چلے گئے تھے۔ نیا یوں میں انگل انگل پانی کھڑا تھا۔ شکاری کتے وہاں چھوٹ کرنے سے گھبراتے تھے۔ اس لیے بلیے پکڑے نہیں جاتے تھے۔ میتو اپنے وعدے سے مجبوراً چھڑ گیا تھا اور گلابی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

مگر اس قبیلے کی عورتیں کچھ اور کہانی سناتی تھیں۔ یہ کہانی انہوں نے اُڑتی اُڑتی گلابی کی ایک سیلی مایا سے سنی تھی کہ جس طرح کینٹھے والا سردار گلابی سے ناکام ہو کر بیکر کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا تھا اور گلابی اس کا بوتھا بھگا کر اپنی بستی میں لے آئی تھی، اسی طرح میتو گلابی سے ہار گیا تھا اور دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا تھا۔

گلابی کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہ اپنے اندھے تائے کے ساتھ اس کی جنگلی میں رہتی تھی۔ دن کو شہر کے لڑکے بالوں کے ساتھ ٹھٹھا ٹھٹھال اور مسخری ٹول کر کے شام کو لوٹتے ہوئے سردار ہاگھٹک کی کمر اور رانیں دبا کر اس سے دور وہ

لے آتی۔ دونوں کا بڑا اچھا گزارا ہو جاتا۔ تائے اور گلابی کا نہیں، گلابی اور ہاگھٹک کا۔ وہ بڑا سردار تھا اور بڑی عمر کا تھا۔ پیٹ بڑا ہونے کی وجہ سے چل پھر نہیں سکتا تھا۔ ڈیوڑھی میں آرام کرسی پر بیٹھ کر اندر باہر کا نظارہ کیا کرتا۔ گلابی اس کے قدموں میں بیٹھ کر ہی اسے دب گھٹ آتی تھی۔ زیادہ دیر نہیں، بس دو منٹ ہی کافی ہوتے۔

اس کی قوم کے دوسرے مرد عورتیں تو سانولی، کالی، خاکی اور سفیدی مائل تھیں لیکن گلابی کا رنگ سرخ تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں چہرہ کندھے سبھی سرخ تھے۔ خونی دباؤ کی وجہ سے نہیں، جلد کی رنگت ہی ایسی تھی۔ اگر ہمارے قصبے میں کوئی آخر پو پو لوجی کا ماہر ہوتا تو وہ گلابی کا رشتہ ریڈ انڈین سے جوڑ کر اسے انڈونیشیا کے کسی جزیرے سے برآمد کر کے لوئیزی لٹاموں کی قریبی منڈی میں ضرور پہنچا دیتا۔ وہ پیدا تو باوریوں کے گھرانے میں ہوئی تھی لیکن اس کے کسی پرکھ کے جینز ریڈ انڈین قبیلے سے چلے آتے تھے۔ بال بھی ویسے ستواں، لمبے اور لینگی اور آنکھی بھی کالی سیاہ، اتاری ہوئی باولی جیسی!

گلابی کے قبیلے کی عورتیں اپنے بالوں کی تین تین سو مینڈھیاں کر کے چوٹی میں سینکڑوں کوڑیاں اور منکے گوندھا کرتی تھیں۔ بازوؤں میں ہاتھی دانت کا چوڑا، سر پر چوہ، ناک میں ہلاک، کانوں میں بالیاں، ماتھے پر چوڑا اور منکے پاؤں میں چاندی کی آرسیاں پہن کر بازار آیا کرتی تھیں۔ ان کے مقابلے میں گلابی کانوں میں نیلے ناچین، آنکھوں میں سرمہ، ٹھوڑی پر بندیا، کھڑے کالری مردانہ قبض، کبھی نیلی ٹول کی، کبھی خاکی ٹول کی، گریبان کا اوپر کا ٹن بند، منکے کے کھلے، ذرا عاں سر جھکا کر بیٹھتی تو گریبان چھنے کی طرح کھل جاتا۔

بازار کے لوگ کھڑے ہو کر دیکھتے۔ کھڑے ہوؤں کو دیکھ کر دوسرے بھی آ جاتے۔ ایک ہنگھا سا لگ جاتا۔ ہر ایک کو نظروں سے گزرتی مگر شریو کو ہاتھ نہ لگانے دیتی۔ اس کے پری واری کی ساری عورتیں گھما گھمے پہنتی تھیں اور کھونٹ نکال کر چلتی تھیں، گلابی بال کھلے چھوڑ کر بغیر ادھنی کے چلتی تھی لیکن ناچیں ڈھانپ کے رکھتی تھی۔ چٹلون نما ایک پانچا مہ سا پہنتی تھی جس کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی جھینیں ہوتیں۔

بڑے مردوں نے اسے ڈوڈ پر لگانے کی کوشش کی مگر وہ سب کو غیچے دے گئی۔ ایک مرتبہ جانوں کے لڑکے اسے اٹھا کر بھی لے گئے مگر وہ ان کے اند کو شش دبا کر اور ان کی جینیں نکوا کر ہنسی ہنسی لہی مسافت پیدل طے کر کے واپس آ گئی۔ سینوں کے بیٹوں نے پیسوں کا لالچ دے کر اسے جب ساتھ لپٹنا ناچا ہا مگر وہ دھکا دے کر اگلی گلی میں نکل جاتی۔ چھوٹے تھانیدار نے اس کے خلاف پرچہ کات کر حوالات میں بند کر دیا تو علاقے کے لوئندوں نے تھانے کے سامنے دھنر تادے دیا۔ اگر بڑی ایس بی کو تار بھجوا دیا تو چھوٹے تھانیدار نے یہ ضمنی بھر کر اسے چھوڑ دیا کہ ”غلطی سے گرفتار کر لی۔ اس کا آشنا ہاگھ گیا۔ جو مطلوب تھا اور جس کے پاس آدھ سیر مکی ایفون تھی۔“ گورا ایس بی فرتھ نیون تفتیش کو آیا تو اس نے گلابی کی کلف لگی نیلی ٹول کی قبض کے چھنے میں جھانک کر کہا ”میرے ساتھ ضلع چلوگی، تمہیں تعلیم دلوائیں گے۔“ تو گلابی نے کہا ”میرا تاپا بوڑھا ہے اور اندھا ہے، میرے بنا وہ مر جائے گا۔“ ایس بی فرتھ نے کہا ”اس کو بھی ہم ساتھ لے چلیں گے۔ لائن میں رہے گا۔ سپاہی لوگ اس کی خدمت کریں گے۔“

گلابی نے کہا ”سیدی بات یہ ہے صاحب بہادر کہ تمہیں میرے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میرے اندر سانپ کا

کھلا زہر ہے، میں وش کنیا ہوں۔“

صاحب بہادر نے اس کا مطلب سمجھ لیا تو یہ چلا کہ اگر وش کنیا خود اپنا دیر اور بھگ کھول کر بلائے تو اس کا زہر نہیں کرتا، شہر پہچاؤاری بن جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی زبردستی کرے تو وش کنیا اسے دس لیتی ہے۔

شام کو جب مغرب کے وقت لوگ سمند خان کی قرأت سننے حویلی کے پچانک پر جمع ہوتے تھے تو ان میں اس گھڑی مسکراتی رہی۔ پہلے تو اس نے گھائی کی موجودگی کو بڑے غیر سنجیدہ انداز میں لیا لیکن جب وہ پسر سر راہ گزار بیٹھ گئی تو ایک نئے تماشا کی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ مردوں والے کپڑے پہننے والی گھائی کا!

دوسرے ہی روز ایک عجیب حادثہ ہوا کہ سمند خان کے سورۃ العادیات شروع کرتے ہی جمال خان سوار ہوا آیا کہ میرا گھوڑا گاڑی توڑ کر پیش گاہ میں طوفان اٹھائے پھرتا ہے اور اندیشہ ہے کہ دوسرے گھوڑوں کو زور دیکوب کرے گا۔ کھٹنوں کے بل گری اور دونوں ہتیلیاں زمین پر ٹیک کر گردن گھما کر اسے دیکھنے لگی۔ سمند خان اپنے سینے پر نیت کے سے اپنا نقصان بھی کرے گا۔ مجھ سے تو قابو میں نہیں آتا، اسحاق اور شبیر خان بھی اسے تو بڑا دکھا کر کچڑنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ ہاتھ باندھے اس طرح سرود کھڑا رہا تو گھائی زمین سے اٹھ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی آگے کو چلی گئی۔ پھر اس نے ایک بار لیکن وہ توجہ ہی نہیں کرتا۔ آپ ذرا اسے آکر دیکھیں کہ کیا کریں۔

حوالدار سمند خان اپنی چوکی سے چپیتے کی طرح اچھلا اور شیر کی طرح دھاڑا ”ہے گھوڑا“ اور انگلی کی طرز لپکا۔ اس کے پیچھے ہڑ بونگ دیکھنے کو باہر کے تماشا کی بھی اندر آ گئے۔ ان میں گھائی بھی تھی۔

جمال خان کا گھدار سبزہ سواٹن وزنی اگلی دونوں ٹانگیں آسمان کی طرف اٹھا کر دونوں سم زمین پر مارتا تو پاگل پن سے نہہناتا تھا اور قریبی گھوڑوں کی گردن پر خون آلود دانتوں کے گہرے زخم لگاتا تھا۔ حوالدار سمند خان کے کراہنے والے وقت نہاد ہو کر تقاضا پڑھ لوں گا۔

انسان کی فطرت اور سرشت میں بے شمار کمزوریاں اس کے خیال اور نیت کے دامن میں کندھے کاٹنے سول اور شوک کی طرح اترتی ہوتی ہیں۔ یہی اجاڑ کھیت یا خود رو جھنکاڑ سے گزرتے ہوئے پوہلی بھٹکھڑے، بھٹکھڑے گوگرد آپ سے آپ جسم اور جاسے سے چٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح بے آباؤ فلسفے اور بے بنیاد فکر یا اندیشے پر دانوں اور بھنجریوں کی طرح دانش و دانائی کی شمع سے لپٹ جاتے ہیں۔ کانٹوں اور سوتوں سے تو بدن چھڑائے بھی جاسکتے ہیں لیکن خوف و غیبت کی جکڑ بندیوں سے ذہن آزاد نہیں کرائے جاسکتے۔ اب چونکہ سارے اعضاء و جوارح پر انہی اذہان کا قبضہ ہوتا ہے، اس لیے اس جھڑکی کے سنتے ہی تھان کا ٹرا۔ شور پشت اور طوفان بحسب سبزہ گھوڑا انہی قدموں پر رک گیا۔ دائیں سم۔ ناگل منو پورے کے پورے ”میں“ کو بھی پاگل کر دیتا ہے۔ پھر بدن خفی رخ ہی مانتا ہے۔ شرکی طرف ہی رجوع کرتا ہے۔ زمین کھدیڑ کر نہہنایا اور گردن کندا کر کے چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ حوالدار نے آگے بڑھ کر اس کے گلے پر تین چھڑ مار کر پھوڑ کر خیر ہی کو اپناتا ہے۔ کوئی اختیار نہیں رہتا!

اور غصے سے تھرا کر کہا ”اوئے بد بختا۔ بد لگام، یاروں کے ساتھ رہ کر بے یاری کرتے ہو۔ لعنت ہو تم پر یہودی!“

ڈنیل گرے گھوڑا اپنے کرتوتوں پر شرمندہ سا کھڑا تھا اور اس کے سانس تک کی آواز معدوم ہو گئی تھی۔ سمند خان کے انہو میں ایک سیلابی حرکت ہوئی۔ سمند خان نے کرج کے دستے پر ہاتھ رکھ کر سر کندوں کی طرف دیکھا۔ ایک حملہ آور نے کہا ”جمال خان، سبزے کے گاڑی کے ساتھ ساتھ آج پچھاڑی بھی ڈال دو، اس کی یہی سزا ہے۔“

گھائی نے ہل بار جھجھکاؤں کو سر جھکائے دیکھا تو دل میں کہا ”بس! سارے سنا میں ایک یہی آدکی رکاب کو مضبوطی سے تھام لیا۔ یہ گھائی تھی، جس کے کالر کا اوپر کا بن بھی آج بند نہیں تھا۔

ہے جو مجھے تھ ڈال سکتا ہے۔“ اس کے بعد وہ درلی جتھہ کی حویلی پر پھر نہیں آئی۔ ادھر ادھر سے پوچھ لیتی تھی لیکن وہاں جاتی نہیں تھی۔

اس رات جب حوالدار سمند خان اپنے سیاہ پنوں میں کنگھی کر کے سونے لگا تو گھوڑے کی شورش کے بجائے جوتے ہیں۔“

”کہاں بیٹھ رہے کے لیے ہوتے ہیں۔“ سمند خان کچھ گڑبڑ سا گیا تو گھوڑے نے ہلکی سی چٹک مار کر اگلے ہوا بھر کے اور پورے زور سے ”پھر“ کر کے کرتا ہے لیکن اس کے بعد کوئی ہڑتال نہیں کرتا، گرفتاری نہیں دیتا، مرن پرست سے راستہ کھد بڑا کہ چلو اب چلیں۔ حویلی کافی دور ہے۔ تو گھالی نے کہا ”ہم انتظار کی لوگ ہیں حوالدار صاحب اور اپنی نہیں رکھنا، دھرتا نہیں دیتا۔ گھوڑا غازی مرد ہوتا ہے، سیاسی جھکندے نہیں جانتا۔“

حوالدار سمند خان کا شہر جگ مشکی بھی زور سے پھنکا رہا اور اس معاہدے کے خلاف احتجاج کر کے چپ چاپ کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ باراتوں کے باہر جھوٹا کھانا سینے کو۔ سرداریوں کی اترن لینے کو۔ جاگیر دار کے فار ہونے کو۔ جیلوں کے باہر اپنے قیدیوں سے ملاقات کرنے کو۔ ہم بچ اور دُشٹ لوگ ہیں حوالدار جی، اس لیے ہم کو۔ کھڑا ہو گیا۔ اس پھنکار میں سمند خان کی ”اچھا“ ڈوب گئی لیکن گھالی نے محبوب کے چہرے کی خوش رنگی سے پہچان لیا کہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔“

حوالدار نے نہ تو پہلے کبھی ایسی بات سنی تھی اور نہ ہی کسی عورت کے اس قدر قریب ہو کر گفتگو کی تھی۔ وہ پوچھا گیا، بیچ فورڈ کسما یا۔ اپنی مرضی سے ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے ہٹا۔ سمند خان نے اس بلکے سے کھینچ کر اسے روکا اس وقت ہوتا ہے جب اس کا سوار کوئی سفلی حرکت کرے یا کسی مقام پر گھٹتی لڑ کر اپنے فرومایہ اور شکست خوردہ ہونے کا ثبوت دے۔ گھوڑا خود شکست کھا جائے، اس کو اتنی تکلیف نہیں ہوتی جس قدر شکست اس کو اپنے سوار کی ہزیمت اور پسائی لیکن بات بھی کبھی ختم ہوئی ہے۔ وہ بات جو اماں حوالدار بابا آدم نے جب شروع کی تھی، وہ جوتی ہوتی اور جوتی ہو جاتی ہے۔ اس لیے پرانے وقتوں کی جنگوں میں جب بادشاہوں کے درمیان فتح اور جنگ کے معاہدے طے پاتے تو چلاتی وہاں سے یہاں تک پہنچ گئی ہے لیکن ابھی ختم نہیں ہوئی۔ وہی بات تھی جو ایک گھڑ سوار پہلی مرتبہ ایک زمین پر لڑا۔ کہ ہمارا بادشاہ یا ہمارا سپہ سالار گلے میں پٹکا ڈال کے دست بستہ دوسرے خسرو گیتی پناہ کے سامنے کیوں حاضر ہو گیا ہے! کر رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ یہ بات آج سے اتنا عرصہ پہلے کہاں چھپی رہی اور کیوں بچھی رہی۔

گھالی نے کہا ”ہمارا کوئی سپاہی نہیں مالک نہیں میتیلی کوئی مددگار نہیں۔ ہم بے بس اور اپ مانت لوگ! یہاں آگئی تھیں ہونے کی وجہ سے فتح و شکست کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ بس نبرد آزما کی اور حرب و پیکار کا ڈھنگ ہوتا ہے۔ اس لیے جنگ کے خاتمے پر اگر کوئی ان کے سواروں سے بے لگائی یا بے مروتی کرے تو ان سے برداشت نہیں ہوتا۔ وہ اپنے حوالدار نے کہا ”میری رکاب تو چھوڑو، دفع ہوئی۔“

تو گھالی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دوسرا ہاتھ بھی اس پر رکھ لیا اور کہنے لگی ”بڑی مشکل سے اس آٹکڑے کو اپنے سوار کو کبھی جلی شکست آٹکھ نہیں سمجھتے!“

کہتے ہیں جب پندرہویں پورس کو میدان جنگ میں شکست فاش دی تھی تو اس نے اپنے گھوڑے سے اتر کر سوار پورس کے سامنے جا کر اور چہرہ اوپر اٹھا کر پوچھا تھا ”آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“ یونانی جنگ باز دونوں طرفوں کے گھوڑوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ وہ میدان جنگ میں ان کو پتہ نہیں چلنے دیتے کہ کون ہارا اور کون جیتا اور کون کس کے آگے سرنگوں ہوا۔

”کہاں؟“ سمند خان کا سارا بدن ٹھنڈا پڑ گیا۔ گھوڑا اور بے چین ہو گیا۔

”کھنڈر خرابے میں“ گھالی نے خوش ہو کر کہا ”تیسری ڈیوڑھی کے پیچھے۔“

”کب؟“ سمند خان نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”شام ڈھلے، سورج چھپنے سے ذرا پہلے۔“ گھالی نے چہرہ اور اوپر اٹھا کر کہا ”جب سوار تمہارے گھوڑے مرتبہ بے خیالی میں بغیر کسی ضرورت کے لگام کو جھٹک کر پنی چھوڑ دے، وہاں ہی پر زین سے ڈھلک کر بیٹھا جیسے شہسوار نہ ہو کوئی بیمار ہو، گھوڑے نے گھالی کی بو پسند نہیں کیا تھا۔ اس لیے کھلے قدم پھینکنا ہوا جلد چلی پہنچ گیا۔“

”اچھا۔“ لیکن یہ اچھا ٹھیک سے گھالی نے سنا نہیں کہ سمند خان کا مشکی بہت گھبرا گیا تھا اور اس بھی ہونے وجہ سے پچھلی دونوں ہاتھوں پر گھوم کر زمین پر قوسیں لگا رہا تھا۔ سمند خان نے اس کی گردن تھپتھا کر اونچی آواز مگر رات اور پورا دن پڑا تھا۔ وہ اس وقت میں جلنت سی تیل مالش کر کے ہلکی سی ایکسر سائز کر سکتا تھا۔ گرم پانی سے نہا سکتا تھا۔ بھرے لہجے میں ”ہے گھوڑا“ کہا مگر بیچ فورڈ نے نہ ہٹنا کر اس کا جواب نہیں دیا۔ گھوڑے کی نظر کافی کمزور ہوتی ہے اور ”دور تہ لباس تبدیل کر سکتا تھا۔ صبح عطر گلاب استعمال کر کے شام کو عطر شامت احمر کی پھریری اپنے پنوں میں اڑس سکتا تھا۔ زیادہ دور تک دیکھ نہیں سکتا لیکن وہ آہٹ سے اور خوشبو سے اور سب سے بڑھ کر اپنے کشف سے دور، بہت دور بلکہ خط ہوا سکتا تھا۔ نئے سرے سے ناخن تراش کر ان پر کیوڑے کا پھابا پھیر سکتا تھا۔ پاؤں کی ٹھنوں پر ویزلین مل کر پٹے ملائم ہی دور تک دیکھ لیتا ہے۔ جو بات اس کو پسند نہ آئے، اس سے بڑی جلدی گھبرا جاتا ہے اور اپنی ناخوشی کا اظہار منتھوں کر سکتا تھا۔“

میل بھر پرے ایک کافی پرانا کھنڈر تھا جس کے ایک حصے پر چاروں کے بھوتوں کا قبضہ تھا اور دوسرے حصے پر شودرول۔ شام سے پہلے اس نے نہادھو کر اپنی نواہی رنگ کاربشی کرتے نکالا۔ لٹھے کی کھڑکھڑاتی شلوار پہنی۔ ٹانگی بھوت براجمان تھا۔ ایک عرصے سے کسی شخص کو اس کے اندر جھانک کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ راگبیر شام کے دن والے سیاہ چپوں کو پالش کر کے چکایا۔ پنوں میں مسکن گھسی کی۔ چھوٹی سی سیاہ داڑھی کو عطر حنا سے چڑھا۔ ڈولتے وجود کو سہارا یہاں سے کئی کترا کر نکلتے تھے۔ جو بھی گزرتا تھا، ٹوٹی بنا کے گزرتا تھا، اکیلا دوکیا نہیں۔

بچے کے لیے ہاتھ میں جو کیوں والا جھوٹا ہنر پکڑا۔ ہنر کے گول بھاری سرے کو نیچے نکالیا اور پستلے سرے کو ہاتھ میں پکڑ کر کہتے ہیں یہ اصل میں شیر شاہ سوری کی ایک سرانے تھی جو مغلوں کے عہد میں تاراج ہوئی۔ پانچ چھ صدیوں پہلے گندھاراؤں اور پنڈلیوں پر مارتا اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

کے سرداروں کے لیے کلب کا کام دیتا تھا اور یہاں صبح گئے تک شراب کی محفلیں جستی تھیں۔ بھرے کے لیے وقت کی تخصیص نہیں تھی۔ دن پر رات برابر چلتا تھا۔ ناچنے والیوں کے جوئے بدلتے رہتے تھے لیکن گھنگھر کی جھنکار کبھی ختم نہ ہوتی تھی۔ سوچا کہ مغرب کی جماعت تو اذان کے ساتھ ہی کھڑی ہو جاتی ہے، کیوں نہ تین فرض پڑھ کر اپنے مشن پر روانہ ہو جاؤں سمند خان نے سرنگ کو آگے بڑھا کر کھنڈر کی دراڑ میں سے جھانک کر دیکھا۔ سامنے جہاز جھنکار میں پتھر کے ٹکڑے کی طرح اڑ رہا تھا۔ خیال آیا کہ وضو کرنے، منہ سر پونچھنے اور جماعت کھڑی ہونے تک انتظار کرنے میں ادھر کا وقت نہ چوکور ستون پڑے تھے۔ تخت پوش جتنے لمبے مگر چوڑائی میں اس سے آدھے۔ ساری چھتیں اڑ چکی تھیں مگر طاقوں میں ٹپائے۔ کسی کے ساتھ وعدہ کر کے اسے انتظار کروانا بھی تو کوئی اچھی بات نہیں۔ اس پر بھی بڑی سخت وعید آئی ہے۔ کیوں نہ کے نشان ابھی باقی تھے۔ بہت سی دیواریں اپنی پوری مضبوطی کے ساتھ گھیر اڈال کے کھڑی تھیں۔ باقی میں کریک آئی پہلے دو فرض پھاڑوں..... باوجود اس کے کہ یہ ساری باتیں سوچتے ہوئے اس کی رفتار سست پڑی اور اس کی رفتار میں کمی آئی تھی۔ زمین پر زہریلی ناگ پھنسیاں اُگی ہوئی تھیں اور دیواروں کے شکافوں میں سرسبز پتیل کے پیز تھے جو کافی بڑے تھے لیکن جب مسجد کے محاذ میں آیا تو اس کے قریب سے ناک سیدھا سیدھا نکل گیا۔

کسی طرف سے گھومتا پھرتا غلطی سے ادھر آ گیا تھا۔ ایک کونے میں آک کے بڑے بڑے پودے تھے۔ انہی کے ساتھ مقدونیہ کے خوبصورت شہزادے، میانوالی کے بیٹے اور دلی جتھہ کے حوالدار نے کہا ”یہ میرا حق ہے خدایا۔ میری بلیت میری سرشت میری فطرت کا حق ہے۔ جب آ لیں برائی ہوئی گھوڑی پر گھوڑا الکتا ہے۔ کبوتری کے گرد کبوتر ناچتا ہے، بیری کا ایک عمر رسیدہ درخت بھی کھڑا تھا۔

سمند خان نے کار خاص کے ایک سپاہی کی طرح اس مقام کا جائزہ لیا اور تیسری ڈیوڑھی کو غور سے دیکھا۔ الرئی کی طرف ہرن اور شیرنی کی طرف شیر جست بھرتا ہے تو انسان پر کیوں پابندی ہے؟ انسان کو کیوں منایا ہے۔ انسان کو کی ابھی ایک چوتھائی چھت باقی تھی اور اس چھت کے نیچے کا فرش روئیدگی سے بھی پاک تھا۔ وہ موقع معائنہ کو کے کندر کیوں روکا ہے۔۔۔۔۔ اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔ ”یہ میرا نفس ہے خدایا۔ میرا وجود ہے۔ میرا سراپا ہے۔ میں اس کا ہیئت اور گلگلی کی ذہانت سے بہت مرعوب ہوا۔ واردات جسمانی کے لیے اس سے اچھا اور کوئی مقام نہ تھا۔ بندہ ہوں۔ قرضدار ہوں۔ یہ میرا تقاضا ہے۔ میرا احرار ہے۔ میں اس کو کیسے چھوڑ دوں۔ کیوں چھوڑ دوں۔ کس کے جس طرح سمندر سے لہریں آ آ کر ساحلی ریت پر پھیل جاتی ہیں، کچھ واپس چلی جاتی ہیں، کچھ رہیں گے اور نگہبان ہوں۔ اس کا تار دل ہوں، اس کا بازو ہوں۔

انہوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے فرش سے اٹھایا۔ بستر پر لٹایا اور پھر مجھے کھیل اوڑھا کر اسی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں کوشش کے باوجود ان سے کوئی بات نہ کر سکا اور انہیں اسی طرح دیکھتے دیکھتے سو گیا۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو میرے کمرے کا انداز ویسا نہ تھا جیسا میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ کھڑکی اور طرف تھی۔ کرسی کا رخ میز کی طرف تھا۔ میز دائیں کونے میں تھی۔ میری وارڈ روب میرے بستر کے سر ہائے تھی اور میرا تیل کا چولہا لوہے کے سنول پر تھا۔ خواب میں یہ ترتیب اس طرح سے نہیں تھی، کچھ اور ہی سینک تھی۔

میں نے ٹھنڈے پانی کی ٹونٹی کھول کر دو تین بڑے بڑے چھپا کے مار کر منہ دھویا اور اسی طرح گیلیا چہرہ لے کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ شہر ابھی ٹھیک طرح سے جاگا نہیں تھا۔ صرف اخبار، ڈیل روٹی، گراساں، کافی، دودھ کی سپلائی کی چھوٹی بڑی گاڑیاں گھوم رہی تھیں۔

گلیا کھنڈر کی بڑی دراڑ میں کھڑی تھی اور اس کے بدن پر اس کی محبوب مردانہ قمیص نہیں تھی۔ اب ریڈانڈر قبیلوں کی تو قسم نہیں دی جاسکتی لیکن ہمارے اس علاقے میں، پنجاب کے صوبے اور وادی سندھ کے دیس میں کسی نے ایسا ریڈش براؤن بدن نہیں دیکھا تھا۔ سمند خان تیزی سے اس کی طرف جھپٹا اور نیزہ بازی کی اس جھپٹ میں جب اس کی شست میں تھا، اس نے زور کا نعرہ مارا ”ہے گھوڑا“

سور کا بچہ

نمک حرام۔۔۔۔۔

بد بخت۔۔۔۔۔

ہے ناشکرا۔۔۔۔۔ یہودی

پھر سوار نے پوری راہیں کھینچ کر اس کا سر کندھوں سے ملا دیا۔ کانٹے دار قزاقی نے اس کی باجھیں چیر دیں جب اس کی راہیں اور کھنچیں اور زبان کئی تو اس نے بے بس ہو کر ایک نعرہ اور مارا ”ہے گھوڑا“ اور ہنر کے مونہ کے گونے دو طرفہ مار سے اس کا سارا بدن درو پلا ہو گیا۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور شہوت، رغبت، طلب، ضرورت، کھسکی اور آہ آشا کے رن میں فرمانے پھر تے سر پٹ گھوڑے کی طرح حملہ آور ہو گیا۔

وہ اپنے قدموں سے چنگاریاں چھوڑ رہا تھا۔

ہر طرف گرد و غبار ہی گرد و غبار تھا۔

وہ گھمسان کے رن میں اور اس کے دل بادل میں گھس گیا تھا

اور اپنے وجود کے دشمنوں پر یلغار کر رہا تھا۔

تھکا ہارا، زخموں سے چور اور اپنے آپ سے شرمندہ جب مقدونیہ کا شہزادہ اور میا نوالی کا بیٹا کچا سا ہو کر رو پاؤں حویلی کے پھانک میں داخل ہوا تو اس کا شہرنگ گھوڑا اپنے فتح مند مالک کی آہٹ پہچان کر زور سے ہنپنایا کہ ما، ثابت و سالم لوٹ آیا ہے۔ دلدل کے جانشین کو یہ فرمان بخوبی یاد تھا کہ ”جو میرے بندے ہیں، ان پر تجھ کو کچھ قدرت، کد ان کو گناہ میں ڈال سکے۔“

سیاہ رات چھپے مٹکی گھوڑے نے شکرانے کے طور پر اپنی تھوپی پوری اوپر اٹھادی اور بدن سونت کر کھڑا ہو گیا۔ روم کے اندر، میرے کمرے کی کھڑکی میں ایک زور کا کڑکا ہوا اور خونخاک دھماکے کے ساتھ ایک آ

گونجی ”ہے گھوڑا“ میں بستر سے اچھل کر فرش پر گر گیا۔ میرے سامنے، میرے کمرے میں میری کرسی پر حوالدار سندھ بیٹھے تھے اور ان کے پاؤں میں کرخت چپلوں کے بجائے کڈلیدر کے سبک سے سلپر تھے۔ میں نے خوفزدہ نظروں، ان کی طرف دیکھا تو وہ مسکرائے اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر کہنے لگے ”کیا ہو گیا بھائی، اتنی چھوٹی سی بات پر گھبرا گئے ایسی بے معنی بات پر جس کا تمہاری ذاتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اٹھو۔۔۔۔۔ شاہاش ایسے نہیں کیا کرتے۔ اتنی خود پنا اور ایسی خود افضی کوئی اچھی بات نہیں۔ ابھی تو بڑا لمبا سفر پڑا ہے۔۔۔۔۔ اٹھو شاہاش۔۔۔۔۔ بستر پر لیٹو۔“

نہیں دیکھی یا کہہ دوں کہ دیکھی ہے مگر میں اس کے مندرجات سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرا مشاہدہ کچھ اور ہے۔
 باؤسانی کا دماغ بہت تیزی سے حرکت کرتا تھا اور وہ زیادہ ترک کر نہیں سوجھتا تھا۔ پوچھنے لگا "تم جو دی ہو کہ شہودی؟"
 میں نے کہا "یار تم بہت تیز بولتے ہو، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ پھر میرا فون بھی کئی دن سے خراب ہے۔ آواز
 ٹھیک شروع ہوتی ہے لیکن پھر ڈوب جاتی ہے۔"

اس نے کہا "میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم وحدت الوجودی ہو یا وحدت الشہودی؟"

میں پھر خاموش رہا تو جلدی سے بولا "صوفیوں کے بڑے گروہ کے مقلد ہو یا حضرت مجدد الف ثانی کے پیرو
 ہو۔۔۔۔۔" ساتھ ہی اس نے کہا "ہائے ہائے حضرت مجدد سے مظہر جان جاناں کا ایک شعر یاد آیا" پھر بجلی کی سی تیزی سے ان
 کا شعر سنایا، ساتھ ہی پوچھنے لگا "کیسا ہے؟ دل پہ وار کیا کہ بگر پیہ؟"

میں بھلا اس بات کا کیا جواب دیتا لیکن پھر خود ہی حضرت مظہر جان جاناں کے حوالے سے مسئلہ تنازع کی باتیں
 کرنے لگا۔ وہاں سے اسے روزنامہ "ایل میا جیرو" میں شائع ہونے والا چٹکا آواگون کا قصہ یاد آ گیا۔ الف سے لے کر
 پے تک سارا مجھے سنایا اور پھر میری رائے طلب کی۔ میں نے کہا "کل یونیورسٹی میں تم سے ملوں گا تو اس پر روشنی ڈالوں گا۔
 یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کے بارے میں علامہ اقبال نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔"

حضرت علامہ کا نام سن کر اس نے کہا "یہ ہے تو پھر میں ابھی آتا ہوں۔" میں نے کہا "خدا کے لیے کچھ عقل سے
 کام لو۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا ہے، ایسا کوگاڑی چلانے میں دقت ہوگی۔ اسے سوتے سے اٹھاؤ گے۔ یہ شرط
 آدمیت نہیں، کل تم سے تفصیلی ملاقات ہوگی، جب تک کے لیے خدا حافظ۔"

میں نے فون بند کر دیا تو اس نے بھی کمری دیا ہوگا۔

سارس بڑا نیک اور پاکیزہ سا پرندہ ہے۔ دھلا دھلا یا، اجلا سا بانور۔ دنیا اور دنیا کے جھیلوں سے پرے لمبی
 نائگیں، لمبی چونچ، چپ چاپ، خاموش بجکت سا بچھی ہے لیکن بجکت لوگ عام طور پر جھوٹے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے
 منکسر میں کئی جھٹکوں کو دیکھا تھا۔ سبھی جھوٹے لوگ تھے۔ سارس بھی مجھے بہت ہی جھوٹا پرندہ لگتا ہے۔ میرے سامنے جب
 بھی کوئی جھوٹ جسم ہوتا ہے یا کوئی جھوٹ پکڑا جاتا ہے تو ہمیشہ وہ ایک پشیمان سے سارس کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔
 میرے حساب سے جھوٹ کی لومڑی، کوئے، گلہ بگڑ یا بندر میں تجسیم ہونی چاہیے مگر ایسے نہیں ہوتا۔ ہمیشہ سارس ہی سامنے آتا
 ہے۔ میں نے ڈاکٹر اجمل سے اس کی وجہ پوچھی تھی تو انہوں نے بتایا تھا کہ سارس خود تو شاید جھوٹا نہیں ہوتا مگر اس کے گلے
 میں ولایت والوں نے اتنا بڑا جھوٹ ڈال دیا کہ وہ حاملہ عورتوں کے گھروں میں نو مولود بچے لے کر جاتا ہے۔ اس وجہ سے
 شاید آپ کے لاشعور میں یہ تصور جاگزیں ہو گیا ہے۔

ان دنوں میری حالت ایک جھوٹے سارس کی سی تھی۔ پتہ کچھ نہیں تھا اور میں لوگوں کے گھروں میں روحانی
 معلومات کے بیچے ڈلیوری کر رہا تھا۔ روحانیت کا ذکر کرنے والوں کا رخ کذب کی طرف ضرور ہوتا ہے، گو وہ سچ کہتے ہیں!
 دوسرے دن باؤسانی نے مجھے بائالوجی میوزیم کی سیزھیوں پر بیٹھ کر وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر ایک سیر حاصل کی پھر

(4)

رات کے بارہ بجے مجھے پروفیسر باؤسانی نے فون کر کے کہا، غالب کا یہ شعر سنا ہے؟

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا!

ڈوبیا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟

میں نے کہا، سنا تو ہے، پر اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ کہاں سنا تھا اور کس سیاق میں سنا تھا۔ باؤسانی بولا "یار جس
 دن مغرب غزل سے متعارف ہوا اور اس کا تصور کلی یورپ کے لوگوں کی فکر کا حصہ بنا تو وہ واقعہ نظر یہ اضافیت کی تھیوری سے
 بھی مبہوت کن ثابت ہوگا۔ ذرا سوچو دو مصرعوں کے اندر اک جہان معنی کو سر بہمہر کر دینا اور پھر قاری کو سند باد جہازی کی
 ساری دانش عطا کر کے اپنے خزانوں کی تلاش کے لیے خود ہی مٹی پل ویزا دے دینا یہ غزل ہی کی ساحری ہو سکتی ہے۔"
 میں کچھ کہنے لگا تو میری بات کاٹ کر بولا "یہ جو غزل ہے ناں یہ ٹی بابا کے گھرانے کی مر جینا ہے۔ جو صرف ان
 مکانوں پر کانٹے لگاتی ہے جہاں حرم اسرار لوگ آباد ہیں۔"

باؤسانی ان دنوں غالب اور میر درد کی دنیاؤں میں ڈوبا ہوا تھا اور فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ کدھر کی چوٹ کھائے
 اور کدھر کی بچائے۔

پھر اس نے غزل کو درمیان ہی میں چھوڑ کر کہا "میں نے سنا ہے، ان دنوں تم تصوف پر لکچر دے رہے ہو اور یوگا
 بھی سکھا رہے ہو؟"

میں نے کہا "تم سے کس نے کہا؟"

بولا "مجھے لوچا جانے بتایا۔ پھر گرگانوں بھی کہہ رہا تھا کہ تم نے اس سے ایٹ اینڈ ویسٹ کے پرانے پرچے
 مانگے تھے۔"

میں کچھ گھبرا گیا تو باؤسانی بولا "تم نے عوارف المعارف دیکھی ہے؟"

میں اس کتاب کا نام پہلی مرتبہ سن رہا تھا اور فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ باؤسانی کو کیا جواب دوں۔ مان جاؤں کہ

دیا۔ وحدت الوجود کا تو کچھ کچھ سراسر میرے ہاتھ آ گیا لیکن وحدت الشہود کا خانہ بالکل خالی رہا۔

حوالدار صاحب سے خواب میں ملاقات ہونے پر اور ان کا آگے جھک کر میرا ہاتھ پکڑنے کے بعد مجھ میں ایک عجیب طرح کا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ جب انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا یا میں نے ان کے ہاتھ میں دیا تو مجھے صرف سنگ سرمے کے فرش سے اٹھنے میں مدد ملی لیکن جب دودن گزر گئے اور تیسرا دن طلوع ہوا تو مجھ پر ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مفہوم ایک اور ہی طرز میں نمایاں ہوا۔ وہ جو چھوٹی چھوٹی خود نمائیوں اور خود ستائیوں کے شگون نے کھلنے لگے تھے، ان پر رندہ پھر گیا اور میری ذات اکہرے بدن کی ایک مضبوط اور قابل اعتماد کائی بن گئی۔

لیکن حوالدار صاحب کے خواب میں آنے اور میرے بیعت کرنے اور مجھے فرش سے اٹھا کر بستر پر بٹھانے کا شاید یہ مقصد نہیں تھا، وہ اس سے ورے کسی اور معاملے کے لیے آئے تھے لیکن خوابوں کی چونکہ فی الواقع کوئی حقیقت نہیں ہوتی اور ان کے کوئی حتمی معنی نہیں ہوتے اور یہ صرف دینی ہوئی خواہشات کے مظہر ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو بھیدگی سے بھی نہیں لیا جاسکتا۔ یہ تو انسانی زندگی کے معنی آفریں مگر بعید از قیاس اشارے ہوتے ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ اس لیے سنجیدہ لوگ انہیں قابل توجہ نہیں سمجھتے۔

انہیں دنوں گراچی کا ایک راسٹر روم آیا۔ میں اس سے متعارف تو نہیں تھا، البتہ اسے بڑی اچھی طرح سے جانتا تھا کہ میں نے تجربی آرٹ، مائیکل انجیلو اور پیرس کے ”پلاس پگال“ پر اس کے بے حد خیال انگیز مضمون پڑھے تھے۔ اس کو انگریزی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا اور اس کا انداز تحریر بڑا خوشگوار اور مانوس قسم کا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آپ کو آپ کا کوئی بہت ہی بے تکلف دوست اپنا مضمون سنارہا ہوں۔ اس کے مضمون ڈان کے سنڈے ایڈیشن میں چھپتے تھے مگر کبھی کبھی۔

اس نے آتے ہی مجھے یہ یونیورسٹی فون کیا تو پتہ چلا کہ میں ہوں تو یہی لیکن فون سے بہت دور ہوں، آ نہیں سکتا۔ شام کے وقت اس نے میڈیوشن فون کیا تو میں نکل چکا تھا۔ عشاء کے وقت وہ پوچھتا پچھتا میرے گھر پہنچ گیا۔ میرا کمرہ چھٹی منزل پر تھا اور اس عمارت میں ابھی لفٹ نہیں لگی تھی۔ ایک سو بائیس سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے میں کچھ دیر چچا فیوری کی کافی بار میں بیٹھ کر گپ لڑاتا تھا اور آخر میں ناشتے کا سامان لے کر اوپر چلا جاتا تھا۔

چچا فیوری جی سچا فاشٹ، اٹلی کا عاشق اور مسیہ یعنی کا دیوانہ تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی مارگریتا بھی بار میں کام کرتی تھی مگر ان مانے جی کے ساتھ۔ دونوں کے درمیان ازدواجی محبت میں کچھ کمی تھی، اس لیے دونوں ہر وقت دہلی زبان میں ایک دوسرے سے جھگڑتے رہتے تھے۔ ہم کو تو ہر وقت قریب رہنے کی وجہ سے اس اکھاڑے کا علم تھا لیکن محلے سے باہر کے گاؤں کو اس کا پتہ نہیں چلتا تھا کہ جھگڑ رہے ہیں۔ مارگریتا اطالوی عورتوں کی طرح قدرے موٹی اور عمر میں کافی چھوٹی تھی لیکن شکل کی بڑی خوبصورت تھی۔ ذرا سی کاہل، بہت زیادہ باتوئی اور کافی حد تک دل پیچیک تھی۔ گاہک بک جلدی بھی ہوتی تو بھی اسے باتوں میں لگا کر اپنا دل پشوری کر لیتی تھی۔

فیوری جی کی کافی بار کے ایک کونے میں چھ کرسیاں ہمارے لیے مخصوص تھیں جہاں ہر وقت اس کے یاروں اور واقف کاروں کا ہنگامہ ہوتا۔ ہفتے کی شام ہم رات کے بارہ ایک بجے تک یہاں بیٹھ کر گپ لگاتے اور محلے کے لوگوں اور

ہاں موجود ساتھیوں کی دل بھر کے چغلیاں کرتے۔ ہم سب کی رنگ لیڈر رہتا تھا جو باقاعدہ دھوبن تو نہیں تھی مگر ہم سب لوگوں کے کپڑے دھو کر دیتی تھی اور اسی آمدنی پر اس کی گزر بسر تھی۔ وہ مارگریتا کو اور مارگریتا اس کو زیادہ پسند نہیں کرتی تھی لیکن چونکہ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت تھیں، اس لیے اچھی بندھ رہی تھی اور وقت گزر رہا تھا۔ سینور داندی ہم سب کا بزرگ دوست تھا۔ عمر بیاسی سال سے اوپر تھی۔ وجہ الفاصل کا مریض تھا۔ گرمیوں میں لمبا کوٹ پہن کر اور اونی مظفر گلے میں ڈال کر چلتا۔ منہ میں انگلی اور انگوٹھے کا حلقہ بنا کر بڑے زور سے سیٹی بجاتا اور ساتھ سینے پر ہاتھ مار کر کہتا ”جوانی..... جوانی..... جوانی“ اس کے لیے کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک نو جوان لڑکی کی نیوڈ تصویر ہوتی تھی جو اس نے کسی اخبار سے کاٹ کر کارڈ پر چپکائی ہوئی تھی۔

سینور داندی جب کبھی بس میں یا ٹرام میں سفر کرتا اور بس کنڈیکٹر اسے سینئر سٹیشن خیال کر کے ٹکٹ نہ دیتا تو وہ چلتی بس میں کنڈیکٹر کو روک کر منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹی بجاتا اور جیب سے تصویر نکال کر اس کی ناک کے سامنے کر کے اونچی آواز میں کہتا ”جوانی، محبت، محبت، جوانی..... ٹکٹ بوڑھے لوگوں کو معاف ہے عاشقوں کو نہیں..... لاکو سیم کی ایک ٹکٹ دے۔“ کنڈیکٹر بس کر اسے ٹکٹ کاٹ دیتا..... سینور داندی پاؤں میں بڑے بڑے گھسے ہونے کی وجہ سے ہمیشہ بغیر تسموں کے فلیٹ بوٹ پہنتا تھا۔ جہاں جہاں اس کے گھسے بہت زیادہ تکلیف دیتے تھے، وہاں اس نے بلینڈ سے جوتوں کا کیڑوں کاٹ کر موکھے بنائے ہوتے تھے۔ نظر بے حد کمزور ہونے اور گھٹیا کی شدید تکلیف کی بنا پر پاؤں گھٹیت کر چلتا تھا لیکن ہر راہ چلتے کود کر اور اس کا کندھا ہلا کر کہتا تھا۔ ”بیاسی برس کا ہوں اور پانی کے ڈالنے سے ناواقف ہوں۔ ہمیشہ شراب پی رہا ہوں، اچھی شراب پی رہا ہوں اور اچھے انگریزوں کی پی ہے۔“

اسی روز ہمارے محلے میں چندال چوکر کی کافی بار میں جمع تھی اور جوڑ کھانے نے مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ ”پروفیسر! پاکستان میں مچھلی سے گندی گالی کیا ہوتی ہے؟“ تو میں نے اپنے دونوں ہاتھ ادا کر کہا تھا ”ایک منٹ غصہ، مجھے گالیاں تو سب آتی ہیں لیکن مجھ سے ان کا ترجمہ ٹھیک سے نہیں ہو رہا۔ کچھ الفاظ ایسے ہیں جو میں نے ابھی تک اطالوی میں جانے ہی نہیں سیکھے ہی نہیں۔“

مارگریتا کہنے لگی ”تم ان کا قریبی مفہوم بیان کر دو، ہم جوڑ جاؤ گے ان کا ترجمہ کر لیں گے۔“ میں کچھ شرمایا اور سر ہلا کر بولا ”چھوڑ دو دفع کرو۔ یہ بھی کوئی پوچھنے بتانے والی بات ہے۔ پھر کبھی کہی۔“ جوڑ جو نے کہا ”حد ہو گئی پروفیسر! تم تو جوانن کی طرح شرما رہے ہو۔ یہاں کوئی غیر تھوڑی ہے، سب گھر کے آدمی ہیں۔“

میں نے چہرہ اٹھا کر بے بسی سے چاچا فیوری کی طرف دیکھا کہ وہ ایک سنجیدہ فاشٹ تھا اور مہذب مسیہ یعنی کا عاشق تھا لیکن اس نے بھی مجھے سہارا نہ دیا اور خوش دلی کے ساتھ بولا ”بتاؤ بتاؤ یہ تو علم کی بات ہے۔ انفرمیشن کی بات ہے۔ اس سے تو کسی ملک کے کلچر کی نشاندہی ہوتی ہے۔“

میں پھر بھی ذرا کسمسایا اور بولنے میں متاثر ہوا تو رہتا نہ منہ کے آگے موٹھ لگا کر اونچی آواز میں کہا ”پچھلے

منہ..... کیا ہو گیا ہے؟ مرے کیوں جاتے ہو؟ پوپ مارے گا؟“ پھر اس نے پوپ کو ایک گندی سی گالی دی اور ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا ”شاباش شاباش..... سو..... سو..... چلو چلو۔“

میں نے کہا ”بہت تیری ماں کی۔“

مار گرتا نے کہا ”شاباش شاباش، بتاؤ بتاؤ۔“

میں نے کہا ”بتا تو دیا ہے۔ اسی طرح بہن کی گالی ہوتی ہے لیکن وہ عام طور پر اس سے شارٹ ہوتی ہے! بہن.....“ سب حیران سے منہ کھول کر میری طرف دیکھنے لگے۔ سینور داندی نے کہا ”ہم گالی کو پوپ چہرہ ہے ہیں، گندی گالی کو اور تم مرد عورت کے جسمانی تعلقات کی بات کر رہے ہو۔ گالی بتاؤ گالی۔“

میں نے چیخ کر کہا ”یہی گالی ہے اور نہایت گندی گالی ہے۔ ہمارے یہاں اس پر قہقہے ہوتے ہیں، خون خرابے ہو جاتے ہیں۔“

سب طوطے سے بن کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور محفل پر سناٹا چھا گیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ جملہ ایک گالی کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک جنسی فعل ہے جو ازل سے چلا آ رہا ہے اور اب تک باقاعدگی سے ہوتا چلا جائے گا، اس میں گالی والی کوئی بات ہے۔

وہ اماں و ڈھی سینور ابسا چا جو صبح سے شام تک کونے میں بیٹھ کر اس دروڑھے بھرا کرتی تھی، اخبار سے نظریں اٹھا کر بولی ”پروفیسر! ہم گالی کو پوپ چہرہ ہیں، گندی اور غلیظ گالی کو اور تم اس عمل کو بتا رہے ہو۔ انسان، حیوان، جانور بلکہ ہر جاندار کی تخلیق کا ذریعہ ہے اور جس سے ہر ایک کی نسل اپنی طے شدہ رفتار کے مطابق آگے بڑھ رہی ہے۔“ سینور ابسا چا نے اپنی عمر کے بیالیس سال کر اس دروڑ پزل حل کرنے میں گزارے تھے جس سے اس کا علم سمندروں کی طرح وسیع اور گہرا ہو گیا تھا۔ وہ ابھی کچھ اور بھی کہتی لیکن جو رتوڑ کھان نے اسے روک دیا۔

جب میں اپنے یاروں کے اس گروہ کی کم عقلی سے ضیق میں آ گیا تو میں نے چڑ کر کہا ”ہمارے یہاں تو بس اسی قسم کی گندی گالیاں ہوتی ہیں۔ تمہارے پاس ان سے کوئی بہتر نمونہ ہو تو پیش کر دو ورنہ بکواس بند کرو۔“

فیور ہتی نے اپنے کاؤنٹر پر گلیا کپڑا پھیرتے ہوئے کہا ”رینا تا تم بتاؤ۔ تم تو تھڑے پر بیٹھ کر ارد گرد کی عورتوں کو گندی گالیاں دیتی رہتی ہو۔“

رینا تا نے گھبرا کر اور شرما کر کہا ”وہ وقت اور تھا اور اس وقت تو جنگ کا سارا بوجھ اٹلی پر آ گیا تھا۔ نہ کھانے کو کچھ ملتا تھا نہ پہننے کو، گالیاں تو دینی ہی تھیں۔“

سینور داندی نے کہا ”اوئے رینا تا سچ گالیاں تھوڑی دینی ہیں، صرف بتانا ہی ہے کہ پروفیسر کو علم ہو جائے، ہمارے یہاں کسی کسی خوفناک غلیظ گالیاں ہیں۔“

”تو تم کیوں نہیں بتا دیتے، نوجوان بڑھے!“ رینا تا نے چڑ کر کہا ”سارے میری جان کو آتے ہیں اور کبھی مجھ سے زیادہ گند بکتے رہے ہیں۔“

”تو چلو پھر دفع کرو۔“ مار گرتا بولی۔ ”نہیں بتانا تو نہ سہی، یہ کونسا انصافی سوال ہے کہ نہ ہوا تو ٹیل ہو جاؤ گے یا

سکول سے نکال دیئے جاؤ گے..... بس ٹھیک ہے۔“

”بس ٹھیک نہیں ناں.....“ جوڑو چڑ کر بولا۔ ”پروفیسر نے اپنی بات بتا دی ہے تو وعدے کے مطابق ہم کو بھی

بتانی چاہیے۔ اسی وجہ سے تو ہم دنیا بھر میں بدنام ہیں کہ اطالوی لوگ جھوٹے بہت ہیں۔“

میں نے ان کی گرمی گفتار کم کرنے کے لیے بڑے سجاؤ کے ساتھ کہا ”چلو کوئی بات نہیں، پھر کبھی سہی۔ یہ کوئی

ایسی ضروری انفرمیشن ہے جو مجھے آج ہی ملنی چاہیے اور اسی وقت ملنی چاہیے۔ بس ٹھیک ہے۔“

سینور ابسا چا نے اپنا اخبار سمیٹ کر رینا تا کو حکم دیا ”رینا تا! اٹھو اور پروفیسر کو ابھی اور اسی وقت ایک گندی گالی

دے کر بتاؤ کہ ہمارے یہاں کس قسم کی گالیوں کو خش ترین سمجھا جاتا ہے اور ٹرک ڈرائیوروں کو کیوں گندا سمجھا جاتا ہے کہ وہ

دوسرے ٹرک کو کراس کرتے ہوئے ایسی گالیاں ضرور دیتے ہیں۔“

رینا تا چونکہ وقت بے وقت سینور ابسا چا سے ادھار لیتی رہتی تھی اور ہر وقت اس کی دین دار تھی، اس لیے وہ

سینور کا حکم نا مل نہ سکی اور کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس سے اپنی سکرٹ کے گرڈل کو ذرا سا کس کر کہا ”ہائے اللہ میں کس

طرح سے، بغیر کسی وجہ کے اپنی زبان گندی کروں اور دو وزخ کا سامان سمیٹوں!“

سب نے میز پر بجا کر اور آواز ملا کر اونچے سُر میں کہا ”کوئی بات نہیں، کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی نہیں پکڑتا اور نہ

ہی تمہارے کھاتے میں یہ گناہ کے طور پر لکھے جاتا ہے..... چلو شاباش یہ خدمت کا کام ہے۔“

رینا تا نے کہا ”سنو پروفیسر! جب ہم لوگ بہت ہی غصے میں آ جاتے ہیں اور ہمیں اپنے جذبات پر قابو نہیں رہتا

اور ہم مرے مالانے پر مل جاتے ہیں تو ہم کہتے ہیں ”او بے.....“ یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگی کہ کوئی اندر تو

نہیں آ رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ کوئی نہیں آ رہا تو اس نے کھنکھار کر اور گھا صاف کر کے کہا ”برانہ ماننا پروفیسر!

میں صرف بتانے کو بتا رہی ہوں..... میرا اس سے وہ مطلب ہرگز نہیں ہے جو اس گالی میں بند ہے..... یہ صرف انفرمیشن

کے طور پر کہہ رہی ہوں..... اس کی حرکت نہیں ہوں۔“

لیکن جب اس نے دائیں ہاتھ کی ساری انگلیاں جوڑ کر ایک ٹھوکا سا بنایا اور اسے سارے کی چوچ کی طرح حملہ

آوری پر تیار کیا تو ایک دم رگ گئی۔ اپنی سکرٹ سے دونوں ہاتھ پونچھ کر سامنے دروازے کی طرف چلی، دروازے سے سر

نکال کر دائیں بائیں دیکھا۔ سارا علاقہ روشن تھا اور بازار اپنے پورے جوبن پر تھا۔ اس نے کافی بار کا دروازہ اچھی طرح

سے بند کیا۔ تیز قدم اٹھاتی واپس اپنی جگہ پہنچی اور ہاتھ کی انگلیوں کا ٹھوکا پھر سے بنا کر اونچی آواز میں بولی ”آؤ!“

وامور نیا تا تو۔“

سب لوگوں نے یہ سنتے ہی اپنے ہاتھ کانوں پر رکھ لیے اور شیم شیم کے انداز میں سر جھکا لیے۔

رینا تا نے کہا ”مجھے معاف کرنا پروفیسر میں نے ایک گندی بات کی اور سب کے سامنے کی۔“

میں ہکا بکا کرسی پر بیٹھ گیا اور یہ سوچ رہا تھا کہ چونکہ میری اطالوی ابھی کمزور ہے، اس لیے میں نے اس فقرے کا

غلط ترجمہ کیا ہے۔ دوبارہ غور کیا تو پھر وہی مطلب نکلا..... تیسری مرتبہ ہر لفظ کے لاشعور اور سابق ذہن کے چمنے میں پڑ کر
جھڑے اور پھنکارے تو پھر بھی وہی معنی وارد ہوئے۔

میں نے کہا ”بھی اس کا مطلب تو میرے حساب سے یہ نکلتا ہے کہ ”جا اور جا کے قتل ہو۔ مر جا؟“ سب نے
ایک زبان ہو کر کہا ”بالکل ٹھیک ہے، یہی تو مطلب ہے۔ ایک جیتے جاگتے، ہنستے کھیلنے، زندہ و پابند شخص سے یہ کہنا کہ
مر جا! قتل ہو جا!! اس سے بڑی گالی اور کیا ہوگی۔ اس سے خلیفہ بددعا اور کیا ہوگی اور اس سے گندی گالی اور کہاں
ہوگی!!..... میں نے ان سے تو نہیں کہا البتہ دل میں یہ ضرور سوچا کہ اس سے زیادہ پیار بھرا جملہ کہ ”دفع ہو، مر پرے“ اور
اس سے بڑھ کر تعلق افزا فقرہ کہ ”اے مر میں اک پان تو لگا، الا گچی سپاری“ اور اس سے بڑھ کر دعائے اظہار اور کیا ہوگا
”نی مر جائیئے! اب اور نہ بددعتی جا۔ لڑکیوں پر اتنا قند ہی ٹھیک ہوتا ہے۔“

میں اس ”گندی“ اور ”خلیفہ“ گالی کے سیاق و سباق پر غور ہی کر رہا تھا کہ سامنے جلدور واز کے کشتے پر دستک
ہوئی۔ کافی بار کے اندر ہم سب یہ گندی گالی سن کر مظلوم سے ہو کر بیٹھ رہے تھے اور کسی کو بھی دروازہ کھلانا یا دھڑکا ہوا تھا۔ میں
چونکہ اس گالی سے لطف لے رہا تھا اور چاق و چوبند تھا، اس لیے میں نے ہی آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے کراچی کا وہی
آرٹ کرینک کھڑا تھا جس نے انگریزی میں مضمون لکھے تھے اور جس کا میں زبردست قسم کا فین ہوں۔ میں نے مصفا
کرنے کو ہاتھ آگے بڑھا یا تو وہ بے تکلف دوستوں کی طرح میرے ساتھ لپٹ گیا اور میری کمر پر محبت بھرے دھپے مارنے
لگا۔ میرے لیے اس سے بڑا عزت افزائی کا اور کیا مقام ہو سکتا تھا۔ میں نے بھی بے تکلف ہونے کے شوق میں دو تین
جوابی دھپے مارے لیکن بہت ہی جھلکے اور بالکل نامعلوم قسم کے۔ پھر میں نے دروازہ اچھی طرح سے کھول کر اسے اندر بلا دیا
اور اپنے دوستوں سے اس کا تعارف کرایا۔ کسی نے بھی اس کو پسند نہ کیا!

اصل میں وہ ذرا متکبر اور گھمنڈی سانو جوان تھا اور انگریزی کا نولیدہ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو بہت کچھ
سمجھتا تھا۔ پھر اس کا لباس بھی ایسا شوخ اور بھڑکیا تھا کہ اطالوی لوگ اس کے تحمل نہ ہو سکتے تھے۔

کہنے لگا ”میں کل رات کا آیا ہوا ہوں اور اس وقت سے آپ کو فون کر رہا ہوں لیکن آپ دستیاب ہی نہیں ہوتے۔“
میں نے کہا ”مجھے آپ کے فون کا علم ہوا تھا لیکن آپ نے کوئی نمبر نہیں چھوڑا تھا اس لیے میں آپ سے رابطہ نہ کر سکا۔“
اس نے کہا ”میں صرف کل کا دن اور کل رات یہاں ہوں۔ پھر مجھے ہیرس چلے جانا ہے۔ وہاں ”لوٹرک سینٹر“
میں میرا ایک لیگجر ہے۔ ایک ہفتہ قیام کے بعد میرا اصل ٹھکانہ لندن کا ہے۔ وہاں ایک مہینہ قیام کے بعد میری واپسی سیدھی
کراچی، واپسی پر کہیں نہیں رکوں گا۔ وطن واپس جا کر آ لائشوں کے جالے اتاروں گا۔“

میں ان کی بے تکلف باتیں سن کر محظوظ ہوتا رہا اور ان سے مرعوب ہوتا رہا۔ بڑے دنگ کر دیک تھے اور کھل کے
بات کرتے تھے۔ ملک کے بڑے بڑے لوگ ان کے دوست تھے اور وہ سارے سیاستدانوں کو قریب سے جانتے تھے۔ فن اور
فنکار کی باتیں کرتے کرتے اچانک میری طرف بھر پور نظروں سے دیکھ کر بولے ”میں آپ کو صبح سے اس لیے تلاش کر رہا تھا کہ
میرے ساتھ چل کر مجھے یہاں کا کوئی بروقتل دکھائیں، وہاں کی لڑکیوں سے ملائیں اور اس ماحول سے متعارف کرائیں۔“

بروقتل کا نام سن کر میرے پاؤں تلے کی زمین کھل گئی۔ میں نے نہ تو اس کے بارے میں کچھ سنا تھا، نہ پڑھا تھا،
نہی ہماری گفتگو میں کبھی اس کا ذکر آیا تھا۔ حالانکہ ہم نے فیورٹی کی کافی بار میں بیٹھ کر طرح طرح کی بکواس کی تھی اور
رنگ رنگ کے مضمون باندھے تھے۔ یورپ کے قبیہ خانوں کے سلسلے میں میرا جو بھی علمی مشاہدہ تھا، وہ ”یاما“ ناول کے اردو
ترجمے، مولانا یازد خان پوری کی کتاب ”ترغیبات جنسی“ عابد علی عابد صاحب کے پیری لوٹی کے ترجمے اور بہت بچپن میں
سریز آف کورٹس آف ہیرس کے تیرتھ رام فیروز پوری کے تراجم سے اخذ کردہ تھا۔ اس کے سوا مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔

انہوں نے میرے جواب دینے سے پہلے کہا ”ابھی چلتے ہیں اور پھر واپسی پر کسی اچھے سے اطالوی ریسٹوران
میں کھانا کھاتے ہیں۔ آخر میں میں آپ کو ٹیکسی پر یہاں چھوڑ کر اپنے ہوٹل چلا جاؤں گا۔“

میں نے کہا ”لیکن میں تو ایسی کوئی جگہ نہیں جانتا اور نہ ہی میرے خیال میں عالمی میں ایسی کوئی جگہیں ہیں۔“
انہوں نے میرے کندھے پر زور دیا کہ ”مار کر کہا“ ”اوہ کم آن اشفاق! کیسی باتیں کرتے ہو۔ دوسری جنگ عظیم
کے بعد عالمی کے قبیہ خانے تو ساری دنیا میں مشہور ہو چکے ہیں۔ اب یا تو تم بننے ہو یا مجھے چکر دے رہے ہو۔“

جلدی انہوں نے مجھے تو اور تم کہہ کر پکارنا شروع کر دیا لیکن میں ان کے رعب علم کے آگے ان سے بے تکلف
نہ ہو سکا۔ ان کے علم کا سارا رعب انگریزی جاننے کی وجہ سے تھا کہ وہ انگریزی میں مضمون لکھ لیتے تھے اور انگریزی میں
گفتگو بھی کر لیتے تھے۔

میں نے ان کی سوالیہ نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے دوبارہ عرض کیا کہ ”اگر ایسے کوئی مقامات ہیں بھی تو مجھے
ان کا علم نہیں۔ میں نے کبھی ادھر تو ج نہیں دی۔ یہ میرا موضوع نہیں۔“

انہوں نے غفلتی کے انداز میں کہا ”اگر یہ تمہارا موضوع نہیں تو یہاں کرنے کیا آئے تھے؟ کسی اور حقدار کو آنے
دیتے جو اس موضوع کے کچھ فائدہ اٹھاتا۔“

ان کی اس چوڑی سے میں گھبرا سا گیا اور شرمندگی سے مسکرانے لگا لیکن وہ مجھے چھوڑنے والے اور معاف کرنے
والے نہیں تھے۔ میرے دوستوں کی طرف اشارہ کر کے بولے ”ان لوگوں سے پوچھو، یہ سارے لفظ نظر آتے ہیں۔ ان کو
ضرور معلوم ہوگا۔“

میں نے جو روتھر کھان سے پوچھا ”کیوں جو! یہاں کوئی قبیہ خانے ہیں، ہمارے روم میں۔“ اس نے ڈکار
لینے کے انداز میں خاصی اونچی آواز میں کہا ”بہت۔“ اور پھر فخر سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

بڑھے داندی نے کہا ”میرے ساتھ چلو، میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ میری تو کئی لڑکیاں کچی داشتائیں رہ چکی
ہیں۔ اب بھی ملتی رہتی ہیں۔“

میرے مہمان نے کاٹنا میری پیالی پر مارتے ہوئے بے چینی کے ساتھ پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا کہہ
رہے ہیں؟“

میں نے کہا ”جی کہہ تو رہے ہیں کہ اس شہر میں چند بروقتل ہیں لیکن ان کے صحیح مقام ان کو معلوم نہیں۔“ ”تو پھر

کہیں اور سے پوچھو۔ کسی اور سے دریافت کرو۔“ انہوں نے بے چینی سے کہا ”اشفاق صاحب! آرٹ اور لٹریچر کے طالب علم کو ایسے سارے مقامات کا علم ہونا چاہیے۔“

مجھ میں بڑے آدمیوں سے مرعوب ہونے کا بڑا ملکہ ہے اور میں ہر بڑے آدمی سے فوراً متاثر ہو کر اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہوں۔ میں پاکستان کے ان کروڑوں انسانوں میں سے ہوں جو اپنی عاجزی، فروتنی، کسرتی اور بیچارگی کے زور پر بڑے بڑے متکبر، گھمنڈی، خود پرست اور خود میں فرعونوں کو جنم دیتے ہیں اور ان کے جلوہوں کے آگے ناپتے گاتے ”آدے ای آوے“ کے نعرے مارتے جاتے ہیں۔ ہمیں صاحبانِ حیثیت سے کچھ مطلوب نہیں ہوتا نہ ہی ہم ان سے کسی رعایت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ ہم تو صرف ان کے گن گانے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور انہیں جتنا بے غیر ساری زندگی ان کے گن گانے کا کرشمہ ہو جاتا ہے۔

”تو پھر؟“ انہوں نے ذرا عجب سے پوچھا تو میں گھبرا گیا کہ ناراض ہی نہ ہو جائیں۔ میں نے کہا ”آپ ذرا ٹھہریے، میں ان سے مزید کچھ پوچھ کر بتاتا ہوں۔“

میرے استفسار پر سینور اسیا چانے بتایا کہ ہمارے یہاں فاشی کے منظور شدہ اڈے کسی مخصوص مقام پر نہیں ہوتے، ہر علاقے میں اپنا ایک کاسینو ہوتا ہے۔

”اگر کوئی علاقہ بڑا ہو تو وہاں دو دو تین تین بھی ہوتے ہیں۔“ جو رجونے کہا۔

فیوریتی نے کہا ”جب میں نے یہاں آکر یہ کافی بار کھولی ہے تو یہاں بھی ایک کاسینو ہوتا تھا لیکن پھر پادریوں نے دنگن کی قربت کی وجہ سے بند کر دیا کہ جو طالب علم دینیات پڑھنے آتے ہیں، وہ بھی وہاں گھس جاتے ہیں۔“

رینا تابولی ”یہ کاسینو ہیں تو روم میں جگہ جگہ لیکن ہمارے قریب ترین علاقے ”تراس تیورے“ میں تین ہیں اور تینوں ہی بہت اعلیٰ درجے کے ہیں۔“ وہ اپنے علاقے کے اڈوں پر ایسے خوش ہو رہی تھی جیسے لوگ فٹ بال یا باسکٹ بال کی قومی ٹیموں پر فخر کیا کرتے ہیں۔

میں نے کہا ”تراس تیورے میں کہاں ہیں؟“

رینا تانے کہا ”قلعہ سانتا نجلو کے ساتھ والے بڑے راستے سے داخل ہو کر جہاں گلیوں کے دو شانے پر پلی اور خرگوش والا چھوٹا فوارہ ہے، وہاں دائیں ہاتھ کی گلی میں ہے۔“

میں نے کہا ”اس گلی میں تو کاپور بٹا ہے۔“

”بس بس بس“ رینا تڑپ کر بولی۔ ”کاپو کے گھر سے چار گھر چھوڑ کر پانچواں گھر بروقتل ہے۔ بڑا مشہور ہے،

دور دور سے لڑکیاں آتی ہیں۔“

میرے مہمان نے ہماری گرجدار آواز میں پوچھا ”کیا بتا رہے ہیں۔“ تو میں نے کہا ”ابھی بحث کر رہے ہیں۔ کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔“

”عجب واہیات لوگ ہیں کہ ابھی تک ڈکس ہی کر رہے ہیں۔“ انہوں نے ناراض ہو کر کہا ”ان سے کہو

جلدی کسی نتیجے پر پہنچ کر تمہیں مطلع کریں۔“

میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا ”لیکن اس گھر کا پتہ کیسے چلتا ہے؟“ تو فیوریتی نے کہا ”باہر ایک سرخ ختی لگی ہوتی ہے پر ڈیفنسر..... جیسے وکٹوریہ گاڑی کی جی نہیں ہوتی بالکل اسی شکل و صورت کی لیکن اس میں سفید شیشے کے بجائے سرخ شیشہ لگا ہوتا ہے اور اس سے سرخ روشنی ہی برآمد ہوتی ہے۔“

اب تک میں اپنے اس ناخواندہ مہمان سے تھوڑا سا زچ ہو چکا تھا، اس لیے میں نے کافی بار کے لیٹر ہینڈ سے ایک ورق پھاڑ کر انہیں بتایا کہ ”میں اس کاغذ پر آپ کو کاسینو تک پہنچنے کا نقشہ بنا دیتا ہوں، آپ کہیں سے بھی ٹیکسی پکڑ کر وہاں جاسکتے ہیں۔ پھر یہاں سے تو وہ علاقہ بہت ہی قریب ہے۔ جلدی سے پہنچ جائیں گے اور بھڑا بھی کم ہوگا۔“

انہوں نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور ہنس کر کہا ”جان من! آپ کے بغیر تو میں یہاں ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اطالوی کون بولے گا اور راستے کون پوچھے گا۔ مجھے تو تھینک یو کی اطالوی بھی معلوم نہیں..... آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”میں آپ کے ساتھ کاسینو جاؤں؟“ میں نے چیخ کر کہا ”یہ ناممکن ہے۔“

”تو پھر میں یہاں بیٹھا ہوں۔ نہ میں یہاں سے اٹھوں گا، نہ یہ بار بند ہونے دوں گا اور نہ ہی آپ کو جانے کی اجازت دوں گا..... اپنے پار، مالک دکان بڑا کو بتلا دیجئے۔“

مجھے معلوم نہیں کہ آپ کی زندگی میں کبھی کوئی ایسا انسان آیا یا نہیں، لیکن میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو ایسی چوہنیشن سے پالا ضرور پڑا ہوگا۔ آپ کسی کھنے جنگل میں پھنس کر گم ہو گئے ہوں گے۔ مخالف سمت سے آنے والے کسی خود غور جلوے کی جلادی نگاہ میں الجھ گئے ہوں گے۔ کسی وحشی جانور سے گھر کر دوڑا ہو گئے ہوں گے۔ آپ کا سامان چلا گیا ہوگا لیکن پلیٹ فارم پر سر ہٹ بھاگنے کے باوجود آپ گاڑی نہیں پکڑ سکے ہوں گے۔ آپ نیزہ بردار وحشی آدم خوروں کے گھرے میں آکر اپنی پوری طاقت سے چیخ رہے ہوں گے لیکن آپ کی آواز برآمد ہونے کے بجائے خاموشی سے واپس جا رہی ہوگی اور آپ کے بیوی بچے بیس فٹ کے فاصلے پر بیٹھے پٹک متا رہے ہوں گے۔

میری صورتحال ان ساری صورتوں سے زیادہ کر بناک تھی اور میں نے اس بک بک سے برآمد ہونے کا ایک سیدھا سا فیصلہ کر لیا تھا کہ سکوتر پر انہیں پیچھے بٹھا کر لے جاؤں گا اور کاسینو کے دروازے پر سرخ ختی کے نیچے چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔

لیکن یوں نہ ہو سکا۔ جب ہم کاسینو کے دروازے پر پہنچے تو ایک بڑھے دربان نے دروازہ کھول کر گھبراہٹ میں کہا ”جلدی جلدی جلدی..... سرکاری وقت ختم ہو رہا ہے، لاسٹ کال! لاسٹ کال! لاسٹ کال!!!!“

پتہ نہیں اس کا مطلب کیا تھا لیکن جب میرا مہمان اندر داخل ہوا تو اس کے ساتھ میں بھی تھا۔

یوں تو روم کے سبھی گھر پرانے ہیں۔ سوہویں سترہویں صدی کے قدیم مسکن لیکن یہ گھر ان سے بھی پرانا تھا۔ دروازے کے عین سامنے پہلی منزل کو جانے والی میز ہیاں تھیں اور بائیں ہاتھ سگ مرمر کا ایک کھلا اور روشن صحن تھا۔ ایک

”اور اگر ہم بتا بھی دیں تو اس سے تم کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔“ نیلی آنکھوں والی لڑکی نے کہا ”ہم صرف رات کے وقت یہاں ہوتی ہیں اور ناموں کے بجائے نمبروں سے پہچانی جاتی ہیں۔“

پھر اس لڑکی نے جس نے میرے مہمان کی کمر میں دھموکا مارا تھا، کچھ تجسس ہی ہو کر مجھ سے پوچھا ”تم یہ سوال کیوں پوچھ رہے تھے؟“

”کونسا سوال؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی.....“ اس نے بچوں کی طرح چہرہ ہلا کر کہا ”تم مستقل طور پر یہیں رہتی ہو؟ اس گھر میں؟“

”اوہ۔“ میں نے ایک جج کی طرح سنجیدہ ہو کر کہا ”وہ میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ تم چاروں کا لہجہ فرق ہے اور تم میں سے کوئی بھی رومن تلفظ کے ساتھ اٹالوی نہیں بولتی ہو۔“

وہ چاروں ایک لمحہ کے لیے خاموش ہو گئیں تو میرے مہمان نے پوچھا ”تم نے کیا کہا؟“

پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہتا، ایک لڑکی بولی ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم رومانی نہیں ہیں۔“

”لیکن کہاں کی ہیں؟“ دوسری بولی۔ ”یہ ہم نہیں بتائیں گی۔“

میں نے کہا ”یاد رہے تم تو رومین کی ہو یا جینیوا کی اور اگر ان دونوں شہروں میں سے کسی کی بھی نہیں ہو تو تاریک کی ضرور ہو..... تمہاری بولی میں اٹالیہ کی روح نہیں ہے۔ تم لوگ باتیں کر سکتے ہو۔ ایک دوسرے کی گفتگو سمجھ سکتے ہو لیکن تمہاری باتوں میں روح نہیں ہوتی۔ سری رح نہیں ہوتی۔“

میں کیا کرتا اور کس طرح سے ان کے ساتھ پورا اترتا۔ وہ شخص جو اتنی بلا شیری کے ساتھ مجھے یہاں لایا تھا، اب منہ میں گھٹکتیاں ڈالے احمقوں کی طرح مسکرا رہا تھا۔

تھوڑی دیر تو میں ان کے ساتھ زبان کی باتیں کرتا رہا اور روم کے تلفظ کے گن گناتا رہا۔ لیکن اچانک کالے بالوں والی کو خیال آیا کہ یہ تو بھک منگے سے شوقین ہیں۔ ان کے پاس ہے کچھ نہیں، مفت نظارہ بازی کرنے آئے ہیں۔ دو چار گولیاں دیکھ کر ایسے ہی واپس چلے جائیں گے۔

اس کجنت نے یہ خیال اپنے ذہن تک محدود نہ رکھا بلکہ ترجمہ کر کے سب کے سامنے پیش کر دیا۔ چاروں ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئیں تو میرے مہمان نے گھبرا کر پوچھا ”کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ جا کیوں رہی ہیں؟“

میں نے وجہ بیان کی تو اس نے ہکا کر کہا ”ان سے پوچھو یہاں کا طریقہ کار کیا ہے؟ اور یہ کس طرح سے خصوصی توجہ دیتی ہیں؟“

میں نے اس فقرے کا عین اسی طرح سے ترجمہ کر کے پوچھا تو نیلی آنکھوں والی لڑکی نے کہا ”پانچ ہزار لیرے فی محبت۔ ہم میں سے جو بھی پسند آئے، اسے ساتھ لے لیجئے۔“

”خالی پانچ ہزار لیرے نہیں“ سیاہ بالوں والی لڑکی نے کہا ”اس کے ساتھ ٹپ بھی دینا پڑے گی۔“

”وہ اپنی مرضی اور حیثیت کے مطابق۔“ چوتھی نے کہا۔

میرے مہمان نے کہا ”پانچ ہزار لیرے تو پچیس روپے پاکستانی ہو گئے۔ ان سے کہو، کچھ کم کریں۔“

میں نے حسب ارشاد اس کا بھی ترجمہ کر دیا۔

کالے بالوں والی نے میرے مہمان کے سر میں کس کے چیمبر ماری اور ساتھ ایک ایسا فقرہ کہا جس کا ترجمہ نہ میں اس وقت کر سکا نہ آگے کبھی کروں گا۔ پھر وہ بڑبڑاتی ہوئی انھیں اور انڈین لوگوں کے خلاف کتنی جھکتی یہ کہتی کمرے سے باہر نکل گئیں کہ ان لوگوں کو لذت، راحت اور خوش باشی سے کیا کام۔ یہ تو ایک ایک آنہ لے کر سال بھر کیوں والے بستر پر لیٹ کے گزار دیتے ہیں۔

وہ جس تیزی سے اندر داخل ہوئی تھیں اس سے دگنی تیزی کے ساتھ باہر نکل گئیں۔ میرے مہمان نے کہا ”حد ہو گئی یار۔ اس میں تاریکی کی کیا بات تھی بھلا۔ دنیا کی ساری تاریکیوں میں بھاؤ ڈاؤ ہوتے ہیں، پھر انہوں نے کیوں برا مانا۔“

میں صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مہمان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”اب چلیں، کافی دیر ہو گئی ہے اور مجھے صبح سویرے یونیورسٹی بھی جانا ہے۔“

انہوں نے کہا ”تھوڑی دیر کے لیے روکو اور دوسرے گروپ سے بات کر لینے دو۔ دوسرے گروپ کی لڑکیاں بھی ابھی آتی ہی ہوں گی۔“

میں نے کہا ”ٹھیک ہے، آپ بیٹھیں۔ میں چلتا ہوں..... نیچے اتر کر آپ کو کوئی ٹیکسی مل جائے گی جو آپ کو ہوٹل چھوڑ دے گی..... آپ کا ہوٹل یہاں سے کوئی زیادہ دور نہیں۔“

انہوں نے کہا ”حد ہو گئی یار۔ آدھا گھنٹہ اور نہیں رک سکتے۔“

میں نے کہا ”سواری! مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں..... اور یہاں رکنا مناسب بھی نہیں سمجھتا۔“

یہ کہہ کر میں چلنے لگا تو وہ بھی میرے ساتھ تیار ہو گئے۔ منہ سے تو کچھ نہیں بولے، البتہ ایک پھدکاری مار کر اپنی ناخوشی کا اظہار کر دیا۔

جب ہم سڑکیوں پر اس کیش رجسٹر والی عورت کے قریب سے گزرے تو اس نے کہا ”آپ کی تشریف آوری کا شکریہ۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو کوئی لڑکی پسند نہ آئی۔ اب آپ اگلے ہفتے ضرور تشریف لائیں گے۔ اگلے بدھ“ رجبو کالا بریا“ لڑکیوں کے درگروپ آ رہے ہیں۔ ان سے مل کر آپ بہت خوش ہوں گے۔“

میں نے بڑی شرافت اور محبت کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولی ”اگر آپ دو ہفتے ٹھہر کر آئیں تو آپ کی ملاقات سسلی کے ایک کھنڈرے مگر مجلس گروہ سے ہوگی۔ تفصیلی خط آچکا ہے۔ ساری لڑکیاں کالے بالوں اور سیاہ آنکھوں والی ہیں۔ سب میں عرب خون ہے اور یہ پڈگری اس وقت سے چل رہی ہے جب صفیلیہ پر عربوں کی حکومت تھی..... یہ دیکھیے،“ اس نے دراز سے ایک لمبا سا لفافہ نکال کر دکھایا ”نوٹو اور کوائف آچکے ہیں اور ڈینٹ بھی آچکی ہے۔ ٹھیک دو ہفتے بعد۔“

وہ یہ بات پرانی انا رکلی کے بساطی کی طرح دہرا رہی تھی کہ بٹنی آچکی ہے، مال دو ہفتے تک پہنچ جائے گا۔ سواری

گاڑی سے آ رہی ہے۔

میرے مہمان نے پوچھا ”یہ کیا کہہ رہی ہے؟“

میں نے کہا ”کچھ نہیں، آپ میرے پیچھے پیچھے آ جائیں!“

اگلی صبح جب وہ پیرس جانے لگے تو میں انہیں سٹیشن پر چھوڑنے گیا۔ مجھ سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھے۔ کھڑکی میں سے سر نکال کر بولے ”تم کو پیرس سے خط لکھوں گا اور پوری تفصیلات سے آگاہ کروں گا..... واپسی پر اگر موقع ملا تو پھر تمہارے روم آؤں گا اور زیادہ دن بھر ملوں گا۔ یہ تو واقعی ابدی شہر ہے۔ یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔“

ان کے پاس چونکہ ٹریولرز چیک تھے جو انہوں نے بھنوائے نہیں تھے، اس لیے سفر خرچ کے طور پر راستے کے لیے انہیں اطالوی رقم کی ضرورت تھی، میرے پاس اس وقت صرف پچاس ہزار لیرے تھے جو میں نے ان کی خدمت میں پیش کر دیے۔ کہنے لگے ”یا تو میں لوٹنے ہوئے تمہیں یہ رقم دے جاؤں گا یا پاکستان سے بینک ڈرافٹ بنا کر تجھ کو دوں گا“ مگر نہ کرنا۔“

میں نے کہا ”آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اس میں فکر کی کیا بات ہے بھلا!“

جب میں مرکزی اردو بورڈ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا اور میرا دفتر ابھی 136 جی گلبرگ میں تھا تو پاکستان سے ایوب آمریت کا دور ختم ہو گیا اور بھٹو صاحب جمہوریت کی شہری صبح لے کر سیاست کے افق پر نمودار ہو گئے۔ ان کے عہد میں میرے یہی مہمان میرے افسر بن کر اسلام آباد تعینات ہو گئے۔ انہوں نے چارج لیتے ہی سب سے پہلے میری پیشگی کرلی اور مجھے اپنے پی اے کے پاس دو گھنٹے انتظار کرانے کے بعد شرف باریابی بخشا۔

اپنے دور حکومت میں انہوں نے مجھے بہت کھڑکایا اور قدم قدم پر ذلیل کی۔ جب بھی لاہور دورے پر تشریف لاتے تھے، مجھے ایئر پورٹ پہنچ کر ان کا سواگت کرنا پڑتا۔ آتے ہی اپنا بریف کیس اور کندھے کا تھیلہ مجھے تھما دیتے۔ گرمی کا موسم ہوتا تو ایک جھڑکی سی دے کر کہتے ”آج گرمی بہت ہے..... کیوں ہے؟“ میں کہتا ”سرا بس ابھی ہوئی ہے۔“ گھنٹہ بھر پہلے تو بڑا خوشگوار موسم تھا۔“

سردی ہوتی تو مجھے طعنہ سادے کر کہتے ”تمہارے یہاں سردی بہت ہے۔“ میں کہتا ”بس سراسی سال ہوئی ہے۔ پچھلے سال، انہیں دنوں میں بڑا خوشگوار موسم تھا۔“

ان کی وجہ سے میں نے انٹرکونٹیننٹل کا سویٹ بھی دیکھا جس میں ایک ساتھ دو تین کمرے تھے۔ ڈرائنگ روم اور لاؤنج الگ تھا اور چھوٹا سا کچھ ایک چھوٹے سے ملحقہ کمرے میں تھا جہاں باورچی کے سونے کا بیڈ بھی لگا ہوا تھا۔ وہ جب بھی لاہور شریف لاتے اسی سویٹ میں ٹھہرا کرتے۔ میں نیچے لاؤنج میں بیٹھ کر اس بات کا انتظار کیا کرتا کہ صاحب کو اچانک کسی چیز کی ضرورت نہ پڑ جائے۔ وہ نیچے کاؤنٹر پر فون کر کے مجھے اوپر بلا کر اور کام سمجھا کر پھر نیچے بھیج دیا کرتے! جس جگہ دورے پر جاتے مجھے بھی ان کی اردل میں جانا پڑتا اور صبح ان کے ٹھکانے پر پہنچ کر حاضری دینا پڑتی۔

ایک مرتبہ انہوں نے مجھے لاہور سے حیدرآباد طلب فرمایا، میں ٹھیک وقت پر پہنچ گیا لیکن ان کی خدمت خاطر

اور معیت میں اتنا وقت گزر گیا کہ مجھے شب ببری کے لیے کوئی مناسب جگہ نہ مل سکی اور میں نے وہ رات حیدرآباد کے ریلوے سٹیشن کی بچہ پر بیٹھ کے گزار دی۔

جب میرے یہ مہمان آرٹ کرٹیک، انگریزی زبان کے مضمون نگار اور مجھ سے پچاس ہزار لیرے ادھار لے کر پیرس روانہ ہو گئے تو مجھے خیال آیا کہ میں نے تو ابھی لینڈ لیڈی کو کمرے کا کرایہ نہیں دیا۔ ریناتا کی دھمائی اور نفور جی کے دودھ کا بل ادا نہیں کیا، یہ سب کچھ کیسے ہو گا اور یہ کیسی طرح سے پوری ہوگی۔ تو مجھے باؤسانی کی بیوی ایلسا کا خیال آ گیا جو ہر مشکل وقت میں ایک اچھی فلمی بھابی کی طرح میرے کام آیا کرتی تھی۔ میں نے فون کر کے اسے اپنے مہمان کی ساری رام کہانی مع اس کی روزمرہ کینٹیکوں کے سنائی اور اس نے جواب میں ہنس کر کہا ”کوئی بات ہی نہیں..... تم فکر ہی نہ کرو۔“ اس ساری رام کہانی سے میں نے کاسینو جانے کا واقعہ منفر کر دیا تھا۔ ایلسا بہت ہی پرانی وضع، پرانے خیالات اور پرانی اقدار کی خاتون تھیں۔ اگر اس کو اس واقعے کا علم ہو جاتا تو اس نے فوراً ایک تفصیلی خط میرے گھر والوں کو لکھ دینا تھا کہ اس کو انگریزی میں خط لکھنے کا بڑا شوق تھا اور کوئی کتاب الیہ اسے دستیاب نہیں تھا۔

پروفیسر باؤسانی ان دنوں ”جادید نامہ“ کا اطالوی ترجمہ مکمل کر چکا تھا اور اس پر نظر ثانی کر رہا تھا۔ مجھے اس کے مددگار کے طور پر فارسی متن پڑھنا ہوتا اور وہ اس کے ساتھ ساتھ اپنی اطالوی عبارت ملاتا جاتا تھا۔ فارسی میں نے بی اے تک پڑھی تھی لیکن اس پر اردو، انگریزی جیسی دسترس نہ تھی۔ اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنے کے لیے میں اگلے روز کی پروفیسر ریڈنگ کے مطابق رات کو جادید نامہ کے پانچ سات صفحے پڑھ کر سوتا تا کہ الفاظ و معانی اور تلفظ کے سلسلے میں ایک غیر غلطی کے سامنے کسی قسم کی شرمندگی نہ ہو۔ یہ کام بڑے انہماک سے ہوتا تھا اور اس کے لیے رات گئے تک جاگنا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ کڑا کر بچہ کد امریکہ کا ایک جرنی مین کسی تجارتی ادارے کا ایجنٹ اپنی ٹوٹی ٹانگ لے کر کسی ڈاکٹر کے پاس گیا اور اپنے اچانک حادثے کا نتیجہ اس کے سامنے پیش کیا۔ ٹانگ کی ہڈی گھسنے سے نیچے دو مقام پر ٹوٹی ہوئی تھی اور دونوں میں گرین وڈ فریکچر کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اپنے ماتحتوں کو فوری سرجری کی تیاری کا حکم دیا اور مریش کو درود روکنے کا ایک بھاری ٹیکہ دے کر پوچھا، یہ حادثہ کس وقت پیش آیا؟ مریش نے کہا، ڈاکٹر صاحب یہ حادثہ پندرہ برس پہلے پیش آیا تھا لیکن میں اس کے خوفناک نتائج سے واقف نہ تھا۔

ڈاکٹر نے حیران ہو کر مریش کی طرف دیکھا اور کہا ”بھائی میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ کی یہ ٹانگ کب ٹوٹی؟“ مریش نے کہا ”وہی تو عرض کر رہا ہوں کہ یہ حادثہ مجھے پندرہ برس پہلے پیش آیا۔ اس وقت میں جوان تھا اور مجھے اس کا احساس نہیں تھا لیکن اب جب مجھ میں برداشت کا مادہ نہیں رہا تو میں چیخا چلا تا آپ کی خدمت میں پہنچ گیا ہوں۔“ ڈاکٹر صاحب حیرانی سے اس کا منہ نہ کھلے لگے اور مکمل طور پر خاموش ہو گئے۔

مریش نے کہا ”ڈاکٹر صاحب آج سے پندرہ برس پہلے میں اپنی مصنوعات کی فروخت کے سلسلے میں کیلی فورنیا کے ایک دور دراز علاقے میں گھوم رہا تھا اور اپنے شیڈول سے زیادہ دیر وہاں رک گیا تھا۔ آؤر تیزی سے بک ہو رہے

تھے۔ ہر روز کپنی سے فون پر رابطہ رہتا تھا۔ میرے کیشن کی رقم تاش کی سروس کی طرح جمع ہو رہی تھی اور میں اپنی کارکردگی پر بہت خوش تھا۔

ایک روز شام کے وقت جب میں ایک گاؤں سے کافی سارے آرڈر بک کر کے قریبی شہر کی طرف روانہ ہوا تو آسمان پر گہری سرمئی گھٹا ایک بادل جمع ہوا۔ بجلی چمکی اور آگافانا بارش ہونے لگی۔ میں نے اپنی گاڑی کی رفتار تیز کر دی اور گاڑی کی تیزی کے ساتھ بارش بھی تیز ہو گئی۔ ہوا کے تند و تیز جھوکے میری گاڑی کو سڑک سے اٹھا اٹھا کر سائیڈوں کی طرف پھینک رہے تھے اور شدید اندھیرے کی وجہ سے میرا دل بیضا جا رہا تھا۔ اچانک موٹے موٹے اگلے پڑنے لگے اور میں نے محسوس کیا کہ میری گاڑی پر ڈیٹ پڑ رہے ہیں۔ ان کی تو خیر مجھے کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ البتہ کسی بھی لمحے اپنی وندسکرین نوٹ جانے کا شدید خدشہ لاحق تھا۔

میں ابھی گاڑی روک کر کسی درخت کے نیچے پناہ لینے کی سوچ ہی رہا تھا کہ پانچ سات سو گز کے فاصلے پر مجھے ایک چھوٹا سا مکان دکھائی دیا جس کی بتیاں اچانک روشن ہوئی تھیں۔ میں نے گاڑی اس مکان کے پہلو میں ایک درخت کے نیچے روکی اور پناہ لینے کے لیے اس گھر کا دروازہ بھایا۔ تھوڑی دیر بعد ادھیڑ عمر کا ایک کسان سگڑ پیتا ہوا باہر نکلا اور میرے ساتھ بڑی ہمدردی سے پیش آیا۔ اس نے میرے سوال کرنے سے پہلے ہی کہا، ”سرا آئی ایم سوری ہمارے پاس شب بری کے لیے کوئی علیحدہ کمرہ تو نہیں ہے البتہ ہمارے بارن کے ساتھ کوٹھڑی ہے جس میں معمولی وضع کا ایک بستر ہے اور دیوار کے ساتھ پانی کی ایک ٹونٹی ہے۔ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا، ”مجھے منظور ہے اور میں آپ کی مہمان نوازی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ مجھے وہ کوٹھڑی دکھا دیجئے۔“

”آپ یقین کریں ڈاکٹر صاحب وہ کوٹھڑی ایک اچھی خاصی صاف ستھری کوٹھڑی تھی اور اس کے اندر لگا ہوا بستر کسی سرائے خانے کے بستر سے بہت ہی بہتر تھا۔ اس کسان نے مجھے وہاں لے جا کر لٹایا۔ حق کا سوچ بتایا۔ طوفان تھمنے پر کھڑکی کھولنے کا طریق سمجھایا اور ایک سگڑ اور ماچس کی پوری ڈبیہ میرے سر ہانے رکھ کر شب بخیر کہہ کر چلا تو میں نے یہ کہہ کر اس کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا کہ صاحب میں تو تمہا کوٹھڑی کرتا ہی نہیں، مجھے سگڑ اور ماچس کی ضرورت نہیں۔ میں نے جواب میں شب بخیر کہا اور کوٹھڑی چٹلون اور جوتے اتار کر بستر میں گھس گیا۔ وہ جو ایک ان ہونا سا خوف میرے دل و دماغ پر طاری تھا، آن واحد میں معدوم ہو گیا اور میں نیچے پر سر رکھ کر گہری نیند سو گیا۔“

آدھی رات کے وقت مارچ ہاتھ میں لیے کوئی شخص میری کوٹھڑی میں داخل ہوا اور آ کر میری چار پائی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور غور سے اس خوفناک شے کو دیکھنے لگا۔ وہ کسان کی درازت اور جواں سال بیٹی تھی جس نے شب خوابی کا سنگلی لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ میری چار پائی کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی اور بڑے مشفقانہ انداز میں بولی، ”آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“ میں نے کہا، ”آپ لوگوں نے تو پہلے ہی مجھ پر اس قدر مہربانی کی ہے اور ایسی جگہ فراہم کر کے دی ہے کہ اس کے بعد مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں رہی۔“

اس نے کہا، ”کوئی کبیل، کوئی چادر۔“

میں نے کہا، ”بالکل نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہے میں بڑے سکون میں ہوں۔“ اس نے کہا، ”ایسے موسم میں بعض اوقات بستر بہت ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور جب تک وہ گرم نہ ہو، ٹھیک سے نیند نہیں آتی۔“

میں نے کہا، ”میرے پاس تو پہلے ہی دو کبیل ہیں اور میں نے دونوں جوڑ کر لیے ہوئے ہیں۔ اب واقعی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔“

اس نے کہا، ”کوئی لنگی کافی وغیرہ، کوئی سینڈوچ یا بسکٹ؟“ میں نے کہا، ”اس وقت میں بالکل پر باش ہوں، کسی بھی شے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنی نارنجی جھاکر چلی گئی۔

تھوڑی دیر تک اس نے ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ”آپ یقین نہیں کریں گے ڈاکٹر صاحب کہ کوئی ٹھنڈا بھر بعد دو پھر میری کوٹھڑی میں آ گئی۔ اس نے اپنا شب خوابی کا لباس اتار رکھا تھا اور محض ایک چادر اپنے گرد لپیٹی ہوئی تھی۔ اس نے پھر اسی تپاک اور ویسی ہی محبت سے کہا، ”آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔“ میں نے کہا، ”بالکل نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں بڑے مزے میں ہوں۔“ اس نے کہا، ”میرے خیال میں یہ بستر آپ کے لیے ٹھیک نہیں اور اس کوٹھڑی کا ماحول بھی تنگ و تاریک ہے۔ آپ میرے کمرے میں آ کر سو جائیں۔“ میں نے کہا، ”آپ کی توجہ اور آپ کی عزائمیت کا بہت بہت شکریہ لیکن میں یہاں بہت ہی کمزور ہوں۔ گھر سے بھی زیادہ آرام میں ہوں۔“ کہنے لگی، ”کسی خاص چیز کی ضرورت ہے، کوئی ایسی چیز جسے آپ مہمان کی حیثیت سے مانگتے ہوئے شرماتے ہوں۔“ میں نے کہا، ”بالکل نہیں۔ میں تو بلکہ بہت ہی بے تکلفی کا وقت گزار رہا ہوں اور آپ لوگوں کی میزبانی کا شکر گزار ہوں۔“ اس نے اپنی نارنجی جھاکر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

یہ کہہ کر ٹوٹی ٹانگ والے مریض نے ڈاکٹر صاحب کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا، ”کل شام، ڈاکٹر صاحب! جب میں اپنے گھر کی ڈھلوان چھت پر چڑھ کر اٹھنا کا رخ سیدھا کر رہا تھا تو اچانک مجھے پندرہ برس پہلے کا واقعہ یاد آ گیا۔ بجلی کی سی تیزی سے مجھے اس نوجوان لڑکی کی بات سمجھ میں آئی اور میرے بدن نے ایک جھنجھکی سی لی۔ اس جھنجھناہٹ سے میں اپنا توازن قائم نہ کر سکا اور چھت سے پھسل کر باہر کی سڑک پر جا گرا۔ ٹانگ کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹ گئی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ اب ڈاکٹر صاحب یہ حادثہ تو پندرہ برس پرانا ہے لیکن اس کی ضرب شدید کا نتیجہ کل برآمد ہوا ہے۔“

اپنے مہمان کے چلے جانے پر ٹھیک چار دن بعد میں رات کے بارہ بجے جاوید نامہ کے تقابل موازنے کے لیے فارسی کا متن دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک نعرہ مار کر میں بستر سے اچھلا اور فرش پر گر گیا۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں کیسے اونچے مقام سے ہوا یا تھا اور میں نے بولتے چلتے بدلوں کے زندہ ناچ گانے میں کس قدر قریب سے شرکت کی تھی۔ ساتویں جماعت میں ہمارے گروپ کا ایک اور نالائق لڑکا پورن اپنے پچو پچو کے عبادتی مٹکے سے ایک تصویر

اڑا لایا تھا۔ یہ تصویر ایک برہنہ عورت کی تھی جسے اس کے پھوپھانے لگا صاحب کی جلد اور جلد پر چڑھے ہوئے خاکی کاغذ کے درمیان چسپا رکھا تھا۔ ڈرل کے پیرڈ میں ہم سب نے اس تصویر کو باری باری دیکھا اور اپنی اس انکشافی مہم پر بہت مسرور ہوئے۔ وہ میٹل سے گندے کارڈ پر لگے ہوئے ہلاک کی چھپی تصویر تھی جہاں ایک پرانی وضع کی آرام کرسی پر ایک بڑی عمر کی برہنہ خاتون بیٹھی تھی۔ یہ اس قدر لگے ہوئے ہلاک کی تصویر تھی کہ اسے نہایت غور سے دیکھنے کے بعد تصور کے زور پر معنی پہنانے پڑتے تھے۔ ورنہ حقیقت میں یہ ایک کھلی ہوئی چھٹی، برف جمانے والی مشین، بھینس کے چہرے اور ٹوٹے ہوئے تانپورے سے ملتی جلتی تصویر تھی۔ پورن کہتا تھا یہ ایک نیوڈ تصویر ہے جو اس کے پھوپھانے شادی سے پہلے کی سنبھال کے رکھی ہوئی ہے۔ ہمیں پورن کا حکم ذہن میں رکھ کر اسے دیکھنا پڑتا تھا تو وہ واقعی ایک نیوڈ تصویر ہی نظر آتی تھی ورنہ حقیقت میں وہ مغلیہ دور کے جھروکے درشن کا ایک طاقتور سی تھی۔

وہ جو نیم دائرے میں بیٹھ کر روحانی اسباق کا ایک سلسلہ شروع ہوا تھا اور جس میں کشا کیے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا، اب ایک مقام پر آ کر رک گیا تھا۔ پہلے تو پادری سائترلی کی دوں فطرتی نے مجھے انسان کے بالوں کے بارے میں بتایا تھا، اب مجھے میرے اندر کے چور نے مشکلیں باندھ کر آگے لگایا ہوا تھا۔ انسان کی گرتی ہوئی اخلاقی قدروں کو دیکھ کر میں نے بھی اپنی قدروں کی کرپڑ شروع کر دی تھی۔

اس سو سال کی مدت میں مجھے تو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کاسینو میرے گھر سے اس قدر قریب ہے اور اس کا شراس قدر ہل اھصول ہے۔ پھر اس پر کچھ خاص رقم بھی خرچ نہیں ہوتی۔ کسی مشکل روٹین کا بھی سامنا نہیں ہوتا۔ کسی کی خوشامد درآمد بھی نہیں۔ کہیں سے کوئی سفارشی چٹھی بھی نہیں لیتی ہوتی۔ بس ایک مرتبہ حوصلہ کر کے چلے جانا ہوتا ہے اور پھر آمد و رفت میں آسانی ہو جاتی ہے۔

اچھے بیٹھے، سو تے جاگتے مجھے رہ رہ کر ان لڑکیوں کا خیال ستانے لگا جو جزیرہ سسلی سے آنے والی تھیں جن کے بال سیاہ اور آنکھیں ہرنوں جیسی کالی تھیں۔ پر وہ ان سنبھلے بالوں والی مرتد اہل کتاب لڑکیوں کے مقابلے میں میرے مسلک کے قریب تھیں۔ ان میں عرب خون تھا۔ وہ مسلمان عکمرانوں کی اولاد تھیں اور اس حوالے سے میرے قریبی رشتہ دار کی بیٹیاں تھیں۔ میں نے ان کی طرف رجوع کرتے ہوئے یہ محسوس کیا گویا میں اپنی عم زادوں سے ملنے جا رہا ہوں اور ان سے پرانے رشتوں کی لڑیاں تلاش کرنے جا رہا ہوں جو ایک عرصہ ہوا ہم دونوں سے ٹوٹ کر وقت کی وادیوں میں گم ہو گئی تھیں۔

ایک شام میں گھر سے نکل کر ایک لڑکھن کا سٹیل کا چکر کاٹ کر سینٹ پیٹر کے راستے واپس آ گیا۔ میں اپنے سکوتر پر وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کوئی میرے سکوتر کو وہاں دیکھ کر اور اس کا نمبر پڑھ کر اندازہ لگا لے گا کہ میں اندر ہوں۔ پھر وہ یونیورسٹی کے ریکٹر سے اور پاکستانی سفیر سے بیک وقت میری شکایت کر دے گا اور میری نوکری ختم کر دی جائے گی۔ کوئی یہ تھوڑی چلتا ہے، انسان کے ساتھ سود دوست سود دشمن ہوتے ہیں، ہر کوئی اعتبار کے قابل تو نہیں ہوتا۔

میں نے سکوتر واپس لا کر گھر چھوڑ دیا اور بس پکڑ کر تراس تیر سے کے پل پر پہنچ گیا۔ یہاں سے وہ مقام، وہ

مقام محبوب اور مقام مجبور بس اتنی دور ہی ہے جتنا لیاقت باغ پنڈی سے یا پرانی انارکلی لاہور سے گورنمنٹ کالج یا پلیٹس سٹریٹ کے ایک سرے سے دوسرا سر۔ لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لیے کئی چھوٹی بڑی گلیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ تب جا کر چھوٹے فوارے والا تڑپا آتا ہے۔

کوٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سر جھکائے، کندھے آگے نکالے۔ کمر میں کب ڈالے، گلے میں بھی دانہ اور لعاب سپتال کا گولہ سا انکائے، من من کے قدم اٹھاتا میں اس گلی کی طرف چلا جا رہا تھا جہاں میرے ہم مسلک اور ہم مذہب لوگوں کو ہرگز نہیں جانا چاہیے لیکن اس وقت کوئی میرے ساتھ ساتھ، میری بائیں طرف، میرے جسم سے دو تین فٹ دور میرا حوصلہ بڑھاتا ہوا میرے ساتھ ساتھ جا رہا تھا اور مجھے میری فطرت اور میری جبلت کے راز سمجھا رہا تھا۔ میرے کانوں میں، میرے دل یا میرے تصور میں نہیں، میرے کانوں میں، ان کانوں میں جن پر میں دھوپ کی ٹینک لگا تھا، اس کی آواز بڑی واضح اور صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کا لہجہ پنجابی تھا لیکن وہ بڑی صاف ستھری اور شستہ اردو بول رہا تھا اور بار بار میرا نام یوں لے رہا تھا جیسے میرا صدیوں کا دوست ہو۔ وہ بہت پر امید انداز میں مجھے آگے بڑھا رہا تھا لیکن اس بڑھاوے کے ساتھ ساتھ ایک ہلکی سی گونج، ناامیدی اور خوف کی بھی تھی۔

اس نے بڑی دور تک اور بڑی دیر تک میرا ساتھ دیا اور مجھے سیز جیوں پر رکھتے ہوئے دیکھ کر میری بغلوں میں ہاتھ دسے کر مجھے اوپر اٹھایا اور کرسی کی سیز جیوں پر چڑھایا۔ میں نے حوصلہ کر کے خود دروازے کی گھنٹی بجائی۔ کوٹ کے کنواروں کو صبح کو کوٹ کو سیدھا کیا۔ ٹائی کی ناٹ کی میزہ نکالی اور بالوں پر ہاتھ پھیر کر اپنے آپ کو کمپوز کیا۔ میری گھنٹی کی آواز پر اب کی بار ایک ٹھنگنے سے آدمی نے دروازہ کھولا۔ جھک کر مجھے سلام کیا اور اوپر سیز جیاں چڑھنے کا اشارہ کیا۔

بائیں ہاتھ، دوہرے بدن کی وہی سینور سنگ مرمر کے فرش پر وا پیر پھیر رہی تھی۔ اس نے اسی انداز میں ”جی آئیاں نوں، بھلی کری آ، یو سوسو آزی آ، مبارکبادں آ یا شاد مرادی آ“ کہا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے کوسینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا سر جھکا یا اور منزل مقصود کی طرف اٹھنے کو سیز جیوں کی جانب مڑا۔

اس کے ساتھ ہی ایک کڑک دار آواز کا سا ناسا پانچا مرمر کے فرش پر بجلی سی کوئی ”ہے گھوڑا۔“

بد بخت..... حرام زادہ

ناشکر گزار..... لعنتی..... یہودی

پاز آ، پاز آ

کم بخت..... سور کے بچیا!!

واپس پھیرنے والی عورت کے ساتھ حوالدار سند خان اپنی پوری کٹ میں کھڑے تھے اور ان کے ہاتھ میں وہی گول ٹکے والا ہنر تھا۔ انہوں نے وہ ہنر زور سے گھبرا کر اپنی ران پر مارا اور چیخ کر کہا ”ہے گھوڑا۔“

حوالدار صاحب اس وقت پورے جلال میں تھے اور اپنا ہنر گھبرا گھبرا کر اپنے دونوں پہلوؤں کو شدید ضربیں لگا

رہے تھے۔ ان کے ہنر میں سختی کے باوجود بڑی چمک تھی اور اس کے سرے پر لوہے کا گیند سیسے سے بھرا تھا۔ بڑا وزنی اور بڑا خوفناک..... اگر میں وہاں سے اسی وقت اپاؤٹ ٹرن مار کر لوٹ نہ پڑتا تو وہ مجھے اپنے ہنر کے نکلے سے مار مار کر لہو لہان کر دیتے اور وہیں گرا کر جان سے مار دیتے..... مرڈران کا سینو!

میں تیز قدم اٹھاتا گھر واپس بھاگ آیا۔ کافی لمبا راستہ تھا لیکن میں نے سارا پیدل طے کیا۔ ایک عجیب طرح کے پکڑے جانے کا خوف تھا جو گھر پہنچ کر بھی میری جان کا عذاب بنا رہا۔ ہر گھڑی یہی لگتا تھا کہ چونکہ ایف آئی آر درج ہو چکی ہے، اس لیے ابھی کوئی گرفتار کرنے آجائے گا۔ وطن عزیز سے دور، دیار غیر میں اگر خدا خواست آپ کے خلاف کوئی رپٹ درج ہو جائے اور آپ کو پتہ چل جائے کہ سرکاری مشینری حرکت میں آگئی ہے تو زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میرے خلاف بھی ایک سرکاری مشینری حرکت میں آچکی تھی اور میں اپنی تمام تر کوشش اور بھاگ دوڑ کے باوصف زندوں میں نہیں رہا تھا اور میرا نام ادھر سے کٹ رہا تھا۔

(5)

پاکستان میں اچھا کھانے، اچھا پہننے اور کھنچنے کے سوا کچھ کے ساتھ ساتھ کئی ادیبوں نے زندگی کی بے معنویت پر کمال کے مضمون اور افسانے لکھے ہیں۔ اسی طرح چیتنے چٹکھاڑتے شور مچاتے محلوں کے اندر تنگ مکانوں، مستقل مہمانوں اور امدتے چو باروں کے درمیان پڑوسی لڑکیوں سے عشق لڑاتے ہوئے بے شمار شاعروں نے تنہائی اور اکلا پے پر کمال کی تخلیقیں لکھی ہیں اور نقادوں سے جھولیاں بھر کے داد حاصل کی ہے لیکن یہ لوگ نہ تو بے معنویت کی روزمرہ خود کشی سے کبھی گزرتے ہیں اور نہ ہی انہوں نے تنہائی کے دکھ دیکھے ہیں۔

میں تنہا تو خیر نہیں تھا لیکن زندگی اس قدر لایعنی سی ہو گئی تھی کہ اب اس پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ وہ کیفیت جو ایمان اور کفر کے درمیان جہنم لے کر انسان کو دہریت کی طرف مائل کر کے رکھتی ہے، کچھ ویسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ مذہب تو ہر کے ڈنڈے کی طرح ہر وقت لباس کے اندر گھسا ہوا تھا اور سننے پکڑنے پر بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑتا تھا۔ مذہب کی چہرہ دستانیاں، آپس کی خانہ جنگیاں، دشمنوں کے ساتھ لڑائیاں، افراد کی دشمنائیاں اور ظلم کی کہانیاں اتنی زیادہ اور اس قدر دور تک پھیلی ہوئی تھیں کہ ہر قسم کا مذہب زہر آب بن کر رہ گیا تھا۔

حوالدار صاحب کی موجودگی کا واہمہ، ان کی کڑک دار آواز کے بھری التباس اور مذہب کی فوق الفطرتی چہرہ دہشتی نے مجھ سے خوش وقتی کا سامان چھین کر زندگی کو کھٹکڑ سا بنا دیا تھا۔ اب زندگی کے دو ہی عظیم مقصد سامنے تھے۔ روزمرہ کی نوکری یا ایک جھٹکے کی خود کشی! جس لذیذ راتب کی رکابی سے کتے کا منہ سنبھلی کے زور پر واپس کھینچ لیا جائے، اس کا علاج کتے کی سی موت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

میں دیار غیر میں کمی رزق کے خوف سے نوکری کے ساتھ چنار ہا اور اسی عظیم مقصد کو زندگی کا سہارا بنالیا۔ اور نیکل انسٹی ٹیوٹ کی ساری کلاسیں شام کے پانچ بجے ختم ہو جاتی تھیں لیکن مجھے سات بجے تک بیٹھنا پڑتا تھا۔ اصل کلاس کے ختم ہو جانے کے بعد مجھے گھنٹہ بھر کلاس روم میں فارغ بیٹھنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد ایک نیا درس شروع ہوتا تھا۔ اس درس کا صرف ایک ہی طالب علم تھا اور اس خصوصی کلاس کے لیے مجھے الگ سے بستر ملتا تھا۔

میرے اس سٹوڈنٹ کا نام وٹوریو ولونیکا تھا اور یہ منسٹری آف کامرس میں سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھا۔ بھرا ہوا مضبوط جسم، میدہ اور شہاب چہرہ، کالی سیاہ داڑھی جس میں چاندی کی سفید تاریں، آنکھوں پر مونے فریم کا چشمہ، چوڑی پیشانی، کانوں کے اندر بالوں کے کنگھریالے پھلے، بائیں ہاتھ میں موٹی میرٹ رنگ۔

وٹوریو ولونیکا مجھ سے عمر میں کوئی اٹھارہ بیس سال بڑے ہوں گے لیکن جس ادب اور سپردگی کے ساتھ کلاس روم کے دروازے پر آکر اندر داخل ہونے کی اجازت مانگتے، میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا۔ میں نے ان سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ اندر آنے کے لیے اجازت نہ مانگا کریں، سیدھے اپنی سیٹ پر آ جایا کریں لیکن ان پر میری اس درخواست کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ جن دنوں میں نے انہیں پڑھانا شروع کیا، وہ سندھ اردو یڈر برائے جماعت ہفتم پڑھ رہے تھے۔ اس کے ساتھ بائگ دراکٹوں کا مختصر انتخاب تھا جو پروفیسر باؤسانی کی نگرانی میں جمع کر کے سائیکلو پائل کیا گیا تھا۔

جب میں نے پہلی مرتبہ ان سے پوچھا کہ وہ اردو کیوں پڑھ رہے ہیں تو انہوں نے کہا "ہم پاکستان کے ساتھ اپنی تجارت بڑھانے کے خواہش مند ہیں۔ بڑھانے کے لیے، شروع کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اس نئے ملک کے ساتھ تجارتی جانکاری حاصل کرنے کے لیے ہمیں آفیسروں کے علاوہ چھوٹے تاجروں اور دکانداروں سے بھی ملنا پڑے گا۔ ان سے ملنے اور ان کی طلب سے بہرہ مند ہونے کے لیے ان کی زبان میں گفتگو کرنا ہوگی اور چونکہ ان کی قومی زبان اردو ہے، اس لیے میں اردو پڑھنے پر مجبور ہوں۔"

ڈاکٹر ولونیکا، اکناکس کے پی ایچ ڈی تھے اور عربی زبان سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ عربی زبان پر حاوی ہونے کی وجہ سے انہیں اردو سیکھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہو رہی تھی اور وہ مجھے کسی قسم کی تکلیف دینے بغیر ہی آسانی سے سبقتاً آگے بڑھ رہے تھے لیکن ان کے ساتھ ایک مشکل ضرورت تھی کہ وہ فقرے کی ساخت کو گرامر کے اصولوں پر رکھ کر آگے چلتے تھے۔

ایک دفعہ عبارت میں "دھلوائی" کا لفظ آیا تو ڈاکٹر صاحب رک گئے۔ پھر میری طرف منہ کر کے پوچھنے لگے، یہ دھلوائی کیا ہے؟ میں نے کہا یہ لفظ دھونے، دھلنے اور دھلوانے سے متعلق۔ جیسے ہم کپڑے دھلاتے ہیں، فرش دھلاتے ہیں، ہاتھ دھلاتے ہیں اور ان کے علاوہ..... لیکن ڈاکٹر صاحب نے میری بات کاٹ کر کہا "وہ تو ٹھیک ہے سر۔ دھونے کے عمل کو تو میں اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔ میں تو آپ سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ "دھلوائی" گرامر میں کیا ہے؟"

میں نے کہا "اوہ..... یہ تو سیدھی سی بات ہے..... دھلوائی بھی..... دوسرے پیشوں کی طرح بس ویسی ہی ہے..... اور اس کو اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کے رخ میں بھی وہی عمل پایا جاتا ہے۔"

لفظوں اور نوٹوں نے پھونے فھونے کے اندر ٹانگ نوٹیاں مارتے تھے اچانک یاد آ گیا اور میں نے منہ پکا کر کے یقین کے ساتھ کہا "ڈاکٹر صاحب دھلوائی اسم ہے..... اسم..... ناؤن....." ڈاکٹر صاحب نے ادب کے ساتھ سر جھکا لیا اور جیسی آواز میں بولے "اسم تو ہے سر مگر کیا اسم ہے؟"

اب مجھے کیا معلوم تھا کہ ان اسموں کم بختوں کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں اور ولایت کے طالب علم ان ساری

قسموں سے واقفیت حاصل کیے بغیر آگے نہیں چلتے تو میں نے بڑی شرافت کے ساتھ اقرار کر لیا کہ مجھے معلوم نہیں "دھلوائی" کس قسم کا اسم ہے۔"

ڈاکٹر ولونیکا نے کہا "پہلے چھوڑیے، اس کو پھر دیکھ لیں گے، پہلے ہم اپنا سبق ختم کر لیں۔" سبق ختم ہوا۔ کلاس ختم ہوئی۔ ہم دونوں دروازہ بھیڑ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو کوئی رات کے بارہ بجے مجھے ڈاکٹر ولونیکا فون آیا کہ "دھلوائی اسم معاوضہ ہے۔"

میں نے کہا "اچھا! آپ یہ پوچھ رہے تھے، یہ تو واضح اسم معاوضہ ہے۔ اس وقت میں ٹھیک سے آپ کی بات نہیں سمجھ سکا۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "ٹھیک ہے سر! میری اردو بول چال ابھی کافی کمزور ہے اور میں اپنا مطلب ٹھیک سے سمجھا نہیں سکتا، آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔"

جن دنوں کا میں نے ابھی ذکر کیا کہ میں مذہب سے پوری طور پر متنفر ہو چکا تھا اور میں نے اپنے آپ کو مذہب اسلام سے مکمل طور پر خارج کر لیا تھا، انہیں دنوں بھانا کے تہوار پر میری ایک ایسی لڑکی سے ملاقات ہوئی جو اپنے علاقے کی نامی گرامی مارکسٹ تھی اور سیاسی امور پر گہری فطرت رکھتی تھی۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ مذہب تو عوام الناس کے لیے انیوں کا وسیلہ رکھتی ہے اور اس نے نوع انسانی کے درخشاں مستقبل کو کھد بڑے رکھ دیا ہے..... اس لڑکی نے مجھے اپنا فون نمبر دیا اور میں نے جواباً اس کو اپنا فون نمبر بھی دیا اور ساتھ گھر کا پتہ بھی بتا دیا..... ہم کئی وجوہات کی بنا پر ایک دوسرے سے کل بہت خوش ہوئے کہ وہ گھر سے سہارا کی لڑکی تھی اور بڑی خوش خلق تھی!

ایک شام ڈاکٹر ولونیکا کی کلاس لینے وقت پہنچ کر کلاس کے کالے بادل آ کر آسمان پر چھا گئے کہ باہر اندھیرا گھپ ہو گیا۔ سڑک پر چلتی ہوئی بتیاں کسی وجہ سے اچانک بجھ گئیں اور میرے چہرے پر تشویش کے آثار پیدا ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "سر! شاید آج آپ کو بس یا ٹرام ملنے میں تکلیف ہو۔ اس لیے آج آپ کو میں گھر چھوڑ کر آؤں گا۔" میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ باہر تیز بارش ہونے لگی اور موسم اچانک سرد ہو گیا۔ میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب اگر آپ برآمدہ نامیں تو میں اپنی برساتی چھن چھاؤں، کچھ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب میری بات کا جواب دینے بغیر جلدی سے اٹھے۔ کھونٹی سے میری برساتی اتار کر اسے پہنانے کے انداز میں کھول کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے پہن تو لی مگر انہیں آئندہ کے لیے ایسی خدمت کرنے سے منع کر دیا۔

جب وہ میرے سامنے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے تو اس بڑے سارے کلاس روم کو باہر کے موسم نے سیل بند کر کے ہمیں بالکل تنہا کر دیا۔ ڈاکٹر ولونیکا نے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو ہم پڑھائی بند کر دیں!"

میں نے کہا "ضرور! ضرور!!!" کچھ عجیب سا موسم ہو گیا ہے۔ "انہوں نے فہم کر لیا کہ "کم از کم پڑھائی کے قابل نہیں رہا۔ اعتراف کے مناسب ہو گیا ہے۔"

ہم دونوں کافی دیر تک خاموش بیٹھے باہر ہونے والی بارش کی آواز سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

اچانک ڈاکٹر صاحب نے اپنی چند آکھیں اوپر اٹھا کر کہا ”سر! کیا میں آپ سے ایک پرائیویٹ بات کر سکتا ہوں؟ خالص پرائیویٹ بات۔ اپنی زندگی سے متعلق۔“

میں نے کہا ”ضرور ضرور، ڈاکٹر صاحب یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ آپ جو کہنا چاہتے ہیں، شوق سے کہیں میں گوش برآواز ہوں۔“

انہوں نے رک رک کر بڑے شرمیلے انداز میں کہا ”استاد محترم! آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور بہت زیادہ کرتا ہوں..... ایسی گہری اور شدید محبت جس کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا جاسکتا۔“

میں کچھ گھبرا سا گیا اور جی آواز میں بولا۔ ”آپ کی مہربانی ہے ڈاکٹر صاحب۔“
انہوں نے میری بات سننے بغیر جلدی سے کہا ”اور سر! ایسی محبت بتائی بھی نہیں جاتی اور بتائی بھی نہیں جاتی اس میں ایک عجیب طرح کا لگاؤ ہوتا ہے۔“

ڈاکٹر ولونیکا میری طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں محبت بھی تھی، عظمت اور شفقت بھی۔ مودت اور مروت بھی، شہوت اور شرافت بھی۔ عاجزی اور سپردگی بھی۔ جیسے جھوٹا ”حال“ کھیلنا انسان کی عجیب خدائیں میں چلا جاتا ہے، اسی طرح ڈاکٹر ولونیکا میرے سامنے سہات میں بیٹھے تھے اور خوشی اور کامرانی کے جذبے سے مسکراتے رہے تھے۔ میں نے کسی قدر تجیدگی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب؟“

تو ڈاکٹر ولونیکا بیکر ٹری کا مرس، وزارت تجارت، فیڈرل گورنمنٹ آف اٹلی نے کہا ”جناب والا۔ آج سے ٹھیک نو برس پہلے میں مسلمان ہو چکا ہوں لیکن مجھے اس کا کوئی شائد ستیاب نہیں ہوا۔“
میں ان کی بات بالکل نہیں سمجھ سکا اور ان کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پہلے تو محبت سے دبا ہوا پھر تنہا چھانے لگا۔ میں نے کہا ”مبارک ہو ڈاکٹر صاحب، دلی مبارک، روحانی اور قلبی مبارک۔“

انہوں نے میرا شکریہ ادا کر کے آہستگی سے کہا ”لیکن میں اسے مکمل نہیں سمجھتا۔ اس میں ابھی گپ ہے۔“
میں نے کہا ”گپ کوئی نہیں ڈاکٹر صاحب۔ یہی اکمل اور اسلم مذہب ہے جو آپ نے قبول کیا اور یہی وہ دین ہے جس نے آپ کو پسند فرمایا اور کیوں نہ ہو۔“ میں نے خوشی سے ان کا کندھا تھپتھا کر کہا ”میرے مذہب میں ایک شریف النفس، قابل قدر، صلح کل اور انسان دوست شخص کا اضافہ ہوا..... لیکن یہ سب کیسے ہوا ڈاکٹر صاحب؟“

تو یوں نے کہا ”جن دنوں میں عربی پڑھ رہا تھا اور میں نے اس زبان پر کافی دسترس حاصل کر لی تھی تو ایسے ہی شوقیہ طور پر میں نے قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ تھوڑے دنوں بعد زبان کا اور زیادہ مزالینے کو میں نے ساتھ الف لیلہ کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ ایک روز قرآن پڑھتا اور دوسرے روز الف لیلہ۔ دونوں چیزوں نے مجھے بڑا لطف دیا لیکن آہستہ آہستہ الف لیلہ کے مطالعے سے میری طبیعت اچاٹ ہو گئی اور میں خالصتاً قرآن کا ہو کر رہ گیا۔“ ڈاکٹر ولونیکا نے غور سے میری جانب دیکھا اور پھر خاموش ہو گئے۔ میں بھی نہیں بولا۔ تھوڑی دیر بعد خود ہی کہنے لگے ”استاد مکرم! کیا آپ نے قرآن پڑھا ہے؟“ میں نے کہا ”بچپن میں پڑھا تھا ڈاکٹر صاحب، اس کے بعد وقت ہی نہیں ملا۔ بی اے، ایم اے کی

تیاری میں لگے رہے۔ اب ارادہ ہے کہ جو نبی فرصت ملے گی قرآن ضرور پڑھنا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا ”آپ کے پاس یہاں ہے کہ میں لا دوں؟“

میں نے کہا ”نہیں۔ میرے پاس ہے ایک مائل شریف۔ میری ماں نے چلتے وقت دی تھی لیکن میں اسے کھول نہیں سکا۔ یہاں بھی وقت نہیں ملتا ڈاکٹر صاحب۔“

باہر بارش کا کافی تیز ہو گئی اور آسمان پر گہرا اندھیرا چھا گیا تھا۔ بجلی چمکنے کے وقفے لے ہونے کی وجہ سے آسمان اور بھی تاریک ہو گیا تھا اور ہمارے کلاس روم کی خاموشی اور بھی بڑھ گئی تھی۔

ڈاکٹر ولونیکا نے کہا ”جوں جوں میں قرآن پڑھتا تھا، میرے ذہن کے جالے اتر رہے تھے۔ جو چیز سمجھ میں نہیں آتی تھی، جہاں جہاں کوئی سہی رمز ہوتی تھی، اس سے روح کی ذات میں بالیدگی پیدا ہو جاتی تھی۔“

ڈاکٹر ولونیکا نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے پونے جوڑ کر کہا ”روح کی باقاعدہ ایک ذات ہوتی ہے سر! اور یہ ذات باہر کے حالات اور واقعات سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔ اس کی صحت ”جسمانی“ قائم رکھنے کو اسے سری رموز سے وابستہ رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اس کی خوراک اور اس کے تغذیے کا منبع ”لامعلوم“ میں ہوتا ہے اور اس کی ڈرپ لامعلوم کے گلو کوڑکی تھیلی سے بندھی ہوتی ہے۔“

اس نے میرا منہ تھیرے کھلا دیکھ کر کہا ”سیدھی سی بات ہے سر کہ انسانی فہم و دانش کی آبیاری قرآن کے مضمون اور متن سے ہوتی ہے اور انسانی روح کی ساری ”فرش منٹ“ حروف مقطعات سے اور نہ سمجھ میں آنے والی آیات سے جڑی ہوئی ہے لامعلوم سے وابستہ ہے۔ یہ ”لامعلوم“ کی کائنات، معلوم سے بھی بڑی اور اس سے بھی گہری ہے۔ اس کی کوئی تھاد ہی نہیں۔“

میں نے اس کی بات نوٹ تو کر لی لیکن میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے۔ میرے حساب سے تو لامعلوم کوئی شے ہی نہیں تھی۔ نہ قابل لمس نہ قابل محسوس نہ کوئی مرئی نہ غیر مرئی۔ میں نے اس کا دل رکھنے کو یونہی ہاں ہاں کر دیا اور شاید وہ بھی کسی حد تک میری ہاں ہاں کو سمجھ گیا۔

کہنے لگا ”وہ رات بھی تقریباً ایسی ہی تھی۔ اسی قدر تاریک اور ایسی ہی گھبرائی لیکن اس وقت سے تھوڑی سی آگے تھی۔ رات کا ایک یا ڈیڑھ بج رہا ہوگا۔ میری بیوی اور بچے دونوں گہری نیند سو رہے تھے اور ان بچاروں کو پتہ نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور ذرا سی دیر بعد خود میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے..... میں نے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور آہستگی سے چلتا ہوا الف کے سامنے سے گزر کر بیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ بڑی گریہ پائی سے جب میں اپنی عمارت کی ساتویں منزل طے کر کے کوٹھے پر پہنچا تو وہاں بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی۔ چھت پر اٹھا ہوا پانی پر نالوں کے اندر چنگھاڑتا ہوا داخل ہو رہا تھا لیکن اب بھی چھت پر اس کی سطح تین تین چار چار بج رہی تھی اور ابھی اس میں اور پانی جمع ہو رہا تھا۔“

میں اپنے جوتے اتار کر چھت کے عین درمیان میں جا کھڑا ہوا اور منہ اوپر اٹھا کر بولا ”اے مسیح دہمیر اور اے عظیم و خیر تو جانتا ہے کہ میں ملک میں اور اس شہر میں اکیلا ہوں اور یہاں کوئی میرا محرم اسرار نہیں۔ میں تیرے ان مظاہر کو،

اس بادل، بجلی، بارش اور موسم کو گواہ بنا کر تیرے پسندیدہ دین اسلام میں داخل ہوتا ہوں اور اپنے آپ کو تیرے سامنے پیش کر کے عرض کرتا ہوں کہ مجھے ان مشکلات کے برداشت کرنے کی طاقت عطا فرما جو مسلمان بننے کے بعد مجھ پر اپنا بوجھ ڈالیں گی..... تو جانتا ہے کہ میں ایک بہت ہی کچا اور بے حد بودا مسلمان ہوں اور تیرے فضل کے بغیر اگلا سانس بھی نہیں سے سکتا۔ اس لیے مجھ پر خصوصی عنایت فرما نا اور اس عنایت کو آگے سے آگے پھیلاتے جانا۔“

ڈاکٹر ولونیکا نے کہا ”میری اس تہذیبی مذہب پر مجھے کسی مظہر قدرت سے تو کوئی نشانی نہ ملی البتہ وہاں کھڑے کھڑے میری آنکھوں سے آنسوؤں کی ایسی جھڑی لگی کہ بارش کے پانی میں میری آنکھوں کا پانی بھی شامل ہونے لگا۔ جب میں آہستہ آہستہ میز صیالیاتر کر چھت پر نیچے اپنی پہلی منزل پر آیا تو میرے قلب کے گھلے دروازے پر میری بیوی اور بیٹا کھڑے تھے اور ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔“

ڈاکٹر ولونیکا نے قصوری دیر توقف کے بعد کہا ”ان دونوں کے ساتھ میرا کیا ناظمہرا، یہ ایک انگلیت کہانی ہے لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اب ان کو بھی پتہ چل گیا ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد مجھ میں کچھ خوشوار تبدیلیاں ہی پیدا ہوئی ہیں۔“

باہر بارش کی یورش قدرے کم ہو گئی تھی۔ سڑک کی روشتیاں بھی لوٹ آئی تھیں اور کلاس روم کے اندر کافضائی دباؤ بھی نازل ہو گیا تھا۔ میں نے کہا ”ڈاکٹر صاحب! میرے لیے تو آپ کی عطا کردہ یہ خبر بہت بڑی تقویت کا باعث بن گئی ہے کہ اب اس درس گاہ میں میں اکیلا نہیں۔“

انہوں نے کہا ”اب جس مقصد کے لیے میں نے آپ کو یہ روداد سنائی ہے، اسے آخری بیج دینے کے لیے میری مدد کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پاکستان سے اسی کام کے لیے بھیجا ہے۔“

میں نے کہا ”فرمائیے! میں حاضر ہوں۔“

کہنے لگے ”میں آپ کی موجودگی میں، آپ کے سامنے اپنے مسلمان ہونے کا اقرار اور اعلان کرنا چاہتا ہوں اور آپ کو اس میں شہد بنانا چاہتا ہوں کہ بغیر شہادت کے نیت اعلان کا درجہ اختیار نہیں کرتی۔“

میں نے کہا ”ڈاکٹر صاحب، مجھے تو کسی کو مسلمان کرنا نہیں آتا۔ نہ تو آج تک میں نے کسی کو شرف بہ اسلام کیا ہے اور نہ ہی میں اس کے آداب سے واقف ہوں۔ بس جس طرح سے آپ نے کر لیا، وہ بالکل ٹھیک ہے۔“

کہنے لگے ”آپ کو کچھ نہیں کرنا پڑے گا جس طرح آپ ہیں، اسی طرح رہیں گے۔ فقط روز مشربک اس حقیقت کے گواہ رہیں گے۔“

پھر انہوں نے قدرے اونچی آواز میں اعوذ باللہ..... اور بسم اللہ پڑھنے کے بعد ایک سورت کی تلاوت کی۔

اور آخر میں کہا ”یا اللہ! یا رب کعبہ میں تو ریلوونیکا اپنے استاد محترم اشفاق احمد کے سامنے تیرے وعدہ لا شریک ہونے کا اعتراف کرتا ہوں اور محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی برحق اور نبی آخر الزماں تسلیم کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ میں تیرے فرستادہ نبیوں، تیرے فرشتوں اور روز قیامت پر ایمان لا کر محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت

میں داخل ہونے کا اقرار کرتا ہوں۔“

پھر ہم دونوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور ایک دوسرے کے لیے ایمان کی سلامتی اور دین و دنیا میں سرخرو ہونے کی دعائیں مانگیں۔

ڈاکٹر وٹور یو ولونیکا پورے ڈیڑھ سال مجھ سے سبق لیتے رہے اور باقاعدگی کے ساتھ کلاس روم میں آتے رہے۔ آخر شام چونکہ پوری انٹرنیٹ ٹیوٹ میں ہم دونوں ہی ہوتے، اس لیے مغرب کی باجماعت نماز باقاعدگی سے ادا کر کے اور بڑا دروازہ بھینٹ کے اپنے اپنے گھر جاتے۔ بس یہی ایک نماز تھی جو میں نے باقاعدگی کے ساتھ ڈیڑھ سال تک روم میں پڑھی لیکن ڈاکٹر ولونیکا کے فارغ التحصیل ہونے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ وہ پھر بھی مجھے تقریبوں اور تہواروں میں ملتے رہے لیکن ہمارے درمیان کوئی باقاعدہ رابطہ نہ رہا۔

انہی ایام میں میں نے نقوش کے لیے ایک افسانہ ”گلہ بان“ کے عنوان سے لکھا لیکن آدھی مسافت طے کرنے کے بعد میں نے اس کا نام ”چرواہا“ کر دیا لیکن افسانہ سمجھوانے سے پہلے جب میں نے اس پر نظر ثانی کی تو چرواہا کاٹ کر اس کا نام ”گدڑیا“ کر دیا۔

یہ افسانہ پاکستان پوسٹ کر دینے کے بعد مجھے اس وہم نے گھیر لیا کہ افسانہ اچھا نہیں ہے اور اس کی بہت میں جھول رہا گیا ہے۔ کہانی میں ڈاکٹر وٹور یو ولونیکا میرے مڈل سکول کے استاد لالہ بھگت رام اور گیانی جی کی جھلک ضرور ہے لیکن اس میں ان کی ہوتے نہیں ہے۔ میں نے فوراً ایک خط محمد طفیل کو لکھا کہ افسانہ روک لیں، یہ ترسیم طلب ہے۔ اسے ٹھیک کر کے آپ کے پاس بھیجوں گا لیکن ان کا جواب آیا کہ اب تو بڑی دیر ہو گئی، فرسے چھپ رہے ہیں۔

چند دنوں میں رسالہ چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا۔ کوئی ایک ماہ بعد محمد طفیل نے رسالے میں چھپا ہوا افسانہ کاٹ کر مجھے بھیج دیا اور ساتھ ہی ایک مختصر سا خط لکھا کہ افسانہ اچھا رہا، لوگوں نے پسند کیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اچھا ہوا، اس کی کوتاہیوں پر لوگوں کی نظر نہیں گئی..... یہ کہانی میں نے ڈاکٹر وٹور یو ولونیکا کو پڑھنے کے لیے دی تو انہیں بہت ہی پسند آئی۔ کہنے لگے ”کاش میرا کردار بھی داؤ بی جیسا ہوتا“ میں نے کہا ”آپ تو دن اپ ہیں کہ منزل پر پہنچ بھی گئے، وہ ابھی تک ابن اسبیل ہیں۔“

ہر تیرا مکان آسیب زدہ ہوتا ہے اور اس کے کمین موری کے راستے اس میں داخل ہوتے ہیں؟ کیا آپ ہر کام کرنے سے پہلے پتہ کھلاتے ہیں اور شگون سے کام لیتے ہیں۔ کیا آپ ایسی دھوتی باندھتے ہیں جو آگے سے کھلی ہوتی ہے اور اس میں کوئی زپ نہیں ہوتی؟ کیا یہ درست ہے کہ آپ کے گھروں میں سانپ، گویہ، سانپے، نیولے پالتو جانوروں کے طور پر رکھے جاتے ہیں اور گھر کے سب لوگ ان سے بڑا پیار کرتے ہیں۔

سینور یناچسالی باوجود اس کے کہ سارے بڑھے پروفیسروں کی آنکھ کا تاریہی اور پوری یونیورسٹی کے لڑکوں کی نگاہوں کا مرکز اور لڑکیوں کے دلوں کی پھانس تھی، ایک معمولی لائبریری اسٹنٹ ہونے کے باوصف یونیورسٹی سنڈیکیٹ سے کوئی سا بھی کام لے سکتی تھی۔ چسالی اس وقت کے روم کی اتنی خوبصورت لڑکی تھی کہ کسی کو اس سے محبت کرنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کی ٹکری ایک اور لڑکی بھی ہمارے روم میں تھی لیکن وہ بیٹا لولو برہنہ کے نام سے فلموں میں چلی گئی۔

میں نے اپنے مارکر کی کپ لگا کر اور کتابت کی کاپی بند کر کے پورے اعتماد سے کہا، "سینور یناچسالی! یہ سب کچھ جو آپ نے سنا ہے یا کہیں پڑھا ہے، محض بکواس ہے اور اس کا حقیقت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ میرا ملک بلاشبہ ایک نوزائیدہ ملک ہے لیکن اس کی تاریخ ہزاروں لاکھوں سال پرانی ہے۔ ہم لوگ نہ تو ضعیف الاعتقاد ہیں اور نہ ہی غیر طبعی، غریب اور دھمی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں نہ تو کوئی بھوت رہتا ہے اور نہ ہی یہاں کسی آسیب کا ممکن ہے۔ جادو ٹونا، تعویذ، گنڈا، تو انسان کے کسی کام آ سکتا ہے اور نہ ہی اس کا وار کسی انسان پر چل سکتا ہے۔ یہ سب خیالی چیزیں ہیں جو پرانے مصنفوں نے اپنے زمانے کے لوگوں کا دل بہلانے کو اختراع کی تھیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی رشتہ نہیں۔ میرے ملک کے پالتو جانور ملی، کتا، گھوڑا، اگے، شکرے، باز، شہباز ضرور ہیں لیکن جن حشرات کا تم نے نام لیا ہے، ان کو ہم نے ہڈیوں کے سوا اور کہیں نہیں دیکھا۔ میرے ملک کے ایک حصے میں دھاری دار شیر ضرور ہوتا ہے اور میرے مشرقی پاکستان کے عزیز اور رشتہ دار بنگال ناگ شیر ضرور پاتے ہیں اور ہاتھیوں سے سواری کا کام بھی لیتے ہیں لیکن اور کسی جانور کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے۔۔۔۔۔ سینور یناچسالی! یہ جو تمہارے ذہن میں سری اور ریزی اور مشکوک قسم کے خیالات ہیں، ان کا انسانی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اسرار آمیز باتیں سب خیالی اور قیاسی ہیں، ان کی بنیاد کوئی نہیں۔ اسائن کچھ بھی نہیں۔"

سینور یناچسالی میری لمبی بات سننے کے بعد ایک مرتبہ پھر مسکرائی اور سر ہلا کر کہنے لگی، "سوری پروفیسر! میرا مطلب آپ کو پریشان کرنا نہیں تھا، صرف معلومات حاصل کرنا تھا اور مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ یہ سب قیاس اور خیالی چیزیں ہیں اور ان کا کم از کم اس دنیا میں کوئی وجود نہیں۔۔۔۔۔ کاش آپ مجھے پہلے لے آتے تو میرے ذہن کی ساری گریں کھل چکی ہوتیں اور میں شانت سروپ زندگی گزار رہی ہوتی لیکن افسوس آپ بڑی دیر کے بعد ملے۔ پھر بھی شکر ہے کہ آپ ملے تو سہمی۔ آپ کی بڑی مہربانی اور اس وضاحت کا دلی شکریہ۔"

چسالی اپنی اونچی اڑی ہوئی کوٹنگ روم کے چوبی فرش پر کڑے کڑے سے بجاتی ہوئی نکل گئی تو پروفیسر فیراکوٹی نے اپنی عینک کے ہلائی شیشوں سے نگاہیں اوپر اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا اور پھر کافی دیر تک دیکھتے چلے گئے۔ شاف روم

روم، جس کو گھر کے اور باہر کے سبھی لوگ "چٹا لہرنا" یعنی شہر ازل کہہ کر یاد کرتے ہیں اور اسے گڑا لہرنا کہتے ہیں۔ یہ پہلے آباد ہونے والا شہر قرار دیتے ہیں۔ یہ خوبصورت بھی ہے اور پر شکوہ بھی، اونچائیوں، اتاریوں اور باغوں، بہاروں والا بھی اور کھنڈروں، خرابیوں اور ویرانوں والا بھی۔ اسی کے لیے تو حکم ہے کہ میری زمین کی سیر کرو۔

ایسے خوبصورت، دلاویز اور تاریخی شہر کے اندر اس کی یونیورسٹی بھی کس آن بان کی ہوگی۔ آپ اس کا اندازہ آسانی سے کر سکتے ہیں لیکن اس یونیورسٹی کے شاف روم کے بارے میں آپ کا قیاس بہت دور تک آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا کہ ہم پرانا شاف روم چھوڑ کر نئے میں منتقل ہو گئے تھے اور نیا شاف روم ویسا نہیں تھا جیسا آپ نے سوچا تھا۔ وہ تاریخی ضرور تھا لیکن آج کی تاریخ کا۔ اس کا روستہ الگ ہی کی پرانی تاریخ سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن تھوڑی دیر اس سے مانوس ہونے کے بعد اس کی ہیئت تبدیل ہو جاتی تھی اور یہ پرانی تاریخ کا ایک حصہ بن جاتا تھا۔ آپ نے نفسیات کی کتابوں کے "اوراک" کے باب میں بہت سی ادراکی مثالیں دیکھی ہوں گی جو کبھی عورت نظر آتی ہے، کبھی گلدان، کبھی زینہ اور کبھی پھیننے دار رومال۔ بس یہی حال ہمارے نئے شاف روم کا تھا۔ جو بیس سیزر کے زمانے کا بھی لگتا تھا اور موسیو لینی کے اندھا دھند دور کا بھی۔

شعبہ فزکس کے صدر پروفیسر فیراکوٹی، شعبہ ہسپانوی کے پروفیسر بائنی کے پروفیسر اور ارضیات کے پروفیسر اپنے اپنے مطالعے میں مستغرق تھے اور میں اپنی سیٹ پر بیٹھا کتابت کی مشق کر رہا تھا۔ اس زمانے میں چوڑے خط کے مار کرنے آئے تھے۔ ان سے اردو بڑی اچھی لکھی جاتی تھی اور آپ سے آپ لکھی جاتی تھی۔

میں آسانی کا غد پر گہرے نیلے مارکر سے غالب کا شعر لکھ کر اسے سجا رہا تھا کہ اگلے روز باؤسانی کو دوں گا کہ سینور یناچسالی عین میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور غور سے عمل کتابت کا نظارہ کرنے لگی۔ میں نے نگاہیں اوپر اٹھا کر جو دیکھا تو اس نے مسکرا کر کہا، "پروفیسر! میں معافی چاہتی ہوں، کیا یہ حقیقت ہے کہ آپ کے ملک میں لوگ ابھی تک ضعیف الاعتقاد ہیں اور بھوت پریت، جادو ٹونا اور تعویذ گنڈے پر ایمان رکھتے ہیں؟ کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے ملک میں

مجھے پروفیسر فیراکوٹی کی بات سن کر زبردست دھچکا لگا اور میں سوچنے لگا کہ ایڑیکو فیڑی کی سیٹ پر بیٹھ کر کام کرنے والا یہ استاد کیسا سادہ لوح ہے کہ اس کو معلومات عامہ کی ایک سادہ سی بات بھی معلوم نہیں!

دور تیس اور ایک دن بڑی چتا اور بدھا میں گزرے کہ یا اللہ اتنے بڑے پروفیسر کو اتنی سی بات بھی معلوم نہیں کہ فوق العادہ باتیں ذہن کی اختراعیں، نامعلوم کے خوف اور کم کوشی کے جواز ہیں، ان کی اصل کچھ بھی نہیں۔ میرا مزہ تو نہیں لیکن اگر مجھے معاف کر دیا جائے تو میں یہ کہنے سے بھی گریز نہیں کروں گا کہ یہ سارا وقت سوز و ساز روی اور چچ و تاب رازی کے متبع میں گزرا لیکن تیسرے روز میں نے پروفیسر فیراکوٹی کو ان کی فزکس لیبارٹری میں جا پکڑا۔

وہ اس وقت کتھنی رنگ کے گگ میں الہہر یوکانی پی رہے تھے اور اپنے سامنے رکھے ہوئے بلور کے آلات کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے غل ہونے کی معافی چاہی تو انہوں نے کمال مہربانی سے میرے لیے جگہ کافی کا ایک گگ بوالیا اور کھڑکی سے باہر دیکھ کر کہنے لگے "یوں تو بارش کے آثار بڑے واضح اور نمایاں ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ بارش ہوگی نہیں، یہ ابر پھٹ کر معدوم ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "اگر بیکو پروفیسور! مجھے آپ کی پرسوں کی بات نے بڑا پریشان کر رکھا ہے اور میں اس وقت سے سوچ رہا ہوں کہ مرنے کے مقابلے میں ایک غیر مرنی وجود کس طرح سے اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے اور "ہونے" کے مقابلے میں "نہ ہونا" کیسے ترازو کے تول میں مل سکتا ہے۔ اور وہ کونسی بیہودہ سائنس ہے جس نے آپ کو یہ بتایا ہے کہ کچھ موجود بھی موجود کی طرح ویسی ہی اہمیت رکھتا ہے اور اپنی اہمیت کے اعتبار سے دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں۔

پروفیسر صاحب نے اپنا کافی کاک ٹیمیز پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں تیزی سے رگڑتے ہوئے بولے "بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ مرنے کے مقابلے میں غیر مرنی کا وجود زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اس کائنات میں "شے" کے مقابلے میں "لا شے" اور Something کے مقابلے میں Nothing زیادہ ہے حالانکہ بظاہر Nothing کچھ بھی نہیں اور Something بہت کچھ ہے۔"

میں نے کہا "پرسوں آپ نے حیران و پریشان کر کے روانہ کیا تھا، آج آپ ذلیل و خوار کر کے بھیجیں گے۔ آپ کا ارادہ کیا ہے؟"

میری بات سن کر ہنسنے لگے اور دیر تک مسکراتے رہے۔ پھر اپنی ہلالی عینک اتار کر بولے "پروفیسر صاحب! آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ دونوں میں سے کون طاقتور ہے؟ وہ جو ہمیں نظر آتا ہے یا وہ جو ہمیں نظر نہیں آتا۔ مرنے کی ٹکڑا ہے یا غیر مرنے کی؟"

میں احمقوں کی طرح ان کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا تو انہوں نے کہا "اس کا سیدھا، واضح اور عین جواب تو یہی ہے کہ جو شے نظر آتی ہے اور سامنے ہے اور مقابلے میں کھڑی ہے، وہ یقیناً نظر نہ آنے والی شے سے زیادہ طاقتور اور زیادہ قوی ہے۔ اگر ہم اپنے ارد گرد کی دنیا کا مطالعہ کریں اور مشاہدے میں دور تک اتر جائیں تو ہم آپ سے آپ محسوس کرنے لگیں گے کہ جو چیز نظر نہیں آتی، وہ نظر آنے والی شے سے زیادہ طاقتور ہے۔"

کے دوسرے حاضرین نے ہماری باتوں کو بالکل نہیں سنا تھا مگر پروفیسر فیراکوٹی اس ڈیٹا لگ میں ہمدرد گوش رہے۔ انہوں نے مجھے مخاطب کر کے دھیمی آواز میں کہا "آپ نے ہمسائی کے نامائے سوالوں کا جس خوش اسلوبی سے جواب دیا، وہ آپ جیسا جین، پراہتا اور صاحب نظر استاد ہی دے سکتا ہے۔"

میں نے سر جھکا کر اور عقیدت کے ساتھ سینے پر ہاتھ رکھ کر پروفیسر فیراکوٹی کا شکریہ ادا کیا اور ان کی عظیم شخصیت کے سامنے اپنے آپ کو مخفی ثابت کرنے کے لیے کچھ ٹوٹے پھوٹے جملے ادا بھی کیے لیکن وہ ان کی حوصلہ افزائی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے۔

پروفیسر فیراکوٹی نے اپنی عینک اتار کر کھلی ہوئی کتاب میں رکھتے ہوئے کہا "آپ نے جس ایمان و اعتبار کے ساتھ ایک حتمی انداز میں اس کی باتوں کا جواب دیا، وہ ایک صاحب نظر اور صاحب شغف ہی دے سکتا تھا۔ ایک عام پڑھا لکھا انسان ایسے یقین اور وثوق کے ساتھ وہ سب کچھ نہیں کہہ سکتا جو آپ نے فرمایا۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمارے درمیان ایک نوجوان شریک کار ایسا بھی ہے جو آفاقی اسرار و رموز سے گہری واقفیت رکھتا ہے اور مکمل کے ان کا اظہار کر رہا ہے۔"

پروفیسر صاحب کی یہ بات سن کر میں کہیں آگیا اور چند لمحوں تک گم سم اور ساکت وصامت اپنے منہ پر ہاتھ رکھا۔ پھر اپنی غفلت مٹانے کی غرض سے میں نے ان سے پوچھا۔ "اگر بیکو پروفیسور! کیا آپ جن بھوت اور پری پریت پر ایمان رکھتے ہیں اور کیا آپ کے خیال میں آسب اور آسیب زدہ مقامات ہوتے ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہماری اُس دنیا میں سپرنچرل کا کوئی عمل و عمل ہے؟"

انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ہم لوگ چونکہ سائنس کے طالب علم ہیں اور ہمارا تعلق سائنس کے شعبہ طبیعیات کے ساتھ ہے، اس لیے ہم اس آسانی کے ساتھ ان ساری باتوں کا بطلان نہیں کر سکتے۔ جن باتوں کو آپ نے محرم اسرار ہونے کی بنا پر غلط اور نادرست قرار دیا یا حتمی اور قطعی طور پر انہیں رد کر کے ان کی تکذیب کی۔ ویسے میں خوش ہوں کہ وہ یونیورسٹی کو ایک قابل اور قابل اعتماد استاد مقرر کیا جس سے ان کے ساتھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔"

میں نے بہت سادہ حیران ہو کر اور کسی قدر ہلکے سے چڑ کر کہا "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ جنوں، بھوتوں، پریوں، چڑیلوں، آسیب زدہ مسکنوں اور فوق الفطرت عناصر پر ایمان رکھتے ہیں اور تو اہم پرستی کے سامنے والے ہیں اور فوق العادہ کے قائل ہیں۔"

انہوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا "ہم چونکہ تجرباتی سائنس دان ہیں اور تجربہ پر ایمان رکھتے ہیں، اس لیے ہم کسی بات کا محض مطالعہ اور تجربے کے بغیر اس پر کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ اب تک چونکہ ہم نے جنوں، بھوتوں اور فوق العادہ پر کوئی تجربہ نہیں کیا اور ان کو اپنی لیبارٹری میں لے جا کر جانچا پرکھا نہیں، اس لیے ہم ان پر کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ ان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دے سکتے۔ ان کو درست یا نادرست نہیں کہہ سکتے۔ آپ کا علم چونکہ بہت وسیع ہے اور آپ کی نظر چونکہ امکان اور لامکان سے بھی آگے ہے، اس لیے آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب فضول ہے، بکواس ہے۔ ایسی چیزوں کا کوئی وجود نہیں، کوئی امکان نہیں، کوئی مقام نہیں۔"

میں کچھ کہنے والا ہی تھا کہ انہوں نے بے حد ملائم آواز میں کہا ”ذرا ہوا پر نظر ڈالے۔ آپ کے ارد گرد، دائیں بائیں، اوپر نیچے موجود اس کا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا، نہ وجود نہ جسم نہ ہیئت نہ ہولا اور جو اس کو جانچ کے دیکھیں تو ہوا سے زیادہ قوی اور شے اس کائنات میں موجود ہی نہیں۔ اس میں وافر مقدار میں آکسیجن موجود ہے جو چرندوں، پرندوں، حیوانوں اور جانداروں کو زندگی کی بنیاد مہیا کرتی ہے۔ اسی ہوا کے اندر کاربن ڈائی آکسائیڈ موجود ہے جس پر نباتات کی زندگی اور نشوونما کا دار و مدار ہے۔ ہر جگہ موجود ہے مگر نظر نہیں آتی۔ ہر وقت حاضر ہے مگر دکھائی نہیں دیتی۔ ہمارے ہر کام کو نمٹانے کے لیے اس کا ہونا ضروری ہے۔ کسی کو محبت نامہ لکھنا ہو، کسی کی یاد میں رونا ہو، کسی کا بوسہ لینا ہو، بنگلہ ہونا ہو، قتل کرنا ہو، خودکشی کرنی ہو، گالی دینی ہو، ہنسنا ہو، حکم دینا ہو، معافی مانگنی ہو، بے وفائی کرنی ہو، بد معاشی کرنی ہو۔ ہمیں ہر حال میں ہوا کی ضرورت ہے۔ کام کرنے سے پہلے کام کرنے کے دوران اور کام کرنے کے بعد۔ اگر اس کی وافر سپلائی موجود نہیں ہوگی تو سب کام دھرے رہ جائیں اور ان کے ساتھ آپ بھی دھرے پڑے ہوں گے۔ ہوا بالکل نظر نہیں آتی لیکن زندگی کا سارا انحصار ایک اسی غیر مرئی Commodity پر ہے۔“

میرا خیال ہے پروفیسر صاحب کے ذہن میں وہی پرسوں والی بات موجود تھی اور وہ مجھے قائل کرنا چاہتے تھے کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا، وہ سائنسی اعتبار سے بھی درست تھا۔ مجھے صدم کم بیٹھا دیکھ کر انہوں نے میری تسلی کے لیے پھر کہنا شروع کیا کہ ”اس وقت آپ کے ذہن میں یہ خیال بار بار اٹھ کر آپ کو مجھ سے بھڑانا چاہتا ہے کہ چلو تو ٹھیک ہے کہ ہوا نظر نہیں آتی اور اس کی ناموجودگی زندگی کو ختم کر سکتی ہے لیکن ایک جسمانی شے کے بارے میں آپ کا خیال ہے۔ ایک ایسی شے جو جسم رکھتی ہے۔ وجود رکھتی ہے، نظر آتی ہے، محسوس ہوتی ہے، چھوئی جاسکتی ہے۔ یہ مثلاً یہ کمرہ ہی ہے، فوگس لیبارٹری کا دفتر۔ اگر اس کی چھت گر پڑے تو وہ آپ کو آن واحد میں ہلاک کر دے گی۔ سانس گٹ کر مرنے سے بہت پہلے، فائٹ، ایک سیکنڈ میں، لیننر گراؤ آپ ختم! سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاڈ چلے گا، غبارا!“

میں ان کی یہ بات سن کر بہت خوش ہوا۔ واقعی میرے ذہن میں اسی قسم کا سوال یا اسی قسم کے سوال جنم لے رہے تھے۔ پروفیسر فیراکوٹی نے فرمایا ”لیکن پروفیسر صاحب یہ چھت گرے گی کیوں بھلا؟ کوئی تو ایسی شے ہے جس نے اس چھت کو گرنے پر مجبور کیا۔ کسی چیز نے تو اتنے ہماری لیننر کو کھینچا، کسی نے تو اس بستی رستی چھت کو زمین بوس کیا۔ اب اس پر نظر کیجئے، اس کو بھی دیکھ لیجئے وہ بھی نظر نہیں آئے گی اور وہ نظر نہ آنے والی شے ”کشش“ ہے۔“ ”گرے وئی!“

”اگر یہ غیر مرئی کشش نہ ہوتی تو ساری کی ساری ٹوٹ جانے والی چھت کبھی نیچے نہ گرتی۔ کبھی کسی کی موت کا باعث نہ بنتی۔ ٹوٹ جاتی، ریزہ ریزہ ہو جاتی لیکن نیچے کبھی نہ گرتی۔ اس جگہ اسی طرح سے قائم رہتی۔“

میں نے کبھی کشش ثقل کی اس اندھی طاقت پر غور ہی نہ کیا تھا۔ ہوا کی طرح یہ بھی میری زندگی سے الگ کوئی چیز تھی۔ آنے سے پہلے میرا ان دونوں سے کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا۔ اس لیے میں ان سے بے تعلق ہو کر زندگی گزار رہا تھا۔

پروفیسر فیراکوٹی نے کہا ”اور یہ روشنی کیا ہے؟ اس کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آپ روشنی کو دیکھ سکتے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی روشنی کو دیکھا ہے؟ بالکل نہیں، کبھی بھی نہیں۔ روشنی بھی ایک غیر مرئی شے

ہے۔ خود نظر نہیں آتی لیکن جب کسی شے پر منعکس ہوتی ہے جب اس کا پتہ چلتا ہے۔ پھر ہم اسے دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے اثرات ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ سیدھے روشنی کو نہیں دیکھ سکتے۔“

کہنے لگے ”بجلی کے بلب کو ہم دھمکتا دھمکتا دیکھ سکتے ہیں۔ اسے روشن صورت میں دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کی روشنی نہیں دیکھ سکتے جب تک وہ کسی دیوار، کسی شخص، کسی کرسی میز، کسی کمرے، درخت، میدان، پہاڑ سے نہ ٹکرائے۔ ہم روشن بلب یا روشن مشعل کو تو دیکھ سکتے ہیں لیکن اس سے نکلنے والی روشنی کو سفر کرتے نہیں دیکھ سکتے کہ اب یہاں پہنچی۔ اب ادھر کو مڑی۔ اب وہاں رکی، اب پھر روانہ ہوئی۔“

اگر سورج اس زمین کو روشن کرتا ہے، اس کرہ ارض کو دمکاتا ہے تو سورج سے زمین تک کا درمیانی فاصلہ بھی روشن ہونا چاہیے لیکن ایسے نہیں ہے۔ خلا سارے کا سارا تاریک ہے لیکن روشنی اس کے اندر سے گزر کر سطح زمین کو منور کر رہی ہے۔ ہر جگہ روشنی پھیلاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ روشنی کی لہریں غیر مرئی ہیں اور وہ اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتیں جب تک کہ کسی شے سے نہ ٹکرائیں یعنی جب تک زمین کی اس فضا پر منعکس نہ ہوں، جو فضا ہماری پیاری غیر مرئی سیلی ہوا نے قائم کی ہے اور جس کو ہماری محبوب غیر مرئی کشش نے تمام کر رکھا ہے۔

اسی طرح سے ہم گرمی کو بھی نہیں دیکھ سکتے، محسوس ضرور کر سکتے ہیں۔ یہی حال سردی کا ہے۔ آپ کسی کھڑکی کے شیشے سے جھانک کر یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ کمرہ کس قدر گرم یا کس قدر ٹھنڈا ہے۔ عین اسی طرح سے ہم بھی اپنے اندر جھانک کر ان طاقتور محرکوں کو نہیں دیکھ سکتے جنہوں نے ہماری زندگیوں کے اندر ایک طوفان اٹھا رکھا ہے۔ محبت، نفرت، طمع، خوف، خواہشیں، لوبھ، مودہ، اہنکار، ہمدردی، ایثار، خوبی، خرابی وغیرہ یہ سب بیجان اور جذبے جو ہمارے اندر ابلتے ہوئے لاوے اور پھیلتے سمٹے جوار بھائے کی شکل میں ہر وقت سرگرم عمل ہیں، سارے کے سارے غیر مرئی ہیں اور ان جذبوں کی طاقت اور ان کا تصادم ملاحظہ کرتے ہو؟ ان غیر مرئی نظریات نے والے جذبوں کا ٹکراؤ اور ان کی وحشت ناک ٹکراؤ

پروفیسر فیراکوٹی نے اپنا گناہ ادا کر کے ایک بھر پور گھونٹ بھر کر بولے ”یوں تو میں اپنی کافی ہمیشہ بغیر چینی کے پیتا ہوں لیکن کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ خوب میٹھی کافی پیوں اور چٹکارے لے کر اپنا گناہ ختم کروں۔“

یہ بات انہوں نے میرا خوف دور کرنے کے لیے کی تھی۔ وہ خوف چھان کی باتوں کا سامنا کرنے سے میرے سارے وجود پر طاری ہو گیا تھا اور میں بلتا سا ہو کر ان کے سامنے سر ڈالے بیٹھا تھا۔ انہوں نے ادھر ادھر کی کچھ باتیں بھی کیں لیکن میں واپس اپنے محور پر نہ پہنچ سکا۔ پھر انہوں نے یونیورسٹی کے کچھ سیکنڈل سنا لیے لیکن ان میں میری کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اس نے میرا پکڑا ہوا ہاتھ اور شدت سے مردوڑا شروع کر دیا اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی "میری ماں مر گئی
اشفاق اور میں اس بھری پڑی دنیا میں ایک تار آ جانے سے بالکل اکیلی ہو گئی۔ بالکل تنہا، ہمیشہ کے لیے بے یار و مددگار۔"
وہ میرے ساتھ چٹ گئی اور کافی اونچی آواز میں رونے لگی۔ سامنے بچہ بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے نے اخبار
چھپے ہنا کر ہمیں تھوڑی دیر کے لیے دیکھا اور پھر اخبار پڑھنے لگا۔ اس کے قریب ایک بڑی تاور بڑھیا سویٹر بن رہی تھی،
اس نے بھی سلائیاں روک کر ہمیں دیکھا اور پھر دیکھتی چلی گئی۔

میں کافی دیر تک سی کو تھکتا رہا اور وہ بڑی دیر تک میرے کندھے پر سر رکھے سسکیاں لیتی رہی۔ میں نے آہستگی
سے اس کے کان میں کہا "اصل میں زندگی کا منجائے مقصود ہی موت ہے تو پھر اس میں رونا دھونا کیا، جو ہوا اس پر صبر کرنا
چاہیے۔" وہ میری بات سن کر اور بھی سسکیاں بھرنے لگی اور اس کا سارا بدن ہچکولے کھانے لگا۔ میں نے سوچا، مجھ سے شاید
کوئی غلطی ہو گئی جس نے اس کے اندر میں اضافہ کر دیا ہے لیکن ہمارے پاکستان میں تو ایسے موقعوں پر اسی قسم کے فقرے
بولا کرتے ہیں، انڈونیشیا میں شاید درد بنانے کا کوئی اور طریق ہو۔

پھر میں نے کہا "دیکھو سنی! جس طرح پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے، اسی طرح مرنا بھی قدرتی ہے۔ انسان مٹی
سے پیدا ہوا ہے اور بالآخر اسی کو مٹی میں مل جانا ہے۔ تمہاری والدہ کی موت کا مجھے بھی اتنا ہی صدمہ ہے جس قدر تم کو ہے مگر
ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ یہ خدا کا ایک اہل قانون ہے اور ہم اس کے سامنے بے بس ہیں۔"

اس نے اپنا سر میرے کندھے سے اٹھایا اور اپنی کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "یہ موت اصل میں
ہے کیا چیز؟"
"میں نے کبھی پڑھا تھا کہ اصل میں کوئی نہیں جانتا کہ موت ہے کیا چیز! نہ ہی کسی کو یہ معلوم ہے کہ یہ ایک نعمت
ہے، ایک برکت ہے، ایک دعا ہے، لیکن لوگ اس سے ڈرتے ضرور ہیں جیسے یہ کوئی بہت بڑی برائی ہو۔ کوئی نفرت
انگیز شے ہو۔"

جلد ہی وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور سامنے دیکھنے لگی۔ سامنے بچوں پر کئی جوڑے پاگل پن
کی حرکتیں کر رہے تھے اور سکول کے بچے اور بچیاں ان کے پاس کھڑے کبوتروں کو دانہ ڈال رہے تھے۔

سستی مردیاتی نے کہا "میری ماں میرا واحد سہارا تھی۔ اسی طرح میں بھی اس کی واحد آس تھی۔ میرا خیال تھا میں
مگر بجوائشن کر کے جلد واپس چلی جاؤں گی اور چکارہ میں کوئی اچھی سی نوکری تلاش کر لوں گی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اب مجھے
اسی طرح واپس جانا پڑے گا اور اپنی ماں کی جگہ گھر کی نگہداشت کرنا ہوگی۔ یہ نہیں میں اس کی جگہ سنبھال بھی سکوں گی یا
ایسے ہی ناکام ہو کر بیٹھ جاؤں گی۔ میرا ایک جواں سال بھائی ذہنی ابتلا میں مبتلا ہے اور ہر دوسرے تیسرے دن گھر سے نکل
جاتا ہے۔ کئی کئی مہینے واپس نہیں آتا۔ گوہم نے اس کے گلے میں اپنے گھر بلو پتے کی تختی بھی ڈالی ہوئی ہے۔ پھر بھی اس پر
کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ وہ خود ہی واپس آتا ہے اور آپ ہی اپنی خود ساختہ زبان میں اپنی درد بھری داستان بیان کرتا ہے۔
پھر میرا سوتلا باپ ہے جو ایک اچھا آدمی نہیں ہے۔ یہ نہیں میری ماں نے اس کے ساتھ کیوں شادی کی اور اس کو اس

(7)

سستی مردیاتی سو ریو بند و یو بڑے دنوں بعد ملی۔ وہ کچھ پڑ مردہ اور مضحک سی تھی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بولی "چلو سامنے
چل کر بیٹھے ہیں۔ بہار آ رہی ہے اور درخت رنگ بدل رہے ہیں۔ گلہریاں بھی نیند سے بیدار ہو کر واپس آ گئی ہیں اور
بہت خوش ہیں۔ میرے پاس شاہ بلوط کی گرم گرم گریاں ہیں جو میں نے راستے میں تمہارے لیے خریدی تھیں۔ پہلے کے
مقابلے میں سستی ہو گئی ہیں۔"

ہم دونوں بیچ کر جا کر بیٹھ گئے لیکن اس نے میرا ہاتھ نہ چھوڑا۔ دوسرے ہاتھ سے اپنا پرس کھول کر مشکل سے شاہ
بلوطی گریوں کا لٹافہ نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولی "اب انہیں ساتھ ساتھ چھیلنا تمہارا کام ہے۔" میں نے کہا "میں انہیں
شوق سے چھیلوں گا اور ایمانداری کے ساتھ کھاؤں گا۔ ایک اپنے لیے ایک تمہارے لیے۔"

لیکن ان مونے ترے ہوئے چھکوں کو ایک ہاتھ سے چھیلنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ ہم بڑی دیر تک اسی طرح
ساکت و صامت بیٹھے ان رنگ برنگی گاڑیوں کو دیکھتے رہے جن میں نومولود بچے اپنے اپنے پٹے پٹے تھے۔ ان میں سے کچھ
سوئے ہوئے ہوں گے اور کچھ کی آنکھیں کھلی ہوں گی اور وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں اور چھوٹی چھوٹی انگلیوں سے ان
فرشتوں سے باتیں کر رہے ہوں گے جو ہم کو نظر نہیں آتے۔ کچھ نوجوان جوڑے بھی بچوں پر ایک دوسرے سے ہنگامہ بیٹھے
محبت کی کھلاڑیاں کر رہے تھے۔ ان میں سے کئی تو محبت کی گھلاوٹ میں آ کر پکھل سے گئے تھے اور اپنے اپنے طریق پر نیم
دراز ہو گئے تھے۔

پارک میں موجود دوسرے لوگوں میں میرے انہماک کو دیکھ کر سستی مردیاتی نے ہچکیاں لے کر مردوڑا شروع کر دیا اور
میرے ہاتھ کو اور سنبھولی سے پکڑ کر اسے ہل دیے گئی۔ میں نے اس کو اس کیفیت میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک
جذباتی اور سادہ لوح سی لڑکی ضرور تھی لیکن اس کے چہرے پر ہر وقت خوشگوار کا اٹھنا سا لگا رہتا اور ماتھے اور آنکھوں پر
مسکراہٹ کا نٹ تھتا۔ آج اس کو اس حالت میں دیکھ کر میرا بھی دل بھر آیا اور میں نے اس کے ماتھے، گال، آنکھوں کو
چومتے ہوئے کہا "کیا ہو گیا سستی؟ کیسی افتاد پڑی اور کیا حادثہ گزرا جو اس طرح سے ہلکان ہو رہی ہو؟"

رشتے سے کیا ملا؟

میں سنی کی اس بات کا کیا جواب دیتا۔ اپنا چہرہ اس کی طرف گھما کر ہولے ہولے اس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔ دو ہولے ہولے کر رہی تھی ”اب میں جلد ہی واپس چلی جاؤں گی اور جا کر اپنے معذور بھائی اور سوتیلے باپ کا سامنا کروں گی۔ وہ مجھے دونوں ہی ایچھے نہیں لگتے لیکن ایک سے میں محبت کروں گی، دوسرے کی عزت کروں گی اور دونوں کی نگہداری کروں گی۔ ہمارے انڈونیشیا میں منافقت بہت ہے۔ اوپر سے ہم کچھ اور ہوتے ہیں اور اندر سے کچھ اور۔ ہم میں تساوی نہیں، ہم جموٹے لوگ ہیں اور بچ بولنے سے کتراتے ہیں۔“

میں نے کہا ”اور یہ جوانڈونیشیا کا سفیر ہے جن کے یہاں تم رہتی ہو!“

”یہ میرا سا ماموں ہے۔“ اس نے جلدی سے میری بات کاٹ کر کہا ”لیکن اس کی بیوی کا سلوک میرے ساتھ کچھ اچھا نہیں رہا۔ میں ان کے یہاں ایک ملازمہ کی حیثیت سے رہتی ہوں اور وہ سارے کام کرتی ہوں جو ایک ”مید“ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ پھر بھی وہ دونوں مجھ سے خوش نہیں ہیں اور میری فیس مشکل سے ادا کرتے رہے ہیں۔“ پھر وہ ذرا سا مسکرا کر بولی ”میں اپنے ماموں کو کھیلے میں بھی ماموں نہیں کہہ سکتی ”مسز“ کہہ کر بلاتی ہوں۔“

وہ بڑی دیر تک پُرل پُرل اپنے بچپن کی باتیں اور اپنی ماں کی محبتوں کے قصے سناتی رہی۔ اپنے گھر کے ایک ایک آدمی کو یاد کر کے ہنستی اور روتی رہی۔ روم میں اپنے سفار تھانے سے باہر اچھا وقت گزارنے کو یاد کرتی رہی اور پھر جھپ کھا کر موت کی طرف لوٹ گئی۔ وہ موت سے کچھ گھبرائی ہوئی، کچھ ٹٹی ہوئی، ذرا سی خوفزدہ، بے حد شام کی اور قدرے عجیب سی بیٹھی تھی۔ وہ اپنی مرحوم ماں کے حوالے سے نہیں بلکہ موت کے مجرد سوال میں گھری ہوئی تھی۔ اصل میں اس سے اپنا سوال نہیں بن رہا تھا جس کے جواب کی تلاش میں وہ اپنی گول ٹھوڑی اوپر اٹھائے بیٹھی تھی۔

جب ہم آزاد کشمیر ریڈیو کے ملازم تھے تو اس وقت ممتاز مفتی کے پاس ایک دنگ سائیکل آیا کرتا تھا جو اپنی باتوں سے بڑا بڑھا کھٹا معلوم ہوتا تھا لیکن اپنی وضع قطع، اپنے لباس اور اپنے تلفظ سے بہت ہی گھاسڑا نظر آتا تھا۔ استاد یوسف ظفر ہر مرتبہ اس سے سینگ پھنسا کر بیٹھ جاتا اور جلد ہی اس سے معذرت کر کے اپنے سینگ نکال کر باہر نکل جاتا۔

وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ زندگی کے بعد مر جانا یا پیدا ہو جانا نہایت غیر معقول اور غیر منطقی بات ہے۔ اس بات کو نہ دل پسند کرتا ہے نہ عقل پسند کرتی ہے۔ اور شہوت تو اس کو بالکل ہی پسند نہیں کرتی کہ کوئی پیدا ہو کر مر جائے تو یہ بڑے نقصان کی اور بڑے گھائے کی چیز ہے۔ اب عقل انسانی اور فہم انسانی گھائے کو پورا کرنے اور اس نقصان کا سد باب کرنے کے لیے آگے بڑھتی ہے اور انسان کو زندہ رکھنے کے لیے سر دھڑکی بازی لگا دیتی ہے۔ انسان کو بھوک ہونہ ہو، وہ کھانا ضرور کھائے گا اور اس لیے کھائے گا کہ بھوک کی شدت موت کا باعث نہ بن جائے۔ اس طرح پانی پیے گا کہ موت کو ٹالنے کے لیے اور زندگی کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اس طرح ہوا ہے، جس کو سانسوں میں لپیٹ کر بڑے بڑے گھونٹ بھرتا ہے۔ سیر کرتا ہے، کسرت کرتا ہے، کس لیے؟ زندہ رہنے کے لیے اور زندگی کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے۔ لیکن کمال ہے! صدقے جاؤں، قربان جاؤں اور تیری اس کوشش کے واری جاؤں کہ چوبیس گھنٹے موت سے بچنے

کا سد باب کر رہا ہے اور زندگی کی پشتی بانی کر رہا ہے لیکن جتنی دیر اس سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے، موت کو پرے رکھنے کی جدوجہد کر رہا ہے، اتنی ہی موت اس کے قریب آ رہی ہے۔ اس کی جانب بڑھ رہی ہے۔ تیزی کے ساتھ اس کی طرف پک رہی ہے۔ ناکم گزر رہا ہے۔

اب جب عقل اور دانش ہر طرح کی حیلہ سازی کر کے موت کو پرے رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور موت پھر بھی آ جاتی ہے تو عقل موت کے مقابلے میں ایک ناکارہ اور ناکام شے ہوئی کیونکہ مرنا جو ہے یہ عقل کے خلاف ہے۔ عقل کے ہوتے ہوئے انسان مر جاتا ہے اور پورے کا پورا مر جاتا ہے۔ اب جب کچھ انسان کے اختیار میں ہے ہی نہیں یعنی اس کا بنیادی ڈھانچہ ہی اس کے تصرف میں نہیں کہ نہ اپنے ارادے سے آیا اور نہ اپنے ارادے سے فوت ہو رہا ہے، نہ اپنا پلان بنا کر آیا ہے اور نہ اب اپنا پلان بنا کر جا رہا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ کسی اور کے ارادے اور کسی اور کی خوشی سے آیا تھا اور اسی کی خوشی سے جائے گا تو اب منطقی صورت یہی نکلی کہ جس کی خوشی سے آیا تھا، اس کی خوشی کے مطابق زندگی گزارے اور اسی کے پلان کے مطابق عمر بسر کرے۔

اب اگر اس کی خوشی سے اس دنیا میں رہا تو اس رہنے کا نام دین ہے اور اگر اپنی تجویز سے رہا تو ”من مرضی“ ہے۔ کفر ہے۔ پھر وہ کہتا ”لامنتفی جائے پلا اور پان کھلا اور خوش رہ کہ اس کا بھیجا ہوا وقت قریب آ رہا ہے۔“

اب میں یہ بات سنی مردیاتی کو کیا بتایا کہ اس کے کام کی نہ تھی اور پھر خود مجھے اتنی مدت کے بعد یاد آئی تھی کہ اگر سنی کی والدہ فوت نہ ہوتی اور وہ اس طرح سے نہ روتی تو شاید مجھے بھی یاد نہ آتی۔

سنی سے اگلے دن پھر ملنے کا وعدہ کر کے میں اپنے گھر آ گیا اور کپڑے اتارے بغیر کرسی پر بیٹھ کر اپنی ماں کے بارے میں سوچنے لگا جو اس وقت مجھ سے ہزاروں میل دور تھی اور ہمارے درمیان کسی قسم کا رابطہ نہیں تھا۔ مجھے اپنی ماں کو جو پیغام بھیجنا ہوتا، وہ میں اپنے بھائی کے خط میں لکھ دیتا اور میری ماں کو جو دعائیں بھیجنا ہوتیں، وہ بھائی سے کہہ کر مجھے بھیجوا دیتی۔ میری ماں بڑی سادہ، بے حد شفیق اور بہت ہی سختی تھی۔ ہم نے اسے لگا تار کام کرتے، بات بات پر مسکراتے، گیلے کپڑوں کے بو جھے اٹھائے۔ چاروں کے شغل بھرے، والوں کی پراتیں اٹھائے اور آٹے کی بور یوں کو گھسیٹے دیکھا۔ وہ کبھی تھکتی ہی نہ تھی۔ تھکتی تو تھکتی نہیں تھی۔ بیمار ہوتی تو ساگ بوئی، مولی پتہ وغیرہ گھوٹ گھٹا کر پی لیتی اور لوٹ پوٹ کر اٹھ کھڑی ہوتی۔ اس کے سر میں اکثر درد رہتا۔ جب اس نے کاغذ کے گول نکلے آٹا لگا کر اپنی کپٹیوں سے لگائے ہوتے تو ہمیں پتہ چل جاتا کہ اماں کے سر میں درد ہے اور اس کی کپٹیاں بچ رہی ہیں لیکن ہم نے اس سے اس سر درد کے بارے میں کبھی پوچھا نہ تھا۔ وہ اس سر درد کی پروا بھی نہیں کرتی تھی۔ اس کی اصل سر دردی اس کا گھر اور اس کی اولاد تھی۔ وہ ہرقت ڈری ڈری اور دھڑکی دھڑکی سی رہتی۔ جب بھی دروازے پر کوئی آہٹ ہوتی، اسے چونک کر دیکھتی یا کوئی جا رہا ہوتا یا داخل ہو رہا ہوتا، وہ ان دونوں کے درمیان ڈرے بھری وقت گزارتی۔ میں اپنی ماں کو چٹا ماتا کہہ کر بلاتا تھا پتہ نہیں اس کو کس بات کی چٹا تھی کہ خوف کم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔

میری ماں بھی ان ہزاروں لاکھوں ماؤں کی طرح تھی جو ہمارے ملک میں انڈیشوں کی انٹی جھری تلے وقت

گزارتی ہیں۔ یوں تو وہ زندہ ہوتی ہیں اور بڑی دیر تک زندہ رہتی ہیں لیکن ان کا ہر سانس لمبے کی ٹھنڈی ہوا کی گھڑی کی گھڑی گھڑی آتا ہے اور اسی خوف سے آنکھ بچا کر واپس جاتا ہے۔ ایک زندگی میں اربوں سکھوں، نیلوں سانس ہوتے ہیں اور ماؤں کی زندگیاں بھی لمبی ہوتی ہیں۔ جب تک آخری بچہ کنارے نہ لگ جائے، وہ شہہ دریا کی ڈوٹھی لہروں میں ڈبکیاں ہی کھاتی رہتی ہیں۔ اولاد کی ساری زندگی ماؤں کو خوفزدہ کرتے، ہنسنے مارتے، فقرے کہتے گزرتی ہے، بچے ان کو دھمکاتے بھی ہیں اور چھیپا بھی ڈالتے ہیں۔ ان سے پیسے چھیننے بھی ہیں اور ان کو کمائیاں لالا کر بھی دیتے ہیں۔ ان کو رلاتے بھی ہیں اور ان کے لیے روتے بھی ہیں۔

مشرق میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص مرد عورت سے بہت محبت کرتے ہیں اور اس کا بے حد احترام کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں کوئی کام عورت کی مرضی اور اس کے مشورہ کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ عامل کو مرد ہوتا ہے لیکن پس پردہ راس عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ ہوائی جہاز مرد اڑاتا ہے لیکن ناور سے اس کی بیوی کی مشین کوئلے کے اختیار میں ہوتی ہے۔ سودا مرد کرتا ہے لیکن فیصلہ عورت کرتی ہے کہ یہ پلاٹ خریدنا ہے کہ نہیں۔ شادی لڑکے لڑکی کی ہوتی ہے لیکن فیصلے عورتوں نے کیے ہوتے ہیں۔ کھرا میز باقی ساری عمر مرد کرتا ہے اور حج پر اسے عورت کا فیصلہ لے کر جانا ہے۔ ہمارے یہاں مرد ماں کے لیے، بہن کے لیے، محبوب کے لیے، ماسیوں، مچھلیوں، چچوں کے لیے ہر قسم کی قربانی دیتا ہے اور ہر حال میں ان کی عزت بحال کر کے رکھتا ہے لیکن ایک رشتے پر آ کر رک جاتا ہے اور وہ رشتہ میاں بیوی کا ہے۔ اس میں واقعات کی تیل اس طرح سے منڈھے نہیں چڑھتی جس طرح ماں، ماسی، بہن، محبوب، بیٹی اور چچی بائی کے معاملے میں چڑھتی ہے۔ شاید اس میں مرد کو اتنی خرابی نہیں ہوتی جتنی شادی کے ادارے اور شادی کے طہن کی ہوتی ہے۔ مرد عورت کی شادی کی گاڑی میں پکرا ضرور پھنستا ہے اور شروع دن سے پھنستا ہے۔ اس میں دونوں ہی شرافت کی حدوں سے پرے نکل جاتے ہیں۔ مرد چونکہ طاقتور ہوتا ہے، صاحب حیثیت ہوتا ہے، ہر اعتبار سے قوی ہوتا ہے، اس لیے وہ ظلم اور زیادتی کے میدان میں بہت دور نکل جاتا ہے۔

لیکن شاید یہ ادارے والی بات بھی ٹھیک نہیں۔ شادی کے ادارے والی اس میں کچھ اور ہی راز ہے، کوئی بڑا راز اور کوئی بے حد پیچیدہ گھنٹی، آخر مرد اور عورت محبت، پیار اور شفقت و مودت والے اسے سارے رشتے طے کر کے یہیں آ کر کیوں رک جاتے ہیں۔ کسی ایک ملک ایک معاشرے یا کسی خاص گروہ انسانی میں نہیں بلکہ ہر جگہ اور ہر مقام اور ہر گروہ اور ہر موسم میں میاں بیوی کے درمیان ایک معرکہ ہی پھاڑتا ہے۔ ایک جدال کی کیفیت ہی رہتی ہے، خواہ اوپر سے امن و سکون ہی کیوں نہ نظر آتا ہے۔

میرے خیال میں چونکہ محبت کے دوسرے رشتے بے حاصل اور غیر پیداواری ہوتے ہیں، اس لیے وہاں کوئی جھگڑا جھیل نہیں ہوتا، جہاں جہاں تخلیق ہوگی، پیداواری کی توقع ہوگی۔ باروری کا انتظار ہوگا، وہیں دنگ فساد، کتا پنی اور دشمنی خروش ضرور ہوگا۔ کیتوں میں کھلیاؤں میں بانگوں میں بوستانوں میں جہاں فصل اگائی جائے گی، دانہ بویا جائے گا، بیڑ پیوند کیے جائیں گے، وہاں بڑبڑ ہوگا۔ غوغا ہوگا، ڈھول نہیں گے، جھلے ہوں گے۔ مدافعت ہوگی۔ ہم برچی تیغ کناری ڈانگ

سونے کے دار ہوں گے۔ کچھ رہ جائیں گے، کچھ ڈیہہ جائیں گے۔ کہیں ڈنڈ بھریں گے، کہیں صلح صفایاں ہوں گی۔ لیکن سب کھیت خالی ہوگا، بھر ہوگا، باغ ویران ہوگا، بے برگ بار ہوگا تو کوئی ادھر پلٹ کر بھی نہیں دیکھے گا۔ ایسے ہی ٹھنڈے ٹھنڈے گزر جائے گا، آرام چین کے ساتھ۔

انسانوں کے درمیان تو میاں بیوی کے جھگڑے تنازعے، خلع اور طلاق ہوتے ہی ہیں، جانوروں کے جوڑے ان سے بھی آگے گزر جاتے ہیں۔ شیرنی بارہ ہوتے وقت شیر کے اس زور کا بچہ مارتی ہے کہ بھاری بھر کم ایال والا شیر نر میں قدم پرے جا کر بلوگڑے کی طرح گرتا ہے۔ شہد کی مکھی اڑتی جاتی ہے، اڑتی جاتی ہے اوپر اور اوپر اور اوپر نرس کا تعاقب کرتے ادھ آسمان کی اڑائیں بھرتے جاتے اور تھک کر ٹوٹ کر مرتے جاتے ہیں۔ ملکہ مکھی خلع، خلع، خلع!! پکارتی اوپر چڑھ جاتی ہے اور رشتیں، خوشامدیں، عاجزیاں کرتے، طلاقیں لے کر نیچے گرتے جاتے ہیں۔

کالی مٹری اختلاط کے مین بعد کالے کڑے کو اوپر سے اتارتے ہی اس کا سر کناک سے کاٹ کر اپنے مضبوط جڑوں میں اس کو کٹر کٹر ملیدہ کر کے کھا جاتی ہے اور اس کے بعد اس کے سارے جسم کو آہستگی کے ساتھ مزے مزے لے کر ہضم کر جاتی ہے، نہ خلع نہ طلاق سارا جھگڑا ایک ساتھ طے پا جاتا ہے۔

مرد عورت میں بھی جھگڑا باروری کے لاشعوری نزاع سے ملتا ہے۔ بچہ ہو جائے تو جھگڑا نہ ہو تو جھگڑا، بیچ میں بچہ ہو تو لڑائی، زین بن خیر ہو تو ناچانی پھل پسند ہو تو دنگا نا پسند ہو تو ٹٹا۔ اصل میں جھگڑا محبت کی کمی بیشی کا نہیں ہوتا تخلیق کے لڑوہ دار تعاش کا ہوتا ہے۔ کچھ جوڑے تو اس ارتعاش کے جھٹکے سہ جاتے ہیں، باقی ساری زندگی ڈنگاتے ہی رہتے ہیں اور جوڑے لگا کر رہتے ہیں، ان کے کھیت رہنے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔

حب نفس۔ حب نفس میں کوئی تازہ عکس نہیں ہوتا۔ بچہ اپنے وجود سے اپنے بدن سے، اپنے انگوٹھے سے محبت کرتا ہے۔ اپنے کان کی لو اور اپنی ناک کی پھنگ سے کھیتا ہے۔ حب نفس کے مزے لیتا ہے اور خوش رہتا ہے۔ بڑا ہوتا ہے تو اپنی جنس کے افراد کی طرف مائل ہو کر ان کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے۔ کوئی دنگا نہیں ہوتا، کوئی فساد نہیں ہوتا۔ کوئی تخلیق نہیں ہوتی۔ بس خالی محبت ہی محبت ہے۔ لگاؤ ہی لگاؤ اور تعلق ہی تعلق ہے جیسے عزیزوں، رشتہ داروں کے درمیان ہوتا ہے کہ نہ آفرینش ہے نہ ایجاد۔

تخلیق میں بڑا غوغا اور بڑا جدال ہے۔ معمولی سے معمولی شاعر بے معنی ہی تک بندی کر کے دوسرے شاعروں کے لیے وجہ نزاع بن جاتا ہے۔ بڑے جھگڑے بڑے لڑائیاں بڑے سر پھول ہوتے ہیں۔ پارٹیاں بن جاتی ہیں۔ بڑی ٹکڑا ہوتی ہے۔ جیوں پڑتے ہیں، کالم لکھتے ہیں۔ طعنوں کے تیر چلاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دروازوں پر گند کے ٹوکے پھینکتے ہیں۔ جیش نظر گالیاں دیتے ہیں پس پشت رسوا کرتے ہیں۔ میاں بیوی سے بڑھ کر لڑائی ہوتی ہے۔ تین طلاقیں سے زیادہ طلاقیں دے کر بھی کیچے میں ٹھنڈک نہیں پڑتی۔ نہ جھگڑا زور کا نہ زن کا نہ زمین کا۔ سارا قصور ایک دھنسی ہوئی مدقوق سی تخلیق کا۔ ایک غزل کا ایک رباعی کا ایک قطعه کا اور ساری زندگی کی قطع کا مای!

تخلیق بڑی طاقتور اور زور آور قوت ہے۔ ایک کوزہ گر کے نئے کوزے سے اور ایک زرکوب کے اچھوتے ورق

میری اصلی بانی تو وہ تھیں جنہوں نے سہاگن ہونے کے باوجود اپنے بچے ایک بیوہ کی طرح پالے تھے۔ ان کے شوہر بن موجی آدمی تھے۔ ایک مرتبہ گھر سے نکل جاتے تو دو دو سال تک واپس ہی نہ آتے تھے۔ نہ خط لکھتے نہ کوئی سند یہ سمجھتے، نہ یہ پتہ ہوتا کہ ان دنوں کہاں ہیں اور کس حال میں گزر رہے ہیں۔ میں نے اپنی بانی کی زندگی کی ایک مختصر سی جھلک اپنے افسانے ”نہیم“ میں دی تھی۔ اس کے بعد موقع ہی نہ مل سکا ورنہ ان کے حالات پر اس عہد کے حوالے سے ایک طویل ناول لکھتا اور اپنے قارئین کو اس خاتون سے متعارف کراتا جو ایک چھوٹی، گڑبادی اور پیت سی ضعیف تھیں لیکن اپنے ارادوں میں عظمتوں کا پہاڑ تھیں۔ وہ ساری زندگی مشکل وقت کو صرف وقت اور مشکل ایام کو صرف ایام سمجھ کر ہی گزارتی رہیں۔ ہر قسم کے حالات سے نبرد آزما ہوئیں لیکن اپنی ساری زندگی کو اسم ہی سمجھا اسم صفت کا نام نہ دے سکیں۔

یہ جو میری دوسری بانی فوت ہوئی تھیں اور جن کا جنازہ ہم قبرستان لے جا رہے تھے، یہ میری حقیقی بانی کی چھوٹی بہن تھیں اور کئی سال سے ان کی اپنی حقیقی بہن سے بول چال بند تھی۔ بول چال بند نہ سمجھتے، اس سے گلہ گزاری اور بایکات کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ یہ بات نہیں تھی۔ بس میری بانی نے لیٹا اپنی بڑی بہن سے بات کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان کا ایک اونچا مقام اور اونچا معیار تھا۔ ان کے خاندان پہلے قمر کاہل میں انگریزی سفیر کے میرٹھی تھے۔ پھر ہندوستان میں انگریز کمانڈر ان چیف کے مشیر بن گئے۔ ان کا رہن بہن، افسانہ بیٹھنا اور کھانا پینا بالکل انگریزوں جیسا تھا۔ وہ ہمیشہ نوبل صاحب کے ساتھ کھانا کھاتے لیکن ان وقت نہیں تھے۔ ابوالوقت تھے اور اپنے حالات پر حاوی ہو کر زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا شمار انگریزوں میں تھا اور ان کے ذہن اور علم اور زور سے آراستہ تھا۔ تین لڑکے دو لڑکیاں، سبھی پڑھے لکھے۔ سبھی کلچرڈ ہر ایک اچھے مقام پر فائز۔ لڑکیوں کے خاندان ایک دوسرے کی کاٹ، ایک سوداگر چوب اور جنگلوں کا ٹھیکیدار دوسرا آرمی کا ٹرینکٹر، گورے صاحب کو گھنٹی رشوت دے کر اپنے کام نکالتے تھے اور میرے نانے فتویٰ دے رکھا تھا کہ ایسی رشوت حرام نہیں، مگر وہ ہے۔

میں نے زندگی میں پہلا مرتبہ خال کوکب کی کار پر سواری کی اور ان کے ساتھ بیٹھ کر درزی کی دکان پر گیا۔ وہاں سے دو فرنگچروالے کے شوہر ہم میں گئیں۔ آتی دفعہ انہوں نے بازار سے شکر پارے اور نمک پارے خریدے اور مجھے کھانے کو دیے۔ خود نہیں کھائے۔ ذرا پیور سے اس کی بیمار والدہ کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ 14 اگست کے بعد جب ہم ہندوستان سے جبرت کر کے پاکستان آئے تو بانی نے لیٹا کا گھر ان پہلے سے لاہور میں موجود تھا اور ٹھیل روڈ کی ایک کوٹھی میں آباد تھا۔ اس کوٹھی کے کئی کمرے، کمران میں دو کاریں اور گیٹ پر میانوالی کا منزل خان چوکیدار موجود تھا۔

یوں تو ہم بھی متوسط درجے کے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن جبرت کے بعد ہماری حالت کچھ غیر ہو گئی تھی۔ میرے والد کے میسرز بنلی رام بردر کے لالہ بالک رام سے کافی گہرے مراسم تھے۔ ہم نے اپنا ریکی ٹانگہ مع سرنگ گھوڑی کے انہیں بھجوا دیا تھا اس لیے لالہ بالک رام میرے ابا جی سے بڑے التفات سے پیش آئے اور انہوں نے نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کو میرے والد کو پانچ سو روپے دیے۔ گو یہ رقم 47ء میں ایک خطیر رقم تھی لیکن ہمارے سارے گھرانے کا بوجھ زیادہ دیر تک نہیں اٹھا سکتی تھی۔ میری والدہ نے اپنے چاروں بیکار بیٹوں کو گھر کا بوجھ اٹھانے کے لیے نوکری کرنے کا مشورہ دیا اور ہر ایک کو دس دس روپے دے کر نوکری کی تلاش میں روانہ کر دیا۔

سے چاروں کھونٹ مل جاتے ہیں اور نئی ہوائیں وجود میں آ جاتی ہیں۔ تخلیق کے تصور، اس کے نقشے، اس کے خاکے اور زائچے اور اکیوشن سے فلکی شعاعوں میں نام نہاد گونج بھر جاتی ہے اور اس کے لاسکی سلسلوں میں ساری کائنات لپٹ جاتی ہے تو جس وقت یہ کائنات معرض وجود میں آئی ہوگی تو کتنی بڑی گونج کے ساتھ تخلیق ہوئی ہوگی اور کیسا بگ بینگ ہوا ہوگا اور جب وہاں اتنا بڑا بگ بینگ ہوا ہوگا تو یہاں جہاں ہر ہر کتبے، ہر ہر گہرائی اور ہر ہر گوشے میں تخلیق کا عمل جاری ہے۔ چھوٹے بڑے دھماکے، چمکدار کڑا کے اور لہریاں تراتے ہوتے رہیں گے۔ دراصل یہ میاں بیوی جھگڑے یا زون و شوکی لڑائیاں نہیں ہیں۔ کچھ اور سی چیزیں ہیں۔ یہ ایسے سری اور رمزی معاملے ہیں جن کو معاشرتی مسائل کی سلیٹ پر حل نہیں کیا جاسکتا۔ نہ ان کو فلسفیات کے فوٹوں سے سمجھا جاسکتا ہے نہ عمرانیات کے فیتے سے ماپا جاسکتا ہے۔

سستی مردیاتی کی والدہ کے وفات پا جانے سے میں طرح طرح کے اندیشوں میں گھر گیا تھا اور ان میں سب سے بڑا خوف میری اپنی ماں کے مر جانے کا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ پاکستان میں میری ماں بھی فوت ہو جائے گی اور میں یہاں روم میں اکیلا بیٹھا رہ جاؤں گا۔ اگر میں واپس گیا بھی تو میرے بھائی اور بہنیں مجھے تسلیم کرنے اور اپنے ساتھ ملانے سے انکار کر دیں گے۔ کچھ لوگ میرے ساتھ ہوں گے کہ بچپارے کی ماں مر گئی اور کچھ لوگ ان کی طرف ہوں گے کہ پہلے اپنی پیاری ماں کو چھوڑ کر پردیس چلا گیا تھا، مزے کرنے اور دل بہلانے اب روتا پھرتا ہے۔ رونا بچے تو رو، ہم تجھے منع نہیں کرتے لیکن بچی بات یہ ہے کہ تجھے اپنی ماں سے پیار نہیں تھا۔ یہ سب دکھا دے کی باتیں ہیں اور ہم منافقت کے قائل نہیں ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے جب میری رشتے کی ایک بانی فوت ہو گئی تھیں اور میں بار بار آگے بڑھ کر ان کے جنازے کو کندھا دے رہا تھا تو میرے بڑے بھائی نے میرے ساتھ کندھا بدلتے ہوئے میرے کان میں کہا ”کیئے! بد ذات بانی کو خود مار کر اور خود قتل کر کے اب اس کو بار بار کندھا دے رہا ہے۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے، اپنی تسلی کے لیے۔ اس فعل کا کفارہ ادا کرنے کے لیے، بس کر۔ چھوڑ دے اور باز آ۔ صد بار گرتو بے شکستی باز آ۔“

میں ان کی یہ بات سن کر گھبرا گیا اور جنازے سے ذرا دور ہو کر چلنے لگا۔ کافی دیر تک سوچتا رہا لیکن وہ الزام جو افتخار بھائی نے مجھ پر لگایا تھا، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ جوڑ سکا۔ بانی نے لیٹا مجھے سب بزرگوں میں سب سے زیادہ پیاری تھیں۔ میری ان کی روز ملاقات ہوتی تھی۔ میں ان کا دل و جان سے احترام کرتا تھا۔ وہ مجھے اپنے بچوں سے بڑھ کر چاہتی تھیں۔ ایک سال سے کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا جب میں نے ان کی حاضری نہ دی ہو۔ جب وہ بیمار ہو کر ہسپتال گئیں، اس وقت بھی میں دفتر سے سیدھا ان کی خدمت میں حاضر ہو کر حالات و واقعات سے انہیں آگاہ کرتا رہا۔ ان کی چھوٹی موٹی فرمائشیں اور ان کی معر خواہشیں پوری کرتا رہا۔ پھر افتخار بھائی نے یہ کیوں کہا؟ طنز یہ لہجہ میں کس لیے اور ایسے غمناک موقع پر مجھے مورد الزام کیوں ٹھہرایا؟

میں جنازے کے انبہ میں گردن ڈالے چپ چاپ چلا جا رہا تھا اور مجھے بانی کی موت کے مقابلے میں اپنے بڑے بھائی کا بول غمزہ کر رہا تھا جس نے مجھے کوئی حصوں میں بانٹ دیا تھا۔

اقبال بھائی چونکہ صرف ایف اے پاس تھے، اس لیے انہوں نے قریبی گاؤں سے سبھی، انڈے، مرغی لاکر چورجی کے پاس بیچنا شروع کر دیئے۔ دس پندرہ دن بعد جب اچھی یافت ہونے لگی تو وہ بکرے اور دنبے بھی شہر لاکر فروخت کرنے لگے۔ ان کی اگم سے گھر کا خرچ اچھا چلنے لگا اور ماں کو بے فکری ہو گئی۔

اسحاق بھائی چونکہ انقلابی ذہن کے تھے اور پاکستان بنانے کے لیے بنگال جا کر بم پنانے کی تربیت حاصل کرتے رہے تھے، اس لیے وہ ایک مرتبہ بھر جہاد میں حصہ لینے کے لیے کشمیر پہنچ گئے۔ ان کے پاس کوئی تیرتوار، مگن بندوق نہیں تھی۔ بس ایک صندوقچی سی ہوتی تھی جیسی ملائی کی برف بیچنے والوں کے پاس ہوتی تھی۔ بس اسی کے زور پر وہ گولیاں اور فلیٹ بھر بھر کر پٹھانوں کو دیتے تھے اور اپنے بیکٹر میں سپلائی لائین کے اکیلے ہی پوری پلاٹون تھے۔

سب سے چھوٹا چونکہ ماں کا لاڈلا تھا، اس لیے اس نے ہر قسم کا چھوٹا اور کچھ کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اماں کو سبز باغ دکھا دکھا کر شیشے میں اتار لیا اور اس کے جج کے جمع کردہ فنڈ سے اچھی خاصی رقم ایٹھ کراچی کے ایک نئی ٹور رائل خریدی اور ماں سے دعا لے کر جہاد کشمیر پر روانہ ہو گیا۔ اس زمانے کی مائیں چونکہ جذبہ اور جہالت سے معمور ہوتی تھیں اور ان کو ایم پی اے، اولیول، اے لیول اور ورلڈ بینک کی ملازمتوں کا علم نہیں تھا، اس لیے اپنے بچوں کو محاذ پر بھیج دیتیں ان کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں تھی۔ وہ غور تیں تو بعد میں پیدا ہوئیں اور ہمارے ہی گھرانے میں پیدا ہوئیں جو یہ کہتی تھیں کہ یہ پاکستان بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر بنانا ہی تھا تو اسے صرف ہماری اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے مخصوص رکھنا تھا۔ اس میں مذہب کدھر سے گھسیڑ دیا اور اگر مذہب لانا ہی تھا تو یہ پرانا، فرسودہ اور بنیادی مذہب کیوں اٹھا لائے۔ اس کو ماڈرن، مذہب کر کے پاکستان کے ساتھ متعارف کرانا تھا۔

جب میں اپنے چھوٹے اور سب کے پیارے اشتیاق بھائی کو محاذ پر جانے کے لیے چھوڑنے گیا تو چاروں لاریاں محاذ جنگ پر جانے والے مجاہدوں سے بھری ہوئی تھیں اور بہت سے جوان چھتوں پر بیٹھے تھے۔ ایک رائل برادر خوبصورت نو عمر لڑکے کو سائیکل کے ڈنڈے سے اتر کر اپنی طرف آتے دیکھا تو چھت پر بیٹھے جوانوں نے لغو تکبیر سے ساری فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔ جب ہمارا پیارا چھوٹا بھائی لاری کی کھڑکی میں پاؤں رکھ کر اوپر چھت پر چڑھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں اپنے بڑے بھائی کی تجارتی نوکری پر تو بہت خوش ہوا تھا۔ یہاں آنسو کس لیے؟ اپنی اپنی نوکری کی بات ہے اور اپنی اپنی نوکری کا مقام ہے۔

مجھے ایمپلائمنٹ ایجنسی نے تین ملازمتیں پیش کیں۔ ریلوے، لاہور کارپوریشن اور ریٹیل جی کیپ۔ میں نے ریٹیل جی کیپ کو ترجیح دی اور اجازت نامہ لے کر چائینیز ریٹیل جی کیپ پہنچ گیا۔ یہاں مجھے پینسٹھ روپے ماہوار پر جونیئر کلرک کی نوکری مل گئی۔ مزے ہو گئے۔

ریٹیل جی کیپ، جو اس وقت دنیا کا سب سے بڑا ریٹیل جی کیپ تھا، تین حصوں میں منقسم تھا۔ والٹن ایریا، ایئر وڈ روم اور چائینیز بیرکس۔ ان تینوں میں چائینیز بیرکس کا علاقہ سب سے بڑا تھا۔ یہیں لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین بیرکوں کے اندر اور باہر پڑے تھے اور یہیں ہماری ان کے ساتھ ہر طرح کی ڈیوٹی لگی تھی۔

میرے کیپ کمانڈنٹ نے مجھے ”معلومات“ کی بیرک میں متعین کر دیا۔ یہاں دونوں طرف کی بارہ کھڑکیوں پر بارہ کلک متعین تھے جو اپنے سامنے بے معنی سے کاغذ رکھے مہاجرین کو ان کے سوالوں کے جواب فراہم کر رہے تھے۔ ان سوالوں میں سب سے اہم سوال ایک ہی ہوتا تھا کہ فلاں شہر فلاں گاؤں فلاں بستی اور فلاں کوٹ کے لوگ اگر پاکستان آ گئے ہوں اور لاؤڈ سپیکر پر یہ اعلان سن رہے ہوں تو دفتر معلومات کے سامنے پہنچ جائیں۔

جو کلرک ”اناؤنسمنٹ بوتھ“ میں مانگیر دفون کے سامنے اعلان کرتا تھا، اس کو یہ کام سخت ناپسند تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ یہ کام چھوڑ کر جانیں سکتا تھا اور دوسرے کلرکوں کی طرح مزگشتی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے یہ کام میرے سپرد کر دیا۔ میں نے خوشی سے قبول کر لیا بلکہ شکریہ کے ساتھ قبول کر کے اناؤنسمنٹ میں اور بھی توجہ طلب باتیں کہنی شروع کر دیں۔ میرے کیپ کمانڈنٹ نے میری یہ برائیاں سنیں تو انہوں نے مجھے سینئر کلرک کا گریڈ دلوا دیا۔ اپنی ہفت روزہ میٹنگ میں انہوں نے سیکرٹری صاحب سے کہہ کر ”مورال بلڈنگ“ کا ایک باقاعدہ پروگرام شروع کر دیا۔ پناہ گزینوں کے آلے زغوں پر نظروں کے چھاپے رکھے جانے لگے تو ان میں زندہ رہنے کی رفق پھر سے پیدا ہو گئی۔

دوسرے دونوں کیپوں میں بھی لاؤڈ سپیکر پر مورال بلڈنگ کا باقاعدہ کام شروع ہو گیا۔ حکومت پنجاب نے دو اعلیٰ درجے کے دانشور اس کام پر متعین کیے۔ والٹن کیپ میں خواجہ محمد شفیع دہلوی اور ایئر وڈ روم کیپ پر ممتاز مفتی۔ یہ پہلا موقع تھا جہاں مجھے اپنے جان سے پیارے اور آنکھ کے تارے محبوب مصنف ممتاز مفتی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ خواجہ محمد شفیع بھی میرے پسندیدہ مصنفوں میں سے تھے۔ ان کے مضامین ”ساقی“ میں پڑھے تھے اور زبان کی چاشنی کے مزے لوٹے تھے۔ اب ان دونوں کے ہر روز ملاقات ہونے لگی۔ خواب حقیقت میں بدل گیا۔

اتنی لمبی امید میں نے اپنی مرحوم ستانی کی داستان غم سنانے کے لیے باندھی ہے کہ جب میں شام کے وقت ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تو بس مجھے ریٹیل چوک پر اتار دیا کرتی تھی۔ یہاں سے ہمارا جلی ہوئی چھتوں والا مکان قریب تھا جس کے دو کمروں میں ہم سارے سر چھپا کر رہتے تھے اور خوش تھے کہ پاکستان بن گیا۔

مزنگ اڈے پر ہمارے گھر سے جہت پہلے میل روڈ پر تانی زینا کی کوٹھی تھی۔ میں اکثر انہیں سلام کر کے اور وہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنے گھر آتا تھا۔ تانی کی بڑی بیٹی جو رشتے میں میری خالہ تھیں لیکن ہم سب انہیں فرزندانہ آ پا کہتے تھے، اپنے دو بچوں سمیت یہیں مقیم تھیں۔ ان کے خاندان دلایت کچھ پڑھنے گئے تھے اور لمبی سٹڈی لیو پر تھے۔

انسانی تاریخ میں صرف ایک مرتبہ ایسے ہوا ہے کہ مہاجر آئے تو انصار نے اپنے گھروں سے نکل کر ان کا استقبال کیا۔ آنکھوں پر ہنسیاں اور اپنے دلوں میں جگہ دی۔ انصار کی لڑکیاں دف لے کر مہاجرین کے سردار کے انتظار میں استقبال گاہے گاتی رہیں۔ بڑے بوڑھوں، لوے لنگڑوں، نابینا اور معذور آوازیں دے دے کر پوچھتے رہے کہ مہمان پہنچ گئے۔ مسافر آ گئے۔ مہاجر درود گئے۔ قدم ہمارے دروازے پر آ گئے۔ خانہ خانہ تست!

بس یہ ایک ہی موقع تھا جب بھائی چارے نے انسانیت کے سب سے اونچے مقام پر پہنچ کر نیچے فرشتوں کو اپنے اپنے کام میں مصروف و مشغول دیکھا۔ اس کے بعد پھر ایسا نہیں ہوا۔ کسی نے نہ تو خوش دلی سے پناہ گزینوں کو قبول کیا

اور نہ ہی پناہ گزینوں نے اپنے میزبانوں سے مہذب مہمانوں کا سلوک کیا۔

میں نے نانی زلیخا کے ساتھ تین چار ملاقاتوں کے بعد محسوس کیا کہ ان کو ہمارا لاہور نا پسند نہیں آیا۔ وہ اس شہر پر بلا شرکت غیر سے قبضہ قائم رکھنا چاہتی تھیں اور یہاں ہزاروں، لاکھوں اجنبی لوگ اچانک پہنچ گئے تھے۔ نہ صرف پہنچ گئے تھے بلکہ آہستہ آہستہ نئے گھروں میں آباد بھی ہونے لگے تھے۔ پہلے سے آباد لوگوں کو یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ کوئی دوسرا بھی آباد ہو اور ان کے گھروں کے قریب ہی آباد ہو!

ایک روز نانی نے مجھ سے پوچھا ”تم لوگ ایک جگہ ہوئے مکان میں کیوں رہتے ہو؟ کوئی اچھا سا مکان کیوں نہیں کھلوایے؟“

میں نے کہا ”اچھا سا مکان لینے سے اباجی گھبراتے ہیں کہ اگر انکو آزادی ہوگی اور ہر کار کو پتہ چل گیا کہ جو گھر ہم ہندوستان میں چھوڑ کر آئے ہیں، وہ اتنی مالیت کا نہ تھا تو ہم پر مقدمہ بن جائے گا۔“

نانی نے کہا ”خیر یہ بات تو نہیں، کوئی اور سی پھند ہے جو تیرے باپ نے تم لوگوں کو نہیں بتایا۔ وہ بڑا سنا آؤنی ہے اور پل پل کی خبر رکھتا ہے، ضرور اس میں کوئی عیب ہے۔“

مجھے نانی کی یہ بات بری لگی اور میں کافی دیر تک ان کے اس فقرے پر غور کرتا رہا۔ گھر آ کر میں نے اباجی کے چہرے کو غور سے دیکھا لیکن اس میں چالاکی کا کوئی عنصر کم از کم مجھے تو نظر نہ آیا، شاید نانی کو اندر کی باتوں کا کوئی علم ہو۔

ایک روز فرزانہ آ پانے مجھ سے پوچھا۔ ”تمہارے دونوں بھائی کشمیر میں کیا کرنے گئے ہیں؟“

میں نے کہا ”وہ جہاد میں شامل ہونے کے لیے گئے ہیں اور پچھلے ہفتے میں ان سے جہلم کے میں کیپ پٹل کر آیا ہوں۔ دونوں بہت خوش ہیں اور دونوں نے اپنے اپنے محاذ پر بڑے معرکے مارے ہیں۔“

آ پانے کہا ”تیرا جو سب سے بڑا بھائی بہادر پور میں رہتا ہے، وہ اب کیا کرتا ہے؟“

میں نے کہا ”جی وہ وہی کچھ کرتا ہے جو اب تک کرتا رہا ہے۔ زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے اور چھوٹی موٹی ٹھیکیداری بھی کرتا ہے۔“

”اس نے ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی زمینوں پر قبضہ نہیں کیا؟“ آ پانے پوچھا۔ ”وہ زمینیں جو اس کی زمینوں کے ساتھ لگی تھیں؟“

میں نے کہا ”جی نہیں کیا ضرورت ہے کسی اور کی زمین پر قبضہ کرنے کی۔ ہماری اپنی زمینیں کافی ہیں اور انہی سے اللہ تعالیٰ ہمارے رزق میں برکت ڈال رہا ہے۔“

نانی زلیخا بھی ہمیں باتیں کرتے دیکھ کر قریب آ کر بیٹھ گئیں۔ ان کی کرسی کے پائے کچھ اونچے نیچے فرش پر تھے لیکن انہوں نے اس ”ڈگ ڈو“ کی کوئی پروا نہ کی اور ہماری باتوں میں مشغول ہو گئیں۔

آ پاپو چھ رہی تھیں کہ ”میرے اباجی اب کیا کام کرتے ہیں اور میرے وہ بھائی جو گاؤں سے آگے، مرغیاں، بکریاں وغیرہ لاکر فروخت کرتے ہیں، ان کو اس تجارت سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟“

نانی نے کہا ”تمہاری والدہ کے پاس سونے کے جوہر پرانے ننگن ہیں، کیا وہ ان کو بیچنا چاہتی ہے؟“ میں نے کہا ”جی مجھے کیا پتہ کہ وہ ان کا کیا بنانا چاہتی ہیں..... مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ میری ماں کے پاس کوئی زیور ہے۔ اگر ہوتا تو وہ پہن کر دکھاتیں۔“

نانی نے کہا ”تیری ماں بڑی سمجھدار ہے اور اس کو عقلمندی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے بڑے ڈھنگ آتے ہیں۔ اس نے اپنے مال کی بھی نمائش نہیں کی۔ اندر ہی اندر سینت کر رکھتی ہے۔“

”ویسے ان سے یہ مت کہنا کہ نانی زلیخا نے ننگنوں کے بارے میں پوچھا تھا۔“ آ پانے کہا ”ان سے بس سرسری پوچھ لینا کہ وہ پرانا زیور فروخت کرنا چاہتی ہیں یا نہیں؟“

”بیچاری مشکل میں ہوگی۔“ نانی نے کہا ”اتنا بڑا میر، آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ نہیں۔ کیا کرے بیچاری۔ آہستہ آہستہ ساری پرانی چیزیں بیچتی پرے کی۔“

آ پافرزانہ نے کہا ”بس ایسے اپنی طرف سے پوچھ لینا۔ ہمارا نام نہ لینا۔ بی بی بیچاری خواہ مخواہ پریشان ہوں گی۔“

میں نے کہا ”نہیں آ پا، میں پوچھوں گا ہی نہیں۔ پوچھا تو انہیں شک پڑ جائے گا۔ وہ اور تفصیل سے پوچھیں گی۔ مجھے اور تفصیل سے بتانا پڑے گا۔ پھر اصل حقیقت کھل جائے گی۔“

آ پانے میری اس دانشمندانہ بات سے خوش ہو کر مجھے ایک نانی دی اور میرے ذہن کی بڑی تعریف کی۔ میں بھی خوش ہوا۔ میرا حوصلہ بندھا اور ایسی ایسی اچھی باتیں سوچنے اور کرنے کی ترغیب ہوئی۔ میرے اندر پہلی مرتبہ بلوغت کا احساس ہوا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں ایک لائق لڑکا نہیں لائق نوجوان ہوں۔

میرے بچے آ پافرزانہ اور نانی زلیخا کی محبت اس قدر بڑھ گئی کہ میں تقریباً ہر روز ان کے گھر جانے لگا اور ہمارے گھرانے کے اندر درنی حالات کو جس تفصیل سے وہ جانتا چاہتی تھیں اور جس طرح سے جانتا چاہتی تھیں، ان کی جزئیات اس طرح سے بتانے لگا جن کی ان کو ضرورت تھی، جن کی ان کو خواہش تھی اور جیسے ان کا اندازہ تھا۔

ان رازوں کو بڑی احتیاط سے اگلے اور ان کی ساری تفصیلات بہم کرنے کے صلے میں مجھے اعلیٰ درجے کی چائے، ریگن کے سموے، سینت کے رکھی ہوئی مٹھائی۔ میرے لیے خصوصی طور پر سنبھالے ہوئے امرود، مالے اور دوسرے مومئی پھل ملنے لگے۔ کبھی کبھار آ پافرزانہ مجھے اپنے خاندان کا کوئی قیمتی رد مال، پرانا پین، ایک مرتبہ استعمال کیے ہوئے بیڈ اور کسی ضروری کام کے لیے ٹھنڈے ڈیڑھ گھنٹہ تک کے لیے خانساں کا سائیکل بھی لے دیتی تھیں۔ اب مجھ پر یہ بات اچھی طرح سے روشن ہو گئی تھی کہ وہ کیا چاہتی ہیں اور مجھ سے ان کی کیسی توقعات وابستہ ہیں۔

پاکستان بننے سے پہلے چونکہ میں ایک قصبے میں رہتا تھا اور ضلع کے ایک معمولی سے کالج میں پڑھتا رہا تھا، اس لیے درسی اور نصابی طور پر کافی لائق ہونے کے باوجود مجھ میں وہ بات نہ پیدا ہو سکی تھی جو بڑے شہروں کے تیز و طرار لڑکوں اور گرجا گھر سکول کے طالب علموں میں آپ سے آپ جنم لے لیتی ہے۔ میں اپنی عمر کے مطابق ایک ذریعہ اور دانا لڑکا ضرور تھا۔ میرا مطالعہ بھی کافی تھا۔ کچھ ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ابتدائی قسم کی خط و کتابت بھی تھی لیکن جدید طرز زندگی

اور ولایتی بودہ باش کی افشاء اور نمائش مجھ پر وائیں ہوئی تھی۔ مجھ پر نئی زندگی اور نئے چلن کی آشکاری نہیں ہوئی تھی۔ بس کتابی سالم تھا اور کتابی علم سارا بوجہ نہیں اٹھاتا۔ ایک کونہ سا اٹھا کر رہ جاتا ہے، باقی ہر طرف اندھیرا ہی ہوتا ہے۔

میری جدیدیت اور ترقی پسندی کا آغاز ایک دہائی مشین سے ہوا جس کے اوپر ایک لگن تھا اور بائیں ہاتھ کو پیچ بھی ایک لگن تھا۔ ان کے درمیان سلائی مشین جیسی ایک تھی لگی تھی۔ یہ مشین اتارکلی میں شیخ عنایت اللہ کی دکان کے شوکیس میں پڑی تھی اور اس پر لال تھی کے نیچے میڈان سویڈن لکھا تھا۔ یہ مشین دودھ سے کریم جدا کرنے کی تھی اور اس کی قیمت تین سو تیس روپے تھی۔ میں اس مشین کو بڑی بڑی دیر تک شوکیس کے سامنے کھڑا ہو کر دیکھا کرتا اور اسے چلا کر دیکھنے کی حسرت لے کر واپس آ جایا کرتا۔

اب میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ ساری خرابی اس مشین کی وجہ سے ہوئی۔ اس دودھ سے کریم نکالنے والی مشین کی بدولت، یہ میرا کسی ولایتی برتن سے متعارف ہونے کا پہلا موقع تھا جس نے مجھے چاروں شلے چست کر دیا۔ میری طرح ایشیا اور افریقہ کے کروڑوں باشندے ولایت کی کسی نہ کسی مشین کے سامنے میری طرح سے سجدہ کر رہے تھے اور زمین سے سر ہی نہیں اٹھاتے تھے۔ اوپر لگائیں اٹھا کر دیکھتے ہی نہیں تھے کہ سر پر ایک آسان بھی موجود ہے جس کی بلند یوں پر بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے اور جس کی رفتوں کے سہارے اوپر دیکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا بھی ہو جا سکتا ہے لیکن ایسے نہیں تھا، ہم سجدہ کر رہے ہی رہنا چاہتے تھے۔

میں نے فرزند آپا سے اس مشین کا ذکر کیا تو وہ ایک بڑی سی اور موٹی سی کتاب اٹھا لائیں جو رنگین تصویروں سے لبریز تھی اور جس میں نیم برہنہ عیسائی طرح طرح کے لباس پہنے انکھیلیاں سی کر رہی تھیں۔ پہلے مجھے انکھیلیاں کے معنی نہیں آتے تھے۔ جب میں نے دوسریں میں ماسٹر گورنر سنگھ سے انشاء کی فرل پڑھی تھی، میرے ماسٹر صاحب کو اس لفظ کا مفہوم معلوم نہ تھا۔ انہوں نے اس مصرعے کی تشریح ان سادہ الفاظ میں کر دی تھی کہ اسے نکبت باد بھاری تو ہم سے انکھیلیاں کر رہی ہے اور ہم اس دنیا سے بیزار بیٹھے ہیں۔ اس سال ماسٹر گورنر سنگھ صاحب کی سالانہ ترقی رگ گئی تھی اور وہ ہر وقت بیزار رہتے تھے۔ اب جو شخص ہر وقت بیزار رہے، اس کو انکھیلیاں کا مطلب کیسے سمجھ میں آ سکتا ہے!

لیکن اب جو میں نے ولایت کی اس رنگین کتاب میں میوں کو پکڑے اتارے اور پینٹے دیکھا تو مجھے انکھیلیاں کا مطلب صاف سمجھ میں آ گیا۔ حالانکہ بہت بعد میں، آگے چل کر یہ حقیقت بھی کھلی کہ یہ بھی انکھیلیاں نہیں تھیں، وہ کچھ اور سی ہوتی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں اور جن کا مذکور ایک اور قسم کی کتابوں میں ہوتا ہے۔

آپا فرزند نے اس رنگین فہرست کے آخر میں برتنوں کا سیکشن نکال کر مجھے اس مشین کی تصویر دکھائی جو عنایت اللہ شوکیس میں پڑی تھی۔ آپا نے بتایا کہ اس کا نام سپریٹر ہے۔ اس سے کریم نکالی جاتی ہے اور اس کی سب سے اچھی ساخت سویڈن میں ہوتی ہے۔

مجھے اس مشین سے محبت ہو گئی۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہنستے روتے اسی کا خیال رہنے لگا اور میں اس کا ایک حصہ بن گیا۔ جب انسان کو کسی مشین سے محبت ہو جاتی ہے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ نہ اپنے کام کا نہ دوسروں کے

فائدے کا۔ ہر وقت ایک ہی دھن سوار رہتی ہے اور ایک ہی طلب دامن دل کھینچتی ہے کہ اس شے کا حصول ہو اور جلد ہو اور پورے کا پورا ہو! جب محبوب انسان ہو تو ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ دست طالب کو جھٹک دے گا۔ اظہار کے جواب میں انکار کر دے گا۔ اقرار کر کے جفا کا رو جائے گا۔ بھول جائے گا۔ بھلا دے گا۔ کسی اور کا ہو جائے گا۔ کسی اور کے ساتھ چلا جائے گا۔ رقیب رو سیاہ کو درمیان میں لے آئے گا۔ ناراض ہو جائے گا یا پھر اپنی چھپلا سے بنا بنایا کھیل بگاڑ دے گا۔ مشین یہ سب کچھ نہیں کرتی۔ اس کے مزاج میں نہ جفا کاری ہے نہ فراموش کاری۔ نہ مکاری ہے نہ کنارہ کشی۔ وہ تو جب کسی کی ہو جاتی ہے تو پوری کی پوری ہو جاتی ہے۔ کوئی بے ایمانی نہیں کرتی، خیانت نہیں کرتی، بے عفتی نہیں کرتی، ہمیشہ وفادار ہو کر رہتی ہے۔ مر سڈیز ہو، بی ایم ڈبلیو ہو، فراری ہو یا آلفارومو، جب ان کا عشق سر پر سوار ہوتا ہے تو اعلیٰ سے اعلیٰ انسان برے سے برے کام کرنے سے نہیں چوکتا۔ صدر مملکت ہو چاہے بادشاہ، وقت موٹر کے عشق کا گرفتار، موٹر سے دور نہیں سو سکتا۔ راقط ہو، ہیزل بلاڈ، کسمرہ ہو، کپیوٹر ہو، سی ڈی سٹم ہو، انسان ان کی محبت میں ہزاروں لاکھوں انسان قربان کر سکتا ہے۔ کاشکوف بنانے والے نے راتیں جاگ جاگ کر جس لگن کے ساتھ اپنے محبوب کا مجسمہ تیار کیا اور اس سے عشق کرنے والوں نے جس وارنٹی کے ساتھ اس کا استعمال کیا تو کسی بدعتی سے نہیں اپنی محبوبہ کی نشانی آنکھ کا نشانہ نہ دیکھنے کے لیے اور اس کی چلنت کی دھڑکن محسوس کرنے کے لیے۔ مشین سے عشق کا علم نہیں ہوتا لیکن انسان اس کے جبر اور وصال میں ایک جگہ ٹکتا ہے اور گھل گھل کر ختم ہو جاتا ہے۔ انسانی محبوب اتنا ظالم نہیں ہوتا۔

میں بھی ایک پیوڈی مشین کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا جو پوری مشین بھی نہیں تھی اور جس کا حصول بھی اتنا مشکل نہیں تھا۔

نانی زلیخا نے کہا ”میرے بیٹوں جانتے ہو، یہ مشین لے لو۔ تین سو ہی میں تو آتی ہے۔“

میں نے ہنس کر کہا ”اور تین سو کدھر ہیں ہمارے پاس نانی ماں!“

انہوں نے باہر کی طرف ہاتھ کا اٹھا کر کے چہرہ سنوار کے کہا ”ماں، سے کہو، وہ لے دے گی۔“

میں نے کہا ”ان کے پاس اتنی رقم کدھر سے آئی جو وہ اپنے بچے بیٹے کے چونٹے پورے کرتی پھریں۔“

آپا فرزند نے کہا ”تمہاری ماں کے پاس بڑے پیسے ہیں لیکن بی بی انہیں ہوا نہیں لگواتی۔“

نانی بولیں ”سارے مہاجر تالے توڑتے ہانکے پھرتے ہیں۔ تم بھی کوئی تالہ توڑ کر کسی کٹھی پر قبضہ کر لو۔ تم کو کسی نے منع تھوڑی کرنا ہے۔ مشکل تو ہم جیسے لوگوں کے لیے ہے جو اس ملک کے اصل باشندے ہیں اور مال غنیمت کے حصہ دار نہیں بن سکتے۔“

آپا نے کہا ”ہم حصہ دار تو نہیں بن سکتے البتہ حصہ بنا تو سکتے ہیں۔ بی بی نے ادھر ادھر اچھے ہاتھ مارے ہیں، ہم اشفاق سے سفارش ڈلو کر اپنا حصہ لے لیں گے۔“

میں نے قدرے اونچی آواز میں لرز کر پوچھا۔ ”آپ سے کس نے کہا؟“ تو نانی زلیخا تشفی آمیز لہجہ میں بولیں۔

”یہ بات تو اب سارے خاندان میں مشہور ہو گئی ہے، اس میں کہنے اور سننے کی کیا بات ہے۔ سبھی جانتے ہیں!“

نانی زلیخا اور ان کے گھرانے سے رو بہ رو ہو کر دوہرا ہمارا طاققت سے باہر تھا۔ برادری میں ان کی شکایت کرنے کی کسی میں جرأت نہیں تھی۔ اپنی صفائی پیش کرنے پر کسی نے اکتبا نہیں کرنا تھا۔ یہ اتنا مشکل محاذ تھا اور وہ اتنے سڑے لوگ تھے کہ ہمارا ہونا نہ ہونا ایک جیسا تھا۔

تھی تو ایک طرح کی منافقت لیکن میں نے سوچا اپنا پالا چھوڑ کر نانی کے لشکر سے مل جاتے ہیں۔ اگر وہاں سیندھ لگ گئی تو ایک چھوٹا سا ڈاکٹار بنا کر رکھ کر فلیٹ لگا دیں گے نہ لگ سکی تو واپس آ جائیں گے۔ گھر کے لوگ محبت کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں، دھکے دھوڑے کھایا آدمی جب واپس گھر والوں کی دہلیز پر پہنچتا ہے تو دروازہ کھل ہی جاتا ہے۔

ایک شام دفتر سے واپسی پر جب میں نانی کے گھر پہنچا تو آ پاؤں کے ناخنوں پر کیونکس لگا رہی تھیں۔ میں بیڈن سے باریک بوندی کے چیلڈو لے کر چلا تھا۔ جاتے ہی الفاظ آ پافرزانہ کی گود میں ڈال دیا۔ انہوں نے پوچھا "یہ کیا؟" میں نے کہا "آپا میں نے وہ مشین خرید لی، کریم نکالنے والی۔ پونے تین سو میں۔"

پونے تین سو کا اعلان سن کر نانی بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور پوچھنے لگیں۔ "کیا خریدیں پونے تین سو میں؟" "کریم نکالنے والی مشین اماں۔" آپا نے جواب دیا۔ "کس نے خریدی ہے؟"

"اس نے اماں..... اشفاق نے۔" "تو تین سو چھوڑ تین ہزار کی چیزیں بھی خرید سکتے ہیں۔" نانی نے وثوق کے ساتھ کہا "اب ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اس کا باپ چاہے تو پورے لاہور کو خرید سکتا ہے!"

میرے دل پر گھٹے جاٹ کی برجھی گئی۔ آپا فرزانہ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "مشین تو لے آئے ہو، مگر دودھ کہاں سے لو گے؟ اس کے ایک گھان کے لیے کم از کم آٹھ سیر دودھ کی ضرورت ہوگی۔"

"اس کا بندوبست بھی ہو گیا ہے۔" میں نے جیسی آواز میں ذرا شرماتے ہوئے کہا۔ میری بات سن کر نانی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انہوں نے منہ کھولا ہی تھا کہ آپا بول اٹھیں "کدھر سے بندوبست ہو گیا ہے دودھ کا؟"

"اللہ نے تو کر دیا ہے منڈیا۔" نانی کہنے لگیں۔ "لیکن اس نے کوئی سبب بھی تو پیدا کیا ہوگا۔ اللہ سب کے بغیر کچھ نہیں دیتا اور سب اس کی ایک اوٹ ہے۔ اس نے کوئی راہ پیدا کی ہوگی ناں۔"

میں نے کہا "ہاں جی راہ پیدا کی ہے تو میں نے یہ مشین خریدی ہے ورنہ مجھے کیا ضرورت پڑتی تھی، خواہ وہ پیسے خرچ کرنے کی۔" آپا نے بڑی محبت کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "آخر ہم کو بھی تو پتہ چلے کہ کوئی راہ پیدا ہوگی ہے تم لوگوں کے لیے۔"

اس کے بعد میں کچھ دیر وہاں بیٹھا ضرور لیکن مجھ سے کوئی بات نہ ہوئی! نانی کی کونھی سے نکل کر میں ریگ کے برآمدے میں چلا اور آنے والی فلوں کی تصویریں دیکھتا رہا۔ پھر چہل قدمی کرتا ہوا اسمبلی ہال کے سامنے چھوٹے سے گراہی پلاٹ میں جا بیٹھا لیکن جب وہاں بھی دل کا بوجھ کم نہ ہوا تو آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر پہنچ گیا۔ اماں اٹھ کر روٹی دیئے لگیں تو میں نے کہا "رہنے دو اماں، مجھے بھوک نہیں۔" انہوں نے حیرت سے میری جانب دیکھا تو میں نے کہا "آج دن بھر دفتر میں ایسی الم علم چیزیں کھاتے رہے کہ اب معدہ انکاری ہو گیا ہے۔ کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔"

اماں کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں میری بات کا یقین نہیں آیا لیکن برا تھہ ہی ان کے چہرے سے یہ بھی ثابت ہو رہا تھا کہ وہ چور ہیں اور انہوں نے بند کوشیوں کے تالے توڑ کر بیگانہ مال سرقت کیا ہے اور کسی کو اس کی خبر نہیں ہونے دی۔ میری ماں تو ایسی نہیں تھی لیکن کیا معلوم حالات اور واقعات نے ان کو ایسا بنا دیا ہو۔

بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے پاکستان بنانے میں دن رات ایک کر دیا تھا اور اپنے آپ پر راتوں کی نیکیوں حرام کر لی تھیں، وہ دن کی روشنی میں حرام کھانے لگے تھے۔ بس دیکھتے دیکھتے اور کا اور ہو گیا تھا اور لوگوں کے پیچھے ہونے اندر باہر آ گئے تھے جس طرح اندر کی چھپی ہوئی گھٹی باہر آ جائے اور "صاحب گھٹی" اس طرح سے پریشان ہو جائے کہ اسے احساس نہ ہو، وہ پریشان ہو گیا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال حرام کھانے والوں کا تھا۔ کوئی کوئی شخص ان میں یہاں تک ضرور پہنچا تھا کہ ہم نے پاکستان سوچ سمجھ کر اور اپنے آپ کو بکتر بند کر کے نہیں بنایا بلکہ ایک جذبے کے تحت بنایا ہے اور جذبہ اندھا ہوتا ہے۔ ادھر بھی لے جا سکتا ہے، ادھر بھی لے جاتا ہے۔ اس کی لہر پر سوار انسان بالکل بے قابو ہو جاتا ہے۔

بہت ممکن ہے اماں بھی ادھر آ کر بے قابو ہو گئی ہوں اور ان سے یہ ساری خطائیں سرزد ہونے لگی ہوں جن کا ذکر نانی زلیخا اور فرزانہ آپا ایک ہی سانس میں کیا کرتی تھیں۔ میں نے اماں پر کڑی نگاہ رکھنی شروع کر دی اور اپنی بڑی آپا کو کچھ بتائے بغیر اس کام پر مامور کر دیا کہ وہ ہماری تعمیر پاکستان والی مسلم لگی قدروں پر نگاہ رکھیں اور جہاں کہیں ان میں کوئی تبدیلی محسوس کریں فوراً سر جری کر کے اس خوفناک گرد و گداز سے کاٹ دیں۔

لیکن ہم سب کے محنت اور لگن سے کام کرنے کے باوجود ہمارے مالی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ اباجی نے دو تین مرتبہ لالہ بالک رام سے مزید قرض لیا تھا اور بھاری رقم کا لیا تھا لیکن اس سے ہماری مالی حالت سدھرنے کے بجائے اور گر گئی ہوئی جاری تھی۔ میرے گھر، بکریاں اور انڈے، مرغ لالانے والے بھائی یہ کام چھوڑ کر کچھ اور کرنے کی سوچ رہے تھے لیکن چھ سات ماہ کی عمر کے پاکستان میں کوئی پوٹیشنل ہی نہیں تھا۔

جب میں نے یہ محسوس کیا کہ ہماری نانی زلیخا کا انصار گھرانہ ہم مہاجروں کو "چور اچھے، لالچی اور لوہی" سمجھتا ہے اس نے ہمارے بارے میں غلط اندازے لگانے شروع کر دیے ہیں تو اس صورتحال نے مجھے شدید رنج میں لتھیر دیا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے مجھے یہی غم و دیک کی طرح چاٹنے لگا کہ ہم اپنی نیک نامی کا گرا ہوا سائن بورڈ پھر کیسے اٹھا کر اپنی ساکھ کے دروازے پر لگا سکتے ہیں۔

میں خاموش ہو گیا اور بڑی دیر تک اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ نانی نے کہا ”دیکھو ہم تیرے بڑے ہیں، تیرے بزرگ ہیں۔ تمہاری خوشی میں ہماری خوشی ہے اور تمہاری ترقی میں ہماری ترقی ہے۔ بتاؤ کیسا چانس ملا ہے تم کو؟“ میں پھر بھی اسی طرح خاموش اور ڈرا ڈرا بیٹھا رہا تو آپا فرزانہ نے چکار کر کہا ”دیکھو میں تمہاری خالہ بھی ہوں اور تمہاری آپا بھی۔ پھر تمہارے آنے جانے سے ہم میں ایک طرح کی دوستی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اب اس دوستی میں اعتماد پیدا کرنا تمہارا کام ہے۔“

میں نے منمناتے ہوئے کہا ”مجھے ڈر لگتا ہے!“

”ڈر کس بات کا بیٹا!“ نانی نے کہا ”ہم تمہارے رشتہ دار ہیں، کوئی غیر تھوڑی ہیں۔ کھل کر بات کرو۔“ ”کھل کر بات کرو۔“ آپا نے کہا ”اور اعتماد کے ساتھ بات کرو، ہم بڑھے لکھے لوگ ہیں، ایک کارا از دوسرے کو نہیں دیا کرتے۔“

”بس سمجھو تم نے بات کی اور کنویں میں گر کر ختم ہو گئی۔“ نانی بولیں۔ ”ہم ایک کی بات دوسرے سے نہیں کیا کرتے۔ ہمارے بڑے پختہ اصول ہیں۔“

میں پھر بھی اسی طرح خاموش بیٹھا رہا تو آپا نے میرا گندہ ہاتھ اپنے خوشبودار ہاتھوں میں لے لیا ”ایسے چپ چاپ کیوں ہو؟ اصل بات کیوں نہیں بتاتے؟ ہم کوئی تمہارے دشمن ہیں جو تمہاری پرائیویٹ بات کسی اور کو بتا دیں گے؟ شاباش، شاباش، کم آن..... کیا بات ہے؟“

میں نے آہستہ سے کہا ”دودھ کا بندوبست ہو گیا ہے اور تقریباً بیس سیر دودھ روز ملنے لگا ہے۔“

”لیکن کیسے بھئی؟ کس طرح؟“ آپا نے مضار کر پوچھا۔

”وہ ایسے آپا..... میں نے ڈرتے ڈرتے کہا“ ہمارے قریب ہی فین روڈ پر اندر کو جا کر رائے صاحب رام کرنی داس ایڈووکیٹ ہائی کورٹ کی کوٹھی ہے۔ کوٹھی تو بند ہے البتہ اس کے سر ونس کو اڑا کر شیڈ کے اندر رائے صاحب کی دو بھینسیں ابھی بھی موجود ہیں۔“

”اور وہ ابھی تک زندہ ہیں!“ نانی نے جلدی سے پوچھا۔

”ان کی دیکھ بھال کو ایڈووکیٹ صاحب ایک پوریا ملازم چھوڑ گئے ہیں جو کوٹھی کی رکھوالی بھی کرتا ہے اور بھینسوں کی دیکھ بھال بھی کرتا ہے۔ پرسوں انفار بھائی نے اندر جھانک کر دیکھا تو پوریا ٹوٹی ہوئی دیوار کی اوٹ میں بیٹھا روٹی پکا رہا تھا۔ بھائی جان، نے اندر جا کر پوچھا کہ تم ابھی تک یہاں کیوں چھپے بیٹھے ہو تو وہ گھٹکھیا کر ہوا، مالک مجھے بھینسوں کی رکھوالی پر چھوڑ دیا ہے۔ بھائی جان نے جھڑک کر کہا، اوئے حرام زادے کا فرا ابھی تک کسی کو پتہ ہی نہیں چلنے دیا کہ تم یہاں رہتے ہو۔ وہ روٹی چولہے پر ہی چھوڑ کر ہاتھ باندھ کر رونے لگا اور کہنے لگا، مالک میری جان بخشی کر دیو میں تیرے سامنے ہی کوٹھی چھوڑ کر چلا جاتا ہوں۔ وہ چلا گیا تو بھائی جان نے بالٹی لے کر دونوں بھینسوں کی دھار نکالی اور دودھ لے کر گھمرا آ گئے۔ اب صبح کے وقت وہ دودھ دہتے ہیں اور شام کو میں جا کر دوہتا ہوں۔ اماں نے لسی بلو کر کھنکھانا شروع کر لے کر گھمرا آ گئے۔“

دیا ہے اور اب ہم کھن ڈال کر سالن بناتے ہیں۔“

”دودھ تو لے آتے ہو بالٹیاں بھر کر۔“ نانی بولی ”لیکن بھینسوں کا خرچ کون پورا کرے گا؟“

اس سوال سے میں کچھ ہلکا سا گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھ پر جرح بھی ہو سکتی ہے اور مجھ سے مشکل سوال بھی پوچھے جاسکتے ہیں۔ کافی گھمبیر صورتحال تھی لیکن چونکہ مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا، اس لیے میں نے دونوں ماں بیٹی کو اپنے اعتماد میں لے کر کہا ”رائے صاحب کے شیڈ میں دو سو بوری تو بنو لے کی پڑی ہے اور ساٹھ بوری کھلی کی موجود ہے۔ ایک پرانا گیراج بھوسے توڑی سے بھرا ہوا ہے۔ کچھ بوریاں بچنے کی دال اور بچنے کی بھوئی کی بھی ہیں۔ سال دو سال تک آسانی سے کام چل جائے گا۔“

”اور اگر کسی اور نے بھینسوں اور گیراجوں پر قبضہ کر لیا، تمہاری طرح..... پھر؟“

”ہم نے نورے بگھیاڑ کو چشتیاں سے بلوایا ہے، اب بھینسیں اور بھوسہ چو کر اس کی نگرانی میں ہے۔“

دونوں ماں بیٹی نے ایک دوسری کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور ان کی آواز مدھم پڑ گئی۔ میں نے کہا ”اب مجھے رخصت دیجئے، زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتا کہ مجھے جا کر بھینسوں کی دھار نکالنی ہے اور پھر ماں کے ساتھ مل کر دودھ کاڑھنا ہے۔“

ان دونوں کی کانٹیاں گرا کر جب میں کوٹھی کے دروازے سے نکلا تو میرے فتح یاب دل نے پر پھڑ پھڑا کر ایک اونچی اذان دی اور میں پڑی پر گھس گھس گیاں ہی ڈال کر چلنے لگا لیکن ایک دن کے اندر اندر یہ بات مصری شاہ والے پھپھا جی، مسلم ٹاؤن والی خالہ اور اسلامیہ پارک کے لالہ جی کے یہاں پہنچ گئی۔ میری ماں نے رو رو کر اور بد دعائیں دے دے کر برا حال کر لیا۔ جب میری ماں روتے ہوئے ناک صاف کر کے اس جھوٹ بہتان لگانے والے کو بد دعائیہ تو میں سر سے لے کر پاؤں تک لرز جاتا لیکن میری ماں نہیں جانتی تھی کہ میں اسی کا بدلہ لے رہا ہوں اور ایک سائنٹفک طریقے پر لے رہا ہوں۔

انہی دنوں آپا فرزانہ کی چھوٹی بہن آپا نعمانہ پنڈی سے ملنے کے لیے آئیں تو میری نانی اور آپا نے ان کو ہمارے وارے نیارے کی طویل داستانیں سنائیں۔ مجھے ان کی آمد کا پتہ چل گیا تھا اور یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کس شدت سے میرا انتظار کر رہی ہیں لیکن میں تین چار دن ان کے گھر نہیں گیا۔ خالی دے گیا۔

میری ماں کو کچھ شک پڑنے لگا کہ یہ سارا جھوٹا پروپیگنڈہ ان کی خالہ زلیخا کرتی ہیں اور ایسی ساری کہانیاں ان کی کوٹھی میں پروان چڑھتی ہیں اور وہاں سے پھر سارے خاندان میں ایکسپورٹ ہوتی ہیں لیکن میں نے اماں کے خیال باطل کو اپنی مضبوط دیلوں سے کاٹ دیا اور ان کی تشفی کرا دی کہ یہ سب کچھ کوئی اور کرتا ہے اور وہ ادھر ہی کہیں، ہمارے گھر کے آس پاس آباد ہے۔ اماں کی ساری توجہ اپنے ارد گرد کے لوگوں پر مرکوز ہو گئی اور وہ ایک گھرے بھیل بھوسے میں پھنس گئیں۔

کچھ دنوں بعد جب میں نانی کے گھر گیا تو آپا نعمانہ نے میرے ساتھ ایسے گلے شکوے کیے کہ مجھے جیج یقین

ہو گیا کہ سارے خاندان میں ان سے بڑھ کر کوئی بھی مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا ”میں نے تو پنڈی سے چلے ہی کیپٹن صاحب سے کہا تھا کہ اگر میں اشفاق سے نہ مل سکی تو میرا لاہور جانا ہی بیکار ہوگا۔ شکر ہے تم آگے لیکن تم ایسے بے ادب اور بے حیا ہو کہ رات دن ڈال کر آئے ہو۔ کیا تم کو پتہ نہیں چلا تھا کہ تمہاری آپا نعلاند آئی ہوگی ہیں۔“

میں نے شرمندگی کا سر جھکا کر کندھے کیلئے کہا ”مجھے معلوم تو ہو گیا تھا آپا کہ آپ آئی ہوگی ہیں لیکن ہمارے کیپٹ میں پناہ گزینوں کی دو گاڑیاں ایک ساتھ انڈیا سے آئی تھیں اور ان کے زخمی اس بری طرح سے کٹے ہوئے تھے کہ ان کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ ادھر قبرستان میں کوئی جگہ نہ تھی۔ میں نے تو ماڈل ٹاؤن کے باہر سڑک کنارے قبریں کھدوا کر لاشوں کو دفن کر دیا۔ لحدیں تو نہیں اٹھوائیں بس ایک نشان سے دوسرے نشان تک ایک لمبا سا اجتماعی قبرستان بنا دیا ہے۔ آگے اللہ معاف کرے۔“

میرا خیال تھا اس دردناک منظر سے متاثر ہو کر وہ سب رونے لگیں گے اور مجھے برا بھلا کہیں گی کہ میں نے لحدوں کی نشانیاں کیوں نہیں اٹھائیں اور انہیں دفن کرنے کے بعد زمین کو سپاٹ کیوں کر دیا مگر ان تینوں نے میری اس بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ نہ وہ حیران ہوئیں۔ نہ ان کا دل پیچا، نہ ہی آنکھیں نمناک ہوئیں۔ نانی زلیخا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہمدردانہ لہجے میں پوچھا ”بھینسوں کا کیا حال ہے؟“

میں نے کہا ”بھینسوں کا حال تو اچھا ہے لیکن نانی ایک مصیبت آپڑی ہے۔ ہمیں خیال بھی نہیں تھا کہ یہ مشکل بھی ہو سکتی ہے لیکن ہو گئی۔“

”ایسا تو پھر ہوتا ہے۔“ فرزانہ آپا نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”مفت کے مالوں پر یوں آزادی سے قبضے تو نہیں ہوتے!“

میں نے رک رک کر کہا ”سب تو ٹھیک ہو گیا نعلاند آپا لیکن ابھی پورا سکون نہیں ہوا۔ ایڈووکیٹ صاحب کی کوٹھی میں گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

”وہ تو ہونی ہی تھی۔“ فرزانہ آپا نے کہا۔

لیکن نانی زلیخا اصل حقیقت جاننے کے لیے بہت پریشان تھیں۔ انہوں نے کہا ”کچھ بھونے کا بھی منہ سے یا ایسے ہی مرچے پڑھتا جائے گا۔“

میں نے کہا ”دونوں بھینسوں کی جودھ کنیاں تھیں، وہ دیکھتے دیکھتے جوان ہو گئیں۔“

”ابھی سے!“ نانی نے بات کاٹ کر کہا۔

میں نے کہا ”جی میرا مطلب ہے وہ دودھ پینا چھوڑ کر چارہ کھانے لگیں۔ اماں نے کہا دودھ پر بھی مہنگی تھیں اور چارے پر اور بھی مہنگی ہو گئی ہیں، ان کو دفع کرو۔ قصائیوں کو دے دو۔“

”ہائے میں مروں!“ نعلاند آپا نے جھوٹی موتی کہا۔

تو میں نے کہا ”نعلاند آپا آدمی بوری تو وہ کھلی کی کھا گئیں اور آدمی چنے کے چھلکے اور سوڑھ کی۔ اماں نے کہا، ان

کو دفع کرو۔“

”پھر کر دیں دفع؟“ نانی نے پوچھا۔

میں نے کہا ”جی ہاں، اسی روپے میں دونوں بچے دیں۔“

”چلو ایک سوساٹھ میل گئے تیری ماں کو مفتا مفت۔“ نانی نے ناخوش ہو کر کہا۔

میں نے کہا ”جی ایک سوساٹھ تول گئے لیکن بھینسوں نے اپنی بچیوں کو یاد میں اڑانا شروع کر دیا۔ اس قدر زور

دور سے ڈکرائیں کہ سارا علاقہ ان کے نالہ و شہیون میں ڈوب گیا۔“

”کوئی آیا تو نہیں تحقیق کرنے؟“ نانی زلیخا نے پوچھا۔

”نہیں جی، تحقیق کرنے کس نے آتا ہے؟“ میں نے کہا ”آتا تھا تو مرنا تھا۔“

آپا نعلاند اس واقعے پر کچھ زیادہ حیران نہ ہوئیں کیونکہ ان کو ساری بیک گراؤڈ معلوم تھی۔ کچھ یہاں پہنچ کر

معلوم ہوئی، کچھ روز کے روزانہ کو فون پر بتادی جاتی تھی۔ انہوں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا ”اب تو سکون ہے؟“

میں نے کہا ”جی اللہ کا شکر ہے۔ اب تو سکون ہے۔ اب تک تو وہ اپنی بچیوں کو بھول بھلا بھی گئی ہیں۔ شروع

شروع میں ان کا دودھ بھی سوکھ گیا تھا لیکن اب بفضل خدا پھر اسی طرح سے دھیل ہو گئی ہیں اور باللیاں بھر بھر کر دودھ

دیتی ہیں۔“

یہ بھینسوں والا قصہ اس قدر شہرت پکڑ گیا تھا کہ ہمارے لاہور کے رشتہ داروں سے نکل کر دور دور شہروں تک چلا

گیا تھا۔ میری ماں پہلے تو صرف گالیاں اور کوسنے دیتی تھیں، اب اس جہان سے زخمی ہو کر وہ ہنسنے پڑنے لگیں۔ مجھے اماں پر

بے ترس آتا تھا لیکن میں کچھ کبھی نہیں سکتا تھا، مجبور تھا۔

اس زمانے میں مال روڈ پر یاسین خان چیشٹری والے کی ایک مشہور دکان تھی جہاں سے چیشٹری اور جنرل

مرچنڈائز کے علاوہ خشکی کی گلاسیوں میں کریم بھی مل جاتی تھی۔ میں نے دو گلاسیاں کریم خرید کر انہیں گھر لے جا کر سلور کی

کنوری میں انڈیلا اور اوپر اخبار کا کاغذ ڈوری چڑھا کے باندھا۔ یہ پنڈی سے آئی ہوئی نعلاند آپا کے لیے ایک بیش بہا تحفہ

تھا کہ وہ مری جا کر ہمیشہ کریم کافی پیا کرتی تھیں۔

انہوں نے کنوری میں انگلی ڈبو کر سفید سفید کریم کو اپنے سرخ سرخ ہونٹوں سے چوسا اور پھر چٹا کر بھر کر پوچھنے

لگیں ”تم نے خود بنائی ہے اپنی مشین سے..... خود!“

میں نے اثبات میں سر ہلا کر عاجزی کا اظہار کیا تو وہ خوشی سے لہرا کر بولیں ”فرزانہ آپا کچھ کے دیکھیے بالکل

میں نے کریم کا مزہ ہے۔ وی فریش نہیں، وی موٹائی، وی سفیدی اور وہی خوشبو۔“

آپا نے کہا ”اب اس کو شیش چلا کر محاورہ بھی تو ہو گیا ہے۔ بڑی آسانی سے سائڈ بزنس شروع کر سکتا ہے۔“

میں نے کہا ”یہ محاورہ تو ہو گیا ہے۔ البتہ ایک دوسری مایوسی گلے کا بار بن گئی ہے۔ ہم نے رائے بہادر صاحب کی

گھول لی ہے لیکن اس میں بھاری بھر کم فرنیچر اور موٹے موٹے قالینوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔“

”کرا کری؟ کرا کری؟“ فرزند آ پانے جلدی سے پوچھا۔

میں نے کہا ”وہ تو بہت ہے، تین الماریاں بھری ہوئیں لیکن عجیب سی گنواروی۔ ہم نے چائے کا ایک سیٹ نکالا تھا تو اس کی پیالیاں اتنی پتلی اور ایسی باریک دیواروں کی ہیں کہ باہر سے ساری چائے نظر آتی ہے۔“
نمائندہ آ پانے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”ہائے میں مر جاؤں آ پانے۔ یوں چائے۔“

میں نے کہا ”بالکل ٹھیک ہے، ان سب کے پینڈے کے نیچے یہی لکھا ہے۔ ہم یہ سیٹ نکال کر گھر لے جا کے چائے پینے بیٹھے تو اماں نے ساری چائے باہر پھینکوا دی۔“
”کیوں؟“ مانی نے اونچی آواز میں پوچھا۔

”آ پانے اماں کو بتا دیا کہ اماں یہ پیالیاں ہڈی سے بنی ہیں اور ان پر یوں لکھا ہوا ہے۔“ اماں نے کہا، ”دفعہ دور پتہ نہیں کس حرام جانور کی ہڈی ہوگی۔ ہم نہیں استعمال کرتے۔ سب ہاتھ منہ دھو، کلی کرو۔“
”اور وہ فی سیٹ؟“ آ پانے فرزند نے پوچھا۔
”وہ اماں نے جعدارنی کو دے دیا۔“

دونوں بہنوں نے ایک ساتھ چیخ مٹا کر لگا لگا اور سر پیٹ لیا۔ پوچھنے لگیں ”تمہاری جعدارنی کہاں رہتی ہے؟“
میں نے کہا ”وہ پروفیسر ابرار صاحب کے کوارٹر میں رہتی ہے۔ پروفیسر صاحب نے میں روپے میں وہ سیٹ جعدارنی سے خرید لیا ہے اور بہت خوش ہیں۔ ان کو حرام حلال کی کوئی پروا نہیں۔ ان کے سارے گھر والے اسی سیٹ میں چائے پیتے ہیں کہ کوئی بات نہیں ہڈی کا ہوا تو کیا ہوا۔“
دونوں بہنوں نے ایک دوسری کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا جس میں غم فصد حسرت لالچ پشیمانی اور شدید رنج کا اظہار تھا۔

میں نے کہا ”اچھا آ پائیں اب چلتا ہوں، کافی دیر ہو گئی ہے۔ اماں میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔“
جب میں گھر پہنچا تو اماں واقعی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ”کل تجھے دفتر نہیں جانا۔ میرے ساتھ چلنا ہے منگمری۔“ میں نے حیرانی سے اپنی ماں کے چہرے کو دیکھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اٹھ کر اسے گھٹ کے ہنسی ڈالی تو وہ اور زور سے رونے لگی اور آہوں اور کراہوں میں اس کا بدن جھٹکے کھانے لگا۔ میں نے اپنے گندے سے رومال سے اس کے شفاف اور پاکیزہ آنسو پونچھے اور پھر چپکار کر پوچھا ”کیا بات ہے اماں؟ تو اس طرح سے رو کیوں رہی ہے؟“

اماں نے خشنی سانس بھر کر کہا ”ہماری منگمری کی ساری برادری میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کہ بی بی سردار بیگم کے مشغلے بیٹوں نے لاہور لوٹنا شروع کر دیا ہے اور انہوں نے جانے والے ہندو مہا جروں کی کوٹھیاں توڑ کر ہر طرح کا سامان وہاں سے اٹھالیا ہے اور تو انہوں نے چھ بھینسیں بھی لوٹ کر ایک احاطے میں جمع کر لی ہیں اور صبح ہشام دودھ پینا شروع کر دیا ہے۔“ پھر ماں نے اونچے اونچے رو کر کہا ”ساری برادری میں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ میں بچے ہوئے

دودھ کو بلو کر کھن نکالتی ہوں اور گھی بنا کر بیچتی ہوں۔“

میں نے کہا ”چھوڑیں اماں، دفع کریں۔ ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ان کا جواب دینے کی یا انہیں صفائی پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہم جو ہیں سو ہیں، ہم جانیں اور ہمارا خدا۔ ہمیں کسی کے مشقیت کی کوئی ضرورت نہیں۔“
اماں نے کہا ”بکواس نہ کرو جس طرح سے میں کہتی ہوں ویسے ہی کرو۔ اپنا بیگ ابھی سے تیار کر کے رکھ لے مع سویرے ہم پہلی لاری سے منگمری روانہ ہو جائیں گے اور دودن بھر کر واپس آ جائیں گے۔ میں برادری کے لوگوں سے مدد و منت بات بھی کر لوں گی اور اپنے بھائی بہنوں اور عزیز رشتہ داروں سے مل بھی لوں گی۔“

”لیکن میں دفتر سے چھٹی لیے بغیر کیسے جا سکتا ہوں اماں۔“ میں نے منمن کر کہا تو مجھے ایک زور کی ڈانٹ پڑی کہ ”ایسی کوئی تیری ڈپٹی کشنری کی نوکری ہے جس کے لیے چھٹی یعنی پڑے۔ واپس آ کر عرضی دے دیا۔ کوئی نہیں کچھ کہتا۔“

اب ان کی اس دلیل کے آگے میں کیا عرض کر سکتا تھا۔ ذرا سی دیر خاموش رہ کر میں نے کہا ”اچھا اماں جیسے آپ کی مرضی۔ جو آپ کہیں گی وہی ہوگا۔“

سہ پہر کے قریب ہم منگمری پہنچے تو لاری اڈا پر میرے کچھ مامول، کچھ خالو اور ایک چچا کھڑے تھے۔ میری اماں چونکہ سب سے بڑی تھیں، اس لیے سارے ان کا دل و جان سے احترام کرتے تھے۔ جب ہم لاری سے اتر رہے تھے عین اسی وقت ماما نور محمد اپنے بیٹے اسحاق کو لے کر آ گئے۔ وہ بہت شرمندہ تھے کہ وقت سے پہلے اڈا لاریاں پر پہنچ کر بی بی کا ساوگت نہ کر سکے۔
میرے ان سارے بزرگوں نے ایک مجھے گود میں نہیں اٹھایا، باقی اپنی محبت کے اظہار میں سب کچھ کیا۔ میں اندازہ بھی نہ کر سکتا تھا کہ ان سب کے دلوں میں اپنی بی بی کی ایسی قدر ہے۔

وہاں مجھے میرے کزن خیر کا ایک اور بھائی بھی ملا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے بڑے تپاک اور گہری عقیدت و محبت سے میری ماں کو سلام کیا۔ میری ماں نے اسے گلے لگا کر پیار کیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی آبدیدہ ہو گئیں۔ منیر کے والد، میری ماں کے بھائی، کسی حادثے میں فوت ہو گئے تھے اور منیر نو عمری میں ہی یتیم ہو گیا تھا۔ بھائی خیر نے بتایا کہ ہمارا یہ لاڈلا بھائی کوئی کام نہیں کرتا، شاعری کرتا ہے اور منیر نیازی کے نام سے لکھتا ہے۔ اس کی کچھ نظمیں اخبار رسالوں میں بھی شائع ہو چکی ہیں، اور اب یہ منگمری سے اپنا ایک پرچہ نکالنے کا منصوبہ بنا رہا ہے لیکن ہم اسے منع کر رہے ہیں کہ اپنا ٹرانسپورٹری کا آبائی کام چھوڑ کر کسی نئی بک بک میں نہ پڑے اور اسی کام میں عزت حاصل کرے جس سے باپ دادا نے دولت بھی کمائی ہے اور نام بھی کمایا ہے۔

میں اپنے خاندان کے ایک ہم نوجوان شاعر کو اپنے درمیان پا کر بہت خوش ہوا اور اس سے راہ و رسم بڑھانے کو قریب جا کر بولا ”مجھے بھی شاعری سے گہرا شغف ہے اور میں بیت بازی کے انٹر کالیمٹ مقابلوں میں شریک ہو کر ہمیشہ انعام حاصل کرتا رہا ہوں۔ اب آپ کو بھی اس مشغلے کا شوقین پاکر اپنی دوستی کا ہاتھ آپ کی طرف بڑھاتا ہوں..... السلام علیکم!“

میرا ہاتھ بڑھے کا بڑھارہ گیا اور اس ظالم نے مجھ سے ہاتھ ملا نہ پسند کیا۔

جب ہم دونوں ظالم و مظلوم ایک دوسرے کے سامنے چپ چاپ کھڑے تھے تو میری ماں نے آواز دے کر کہا ”میر میری صندوق کڑی اٹھا لو بیٹا اور آگے آگے چلو۔ اپنی ماں کو بتاؤ کہ میں آگئی ہوں۔“

میر نے ”اچھا جی“ کہہ کر لپک کر اماں کی صندوق کڑی اٹھائی اور اسے اس فخر سے اٹھا کر چلا جیسے وہ شاعر نہ ہو کوئی معمولی سا میر نیازی ہو۔

اماں نے جاتے ہی ساری برادری میں رچھڑ ڈال دیا تو سب مرد اور عورتیں کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر کہنے لگیں کہ ”ہم سے تو جوئی چاہے قسم لے لیں بی بی ہم نے نہ تو ان باتوں میں کوئی دخل دیا اور نہ کسی پر اعتبار کر کے ایسی باتوں کو مانا۔ یہ کوئی اور سی بذاذت اور بی ایمان کا فر ہے جو آپ کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں پھیلاتا ہے۔ ہم اس سے بالکل بری الذمہ ہیں۔“

اماں نے ہاتھ اٹھا کر اس کا فر، کتے کو بد دعائیں دیں کہ اللہ کرے کیڑے پڑیں۔ کوڑھی ہو کر مرے۔ آنکھوں میں سنڈیاں چلیں، کفن نصیب نہ ہو، چیلیں، کوئے گدھیں گیدڑ لاش نوچ نوچ کر کھائیں، قبر نصیب نہ ہو۔

موقع پر موجود سب بی بیوں نے ہاتھوں پر دوپٹے پھیلا کر آمین کہا اور مردوں نے دعائیں انداز میں ہاتھ اٹھا کر ثم آمین کہا۔ ایسی بد دعائیں سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے لیکن میں مجبور تھا۔ ہمارے شریف، غریب، مظلوم، احمال گھرانے کی تذلیل ہو رہی تھی، خاص طور پر میری ماں کی عزت چوراہے میں نیلام ہو رہی تھی، یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر تھا۔ میں ہر حال میں اس کا بدلہ لینا چاہتا تھا لیکن مجبور تھا۔ تیر و تفنگ سے بدلہ لینے کی مجھ میں طاقت نہ تھی، بس ایک فکشن کا سہارا تھا جو کبھی لڑ رہی تھی اور بھرے ہاتھ کے دار کر رہی تھی۔

اماں جب ہماری منگھری برادری کی یو این او سے برأت کا سرٹیفکیٹ لے کر واپس لاہور پہنچیں تو اگلے ہفتے راولپنڈی برادری میں اپنا کیس لے جانے کا پروگرام بنانے لگیں۔ میں نے کہا ”اماں! ابھی دو تین ہفتے ٹھہر کے جانا، اوپر تلے ٹھیک نہیں۔ بڑے بزرگ سمجھیں گے شاید آپ ہی میں کوئی خرابی ہے جو بھاگی پھرتی ہیں۔“ اماں کی مہربانی تھی جو انہوں نے میری بات مان لی ورنہ اتنی اجتماعی بددعاؤں کے سامنے میرا کچھ نہیں رہنا تھا!

تین دن بعد جب میں منگھری سے لوٹا تو سید حانانی کو سلام کرنے گیا۔ میری دونوں آپائیں اور نانی اور ساتھ ان کی کوئی بھیلی چائے پی رہی تھیں۔ مجھ سے کہتے ہی ان کا خانہ زمانہ پرچ پیالی لے آیا اور میں ان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا۔ ان کے اس استفسار پر کہ میں اتنے دنوں کہاں رہا؟ میں نے ڈرتے ڈرتے اور کتے رکتے آپا فرزند کی طرف منہ کر کے کہا ”میں دو دن کے لیے جہلم گیا ہوا تھا۔“

”جہلم!“ نانی زلزلہ خیزان ہو کر پوچھا۔ ”جہلم؟ وہ کس لیے اور وہاں کس لیے؟ جہلم میں تمہارا کون ہے؟“ میں نے کہا ”نانی! جہلم محاذ کشمیر کا میں کیسپ ہے اور وہاں میں اپنے مجاہد بھائیوں سے ملنے گیا تھا۔ وہ دونوں ہر پندرہویں دن ایک ہفتہ ریست کرنے کے لیے جہلم آتے ہیں اور یہاں سے گولہ بارود اور گڑ پنے لے کر واپس محاذ پر جاتے ہیں۔“

نانی نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور ہنسنے لگیں۔ انہوں نے اخبار میں دیکھا تھا کہ ہندوستانی سرگرنٹ کہتی ہے کہ پٹھان حملہ آور لوٹ مار کے لیے کشمیر میں داخل ہوتے ہیں اور مقامی باشندوں کا مال و اسباب لوٹ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ ان کا کشمیر کی آزادی سے یا کشمیریوں کو ہندوستان کے پنجہ استبداد سے چھڑانے کی کوئی آرزو نہیں۔ میں نانی کی معنی خیز نظروں کا مطلب سمجھ گیا لیکن میں اس موقع اور اس مقام پر اپنا بیان بدلنے کا آرزو مند نہیں تھا۔ میں نے اپنی نظریں جھکا لیں اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ نانی زلیخا میرے نظریں جھکانے اور خاموش رہنے کا مطلب آسانی سے سمجھ گئیں اور انہوں نے مجھے مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ میں شکست خوردہ سا وہاں سے لوٹ آیا اور شرمندہ شرمندہ اپنے بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

اس زمانے میں ایک انگریزی میگزین ”لائف“ بڑا زوروں کا رسالہ تھا۔ مجازی سائز کا رنگین تصویروں اور معنی خیز مضمون سے لدا پسند ایہ رسالہ ہر پندرہ دن بعد بڑی باقاعدگی سے دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ جاتا۔ میرے پاس اس رسالے کا پورا دو سال کا فائل تھا لیکن وہ بکترس میر رہ گیا۔ سن چھیا لیس میں میں نے اس رسالے کے ایڈیٹر کو ایک خط بھی لکھا تھا جو تین فخرے کم، سارے کا سارا چھپ گیا تھا۔

رسالہ ”لائف“ کی اسٹنٹ ایڈیٹر اور دنیا کی نامور فوٹو گرافر اور سنوری رائٹر مارگریٹ برک وہائٹ تاریخ انسان کی سب سے بڑی ہجرت کی تصویریں کہانی بنانے لاہور آئی تھیں۔ میں ان کے رسالے کے ذریعے ان کے نام سے ان کے کام سے ان کی دفتری اور گھر بلو زندگی سے اچھی طرح سے واقف تھا۔ مجاہد کیسپوں میں مجاہدین کی مجموعی ہیئت اور ان کی خستہ حالی کی تصویریں بنانے کے لیے مارگریٹ برک وہائٹ نے میرے کیسپ کمانڈنٹ سے مجھ کو مانگ لیا اور میں مسز وہائٹ کی ارد گرد میں ان کے ساتھ ساتھ ایک غلام زادے کی طرح دوڑنے بھاگنے لگا۔ وہ ہیرک کی ٹین کی چھت پر چڑھ کر دو در در تک پھیلے مہاجرین کا فوٹو اتارنا چاہتی ہیں تو میں اپنے کندھوں کی سیڑھی بنا کر انہیں کھلی کھڑکی کے پت کا زینہ مہیا کر کے چھت پر چڑھا رہا ہوں۔ وہ منہ و لیاقت پیکٹ کے تحت ٹائٹا ایئر لائنز کے اترنے اور چڑھنے والے جہازوں کا فوٹو بنانا چاہتی ہیں تو میں جلدی سے میز گھسیٹ کر میز پر ٹین کی کرسی رکھ کے، کرسی کے پائپوں کو مضبوطی سے پکڑ کر مارگریٹ کو اس پر چڑھا رہا ہوں اور اپنی خدمت گزار پر فخر کر رہا ہوں۔ میڈم برک وہائٹ کہتی ہیں لنگرے تنوری روٹی اور والے لے کر آؤ تو میں سائیکل کی سی رفتار سے بھاگا جا رہا ہوں اور لاگھری سے درخواست کر رہا ہوں کہ کچھ ایسا کرو جس سے دال میں مرجھیں کم ہو جائیں۔

دن بھر میڈم مارگریٹ برک وہائٹ کا مجاہد کیسپوں میں ساتھ دینا، شام کو اسے تاکنے کی سیر کرانا اور اس کا اگلی سیٹ پر بیٹھ کر بچوں کی طرح تاکنے کی گھنٹی بجانا، اس کی ڈاک کو احتیاط کے ساتھ جی پی او لے جا کر پوسٹ کرنا، اس کو ہر روز کوئی نہ کوئی دیسی کھانا کھانا اور وقت سے پہلے دکاندار کو بتلا جانا کہ کھانے کا ڈالنا، خوشبو اور کات وہی رہے لیکن اس میں مرجھیں کم ہوں۔ سب سے پہلے باربی کیو کا مطلب مجھے میڈم ہی کی زبانی معلوم ہوا اور میں تو باربی کیو کوگا کپوں کی وہ قطار ہی سمجھتا تھا جو باربر کی دکان پر اپنی باری کے انتظار میں لگی ہوتی ہے۔ میڈم کو لاہوری کھانوں میں سب سے زیادہ خلیطے کے کباب پسند تھے اور وہ ہر دوسرے دن چونا منڈی جا کر خلیطے کے باربی کیو سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھیں۔

ہے۔ گدھا کیا جانے زعفران کا بھاؤ۔ تو رہنے دے، میں یہ سارے رکھ لیتی ہوں، کچھ سوچوں گی ان کا۔“
میں نے کہا ”ٹھیک ہے آپ۔ میں تو یہ سب کچھ آپ ہی کے لایا تھا۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔“
ہماری باتیں سن کر پہلے تو نانی زلیخا ادھر آئیں اور اتے ہی بولیں ”وے منڈیا تو مجھے بتا کر آیا کر اور بتا کے جایا کر۔۔۔ کل بھی تو ملے بغیر چلا گیا، اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ ایسے ہی چلا گیا تھا۔“

میں نے کہا ”نانی میں تو آپ فرزند اور آپ نعمانہ دونوں کو بتا کر گیا تھا کہ نانی جی کو بتا دینا۔“
”نہیں ناں۔“ انہوں نے دونوں بھوپوں پر زور دے کر کہا ”مجھ سے مل کے نہیں جائے گا تو مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ تم لوگ کیا کر رہے ہو اور اللہ کے فضل سے کیسے آباد ہو رہے ہو؟“

میں نے کہا ”بس ٹھیک ہی کام چل رہا ہے نانی۔ آہستہ آہستہ آباد ہو رہی جاؤں گے، کچھ وقت لگے گا۔“
نانی نے کمال مہربانی سے فرمایا ”کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف مانگ لیتا۔ تیری ماں اپنے ہی تکبر میں رہتی ہے۔ رشتہ داروں، عزیزوں سے کچھ مانگتی نہیں۔“

”ان کو ضرورت ہی کیا ہے۔“ آپ نے کہا ”جن کے گھروں میں ولایتی پوشاکیں آتی ہیں، بن مانگے، انہیں کیا ضرورت پڑی ہے دست سوال دراز کرنے کی۔“

نانی اماں نے کپڑوں کا پیکٹ دیکھ کر پوچھا۔ ”یہ کیا ہے فرزند؟“ تو آپ نے ساری رام کہا، کچھ انداز سے اور کچھ اس انداز سے پوچھا ہے چڑھا کے بیان کر دی۔ نانی نے اپنے اڑسٹھ برس پرانے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر پوچھا۔ ”بس یہی کچھ تھا وہاں یا اور بھی کچھ نکلا؟“

میں نے کہا ”اور بھی بہت کچھ تھا لیکن اماں ناراض ہوں گی۔“
”اس کی تم پروا ہی نہ کرو۔“ نانی اور آپ ایک زبان ہو کر بولیں ”ہم تمہاری اماں کو یہی نہیں چاہتے گے۔“
میں نے کھکھیا کر کہا ”بات ہوئی ہوئی دور جا نکلتی ہے اور سارے خاندان میں پھیل جاتی ہے۔ پھر ہم صفائیاں کرتے پھرتے ہیں اور کوئی مانتا ہی نہیں۔“

آپ نے کہا ”مجھے معلوم ہے تم لوگ منگھری گئے تھے اور وہاں بڑی صفائیاں پیش کر کے آئے ہو لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں۔“

میں نے بات کاٹ کر کہا ”اماں تو صفائیاں پیش کرتی رہیں اور بدعاتیں مجھے ملتی رہیں۔“
آپ نعمانہ دوسرے کمرے سے ہماری گفتگو سنتی آتی تھیں۔ انہوں نے گیلری میں سے باہر نکلے ہوئے کہا ”بڑا کامیاب دورہ رہا آپ لوگوں کا منگھری والا۔۔۔ ساری برادری نے تمہاری صفائیاں مان لی ہیں اور بی بی کو باعزت بری کر دیا ہے۔“ پھر وہ ہنسنے لگیں اور ان کی ہنسی میں زہری ہزیمت سے زیادہ ہی آمیزش تھی۔ انہوں نے ڈرائی کلین کیے کپڑوں میں سے جینز اٹھا کر کہا ”یہ میں لے لیتی ہوں۔ میرے پوری آ جائے گی۔“

آپ نے کہا ”تم لے کر کیا کرو گی، نہ پہنی جاسکتی ہے، نہ دکھائی جاسکتی ہے۔ فائدہ!“

میڈم مارگریٹ برک دہانت کو پورے دس روز لاہور میں گزارنے تھے لیکن ان کے جانے کا اچانک پروگرام بن گیا۔ امریکہ سے کیبل گرام آیا تھا اور میں نے ہی ریسپونڈ کر کے میڈم کو دیا تھا۔ تار دیکھ کر وہ آن واحد میں تیار ہو گئیں۔ اور سینٹ ایڈریڈ کا ڈکونا لاہور سے ملتان، ملتان سے حیدر آباد ہو کر کراچی جاتا تھا۔ میڈم کراچی روانہ ہو گئیں اور جاتے ہوئے مجھ سے کہہ گئیں کہ میرے کپڑے لے کر ممتا جوں میں تقسیم کر دینا۔ پادری صاحب کو دے دینا یا خود انہیں ڈسپوز کر دینا۔ ڈرائی کلیننگ کی اجرت میں نے ادا کر دی لیکن کپڑے ابھی تک تیار نہیں ہوئے تھے۔

میڈم مارگریٹ کے کپڑے لاٹھری کی نہایت ہی خوبصورت لڑکی (جو کاؤنٹ کے دوسری طرف تیار شدہ کپڑے بڑے سے خاکی کاغذ میں گھوری کی طرح لپیٹا کرتی تھی) لے کر میں سیدھا نانی زلیخا کے گھر پہنچا۔ آپ فرزندہ بال دھو کر دھوپ میں سکھا رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ”مرز“ کا ایک پرانا پرچہ تھا اور وہ اپنے کنوارے زمانے کی چمنی کا کی سی بن کر اپنے دونوں پاؤں پائینچوں میں پھنسائے بیٹھی تھیں۔ میں سلام کر کے ان کے سامنے کھڑا ہو گیا تو وہ میرے پیکٹ کی طرف اشارہ کر کے بولیں ”یہ کیا ہے؟“

”یہ کپڑے ہیں۔“ میں نے خوشی سے کہا۔ ”ولایتی کپڑے۔ یورپین۔“
”تم نے کہاں سے لیے؟“ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا تو میں نے مسکرا کر کہا ”آج کل سب کچھ مل جاتا ہے، ذرا سی ہمت ہوئی چاہیے۔“

آپ نے کہا ”ہمت کے بچے، لا دکھا مجھے، کیا اٹھائے پھرتا ہے۔“
میں نے ڈرائی کلین کا دو رنگوں میں چھپے خاکی کاغذ کا پڑا ان کے ہاتھوں میں دے دیا۔ انہوں نے کمال صفائی اور شائستگی کے ساتھ اسے کھولا اور اس پیکٹ میں ولایتی کپڑے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ ”یہ کیا؟“ انہوں نے چہرہ اوپر اٹھا کر پوچھا تو میں نے ادھر ادھر نظر میں گھما کر سارے ماحول کا جائزہ اس طرح سے لیا جیسے کوئی اور تو موجود نہیں۔ کوئی سن تو نہیں رہا، کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔۔۔ پھر میں نے آہستگی سے کہا ”رائے بہادر رام سرن داس ایڈووکیٹ کی کونھی کا ایک اور کمرہ کھولا تھا تو اس کے وارڈروپ میں سے یہ پیکٹ برآمد ہوا۔“
”لیکن یہ تو ولایتی کپڑے ہیں؟“ آپ نے کہا۔

”رائے بہادر صاحب کی بڑی بہو ایک آئرش لڑکی تھی۔“ میں نے منمناتے ہوئے کہا ”ارد گرد کے لوگوں سے مجھے ہی کچھ معلوم ہو رہا، اس سے زیادہ نہیں۔ آپ اپنی پسند کے کپڑے رکھ لیں اور جو مناسب نہ ہوں، وہ مجھے واپس کر دیں۔“
آپ فرزندہ نے ان میں سے ایک سٹش، ایک پولکا ڈانس کارڈ مال اور تین ننگریز علیحدہ کر لیں۔ پھر انہوں نے سارے کپڑوں کو یکجا کرتے ہوئے کہا ”توان کا کیا کرے گا، باقی کپڑوں کا؟“

میں نے کہا ”وہ میں اماں طالعال کی بیٹی کو دے دوں گا۔ اس کے گھر لڑکی پیدا ہوئی ہے، وہ ان کپڑوں کو کاٹ کٹر کر بچی کی فراکیں اور کلوٹ بنا لے گی۔“

”تو رہنے دے اماں طالعال کی بیٹی کو۔“ آپ نے چڑ کر کہا ”اسے کیا معلوم کہ یہ کپڑا کیا ہے اور کس قدر قیمتی

نانی ماں نے کہا ”بہنی کیوں نہیں جاسکتی۔ ولایت جا کر پہن لے گی۔ جب یہ لوگ دورے پر جائیں گے۔“
آپ فرزند نے کہا ”ابھی طے تھوڑی ہوا ہے ولایت جانے کا۔ اگر جانا ہوا تو مجھ سے مانگ لینا۔ جب تک میں
سنبھال کے رکھوں گی۔“
آپ نعمانہ نے ان کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا تو نانی زلیخا بولیں ”بھئی میں پوچھ رہی تھی کہ بس یہی کچھ ملے
وہاں سے، اتنی بڑی کوٹھی ہے؟“

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ”کچھ زیور بھی تھا۔“
تینوں پرستہ طاری ہو گیا اور وہ وقتی طور پر ساکت و صامت ہو کر بیٹھ گئیں۔
آخر نانی ہی نے پرانے تجربے کی بنا پر حوصلے کی ڈوری پکڑ کر اوپر سر نکالا اور پوچھا ”کیا ملا؟“
میں نے کہا ”نانی ملنا کیا تھا۔ بڑا ہی ڈگ اور ہندوانہ رواج کا زیور تھا۔ بڑی آپا اور چھوٹی آپا نے تو ہاتھ لگائے
سے انکار کر دیا کہ ہمارے کس کام کا، ہمارے لیے تو کوڑا ہے۔“
آپ فرزند نے پوچھا ”تھا کیا کچھ؟“
میں نے کہا ”بارہ تو لنگن تھے میلے میلے اور چھ سالہ لڑکے تھے، شیر کے مونہ والے، پاؤں میں پینپنے کے۔ ایک
تاج تھا سونے کا جیسے سر پر کڑا ہی اونگھی رکھ لی ہو، لوٹا سا۔۔۔۔۔۔“ ماں نے کہا ”دفع دور کیسی احمق ہوں گی یہ ہندوانیاں جو
اسے سر پر پہن کے چل پھر سکتی ہوں گی، پاگل کہیں کی؟“
نانی نے کہا ”تو ہندوانیوں کو دفع کر، یہ بتا اور کیا نکلا؟“

میں نے کہا ”نانی اور کچھ ہار تھے، ماتھے کے جموہر تھے۔ ہاتھوں کی پنجیاں تھیں۔۔۔۔۔۔“ اس کے بعد میرا
زیورات کے بارے میں ذخیرہ الفاظ ختم ہو گیا تو میں ان کے چہرے دیکھنے لگا۔ آپ نعمانہ کی تو کھٹکھی سی بندھ گئی تھی
اور وہ بغیر آواز نکالے، سسکیاں بھرے دھاڑ دھاڑ رو رہی تھیں۔ آپ فرزند کے دھوئے دھائے بال بالکل سوکھ گئے
تھے اور اب وہ سر جھکا کے غم کھا کے بڑی افسردگی کی حالت میں بالوں کو سمیٹ کر ڈھیلی ڈھیلی سی گت کر رہی تھیں۔
صرف نانی ماں قدرے حوصلے کے ساتھ بیٹھی تھیں لیکن ان کا حوصلہ بھی محض دکھاوے کا تھا، اندر جان نہیں تھی۔ مجھ سے
پوچھنے لگیں۔ ”اب کہاں رکھا ہے وہ زیور؟“

میں نے کہا ”جب سب نے ناپسند کر دیا نانی تو پھر مجبور ہی تھی، اماں نے حقیق سنار کو بلا کر کہا ”ان سب کو پھٹلا
کے ایک ڈلا بنا دے اور موتی۔“ منگے پٹا، ٹاٹکا تو رکھ لے۔۔۔۔۔۔ لیکن مجھے اندازہ لگا کر بتا دے کہ کل کتنا سونا ہوگا۔۔۔۔۔۔ اس نے
سارے زیوروں کو الٹ پلٹ کے کئی بار دیکھا اور کہا ”ماسی جی میرا اندازہ ہے پونے سیر کے قریب سونا ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔“
ابھی میں نے بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ نانی ماں کو زور کا چکر آیا اور وہ کرسی کے دونوں بازو پکڑ کر بیٹھ گئیں۔
آپ فرزند چار پائی کے نیچے اپنا ڈنگا پاؤں گھما گھما کر اپنے سلیپر تلاش کر رہی تھیں لیکن ان کو سلیپر نہ مل سکے اور وہ حرماں نصیب،
ویسے ہی بٹکے پاؤں اندر چلی گئیں۔ آپ نعمانہ مرقع چٹائی کی داغ فراق محبت شب کی جلی ہوئی۔۔۔۔۔۔ والی تصویر بنی بیٹھی

نہیں۔ آپا ویسے بھی خوبصورت نہیں تھیں لیکن اس سانچے نے تو ان کے غناک چہرے کو حسین بنا دیا تھا۔
نانی نے حوصلہ کر کے پوچھا ”پھر بنایا اس نے ڈلا، سونے کا؟“
”ڈلا تو بنایا نانی۔۔۔۔۔۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا لیکن اس کا حساب بالکل غلط نکلا۔ نانی کے چہرے پر
ایہ کی ایک چھوٹی سی کرن نمودار ہوئی کہ اچھا ہی ہوا!
میں نے کہا ”اس نے پونے تین سیر سونے کا اندازہ لگایا تھا لیکن جب سب زیوروں کو پھٹلایا تو ڈھیلا سواتین
بر کا بن گیا۔“

آپ فرزند تو پھر بھی اپنے پاؤں پر چل کر اندر چلی گئی تھیں لیکن نانی ماں سے کوشش کے باوجود اٹھانہ گیا۔ انہوں
نے دو تین مرتبہ زور لگایا لیکن زمین نے ان کے پاؤں پکڑنے سے انکار کر دیا اور وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد
انہوں نے ہاتھ کا اشارہ کر کے گویا مجھ سے کہا ”اب جا، دفع بھی ہو جا۔ کب تک ہمارا کلیجہ جلاتا رہے گا۔“
میں اٹھا اور دونوں کو سلام کر کے گھر واپس آ گیا۔

سارے مہاجر کیمپوں میں انسانی فتنے کی ایسی بھارتھی کہ عادی شخص کے علاوہ اور کوئی پانچ منٹ سے زیادہ ٹھہر
نہیں سکتا تھا۔ ممتاز مفتی اور خواجہ محمد شفیع دہلوی کو جب بھی دوپہر کے کھانے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ میرے دفتر میں
آ کر کھاتے۔

میرا اناؤڈرننگ بوتھ بالکل ایئر ٹائٹ تھا اور میں نے کھڑکیوں اور دروازوں کو کرافٹ پیپر لگا کر سیل بند کر رکھا
تھا۔ ایک کھڑکی میں دو ہر الخاف گھسیڑا ہوا تھا اور ایک دروازے پر چیٹ کی رضائی کا دبیز پردہ منڈھا ہوا تھا۔ اندر آنے
جانے کے لیے ایک ہی چھوٹا سا دروازہ تھا اور اس بوتھ میں بیٹھ کر اطمینان سے کھانا کھایا جاسکتا تھا، باہر کی بو کم آتی تھی۔
مفتی اور خواجہ شفیع میرے بوتھ میں بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے اور میں ان کی میزبانی کے شوق میں باہر لنگر
سے گرم گرم روٹی لا کر دیتا تھا کہ میرے تیسرے چکر میں میرے پاؤں کی زمین اٹھ کر آسمان سے جا ملی اور اس فوری اور
اچھی اٹھان میں جو خطرہ لاحق ہوتا ہے، وہ بھی میرے وجود سے لپٹ کر سنسانے لگا۔

میں اخبار کی چوہری تہہ پر تنور سے نکلے ہوئی دوسرنگ اور کڑکڑاتی روٹیاں لے کر آ رہا تھا۔ جلدی اس بات کی تھی
کہ گرم گرم اور تازہ تازہ روٹی لے کر اپنے مہمانوں کی خدمت میں پہنچ جاؤں لیکن یہ تیزی تنور سے لنگر کی سرحد تک ہی
نصیب ہوئی، اس کے بعد میں پتھر کا بت بن گیا۔

میرے سین سامنے قائد اعظم کھڑے تھے اور ایک طرح سے میرا راستہ روک کر کھڑے تھے۔ میرے ہاتھ پر
بہر اخبار تھا۔ اس پر دو تنوری روٹیاں تھیں۔ جیب میں کچھ سکے تھے۔ پاؤں میں خاکی رنگ کے فلیٹ بوٹ تھے۔ آنکھوں
پر زور کی نظر کا چشمہ تھا اور میرا محبوب میرے سین سامنے کھڑا تھا۔ وہ محبوب جس سے آج تک ان دیکھے محبت کی تھی، جس
کے ارشادات گرامی پڑے تھے جس کی تقریر سننے گھروالوں سے چوری جالندھر کا سفر کیا تھا، جس کی کچھ تصویریں اپنے
کمرے میں فریم کر کے سجائی تھیں، باقی دل کی دیواروں پر بغیر فریم کے لٹک رہی تھیں۔

قائد اعظم کو اپنے اس قدر قریب دیکھ کر میرا دل مر جانے کو چاہا کہ بس اس کے بعد نہ اور کچھ ہو اور نہ ہی یہ سب دوبارہ وجود میں آئے۔ ایسے ہی ختم ختم ہو جائے! قائد اعظم کے ساتھ اس وقت ہمارے کیمپ کمانڈنٹ رانا صاحب نواب ممدوٹ، میاں افتخار الدین، آئی جی پولیس اور دوسرے بہت سے زعماء تھے۔

قائد اعظم نے اپنا دایاں ہاتھ ذرا سا اوپر اٹھا کر مجھ سے پوچھا ”روٹی ہے!“ میں نے کہا ”جی جناب روٹی ہے۔“

”یہاں بنی ہے؟“

”جی جناب یہیں پکی ہے، اسی لنگر میں۔“

”سب کے لیے ہے؟“

”ہاں جی، سب کے لیے ہے۔“

”اچھی ہے؟ ٹھیک ہے؟“

”بہت اچھی جناب عالی۔“

”کھا کے دکھاؤ۔“

بڑے سال بعد جب میں آزاد کشمیر ریڈیو پر سکرپٹ رائٹر ہو کر گیا تو مفتی نے مجھے وہ سوکھی ہوئی روٹی دکھائی جو اس نے ایک رشتہ جزدان میں رکھی ہوئی تھی۔

ان دنوں کشمیر کے اندر سارے محاذ ایک ساتھ گرم ہو گئے اور محاذوں سے خبریں آنی بند ہو گئیں۔ میرے دونوں بھائیوں میں سے ایک کا بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ سرینگر کے ایئر پورٹ پر پاکستان کا قبضہ ہو گیا ہے اور اب ٹھیک دو دنوں بعد سارے سرینگر پر پاکستانی قبضے کی خبر آنے والی ہے۔ سب تیار ہیں۔

قبضے کی خبر تو نہ آئی البتہ یہ پتہ چلا کہ میرا بڑا بھائی زخمی ہو گیا ہے اور اسے جہلم کے ہسپتال میں داخل کروادیا گیا ہے۔ میں سب کام چھوڑ چھاؤں کمروری طور پر جہلم پہنچا اور ہسپتال میں اپنے بھائی سے ملا۔ وہ ایک پہاڑی کے پیچھے چوکس پوزیشن میں دشمن کی پسپائی پر گہری نظر رکھنے پر متعین تھے۔ گولہ چلنے کے ارتعاش سے پہاڑی سے ایک بڑا سا پتھر سیدھا ان کی کمر پر گرا اور وہ چپک کر اسی مقام پر بے ہوش ہو گئے۔ سارے ہجر پر شدید باؤ پڑا لیکن پہلیاں ٹوٹنے سے محفوظ رہیں۔ ہسپتال والے صبح وشام ان کا باقاعدگی کے ساتھ مشاہدہ کرتے تھے کہ اندرونی جریان خون مکمل طور پر رک گیا ہے یا ابھی بھی کوئی کوئی قطرہ رستا ہے۔ مجھے توقع سے بڑھ کر وہاں رکنا پڑا، واپس آیا تو نانی زلیخا کا پیغام آیا تھا کہ مجھ سے جلدی آ کر ملو، ایک ضروری کام ہے۔

میں حسب ارشاد ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ضروری کام کی بابت پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ضروری کام اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ تمہاری خیریت کی خبر مطلوب تھی۔ تم جو کئی روز سے نہیں آئے تو مجھے کسی نے بتایا کہ اپنے بھائیوں سے ملنے جہلم گئے ہو۔ پہلے تو دوسرے روز ہی واپس آ جاتے تھے، اب کی بار تم نے پورا ایک ہفتہ لگا دیا تو مجھے تشویش ہوئی کہ اللہ خیر کرے، لڑکا آیا نہیں۔

میں اپنے بھائی کی صحیح صورتحال واضح کرنے لگا تو مجھے اچانک خیال آیا کہ اس سے تو نانی کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ وہ میرے بیان کو جھوٹ سمجھیں گی اور میں چڑ کر شاید خشمگین ہو جاؤں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ ان کی مرضی کی اور ان کے فائدے کی بات کی جائے۔ وہ جو کچھ چاہتی ہیں، وہی بتایا جائے۔

میں نے حسب عادت ادھر ادھر دیکھ کر کہا ”میں وہاں سے ٹرک لینے گیا تھا؟“

”ٹرک!“ نانی نے حیران ہو کر پوچھا۔

”بھائی وادی کشمیر سے وٹرک لائے تھے۔ ایک تو ان کے ساتھ آ گیا، دوسرا انہوں نے کانوائے ٹرک میں رکھا

میں نے بیرک میں داخل ہوتے ہی شور مچا دیا۔ ”قائد اعظم..... قائد اعظم۔ ہمارے کیمپ میں، چائینز بیرک میں، ہم سے ملنے آئے ہیں، مہاجرین کو دیکھنے آئے ہیں۔“ سارے لوگ دیکھنے کے لیے باہر کو لپکے اور برآمدے میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک لوجوان جس کی میز میرے اور آغا شیریں کے درمیان ہوا کرتی تھی اور جو چھٹی کے وقت کھانے کے بجائے رسالے پڑھتا تھا، اور جس نے حال ہی میں اپنا نام محمد شفیع سے بدل کر سلیم چودھری رکھ لیا تھا، کچھ دیوانہ سا ہو گیا۔ وہ اپنے دس بارہ قریبی عزیز دریاے بیاس کے کنارے شہید کروا کر آیا تھا، خاموش سا رہتا تھا۔ قائد اعظم کے کیمپ میں تشریف لانے کی خبر پا کر وہ دیوانوں کی طرح پاکستان زندہ باد! قائد اعظم زندہ باد! محسن اسلام، محسن پاکستان زندہ باد! پائندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا قائد اعظم کے گردہ کے پیچھے بھاگا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس پولیس کے ایک کارندے نے پلٹ کر اسے روکا تو وہ بھج گیا۔ کار خاص ملازم اپنے دونوں بازو پھیلا کر اس کی راہ میں مزاحم ہوا تو وہ اس سے بھڑ گیا، دونوں زمین پر گرے۔ کار خاص کے آدی نے اس پر گودارکھ کر اس کی دونوں کلاںیاں مضبوطی سے پکڑ لیں۔ وہ زمین پر لیٹا نر پار

تھا، وہ پیچھے رہ گیا۔“

”ٹرک کیسے تھے کا کا؟“ انہوں نے جلدی سے پوچھا۔

”بس جی ایسے ہی تھے جتنی ٹرک، معمولی۔ جیسے ہمارے گھروں میں ہوتے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے جتنی ٹرک تو میں سمجھتی ہوں، اچھی طرح سے لیکن ان میں تھا کیا؟“

”ہونا کیا تھا نانی؟“ میں نے ڈھیل دے کر کہا ”ایک تو پیچھ گیا اور دوسرا پیچھے رہ گیا۔“

”لیکن وہ تھے کس چیز کے..... تھا کیا ان میں؟“

”وہ جو بھائی صاحب کے ساتھ آ گیا وہ تو بس ایسے ہی تھا، نیم بھرا ہوا..... کھڑکٹا سا۔“

”میں کیا پوچھ رہی ہوں اور تو کیا بکواس کیے جا رہا ہے۔“ نانی نے چڑکڑکھا۔

میں نے کہا ”میں تو وہی کچھ بتا رہا ہوں نانی جو آپ پوچھ رہی ہیں۔ بتا تو رہا ہوں کہ میں ٹرک لینے گیا تھا۔“

”کوئی ٹرک؟ کیسے ٹرک؟ کس نے بجوائے تھے؟ کیا تھا ان میں؟“ انہوں نے مزید بے صبری سے پوچھا۔

میں نے کہا ”نانی وہ اتنے بڑے بڑے ٹرک نہیں تھے جس قدر آپ سوچ رہی ہیں۔ رضائیاں رکھنے والی

ہٹائیاں نہیں تھیں۔ سوٹ کیس سائز کے ٹرک تھے..... جتنی۔“

”پھر وہی بات!“ انہوں نے زچ ہو کر کہا ”تھا کیا ان ٹرکوں میں؟“

”وہ جو بھائی صاحب اپنے ساتھ لائے تھے، اس کی تو چابی کھو گئی تھی، وہیں محاذ پر..... اور جو کافوائے میں آ رہا

تھا، وہ ابھی تک پہنچا نہیں تھا۔“

”پہنچ گیا پھر؟“ انہوں نے چیخ کر پوچھا۔

”ہاں جی پہنچ گیا لیکن بالکل چپا ہو گیا تھا راستے میں۔ پٹھان مجاہدین، اس پر بیٹھ کر چائے پیتے رہے۔“

”اس میں کیا تھا؟“ انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

”اس میں زیور تھے نانی۔ کشمیری وادی سے لوٹے ہوئے زیور۔“

”تیرے بھائی نے لوٹے تھے؟“

”سب نے مل کر لوٹے تھے۔ پھر حصہ پتی ڈال کے اپنا اپنا مال الگ کر لیا تھا۔ میرے بھائی کے حصے میں سب

سے زیادہ مال آیا کیونکہ وہ بہت ہی اگلے فرنٹ سے لڑ کر لوٹا تھا۔“

”وہ تو سنا ہے زخمی بھی ہو گیا ہے۔“ نانی نے ہمدردی سے پوچھا۔

”زخمی تو خیر نہیں ہوا، اللہ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک ہے لیکن دوسرا، اب آنے تک مجھے کوئی بہانہ تو کرنا ہی تھا

ناں اتنی دیر جہلم میں توقف کرنے کا!“

”تو پھر آ گیا دوسرا ٹرک؟“

”بتا تو رہا ہوں کہ آ گیا۔ اس کی چابی تھی میرے بھائی کے پاس لیکن جو اپنے ساتھ لائے تھے، اس کی چابی

کھودی موصوف نے راستے میں۔“

”چابی کو دفن کرو۔“ نانی نے آرام سے کہا ”یہ بتاؤ کہ ان دونوں ٹرکوں کو یہاں لاکر کے کس کے حوالے کیا؟“

”لہجے نانی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ دینا کس کو تھا، سارا حق ماں باپ کا ہی ہوتا ہے اولاد کی فتوحات پر۔

دونوں ٹرک والدہ صاحب کی خدمت میں پہنچا دیئے۔“

”اور جس کی چابی ہم ہو گئی تھی؟“ نانی نے پوچھا۔

”وہ ہتھوڑے کے ایک دھمو کے سے کھل گیا..... کھڑاک۔“

”تیری ماں تو بہت خوش ہوگی؟“

”خوش کیا ہوتا ہے نانی، سارا زیور ڈوگر اگھڑت ہے۔ مونے مونے، اکھڑا کھڑ، پرزے سے ہیں، مشین کے

زیور نہیں لگتے۔ نزاکت نہیں ان میں..... ڈوگر لوگ ایسا ہی زیور پسند کرتے ہیں شاید۔“

”تمہاری کوئی ماڈل بہنوں نے پہنا ہے۔“ نانی بولیں۔ ”لے کے سارے کا سارا لگایا لینا ہے، ڈھیلا بنانے

کے لیے۔“

”وہ تو پھر مجبوری ہے۔“ میں نے انہیں چڑانے کی غرض سے کہا لیکن وہ چڑی نہیں، غمزہ سی ہو گئیں۔ ایک

وقت تھا ہمارے سارے خاندان، سارے خانوادے، ساری برادری پر ان کی حکومت تھی۔ ان کی دولت، جائیداد اور عالی

رجے کے آگے کوئی بول نہیں سکتا تھا اور اب سونا ایک اہلٹا ہوا چشمہ بن کر ہمارے گھر میں داخل ہو رہا تھا اور بہت بھاری

مقدار میں داخل ہو رہا تھا۔

پوچھنے لگیں۔ ”کیا تم ہر پٹے ایسے ٹرک لینے جہلم جاتے ہو؟“

میں نے کہا ”جہلم نہیں نانی، ہر پندرہویں دن۔ ان کو چھٹی ہی پندرہ دن بعد ملتی ہے اور پھر اتنی جلدی اچھا

مال اکٹھا بھی نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی مجھے خالی ہاتھ بھی آنا پڑتا ہے۔“

”اور یہ جو ڈھیلے بن جاتے ہیں سونے کے، اتنے بڑے بڑے۔“ نانی نے انگلیاں کھول کر ہاتھ کا کچھ بناتے

ہوئے کہا ”ان کو رکھتے کہاں ہو؟“

میں نے کہا ”ان کو زمین میں دبا دیتے ہیں۔ وہ گوشہ زمین سوائے اماں جی اور بابا جی کے اور کسی کو معلوم نہیں۔

ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا۔“

اس زمانے میں دل کی تقویت کے لیے اور ہارٹ ٹریٹمنٹ کے لیے بس ایک دوا تھی..... کورامین۔ ان کے ڈاکٹر

نے نانی کے لیے یہ دوا تجویز کی تو ان کو کوئی خاص اتفاق نہ ہوا۔ جب پی لیتیں تو دل ذرا ٹھہر جاتا تو پھر اسی طرح سے

دھرکتے لگتا۔ ہماری دولت کے چڑھتے ہوئے گراف کو دیکھ کر وہ روز بروز نیچے ہی نیچے گرتی جا رہی تھیں اور ان کے ہاتھوں

میں تھوڑا سا ریشہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ آپا فرزند اب مجھ سے ملنے میں کتراتے تھیں۔ ان کو معلوم تھا کہ میری ملاقات انہیں کوئی

راحت عطا نہیں کرے گی بلکہ مزید پریشانوں میں مبتلا کر دے گی۔ ان کا خیال تھا کہ برے کاموں کا نتیجہ ایک روز برائی

نکلتا ہے اور چاؤ چاؤ میں آگے بڑھتا انسان خود ہی علی بابا کے غار میں بند ہو جاتا ہے۔ یہ خیال ان کو بہت تسکین عطا کرتا تھا اور وہ اسی کے سہارے نازل زندگی گزار رہی تھیں۔

نانی کی کوٹھی میں سبز رنگ کی ایک پرانی واکس ہال گاڑی تھی جسے نانابی مرحوم کا پرانا ڈرائیور تاج دین چلاتا تھا۔ یہ گاڑی اکثر ورکشاپ پر رہتی تھی اور پٹرول اور ڈیزل قحط زدہ ڈنگروں کی طرح کھاتی تھی۔ تاج دین اور واکس ہال کے باوجود گھر کے سب لوگ سالم تا نگہ کرا کے اپنے اپنے کاموں پر جاتے تھے۔ گاڑی کبھی چل پڑتی تھی، کبھی انکاری ہو جاتی تھی۔ کئی مرتبہ راستے میں کھڑی ہو جاتی تھی تو اسے دھکیل کر کوٹھی پر واپس لاتے تھے۔ گاڑی کم تھی، بس عزت ہی عزت تھی۔ دور دور کے لوگوں کو معلوم تھا کہ خان صاحب کے یہاں کار ہے جو اگر ایک دفعہ گرم ہو جائے تو ذرا سی چابی مارنے سے چل پڑتی ہے۔ ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اگر ایک مرتبہ کھڑی ہو جائے تو پھر بڑی مشکل سے گھر واپس آتی ہے۔

نانی بس ایک مرتبہ ہی واکس ہال پر اپنے حکیم کے ہاں جاسکتی تھیں حالانکہ ان کی آرزو تھی کہ ہفتے کے ہفتے گاڑی میں ہی جایا کریں اور حکیم صاحب سے اپنے اختلاج قلب کی دوا کے نسخے بدلوا لیا کریں!

ایک رات جب سبز واکس ہال کو تاج دین ڈرائیور اچھرے اور مسلم ناؤن کی درمیانی آبادی میں سڑک کنارے چھوڑ آیا اور میرے نانامرحوم کی محبوب کار ساری رات ایک غیر علاقے میں بارہ مددگار کھڑی رہی تو مجھے اس حقیقت حال پر دلی صدمہ ہوا۔ میرے خیال میں واکس ہال کو ایسے کرنا نہیں چاہیے تھا۔

ٹھیک چار روز بعد جمعرات کے دن میں دفتر سے دو گھنٹے پہلے چھٹی کر کے نانی زلیخا کے یہاں پہنچ گیا۔ وہ اس وقت بستر میں تھیں اور آفرزاندہ نے ان کو کورائین کے بارہ قطرے پلا کر ابھی ابھی لٹایا تھا۔ نعمانہ آپان کے تلوے رگڑ رہی تھیں اور بار بار پوچھ رہی تھیں "اماں اب طبیعت کیسی ہے..... اب کیسا محسوس کر رہی ہیں؟" نانی گودم آواز میں "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے" کہہ رہی تھیں لیکن ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔

سلیم چودھری نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے گاؤں میں سب سے اعلیٰ اور سب سے آخری دوائیں سیب اور ہی کا مرہب ہوتی ہیں اور ان کے زور پر مریض کئی کئی سال نکال جاتے ہیں..... نانی زلیخا کی طبیعت خواہ کسی بھی تھی لیکن وہ بہر حال میری نانی تھیں اور مجھے ان کی صحت کی ویسی ہی فکر تھی جیسی ان کے بچوں کو تھیں۔ میں جانتے ہوئے ان کے لیے آدھ آدھ پاؤسیب اور ہی کا مرہب لے گیا اور اسے بغلند ہو کر انہیں کھانے پر مجبور کیا۔ تھوڑا تھوڑا آفرزاندہ اور آفرزاندہ نے بھی چکھا اور مجھ سے اس کے ملنے کا پتہ پوچھا۔

تھوڑی دیر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے فرزند آ پاسے پوچھا "آپا یہ چیری سلر کیا ہوتی ہے؟"

آ پاسے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا "مجھے تو معلوم نہیں کہ چیری سلر کیا ہوتی ہے؟"

"تم نے کہیں یہ لفظ دیکھا ہے؟" نعمانہ آ پاسے پوچھا "یا کہیں پڑھا ہے؟"

میں نے کہا "میں نے دیکھا بھی ہے اور پڑھا بھی ہے لیکن میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

نعمانہ آ پاسے کہا "کہاں پڑھا ہے؟"

میں نے کہا "یہیں جی، اسی لاہور میں، اسی شہر میں....."

فرزند آ پاسے کہا "تو چیری بلاسم کو تو نہیں پوچھ رہا۔ یہ ایک قسم کی بوٹ پالش ہوتی ہے اور ولایت سے آتی ہے۔"

نانی نے بڑی نحیف آواز میں پوچھا "لیکن تم نے دیکھا کہاں یہ لفظ؟"

میں نے کہا "نانی لفظوں کا کوئی خاص مقام تو نہیں ہوتا ناں۔ ڈکشنری کے علاوہ بھی ادھر ادھر نظر آ جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو ایسے ہوتے ہیں کہ ڈکشنری میں بالکل نہیں ملتے لیکن روزمرہ میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔" فرزند آ پاسے کہا "جتنا تو بڑا ہورہا ہے، اسی قدر بے وقوف بھی ہو رہا ہے..... ساتھ ساتھ۔"

میں نے کہا "آپا آپ سے کیا پردہ اور چکی بات چھپانے سے کیا حاصل، ہم نے ایک کار چرائی ہے۔"

"کارا" نانی نے کہنی کے بل ہو کر اور سر اٹھا کر اپنی بیٹیوں کی آواز میں آواز ملائی۔

"کہاں سے چرائی؟" آفرزاندہ نے پوچھا۔

میں نے کہا "بس کہیں سے بھی چرائی، چرائی..... لکھی چیز خدا کی دھیلے کی نہ پاکی....."

"پھر بھی۔" نانی نے اسی طرح کہنی کے بل سر کو اور اٹھا کر پوچھا۔ "کہیں سے تو چرائی ہوگی آخر!"

میں نے کہا "یہ جو فیمن روڈ ہے ناں اس کے ساتھ ایک اور چھوٹی سی فرزر روڈ ہے۔ اس پر وکیلوں کے دفتر ہیں

لیکن ان دفاتروں کے پیچھے پرانی وضع کی کوٹھیاں بھی ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ان میں زیادہ کوٹھیاں آسب زدہ ہیں اور

ان میں بھوت رہتے ہیں۔ پرانے بھوت بھی اور نئے حالیہ بھوت بھی سن سینٹا لیس کے فسادات کے۔"

وہ تینوں میری طرف الف لیلوی داستان غور سے سن رہی تھیں اور اس پر یقین کیے جا رہی تھیں۔ "پرسوں" میں

نے سوچتے ہوئے کہا "پرسوں کی بات ہے۔ نا نا، اترسوں کی..... پرسوں سے ایک دن پہلے کی کہ میرے سب سے بڑے

بھائی بہادر پور سے آئے تھے ان کو ہم نے آسب زدہ مکانوں کے قصے سنائے تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے کہ ہم سے بڑا

بھوت اور کون ہوگا اس زمانے میں۔ لاؤ تو ذرا مجھ کو بھی دکھاؤ ایسے مکان جن میں بھوتوں کا سیرا ہو۔"

"واہ بڑا دلیر ہے تیرا بھائی۔" نانی نے فخر سے کہا "ایک مرتبہ بالٹی اٹھا کر دس سیر کچا دودھ پنی گیا تھا۔ تیرے نا نا

نے اس کو بیس روپے انعام دیے۔"

میں نے کہا "جی بالکل، وہ ایسے ہی ہیں اور کسی سے ڈرتے نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی لوہے کے کڑوں والی

لاٹھی کندھے پر رکھی اور میرے دوسرے بھائی سے جو گاؤں سے گئی، مرغیاں اور بکرے لاکر فروخت کرتے ہیں، کہا چل

بھی دکھا مجھے آسب زدہ مکان۔"

"تو بابا، بڑی جرأت ہے تم گاؤں کے لوگوں میں۔" فرزند آ پاسے سکڑ کر بولیں۔

میں نے کہا "میں تو خیر ایسا نہیں لیکن میرے دوسرے بھائی بھی بہادر اور جرأت مند ہیں۔ جب وہ دونوں چلے

تو میں بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ ایک بند کوٹھی کا کوٹ گیت کھول کر جب ہم اندر لان میں داخل ہوئے تو کچھریل کی چھت

کسی کو اس دنیا میں۔
 میں نے کہا ”آپا لیکن اس میں ایک خرابی ہے کہ اس کے سامنے چابی نہیں لگتی۔ اندر بیٹھے بیٹھے آن ہو جاتی ہے۔“
 ”یہ خوبی ہے کہ خرابی گدھے!“ آپا نے گدھے پر زور دے کر کہا ”یہ تو لیٹ ماڈل ہے یہ خوف، اس کو چابی کی
 کیا ضرورت!“

میں نے کہا ”چابی مارتا ہوا آدی ذرا خوبصورت لگتا ہے۔ سارٹ دکھائی دیتا ہے۔ ایک اچھلیٹ نظر آتا ہے۔
 اندر بیٹھے بیٹھے کھس کھس کر کے چلا لینا تو کوئی خوبی کی بات نہیں۔“
 آپا نے ہنسا کر کہا ”جاذب ہو جا میری نظروں کے سامنے سے..... اگر تو نے پھر ایسی بات کی.....“
 ”لیکن وہ گاڑی ہے کہاں؟“ نانی نے کہنی پر جھکے جھکے پوچھا۔

”ہمارے گھر کھڑی ہے۔“ میں نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ”ہمارے دروازے کے سامنے..... اب تو میں بھی کچھ
 کچھ جانے لگا ہوں لیکن یونیورسٹی گراؤنڈ اور لیک روڈ کی طرف چلاتا ہوں، مال روڈ پر نہیں جاتا۔“
 اچانک نانی بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئیں اور اپنے دونوں ہاتھ زانوؤں پر رکھ کر بولیں۔ ”اس طرح سے تو تم پکڑے
 جاؤ گے بچہ۔ گاڑی کا تو نمبر ہوتا ہے اور نمبر سے فٹ پتہ چل جاتا ہے کہ کس کی گاڑی ہے۔ تم کب تک چمپاؤ گے۔“ نانی کو
 اپنی اس بات پر شرک ہو مڑ جیسا مڑا رہا تھا اور وہ سر ہلا کر کہہ رہی تھیں ”مشکل پڑ جائے گی میاں، خاصی مشکل۔ ڈانڈی
 مشکل۔ تم کو تو چھڑا دیا بھی نہیں جاسکے گا۔“

میں نے کہا ”پر میں یہ گاڑی بہاؤ پور جا رہی ہے۔ وہاں اس کی نمبر پلیٹ تبدیل ہوگی۔ سرکاری نمبر اتار کر اس پر ریاستی
 نمبر لگے گا۔ وہیں اس کا نوکرن بنے گا وہیں اس کی خریداری کی رسید کئے گی۔ بڑے بھائی نے سب بندوبست کر لیا ہے۔“
 کوئی بھی کچھ نہیں بولا۔

میں نے کہا ”جب یہ گاڑی نمبر پلیٹ بدل کر یہاں آ جائے گی تو میں خود آپ کو اس میں سیر کرایا کروں گا۔ کبھی
 شالا بار باغ، کبھی راوی، کبھی قلعہ، کبھی ہرن مینار..... بس سیر ہی سیر..... سیر ہی سیر۔“
 کسی نے بھی کچھ نہ کہا۔ سبھی سننے والے خاموش بیٹھے رہے۔

میں نے کہا ”چھاب میں اجازت چاہوں گا۔ اگلی مرتبہ آ یا تو گاڑی لے کر ہی آؤں گا انشاء اللہ بشرطیکہ بڑے
 بھائی اسے بہاؤ پور سے جلد لے آئے۔ ان کا اپنا ارادہ آج شریف جانے کا ہے۔ وہ کہتے ہیں میں گاڑی کو وہاں بھی سلام
 کرائے لے جاؤں گا۔“

تینوں میں سے کسی نے بھی میری بات کا جواب نہ دیا اور میں سلام کر کے خاموشی سے باہر نکل آیا۔ باہر پورچ
 میں تاج دین سبزو کس ہال کے نیچے لینا ہوا کوئی بیچ فٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو بار بار گر جاتا تھا.....!
 دو دن تو نانی زلیف کی حالت گھر پر غیر رہی، پھر ان کو گورا وارڈ میں داخل کر دیا گیا۔ ان کا دل بڑھ گیا تھا۔
 بلڈ پریشر میں اضافہ ہو گیا تھا اور دل کی کوڑیاں ڈھیلی پڑ گئی تھیں..... میں ان کو دیکھنے ہسپتال گیا تو انہوں نے سارے بیمار

تے سے ایک کو اچھڑا ہوا نکالا اور تقریباً ہم سے نکراتا ہوا اوپر کو نکل گیا۔ میں تو خوف کے مارے پیلا پڑ گیا۔ میرے
 بھائی نے اپنی شام والی لائٹی جو گھبرا کر سامنے والے تالے پر ماری تو تالا وہ جا کر باڑ میں گرا۔ گیراج کا پھانک کھل گیا۔
 ایک سیاہ رنگ کی جھم جھم کرتی کار کھڑی تھی۔
 ”کار“ تینوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

”اور اس کار کے پیچھے جہاں فالتو پیر رکھتے ہیں.....“ میں نے یقین بھرے انداز میں کہا ”پیسے سے اوپر پیر
 لفظ لکھا تھا“ چیری سلز“

فرزاند آپا نے زور سے اپنا ہاتھ ماتھے پر مارا اور چیخ کر کہا ”چیری سلز نہیں گدھے، کرائسلر..... کرائسلر.....
 اس وقت دنیا کی سب سے خوبصورت کار ہے اور لاہور میں اس وقت اس کے تین چار دانے ہی ہوں گے۔“ پھر انہوں نے
 دوسری چیخ مار کر کہا ”کہاں گئی وہ کار؟“

میں نے کہا ”ہم نے نکال لی..... بھاگ کے جانے والے جلدی میں ہوں گے۔ انہوں نے کار بھی کھلی چھوڑا
 ہوئی تھی اور اس کے اندر اس کی چابیاں بھی لٹک رہی تھیں۔“
 ”لیکن نکالی کس نے؟“ نانی نے لیٹانے باریک بات پوچھی۔

”نکالی میرے بھائی نے نانی۔ وہ بھائی جو گاؤں سے سچی، مرغیاں وغیرہ لاتا ہے۔ اس نے لاری چلائی سیکڑا
 ہے۔ ڈرائیور اسے سیٹ پر بیٹھا کر سٹیئرنگ اس کے حوالے کر دیتے ہیں اور خود ایک ٹھونکا لگا لیتے ہیں۔ سارا راستہ گاڑا
 چلاتا ہے، شہر قریب آنے پر ڈرائیور واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ جاتا ہے اور میرا بھائی سوار یوں کے ساتھ جا بیٹھتا ہے۔“

”پھر؟“ نعمانہ آپا نے پوچھا۔ ”پھر.....!“
 ”پھر کیا! ہم نے گاڑی نکال لی اور سارے شہر کا چکر لگایا۔ اماں کو بٹھا کر داتا دربار لے گئے۔ اباجی کو بادشاہ
 مسجد لے جا کر مغرب کی نماز پڑھوائی..... لیکن اباجی کو پسند نہیں آئی۔“

”کیا نہیں پسند آیا تیرے باپ کو..... نخریلے کو۔“ نانی نے پوچھا۔
 میں نے کہا ”نانی ان کو گاڑی نہیں پسند آئی۔“
 ”نئی گورگاڑی؟“ فرزاندہ آپا نے کہا ”اور بھائی جی کو پسند نہیں آئی۔“

”اس وجہ سے پسند نہیں آئی کہ گاڑی نئی گور نہیں ہے، سیکنڈ ہینڈ ہے۔“
 ”سیکنڈ ہینڈ کیسے؟“ نانی نے پوچھا۔
 میں نے گلا صاف کر کے قدرے اونچی آواز میں کہا ”نانی! گاڑی دو ہزار میل پہلے ہی چلی ہوئی ہے۔“ آپا

پھر ایک مرتبہ اپنے ماتھے پر زور کا ہاتھ مارا اور کہا ”بے وقوف لوگو! گاڑی کا دو ہزار میل چلے ہونا، چلتا نہیں کہلاتا، رنگ
 کہلاتا ہے..... اس سے نئی گاڑی اور کون سی ہو سکتی ہے بھلا۔“
 پھر آپا نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ”کرائسلر گاڑی۔ فائی سیون ماڈل۔ بلیک کالر۔ برینڈ نیو۔ اور کیا چاہیے

پرسی کرنے والوں کو وہاں سے اٹھا دیا۔ مجھے اپنے بیڑ پر بٹھا کر بولیں۔ "کوئی اور ٹریک لے کر نہیں..... جستی ٹریک۔" میں نے کہا "بچھلے ہفتے لے آیا تھا لیکن ایک ہی طرح کا مال نکلتا ہے۔ ڈگ اور ان گھڑت ٹو میں! کشمیری برہمن پھر بھی ٹیسٹ فل ہیں، ان کے زیورات خوبصورت ہیں لیکن ڈوگرے تو زیورات کے نام پر تالے اور ہتھوڑے سے بناتے ہیں۔ دیکھنے میں وہاں بات لیکن وزن میں سائلڈ۔ مگر اور پورے قول کے۔"

نانی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "اچھا بھئی اپنی اپنی قسمت ہے۔ ہم ایمانداری میں رہے اور لوگ کہیں کے کہیں پہنچ گئے۔ جو بھاگ بے ایمانی لوگ لگتا ہے، وہ ایمانداری کو نہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے نانی لیکن اب ہم بھی کیا کریں۔ لٹ لٹا کے آئے ہیں، کچھ تو اس کا مداوا ہونا چاہیے۔" نانی چڑ کر بولیں "دفع ہو دوسارے۔ چلبے میں جاؤ۔ یہ مداوا کر رہے ہو کہ رت بنا پھیر رہے ہو گا جروں میں۔" میں نے نانی کے اس فقرے پر ہنسنے کی کوشش کی تو وہ ہنسا کر بولیں۔ "اوپر سے تو تیری ماں بڑی شریف بنی ہے اور ہر وقت ذکر کرتی رہتی ہے کام کاج کرتے ہوئے لیکن اندر سے بڑی گہری ہے۔ کسی کو کانوں کا خبر ہی نہیں ہونے دیتی کہ کسے کیسے گھاؤ گھپ کر رہی ہے۔"

نانی ماں کہہ رہی تھیں اور اماں کی کردار کشی ہو رہی تھی۔ میرے لیے دونوں بزرگ ہستیاں تھیں، اس لیے میں خاموش ہو کر بیٹھا رہا، گواندر سے میرا دل چاہتا تھا کہ ایک انارکسٹ کی طرح میز پر کھڑے ہو کر دھواں دھار تقریر کروں اور پھر اس کمرے کا سب کچھ تھس تھس کر دوں۔ میں نے ظالم سانج کا رخ پہلی مرتبہ ایسا دیکھا تھا جس پر کوکھڑا بھرے ہوئے تھے اور جس کے ایک ایک کانٹے سے خون کے قطرے لپک رہے تھے اور جس کا ہر ایک خار کٹار کا زخم دیتا تھا۔

جب میں اٹھنے لگا تو نانی نے تنکے تلے ہاتھ پھیر کر ایک روپیہ نکالا اور اسے غور سے دیکھ کر میرے حوالے کر دیا۔ ان کے تنکے کے نیچے صدقے اور خیرات کے لیے بہت سی کھلی رقم رکھی تھی۔ گھر پہنچا تو دیکھا کہ میری ماں موٹے موٹے آنسو بہا کر اپنے کھدر کے دوپٹے سے آنکھیں پونچھ رہی ہے اور ہلکی آواز میں بین کر رہی ہے۔ درمیان میں رک کر دو خودکامی میں مصروف ہو جاتی اور بات کرتے ہوئے اس کی کھلھی بندھ جاتی۔

میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور خوفزدہ آواز میں بولا "کیا بات ہے ماں؟ روکیوں رہی ہے؟" تو اسی نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر اونچی آواز میں کہا "مر جانے جوگوں نے اب ہم پر ایک اور الزام لگا دیا ہے کہ ہم نے کسی کا گیرانہ تو ذکر اندر سے نئی بکھور کا رکنا ل لی ہے اور اسے اڑائے اڑائے پھرتے ہیں۔"

میں اپنی ماں کا کندھا تھپکتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گیا اور روکھی آواز میں بولا "تو فکر نہ کر ماں، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر ہے گا۔ سچ کا بول بالا ہو گا اور جھوٹے کا منہ کالا ہو گا۔ بس تھوڑی دیر اور صبر کر۔" اماں میرے ساتھ لپٹ کر اور اونچی آواز میں رونے لگیں۔

اگلے روز جب میں نانی ماں کی خبر لینے ہسپتال گیا تو وہاں آپا فرزانہ، آپا نعمانہ اور ان کے ساتھ ماموں بھی موجود تھے۔ نانی کی حالت پہلے کے مقابلے میں قدرے خراب تھی اور وہ بالکل خاموش لیٹی ہوئی چھت کی طرف دیکھ

رہی تھیں۔ میں نے ان کو سلام کیا تو انہوں نے صرف نظریں گھما کر دیکھ کر سلام کا جواب نہیں دیا۔ آپا فرزانہ نے پوچھا "امی بکھوڑ پئیں گی۔" تو نانی نے نفی میں سر ہلایا اور آنکھیں بند کر لیں۔

ماموں نے کہا "سنو ہے آج کل بڑی فوحتات ہو رہی ہیں اور لمبے ہاتھ مارے جا رہے ہیں" میں نے کیسانانی امی ہنس کر کہا "ایسی تو کوئی بات نہیں ماموں۔ بس کبھی نہ کبھی، کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔"

"کچھ ناں کچھ....." آپا نعمانہ نے چیخ کر کہا "کچھ ناں کچھ! جہاں نئی کھور کر کھلر موڑ آ جائے، زریو میٹر چلی ہوئی، اس کو تم کچھ نہ کچھ کہو گے۔"

نانی نے آنکھیں کھول کر کہا "ہر ساتویں دن دو ٹریک آتے ہیں زیور اور لعل و جواہر کے بھرے ہوئے اور یہ کچھ ناں کچھ کہہ رہا ہے۔"

ماموں نے کہا "کوئی اور نئی چیز بھی ملی؟" میں نے کہا "کل تو دو گھڑیاں ملی ہیں فیور لیو باکی۔ ایک نئی تھلی بالکل۔ ٹھنکی کی تھلی میں لپٹی ہوئی، ڈیبا میں بند۔ دوسری بھی تھی تو نئی لیکن اس میں شریپ پڑا ہوا تھا۔ کسی نے آٹھ دس دن استعمال کر کے واپس کیس میں رکھی تھی۔"

"اودہ وہ ہیں کہاں دونوں گھڑیاں؟" ماموں نے جلدی سے پوچھا۔

"گھر پر ہیں۔ الماری میں رکھی ہوئی ہیں۔"

"ان میں سے ایک مجھے دے سکتے ہو؟ اپنے ماموں کو!"

"کیوں نہیں؟" میں نے اعتماد دلاتے ہوئے کہا "آپ دونوں لے لیجئے، ہمارے کس کام کی۔"

ان کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر ابھری اور پھر ٹھوڑی سے ماتھے تک پھیل گئی۔ جب وہ ایسی آسودگی کی گود میں کڈلی مار کر لیٹ گئے تو میں نے آہستہ سے کہا "ایک کیمرو بھی تھا۔"

"کونسا؟" وہ بچلی کی طرح ترپے۔

میں نے کہا "مجھے اس کا نام اچھی طرح سے نہیں آتا۔ لیکار یا لاکھ تھا۔"

"کہاں ہے؟ کہاں ہے کہاں ہے!؟!" وہ ایک دم اٹھے اور انگڑائی سی بن کرتے گئے۔

میں نے کہا "وہ تین چار دن تو ادھر ادھر چار پائیوں پر رل رہا، پھر ڈبے بوتلیں والا کباڑیا آیا تو اماں نے گیارہ روپے میں اس کے ہاتھ بیچ دیا۔"

ماموں نے زور سے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور گرتے گرتے بچے۔ انہوں نے میرے دونوں کندھے زور سے جھجھوڑ کر پوچھا۔ "اس کباڑیے کو جانے ہو؟ اس کی دکان کا پتہ ہے۔"

میں نے ڈھیلا سامنے بنا کر آہستگی سے کہا۔ "اس کی دکان تو علم نہیں البتہ میں اسے شکل سے پہچانتا ہوں۔ کسی روز نظر آتا تو آپ کو اطلاع کر دوں گا۔"

ماموں نے کہا "میں تو پرسوں چلا جاؤں گا لیکن اگر وہ کباڑیا نظر آ جائے تو اس سے وہ کیمرو، سوڈیڑھ سوڈو

بلکہ چار پانچ سو میں بھی خرید لینا..... پیسے فرزند سے لے لینا یا نعمانہ سے لیکن وہ کسمرہ چھوڑنا نہیں بالکل۔“

نانی نے آنکھیں کھول کر دھیمی آواز میں کہا ”اس کو پیسوں کی کیا پروا ہے۔ یہ تو بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔“

لے گا، پیسے دے دے گا۔ تیرا شوق پورا کر دے گا۔“

”اور گھڑی؟“ ماموں نے پوچھا۔

”وہ میں کل لیتا آؤں گا۔“

”اسی وقت..... یہیں!“

”جی..... اسی وقت..... یہیں۔ آپ بے فکر ہیں۔“

مجھے یقین ہے ماموں بے فکر نہیں رہے اور ساری رات سوچتے رہے کہ وہ نئی گھڑی یا ندرہ کدھر دفتر جائیں گے۔

اگلے روز میں جان بوجھ کر ہسپتال نہیں گیا۔ گھڑی پاس ہوتی تو جاتا۔ اسی وجہ سے خالی دیا۔ دو دن بعد پتہ چلا

کہ نانی کی حالت اچھی نہیں۔ رات سے ڈرپ لگی ہے۔ پیشاب آور دو آئیں دی جا رہی ہیں اور نالی کے ذریعے ہی پیشاب

نیچے بوتل میں لیا جا رہا ہے۔

میں گیا تو مجھے دیکھ کر رونے لگیں۔ بہت ہی مدھم آواز میں بولیں۔ ”ماموں کی گھڑی لے آئے؟“

میں نے کہا ”نہیں نانی، وہ گھڑی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ بڑے بھائی لے کر سرگودھا چلے گئے۔ میں نے

فون کر کے پچھوایا تو پتہ چلا کہ انہوں نے کسٹمر سرگودھا کو تحفے کے طور پر دے دی..... لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں جلد ہی

ایک نئی اور لس سے بھی اعلیٰ گھڑی پیدا کر کے دوں گا اور جلد پیدا کروں گا۔“

نانی نے پوچھا ”جہلم نہیں گئے؟“

میں نے کہا ”ہو کر آ رہا ہوں، اسی لیے تو دور روز حاضر نہیں ہو سکا۔“

”بھرا لے ٹریک.....“ نانی نے دھکی ہو کر پوچھا۔

”اس مرتبہ بہت سال غنیمت ہاتھ آیا۔“ میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا ”لیکن ان میں زیادہ تعداد پرانی

بادشاہتوں کے زرئی سکوں اور اشرفیوں کی ہے۔ اشرفیاں موٹی اور بڑے ساز کی ہیں۔ آپ چاہیں تو انہیں فی ٹرائی میں

پہیوں کی جگہ استعمال کر سکتے ہیں۔ ویسے ان کی چھب دیسی کی ویسی ہے۔ جھم جھم کرتی اشرفیاں۔ ڈھلکا کھول تو ان کی ڈلک

زیادہ دیر کھلی آنکھوں سے دیکھا نہیں جاسکتا۔ بینائی ماند پڑ جاتی ہے۔ آدی اندھا ہو جاتا ہے اور دولت کا اندھا تو آپریشن

کے قابل بھی نہیں رہتا۔ اندھیرے میں ہی ساری زندگی گزارتا ہے۔“

نانی نے کہا ”کتنے ٹریک ہیں اشرفیوں کے؟“

میں نے کہا ”نانی انہیں ٹریک تو نہ کہا کریں حتیٰ ٹریکوں کو۔ چارٹ بائی دو فٹ بائی ایک فٹ۔“

نانی نے کہا ”مجھے ان کا ناک نقشہ نہ سمجھا۔ قدرت نہ بتا۔ یہ بتلا کہ ملے کتنے؟“

”پانچ نانی ماں پانچ۔“ میں نے خوش ہو کر اپنا دایاں پنجہ نانی کے ڈوہتے ہوئے چہرے کی طرف کر دیا۔

انہوں نے ایک مرتبہ جی بھر کے کچھ دیکھا، پھر آنکھیں بند کر لیں۔ سورج ڈوبنے لگا اور پیلی روشنی ماند پڑتے

پڑتے ایک سنولائی کلب میں تبدیل ہو گئی۔

میں نے اس سے پہلے کبھی کسی انسان کو مرتے نہیں دیکھا تھا۔ سختیں اور لاشیں ضرور دیکھی تھیں۔ بے گور و کفن

مردہ لوگ بھی دیکھے تھے۔ ریلوے جی کیپ میں اتنا عرصہ کام کرنے سے لاشوں سے پٹی ہوئی گاڑیاں خالی کرانے، گاڑیوں

کے ڈبے دھلوانے۔ باہر پالتیوں سے پانی اچھال اچھال کر ٹریٹوں کو صاف کرانے کا کام ضرور کیا تھا لیکن کسی کو اس قدر

زہیب سے مرتے نہیں دیکھا تھا۔

میری نانی میرے سامنے فوت ہو رہی تھیں اور میں ان کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ آگے بڑھ کر ان کو تسلی نہیں دے سکتا

تھا۔ ان کے سامنے کچھ پڑھ نہیں سکتا تھا، ان پر دم نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ پھونک نہیں سکتا تھا۔ ان کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا تھا۔ اوپر

پریمی، تاڑے لگی ہوئی نظروں کو واپس نہیں اتار سکتا تھا۔ خاموش اور سہا ہوا سا بیٹھا تھا۔ موت کا خوف تو بلاشبہ تھا لیکن اس

کے گرد غصے کا ایک کبل بھی لپٹا ہوا تھا۔ اس نے کچھ سہارا دے رکھا تھا۔ ذرا سی گرمائی بھی عطا کی ہوئی تھی کہ انہوں نے

میری ماں کو جو اتنا تنگ کیا تھا، اسے سارے خاندان میں بدنام کیا تھا، ہر ایک کو شک و شبہ میں مبتلا کیا تھا۔ ان کی عمر بھر کی

کامیابی افواہوں اور غلط بیانیوں کے لہندے سے قلم بردہ تھی۔ میری ماں کو بزار لایا تھا تو اب میں کیا کروں۔ میں کدھر سے

ان کی تسلی کروں، ان کا سہارا بنوں۔

میری نانی میرے سامنے آہستہ آہستہ فوت ہوتی گئیں اور میں ان کے قریب دیوار سے ڈھونگ کر چپ چاپ

بیٹھا رہا..... وہ جو میرے بھائی نے کندھا بدلتے ہوئے میرے کان میں بات کہی تھی، کچھ ایسی غلط نہیں تھی۔ اسی طرح سے

ہوا تھا۔ میری نانی بھرے ہوئے ٹریکوں کی حسرت لے کر فوت ہوئی تھیں۔ ایسے ٹریک جو علی بابا کو تو مفت ملنے رہے تھے

لیکن اس کے بھائی قاسم کے لیے شرمناک بن گئے تھے۔

موت بھی کیا عجیب چیز ہے۔ اس سے کئی کھلے ہوئے ٹریک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے ہیں اور کئی ازل

کے منہ بند خزانے آپ سے آپ کھل جاتے ہیں۔ وہ جو مجھ میں اور سستی مردیاتی میں ایک طویل المیعاد حجاب قائم تھا، وہ

اس کی ماں کے انڈونیشیائے ایک قصبے میں فوت ہو جانے سے خود بخود دور ہو گیا اور ہم ایک دوسرے سے بے فکر ہو کر

بڑی بڑی دیر تک ایک دوسرے کو چومتے رہتے اور تسلیاں دیتے رہے۔ اتنی دور کی موت نے ہمارے درمیان کتنی

قرابت پیدا کر دی تھی!

ہماری لائبریری میں اطالوی اقتباسات کی ایک ڈسٹری تھی، میں نے اس میں سے ”موت“ کی پٹی نکال کر

اپنی پسند کے اقتباس جمع کر لیے۔ وقت گزرنے پر جب سنی مجھ سے قدرے دور ہو جاتی تو میں اس کا کندھا تھپتا کر کہتا

”ہم موت کی کیا پروا کرتے ہیں سنی! جب ہم زندہ ہوتے ہیں تو یہ نہیں ہوتی اور جب یہ ہوتی ہے تو ہم نہیں ہوتے۔ کیسے

مرے کی بات ہے کہ ہمارا اور اس کا آسانا سامنا ہی نہیں ہوتا۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں۔“ اس اقتباس سے

حوصلہ پکڑ کر سستی میرے ساتھ لگ کر بیٹھ جاتی اور میں اس کے بالوں میں اگھیاں پھیرتے ہوئے کہتا ”تمہیں سقراط کے

میں بڑی طاقت ہے۔

ویسے ایک علم ڈاکٹر کا، معالج کا، ملاح کا، بروہی کا اور کسان کا بھی ہے لیکن وہ گفتگو کے علم اور کام محض کے فن کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ علم نافع کے مقابلے میں علم غیر نافع محض مضبوط اور زیادہ کارگر ہے۔ وہ سارے کیے کرائے پر دونوں سے پانی پھیر سکتا ہے۔ ساری خدمت اور چاکری کو ایک فقرے سے کاٹ سکتا ہے اور سالوں کی محنت مشقت، جانفشانی اور ریاضت کو ایک فقرے سے ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ علم غیر نافع میں واقعی بڑا زور ہے۔ وہ ساری دنیا کا واحد مکران ہے..... بلا شرکت غیرے!

آخری وقت کے مکالمات بھی تو یاد ہوں گے۔ جب اس نے کہا تھا کہ اب جب کہ فراق کا وقت آ گیا ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے، مجھے اپنی موت کے سفر پر روانہ ہونا ہے اور آپ کو اپنی زندگی کے ساتھ آگے بڑھنا ہے تو ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ہم میں سے خوش قسمت کون ہے اور مرے میں کون ہے۔ یہ حقیقت تو بس خدا ہی کو معلوم ہے۔

”اور پھر اس بات پر بھی غور کرو کہ ہم حضرت آدم علیہ السلام کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے دنیا کو موت جیسی نعمت سے بہرہ مند کیا۔“

”دیکھو ایک وقت تھا کہ ہم نہیں تھے لیکن ہم اس نہ ہونے پر فکرمند نہیں تھے۔ اسی طرح سے ایک وقت آئے کہ ہم پھر نہیں ہوں گے تو پھر اس نہ ہونے پر فکرمند کیا!“

”اور سنو سستی مرد یا تیری ایک قدرتی موت وہ ہے جب آپ خود اپنی مرضی سے مر جائیں، کسی ڈاکٹر یا ہسپتال کی مدد کے بغیر.....“

لیکن سستی نے ایک خوفزدہ ہرئی کی طرح کہا ”میرے خیال میں، اس دنیا میں سب سے زیادہ بری چیز موت ہے۔“ میں نے فوراً پلٹ کر کہا ”اس دنیا میں کئی چیزیں موت سے بھی بری ہیں۔ مثلاً زندگی!“

اس نے تھوڑی دیر غور کیا، پھر مسکراتی ہوئی میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ ہم بڑی دیر تک اس کی والدہ کی باتیں کرتے رہے یعنی وہ کرتی رہی اور میں سنتا رہا اور ساتھ ساتھ ہنکارا بھی بھرتا رہا کہ لفت اقتباسات سے اٹھائے ہوئے میرے جملے استعمال میں آ جائیں۔

علم بھی کیا کمال کی چیز ہے کہ اس کو ذاتی غرض سے کہیں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور اس کا نشانہ بھی چوکتا نہیں۔ جب ہم شکار پر جاتے تھے اور بھائی جان اڑتے ہوئے تیریا اترتی ہوئی مرغابی کو نشانہ بناتے تھے تو بسا اوقات نشانہ چوک جاتا تھا۔ نشانہ لگ بھی جاتا اور شکار گر بھی جاتا تو اٹھا کر لانے والے کتے ڈائریکشن بھول کر ایک دوسرے سے لڑنے لگتے۔ سارا وقت ان کے چکر کاٹنے، دائروں میں احمقانہ گھومنے اور بھنمیل بھوسوں میں گزر جاتا..... لیکن علم ایسی چیز ہے کہ اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ انسان کو گھائل کر کے رہتا ہے۔ اس پر اثر انداز ہو کر رہتا ہے۔ اس کو متاثر کر کے جان چھوڑتا ہے۔

میں نے بھی معلومات اور جان کاری کی کنڈی ڈال کر صرف ایک موضوع کے کاٹنے سے سستی کو پکڑ لیا۔ وہ اپنی ماں کے مرجانے سے غم دیدہ تھی۔ میں نے موت کے موضوع کا پھندا ڈال کر اس کو گرفتار کر لیا۔ اگر وہ غریب ہوتی تو میں غربت، مفلسی، بھوک، ناداری کے المناک قصے سنا کر اپنا مطیع کر لیتا۔ اگر وہ بیمار ہوتی تو میں غلاموں، معالجون کے رویوں پر تنقید کر کے اس کا دل خوش کر دیتا۔ مجھے اس کے لیے کچھ کرنا نہیں تھا، صرف اس کی خواہش کی تکمیل کا زبانی کھای ساتھ دینا تھا۔ جس طرح میرا اپنے مریدوں کے لیے کچھ کرنا نہیں ہے، ان کی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے دعا کر کے ان سے چندہ وصول کر کے لے آتا ہے۔ شاعر غریبوں، ناداروں اور ذلتوں کے ماروں کے لیے کچھ کرنا نہیں ہے۔ صرف ان کے خوابوں میں رنگ بھر کر ان سے آنے جانے کا کرایہ، مشاعرے کی فیس اور ضیافتوں کا اہتمام کرا کے آ جاتا ہے..... واقعی علم

کلی نہیں، پر نظروں کا رخ اوپر کو تھا۔ آنالوگر چونے حوصلہ کر کے پوچھا ”مہاراج یہ حقیقت کیا ہوتی ہے؟ یہ سچ اور اور.....“

کہنے لگے ”سچائی ہر مقام پر سچائی ہی ہوتی ہے۔ اس کی کوئی شکل، کوئی گھڑت، کوئی صورت نہیں ہوتی۔ یہ وہ ہے کہ جو ہے۔ شروع سے ہے اور آخر تک اسی طرح رہے گی۔ یہ سوچنے سے پرکھنے سے، بولنے سے، بھاشن سے اور کھن سے ادھر کی چیز ہے۔“

پھر وہ تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولے ”سچائی اور واسطو تا جو روشن، پرکاشت اور ویکٹ ہے کسی رنج، سن تپ اور ہلچل کے بنا کسی جسم، بدن اور دیہہ بنا اپنے آپ میں ہوتی ہے۔ اس کا سنسار کے ہونے نہ ہونے سے کوئی سبب نہ نہیں ہوتا، کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔“

(8)

میں بابا کے منہ سے نکلے شبدوں پر حیران ہو رہا تھا اور رام سنگھ تو مر نکلیوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا کیوں بچو! دیکھا ہمارے بھاشن کا کرشمہ۔ ابھی تو یہ شروعات ہیں۔ دو سال کے اندر اندر ساری دنیا کی زبان ہندی ہو جائے گی۔ میں دل ہی دل میں ہندی کے پھیلاؤ سے خوفزدہ ہو رہا تھا۔ اس کی بڑھتی ہوئی لہر میں اب میرے وجود سے ٹکرا کر واپس جانے لگی تھیں اور میں دل ہی دل میں اس سے مرعوب ہونے لگا تھا۔

مرچیس نے کہا ”مہاراج یہ Awareness کیا ہے اور اس کو کس طرح سے حاصل کیا جاسکتا ہے؟“

”اور اگر حاصل ہو جائے“ ماریا جلدی سے بولی ”تو اس کو کس طرح سے Cultivate کیا جاسکتا ہے؟“

بابا دھرم داس نے اپنی روشن روشن نظریں ہم پر جما کر کہا ”تم خود Awareness ہو، تم آپ جانکاری ہو، تمہارا ہی دھرم نام سوچنا ہے۔ اب جب تم خود جانکاری ہو تو اسے حاصل کہاں سے کرنا ہے بھائی۔ جب آپ ہی سوچنا ہو تو اس کی Cultivation کیسی!“

پھر آنکھیں بند کر کے بولے ”بس اس جانکاری اور اس سے پرستے حاصل کرنے کے لیے تھوڑا سا کام کرنا ہے۔ ذرا سادہ کرنا ہے اور وہ یہ کہ اپنے سوا اور جتنی چیزوں کی جانکاری ہے اور جو جو انظر مشن ہے، اس کو چھوڑنا ہے۔ ان سب کو گناہ گنا ہے یعنی اپنی ذات، اپنی ہستی اور اپنی اس جانکاری کے علاوہ سب چیزوں کو ترک کرنا ہے اور جب یہ ہو گیا، مارے نقش مٹ گئے، سارے چتر، سارے نشان سارے نیل بوٹے، پھول پتی ملیا میٹ ہو گئے تو پھر آپ ہی آپ رہ گیا، ذات ہی ذات رہ گئی۔“

راہیہ تو نے کہا ”مہاراج اگر ذات کو آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ جانکاری مل جاتی ہے کہ سب کا ٹھکانہ، جھاڑ بوکاڑ، نشان چتر مٹ گئے ہیں اور اب میں ہی میں ہوں تو پھر مجھ کو، مجھ راہیہ تو کو، راہیہ تو لیا را کو پتہ کیوں نہیں چلتا کہ میری ذات ابا گر ہو گئی ہے، سب آلائشوں اور گند بلا سے پاک ہو گئی ہے۔ بالکل اکیلی ہے، مجرد ہے۔“

بابا دھرم داس نے بڑی شفقت اور سنجیدگی سے کہا ”تمہارا اس وقت کا گیان، اس وقت کی بدھی اور اس وقت کی سکھانا اور دوپا سارے کا سارا احسا کے کارن ہے۔ انا کی وجہ سے ہے۔ یہ دیا نہیں ہے، بے سبب نہ دیا ہے۔ انا و شک

انہی دنوں ہمارے شہر روم میں ایک بابا دھرم داس آیا۔ اس کی خبر اخباروں میں بھی لگی اور یونیورسٹی میں اس کا زبانی چرچا بھی ہوا۔ میرے کچھ ساتھیوں، شاگردوں اور دوستوں نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ”بابا“ کا لفظ سن کر اور پڑھ کر میرے دل میں بھی اس سے ملنے کی آرزو پیدا ہوئی لیکن اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں جب میں نے اس کی تصویر دیکھی اور اس کا انٹرویو پڑھا تو مجھ پر کھلا کہ یہ بابا جی پینتیس چالیس برس کی عمر کے ایک آئرش دکاندار ہیں۔ پہلے رومن کیتھولک تھے، پھر یوگا کی طرف مائل ہو کر بابا بن گئے۔ سٹیفن آئس سے نام بدل کر دھرم داس بن گئے۔ مذہب تو بدستور رومن کیتھولک ہی رہا لیکن مشرب میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ لباس بھی بدل لیا اور وہ سنہری ڈاڑھی جو پہلے چھوٹی تھی، اب سینے تک بڑھ چالی۔ سر کے بال غورتوں کی طرح چھوڑ دیئے اور ماتھے پر نقشہ کھینچ لیا۔ ریلوے سٹیشن کے پاس ایک چھوٹے سے ہوٹل میں میڈی ٹیشن کی تعلیم دیتے تھے اور بھگوان سے لو لگانے کے طریق بتاتے تھے۔ ہفتے میں دو بار ویدوں اور اپنشدوں کی تعلیم پر لیکچر ہوتا، ساتھ سلائیڈ بھی دکھاتے تھے۔ لکھا تھا کہ انہوں نے گیارہ برس تک نامی گرامی گوروں سے تعلیم حاصل کی اور مٹھ میں ایک لمبی مدت گزار لی۔

میرے بہت سے ساتھی بابا دھرم داس کا بھاشن سن کر سرد جھٹے ہوئے آئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ اگر علم کے ٹھکانے مارتے سمندر کو دیکھتا ہے تو ہمارے ساتھ چلو۔ آنالوگر چو اور ماریا پیا لوری تین تو اس کے عشق میں جتلا ہو کر ایسی سکھ ہوئی تھیں کہ بابا کے سوا اور کوئی بات ہی نہ کرتی تھیں۔

ہم کل سات افراد بھگوان بابا دھرم داس کی سیوا میں اہمیت ہوئے اور پائے لاگن کے بعد ان کے سامنے فرش پر بیٹھ گئے۔ بابا دھرم داس سنہرے بالوں اور سنہری ڈاڑھی کے زور پر تصویر کی کراسٹ کا نیاروپ نظر آتے تھے۔ ماتھے پر گہرے سرخ رنگ کا کیوٹس کے قوام والا نقشہ، گروا گرو چو طرفہ سفید حاشیہ، نقشے کے اندر چھ سات دھلے دھلائے سفید چاول مانے سے چنے ہوئے آنکھوں میں سرخ آنجن، سر سے کیسری خوشبو اور کمرے میں دھوپ سا گرمی کا مشام انگیز دھواں۔

مسکراتے رہے اور ہماری طرف دیکھتے رہے۔ ہماری طرف دیکھتے رہے اور مسکراتے رہے۔ آنکھیں پوری

جان کاری ہے۔ فضول معلومات ہے۔ ایسی جانکاری کو اور اس پر کاری دیا کو ہمیشہ ایک ”کرتا“ کی اور ایک ”کرم“ کی طلب ہوتی ہے۔ ایک فاعل کی اور ایک مفعول کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساری دنیا کا علم اس چوکھٹے میں بندھا ہے۔ اس سے باہر نہیں نکل سکتا..... اس کے مقابلے میں ذات کی جانکاری اور ذات کی پہچان کے بعد کسی قسم کے مفعول کی ضرورت نہیں رہتی۔ دوئی مٹ جاتی ہے اور ایک کی راہ جاتی ہے۔ وحدت رہ جاتی ہے۔ توحید کا غلبہ ہو جاتا ہے۔“

پھر کہنے لگے ”سنسار کی پھیلی و دیا اور اس دنیا کی تعلیم کا یاد سے اور خیال سے اسمن فکستی اور یادداشت سے کر تعلق ہے بلکہ ہماری تعلیم کی بنیاد ہی یہی ہے لیکن یہ بھی ایک فالتو چیز ہے۔ اضافی شے ہے، یاد کرنے کے لیے ایک فاعل درکار ہے جو یاد کرے۔ ایک مفعول جس کو یاد کیا جائے لیکن ذات کی آگہی میں ایسی کوئی چیز نہیں۔ کوئی دوئی نہیں۔ کرا ٹکراؤ نہیں۔ نہ کوئی یاد کرنے والا ہے نہ کسی کی یاد آ رہی ہے..... اور نہ ہی کوئی یاد ہے۔“

ہم سب دم بخودان کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا کلام ہمارے رگ و پے میں اترتا جا رہا تھا۔ یہ ایک عجیب سی علم تھا اور ہمارے لیے بالکل ہی نئی بات تھی لیکن تعجب اس پر ہو رہا تھا کہ بات ہمارے اندر سرایت کرتی رہی تھی۔ گو اس کے پورے معانی اور مطالب واضح نہیں ہو رہے تھے لیکن اس کا ہیولا سائنے نظر آ رہا تھا۔ صاف اور بے لاگ! لیکن ذات کا وجود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ذات کا حلیہ واضح نہیں تھا۔ ذات کی ذات کا پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کس برادری سے تعلق رکھتی ہے۔

بابا دھرم داس کہنے لگا ”ذات ہر وقت موجود ہے۔ ساتھ ساتھ ہے لیکن ہر شخص ذات کو جاننا چاہتا ہے۔ اصل میں لوگ اپنے آپ کو اور اپنی ذات کو جاننے کے لیے گھروں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ جنگلوں، بنوں میں اس کا ڈھونڈتے ہیں۔ لوگوں سے مدد کی اچھیا کرتے ہیں کہ مجھ سے میری ذات ملا دو۔ مجھ سے میری ذات کا تعارف کرا دو۔ پرستے کرا دو۔ حیرانی کی بات ہے کہ لوگ اسے ایک نئی چیز سمجھتے ہیں۔ بازار سے لائی ہوئی کوئی شے۔ کسی سے مانگی ہوئی ادھار لی ہوئی۔ پر یہ نہیں ہوتی اور کہیں سے لائی بھی نہیں جاتی۔ ساتھ ہی ہوتی ہے، وہی ہوتی ہے۔ پر بھائی اور دکھائی نہیں جاسکتی اس کا گیان گوجر ہوتا ہے۔“

تو مرچی نے کہا ”اسی کا چرچا پنشدوں اور سوتروں میں تو ہے مہاراج۔“

مہاراج نے انہما نے جی سے کہا ”ہے اور آویٹا ہے، پر اس سے کوئی پتہ نہیں چلتا۔ پر پی پا دھن نہیں ہوتا۔ پرانے سوتروں میں کیول سمجھانے کے لیے اس کا اندوہن ہے کہ ذات اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کے برابر ہوتی ہے۔ بال کی نوک جیسی ہوتی ہے۔ بجلی کے چکارے سان ہوتی ہے۔ پوتر سے پوتر، ملائم سے ملائم اور مردل سے مردل ہوتی ہے۔“

”تو پھر اس کا تجربہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اس کو کھانا کیسے جاسکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

سائیں بابا نے ذرا سا مزاج ہو کر کہا ”جتا تو رہا ہوں بالوگ کہ اگر ہم ذات کو جاننے کی پریقن کریں گے تو پھر دو ذائقہ ہو جائیں گی۔ ایک جاننے والی دوسری جنوانے والی۔ دوئی پیدا ہو جائے گی..... دوئی پیدا ہوئی تو تاش ہوا! سمجھے کہ نہیں؟“

میں نے گہرا کر کہا ”سمجھ گیا جی بالکل سمجھ گیا۔“

بابا دھرم داس نے محبت سے میری طرف دیکھ کر کہا ”سادھو بابا! ذات کی سمیٹا نہیں بتائی جاسکتی۔ اس میں اتر جا سکتا ہے۔ جیسے بادی میں اتر کر جل سے گاگر بھری جاتی ہے۔ اسی طرح اس میں اتر کر درپن کا رنگ دیکھا جاسکتا ہے۔ جس طرح چپ کو پکڑا جاسکتا ہے۔ چپ میں اتر جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح ذات میں بھی بسرام کیا جاسکتا ہے۔ چپ ایک ایسی چیز ہے جس کو شبدوں میں نہیں بتایا جاسکتا۔ اکھروں میں نہیں لکھا جاسکتا۔ چپ تو بس چپ ہی ہوتی ہے۔“

آنانے کہا ”بابا جی یہ چپ ہے کیا؟ اس کی اصل کیا ہے اور اس کا دنیا میں کام کیا ہے؟“

گواسائیں دھرم نے کہا ”سنو رینا! بول چال، بات چیت، کھوپ کھن سے پرے چپی ہے، خاموشی ہے، مون ہے یعنی جو ہے وہ مون ہے جو مون نہیں ہے، اس کا کوئی شر نہیں، استو نہیں..... اور یہ جو چپی ہے، یہ جو خاموش ذات ہے، یہی بھگوان ہے۔ خالی ذات جیو ہے۔ خاموش اور مون ذات بھگوان ہے..... اس سنسار کے سارے علم کمزور، نکتے اور نرم ہیں۔ خاموشی اور مون کا علم ہی اصل علم ہے۔ وہی صحیح علم ہے۔“

انہوں نے آنکھیں بند کر کے پھر اپنا آموختہ دہرایا کہ ”ذات تو ہر وقت اور ہمہ وقت موجود ہے، ساتھ ساتھ ہے۔ پر اس کے لیے خاموشی اور سکوت مطلوب ہے۔ جب ”نا ذات“ کا اور ”لا ذات“ کا کھیزا اٹھ گیا تو ذات صاف نظر آنے لگی۔ کمرہ تو موجود ہے پر اس کا شعور پیدا کرنے کے لیے اندر کا کاٹھ کاٹھ، گودڑ پھونس اٹھانا پڑے گا۔ صفائی کرنی پڑے گی۔ جو نجی صفائی ہوئی، کمرہ کھٹ سے سامنے آ گیا بلکہ کمرہ ہی کمرہ گیا اور سب کچھ ختم ہو گیا۔“

ماریا پاپا نے ذات کے جھگڑے سے جگ آ کر ”ٹھا“ کر کے پوچھا۔ ”بابا جی! ذات کی بات تو تھوڑی تھوڑی سمجھ میں آگئی، یہ بتائیے کہ جیون میں آئندہ کیسے حاصل کا جاسکتا ہے۔ سکون قلب اور مویش کا کیسے پکڑا جاسکتا ہے؟“

ماریا کے اس سوال کو ہم سب نے پسند کیا!

آئرش بابا دھرم داس نے کہا ”اگر انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کی خوشی اور آئندہ کا بھید باہر کی چیزوں اور باہر کے جمع جھنڈے سے ہے تو وہ مورکھ ہے۔ اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی خوشی اس کے مال اسباب روپے پیسے نوکر چاکر کی وجہ سے ہے تو وہ مہامورکھ ہے۔ جو کوئی یہ دو چار پرگٹ کرتا ہے کہ جب تک اس کے پاس دھن دولت ہے، مال منال ہے اور جیمن جائیداد ہے تو وہ دھن دان ہے تو خوش ہے۔ آئندہ میں ہے، موج میں ہے اور جونہی اس سے یہ چیزیں چھن جاتی ہیں، لٹ جاتی ہیں تو وہ غریب ہو جاتا ہے۔ غریب ہو جاتا ہے تو کھی ہو جاتا ہے۔ سکھ سے دور اور دکھ کے پاس ہو جاتا ہے۔ سارا جیون نرک میں گزرتا ہے اور مرے پر بھی نرک ہی جاتا ہے۔ یہ خیال بڑا غلط ہے بلکہ سارا اوچار ہی جھوٹا ہے۔ آج کی سوچ کے انوسار بالکل ہی ناانسانیک ہے۔ دھن، دولت اور ہوت اور جمع جھنڈا دی کو سکھ شانتی نہیں دیتا۔ یہ اس کے بس میں نہیں۔“

ہم سب کے دلوں میں ایک ہی سوال اٹھا اور ایک ہی بات ایک ساتھ ابھری کہ اگر ”ہونا“ خوشی نہیں دے سکتا، دھن دولت اور جمع جھنڈے زمین جائیداد اور پنڈی پر چڑھ آئندہ نہیں دے سکتا، پوزیشن پزیشن لگا تار سکھ نہیں دے سکتا تو پھر اور کوئی شے انسانی خوشی کا باعث ہو سکتی ہے؟

بابا دھرم داس نے ہمارے چہروں سے ہمارے اندر کی کیفیت بھانپ لی اور کہنے لگے ”کبھی تم نے سوئے

ہوئے آدی کو غور سے دیکھا ہے؟ کسی بھی سوئے ہوئے انسان کو مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا بوڑھا۔ گورا ہو یا کالا۔ کوئی بھی انسان ہو، پر ہو سو یا ہوا۔ پٹنگ پر، کھٹ پر، صوفے پر یا دھرتی پر، کہیں بھی سویا ہوا اور گہری نیند سو یا ہو تو اس وقت اس کی ذات، خالص اور اصل ذات اجاگر ہوتی ہے۔ اس کے اضافے حوالے ٹوٹ چکے ہوتے ہیں اور اس کی صرف ایک ہی پہچان باقی رہ گئی ہوتی ہے۔ اصلی اور ذاتی پہچان۔“

”گہری نیند میں بہت ہی گھوک سو یا ہوا انسان دھن، دولت اور جمع جتھہ اور حکومت سے بالکل بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ ہوتا تو وہی انسان ہے، جسمانی، روحانی اور ذہنی طور پر لیکن اس کی ذات سے وہ سارے پوسٹر، اشتہار اور لیبل اڑ چکے ہوتے ہیں جو اس نے بڑی محنت کے ساتھ اپنے وجود کے ساتھ چپکائے ہوئے ہیں۔ وہ کو اجس نے ہنس کے پر لگا کر اپنی ذات کو کھانے کی کوشش کی ہوتی ہے، گہری نیند میں ان پروں سے بے نیاز ہو چکا ہوتا ہے۔ اب وہ بڑے آرام اور اطمینان کے ساتھ اپنی چال چل رہا ہوتا ہے اور خوشی، مسرت، شادمانی اور آنند کی دنیا میں گھل چکا ہوتا ہے۔“

سو یا ہوا آدی، بے گھر، بے در، بے نشان و بے گمان، نہ مال و دولت، نہ زمین جائیداد، نہ سونا چاندی، نہ ہیرے جواہر نہ سلطنت نہ حکومت نیند کی آغوش میں نومولود بچے کی طرح لیٹا ہوتا ہے۔ جگا تو جگا کرتا نہیں، منہ مانگے دھیمی آواز میں یہ کہہ کر کہ ”ذرا سا اور سولینے دو“ پہلو بدل کر پھر نیند کی وادی میں اتر جاتا ہے۔ مال منال اور سونا چاندی، روپا پنا اور لعل جواہر میں جوں جوں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کی آسودگی کم ہوتی ہے۔ جونہی ان کو بھولنے لگتا ہے، پریش اور پوزیشن سے پرے ہوتا ہے۔ بے خودی اور بیہوشی کے عالم میں نیند کے بحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ پھر کسی چیز کی پروا نہیں رہتی، کوئی چیز یا نہیں آتی۔ کسی ملکیت سے علاقہ نہیں رہتا۔ تو یہ سوچنا کہ ملکیت ثروت سے تھلکی طمانیت ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے، ایک نہایت ہی غلط مفروضہ ہے۔ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

پس معلوم یہ ہوا کہ خوشی مسرت انبساط اور آنند انسان کے اندر ذاتی، اصلی اور موروثی ہوتی ہے۔ کہیں باہر سے نہیں آتی۔ نہ آسکتی ہے نہ لائی جاسکتی ہے۔ نہ باہر سے کچھ لے کر خوشی حاصل کی جاسکتی ہے۔ نہ اپنے ارد گرد اشیاء اور دولت جمع کر کے سکون قلب کی دولت کمائی جاسکتی ہے۔“

ہم یہ بات سن کر حیران رہ گئے۔

پروفیسر ایتھ نے کہا ”یہ سارے کا سارا جاپانی فلسفہ ہے اور ہماری پرانی داستانوں میں اس کا واضح تصور ملتا ہے۔“ تو مر جی نے کہا ”جاپان تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا جب انپشنوں میں اس درشن شاستر کی چرا ہو گئی تھی۔“ دونوں پروفیسروں کے درمیان اسی بات پر ہلکا سا جھگڑا ہو گیا لیکن ہم نے ان کی طرف کوئی زیادہ نہیں دی۔ بھگوان دھرم داس بھی مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

گھر آ کر میں نے سوچا تو مجھے بھگوان دھرم داس کی باتوں میں بڑا وزن معلوم ہوا۔ یہ ایک ایسی ہی بات تھی جس نے میرے مذہب کی کسی ہوئی چولیس ذرا ڈھیلی کر دی تھی اور میرے اندر تشکیک کا مادہ پیدا ہو گیا تھا۔ اپنے گھر کی باتیں کچھ غیر غیر سی لگنے لگی تھیں اور پڑوسیوں کے دروازے پر خیر نظر آنے لگی تھی۔

سہ پہر کے وقت ریڈیو ٹرانسمیشن کے بعد میں سیدھا مہاراج دھرم داس کی سیوا میں حاضر ہو جاتا، وہاں اور لوگ بھی ہوتے لیکن وہ مجھ پر خاص توجہ دے کر سب کے سامنے میرا مان بڑھاتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں امر بڑی، ہندی میں ان کے بھاشن کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور کہیں چوکتا نہیں تھا جبکہ دوسرے اطالوی حاضرین انہیں بار بار روک کر مہاراج کے ملفوظات کی وضاحت طلب کرتے تھے لیکن اس کی دوسری اور اصل وجہ یہ تھی کہ میں مسلمان تھا اور میرے دل میں ان کی سیندھ نہایت کامیابی سے لگ رہی تھی۔ انہوں نے میرے مذہب کے بارے میں کبھی کچھ کہا تو نہیں تو اہل بیت ان کی باتوں کا رخ بتاتا تھا کہ اس دنیا میں ویدوں کا علم ہی عالی ہے اور ویدک دھرم ہی اصل دھرم ہے۔

میری فرمائش پر مہاراج نے مجھے ہندو آتمک کا درس دینا قبول کر لیا اور میں ایک بھکاری کی طرح ہندو دھرم کی ریلز سے لگ کر کھڑا ہو گیا کہ آگیا ہوں تو میں اندر آنگن میں چلا جاؤں گا اور اس گھرانے کی سیوا قبول کر لوں گا۔

پہلے کچھ روز جب تک سی ری لیکن پھر مجھے اچانک ایک سہارا مل گیا۔ ایک رات سوتے وقت کچھ گھبراہٹ، کچھ دہچا اور کچھ بے چارگی کے عالم میں مجھے معاً خیال آیا کہ بڑے بڑے جید علماء اور اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ مسلمان اور مجھے ہوئے مسلمان سیاستدان دل و جان سے ہندو کا منکر ہیں کے ساتھ تھے اور لباس، زبان، فہم اور سوچ کے اعتبار سے ہندو دھرم کے زیادہ قریب تھے۔ اکثر ان کے بیانات سے مسلم لیگ کی تنگ نظری، تنگ دلی اور تنگ ظرفی کی وضاحت ہوتی رہتی تھی اور اس سے بلا واسطہ طور پر اسلام کو ماننے والوں کے کردار اور اخلاق پر بھی روشنی پڑتی رہتی تھی۔ سیاستدانوں کی کچھ باتیں بڑی دلچسپ اور ان کے منطقی دلائل اکثر و بیشتر بڑے وزنی ہوتے تھے۔ ہمارا گھر انہی تھا تو مسلم لیگی لیکن ہمارے بھائی دلیور علم سے آراستہ ہونے کے بعد کافی حد تک لبرل ہو گئے تھے لیکن زیور کی یہ خوبی کہ اسے پہن کر آدی گھر کا نہیں رہتا، اسے حادث، اضطراب اور سنگھار کے لیے باہر جانا ہی پڑتا ہے۔ اپنا آپ دکھانا ہی پڑتا ہے اور باہر کے لوگ جبھی درشن کرنے آتے ہیں جب ان کی مہمانی کی جائے، ان کی طرف کی بات کی جائے۔ ان کو تسلیم کیا جائے۔

ولایت آ کر میں اور لبرل ہو گیا تھا اور مجھے تنگ نظری اور بنیاد پرستی کی باتیں بری لگنے لگی تھیں۔ اسلام کے بارے میں جو باتیں آریہ سماجی کرتے تھے اور جو اعتراضات سیتھارتھ پرکاش جیسی کتابوں میں تھے اور جو مذاق خود میرے ہم مذہب اپنے ہم مذہب پر کرتے تھے، ان ساری باتوں میں اب معنی سے پیدا ہو گئے تھے۔ اب یہ بات بار بار میرے منطقی وجود کو گدگدائے لگی تھی کہ میں چونکہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہو گیا تھا، اس لیے مسلمان تھا۔ اگر کسی پارسی یا یہودی کے گھر میں جنم لے لیتا تو وہی ہوتا۔ پھر مذہب کے بارے میں جھگڑا کیسا اور ایک مذہب کے ہو کر رہنے میں فائدہ کس کا! انسانیت سب سے بڑی چیز ہے۔ سارے مذہبوں، تمام مسلکوں، دریاؤں، سمندروں، ستاروں، سیاروں بلکہ کل کائنات سے بڑی اور ارفع چیز انسانیت ہے۔ جب تک اس کو نہ اختیار کیا جائے، مذہب کے ساتھ وابستہ ہونے کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔ فائدہ اس لیے نہیں کہ پردہتوں، پادریوں اور بیروں نے اپنے اپنے فائدے کے لیے مذہب کے بڑے بڑے بت تراش کے رکھے ہیں لیکن اور معصوم لوگوں سے انہیں سجدے کرائے جاتے ہیں۔ چڑھاوے چڑھائے جا رہے ہیں۔ انسانوں کے بلیدان دیئے جا رہے ہیں اور اس کائنات کی سب سے ارفع مخلوق کو کیڑے

کوڑوں سے کتر بنائے چلے جا رہے ہیں۔

جب ایسے خیالات نے میرے ذہن میں جگہ جگہ جالے تن دیئے اور میں نے ایک راج العقیدہ انسان دوسرے کی طرح مذہب انسانیت کو اختیار کر لیا تو میں نے کچھ شب فاضل حاصل کرنے کے لیے سائیں بابا دھرم داس کے ڈیرے پر ایک طویل حاضری دی۔ اتفاق سے اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ مختلف النوع کے پھلوں، کیک کے ڈبوں، چاکلیٹ کے پیکنوں اور میٹھی گولیوں کے رنگین لفافوں سے سائیں مہاراج کے کمرے کا فرش پنا پڑا تھا۔ میں ان کے سامنے ایک کونے میں ہو کر بیٹھ گیا اور بڑی عاجزی سے بولا "مجھے ویدک شکشا دیجئے مہاراج اور اس دھیان کی تہ میں اتاریے جہاں سے گیان پراپت ہوتا ہے۔"

بابا دھرم داس نے بڑے پریم سے میری ساتھ ویدانت کے فلسفے پر گفتگو شروع کی اور جہاں جہاں ان کو مشکل پڑی وہاں انہوں نے انگریزی کا سہارا لے کر اس گھمبیر فلسفے کی تفصیلات فراہم کیں۔ ان کی آسانی کے لیے اور خود میری فہم کے لیے انگریزی زبان بہتر ذریعہ اظہار ثابت ہوئی اور ہم بڑی دیر تک اسی زبان میں بات چیت کرتے رہے۔ مہاراج نے کہا کہ اگر مجھ کو واقعی راہ سلوک اور ایثار پراپتی سے دلچسپی ہے اور میں اس معاملے میں پیچیدہ ہوں تو مجھے اپنی زمین ہموار کرنے کے لیے روحانیت کا بیج وصول کرنے کے لیے اپنے کھیت کو تیار کرنا ہوگا اور جیسا کہ ہر کھیت کی تیاری کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے، اسی طرح مجھے بھی اس پراپتی کے لیے کشت کرنا ہوگا۔

انہوں نے مجھے گاٹری منتر کا اچارن کرنے کے لیے تین دن کی مہلت دی اور کہا اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے کام کرتے فارغ بیٹھتے من ہی من میں اس منتر کا جاپ کرتے جانا ہے اور تین دن بعد لوٹ کر میرے پاس آنا ہے۔ تین دن بعد انہوں نے ایٹور کے مارگ پر چلنے کی خوشخبری دی اور بتایا کہ بدھ کے روز صبح سویرے چار مختلف پھل اور چار مختلف پھول اور چار مختلف اناج ایک ان چھوٹی تھالی میں پروں کر میرے پاس لانا اور گورو مہاراج کو بیس نوا کر ایٹور پراپتی کے راستے پر پہلا قدم رکھ کے اپنا سفر شروع کر دینا۔

پھر انہوں نے مجھے گاٹری منتر لکھوایا جو میں نے ان کے سامنے اردو میں لکھا کہ تلفظ کی غلطی کا اندیشہ کم سے کم رہے۔

سائیں بابا دھرم داس نے کہا "بولو میرے ساتھ.....!"

اوم بھو بھوہ سوت سوی تر ورے نیم بھو گورو تی دھی دھی دھی یو نہ، پر چویات.....!

میں نے ڈرتے ڈرتے اس کا مطلب پوچھا تو انہوں نے فصیح انگریزی میں فرمایا، اس کا مطلب ہے "اللہ تعالیٰ جو کل مخلوقات میں جلوہ گر ہے اور ہر شے میں اس کا روپ ہے۔ وہ پرستش کے لائق ہے..... اس پیدا کنندہ کا نور سب جانوں میں جلوہ گر ہے۔ ہم تیرے بندے تیرے فرمانبردار، ترے عبد خلوص عقیدت سے یقین کرتے ہیں کہ جو ہمارے حواس خمسہ اور دل و عقل میں ان کو اپنی طرف رجوع فرمائے۔"

پھر انہوں نے ایک ایک کا تلفظ بتاتے ہوئے ان کے معنی بتائے کہ اوم کے معنی ہیں اللہ اور بھوہ کہتے ہیں آسمان اول کو، بھوہ دوسرے آسمان کو اور سوہ کے معنی ہیں تیسرا آسمان..... تیرے سوی تیر کا مطلب ہے اس پیدا کنندہ اور

درہم ہوتا ہے ماننے کے لائق۔ بھو گورو دھنی ہے اور دوسری کا مطلب ہے روشن کنندہ۔ دھی دھی یعنی ہم خیال کرتے ہیں اور دھیو ہواں خمسہ اور عقل اور کہتے ہیں اور پرچودیات کا مطلب ہے رجوع کرے۔

میں نے سارے لفظوں کے الگ الگ معنی ان کے نیچے لکھ لیے اور مہاراج کے ساتھ آٹھ دس مرتبہ اس منتر کا جاپ کیا کرواپس گھر آ گیا۔

تین دن اور تین راتیں، اپنی ڈیوٹی کے علاوہ میں ہر وقت گاٹری منتر کا جاپ کرتا رہا۔ آخری رات کہ صبح مجھے بیت کے لیے مہاراج کے پاس جانا تھا، مجھے اچانک خیال آیا کہ اس منتر کا ترجمہ علامہ اقبال نے بھی کیا ہے اور گاٹری کے حضور میں ایک بہت اچھی نظم بانگ درا میں درج کی ہے۔ بانگ درا اس وقت دستیاب نہ تھی اور مجھے اس وقت اس نظم کا صرف مطلع اور ایک ایک شعر یاد آرہا تھا کہ "اے آفتاب روح روان جہاں ہے تو شیرازہ بند و نذر کون و مکان ہے تو۔ اے آفتاب ہم کو نیا شعور دے + چشم خرو کو اپنی جگہ سے نور دے..... اور پھر نہ ابتداء کوئی نہ کوئی انتہا تری..... اس کے بعد کوئی مصرعہ یا کوئی شعر یاد نہیں آ رہا تھا۔ سب کچھ ذہن سے اتر گیا تھا۔ بس ایک بات ابھر کر بار بار سامنے آ رہی تھی کہ حضرت علامہ بھی شاید میری طرح اس منتر کا جاپ کرتے رہے ہوں گے لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہ تھا بس گمان ہی گمان تھا!

بدھ کے روز میں چینی کی ایک خوبصورت نئی پلیٹ میں چار پھل اور ان کے ساتھ چار خوش رنگ پھول اور ایک کونے میں چار قسم کے اناج رکھ کر سائیں مہاراج کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ اپنے کمرے میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ دوپٹہ ساگر می اور دولا پتی قسم کی اگر قبوں سے سارا کمرہ دھواں دھار ہو رہا تھا۔ مہاراج مرگ چھالا پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور اپنے سامنے بیٹھنے کی آگیا دی۔ میں ان کے سامنے دوڑا نو بیٹھ گیا۔

انہوں نے اپنے اپنے دانے شیشے میں جڑی اپنے گورو مہاراج کی ایک تصویر پر ہاتھ رکھ کر اونچے اونچے اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔ میں کچھ منٹ کچھ خود فود، کچھ تجسس دھیمی آواز میں گاٹری منتر کا جاپ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد آپ نے آنکھیں کھول کر میری پلیٹ پر دوپٹہ دان سے دھواں دیا اور ساتھ ساتھ بھاری آواز میں اشلوک پڑھتے گئے۔ پھر انہوں نے اپنے گورو کی تصویر کی آرتی اتاری اور تصویر کا سارا شیشہ دھوئیں کی دیبڑ تہہ کے نیچے ڈوب گیا۔

پھر بابا دھرم داس نے دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "تیرا کلیان ہو بابا۔ جیون مکت ہو اور کرموں کا چکر ہاپت ہو..... گورو مہاراج کو ڈنڈوت کرو۔"

میں نے گورو مہاراج کو جن کے ہونٹ بہت موٹے اور ناک نتھنے دور تک کھلے تھے، ذرا سا ہاتھ اٹھا کر لکھنوی طوائفوں کی طرح سلام کیا۔ سائیں دھرم داس نے سمجھانے کے انداز میں قدرے اونچی آواز میں کہا "ڈنڈوت کرو بابا! ڈنڈوت۔"

میں اللہ کی طرح گوسائیں جی کو دیکھنے لگا!

وہ سمجھ گئے کہ میں ان کا مطلب نہیں سمجھا۔ مسکرا کر بولے "ڈنڈوت" پھر ذرا سے توقف کے بعد انہوں نے زمین پر سجدہ کر کے کہا "ما تھا فیکو بابا تھا..... گورو مہاراج کی مورت کو ماتھا فیکو۔"

میں نے کچھ اس حیرت سے سائیں دھرم داس کی طرف دیکھا کہ میرا سارا وجود پتھر کا بت بن گیا۔

دھرم داس جی بیا کل ہو کر بولے۔ ”جلدی کرو بابا، گورو مہاراج ہی آگیا دیں گے۔ یہی نام دان کریں گے اور انہی کی ہکشا ہوگی۔“

میں نے مکتب کے ایک نوآموز طالب علم کی طرح کہا ”خدا کی ذات کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ پتھر مورتی، تصویر، خنجر شمشیر سب کو سجدہ کرنے کی منائی آئی ہے۔ میں اس تصویر کو سجدہ نہیں کر سکتا۔“

انہوں نے پکار کر کہا ”دیکھو سادھو یہ تو ایک رچوتیل ہے۔ اس میں دین دھرم کے خراب ہونے کا کوئی ڈر تر اس نہیں۔ تصویر کو ماتھا ٹیکنا گورو کے مان اور ست کار کے لیے ہے۔ اس کی پوجا کے لیے نہیں۔“

میں نے کہا ”دھرم داس جی اور جو چاہے کرالو، جیسے من میں آئے مٹا لو لیکن اللہ کے سوا میں کسی اور سجدہ نہیں کر سکتا۔ یہ بات میری کیسٹری نہیں، آئی ایم ویری سوری۔“

میں سوا می جی سے ہاتھ ملائے بغیر اپنی پلیٹ اور پھل پھول انہی کے پاس چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہیں کے پاس ”پیٹرا ڈویل اسیدرا“ کے فوارے پر کسے ہوئے بوٹ اور تنبی ہوئی جرائیں اتار کر شندے پانی سے دھو لیا۔ چھوٹے سے رومال سے چوڑا مندر موٹے بازو پونچھے۔ گیلے پاؤں پر جرائیں چڑھائیں تو اندر بوٹ بھی بھیگ گئے۔ بس پتھر کر گھر آ گیا۔

گھر پہنچ کر تھوڑی دیر تک تو بستر کے کنارے بیٹھا رہا۔ پھر دو تیرو یوولونیکا کو فون کر کے قبلہ کی سمت دریافت کی۔

اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا ”آپ کے پاس قطب نما ہے؟“ میں نے کہا ”ہے۔“

کہنے لگا ”ذرا توجہ سے سمجھ لیجئے۔ اس میں آپ کو تھوڑی سی مشکل ہوگی۔“

لیکن جب اس نے سمجھا تو کوئی بات بھی مشکل نہ لگی۔ کعبہ عین سامنے آ گیا۔ میں نے فرش پر اخبار بچھا کر خدا

کا شکر یہ ادا کیا کہ اے اللہ آج آپ نے مجھ پر بڑی کرپا کی نہیں تو میں تو برہمنی کی ڈھلوان پر پھسل کر آگے ہی نکل گیا تھا!

میرے ننگی ساتھی، بڑے اور لڑکیاں، بزرگ دوست اور استاد، پندرہ کی تعداد میں گوسائیں دھرم داس کے ہاتھ

پرانی شی ایٹ ہوئے۔ ہر ایک کو الگ الگ نام دان ملا اور سب نے پابندی کے ساتھ میڈیٹیشن شروع کر دی۔

جب یہ لوگ آپس میں ملنے تو اپنے اپنے مراقبے کی تفصیلات ایک دوسرے کو بتاتے اور باہم نوٹس ملاتے تو

مجھے بڑا افسوس ہوتا کہ میں ذرا سی بات پر اڑ کر اتنی بڑی نعمت سے محروم ہو گیا اور اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ گیا۔ پھر خیال

آتا کہ جب مجھے اس بات کا حکم ہی نہیں ہے کہ میں کسی اور کو معبود مان کر اس کے آگے سجدہ کروں تو پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا

ہے کہ میں حکم عدولی کر کے امر سے باہر نکل جاؤں۔

دراصل میرے اندر ایک بہت ہی قدیم، بے حد بوڑھا اور ایک اصولی قسم کا بزرگ شخص رہتا تھا۔ یہ بزرگ ایک

بنیاد پرست بوڑھا تھا جس کا پلنگ میرے وجود کی ڈیوڑھی کے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ رکھا تھا۔ یہ بوڑھا بیا بھی تھا

اور عمر رسیدہ بھی لیکن میں نے اسے پلنگ پر لیٹے بہت کم دیکھا تھا۔ دونوں پاؤں زمین پر جما کر اور دونوں ہاتھوں سے پلنگ

کی پٹی منبٹلی سے پکڑ کر پلنگ کے کنارے بیٹھا رہتا۔ جب ہم اس کے قریب سے گزرتے تو وہ سر اٹھا کر بھرپور نظروں سے ہماری طرف دیکھتا اور پوچھتا ”کہاں جا رہے ہو؟“ اسی طرح ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے ہماری واپسی پر کھٹکار کے پوچھتا ”کہاں سے آرہے ہو؟“ گوہم نے کبھی اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور ہمیشہ وہاں سے کئی کاٹ کے گزرتے تھے۔ پھر بھی اس کمزور اور بیمار بوڑھے کا دبدبہ ایسا تھا کہ ہم اس سے آنکھ ملا کے بات نہیں کر سکتے تھے۔ اسے جھٹلا نہیں سکتے تھے۔ اس کے دلائل کا بطلان نہیں کر سکتے تھے۔ یہ اسی بابے بڑھے کا خوف تھا جس نے مجھے گورو مہاراج کی تصویر کے سامنے جھکنے سے روکا اور میری گردن میں اپنے شے گاڑھ کر مجھے سیدھا بٹھا دیا۔

خیر یہ تو ہوا اور میں اس کا شاکہ بھی نہیں تھا۔ جو کچھ گزرا اس پر مطمئن تھا لیکن بابا دھرم داس کی باتیں بھی کمال کی

تھیں۔ اس کے گوروں نے اور ان کے لکتوں نے بڑے پیچیدہ مسائل پر گہری نظر ڈالی تھی اور پاتال میں اتر کر بکالی کا

پول لائے تھے لیکن ساری سسائوں کا جواب تو کسی کے پاس بھی نہیں تھا لیکن ان کی یہ بات کہ انسان کی سیلف اور انسان

کی اصل ہی خوشی اور آئندہ ہے وہ جب گہری نیند میں اپنی ان کی جکڑ بند یوں سے رہائی حاصل کر کے اپنا مظاہرہ کرتی ہے تو

سکون قلب کی شکل جسم انداز میں نظر آنے لگتی ہے۔ ذات اصل ہے اور ایگواس کا کینسر ہے۔ یہ کینسر ذات کے رگ و پے

جس اتر کر اس کو چاٹ چاٹ کے ختم کر دیتا ہے۔ سیلف مٹ جاتا ہے، کینسر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ اس دنیا میں ایک دوسرے

سے ملے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے، ہاتھ ملاتے، منہ چومتے، چھمی ڈالتے، سر جھکاتے، دوزانو ہوتے، نماز گزارتے۔

ذات تو پیچھے رہ جاتی ہے، انات ہی ایک دوسرے مل ملا کر، معاملے کر کے، نیو دے کر، وعدہ کر کے، خوش ہو کر، ناراض رہ کر

اپنی اپنی راہ چلی جاتی ہے۔ اس دنیا میں سب اناؤں کے میلے ہیں۔ ان کی محفل مشاعرہ ہے، ایگو کی لیلیا ہے! ایگو کی کونسلیں

ہیں، ان کی بادشاہتیں اور ایگو کی ڈیموکریسیاں ہیں۔

چپت بھی اس کی ہے، پت بھی اس کی۔ درویشی بھی اسی کی، سلطانی بھی اسی کی۔ ین بھی یہی یا نگ بھی یہی۔ کالج

کے زمانے کا پڑھا ہوا تذکرہ غوثیہ کا ایک قصہ یاد آ گیا جس میں ایک بے لوث آدمی کا ذکر تھا جو لوگوں سے اللہ واسطے کی

حبت کرتا تھا..... فرمایا:

ایک مرتبہ ہم قلندر صاحب کے چلہ میں جا کر ٹھہرے، یہ جگہ بوڑھے کے قریب ہے اور چلہ کا مقام بالکل ویرانے

میں ہے۔ شاہ امیر الدین صاحب بھی وہاں تشریف لائے اور مجھ سے فرمانے لگے کہ میاں جنگل میں رہ کر تم کیا کھاؤ گے اور

کہاں سے کھاؤ گے۔ ہم نے کہا، صاحب جو خدا کھلائے گا، اسی پر راضی رہیں گے اور اس کا شکر ادا کریں گے۔ تھوڑی ہی

دیر بعد ایک شخص آیا اور چاول، مرغی، گھی وغیرہ لایا۔ ہم نے اس سے کہا ”بھائی اگر تو قلندر صاحب کی نذر لایا ہے تو پانی پت

یا کرنال کو لے جا اور اگر زندہ قلندر کے واسطے لایا ہے تو ہمارے سامنے رکھ دے، ہم حاضر ہیں۔“ اس نے کہا ”صاحب میں

تو آپ کے واسطے لایا ہوں کہ پتہ چلا تھا کہ آپ چلہ میں تشریف لائے ہیں۔“

ہم نے اس کا پلاؤ لایا اور مزے سے کھایا۔ پھر تو ہمیشہ یہی کیفیت رہی، چھ مہینے تک ہم وہاں ٹھہرے، ہر روز کچھ

نہ کچھ آتا رہا۔ بڑا اچھا وقت گزرا اور خوب کیفیتیں رہیں۔

ہم نے پوچھا "میاں باجو یہ تو بتلاؤ کہ بھلا تم نے بھی کیسا گری کی ترکیب کسی اور کو سکھائی؟" کہنے لگا "ہاں ایک شخص کو تو میں نے زبردستی سکھائی اور دوسرے نے زبردستی مجھ سے سیکھ لی۔"

ہم نے کہا "ذرا اس اجمال کی تفصیل بیان ہو جائے۔"

باجو کیسا گری کرنے کہا "اس کا حال یوں ہے کہ ایک مرتبہ ہم دو کیسا گری گھر سفر تھے۔ دور دراز کا لہارا سٹے طے کر کے ہم ایک گاؤں میں پہنچے جہاں کا چودھری نہایت نیک بخت اور مخیر آدمی تھا۔ چوپال میں ہم دونوں جا کر اترے تو وہ آیا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی اس کے ساتھ تھی جس کے کانوں میں سونے کے بالے تھے۔ اس نے ہمارا حال پوچھا اور کہا "جب تک آپ کا پی چاہے یہاں ٹھہریں۔ کھانا ہمارے گھر سے آیا کرے گا۔ اس روز اتفاق سے ان کے گھر میں کچھ نہیں تھا۔ اس مرا کر ہم نے اپنی چھوٹی لڑکی کا بالا گروی رکھا اور ہم کو تین دن تک طرح طرح کا کھانا کھلایا۔ خوان خود لے کر آتا اور خالی برتن آپ سمیٹ کر چلا جاتا۔ ہم دونوں کیسا گری کے خلوص اور بے غرضی سے بڑے متاثر ہوئے۔ اس شخص میں تکبر اور انا ہم کو نہ تھی۔ سوتے جاگتے میں ایک جیسا تھا اور ملکیت اور اندوختے سے بالکل بے بہرہ۔ اس کی ذات دھوپ چھاؤں میں ایک سا رہتی۔ نہ وہاں سایہ تھا نہ یہاں۔ ایکٹا کا پریمی تھا وہی نام کو نہ تھی۔"

باجو نے کہا "چوتھے روز جو ہم اس سے رخصت ہوئے تو ایک نیل اکسیر کی اس کے حوالے کی اور اپنے رو برو اس کی تاثیر دکھلا دی کہ تانبہ اس طرح سونے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس نے نیل تو گھما کے کہیں دور ٹیلوں میں پھینک دی اور لہجے کر ہمارے پیچھے دوڑا کہ میں نے تمہاری خدمت بے غرضی اور خلوص نیتی سے راہ اللہ کی تھی، نہ اس طمع کے لیے اور اس کا بھنا پانے کے لیے۔ خدا کی مہمانی سمجھ کر تمہاری سیوا کی اور تم بنیا بن کر اس کا حساب چکانے لگے۔ پھر اس نے ہمارے مارنے کو لاٹھی اٹھائی تو ہم نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور بمشکل اس سے جان چھڑائی۔"

اس نے تو ہمیں خدائی مہمانی سمجھ کر اپنا ہاتھ روک لیا لیکن ہمیں کوس ڈیڑھ کوس کی مسافت طے کرنے کے بعد خیال آیا کہ دیکھو یہ شخص دنیا دار ہو کر اس بے لوث طریق پر ہمارے ساتھ پیش آیا اور ہم نے اس کی مہربانی کا کوئی بدلہ نہ دیا، بہت شرم کی بات ہے، ہمارے پاس ایک کمال کا فن موجود ہے، لعنت ہو ہم پر اگر ہم اس کو کیسا گری سکھا کر نہ جائیں۔"

چنانچہ ہم پھر واپس پلٹے اور اسی چوپال پر آ کر قیام کیا۔ چودھری نے کہا "کیوں پھر مار کھانے کا ارادہ ہے جو دوبارہ اس گاؤں میں آ گئے ہو؟" ہم نے کہا "صاحب! ایسی کوئی بات نہ ہوگی۔ ہم تین روز اور یہاں ٹھہرا چاہتے ہیں، اس کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے۔" چودھری بولا "بہر و چشم! میں دل و جان سے آپ لوگوں کی خدمت کروں گا اور اس خدمت کی خوشی میں لہراتے ہوئے آپ کی سیوا کروں گا لیکن حرف طمع زبان پر لاؤ گے اور مجھے خواہش کے اندھے کوئیں میں گرانے کی کوشش کرو گے تو جان سے مار ڈالوں گا۔"

باجو بولا "میں نے کہا، بھائی طمع کی بات جانے دو۔ اس سے ہم بھر پائے البتہ ایک نماز کو تم کو بتاتے ہیں تو پڑھو گے یا نہیں؟" کہا "ہاں! کیوں نہیں پڑھوں گا۔ نماز کا کوئی مضائقہ نہیں۔"

باجو کیسا گری کرنے کہا "میں نے وہی دو گانہ خضریٰ اس کو بتا دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس نماز کو تین روز تک

ہمارا ایک دوست باجو کیسا گری بھی اکثر وہاں آیا کرتا جس کے ساتھ خوب گپ رہتی۔ باجو کیسا گری کا دستور تھا کہ جب آتا تو مٹھائی شیرنی وغیرہ ضرور لاتا۔ ایک روز ہم نے باجو سے پوچھا کہ یہ جو کیسا گری کا فن ہے یہ تو نے کیسے حاصل کیا؟ اور کس سے حاصل کیا؟ اس نے جواب دیا کہ میری آٹھ یا نو برس کی عمر تھی کہ والدین کا انتقال ہو گیا۔ جو نقد و منقار اس پر ہمارے چچانے قبضہ کر لیا۔ میں ان کی گائے بھینس چراتا جس کے بدلے وہ مجھے دو وقت کی روکھی سوکھی دے دیتے تھے۔ چچی میری مجھ کو بہت مارتی اور تنگ کرتی تھی تاکہ میں نکل جاؤں اور میرا مال و اسباب بے کھٹکے ان کے پاس رہے۔ چنانچہ ایک دن چچی نے مجھ کو بڑی بے دردی سے مارا۔ میں بھینس لے کر جنگل کو چلا اور راہ میں بیٹھ کر رونے لگا۔ اتنے میں ایک گرو اور دو چیلے ان کے میری طرف کو آئے۔ مجھ کو روتا دیکھ کر کھٹکے اور حال پوچھا۔ میں نے اپنا تمام قصہ بیان کیا۔ فرمایا کہ آہ ہمارے ساتھ چل اور یہ گائے بھینس یہیں چھوڑ اور اس گاؤں کو خیر باد کہہ کر اس نئے سفر پر روانہ ہو۔ چنانچہ میں گائے بھینس وہیں چھوڑ کر ان کے ہمراہ ہوا۔

گورو نے میرے ساتھ بڑی محبت اور شفقت کا اظہار فرمایا اور قدم قدم پر میری نگہداری کی۔ گورو کی اس الفت اور محبت کے باعث وہ چیلے میرے جانی دشمن ہو گئے۔ ایک دن گورو جی تو باہر گئے تھے، چیلوں نے اکیلا پا کر مجھے خوب پیٹا۔ میں رو رہا تھا اور سسکیاں لے لے کر آستین سے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا کہ گورو جی آ گئے۔ پوچھا اب کیوں روتا ہے؟ میں نے عرض کیا، سرکار وہاں تو ایک اکیلی چچی دشمن تھیں، یہاں آپ کے دونوں چیلوں نے مل کر مجھے پیٹا ہے اور میری جان کے دشمن ہو گئے ہیں۔ مہربانی فرما کر مجھے رخصت کیجئے۔ اب کہیں اور ہی زندگی کے دن کاٹوں گا۔

یہ بات سن کر گورو جی بولے "خیر! اب تو ارٹھی کا درخت لگائیں گے۔" یہ کہہ کر انہوں نے سورۃ والضحیٰ سے مجھ کو قرآن شریف پڑھانا شروع کیا۔ جب یہ سورتیں حفظ ہو گئیں تو نماز کے ارکان و احکام سمجھائے۔ نماز بھی بخوبی یاد ہو گئی۔ ایک رات گورو جی نے مجھے فرمایا کہ آج دو رکعت نماز اس ترکیب سے پڑھ کر سو رہنا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت خضر علیہ السلام تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے مجھ کو تمام ترکیبیں چاندی بنانے کی تعلیم کیں۔ علی الصبح یہ خواب گورو جی سے عرض کیا تو انہوں نے فرمایا، ٹھیک ہے۔ اب ان ترکیبوں کی آزمائش کر کے مجھے بتلا۔ میں شام تک سب ترکیبوں کا امتحان کرتا رہا۔ جو کی سو پوری اتری، میرے دل کو یقین ہو گیا۔

دوسری شب پھر ان کے فرمانے پر وہی دو گانہ پڑھ کر سو یا تو حضرت خضر علیہ السلام نے سونا بنانے کی ترکیبیں ارشاد فرمائیں۔ دن میں ان کی بھی آزمائش کی تو ان کو سو فیصد درست پایا۔ تیسری رات پھر وہی عمل کیا تو جو ہرات کی صفت تعلیم فرمائی۔ چوتھے روز گورو جی نے مجھے رخصت کر دیا اور وہ چیلے دیکھتے دیکھتے رہ گئے۔

میں چلا تو آیا لیکن تین دن تک یہ حال رہا کہ نہ کھانے کو جی چاہے نہ نیند آئے۔ پھر گورو جی کے پاس گیا اور یہ کیفیت عرض کی تو انہوں نے فرمایا "جامیاں! تو کھلائے گا تو کیا اور بیکس طرح سے چلائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ خود کھایا کر۔" اس دن سے میں خوب کھانے پینے لگا اور دیکھ لیجئے، اب تک مزے کر رہا ہوں۔ نہ کوئی فکر نہ فاقہ۔ نہ رنج و غم نہ درد و الم، بڑی موج میں گزر رہی ہے۔

کیا کے طالب ہیں۔ ہر ایک کا یہی سوال ہے کہ کوئی نسخہ بتلا دو مگر باوجود محبت اور بے تکلفی اور ملاقات کے آپ نے کبھی اس امر کی خواہش نہ کی، اس کا کیا سبب ہے؟

ہم نے کہا ”اچھا! پہلے یہ بتاؤ کہ جو لوگ تم سے پوچھتے ہیں، کیا ان کو تم نے بتایا؟“
کہنے لگا ”نہیں۔“ ہم نے کہا ”پھر ہمیں کیا ہے جو تم سے خواہش کریں اور اس ملاقات میں خلل ڈالیں۔ رہا وہ کہ کیا کا سو ہم کو یونہی حاصل ہے۔ تم ہر روز مٹھائی اور ملائی لے کر آ جاتے ہو اور ہم کھا لیتے ہیں، اس سے زیادہ مزا کیا کا ہم کو درکار نہیں۔“

باجو نے کہا ”ایک روز میں پٹھے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ایک پیر جی کی خدمت میں گیا کہ حضرت مجھے مرید کر لیجئے لیکن انہوں نے مجھے غریب، شکستہ حال، دردمند دیکھ کر مجھے دھتکار دیا۔ اس وقت پیر جی کیسی گری کی دھت میں معروف پھونکا پھاکی کر رہے تھے۔ میں نے ان کی ادویات لے کر اور کچھ اپنے پاس سے ملا کر جھٹ پٹ چاندی بنا کر دکھا دی۔ پھر تو پیر جی لٹو ہو گئے۔ بڑی خاطر و مدارات کی اور کہا کہ ہم تجھ کو دل و جان سے مرید کریں گے۔ بشرطیکہ کیا سکھا دے۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ تین من گود بندروں کا جمع کرادیجئے، پھر عمل شروع ہوگا۔ پیر جی نے مریدوں کو حکم دیا۔ چند روز میں بندروں کا گود جمع ہو گیا۔ میں نے کہا اس کو گھڑوں میں بند کر کے آگے دے دیجئے تاکہ اس کا تیل نکل آئے۔ پھر تیل نکل آئے کچے بعد کی ترکیب بتا کر میں تو چل دیا اور پیر جی نے گود کو آگ دلوادی۔ مارے بدبو کے تمام ہستی کے لوگ چائے اور پیر جی کے گھر پر ایک شور و غل مچا دیا کہ خدا کے لیے پیر جی کیوں تمام ہستی کا ناک میں دم کیا اور آپ کیسے پیر ہیں جو اتنی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ کبھی بندر کے گود سے بھی سونا بنا ہے! خلیف ہوئے اور ہستی چھوڑ کر کسی اور طرف کو نکل گئے۔“

باجو نے کہا ”ہم اس شخص کی شرافت اور بے غرض مہمان نوازی سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ ہر حال میں اس کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ جب اس نے اکسیر لینے سے انکار کیا تو ہم نے اس کو اکسیر سازی کے شمع سے ہی متعارف کرا دیا۔ ہم تو چلے گئے، ہمارے بعد اس نے دو گنا خضریٰ ہماری اشارت کے مطابق پڑھی اور اس سے فیض یاب ہوا۔۔۔۔۔ سال بھر بعد جو ہم واپس آئے تو لوگوں سے معلوم ہوا کہ وہ چودھری دیوانہ ہو گیا اور گاؤں گاؤں بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ بہت جستجو کے بعد ملا تو ہم کو دیکھتے ہی لٹھ لے کر ہمارے پیچھے دوڑا اور کہا کہ خداتم کو عارت کرے۔ تم نے مجھ کو خراب کر دیا۔ میں جو سید دلانے اور دان پن کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا، مجھے طمع کی بانی پر بٹھا دیا اور میں دینے کے بجائے جمع کرنے لگا۔ گھرباں بال بچے سب چھٹ گئے۔ روٹی ٹکڑے کا بھی ٹھکانہ نہ رہا۔ یہ کہہ کر وہ بد نصیب ادھے اور بچے رونے لگا اور کہا کہ خداتم کو بھی اس مصیبت میں نہ ڈالے۔ نہ دینار ہی نہ دین، سب عارت ہو گیا۔ تمام جہان اپنی جان کا دشمن معلوم ہوتا ہے۔“
ہم نے کہا ”اچھا میاں باجو تو ہوئی اس شخص کی داستان جس کو مال و منال سے جلی طور پر کوئی علاقہ نہ تھا اور تم نے زبردستی اس کو دھن دولت سے باندھ کر کیا گری کی توپ سے آڑا دیا۔ اب یہ بتاؤ کہ جس نے زبردستی تم سے فیض سیکھا اور زور بازو سے یہ راز لے اڑے، وہ کون لوگ تھے؟“

باجو نے کہا ”ایک مرتبہ ہم ضلع سہارنپور کے ایک گاؤں میں مقیم تھے تو وہاں کے ایک جولاہے نے ہماری بڑی خدمت کی۔ یہاں تک کہ اپنا تمام مال و اسباب بیچ کر ہم کو کھلا دیا۔ جب وہ بالکل قلاش ہو گیا تو اس نے ایک روز کیا کام کیا کہ قد آدم گڑھا گھر کے اندر رکھو اور اس پر ایک بور یا اور بور یا پر سفید چادر بچھا دی اور اپنی بیوی کو سمجھا دیا کہ خالی دیکھیوں میں چمچا ہلاتی رہنا تاکہ معلوم ہو کہ کھانا کتنی قسم کا پکتا ہے اور ضیافت کا اہتمام جاری ہے۔ پھر وہ جولاہا ہم کو بلا کر لے گیا کہ چلیے آپ کی دعوت ہے۔ ہم کو تو اچھے کھانوں کی چاٹ لگی ہوئی تھی، جھٹ چلے گئے۔ پہلے تو ہم اور وہ ایک چار پائی پر بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور وہ اپنی بیوی کو تاکید کرتا رہا کہ جلدی پلاؤ اور زردہ پکا کر لا ہم کب سے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔ وہاں کیا خاک دھرا تھا جو وہ لاتی۔ یوں ہی جھوٹ موٹ دیکھنی کھڑکا دیتی تھی۔ اس انتظار میں آدمی رات ہو گئی۔ اس وقت ہمارے میزبان نے کہا ”آؤ کھانا تیار ہے۔“

”ہم بخوش اٹھے اور سفید چادر پر قدم رکھا کہ اب ترنوالے کھائیں گے لیکن اس پر بیٹھنا تھا کہ دم سے گڑھے کے اندر! میں تو گرا اور میرے گرتے ہی وہ دونوں میاں بیوی لٹھ لے کر میرے سر پر آچڑھے اور دھڑا دھڑا مارنے لگے اور بولے کہ آج اسی گڑھے میں تم کو مار کر دبا دیں گے اور اوپر پانی چھینٹا لگا کے چار پائی ڈال کے بیٹھ جائیں گے کہ کسی کو خبر تک نہ ہو۔۔۔۔۔ ناچار اس جولاہے کو چاندی کا ایک نسخہ بتلانا پڑا۔ اس نے دو چار دفعہ اسی دم آڑا لیا اور اس کی بیوی لٹھ لے کر میرے اوپر پہرادی رہی۔ جب بے کار دھاتوں سے کھٹا کھٹ چاندی بننے لگی تو اس نے رہائی دی۔ پھر پاؤں میں گر پڑا اور رو کر قصور معاف کرایا۔ اس دن سے میں نے توبہ کی کہ کسی کی دعوت نہیں کھاؤں گا۔“

ایک روز اسی باجو کیسیا کرنے ہم سے دریافت کیا کہ ”میاں صاحب سیکڑوں آدمی میرے پیچھے پھرتے ہیں اور

نہروں سے انہیں دیکھنے لگے۔

پروفیسر انگار جی نے کہا ”ہمارا خیال تھا کہ ہمارے گھر میں چوہے ہیں، رات کے وقت کچھ کھڑکھڑاہٹ ہوئی تھی تو میری بیوی کو شک ہو گیا تھا کہ ہمارے گھر میں چوہوں کا کوئی گھرانہ آباد ہے۔ میں اس کی یہ بات تسلیم نہیں کرتا تھا لیکن وہ جی جی۔ اس کی ٹیبلٹی نے اسے ایک چوہے دان لا کر دیا جسے میں نے دھو دھا کر، سکھا کر اور اس کے اندر پنیر کا ایک ٹکڑا لگا کر اندر کے کمرے میں رکھ دیا۔“

”پھر سرا پکڑا کوئی چوہہ“ پروفیسر فیرا کوٹی نے پوچھا۔

”ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔۔۔۔۔ ابھی نہیں۔“ ماسٹر انگار جی نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا ”ابھی تو بڑی دیر ہے۔“

چوہا کوئی اتنی جلدی تھوڑی پکڑا جاتا ہے۔“

پھر وہ کچھ سوچنے لگا اور خاموش ہو گئے۔ انہیں سوچ میں ڈوب کر کچھ بھی ساکت و صامت اسی طرح بیٹھ رہے۔ پھر انہوں نے سر ہلایا۔ ہلکی سی ”ہونہہ“ کی اور مسکرا کر بولے۔ ”میں اب ان کا مجیدی ہو گیا ہوں۔ واقعی ہمارے گھر میں ہیں اور ان کا پورا ایک گھرانہ آباد ہے۔۔۔۔۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین پکڑے۔“

”تینوں کو مار دیا کہ باہر لے جا کر چھوڑ دیا؟“ ہم میں سے کسی نے پوچھا۔

”نہ مارا“ ماسٹر انگار جی نے کہا ”نہ باہر لے جا کر چھوڑا۔ چوہے دان کا دروازہ کھول کر انہیں واپس اپنے بیلوں میں جانے دیا۔ بڑی خوشی سے چھلانگیں مارتے بھاگ گئے۔ اب میرے دوست بن گئے ہیں۔“

مجھے یہ یاد آئی کچھ دیوانہ سا معلوم ہوا!

پروفیسر انگار جی نے کہا ”انسان اور چوہے بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور بہت ہی قریب ہو کر ملتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ دونوں ہی ہم خورد ہوتے ہیں۔ اناج کھاتے ہیں، پھل کھاتے ہیں، گوشت کھاتے ہیں، بھڑی کھاتے ہیں، مغز اٹھاتے ہیں۔ مچھلی کھاتے ہیں۔۔۔۔۔ اور اگر کچھ نہ ملے تو ایک دوسرے کو کھا جاتے ہیں۔“

ہم سب نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں ان کی بات کی داد دی۔

”مجھے بتایا گیا ہے۔۔۔۔۔“ پروفیسر انگار جی بولے ”کہ دونوں پر تقریباً ایک جیسی بیماریاں حملہ آور ہوتی ہیں کیونکہ دونوں کا اعصابی نظام اور نظام ہضم بالکل ایک جیسا ہے۔“

پھر انہوں نے کہا ”انسان اور چوہے سخت سے سخت موسم میں زندگی گزار سکتے ہیں۔ بخیر خدائے الٰہی میں بھی زندہ رہ سکتے ہیں اور صحرائے کالا باری میں بھی۔ دوسرے جاندار ہر موسم میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ ان کو ایک مناسب ماحول اور متعلق آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔“

پھر استاد انگار جی بے اشتہ اور ہستے ہوئے بولے ”میں نے اپنے گھریلو چوہوں کا مشاہدہ کیا ہے، وہ بھی ہماری طرح مہنتی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جب میں اپنا باجہ بجاتا ہوں تو کسی کی پسندیدہ دھن پر وہ دانت بجاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی پیوٹیاں مار کر خوش ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ میرا مشاہدہ ہے کہ چوہے بھی انسانوں کی طرح خوشیاں مناتے ہیں، قلابازیاں

(9)

پروفیسر انگار جی روم یونیورسٹی کے پروفیسر ایمبریش تھے اور اپنی مرضی سے یونیورسٹی تشریف لاتے تھے۔ وہ اٹلی کے ملک الشعراء تھے اور ان کی شاعری اور شرافت کی سارے ملک میں دھوم تھی۔ بڑے ملنسار، مرنجیاں مرنج، پرانی وضع کے انسان تھے اور پروفیسر باؤسانی سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ میں نے ان کا نام سن رکھا تھا لیکن ان کو جانتا نہیں تھا۔ ایک روز ایک بڑی عمر کا بھکاری پاؤں میں بغیر قسموں کے فلیٹ بوٹ پہنے، ہاتھ میں جوت کا تھیلا لٹکائے، سر پر ایک میلی کچلی بیری اوڑھے شاف روم کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس وقت کوئی دس بارہ پروفیسر شاف روم میں موجود ہوں گے۔ سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ صرف میں نے اس منگتے کو دروازے کی طرف آتے دیکھا تو حیران رہ گیا کہ اسے یونیورسٹی کے گیٹ کے اندر داخل ہونے کی اجازت کس نے دی! اور اگر وہ کسی طرح سے اندر داخل ہو ہی گیا تھا تو اسے لڑکے لڑکیوں نے آگے کیوں بڑھنے دیا۔

جونہی وہ فقیر دروازے پر پڑ کے بغیر اور کسی سے پوچھے بنا اندر شاف روم میں داخل ہوا تو سارے پروفیسر بڑبڑا کر اٹھے اور اپنی اپنی کرسیاں چھوڑ کر سرو قد ایستادہ ہو گئے۔ کسی نے ”بن جو رنو پروفیسورے۔“ کسی نے ”بن جو رنو ماسٹر“ کسی نے اگر بیکو کہا اور وہ شخص ہاتھ ہلاتا، ہکلاتا سارے مسلمانوں کا جواب دیتا دیتا ایک قریبی کرسی پر بیٹھ گیا۔

میرے چہرے پر حیرانی اور سراسیمگی کے آثار دیکھ کر پروفیسر گرگانوں نے کہا ”یہ ماسٹر وانگر جی ہیں۔ اٹلی کے ملک الشعراء۔ ہم سب کے استاد، سب کے سینئر۔“

میں نے ہاتھ اٹھا کر اور ہلکا سا سر ہلا کر انہیں سلام کیا لیکن انہوں نے میری طرف دیکھا نہیں۔ اس وقت وہ کرسی پر بیٹھ رہے تھے۔

جب ہم سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اور انہوں نے بھڑی کا تھیلا جس میں سے پالک کے پتے اور چھندر کے گہرے ارغوانی و فیصل باہر نکلے پڑے تھے، اپنی کرسی کی ٹانگ کے ساتھ کھڑا کر لیا تو حاضرین توجہ بھری

لگاتے ہیں اور موج میلہ کرتے ہیں۔

”لیکن ایک بات ہے۔۔۔۔۔“ انہوں نے انگلی اٹھا کر کہا ”چوہے ایک معاملے میں انسان سے افضل ہیں کہ نسل کشی میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ مجھے پیرس کے ایک ماہر حیوانات نے بتایا تھا کہ اگر چوہوں کا ایک جوڑا باقاعدہ سے بچے پیدا کرتا رہے اور چوہے اور چوہیاں میں کوئی ذہنی، بدنی، معاشی یا جنسی اختلاف پیدا نہ ہو اور ان کے سیاسی حالات ٹھیک رہیں اور ان کے درمیان کوئی اور چوہیا نہ آجائے تو ایک جوڑا پانچ سال کی مدت میں نسل در نسل بارہ بار کر کے نوکرب چالیس ارب چھتیس کروڑ ننانوے لاکھ اہتر ہزار ایک سو بائیس بچے پیدا کر سکتا ہے۔“

ہم سب نے ذوالوجی کے پروفیسر رینالڈ کی طرف دیکھا جو زیر لب مسکرا رہے تھے اور اس بات کے معقول نظر آ رہے تھے کہ اگر ایک جوڑے کے خاندان کے جلد جلد شادیاں ہوتی جائیں تو واقعی ان کی نسل کی تعداد تقریباً ہی قدر ہو جائے گی۔

”اور ایک اور معاملے میں بھی چوہا انسان سے برتر ہے۔“ استاد نے وثوق سے کہا ”اور وہ یہ کہ اس نے اپنی ذات کی قربانی دے کر ہی کمال کے علاج اور غضب کی دوائیں دریافت کر کے دی ہیں اور انسانوں کے وجود پر اپنی زندگیاں قربان کر دی ہیں۔“

”اب فرق صرف یہ ہے“ انہوں نے کہا ”کہ چوہا صرف کھانا چیتا ہے اور بچے پیدا کرتا ہے اور ساری زندگی بلا سے کئی کئی گز اکر گزارتا ہے۔ اس کو شاعری، مصوری، فلسفے یا فلکیات فزکس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اپنے تنگ و تاریک بلوں میں، اینٹوں کے انبار کے درمیان اور ٹنکوں کے پیچھے اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے۔ کسی چوہے نے نہ تو دانے کا کام سنا ہے اور نہ ہی مائیکل اینجیلو کی تصویریں دیکھی ہیں۔ نہ آئن سٹائن کی تصویر پر کبھی مباحثہ کیا ہے۔۔۔۔۔ سیدھی بات یہ ہے کہ چوہے کی کوئی روحانی یا فکری زندگی نہیں ہوتی۔“

”پھر اس ساری دنیا میں آج تک کوئی چوہا ایسا پیدا نہیں ہوا جس کو کوئی اخلاقی پرابلم رہی ہو۔“

سارے شاف روم پر سکوت طاری تھا اور ہم بڑے غور سے استاد کرم ماسٹر انگاریتی کی بات سن رہے تھے۔

انہوں نے کہا ”آج تک کسی چوہے کو یہ سوچنا نہیں پڑا کہ وہ ایک غرض مند دنیا دار ہو کر رہے یا ایک صوفی کی طرح زندگی گزارے۔۔۔۔۔ اس کے مقابلے میں انسان کو ہزار اہمجن میں لاکھوں Conflicts ہیں اور وہ ان کے درمیان اختیاری اور بے اختیاری کی لہروں میں الجھتا گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ انسان صرف اس صورت میں انسان ہے کہ وہ اپنی جہتوں کے منہ میں لگام دے کر پوری مضبوطی کے ساتھ راسخ سنبال کر زندگی کے راہوار کو اڑائے چلا جائے۔ انسانیت یہی ہے کہ انسان ان جہتوں پر جنہیں وہ دوسرے جانداروں کے ساتھ Share کرتا ہے، قابو پا کر انہیں اپنی مرضی کے مطابق عمل میں لائے۔ انسان میں اور چوہے میں یہی نمایاں فرق ہے کہ وہ چوہے کی طرح اپنی جبلت کو اپنا قائد مان کر اس کے حکم اور اشاروں پر نہیں چلتا۔۔۔۔۔ لیکن اپنی جہتوں کی راہیں اپنے ہاتھوں میں سہار کر زندگی بسر کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ ایک بڑا مسئلہ ہے بلکہ بہت ہی بڑا مسئلہ ہے جس کے ساتھ ہمارے دوسرے چھوٹے چھوٹے بے شمار مسئلے بندھے ہیں۔ یہ چھوٹے

چھوٹے مسئلے انفرادی طور پر اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس بڑے مسئلے کا کوئی حل نہیں ڈھونڈا جاتا۔“

”اور یہ بھی سرا“ ہم میں سے ایک بولا کہ ”کوئی آگے بڑھ کر ہمارا یہ مسئلہ حل کر دے گا اور ہمارا رہنما بن کر مسندِ نبی کے ساتھ کھڑا ہو جائے گا اور ہم اس کی ہر بات کو اسی طرح سے تسلیم کرنے لگیں گے جس طرح سے چوہا اپنی جبلت کو دل و جان سے مانتا ہے۔“

”کچھ یوں لگتا ہے۔“ پروفیسر انگاریتی نے کہا ”کہ ہمارے اوپر کبھی بھی وہ وقت نہیں آئے گا جب ہم اخلاقی مسائل سے عہدہ برا ہو جائیں گے اور انسان اپنے اندرونی خلفشار سے نکل کر آرام اور اطمینان کے سنگھاسن پر بیٹھ جائے گا۔۔۔۔۔ بس یہی فرق ہے جو ہمارے اور چوہے کے اندر موجود ہے۔ چوہا مزے میں ہے اور ہم ہر لمحہ بے چینی اور Stress میں گزار رہے ہیں لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی چوہے کے ساتھ اپنی زندگی بدلنے کا خواہش مند نہیں۔“

”اور یہ بات ایسی ہے۔۔۔۔۔“ انہوں نے ذرا ٹک کر کہا ”جسے کوئی چوہا آج تک سمجھ نہیں سکا! اور یہی وجہ ہے جس کی بنا پر چوہا، چوہا ہے!!“

پھر وہ جلدی سے اٹھے۔ اپنا سبزی کا تھیلا اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے شاف روم سے باہر نکل گئے کہ ”اس وقت تک میرے چوہے دان میں ضرور کوئی چوہا لگ گیا ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میری بیوی پڑوسیوں کا لڑکا بلوا کر اسے مرواندے۔ میں ان میں سے ایک ایک کو پہچانتا ہوں، کبھی میرے دوست ہیں۔“

میں نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے انہیں دور تک دیکھا۔ وہ آنے والے قدموں کے مقابلے میں جانے والے قدم زیادہ تیزی سے اٹھا کر جا رہے تھے اور لڑکے لڑکیاں، پروفیسر، مالی، چڑاسی، ہرکارے اور چوکیدار رک رک کر اور جھک جھک کر انہیں سلام کر رہے تھے۔

پروفیسر باؤسانی نے مجھے بتایا کہ استاد کرم پروفیسر انگاریتی تسکایا کے ایک کسان گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے والد تلاش معاش کے سلسلے میں اپنا پیارا لٹلی چھوڑ کر مصر میں آباد ہو گئے تھے۔ اسکندریہ کے قریب ایک قصبے میں ان کی بیکری تھی اور اچھی گزراوقات ہو رہی تھی۔ پروفیسر انگاریتی 1888ء میں اسی قصبے، اسی علاقے اور اسی لسانی ماحول میں پیدا ہوئے اور اپنی جوانی کے آغاز تک کا زمانہ اسی جگہ گزار دیا۔ چوبیس برس کی عمر میں یہ اطالوی نوجوان مصر چھوڑ کر پیرس چلا آیا اور پیرس جاتے ہوئے اس نے پہلی مرتبہ اپنے پرکھوں کے وطن اطالیہ کو دیکھا۔

”پہلی جنگ عظیم کی ابتداء ہوئی تو میں میلان میں تھا۔“ یہ کہہ کر استاد ذی کرمی انگاریتی نے غور سے میری طرف دیکھا اور انگلی سے میرے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ”تم عربی جانتے ہو؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا تو انہوں نے حیران ہو کر پوچھا ”پھر تم قرآن کس طرح سے سمجھتے ہو؟“

میں نے کہا ”یا شیخ! ہم قرآن سمجھتے نہیں، قرآن پڑھتے ہیں۔ قرآن کا متن ہمیں بچپن میں پڑھا دیا جاتا ہے۔ سکھا دیا جاتا ہے۔۔۔۔۔ رٹا دیا جاتا ہے اور پھر ساری زندگی ہم مختلف موقعوں پر اور زندگی کے مختلف مراحل میں قرآن کی

ملاوت کرتے رہتے ہیں۔“

کہنے لگے ”میں چونکہ مصر میں پیدا ہوا تھا، اس لیے میری مٹی اور محاشرتی زبان عربی تھی۔ مگر پرہم اطالوی بولتے تھے اور سکول میں ہمیں فرانسیسی پڑھائی جاتی تھی۔ کچھ مدرسے انگریزی کے بھی تھے لیکن میرے والد نے مجھے انگریزی پڑھانا پسند نہ کیا۔ فرانسیسی مدرسے میں داخل کروادیا۔“ پھر ذرا ساڑک کروائیں کر بولے ”میں نے اپنی شاعری کی ابتدا عربی میں کی تھی۔ ایک تو میں فر فر عربی بولتا تھا، دوسرے مجھے اس کا رسم الخط بہت پسند تھا اور تیسری بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمارا بیکری سے ایک لڑکی ذیل روٹی، پاستا اور پائے لینے آئی تھی اور وہ بہت ہی خوبصورت تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بے بسی باتیں تو ضرور کرتے تھے پر میں اس کی تحلیل و تعظیم کے واسطے گفتگو سے بڑھ کر کوئی کام کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے حسن کی شان میں قصیدے لکھنے شروع کر دیے اور اپنے آپ کو ایک مایہ ناز شاعر سمجھنے لگا۔“

”اور اس پر.....“ میں نے بے صبری سے پوچھا۔ ”اس حسینہ نازنین اور ناظورہ و فخریہ پر آپ کی شاعری کا اثر ہوا؟“

”اسے میں نے کبھی اپنی نظمیں دکھائی ہی نہیں۔“

”کیا؟“ میں نے چیخ کر پوچھا۔ ”قصیدہ لکھ کر اسے ممدوح کو سنایا ہی نہیں؟“

”جی آواز میں بولے“ نہیں..... میں نے مناسب نہیں سمجھا..... دراصل میں شروع ہی سے اس طرح کا تھا۔ جذباتی، جھینپو، امن پسند اور شرمسار زمانہ نوجوان! مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ اظہار محبت کر کے محبوب کی شان میں گستاخی کروں اور اس کا رتبہ گھٹاؤں۔“

”اس نے بھی آپ کی محبت کو محسوس کیا یا نہیں۔“ میں نے بے تابانی سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے ضرور کیا ہوگا۔“ انہوں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا..... ایک بہت باوقار لڑکی تھی۔ مصری نہیں تھی لیکن میری طرح وہ بھی مصر میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا خاندان ایران سے آکر اسکندریہ آباد ہو گیا تھا۔ پھر اس کے باپ نے کاروبار شروع کر دیا تو اپنے گھر والوں کو ہمارے قصبے میں بھیج دیا۔ اس کا نام ار جند تھا۔ آنکھیں گہری نیلی، بال کالے سیاہ اور رنگ گورا، میں اس سے ملنے کے بعد احساس کمتری کا مریض ہو گیا اور میں کم ہی گھر سے باہر نکلتا تھا۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے خوف سا لگا رہتا تھا کہ اچانک وہ راستے میں نہل جائے۔“

”صرف اس خوف کے مارے آپ گھر میں چھپے رہتے تھے؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”نہیں!“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اس کے فراق کا دکھ بھی ایسا جان لیوا تھا کہ مجھ میں ہلنے چلنے کی اور باہر نکلنے کی طاقت ہی باقی نہ رہی تھی۔“

یہ پروفیسر انگاریتی سے میری دوسری ملاقات تھی۔

میں شاف روم میں اکیلا بیٹھا تھا۔ وہ حسب معمول آکر دروازے پر کھڑے ہو گئے، ادھر ادھر دیکھا۔ واپس جانے لگے تو میں نے اٹھ کر سلام کیا۔ دھیمے دھیمے قدم اٹھاتے میرے پاس آکر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہم دنیا جہاں کی باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے بارے میں بتایا، میری بابت پوچھا۔ پھر پاکستان کے اور پاکستان کی ادبی زندگی کے بارے میں سوال کرتے رہے اور آخر میں پھر کبھی تفصیلی ملاقات کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

اس پہلی ملاقات میں انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کی تعلیم واجبی سی ہے اور وہ سکول کے درمیانی درجوں سے آئے نہیں بڑھ سکے۔ 1915ء میں جب اطالیہ بھی پہلی جنگ عظیم میں شریک ہوا تو انگاریتی بھی ایک سپاہی کے طور پر فوج میں بھرتی ہو کر محاذ جنگ پر پہنچ گئے۔ محاذ کی اگلی صفوں میں گولہ باری کے درمیان وہ کئی مرتبہ مرے اور کئی مرتبہ جئے۔ یہ مرنے جینے کا تجربہ ان کی زندگی کا ایک انوکھا تجربہ تھا جس نے ان سے آدھی زندگی لے لی تھی اور آدھی موت دے دی تھی۔ انگاریتی کی شاعری کی ابتداء گولہ باری کے دوران انہی خندقوں میں ہوئی اور اس نے اپنی شاعری کا پہلا مجموعہ یہیں رچ کیا جو بعد میں ALLEGRIA کے نام سے شائع ہوا۔

کہتے تھے 1920ء میں میں نے شادی کر لی اور اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کی خاطر میں اس کے شہر روم میں آباد ہو گیا اور روم میں مجھے تم سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ تم جو مشرق کے رہنے والے ہو، اور میں جو یورپ کا ایک باشندہ ہوں اور میری پیدائش پاکستان اور اطالیہ کے درمیان اسکندریہ میں ہوئی تو پھر میں کون ہوں اور میرا تمہارا کیا رشتہ ہے..... وقت اور زمان کے بارے میں ان کے نظریات بہت ہی عجیب تھے۔ ان میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ صاحب وقت تبدیل نہیں ہوتا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ چلتا جاتا ہے۔ جس طرح تیز رفتار گاڑی کے ساتھ وقت اور مسافت کو قطع کرتے ہوئے سواری ہی رہتا ہے۔ اسی طرح وقت سے گزرنے والا انسان اپنی شکل و صورت اور وقت پر قائم رہتا ہے۔ جتنی اس میں تبدیلی رونما ہوتی ہے، اسی قدر وقت بھی عمر میں بڑھ جاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ عمر کے آخری حصے میں محمد حسین آزاد کی سوچ میں بھی ایسی ہی کوک بھگتی تھی لیکن وہ چونکہ بنیادی طور پر شاعر نہیں تھے، اس لیے ان کی فکر سپاک و فنا کے پھمیل بھوسے میں پھنس گئی اور انگاریتی اپنے عہد کے ایک عظیم شاعر کے طور پر ابھرے۔ شاعر چونکہ فلسفی یا ریاضی دان نہیں ہوتا، اس لیے اپنی شاعری میں خط کشیدہ الفاظ بھی چھوڑے جاتا ہے اور خالی جگہوں کو پُر کرنے کا حکم بھی لگاتا جاتا ہے۔ شاعری کو علم و ادب کی سرکاری سرپرستی حاصل ہے اور بیوز کی پچھتر چھاپا میں بلا خوف و خطر کامیابی سے آگے بڑھتی ہے۔ نثر کے لیے ایسا کوئی اہتمام نہیں!

میں ماسٹر و انگاریتی کی شاعری کے مقابلے میں ان کی ذات سے زیادہ متاثر تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو استاد مکرم کے لیے نوبل پرائز کے طلبگار تھے۔ انگاریتی شاید واقعی اپنے عہد کے بہت بڑے شاعر تھے لیکن اطالوی ہونے کے ناطے ان کی انٹرنیشنل پی آر نہ ہونے کے برابر تھی۔ نوبل پرائز حاصل کرنے کے لیے چونکہ بڑے وسیعہ اور طاقتور پی آر کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے ایل ماسٹر و دونوں مرتبہ نوبل پرائز پانے سے رہ گئے۔

اس سلسلے میں جرمنی اور فرانس کے ادبی حلقوں میں ان کی کچھ مٹی بھی ہوئی لیکن ماسٹر ورنے اس کی کوئی خاص پروا نہ کی۔ لیکن جس طرح مربوط انداز میں بات کرتے کرتے ان کے خیال کی توپ رجبک چاٹ جاتی تھی اور اس میں ایک عجیب طرح کی جگہ رونما ہوتی تھی تو میں اس روشنی کا بڑا دیوانہ تھا۔ باؤسانی نے مجھے بتایا کہ 39ء میں ان کا نوکر اکلوتا پینا اپنڈکس کے غلط آپریشن کی وجہ سے فوت ہو گیا تھا۔ پروفیسر صاحب اپنے مردہ بچے کو سینے سے لگا کر ہسپتال سے پیدل گھر آئے تھے اور کسی کو اسے دفن کرنے نہیں دیتے تھے۔ اس روز سے ان کی شاعری نے تو لا معلوم نئی جہتوں کی نشاندہی شروع کر دی لیکن ان کی گفتگو میں کبھی کبھی ایک پہرہ ایک طرف کی کھینچ مارنے لگا اور یہی کھینچ ان کی ذات کے نور جمال کا سہل بن گئی۔

ایک روز جب میں نے بابا دھرم داس سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا اور ان سے انی شی ایٹ ہونے کی خواہش کا قصہ بیان کیا تو وہ میری بات سن کر بہت حیران ہوئے۔ اول تو ان کا خیال تھا کہ میں اس عمر میں یقیناً کسی سے نیہیت ہو جاؤں گا اور میں نے باطن کے سفر کا آغاز کر دیا ہوگا۔ دوم یہ کہ اگر اب تک کوئی راستہ نہیں پکڑا تو پھر کوئی نیا راستہ کیوں؟ وہ اپنے بزرگوں کا اور اپنے پرکھوں کا پرانا راستہ ہے، اس کو کیوں نہ تلاش کیا جائے۔ کوئی دور تو نہیں ہوگا، ایسا پوشیدہ بھی نہیں ہوگا۔ ذرا سا جھانچ کر دور کر کے صاف نظر آنے لگے گا۔ بالکل سامنے!

ایک روز جب ماسٹر ورنے مجھے اپنے گھر آنے کی اجازت دی تو متعلق اور مناسب ماحول ہونے کی بنا پر میں نے ان سے انسان کی اصل ذات اور انسان کے بنیادی جوہر کی بابت پوچھا کہ یہ سیلف کیا چیز ہے؟ اس کا تذکرہ بابا دھرم داس بہت کرتے تھے لیکن ہمیں یہ چیز اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

پروفیسر انگار جی نے کہا ”مجھے بھی یہ بات اپنے محبوب بیٹے کے مر جانے کے بعد سمجھ میں آئی ہے۔ اس کے لیے یا تو بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے یا کوئی بہت قیمتی قربانی دینی پڑتی ہے لیکن قربانی والا سودا بڑا مہنگا ہے کہ قربانی کے ساتھ ساتھ قربانی دینے والے کا بھی ایک بڑا حصہ سمیٹ چڑھ جاتا ہے۔“

”بہت سال پہلے کی بات ہے۔“ انہوں نے کہا ”میں اس وقت فرانس میں تھا۔ جب یورپ کے کچھ ماہرین نفسیات، انسانیات، اقتصادیات اور معاشریات نے مل کر یہ سوچنا شروع کیا کہ انسان اصل میں ہے کیا؟ کیا جنگ و جدال، نفرت و خصومت، بربادی اور راہزنی، قتل و غارت اس کی فطرت میں شامل ہے اور یہ چیزیں وہ اپنے خونی درے کے طور پر لے کر پیدا ہوتا ہے یا اتنا بہت کچھ وہ بعد میں سیکھتا ہے۔ اس دلچسپ سوال کا دائرہ وسیع ہو کر ساری دنیا پر پھیل گیا اور ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، فلسفیوں نے اس موضوع پر لمبے چوڑے مضمون لکھے لیکن وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ ایک عرب فقیہ نے بھی، جو اس وقت بیڑس میں قیام پذیر تھا، اس سلسلے میں ایک طویل مقالہ لکھا جس کا لب لباب تھا کہ انسان فطری طور پر اسلام پر پیدا ہوتا ہے اور اس کی ذات، سلامتی اور سکون کا استخراج ہوتی ہے۔ میں نے تو ان کے اس مقالے کو بے حد پسند کیا لیکن باقی سب دانشوروں اور محققوں نے اس کا بے طرح مذاق اڑایا۔ اگر انہوں نے اپنے مضمون میں ”اسلام“ کا لفظ استعمال نہ کیا ہوتا تو سب نے بڑی توجہ سے یہ مقالہ پڑھنا تھا اور اس کی بنیاد پر بات آگے کی تحقیق میں

داخل ہو جاتی لیکن ایسا نہ ہوا اور ان کی بات صد الصبح اہو کر ریگزاروں کے حوالے ہو گئی۔“

”بڑی دیر تک یہ بات اخباروں، رسالوں اور لیکچروں کے درمیان گھومتی رہی۔ آخر ایک انجمن نے فیصلہ کیا کہ اس پر ایک سیمینار ہونا چاہیے تاکہ ماہرین اور فاضلین دو بدو ایک دوسرے سے بات کر سکیں۔ برسلز کے مقام پر ایک بہت بڑا اجتماع ہوا جس میں دنیا بھر کے ادیبوں، فلسفیوں، نفسیات دانوں، علم حیاتیات کے ماہروں اور مذہبی رہنماؤں نے شرکت کی۔“

”آپ بھی اس سیمینار میں شریک ہوئے؟“ میں نے پوچھا۔

پروفیسر انگار جی نے کہا ”میں اس سیمینار میں شرکت تو نہیں کر سکا البتہ اس کی روزمرہ کارروائی سے بڑی باقاعدگی کے ساتھ مستفید ہوتا رہا۔ میرے پاس اب بھی اس کی پوری روئیداموجود ہے اور شرکاء مذاکرہ کا متفقہ فیصلہ بھی میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔“

میں اس متفقہ فیصلے کی تفصیل جاننے کے لیے بے چین ہوا تو ماسٹر ورنے فرمایا کہ مذاکرہ میں پہلے دن طویل گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ پروان چڑھے عاقل و بالغ انسان کے بجائے اس کی کنہ اور اس کے Bud کا مطالعہ اور معائنہ کیا جائے کہ اس کی سرشت کیا ہوتی ہے اور اس میں جنلی طور پر کیا رنگ بھرا ہوتا ہے اور اس کی فطری نفسیات کیا ہوتی ہے۔ چنانچہ اس سیمینار کے دوران اسی مقام پر مختلف رنگ و نسل، مختلف شاہت اور مختلف صحت اور قومیت کے اسی بچے جمع کیے گئے۔ ان میں کچھ شیرخوار بچے تھے، کچھ گھٹنوں چلتے تھے، کسی نے کھڑے ہونا سیکھ لیا تھا اور چند ایک بالکل نو مولود تھے۔

شرکاء مذاکرہ نے ڈاکٹروں، نرسوں، فلسفیوں اور نفسیات دانوں کی موجودگی میں ان بچوں کا بغور مطالعہ کیا اور دن اور رات کے مختلف اوقات میں مختلف حالات کے تحت کیا اور بالاخر اس نتیجے پر پہنچے کہ انسان کی جز اور نسل انسانی کی بنیاد میں کوئی خرابی نہیں، دنیا کا کوئی بچہ لاچکی، فریبی، ظالم، حاسد، مکار و کر دہی اور سنگین نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ہم عمروں، ہم عصروں، ساتھیوں، ہم جویوں اور بڑے بزرگوں سے کلکاریں مارتے ہی ملتا ہے اور ہونٹوں پر انگلی سے توبہ بجاتے اور برد پھر کرتے ہی جدا ہو جاتا ہے۔ اپنے قریب کی چیزیں کھینچتا گھسیتا ضرور ہے لیکن جلد ہی ان چیزوں کو بھول کر کسی اور دھیان میں لگ جاتا ہے۔

چنانچہ طے یہ پایا کہ انسان فطری طور پر اچھا ہوتا ہے، خیر ہوتا ہے۔ شریف النفس ہوتا ہے اور خوش قلب اور مہربان ہوتا ہے۔ انسان کے بچے کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھیں تو وہاں بدی، خباثت، خیانت اور ظلم نہیں ہوگا بلکہ خوشی، لطافت، چمک، ہنس، رونق اور محبت ہی نظر آئے گی۔“

میں نے عرض کیا ”بچے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن جب ہم اپنا، اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں، رشتہ داروں اور ساتھیوں، ملاقاتیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندر باہر گندی گند دیکھتے ہیں۔ وہ کوئی بدی، خرابی اور ممکنہ عیب ہے جو ہم میں موجود نہیں۔ یہ جنگیں، یہ نعرے، سرحدوں کے جھگڑے، مذہبوں کی لڑائیاں، ظالموں کی چیرہ دستیائیں، کونسا عیب ہے جو حضرت انسان میں موجود نہیں اور جس میں وقت کے ساتھ ساتھ قوی تر ہونے کے امکان ظاہر نہیں۔“

ماسٹر وانگا ریتی نے کہا ”بچے اسٹیج کی طرح ہوتے ہیں۔ غسل کرنے کے تو لیے جیسے، ہر شے بڑی آسانی سے جذب کر لیتے ہیں۔ جب ان کی عمر دوسال کی ہو چکی ہے تو انہوں نے دس ہزار گھنٹے کی زندگی کا مظاہرہ کیا ہوتا ہے۔ اچھا برا، خوش نما بد نما، کڑوا میٹھا، گھٹتی ناگھٹتی..... زندگی کی ساری جزئیات، اپنی اپنی سیدھی بت کے ساتھ ان کے تجربے سے گزری ہوتی ہے۔ اب اپنی آگے بڑھتی ہوئی زندگی میں جب بچے اپنے مشاہدات کو عملی صورت عطا کرنے کے لیے وقت کی سٹیج پر آتے ہیں تو ایکٹ کے دوران ان کو پتہ چلتا ہے کہ اس جہان رنگ و بو میں کچھ چیزیں ”اچھی“ ہیں اور کچھ ”بری“ اور ہم سے اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ ہم ”اچھا اچھا“ کریں اور ”برا برا“ ترک کر دیں۔ یہی یہاں کا دستور ہے اور یہی اس دنیا کا قاعدہ ہے۔“

”بچے یہ بات جان تو جاتے ہیں لیکن ایک بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ کچھ چیزیں ”صحیح“ کیوں کہلاتی ہیں اور کچھ چیزیں کو ”غلط“ کا نام کیوں دیا گیا ہے..... لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بچہ آہستہ آہستہ کس قدر کامیابی کے ساتھ اپنے بڑوں کا یہ فن سیکھ جاتا ہے کہ برے کو اچھے کے ساتھ اور غلط کو صحیح کے ساتھ کس طرح سے ڈھانپا جاسکتا ہے اور اس میں کیسے کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔“

بدی اور برائی تو اپنے ماحول کا مطالعہ کرنے سے سیکھی جاتی ہے اور نیکی ان کو ان کا ماحول اس لیے سکھاتا ہے کہ اس بدی کو مستور کیے کرنا ہے۔ دراصل ہمیں اچھا بننے کی حیلہ سازی اور نیک ہونے کا مکر سکھایا جاتا ہے اور جب کبھی مکر کی اوٹ ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر گر جاتی ہے تو نیچے سے بدی نمایاں طور پر نظر آنے لگتی ہے۔ جب انسان بھری پری سٹیج پر اس طرح سے عریاں ہو جاتا ہے تو وہ بکھنے لگتا ہے کہ میرا اندر خراب ہے اور میں نہاں طور پر بدی سے بھرا ہوا ہوں۔ چنانچہ اچھائی کا بھرم رکھنے کے لیے انسان ایک ایسی ناختم جدوجہد میں اُلجھ جاتا ہے جس کا سچائی سے حق سے اور انصاف سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

آپ جو لوگ صبر و استقامت اور عزم و حوصلہ کے ساتھ اندر کی برائی کے نیچے پہنچ کر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں وہاں سکون اور سکینت کا ایک سمندر دکھائی دیتا ہے اور وہ اسی خبر سے متعارف ہوتے ہیں جو اصل ہے۔ انسانیت کی کنہ ہے اور ان کے بچپن کا وجود ہے۔ وہ وجود جو ان کی صحیح ذات اور ان کا مجر دیلیف ہے۔

پھر انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا اور فرمایا ”وہ جو تمہارے بابا دھرم داس تھے، وہ اسی سیلیف کی بات کرتے تھے کہ تمہارا سیلیف تو نیک پاک، شریف اور خوشگوار و خوش کردار ہے لیکن تم نے اپنی ذات کے ارد گرد اتنے مضبوط سائن بورڈ اور ایسے بھاری بھاری تختے جڑ لیے ہیں جن کا اتنا تاب ممکن نہیں رہا۔ ان سائن بورڈوں پر کہیں ”ہیرڈ“ لکھا ہے کہیں ”عالم“ کہیں ”ایکٹر“ اور کہیں ”ڈانسر“ کہیں ”سیاستدان“ اور کہیں ”ناہنہ روزگار“ ضرورت پڑنے پر موقع محل کے مطابق آپ وہ سائن بورڈ آگے کرتے جاتے ہیں جس کی نمائش مقصود ہوتی ہے۔ تمہاری اصل ذات اور تمہارا سیلیف ایک چوزے کی مانند ان تختوں، پٹھوں اور سائن بورڈوں کے جکڑ بند میں ایک عمر قیدی کی طرح گزارا ہوتا ہے۔ وہی چوزہ جو وہ برس تک آزادی کی بھرپور فضاؤں میں گود یوں کے اندر پلا، ہانپوں میں گھوما، ستاروں کے ساتھ مکرایا اور کائنات کے

مظاہرے ہم کلام رہا..... صوفیوں، سنتوں، روحانیوں، ہیراگیوں اور یوگیوں کی ایک ہی آرزو ہوتی ہے کہ وہ ذات کے چوزے کو عمر قید سے رہائی دلوا کر اسی سکھ شانی، حق حقیقت اور صدق وصفائی کی اس جولانگاہ میں پہنچ جائیں جہاں سے زندگی نے اپنا آغاز کیا تھا۔

میں نے کہا ”تو یہ ذات کا چوزہ ہر شخص میں موجود ہوتا ہے؟“

فرمایا ”ہر شخص میں موجود ہوتا ہے۔“

”مجھ میں بھی موجود ہوگا؟“

”ہوگا کیا! موجود ہے۔“

”ظالم ڈاکو، چور اور زانی، ہٹلر اور ہلاکو میں بھی موجود ہوتا ہے۔“

”ان میں بھی موجود ہوتا ہے؟“

”تو پھر یہ چوزہ اپنی قید کے کسی کو نہ کھڑے سے سر نکال کر باہر کیوں نہیں دیکھتا؟“

”ہم میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے سیلف پر اس محنت سے تختے، چادریں اور پیٹے چڑھائے ہیں اور اس قدر شدت سے ان میں بیچ اور کاٹنے کے ہیں کہ وقت گزرنے پر اب ان ٹنوں اور ڈھریوں کو کھولا نہیں جاسکتا۔ وہ سب

ذہن آلود ہو کر یک جان ہو چکے ہیں۔“

پروفیسر صاحب کی یہ طویل گفتگو سن کر مجھے پہلی مرتبہ اپنے سیلف کی اسیری کا حال معلوم ہوا۔ میری ذات کا وہ معمولی سا چوزہ جو مجھ سے الگ رہ کر روشنی اور ہوا سے محروم، تنہائی، لاغری، کمزوری اور بے بنیادگی کی زندگی گزار رہا تھا اور مجھے اس سے ملنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ نہ ہی میں اس کو اس کی حالت اسیری میں گڑ، تھل اور تھل پہنچا سکتا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان پہنچنے کی ساری راہیں مسدود تھیں لیکن حیرانی کی یہ بات تھی کہ میں اس سے باہر بھی نہیں تھا۔ میرے چوزے نے خود اپنی شان بنانے کے لیے اپنے گرد سائن بورڈوں، سائن پوسٹوں، ہینروں کی ایک مضبوط جیل تعمیر کر لی تھی جس کا کوئی دروازہ نہ تھا۔ میرا سیلف اس کے اندر قید تھا اور میں خود ایک ملاقاتی کی حیثیت سے اپنی ذات سے ملنے کی آرزو میں تڑپ رہا تھا۔

میرے چوزے کے گرد لوہے کی چادر کا ایک بورڈ تھا جس پر ”ادیب“ لکھا تھا۔ دوسری چادر پر ”براڈ کاسٹر“ چھپا تھا۔ تیسری پر ”پروفیسر اور ماہر تعلیم“ چوتھی پر میری پہلی کتاب ”ایک محبت سوافسانے“ کا نام۔ درزوں اور جھریوں پر ٹین لیس سٹیل کی تختیاں رہنوں سے پیوست تھیں جن پر ”خوبصورت“ ”صحیح منہ“ ”شریف انشس“ ”خوش کلام“ ”مرد مجاہد“ ”فرزند پاکستان“ ”نیک نہاد“ ”صلح کن“ اور پتہ نہیں کیا کیا لکھا تھا اور ان سب پر دوانچ موٹے لوہے کی چادر کا تنگ خول چڑھا تھا جس کے چاروں طرف ”گڈ ریا گڈ ریا“ لکھا تھا۔

میں نے پروفیسر انکار جی کی طرف درد بھری نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ ”کسی صورت میں اپنے سیلف سے مل

سکتا ہوں۔ ایک بار..... آخری بار.....!“

انہوں نے مسکرا کر کہا ”بتا تو رہا ہوں بھائی کہ صوفی سادھو اس ملاقات کو باطن کا سفر کہتے ہیں اور کیا گروں کی طرح وہ ساری زندگی اسی جہن میں گزار دیتے ہیں۔“

”اور ان کی ملاقات ہو جاتی ہے۔“ تنھے، پچھے، کھل جاتے ہیں؟ راہل جاتی ہے؟ میں نے پوچھا۔

کہنے لگے ”کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ بہت سوں کو مل جاتی ہے۔ بہت سوں کو ملی۔ سینٹ فرانس آف آسینزی، سینٹ تھریا، سینٹ آگسٹائن، منصور حلاج۔ جیند بغدادی، راماکرشنا۔ اور بے شمار۔۔۔۔۔ لاکھوں، ہزاروں کروڑوں کو ہی۔۔۔۔۔ کسی کا نام معلوم ہو گیا۔ بہت سے اسی سرخوشی میں بے نام آگے نکل گئے کہ منزل مل گئی۔ مزے ہو گئے۔ ملاقاتیں ہو گئیں۔ نام بنا کر اور نام بنا کر کیا لیتا ہے۔“

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ”اس کا کوئی طریقہ ہے اپنی ذات بکھانے کا؟“

کہنے لگے ”مجھے تو معلوم نہیں۔ میں نے تو یہ راہ دریافت کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ البتہ طریقت والوں نے کئی طریقے نکالے ہیں جیسے پہاڑوں کی چوٹیوں اور سمندروں کی تہوں میں جانے والوں نے راستے ڈھونڈ لیے ہیں، اسی طرح باطن کے مسافروں نے بھی کچھ راستے نکالے ہیں!“

”آپ ان کی بابت کچھ جانتے ہیں۔“ میں نے جلدی سے پوچھا تو انہوں نے مایوسی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا اور خاموش ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد اپنے آپ سے گویا ہوئے کہ ”بس منت خوشامد اور لالو چوہی ہے کوئی باقاعدہ کلیہ یا کوئی سائنسی طریقہ نہیں، بس ایسے بڑھاوا چڑھا دیا ہے۔ اس سے ادراک ذات ہو جائے تو پو پو بارہ نہیں تو اندھی کھو میں ظلمات کا سفر تو ہے ہی۔“

میں نے پوچھا ”اور یہ لالو چوہی کیا ہے؟“

کہنے لگے ”بس کیے جانے کا نام لالو چوہی ہے۔ کوئی منزل تو ہے ہی نہیں۔“ پھر ذرا سا مسکرا کر بولے۔ ”ہمارے اسکندریہ کی جامع مسجد کے ایک خطیب تھے، ابو القاسم طیلادی۔ میرے والد سے ان کی اچھی راہ ورسم تھی۔ وہ جب بھی ہمارے یہاں آتے تو میرے والد ایک ہی بات پوچھتے کہ اچھا مسلمان بننے کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کا ایک ہی جواب دیا کرتے کہ اچھا مسلمان بننے کے لیے صرف کوشش ہی کی جاسکتی ہے اور اسی کوشش کا نام اچھی مسلمانی ہے لیکن میرے والد کی اس جواب سے تشفی نہیں ہوتی تھی۔ میں دور بیٹھا خوب سمجھتا تھا کہ شیخ ٹھیک فرما رہے ہیں۔“

پھر آنکھیں بند کر کے کہنے لگے ”انسان نے قدیم زمانے سے لے کر اب تک گیان ذات کے لیے اپنی دو قوتوں کا ہی سہارا لیا ہے۔ ایک بصارت اور دوسرے سماعت لیکن بصارت کے مقابلے میں سماعت سے زیادہ کام لیا ہے یا یوں سمجھ لو کہ بصارت کے مقابلے میں سماعت نے بہتر طور پر رہنمائی کی ہے۔“

”نظر، ارٹھکا، نظر یا عرف عام میں نظر بندی کے علاوہ تفکیر اور مراقبہ کی اور بھی کئی فی روشیں اور مہارتی طریقے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر تقسیم ذات کا ڈول ڈالا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ بے مقصد بیٹھنے، بیٹھنے رہنے اور خاموش لمحات

مزار نے سے بھی ذات کا گیان ہونے لگتا ہے۔“

آپ مراقبہ کریں، تفکیر کریں یا خاموش ہو کر ایسے ہی بیٹھ رہیں، اس میں آپ کو ایک اصول پر ضرور عمل پیرا ہونا پڑے گا کہ آپ کے ارد گرد روشنی ہے۔ روشنی کا ایک بہت بڑا تہ ہے اور آپ اس کے نیچے بیٹھے ہیں۔ روشنی کی ایک آبشار ہے۔ ایک نیا کرا قال ہے اور آپ اس کے اندر سے ہوئے جھلار میں نہا رہے ہیں۔

”روشنی کیوں؟“ میں نے پوچھا ”خوشبو کیوں نہیں، رنگ کیوں نہیں، نظارہ کیوں نہیں؟“

پروفیسر نے کہا ”اگر میں عربی میں پڑھوں گا تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ بہتر یہی ہے کہ میں اطالوی میں سمجھاؤں۔ آسان اور سادہ اطالوی میں اور تمہارے قریب ہو کر بتاؤں کہ اللہ روشنی ہے۔ آسانوں کی اور زمین کی۔ مثال اس روشنی کی یہ ہے کہ جیسے ایک طاق ہو اور اس کے اندر ایک چراغ۔ اور وہ چراغ دھرا ہو ایک شمشے میں، ایک قندیل میں اور وہ قندیل ہے جیسے ایک چمکتا ہوا ستارہ، تیل جلتا ہے اس میں ایک برکت والے درخت کا جوڑیوں کا ہے اور جو نہ شرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف! لگتا ہے کہ اس کا تیل روشنی ہے اگرچہ اس میں آگ نہ لگی ہو۔۔۔۔۔ روشن پر روشن، نور پر نور۔۔۔۔۔ اللہ جس کو چاہے اپنی روشنی کی آگ دکھا دیتا ہے اور بیان کرتا ہے اللہ کی مثالیں لوگوں کے واسطے ہیں اور اللہ سب چیز بنا رہا ہے۔“

میں نے کہا ”یہ تو کسی مذہبی کتاب کا بیان معلوم ہوتا ہے۔ کسی پرانے صحیفے کا۔“

انہوں نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے کہا ”خداوند زمین و آسمان کی رونق اور ہستی ہے اور کائنات کی ساری مخلوقات کو اسی سے نور وجود ملتا ہے۔ چاند، سورج، ستارے، سیارے، معلوم اور لامعلوم، حاضر اور غائب، انبیاء، اولیاء، فرشتے اور ان کے علاوہ اور بھی جو کچھ ہے اور ان میں جو واضح اور پوشیدہ روشنی ہے، وہ اسی خزانہ نور کی بدولت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استاد، گورو، پیر مرشد، شیخ اور ہادی باطن کے مسافر کا پہلا قدم اندھیرے سے نکال کر نور کی شاہراہ پر رکھتے ہیں اور پھر اس کی انگلی پکڑ کر قدم قدم چلاتے ہیں۔“

”لیکن اس میں طاق کا کیا مطلب ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”جس میں روشنی کی قندیل رکھی ہے؟“

کہنے لگے ”یوں تو خدا کے نور سے کل کائنات کی موجودات روشن ہیں لیکن گیان ذات کے متلاشی کا جسم ایک طاق کی مانند ہو جاتا ہے۔ ایک دراز قد محرابی طاق کی طرح، اور اس کے اندر ستارہ کی طرح کا چمکدار شیشہ قندیل رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ شیشہ اصل میں اس کا قلب ہوتا ہے۔ جو ایک انینا کی طرح عالم بالا سے متعلق ہوتا ہے اور اپنے سارے سنگت و بین سے وصول کرتا ہے۔“

پروفیسر صاحب اکثر ہمارے صنف روم میں آ کر علم و ادب کی گہری وارداتیں اور شاعری کے مہینہ اور میسرہ کی باریک کفیتیں اور روزمرہ کے دلچسپ مگر خیال انگیز قصے سنا کر چلے جاتے تھے لیکن ایسی بات انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہ کی تھی۔ مجھے کچھ کچھ تو سمجھ میں آ رہا تھا لیکن ان کی باتوں کا بیشتر حصہ ابرسیاہ مست کی نگہیاں بن کر اڑا جا رہا تھا۔ میں کچھ حیران بھی تھا اور کسی قدر گھبرایا ہوا بھی تھا لیکن میری حیرانی میں گھبراہٹ زیادہ تھی۔

چہرہ اوپر اٹھا کر اور آنکھیں بند کر کے دوبارہ کہنے لگے۔ ”اس قدر بل کی روشنی بے حد صاف و شفاف ہوتی ہے جو لگا ہوں کو خوشنڈک اور جو دو کوسوں عطا کرتی ہے۔ یہ روشنی ایک مبارک درخت زیتون کے تیل سے حاصل کی جاتی ہے نہ مشرق کا ہوتا نہ مغرب کا۔“

میں نے کہا ”میں آپ کے اس درخت کی شباهت نہیں سمجھا۔“

جلدی سے بولے ”تم نے زیتون کا درخت دیکھا ہے؟“

میں نے کہا ”کیوں نہیں سرا میں اٹلی کا باشندہ ہوں اور زیتون کے درختوں سے، ان کے پودوں سے، ان کی پھلیوں سے اور ان کے پھل سے اچھی طرح واقف ہوں۔“

”اور اس کے تیل سے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”اس کے تیل سے بھی متعارف ہوں۔ دو وقت کا اسی تیل میں پکا کھاتا ہوں اور اس کو کچی صورت میں ملا کر انڈیل کر لطف لیتا ہوں۔“

انہوں نے کہا ”اور زیتون کا یہ درخت جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے، وہ اس جہان کے اندر کسی طرح کا نہیں نہیں۔ وہ آڑا ہے اور گویا ایک کھلے میدان میں ہے۔ اس پر دھوپ اور روشنی ہمہ وقت ٹھونکنے ہے۔ سورج مشرق میں ہوں مغرب میں، اس زیتون کے وجود پر اور وجود کے ہر کونے اور پہلو پر دھوپ پڑتی ہے اور یہ عام خدا کے علاوہ روشنی سے کسی اپنی خوراک اور قوت حاصل کرتا ہے۔ نباتات کے ماہرین بتاتے ہیں کہ ایسے زیتون کا تیل بہت صاف اور لطیف ہوتا ہے۔ اس قدر صاف لطیف، چمکدار اور درخشندہ کہ یوں لگتا ہے کہ آگ دکھائے بغیر ہی روشن ہو جائے گا۔“

پھر انہوں نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا ”یہ خدا کے نور کا ذکر ہے اور اس کا نور کسی وجہ کی طرح بھی دلیل یا کسی توجیح کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ جہت کی قید سے پاک ہے! جو بھی اس کا طالب ہوگا، اس کو یہ روشنی ضرور ملے گی۔ سب کچھ اس کے قبضے میں ہے، وہ جس کو چاہے اپنی روشنی عنایت کر دے۔“

میں نے کہا ”آپ نے یہ سب کچھ کہاں سے سنا؟“

کہنے لگے ”میں نے یہ درس اپنے اسکندر یہ سے اور اپنے مصر کے کوچہ و بازار سے لیا۔ پھر میری ماں بچپن میں مجھے انجیل مقدس کا سبق پڑھاتے ہوئے بھی بتایا کرتی تھی کہ یوحنا کے پہلے خط میں درج ہے کہ ”خدا نور ہے اور اس میں ظلمت بھی تاریکی نہیں۔“

میں نے کہا ”اس ازلی روشنی کا سارے مذاہب میں ذکر ہے اور پرانے صحیفوں میں بھی یہ بیان موجود ہے لیکن روشنی پر روشنی کے کیا معنی؟ جب روشنی کا مذکور ہو گیا تو پھر نور علی نور کیا ہوا؟“

ماسٹر نے کہا ”میں کچھ یقینی طور پر تو نہیں کہہ سکتا البتہ احتمالاً اور ارتجالاً یہ سمجھتا ہوں کہ ایک تو خود قابلیت نور کی اعلیٰ درجے کی تھی، اس پر نار کا بھی اس کے ساتھ پیوند لگ گیا۔ پھر چراغ قدریل میں ہونے سے اور شیشہ قدریل پہلو وار ہونے سے ایک روشنی بہت سی روشنیوں کا مخرج بن گئی۔“

اس پرانی یادوں کو ٹٹولتے ہوئے پروفیسر انگار جی نے کہا ”بچپن میں ہمارے ایک استاد سکول کے بچوں کو نہر سونہ کے کنارے روشنی کا مینار دکھانے لے گئے تو ہم نے دیکھا کہ شیشے کے ایک مدور گولے کے درمیان سفید گیس کا ہنڈا روشن ہے۔ اس ہنڈے کی روشنی اس قدر تیز تھی کہ ادھر نگاہ نہیں کی جاسکتی تھی۔ ہنڈا تو اپنی جگہ ساکت و صامت روشن تھا البتہ اس کے گرد شیشے کا گولا گھوم رہا تھا۔ یہ گولہ بند نہ تھا بلکہ شیشے کی براق ٹکونی قلموں سے بنا تھا۔ جو گولائی کے خم دے کر مختلف زاویوں پر لگائی گئی تھیں۔ اندر سے ہنڈے کی روشنی جب ان براق قلموں سے منعکس ہو کر نکلتی تو دو چند بلکہ دو چند ہو جاتی۔ یہ براق قلمیں تیز Reflectors کا کام دیتی تھیں۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ روشنی جب بھی کسی جسم صغیری سے یا آلہ انعکاس سے چھچھل کر نکلتی ہے تو اس کی ریخ میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔“

”یہ تو ہوئی ناں مثال۔“ میں نے تسلیم کرتے ہوئے کہا ”بہت ہی کامیاب مثال۔ اب بتائیے آپ کے نزدیک اس کی اصل کیا ہے۔“

کہنے لگے ”بھئی بات یہ ہے کہ اصل تو اس کی کوئی صاحب معرفت ہی بتا سکتا ہے۔ میں تو ایک رمضان محری کے وقت قاہرہ کے بازاروں میں گھومنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پہلے تو دیکھنے والے کو نور کا علم ہوتا ہے۔ اس کا ادراک ہوتا ہے۔ پھر وہ روشنی قلب پر وارد ہو کر عمل کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح ایک شیخ پر علم عمل کیجا ہو کر نور علی نور ہو جاتے ہیں۔“

پروفیسر صاحب کی بیگم دو اعلیٰ درجے کی دھواں چھوڑتے کافی گٹرے میں رکھ کر لائیں تو ہم نے یک زبان ہو کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے مسکرا کر کہا ”آپ کو میرا شکر گزار ہونے کے لیے دو مرتبہ شکریہ ادا کرنا پڑے گا کیونکہ میں دوسری مرتبہ کافی بنا کر لائی ہوں۔“

”اور پہلی مرتبہ کب تھی؟“ پروفیسر انگار جی نے پوچھا۔

”پہلی مرتبہ آپ اشفاق صاحب کو روشنی اور نور کے بارے میں اپنی کوئی نظم سنار ہے تھی۔“ بیگم صاحب نے کہا ”جس میں زیتون کا اور زیتون کے درختوں کا کچھ اچھا سا ذکر تھا۔“

کہنے لگے ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے، آپ کا دو مرتبہ شکریہ بلکہ آپ کا شکریہ ہی شکریہ۔“

ہم آہستہ آہستہ دیر تک کافی پیتے رہے اور خاموش رہے۔ بعض اوقات سننے والے کے دل پر کہنے والے کی بات ایسا تاثر چھوڑ جاتی ہے کہ وہ وقتی طور پر رنگ ہو جاتا ہے اور محفل میں جب کوئی پوچھنے والا اور سوال کرنے والا ہی نہ رہے تو جواب دینے والا بھی گم سم سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس وقت ایک عجیب طرح کی ایسی گونج پیدا ہو جاتی ہے جس کے ارتعاش کو صرف بدن کے رینگٹوں سے ہی پکڑا جاسکتا ہے۔

کافی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی اور خاموشی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں ان سے رخصت لے کر جانا بھی چاہتا تھا اور ابھی کچھ دیر اور ان کے پاس بیٹھنا بھی چاہتا تھا۔ میرے پاس ان دونوں کاموں کے لیے کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ جب سینور انگار جی کافی کے خالی گلاس لینے آئیں تو میں نے پروفیسر صاحب سے کہا ”اب میں آپ سے اجازت چاہوں

یہ بات سن کر نہایت چپ ہوا اور شاہ صاحب کے قدم پکڑے کہ ”دراصل ہمارا خیال غلط تھا جو آزادی کا دم بھرتے تھے!“

یہ قصہ میں نے منٹو کی محفل میں کوئی پانچ چھ مرتبہ سنایا اور ہر مرتبہ گالیاں کھائیں۔ دیے وہ بڑا دلدار آدمی تھا۔ یاروں کا یا راد بے سہاروں کا سہارا تھا۔ اس کی محفل سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ گواس کی آزاد روی اور راست گوئی سے اختلاف رہتا، مار کھانی پڑتی اور ذلیل ہونا پڑتا۔

حق گوئی اور بے باکی کی بھی بڑی قسمیں ہیں اور ہر شخص اپنی قسم کو سب سے بہتر برینڈ خیال کرتا ہے اور اس کے ابلاغ میں اپنی عمر عزیز صرف کر کے گمنامی کی وادی میں اتر جاتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک کمال طور پر سچا شخص اکثر اوقات بڑا ہی ظالم ہوتا ہے۔

ریسرچ کا کام بھی راستی اور سچائی کی چھان پھٹک کے لیے کیا جاتا ہے۔ دانہ الگ اور بھوسہ الگ کر کے علیحدہ علیحدہ ڈھیر لگا دیے جاتے ہیں۔ لوگوں کو گمراہی سے نکال کر سیدھے راستے پر ڈالنے کا کام تحقیق کا ہے۔ تحقیق کے نتائج چھوٹے بڑے چراغوں کی صورت میں ہر راستے کو روشن اور ہر منزل کو منور کرتے چلے جاتے ہیں۔ انسان کے بھٹکنے کا اندیشہ نہیں رہتا۔

جب میں اپنی کالج کی تعلیم کے چھ سال میں تھا اور اپنے افسانوں کا مجموعہ ”ایک محبت سو افسانے“ چھپوا چکا تھا، اس وقت میرا ایک ہی معمول تھا کہ سورج ڈھلتے ہی اپنے پبلشر کتبہ جدید کی دکان پر پہنچ کر بہانے بہانے سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ میری کتاب کتنی بچی ہے اور لوگوں کو کس قدر پسند آئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر شام اپنے سے سینئرا دیوں سے ملنا اور ان کی باتوں کو سیٹھ کر گھر لاکر سینت کے رکھتے جاتا۔

ایک شام ہم کتبہ جدید پر کھڑے بڑی قد آور باتیں کر رہے تھے۔ خوش تھے کہ ساحر لدھیانوی اور عزیز احمد ہمارے ساتھ موقع پر موجود تھے۔ صفدر میرا اپنے مخصوص کامریڈی لباس میں رک سیک پشت پر ڈالے بڑے انہماک سے کوئی کتاب دیکھ رہے تھے۔ چودھری رشید پارسوں پرستلی لپیٹ رہے تھے کہ بھرے بھرے بدن کا ایک گورا چٹا لڑکا سفید مکھن زین کی چٹلون اور سفید ٹول کی قمیص پہنے سال پر آ کر سلا مالیک کہہ کر نئے رسالے دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کی چٹلون موٹے چمڑے کی براؤن چینی سے بندھی تھی اور اس کے ہاتھ میں سولا بیٹ تھا۔

چودھری رشید نے ہم سب کا اس نوجوان سے تعارف کرایا جس کی حال ہی میں چھپنے والی کتاب نے اسے راتوں رات فرش سے عرش پر پہنچا دیا تھا۔ اس کتاب کا نام ”شبلی کی داستان معاشقہ“ تھا اور اس میں کسی عظیم فیضی سے شبلی کی گہری دانشگری کے دستاویزی ثبوت پیش کیے گئے تھے۔ میں نے یہ کتاب سنو ضروری لیکن پڑھی نہ تھی۔

نوجوان مصنف نے کمال مہربانی سے اپنی یہ کتاب آٹو گراف کر کے مجھے مرحمت کی اور کہا اسے پڑھ کر اپنی رائے ضرور دینا۔ عزیز احمد نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور اپنی عینک کے پیچھے اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں جھپک کر کہا ”تعجب! آپ نے یہ کتاب ابھی تک پڑھی ہی نہیں۔“ میں نے بڑی ندامت سے سر جھکا کر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر مجھ

ہے بات بن نہ سکی، گھٹکھیا کر رہ گیا۔

رات کی تنہائی میں اپنے کمرے کے اندر بالکل اکیلا، جیسے جیسے میں یہ کتاب پڑھتا جاتا تھا، میرے رونگٹے کھڑے ہوتے جاتے تھے۔ شبلی نعمانی کی ہمارے گھر میں بڑی عزت تھی۔ ہماری بڑی آپا ہم سب کو سیرۃ النبی سبقتا پڑھاتی تھیں اور مشکل مقامات پر رک کر ہمیں تاریخی تفصیلات بہم کرتی جاتی تھیں۔ جو کمال شبلی کی تحریر کا طرہ امتیاز تھا، کچھ ایسا ہی کمال ہماری آپا کی تقریر کے بحر میں تھا۔ ہم سب بے پردہ، اچاٹ مزاج، کھلنڈرے اور نال منول ہونے کے باوجود برت کے اس سیشن کے بڑے رسیا تھے اور آپا کو کبھی چھٹی کرنے نہیں دیتے تھے۔

جب میں نے یہ کتاب ختم کی تو صبح کے چار بجے رہے تھے اور فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ شبلی جس کی ہم لوگ پوجا کرتے تھے، ایک اور ہی روپ میں میرے سامنے تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے آنکھ نہیں ملا رہے تھے۔ میں اپنی جگہ ٹھہر رہا تھا اور شبلی اپنے مقام پر کچے پڑ رہے تھے۔ ہمارے درمیان پہلے تو دوری پیدا ہوئی۔ پھر اجنبیت نے جنم لیا اور سورج طلوع ہونے تک میں اپنے محبوب مصنف سے کنارہ کش ہو کر اس کے خلاف ہو گیا۔ میرے دل میں اس کے خلاف نفرت کی ایک ایسی لہر پیدا ہوئی جو بلند سے بلند تر ہوتی گئی اور جس نے مجھے مایوسیوں اور گرداب میں تیزی سے بلونا شروع کر دیا۔

میں زندگی میں پہلی مرتبہ ریسرچ کی افادیت سے روشناس ہوا اور میں پہلی مرتبہ سچ کی چھان پھٹک کے گہرے علم کی گہرائیوں میں اترا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے میرے دل نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جب ایک شخص ایسا کمزور، اس قدر ذلیل، ایسا دور خا اور کا ذی ہے تو پھر اس کی تصنیف پر کس طرح سے اعتبار کیا جاسکتا ہے اور اس کی تحریر کے واقعاتی سچ کو کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

اس معاملے میں آپا کے ساتھ بڑی مجلس ہوئیں اور گفتگو کے دوران میں پہلی مرتبہ میں اپنی بہت ہی بیماری اور ہم سب کی محبوب بہن کے ساتھ گستاخی کے ساتھ پیش آیا۔ کچھ باتیں میرے منہ سے ایسی بھی نکل گئیں جو مصنف کی ذات، اس کی کتاب اور کتاب کے نفس مضمون سے بھی تعلق رکھتی تھیں۔ آپا میری باتیں سن کر پتھرا سی گئیں اور ان کی آنکھوں سے ناپ آب آنسو گرنے لگے لیکن میں ریسرچ سے اور ریسرچ کی سچائی سے ایسا متاثر ہو چکا تھا کہ اب مجھے ان آنسوؤں کی کوئی پروا نہ رہی تھی اور میں ایک بہادر اور سچا انسان بن چکا تھا۔

کچھ لوگ سچ کو دبا کر، چھپا کر اور کپڑوں میں لپیٹ کر رکھتے ہیں کہ باہر نکلا تو سچ کو ٹھنڈا لگ جائے گی اور اس کو ٹھنڈا ہو جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ ڈھکا رہے اور لوگوں کی نگاہوں سے چھپا رہے۔ ایسے لوگ معاشرے کو اور انسانیت کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں اور ترقی کی راہیں مسدود کر دیتے ہیں۔

اپنی آپا کی صحبت میں اور ان کی تعلیم کی وجہ سے بچپن ہی سے میں فارغ اوقات میں درود شریف پڑھا کرتا تھا۔ اب میں نے اس کا پڑھنا بھی ترک کر دیا!

مجھ میرے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا اور میں ایک روشن خیال اور عظیم انسان بننا جا رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا

تھا کہ ہم سچ سننا اس لیے پسند نہیں کرتے کہ ہم سچ بولتے نہیں، سچ بولنے کے لیے اور سچ کہنے کے لیے سب سے پہلے سچ سننے کی عادت ڈالنا ضروری ہے۔ اس لیے کے تحت میں سچ سننے کا رسیا بن گیا اور مجھے اس کا چکا پڑ گیا۔

اسی زمانے میں مجھے مجرا دیکھنے کا ایسا چکا پڑا کہ جہاں بھی کسی شوخ و شنگ بانی کے بحرے کی خبر پاتا، اذکر وہاں پہنچ جاتا۔ طوائفیں بھی بڑی سچی مخلوق ہوتی ہیں۔ ہر قسم کے مجید بھاؤ بتاتی جاتی ہیں، کچھ چھپا کر نہیں رکھتیں۔ اظہار میں سب کچھ کھول کھول کر نمایاں کرتی جاتی ہیں۔ انگ انگ کھلا ہوتا ہے، کچھ ڈھانپ کے نہیں رکھتیں۔ اسی حقیقت بیان کی وجہ سے لوگ انہیں پسند کرتے ہیں اور انہی حقیقتوں کے اظہار کی بدولت وہ ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر شہرت پاتی ہیں..... بحرے کے علاوہ جہاں کہیں شوخ و شنگ قسم کے سچ کا اظہار ہوتا، میں بھاگ کر وہاں پہنچ جاتا اور حسب توفیق محرک جھاڑ کر واپس آ جاتا۔

رہسچ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان کو سچ سے گزرے بغیر اور سچ کیے بغیر بنے بنائے سچ کی دولت میں مفت مل جاتی ہے۔ بتانا یا اور ریڈی میڈ سچ بڑا ہی مفید، بے حد موزوں اور حد درجہ آرام دہ ہوتا ہے۔ یہ خواب اور گولی سے بھی بڑھ کر سکون دیتا ہے۔

تقریباً ایسا سکون ایک مرتبہ پہلے بھی ملا تھا جب میں دسویں کا امتحان دے کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا۔ ہمارے مکتب میں جو انجمن اسلامیہ کا سالانہ جلسہ جامع مسجد میں ہوتا تھا، اس کے لیے دو دروازے اٹلی درجے کے مولوی بلائے جاتے تھے۔ میرے ابا جی اور چاچا والی محمد اس انجمن کے کرتا دھرتا تھے۔ وہ ہمارے قصبے کے لوگوں کی فرمائش پر ایسے مولوی بلائے پر مجبور تھے جو گلے کے سریلے کھانے کے چسکورے بات کے شیلے اور دلیل کے کٹیلے ہوں۔ دوسرے مسلک کے لوگوں کے چٹکے چھڑا دیں اور اپنے عقیدے پر آئینے نہ آنے دیں۔ منظوم لطیفے اور نظریات نہ کہانیاں آسانی سے سنائیں۔ روتوں کو ہنسا دیں اور ہنستوں کو لڑا دیں اور اپنی ہاؤ ہو سے جلے میں مجلس کا سارنگ پیدا کر دیں..... اس سلسلے میں جال آباد کے مولوی امیر دین سرفہرست تھے اور تینوں نشستوں میں ان کی تقریر سب سے بعد میں رکھی جاتی تھی۔ مولوی صاحب لوگوں کو ہنسا ہنسا کر جلے کو کشت زعفران بن دیتے تھے اور جو لوگ مسجد میں پاؤں پھیلا کر دیر سے گہری نیند سوئے ہوتے، ان کو ان واحد میں اپنے ہتھکوپن سے جگا دیتے تھے۔

میرے بڑے بھائی نے جو ان دنوں لاہور میں ایل بی کر رہے تھے، ابا جی سے کہا کہ اگر وہ اجازت دیں اور ان کے پاس ذرائع ہوں تو وہ ان آٹھ دس مولویوں کی کھپ میں ایک ایسے نوجوان مولوی کو بھی بلائیں جو ایم اے پاس ہے۔ چٹون کوٹ پہنتے ہیں اور لاہور کی ایک مسجد میں امامت کرتے ہیں۔ ابا جی نے چاچا والی محمد سے ذکر کیا تو انہوں نے اپنے ذہن ختمین اور گولڈ میڈلسٹ بھتیجے کی فرمائش کو صاف کیا اور لاہور سے مرزا عبدالحمید صاحب کو مکتبہ آنے کی دعوت دے دی گئی۔

جب ہم لوگ مرزا عبدالحمید صاحب کو نشین پر لینے گئے سیکنڈ کلاس کے ڈبے سے ایک چاق و چوبند پھر تیار اور نوکیلا سانو جوان شیروانی پہنے اور سر پر ردی نوٹی رکھے برآمد ہوا۔ ہمارے علاقے کا جو نیند گردہ مولویوں کو ریلوے نشین

سے لینے جایا کرتا تھا۔ اس نے مرزا عبدالحمید کو دیکھ کر ایک بھی نعرہ نہ لگایا اور حیرانی سے بھائی جان کے اٹھتے ہوئے بازو کو دیکھنے لگے جو انہیں نعرے لگانے کے لیے اونچے اونچے ہمارے تھے۔

مرزا عبدالحمید نے ایک ایک کر کے ہم سب سے ہاتھ ملایا اور ہم انہیں ساتھ لے کر اپنے گھر آ گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہمارے گھر سے پرانی قسم کے روایتی مذہب کو رخصت کیا گیا اور اس کی جگہ ایک نئی وضع تبلیغ کا اسلام آسانیاں، تن آسانیاں اور نو بنیانیاں لے کر خود بخود ہماری چار دیواری کے اندر آ گیا۔ ہم بھائیوں کے درمیان ہر لمحہ ایسی تازہ بہ تازہ اور نوبہ نو گفتگو ہونے لگی کہ میری والدہ کو شک پڑنے لگا کہ ہم آریہ سماجی ہو گئے ہیں اور لالہ امر ناتھ نے ہماری شادی کر لی ہے۔

لالہ امر ناتھ کی سوڈا وائر بھرنے کی مشین تھی اور سارے شہر میں صرف اس کا پانی چلتا تھا۔ وہ سوڈا وائر کے علاوہ جگر، روز اور دودھ کی بوتلیں بھی بھرتا تھا۔ شام کو اس کے ”کارخانے“ پر مکتب کے پڑھے لکھے لوگ جمع ہوتے تھے اور مذہب پر سیر حاصل گفتگو کر کے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ میرے چاروں بڑے بھائی ان مباحثوں میں شریک ہو کر مخالفین کے دانت کھنکھاتے تھے لیکن میری ماں کو ہمیشہ فکر رہتی تھی کہ بچے غلط جگہ پر جا کر وقت ضائع کر رہے ہیں۔

اماں چونکہ پرانی وضع کی ایک پینڈ و عورت تھیں اور صدیوں سے چلنے آئے پرانے دین پر سختی سے عمل پیرا تھیں، اس لیے وہ تحقیق و تفتیش کے رموز سے نا آشنا تھیں اور اسی لکیر پر فقیرانہ چلی آ رہی تھیں جو ان کے بڑوں نے اور ان کے پرکھوں نے ان کے لیے طے کر دی تھی۔ اماں طرز کھن کا برقعہ پہنے ابا جی کی قیادت میں آنکھیں بند کر کے چلی آ رہی تھیں اور ابا جی ڈاکٹر ہونے کے باوصف اپنے خانوادے کی ڈائریکشن کے مطابق انہی راستوں پر چل رہے تھے جو خط کھینچ کر ان کو سبھا دیئے گئے تھے۔

میرے چاروں بڑے بھائی جو اپنے اپنے فن میں یگانہ روزگار تھے، کچھ تو لالہ امر ناتھ کے کارخانے پر بحث مباحثے کی وجہ سے اور کچھ آگے بڑھتے ہوئے زمانے کی نو طرازیوں سے متاثر ہونے کی بنا پر مرزا عبدالحمید کی دو تقریروں کی مار بھی برداشت نہ کر سکے اور ان کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ مرزا صاحب نے بتایا کہ یہ ان کی اصل تقریریں نہیں ہیں کہ مکتبہ جیسا قصبہ ان کا قتل ہی نہیں ہو سکتا اور یہ لوگ میری تحقیق کے ایک فقرے کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں چالوسی باتیں کر کے ان کا دل خوش کر رہا ہوں ورنہ اصل حقیقت تو کچھ اور ہے۔

اور جب ہم نے علیحدگی میں ان سے اصل حقیقت دریافت کی تو ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ان کی تحقیق بتاتی تھی کہ نمازیں پانچ نہیں بلکہ دو ہیں۔ بڑی عید پر قربانی کرنا جائز ہے۔ ایک سے زیادہ شادی حرام ہے اور جہاد کا مطلب مد مقابل سے لڑنا نہیں بلکہ اپنی کوتاہیوں اور بد خصالیوں کو دور کر کے اپنی روح کو پاک صاف کرنا ہے۔

مرزا عبدالحمید صاحب نے بتایا کہ اسلام اس وقت ہمارے سامنے اپنی اصل صورت میں نہیں ہے۔ مولویوں اور ملاؤں نے اس کی صورت مسخ کر کے اور اس میں کافرانہ مذاہب کے عناصر داخل کر کے اسے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ آج کا اسلام وہ اسلام نہیں جو اصل اسلام تھا اور جو اپنے وجود میں آنے کے چند سال بعد ہی دنیا کے گوشے

گوشے میں پھیل کر انسانیت کی فلاح و بہبود کا باعث بنا تھا۔ آج کا اسلام تو بے عملی، بے یقینی، شخصیت پرستی اور شاہ پسندی کی ایک بھونڈی سی تصویر ہے جس پر مشرک و الحاد کے حاشیے چڑھتے اور اترتے رہتے ہیں..... مرزا صاحب اپنی گفتگو کے ہر وقت کے بعد ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ”اسلام ایک ارفع اور اعلیٰ نظام حیات تھا جسے ظالموں، غاصبوں، احمقوں نے اعلیٰ میں ملا کر اس کی ہیئت ہی تبدیل کر دی۔ اب کوئی موسیٰ ہی اس ظلم سامری کو توڑ سکتا ہے اور وہی ہماری کھوئی ہوئی میراث کو دشمنوں کے پنجے سے نکال کر واپس لاسکتا ہے۔“

میرے نیک دل، شریف، پاکیزہ اور دیانتدار بھائی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ وہ جو چوتھی جماعت سے لے کر ایل ایل بی کے آخری سال تک نماز باقاعدگی سے پڑھتے چلے آ رہے تھے اور اپنے مذہب کے سارے رجحان پابندی سے ادا کرتے تھے، تحقیق و جستجو کے پنجے سے نیچر لاکر پانچ کے بجائے دو نمازیں پڑھنے لگے اور دیکھ کر سچ کی روشنی میں اسلام کی بہت سی فروغی باتوں کو ترک کر کے صحیح معنوں میں سچے مسلمان بن گئے۔ انہوں نے مرزا صاحب سے بہت سی راز کی باتیں سیکیں اور ساتھ ہی بڑی مشکل اور طویل منت ساجت کے بعد مرزا صاحب سے ان کے پیار کا نام بھی معلوم کر لیا۔ ان کا نام پیرزادہ ابراہیم حنیف تھا اور وہ ریلوے روڈ پر اسلامیک کالج کے گیٹ کے سامنے قومی کتب خانے کی اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ ان کے چوبارے کو جانے والی میز حیاں گھوم کر اوپر جاتی تھیں اور ان میز جیوں کے اوپر کا دروازہ اندر سے ہمیشہ بند رہتا تھا۔ پیرزادہ صاحب چھوٹے قد کے نحشی سے انسان تھے لیکن ان کی آواز بڑی پاٹ دار تھی۔ انہیں یقین کے ساتھ بات کرنے اور اپنے بیان پر قائم رہنے کا بڑا ملکہ تھا۔ بڑی سی کرسی میں چھوٹے سے ہو کر بیٹھنے کے باوجود وہ اپنے کتب خانے کی ہر شے پر حاوی تھے۔

ان کے کتب خانے میں اردو، فارسی، عربی کتابوں کے علاوہ انگریزی، عبرانی، ہندی، سنسکرت اور فرانسیسی زبان کی بھی بے شمار کتابیں تھیں۔ دیواروں پر خوبصورت چاپانی لڑکیوں کے رنگین کیلنڈر آویزاں تھے اور ان کے درمیان شیشے میں فریم کی ہوئی فارسی رباعیوں کے طغے تھے جو کسی ایک ہی شاعر ابوسعید ابوالخیر کے کلام پر مشتمل تھے۔ کمرے کی ساری کھڑکیاں بند تھیں اور شیشوں پر کاغذ منڈھے تھے۔ اندر بلب جلا کر روشنی کی جاتی تھی اور پیرزادہ صاحب کے میز پر ٹیبل لیپ کے پاس خوبصورت ہینڈل والا ایک محدب شیشہ بھی ہر وقت موجود رہتا تھا۔

یہ گول اوپر چڑھتی میز حیاں ایک مرتبہ اربل کھا کر مزید اوپر چڑھتی تھیں جہاں پیرزادہ صاحب کی والدہ اور ان کے مرحوم بیٹے کا اکلوتا لڑکا رہتے تھے۔ ابراہیم حنیف صاحب نے شادی نہیں کی تھی اور وہ علمی تحقیق کو اپنے حوالہ نکاح میں لانے کے بعد دوسری شادی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کے بچتے تھوڑے سے قاتر اہل عقل تھے۔ اس لیے جسمانی طور پر بہت مضبوط اور کام کرنے کے دھنی تھے۔ گھر کا سارا بوجھ ان کے کندھوں پر تھا۔ دوسن کی آنے کی بوری بغل میں دبا کر بل کھاتی تنگ میز جیوں پر گھری کی طرح گزر جاتے تھے۔ نچلے دروازے پر کسی کی آہٹ پا کر یاد تک سن کر سب سے پہلے میاں کی گونجدار ”کون ہے؟“ گول میز می کے زرخے میں گونجتی اور سب کو پتہ چل جاتا کہ چوکھٹ پر کوئی ہے اور شرف باریابی چاہتا ہے۔

پیرزادہ ابراہیم حنیف صاحب کے ملاقاتیوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ گنپت روڈ کے رام لال سوری ان کے پلیر تھے۔ ان کا کارندہ من موہن چڑا اسی دن میں دو تین مرتبہ پیرزادہ صاحب کے گھر کا چکر لگایا کرتا۔ کبھی پروف دینے بھی پروف واپس لینے۔ کبھی کاغذ کا نمونہ دکھانے کبھی سطر کا سائز جانچوانے۔ وہ ایک ایک بات خود جانچتے تھے۔ پھر اس سے پیدا ہونے والی متوقع صورتحال آ سکتے تھے۔ اس کو دوسے ضرب دے کر خدشات میں اضافہ کر لیتے تھے۔ پھر ان خدشات کو فکر کی خرابی پر چڑھا کر عقل کے ٹول سے ان کے چھوڑے اتارتے تھے اور مضبوط پایہ تخت کو ایک کمزوری ٹانگ میں تبدیل کر کے سارا بوجھ اس پر ڈال دیتے تھے۔ بڑے زبردست موحد تھے لیکن اللہ کو پورے کا پورا نہیں مانتے تھے۔ خدا سے بے پناہ الفت تھی، اس لیے اس کو ہر وقت دانش کی باتیں بتاتے رہتے تھے۔ اس کا بڑا خیال رکھتے اور اس کی بھولی ہانپ اپنی پسند کے ملاقاتیوں سے بیان کیا کرتے۔

میں نے جب چھ ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد ان کے پراسرار ٹھکانے کا پتہ چلایا اور ان کی دہلیز پر آواز دینے میں کامیاب ہو گیا تو میرے الف اے کے فائل امتحان میں چار ماہ باقی رہ گئے تھے۔ جنگ عظیم اپنے پورے زوروں پر تھی۔ گوراپلٹوں کے فوجی لاہور کی مال روڈ کے علاوہ دوسری سڑکوں پر بھی نظر آ جاتے تھے لیکن کم کم اس وقت گورافوج کے لیے کچھ ایسے ولایتی رسالے بھی آتے تھے جن کے اندر تصویروں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہم مرمر جاتے تھے۔ ایک رسالہ Men only دوسرا Lilliput تیسرا Heal of Vitality ایسے رسالے تھے جن کے اندر غضب کے نسوانی جسم آویزاں ہوتے۔ ان تصویروں کو اس زمانے میں Pin up girls کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ راما کرشنا کتابوں کی دکانوں کے ساتھ ایک چھوٹے سے کھوکھے میں دو دو کھاڑے کی دکان تھی جو صرف اپنی کتابیں بیچتا تھا۔ اس کے پاس ایسے رسالے کافی تعداد میں موجود تھے۔ وہ ایک رسالہ ایک مرتبہ دیکھنے کے آٹھ آنے لیتا تھا۔ شام تک بیٹھیں گچس روپے بنا لیتا اور رسالے اس کے پاس محفوظ کے محفوظ رہ جاتے۔

جب میں پیرزادہ ابراہیم حنیف صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو فقہ الملتح پر ان کے خیال افروز لکچر سن کر بے حد متاثر ہوا۔ انہوں نے ایک ابتدائی کتاب بھی اس موضوع پر شائع کر رکھی ہے اور بڑی ضخامت اور بڑی تقطیع کی ایک اور کتاب کا بھی ڈول ڈال رکھا تھا۔ وہ زبان میں اعراب، نشان گزاری، اعلام اور تلفظ پر بہت زور دیتے تھے۔ ہر شعر کو فنِ نرت کے مطابق پڑھنے اور اس کے مطالب صرف بھلاؤ بتانے سے واضح کرنے کا فن انہیں خوب آتا تھا۔ مجھ پر اعتبار کرنے اور میری ذات میں دلچسپی لینے کے بعد انہوں نے ایک کتاب آگے بڑھا کر فرمایا ”یہ شعر پڑھو۔“

میں نے قدرے اونچی آواز میں وضاحت کے ساتھ قیمل ارشاد کرتے ہوئے کہا:

کعبہ دل میں کیا آن کے اس بت نے مقام

دل گنہگار، گنہگار، گنہگار نہیں.....!

کہنے لگے مطلب بیان کرو، میں نے عرض کیا ”میری حد درجہ کوشش، گریز اور گریخت کے باوجود اس محبوب تم پیش اور نگار عریذہ جو نے زبردستی میرے دل پر قبضہ کر لیا اور وہاں آ کر براجمان ہو گیا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا

دل ہرگز ہرگز گنہگار نہیں ہے۔۔۔۔۔

جب میں ان کی خدمت میں یہ مطلب بیان کر چکا تو آپ نے کہا "اب اس شعر پر فن نرت لاگو کرو اور اس کا بھید بھاؤ بتاؤ۔ اس کی فطرت گزاری کرو۔۔۔۔۔ میں الوی طرح آنکھیں کھولے، کان پھیلائے اور سر ہلائے بغیر احمقوں کی طرح بیٹھا تھا۔ میں کوئی بھویوں کا لونڈا تھا جو نرت پھرت کی رمز جانتا یا میں نے کوئی شدہ مجرے دیکھے تھے جو بدن تحرک کر شعر کی تقطیع کر لیتا! پیر زادہ صاحب میری طرف اور میں ان کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر انہوں نے سسکا کر ایک ہاتھ اوپر اٹھایا، اس کی شمی گھمائی، سر کو ہلکا سا ہلایا اور کہا:

کعبہ دل میں کیا آن کے اس بت نے مقام

دل گنہگار (واہ جی واہ، سبحان اللہ) دل گنہگار!

(اور گنہگار، گنہگار نہیں؟) (یہ جو مکار ساموئیل پا کر دل کے اندر آ کر بیٹھ گیا ہے! یہ گنہگار نہیں)

جس نے بتائے بغیر قبضہ کر لیا ہے!!)

شعر کی Punctuation تبدیل ہو جانے سے شعر کا مطلب ہی بدل گیا۔ بڑا لطف آیا۔ میں نے پیر زادہ صاحب کو فوجی سیلٹ کیا تو انہوں نے سر ہل کر کہا "غالب کی شاعری میں نرت کا فن اپنے عروج پر ہے۔ اردو کے اور کسی شاعر کو اس صنف لطیف پر ایسی دسترس حاصل نہیں جو غالب کو ہے۔ اس کا مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ شعر سامنے رکھیں۔ فن نرت کی خوردبین سے اس کا تجزیہ کریں اور الگ الگ حصوں کو سروں کی طرح دبا کر اور اٹھا کر دیکھیں، مطلب خود بخود واضح ہو جائے گا۔ مثلاً اس شعر کے دیوان کا پہلا ہی شعر ملاحظہ کرو کہ

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈوبیا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

پہلے تو میں اس بات پر ہی ٹھسکا کہ یہ دیوان غالب کا اولیٰ شعر ہے۔ پھر اس کے معانی پر غور کیا تو وہی پرانے معنی ذہن میں آئے جو تشریح کرنے والوں نے بتائے اور سمجھائے تھے۔ عرض کیا "پیر زادہ صاحب کم از کم اس شعر پر آپ کی نرت کا فن نہیں چلا گا۔ بات واضح ہے اور شعر میں کوئی پیچیدگی نہیں۔"

انہوں نے میری بات سن کر بغیر آواز کے "ہونہ" کہا اور بولے "ایک تو وہ مطلب ہے جو تم سپاٹ داؤی سے سمجھ گئے ہو۔ دوسرا مطلب فن نرت وارد ہونے کے بعد یہ نکلتا ہے کہ

نہ تھا کچھ تو خدا تھا (اپنے سینے پر ہاتھ مار کر حضرت انسان کہتا ہے کہ) نہ تھا کچھ تو (میں) خدا تھا (اور اگر بدستور

کچھ نہ ہوتا تو خدا ہی رہتا) کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا! (ارے میاں اس ہونے نے مجھے مار ڈالا) ڈوبیا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں

تو کیا ہوتا۔۔۔۔۔ پھر کہنے لگے اچھا مرزا غالب ہی کا دوسرا شعر لو۔۔۔۔۔ میں نے بات کاٹ کر بڑے ادب سے کہا "حضور والا اور

شعر تو بعد میں لیں گے پہلے یہ فرمائیے کہ آپ سے کس سخرے نے یہ بات کہی کہ یہ شعر دیوان غالب کا پہلا شعر ہے؟"

کہنے لگے "سخروں سے نہ ہم بات کرتے ہیں، نہ انہیں منہ لگاتے ہیں۔ تم جیسے بد فہموں سے اس لیے کلام کر

لیتے ہیں کہ شاید روشنی کی کوئی کرن تمہارے نہاں خانہ میں اتر جائے اور تمہارا کچھ فائدہ ہو جائے۔ دو تین مرتبہ اور دیکھیں گے، پھر تم سے معذرت کر لیں گے۔ ہمارا تو بس یہی چلن ہے۔"

میں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور آپ کوئی سا بھی دیوان غالب، کہیں کا بھی چھپا ہوا، کسی بھی زمانے کا مرتب اٹھا کر دیکھ لیں، اس کا سب سے پہلا شعر

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا

کاغذی ہے پیر بن ہر پیکر تصویر کا

ہی ملے گا۔"

میری بات تیزی سے کاٹ کر بولے "وہ بھی تمہاری طرح کے جاہل اور گھماڑ لوگ تھے۔ نہ ان کے پاس علم تھا نہ عقل۔ جو شعر کسی نے اپنی مرضی سے اولین دیوان میں چھاپ دیا، سب نے دھڑا دھڑا اسی کے تتبع میں دیوان شائع کرنے شروع کر دیئے۔ یہ بھیڑیوں کی دنیا ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ تم بھی بھیڑیوں میں بھیڑ مل کر رہا کرو۔ ہمارے جیسی باتیں کرو گے تو گھٹا کٹاؤ گے۔"

میں نے کہا "غالب کی زندگی میں جو دیوان چھپا تھا، اس میں بھی یہی غزل سب سے پہلی غزل ہے۔"

فرمانے لگے "تمہیں یقین ہے کہ اس کے عہد میں جو دیوان چھپا تھا اور جس طرح سے اس نے اپنا دیوان مرتب کر کے دیا تھا، وہ اسی مطلع سے شروع ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "تاریخی شواہد تو یہی بتلاتے ہیں حضور! اور غالب شناس اس کے خطوں کے حوالے سے اسی شعر کا تذکرہ کرتے ہیں کہ نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا اور کاغذی۔۔۔۔۔"

بات کاٹ کر بولے "اس دنیا میں ایسے کاٹنے والے بہت ہیں کہ کچے دھاگے کے ٹڈلے لے دوڑے اور ہر

ایک کے سامنے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرنے لگے۔۔۔۔۔ میاں صاحبزادے اردو فارسی کے شعراء کی یہ رسم قدیم ہے کہ اپنے

دیوان کی ابتداء حمد سے یا اپنے کسی حمدیہ شعر سے کرتے ہیں۔ دوسرا التزام یہ رکھتے ہیں کہ اپنی غزلوں کو انضباطی ترتیب سے

شامل دیوان کرتے ہیں کہ تلاش کرنے میں آسانی رہے۔ چنانچہ مرزا نوشہ کا ردیف "با" اور یا کا تو کوئی شعر ان کے دیوان

میں موجود نہیں۔ البتہ "تا" کی ردیف سے ان کی غزل شروع ہوتی ہے کہ

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈوبیا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اب یہ ردیف انضباطی ترتیب سے شروع بھی "تا" سے ہوتی ہے اور اس کا یہی شعر حمیدہ بھی ہے۔ اسی لیے میں

نے اپنے مرتب کردہ دیوان غالب کو اسی اعتبار سے شائع کیا ہے اور اب تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے اپنی بے ترتیب لائبریری کی ایک الماری کے اوپر والے خانے سے

"درس غالب" کی ایک کتاب نکال کر مجھے عنایت کی۔ درج کتاب ساز کا یہ دیوان صاحب سحرے کاغذ میں لیتھو میں چھپا

فرمانے لگے "اب جب کہ تم گردو گوسفنداں سے الگ ہونے کی صلاحیت پیدا کر رہے ہو اور تم میں پہلا بوجھ اٹھانے کی اہلیت پیدا ہو چلی ہے تو حق کو تھامنے کے لیے اپنا اوک آگے پھیلاؤ اور اس تحقیق کو سنبھالنے کے لیے اندر حوصلہ پیدا کر کے سنو کہ یہ خالص میری کھوج ہے۔ اس سے پہلے نہ تو کوئی یہ راہ سمجھا اور نہ ہی کسی نے اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت محسوس کی۔" انہوں نے ذرا سارک کر میری طرف غور سے دیکھا اور میں ان کی نگاہوں کی تاب نہ لاکر بالکل ساکت ہو گیا۔

فرمانے لگے "قرآن میں کہیں بھی نماز پڑھنے کا ذکر نہیں، صلوٰۃ قائم کرنے کا ذکر ہے۔ نماز پڑھی نہیں جاتی قائم کی جاتی ہے اور یہ صلوٰۃ ایک عہد ہے۔ ایک وعدہ ہے جو بندہ اپنے خدا کے ساتھ کرتا ہے۔ صبح سویرے اٹھو، بستر پر لیٹے اپنے رب کے ساتھ وعدہ کرو کہ میں دن بھر تیری ہی عبادت کروں گا اور تجھی سے مدد مانگوں گا اور جب سارا دن گزار جائے، بھول چوک ہوتی رہے۔ تو شام کو پھر خدا کے ساتھ صلوٰۃ قائم کرو کہ اب تیرے ساتھ پھر وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے عہد پر قائم رہوں گا۔ تیری ہی عبادت کروں گا اور تجھی سے مدد مانگوں گا۔ یہ جو رکعتیں اور قیام وقعدہ وغیرہ ہے، یہ سہ مولوی کی اختراع ہے۔"

اس دن کے بعد سے میں نے نماز چھوڑ دی اور صلوٰۃ قائم کرنی شروع کر دی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ دین میں بلا سہولت ہے تو واقعی سہولت پیدا ہو گئی۔ یہ سہولت ایک ایسے عالم دین نے پیدا کر کے دی تھی جو دینی علوم پر بھی گہری نظر رکھتا تھا اور جس نے کبھی سنی سنائی یا گھڑی گھڑائی بات نہ کی تھی بلکہ ہر معاملے کو تحقیق کے ترازو میں تولتا تھا اور ریسرچ کی چھلنی میں چھاننا تھا۔ پیر زادہ صاحب علم الکلام، علوم فقہ الملغ، علوم سماوی وارض، علم لدنی، منطق استخراجی کے سمندر اور کے غواص تھے۔ ان کو الفاظ کی پٹی کے اندر ہر نوح کے گوہر معانی کا علم ہوتا تھا اور وہ کسی بھی پٹی سے اپنے علم کے زور و نفع معانی پیدا کر کے دے سکتے تھے۔ شاعری خاص طور پر کلاسیکی عربی شاعری پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ جاہلہ کے شاعر جن سے عربی زبان کا بڑے سے بڑا محقق بھی نا آشنا تھا، پیر زادہ صاحب نہ صرف اس کے کلام سے آشنا تھے بلکہ ان کے ناقد اور شارح بھی تھے۔ میں نے ان سے بڑا عالم نہ آج تک دیکھا نہ سنا نہ کتابوں میں پڑھا۔ وہ اپنی مثال آپ تھے۔ جن دنوں میں باقاعدگی سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا (اور یہ بیالیس تتالیس اور چوالیس کی بات ہے ان دنوں وہ "فلسفہ حسن و عشق" پر دس جلدوں کے اندر ایک نیا تھمیس پیش کر رہے تھے جو "فلسفہ جمال" پر ایک عظیم کتاب کی صورت میں ظہور پذیر ہو رہا تھا۔ وہ کہتے تھے، یہ میری آخری تصنیف ہے جس کے بعد میں نہیں ہوگا۔ میں نے جب کہ ان سے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ اس کے بعد آپ وفات پا جائیں گے تو وہ ہمیشہ جھڑک کر یہی کہا کرتے "حق انسان ان میں مرنا جینا کدھر سے آ گیا۔ میں کہہ رہا ہوں کہ اس کے بعد میں نہیں ہوں گا۔"

دیوار کے ساتھ لگی الماریوں میں تو ان کی کتابیں غسانس بھری تھیں لیکن فرش پر رکھے بارہ جستی فرنگوں میں ان کے مسودات تھے جن کو وہ بڑی احتیاط کے ساتھ تالا لگا کر رکھتے تھے اور کسی شخص کو ان کو قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ فرنگوں کے پاس نہ ان کی چابیوں کے پاس۔ میں نے زندگی میں بس ایک مرتبہ ان کے حکم سے ایک ٹریک کا تالا کھول کر ان

لیکن اس کا ڈھکنا اٹھانے کی اجازت نہ مل سکی۔ فرمایا کرتے تھے، ان فرنگوں میں "فلسفہ حسن و عشق" کا مواد محفوظ ہے جو اگر دوسرے ادھر ہو گیا تو سارے تھمیس کا تانا بانا بکھر جائے گا اور پھر اس کی شیرازہ بندی نہ ہو سکے گی۔ میں نے کبھی دیکھا تو نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ان فرنگوں میں اجسام وابدان کی ایسی نایاب تصویریں تھیں جنہیں اس علاقے کے لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تاریخ جمالیات کے اس عظیم سکار کی تقریباً ساری زندگی حسن کے مختلف زاویوں کا مواد اکٹھا کرنے میں صرف ہوئی تھی اور ابھی وہ اور مواد جمع کر رہے تھے۔

میں جب کبھی اپنے آپ کو قریب سے دیکھتا ہوں تو خود کو بہت ہی فرسودہ، روایت پرست، ماضی گزیدہ اور رکھ پوجا کا آدمی پاتا ہوں۔ میرے ساتھ کے دوست وقت کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اور انقلاب کی تند و تیز لہروں میں سوار ہو کر کہیں کے کہیں پہنچ گئے اور میں انہی پائمال اور خوار زبوں روایتوں کے جال میں الجھ کر وہیں کا وہیں رہ گیا۔ میرا وجود ایسا روایت پرست ہے کہ ابھی تک اسی زمین پر چل پھر رہا ہے جو بڑی دیر ہوئی ایک پٹانے کے ساتھ معرض وجود میں آئی تھی۔ میں ابھی تک اسی سورج سے گرمی اور روشنی حاصل کر رہا ہوں جس کا سن شریف ارب ہا بلکہ پدم ہا سالوں سے بھی زیادہ ہے۔ ابھی تک وہی گندم کھارہا ہوں جس کا ایک دانہ بھولے سے میرے جد امجد نے کھالیا تھا اور ان کو عمر ہے اتار کر فرش پر پہنچا دیا گیا تھا۔ میں ابھی تک انہی سمندروں پر کشتی رانی کر رہا ہوں، انہی دریاؤں کا پانی پیا رہا ہوں انہیں چھاڑوں کے اندر شکار کھیل رہا ہوں جو بگ بینگ کے ساتھ معرض وجود میں آئے تھے۔ پتہ نہیں میں اس قدر کاہلی اور ایسا پھسندی کیوں ہوں۔ میرے سارے ساتھی ان آثار کہن کو چھوڑ کر کہیں کے کہیں پہنچ گئے اور میں ابھی تک اس جگہ پر دام پڑا ہوا ہوں۔

لیکن اس ساری کاہلی، کشتی اور گراں جانی کے باوجود میں نئی تحقیق سے اور ریسرچ سے متاثر ضرور ہوتا ہوں۔ اس کا حسن و جمال میری نگاہ کو کبھی بھی نہ کرتا ہے۔ میں اس کے قریب جا کر کھڑا بھی ہوتا ہوں۔ بڑے سجاؤ اور پردگی کے ساتھ اپنا آپ بھی اس کی خدمت میں پیش کرتا ہوں لیکن تحقیق و تفتیش اور ریسرچ مجھے پورا کا پورا قبول نہیں کرتی۔ میرے کچھ چھوٹے اور روئے ماضی کے ساتھ بھی چھپے روئے جاتے ہیں اور میں پورا نعرہ مار کر جدید کے ساتھ وابستہ نہیں ہو سکتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تحقیق و تفتیش کی عقیدت ہندی کا دم نہیں بھرتا۔ اس کا احسان منداور نشان گزار نہیں ہوتا۔ اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ میں ریسرچ کا رسیا ضرور ہوں لیکن اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر ڈوٹ گانے والوں کی طرح جھولنے نہیں لگتا۔ ریسرچ کا رلبتہ مجھے ہلا کے رکھ دیتا ہے۔ اس کی عظمت کا "لے سو" مجھے بار بار کچلتا اور قدم قدم چھوڑتا رہتا ہے، لیکن اپنی مرضی اپنی خواہش اور اپنے موع میلے سے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میرے اندر بھرپورستی کا مادہ زیادہ ہے اور میں ہر صاحب کرشہ و کرامات کی ہر وقت چوکی بھرتا رہتا ہوں۔

ایک روز میں اورنگ نگر تو نسوی مکتبہ جدید کی کیوسک کے سامنے کھڑے ہاتھیں کر رہے تھے کہ وہاں بلونٹ سنگھ آ گیا۔ ان دنوں مکتبہ جدید کی طرف سے اس کی کتاب "جگا" چھپ رہی تھی اور اس کی افسانہ نگاری کا طوطی ہندوستان کے اور دواڑ علاقوں میں بول رہا تھا۔ وہ نیلے رنگ کے خوبصورت سوٹ میں ملبوس سرخ رنگ کی ٹائی لگائے اور ہلکے نسواری

رنگ کی جھوٹ دار پگڑی باندھے نئے آنے والے رسالوں کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس نے فکر سے، مکتبہ اردو اور دیگر سال کے بارے میں کچھ کاروباری باتیں کیں اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "تم اب تک دو افسانے سنا چکے ہو، چھاپا ایک بھی نہیں، کیا ڈرتے ہو؟" میں نے کہا "ہرگز نہیں سردار جی۔ میرے دونوں افسانے "ادبی دنیا" اور "ساقی" میں چھپ چکے ہیں اور ایک ہمایوں کو بھجوا رکھا ہے۔ دیکھیں کب چھپتا ہے۔ اس نے ایک سینئر ادیب کی طرح میرے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دی اور "شاباش شاباش" کہہ کر پھر رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔

فکرتو نسوی نے ایک جھٹکے دار "لوڈ" کے ساتھ کہا "یہ بھی آگیا بائبل۔ پکی پکائی گھل" ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دیوندر سیٹھارتھی اپنا لمبا کوٹ کالی ڈاڑھی اور سیاہ زلفیں پہنے ہمارے قریب پہنچ کر رک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چڑے کا ایک گھسا پٹا بریف کیس تھا۔ پاؤں میں نرئی کی جوتی اور کندھے پر ایک چیکٹ سا مظہر جھول رہا تھا۔ بلونت سنگھ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور عاسلام کیے بغیر پھر رسالوں کی ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔

دیوندر سیٹھارتھی بار بار فکرتو نسوی سے اپنے نئے افسانے کا عنوان پوچھ رہا تھا اور فکر یہ کہہ کر جان چھڑا رہا تھا کہ کسی روز مکتبہ آ کر افسانہ سنانا تا پھر عنوان پوچھتا اور دیوندر یہ کہہ رہا تھا کہ تم یہ افسانہ دو مرتبہ سن چکے ہو اور جان بوجھ کر اس کا عنوان طے کرنے میں میری مدد نہیں کر رہے ہو۔ تم گھڑیاں کی جون بھتو گے اور اس کے بعد بھی تمہارا کلیان نہیں ہوگا۔ جو کوئی علم کا دھارا کسی سے روک کر رکھتا ہے، وہ سنسار کی جون بھت کرکٹ پالتے چوہے کی جون میں داخل ہوتا ہے۔ جنگلی خار پشت کی جون میں۔

فکر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور میری طرف منہ کر کے کوئی نہایت ہی غیر ضروری اور غیر اہم بات کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اسنے میں چھوٹے قد کا ایک سانولا سانو جوان بے حد قیمتی سوٹ پہنے اور اپنی ٹائی میں سونے کی پن لگائے ہاتھ میں خاک کی کاغذ میں لپٹا ایک چھوٹا سا پیکٹ اٹھائے ہمارے پاس پہنچ کر رک گیا۔ اس کلین شیو گول منول جھینپے جھینپے اور رکتے رکتے آدی کو میں نے کہیں دیکھا تھا لیکن مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ شاید اس کا فونو کہیں چھپا تھا یا اس سے بالمشافہ کوئی بات ہوئی تھی یا کسی محفل میں اسے دور سے دیکھا تھا۔ دیکھا ضرور تھا لیکن اب میری یاد سے اس کی شبیہ پکڑی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے باری باری ہم سب سے کچھ کہے، کچھ بولے یا سلام کیے بغیر ہاتھ ملایا اور پلٹ کر سامنے کا رسالہ اٹھانے کو بڑھا تو چودھری بشیر نے اپنے کھاتے سے سر اٹھا کر اونچی آواز میں "اوہو" کہہ کر اپنا بازو آگے بڑھا دیا۔

"آپ کب آئے شہاب صاحب..... کوئی اطلاع ہی نہیں دی۔" شہاب صاحب نے شرمیلی آواز میں منمناتے ہوئے کہا "اچانک آنا ہو گیا، ایک سرکاری میٹنگ تھی۔ تین دن دلی میں رہی۔ ایک روز کے لیے لاہور چلی آئی، اسی سے فارغ ہو کر آ رہا ہوں۔"

مجھے قدرت اللہ شہاب کی شاعری نے بہت متاثر کیا تھا اور میں بڑی دیر سے اس سے ملنے کا آرزو مند تھا۔ حال ہی میں اس نے افسانے بھی لکھنے شروع کر دیے تھے لیکن جو لطف اس کی شاعری میں تھا، وہ اس کے افسانوں میں نہیں ملتا تھا۔

میں نے کہا "شہاب صاحب کالج کے زمانے میں ہم نے بڑی محبت اور چاہت کے ساتھ شیلے کا مطالعہ کیا ہے لیکن اس کا حسن بیان اس وقت تک نہ کھل سکا جب تک ہم نے آپ کا ترجمہ نہیں دیکھا..... آپ کے بیان میں بڑا زور ہے۔"

"کس کے بیان میں زور ہے؟" کسی نے پیچھے سے پکار کر پوچھا۔ ہم سب نے پلٹ کر دیکھا مخور جالندھری اپنا دوسرا چہرہ لیے مخصوص انداز میں مسکرا رہا تھا۔

دیوندر نے کہا "ہم شہاب کی شاعری کا ذکر کر رہے تھے کہ اس کے بیان میں بڑا زور ہے۔ اوپر سے جالندھر کا زور آ رہا ہے۔"

مخور نے کہا "نہیں نہیں..... شہاب نظم کی نسبت کا ڈھنگ خوب جانتا ہے اور اصل پر حاوی ہو کر ترجمہ کرتا ہے۔" پھر اس نے شہاب سے ہاتھ ملایا اور کچھ ایسی باتیں کرنے لگے جیسے ایک دوسرے کو عمر سے جانتے ہوں۔

شہاب نے کہا "اگر آپ کے پاس وقت ہو تو ہم یہاں قریب ہی کسی ہوٹل پر چل کر چائے پیتے ہیں۔"

سیٹھارتھی نے کہا "چائے بھی پیتے ہیں اور ساتھ کچھ نقل بھی کرتے ہیں۔ نظام ہوٹل میں دونوں بیڑوں کا بے حد اچھا انتظام ہے۔ آؤ ناشن شرط ہے۔"

شہاب مسکرایا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے، وہیں چلتے ہیں۔"

جب ہم نظام ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے اور شہاب کے چائے کے آرڈر پر ڈرا اور کھل کر بے فکر بیٹھ گئے تو سیٹھارتھی نے میرے سے کہا "اور ساتھ بھی کچھ....."

ہم سب نے کہا "کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ وہ تو ساتھ ہی ہے..... وہ تو ہوتا ہی ہے۔"

اس روز میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ میں شہاب کی شاعری کے علاوہ اس کی آئی سی ایس شپ سے بھی متاثر ہوں..... بلکہ اس سے کسی حد تک زیادہ ہی متاثر ہوں۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے میرے سینئر ادیب بھی اس کے کام سے بڑھ کر اس کے دام سے متاثر تھے۔ وہ اس وقت اردو کا واحد ادیب تھا جو آئی سی ایس تھا۔ آئی سی ایس ہونا بڑے جوکھوں کا کام تھا۔ ہر کوئی اس دریا کو پار نہ کر سکتا تھا۔ بڑے بڑے نامی گرامی بیرونی چھوٹی چھوٹی لہروں کے پیچھے اور کٹورہ بھر گر داب میں ڈوب جاتے تھے۔ دس ہزار امیدواروں میں سے کوئی ایک سرے چڑھتا تھا۔ لوگ اسے دیکھنے دور دور سے آتے۔ ان کو تو کیا کہتے، اخبار میں چھپی ہوئی تصویروں پر ہی اکتفا کر کے خوش ہو جاتے۔ اس زمانے میں لوگ آئی سی ایس افسروں کے نام بھی جانتے تھے۔ ناموں کی مہارانی مختلف صوبوں کی مختلف زبانوں میں دہرائی جاتی تھی اور لوگ اپنے اپنے پسندیدہ آئی سی ایس کے بارے میں ایک دوسرے کو معلومات فراہم کرتے رہتے تھے۔ ولایت کے آئے ہوئے گورے آئی سی ایس تو پھر کبھی نہ کبھی نہ کبھی نہ کہیں نظر آ جاتے تھے لیکن آئی سی ایس کے مقامی آئی سی ایس کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ ایک تو وہ دفتر

پکھری جانے کے علاوہ باہر نہیں نکلتے تھے، دوسرے اپنی کوشیوں اور بنگلوں کے لانوں میں گورے آفسروں کی طرح ایکسر سائز نہیں کرتے تھے۔ کالے لوگوں سے دور دور رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کالے لوگوں کے قریب آنے سے ان کی تمکنت میں ممکنہ پیدا ہو جائے گی اور ایسی لوگوں کا ان سے ملنا ممکن ہو جائے گا۔

اتنی ساری بندشوں کے باوجود اور ایسی مانتھا لوجی کے باوصف ایک بھر پور آئی سی ایس آفسر جس نے انگریزی کمپی ٹیشن کا ایک بین الاقوامی انعام جیتا تھا، ہمارے درمیان مزے سے بیٹھا ہم سے باتیں کر رہا تھا اور ہمارے جیسی بائیں کر رہا تھا۔

محمود جالندھری نے کہا ”شہاب صاحب آپ کی پھر ویسی کوئی نظم دیکھنے کو تیلی جو شیلے کی کسی نظم کے ترجمے کی صورت میں ادبی دنیا میں چھپی تھی۔“

شہاب نے کہا ”اب کچھ عرصے سے افسانوں پر توجہ ہو گئی ہے لیکن ان کا بھی وہی حال ہے، نظموں جیسا۔ ہر لعلت!“

سیستھارتھی نے کہا ”کہانیوں کو تو خیر کچھ نہ کہیے وہ تو اپنے انداز میں ٹھیک چل رہی ہیں، کرشن اور اوپندر سے بہت کر، ان میں تو بڑی جان ہے۔“

محمود نے کہا ”لیکن ان کی جان کا ہیرا سن نظموں میں بند ہے۔۔۔۔۔۔ وہ کیا ہے شہاب صاحب۔۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔۔“

شہاب نے کہا ”مجھے تو کچھ یاد نہیں۔ وہ تو شیلے کے کاہوس نے پکڑا لیا اور حکماً ترجمہ کروا لیا۔ بس ایسے ہی ہے۔“

میں نے کہا ”اس نظم کا عنوان ہے ”سہاگ گیت“ اور یہ ایک کورس کے روپ میں ہے۔ آج سے پانچ سال پہلے یہ ادبی دنیا کے اکتوبر 40ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ ہم نے اس کی ایک سٹیسی ڈھن بنا کر کالج ٹیوٹوریل گروپ میں اس کی ریڈنگ کی تھی اور لڑکیوں کا رول بھی لڑکوں نے ہی کیا تھا؟“

”کیوں؟ لڑکیوں کو کیا ہوا؟“ بلونت سنگھ نے سنجیدگی سے پوچھا تو دیوندر سیستھارتھی نے بھولا سامنہ بنا کر کہا ”ان کو پسند نہیں ہوگا۔ یہ جو پنجاب کی لڑکیاں ہیں ناں یہ شانتی نکلتیں جیسی لڑکیاں نہیں کہنا چاہتی ہوئی کلاس میں آئیں اور ناچتی ہوئی واپس جائیں۔ ان میں اور ان میں فرق ہے۔ یہاں منافقت ہے۔“

فکر تو نسوی کو پنجاب کی لڑکیوں کے بارے میں سیستھارتھی کا یہ خیال کچھ اچھا نہ لگا۔ اس نے بدلہ لینے کی غرض سے اپنی باچھیں کھینچ کر کہا ”تم یہ بتانا چاہتے ہو کہ تم نے شانتی نکلتیں دیکھا ہے اور ٹیگور کے ساتھ فوٹو کھینچا ہے۔۔۔۔۔۔ پھر اس میں کیا بڑائی ہے؟ یہ کوئی شجی کی بات ہے۔ شانتی نکلتیں کوئی بھی جاسکتا ہے۔ کرایہ ہونا چاہیے۔“

میں نے کہا ”ہم نے جب کالج ٹیوٹوریل میں اس نظم کا نیوچریشن کیا تھا تو ہم لوگ دو ٹکڑیاں بنا کر آنے سامنے نہیں بیٹھے تھے بلکہ ایک ہی گروہ میں گھل کر بیٹھے تھے اور اپنا اپنا ڈائیلاگ آجانے پر اسی ٹکڑی کے اندر اسی طرح۔ ادا جی شروع کر دیتے تھے مگر ایک اور مجید بھاؤ کے اندر۔۔۔۔۔۔ نظم تھی۔“

رات! جلادے جلدی جلدی دیکھ مالا تاروں کی تو

بھر بھر تھا لٹا دے موتی جھولی میں گھزاروں کی تو۔۔۔۔۔۔!

چاند کی کرنوں کو بن بن کے سندر صورت بیچ بچھا دے

دکھ داتا ہے دن کی آگنی، سورج دیو کی جوت بچھا دے

آ جاسندر پنوں والی! جھوٹے حیلے اور بہانے!

رات کے گھونگھٹ میں کیا ہوگا۔۔۔۔۔۔ ہائے کوئی یہ کیا جانے!

جاری سکھی! آ کاش کے تارے آج ترے رکھوالے ہوں گے

سکھ سنگت کی ریت منانے، جھوم جھوم متوالے ہوں گے

پریم کی اونچ اور نیچ سے تھک کر، پیاری سکھی جب تو سو جائے

سندر سندر، کوئل کوئل، ٹھنڈے پنوں میں کھو جائے

رہ رہ کر یوں ڈرتا ہے من، تو اپنی ہے وہ بیگانے

رات کے گھونگھٹ میں کیا ہوگا۔۔۔۔۔۔ ہائے کوئی یہ کیا جانے

رات کا پل پل بڑھتا جائے، دن کی گھڑیاں سوئی جائیں

اوپر نیچے نیچے بہت میں سورج کی کرنیں کھوتی جائیں۔۔۔۔۔۔!

کرند کرند کے بجلی جے، کالی بدلی میں کھو جائے

جیسے کالے بالوں والی تاریکی میٹھی بال سکھائے۔۔۔۔۔۔!

جاری سکھی، پر تیرا جانا۔۔۔۔۔۔ دل ہی نہ مانے

رات کے گھونگھٹ میں کیا ہوگا۔۔۔۔۔۔ ہائے کوئی یہ کیا جانے

سہلی کر: نیند کے ماتے نیند بھلا دیں، پریم کا ساگر جب لہرائے

من کا راگی من مندر میں میٹھی میٹھی تان اڑائے

جیسے من کی پیٹنگ بڑھا کر چنچل آشا جھولا جھولے

یا جیسے رات آئے بسنتی، کھیت کھیت میں برسوں پھولے

روٹھ روٹھ کے بیٹھے کوئی۔۔۔۔۔۔ کوئی ڈھونڈے چور بہانے

رات کے گھونگھٹ میں کیا ہوگا۔۔۔۔۔۔ ہائے کوئی یہ کیا جانے

جب میں تقریباً اسی انداز اور اسی رہاؤں میں یہ نظم سنا چکا تو ہر ایک نے جی بھر کے داد دی۔ شہاب صاحب ایک ہی دم اتنی ساری داد وصول کرنے کی ہمت نہ رکھتے تھے، پہلے ذرا سے جھینپے پھر شرماے اور بعد میں آبدیدہ سے ہو کر سر جھکا کے بیٹھ گئے۔۔۔۔۔۔ ہم سب نے محسوس کیا کہ کسی کسی آئی سی ایس میں ایک انسان بھی ہوتا ہے۔ ایک جاتا ہوا سا انسان۔ وجود کی

گلی کی بکڑ پر۔ تھوڑا سا نظر آتا ہوا باقی سب گزرا گزرا اور کندھا بدل بدل کے بڑھتا ہوا!

یہ شہاب صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔ ان دنوں وہ اوڈیسہ میں اسٹنٹ کاشنر تھے اور کسی میٹنگ کے سلسلے میں دارالحکومت وئی آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو ان کی کہانیوں اور نظموں سے کہیں زیادہ بلند پایا۔ ان میں ایک عجیب طرح کا پیارا پن اور ایک عجیب طرح کی شرمناک تھی۔ یہ بچیاں ان لوگوں میں ہوتی ہے جن میں کسی قسم کا مالی، جانی، باہی، جانی یا علمی، شکی اور عقلی تکبر نہیں ہوتا اور جو کسی کو بتائے بتائے سنائے دکھائے بغیر آسانیاں عطا کرتے رہتے ہیں۔ کئی سال بعد اسی روم میں مجھے ان کا خط ملا کہ ”بڑی مشکل سے تمہارا پتہ حاصل کیا ہے۔ میں ان دنوں ہالینڈ میں ہوں۔ ایک کورس ہے جس کی تکمیل پر قریباً دس ماہ لگیں گے۔ پھر پاکستان جاتے ہوئے چند روز روم میں گزراؤں گا اور تم سے ملاقاتیں رہیں گی۔“

میں نے اس خط کا فوری جواب یہ لکھا کہ دس ماہ بعد پاکستان جاتے ہوئے تو ضرور روم ٹھہر کر جائے لیکن ابھی آنے میں کیا حرج ہے۔ ویک اینڈ کے ساتھ کوئی چھٹی ملا کر آ جائیں۔ دو تین روز میرے پاس رہیں۔ پھر واپس ہالینڈ چلے جائیں۔ ہالینڈ کونسا دور ہے۔ بات یہ ہے، میں نے لکھا کہ کتاب روم کا مطالعہ کرنے کے لیے اس کی فہرست مندرجہ ذیل سے پہلے آگاہ ہونا ضروری ہے اور یہ تھا ضابطہ پورا ہو سکتا ہے کہ روم کی سیر کرنے کے لیے پہلے چند روز آ کر روم کو پرے پرے سے دیکھا جائے۔ پھر گھر واپس جا کر اس ”ویڈ“ کے ساتھ چند مہینے رہا جائے، پھر وقت مقررہ پر آ کر روم کی سیر کی جائے۔ روم ایک دن میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک ہفتے میں بھی اور اسی طرح ایک مہینے کے اندر بھی اور ایک سال میں بھی لیکن مشکل یہ ہے کہ جو لوگ کئی سالوں سے یہاں رہ رہے ہیں، انہوں نے بھی روم نہیں دیکھا۔ پورا روم نہیں دیکھا، اس کے حصے بخرے ضرور دیکھے ہیں۔

میرے ایسے لے بے خط کا جواب شہاب صاحب نے نہایت مختصر دیا کہ ”فی الحال نہیں آ سکتا، بہت مشکل ہے۔ دو چھٹی مل سکتی ہے نہ اجازت۔ اگلے ہفتے امتحان ہے، اسے چننا کر سوچ سکتا ہوں لیکن اس کے بعد پھر ایک ٹیسٹ ہے۔ آپ میرے تھوڑا لکھنے کو بہت سمجھیں اور معذور جان کر معاف فرمادیں۔“

میں نے انہیں معاف تو کر دیا البتہ ہمارے درمیان خطوں کا ایک لنگڑا سا سلسلہ ضرور شروع ہو گیا۔ جس روز میں روم پہنچا تو وہ دن اور اس سے اگلا دن تو میں نے اپنے کمرے میں گزارا لیکن باہر نکلنے پر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ٹیکسی لے کر پرنسٹن قبرستان پہنچا اور شیلے کی قبر پر ایک گلدستہ اپنی طرف سے اور دوسرا شہاب صاحب کی طرف سے بعد بجز و نیاز اس سل کے قدموں میں رکھا جس پر شیلے کا نام اور اس کی تاریخ وفات لکھی تھی۔

شیلے کی قبر ایک چھوٹے سے اہرامی کنارے کے قریب واقع ہے اور اس کا تعویذ زمین کے ساتھ ہموار صورت میں بیوست ہے زیادہ اوپر اٹھا ہوا نہیں۔ نہ ہی مزار کے پاس کوئی لوح یا صلیب ایستادہ ہے۔ نہ ہی اس کا کوئی چہرہ یا جنگلا ہے۔ بس ایک بڑی سی سنگ مرمر کی سل ہے اور اس پر مرنے والے کی نشانی رقم ہے۔

میرے پاس میرا کیمرو تھا اور اس کے شرف میں کوک بھر کر اپنی بھی تصویر لی جاسکتی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ سامنے

کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں کیمرو رکھا جاسکتا۔ میں نے پتھر کے ایک ٹوٹے پر کیمرو رکھ کر دیکھا تو لیول بہت نیچا تھا۔ اگر میں قبر کی لوح پر لٹ بھی جاتا تو بھی تصویر نہ آ سکتی تھی لیکن شیلے کی قبر پر آ کر تصویر کھنچوائے بغیر چلے جانا میرے لیے موت کا پیغام تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی۔ کپاس کے جھاڑ کی سی ایک سوئی نما لکڑی قریب ہی مل گئی۔ اس کو ایک قبر کی جڑ میں بکڑ کر اس کے ساتھ کیمرو لٹکایا تو کیمرو کے وزن کی وجہ سے لکڑی ٹوٹ گئی۔ نہایت ہی قیمتی کیمرو بری طرح سے زمین پر گر گیا۔

اہرام کی طرف سے آنے والے ایک شخص نے میری مصیبت کو بھانپا اور میرے قریب پہنچ کر نہایت صاف اور واضح انگریزی میں پوچھا۔ ”آپ اپنی تصویر بنانا چاہتے ہیں؟“

میں نے کہا ”جی۔“

پوچھا ”شیلے کی قبر پر یا اس کے احاطے میں کسی بھی اور جگہ؟“

میں نے کہا ”شیلے اور صرف شیلے کی قبر پر۔۔۔۔۔ میں سات ہزار میل کی دوری سے یہاں فوٹو بھی کھنچوانے آیا ہوں اور میرا دھڑانے کا کوئی مقصد نہیں۔“

اس نے کیمرو میرے ہاتھ سے لے کر کہا ”بھینس۔“

میں پتھر کی اس سل کے سامنے دوڑا تو سا بیٹھ گیا تو اس شخص نے دو چار انگلیں ادا کر کے بنا کر کہا ”آپ کی یہ نشست ٹھیک نہیں، لوح آتی ہے تو آپ کا چہرہ کٹ جاتا ہے۔ آپ کا چہرہ کپوڑ کرنا ہوں تو سل کا ایک کونا کٹ جاتا ہے۔ آپ اس سل پر چڑھائی کے رخ دونوں ہاتھ رکھ کر سو گوار انداز میں سر جھکا کر بیٹھیں تو ٹھیک رہے گا۔“

میں نے اس کی بات مان لی اور دونوں ہاتھ سل پر رکھ کر اور بدن کا بوجھ ہتھیلیوں پر ڈال کر غمناک انداز میں سر جھکا کر بیٹھا تو اس نے کہا ”بالکل ٹھیک ہے۔ سر ڈالنا اور جھکا دیں۔ چہرے پر دکھ کے آثار پیدا کریں۔ آنکھیں کھلی رکھیں اور آنکھیں عبارت پر رکھیں۔ میں سامنے سے نہیں بلکہ پہلو کی جانب سے پروفیل بناؤں گا۔ بس۔۔۔ خاموش۔۔۔ ریڈی۔“

اس نے میری اسی طرح بیٹھے بیٹھے اسی مقام سے دو سیٹ شٹ لے لیے اور کیمرو مجھے لٹا دیا۔ جب میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا ”میرا نام کندوٹی ہے۔ مار یو کندوٹی اور میں ہفتے میں دوبار شیلے کی قبر پر ضرور آتا ہوں۔ یہ جو میں نے انگریزی سیکھی ہے تو اسی شاعر بے بدل کی یاد میں سیکھی ہے۔“

مار یو کندوٹی کی عمر کوئی ساٹھ پینسٹھ کے پنے میں تھی مگر وہ اپنی عمر کے مقابلے میں بہت جوان نظر آتا تھا۔ دراز قد، بھرے بھرے کندھے، مضبوط جسم، ہلکا گندمی رنگ اور مسکراتی ہوئی آنکھیں۔۔۔۔۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا دادا سینورا جو یو کندوٹی بندر گاہ پر سامان ڈھوتا تھا لیکن اپنی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے مزدوروں کا میٹ بن گیا۔ اس کی ملاقات تو جوان شاعر سے ڈور کی بندر گاہ پر ہوئی تھی۔ جب اس نے شیلے کو گود میں اٹھا کر دوسری کشتی میں اتارا تھا۔ پایاب ساحل پر کشتیاں مل کر ایک دوسری سے بچ رہی تھیں اور شیلے کے لیے ایک کشتی سے دوسری میں منتقل ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ میرے دادا نے کوئی بھر کر حسن کے اس مجھے کو آٹن واحد میں دوسری کشتی میں اتار دیا۔ کشتی کی سیٹ پر بیٹھے ہی جب اس مجسمہ حسن و خوبی نے

اپنی بڑی بڑی حیران نگاہوں سے میرے دادا کی طرف دیکھا تو میرا دادا اس یونانی دیوتا زادے کا اسیر ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور دونوں میں دوستی ہو گئی۔

ماریو نے کہا "میرا دادا ایک سو گیارہ سال کا ہو کر فوت ہوا لیکن اس ان پڑھ مزدور نے انگریزی زبان پر ایسا عبور حاصل کیا کہ کٹس جیسے تنگ مزاج اس کو اپنی نظمیں دکھا کر رائے لیا کرتے تھے اور انگریزی روزمرہ میں اس سے مشورہ لے کر مصرعوں کا رخ بدلا کرتے تھے۔ پھر جب شیلے نے اپنی ازدواجی زندگی سے تنگ آ کر اپنی محبوبہ کے ساتھ روم منتقل ہونے کا پروگرام بنایا تو میرے دادا کو اس کی جنت گم گشتہ ہاتھ آ گئی۔ اپنا آبائی وطن باپ دادا کا شہر، پوپ کی قربت، پرانے یاروں کی سنگت، میرا دادا شیلے سے بھی پہلے روم پہنچ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔"

یہ مزدور پیشادور جفاکش لوگ بڑے قابل اعتماد ساتھی ہوتے ہیں۔ میرا دادا بھی ایسا ہی یاروں کا یادگار یاروں کا پیارا تھا۔ روم پہنچ کر اس نے گلہ بانی، درخت کٹائی اور کوہ پیائی کا کام شروع کر دیا۔ جنگل میں درختوں کے ٹھیکے سے اسے کافی آمدن ہونے لگی اور اس کے پاس دوستدار یوں کے لیے دافر وقت کا ذخیرہ عام ہو گیا۔

میرے والد کو انگریزی زبان پسند نہ تھی جیسی مجھے یا میرے دادا کو تھی۔ اس نے میرے دادا سے تھوڑی بہت سیکھی ضرور لیکن اس کا اصل عشق نجاری تھا۔ وہ روم بھر میں اپنے وقت کا اعلیٰ درجے کا بروہی تھا اور اس کے ہاتھوں میں ہر قسم کی لکڑی موم کی طرح ہر صورت میں ڈھلتی جاتی تھی۔ وہ ایک آرٹسٹ ضرور تھا لیکن اسے زبان سے یا زباندانی سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ میرا دادا جب بھی کوئی مشکل نظم یا پیچیدہ فلسفہ اس کے سامنے پڑتا تو وہ سمجھ ضرور لیتا لیکن اس سے زیادہ لطف اندوز نہ ہو سکتا۔ اپنے باپ کے مقابلے میں اپنے دادا کا زیادہ چہیتا تھا کہ میں اس کی ادبی لطف بازیوں میں برابر کا ساتھ دیتا اور کبھی کبھی اس سے پیچیدہ سوال پوچھ کر اسے گھٹتی لڑنے پر بھی مجبور کر دیتا۔

ماریو کندوتی میرے ساتھ کوثر میں ڈھلی انگریزی اور خالص لندن کے مخزنج میں بات کر رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بی بی لندن سے خبریں سن رہا ہوں اور اس کے تھوڑی سی دیر بعد یہی شخص خبروں پر تہرہ بھی شروع کر دے گا۔ پہلی ہی ملاقات میں میں کندوتی فیملی سے یوں گھل مل گیا جیسے میرے دادا ان کے صدیوں کے تعلقات ہوں۔ میری انگریزی سخن دانائی اور گفتگو تو اس جیسی نہ تھی لیکن تازہ علمی اور ادبی معلومات میرے پاس زیادہ تھیں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اس لیے بھی بہت پسند کیا کہ ہماری گفتگو کا بیشتر موضوع شیلے، اس کی شاعری اور اس کی زندگی سے متعلق تھا۔ اس کے گھر میں اس کے دادا کے ساتھ شیلے کی کئی تصویریں تھیں جنہیں انہوں نے دادا کی وصیت کے مطابق عام نہیں کیا تھا۔ کمرہ بند کر کے، پردے کھینچ کے اور دو قفل شدہ کھول کر ماریو نے ایک مرتبہ یہ فوٹو دکھائے تھے اور پھر ان کو کوئی تذکرہ نہ کیا تھا۔

ماریو نے کہا کہ میرا دادا بتایا کرتا تھا کہ میں شیلے کا اور اس کی شاعری کا دیوانہ تھا۔ وہ اپنے سیاہ ہتھکڑیا لے بالوں کے نیچے شفاف آنکھیں کھول کر فضا میں تکتا تھا تو سامنے کا سارا خلا با معنی ہو جاتا تھا۔ اس کی باتیں، اس کے نظریات، اس کے خیال اور اس کی پیش گوئیاں پتھر یوں کی طرح سطح زمین پر پھیل جاتی تھیں اور پھر ان پر تصورات، چندار اور انگار کی تتلیاں رقص کرنے لگتی تھیں۔ وہ اٹلی کی شراب اور روم کی عورتوں کا عاشق تھا اور ہر اس شے کا دیوانہ تھا جو اس کی

گاہوں میں حسین تھی۔

دادا کہتا ہے کہ جس روز "تو اور تو" کی جھیل میں اس کی کشتی ڈوبی ہے، میں عین اس وقت کلوزیم کی دیوار پر رسد پھینک کر کند سے اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے نیچے بہت سے تماشائی جمع ہو گئے تھے جن میں سے کچھ مجھے ایک کوہ پیما کی حیثیت سے جانتے بھی تھے۔ یہ آٹھ جولائی کی ایک گرم اور اسی ہوئی شام کا ذکر ہے۔ جب میں کلوزیم کی ستواں دیوار پر بہت اوپر کاٹی اونچا چڑھ گیا تھا۔ دادا کہتا ہے کہ اس وقت کسی نے نیچے سے بہت اونچی آواز میں پکار کر کہا "تجھارا جگری یار اور پیارا شاعر شیلے پانی میں ڈوب کر مر گیا ہے اور اس کی کشتی پچھاڑی کے اندر غرق ہو گئی ہے۔" میں بجلی کی سی تیزی سے رستے پر پڑتا ہوا نیچے آیا اور میرے ہاتھ اور پاؤں رے کی رگڑ سے ادھر دھر جمل اٹھے۔

دادا بتاتا تھا کہ جب ہم جائے حادثہ پر پہنچے تو بائرن اور لی ہنٹ بھی کبھی میں سوار وہاں پہنچ چکے تھے۔ ان کے ساتھ سپاہیوں کا ایک ویسا ہی دستہ تھا جو ایک روز پہلے میلہ آفیسر کے ہمراہ یہاں پہنچا تھا۔

گورگنا، کا پرانی اور ایلاہا جزیروں کے درمیان ٹھانٹھیں مارنا ہوا سمندر ہمارے سامنے تھا اور ہم اس مقام اور اس فضا کے طلسم میں جکڑے ہوئے تھے جو شیلے نے اپنی موت کے لیے پسند کی تھی۔ پتھر ملی چٹانوں پر گزرے ہوئے موسموں کے سرد و گرم چشیدہ پرانی وضع کے روشنی کے مینار ایک کھلی قوس میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے سنگ مرمر کی دی ہوئی کھائیوں کا ایک ذخیرہ دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس وقت سمندر کے بڑے بڑے تھیرٹروں کے سوا اور کوئی آواز نہ تھی۔ ہر طرف اک بڑکا عالم تھا۔ خوف کی فضا نے دور دور تک چھاؤنی چھائی تھی اور ہر شے پر سے ایک سم کا سایہ گزر رہا تھا۔ دادا کہتا ہے کہ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ شیلے کو اپنے آخری سفر کے لیے اس سے بہتر اور کونسا مقام نصیب ہو سکتا تھا۔ تقدیر نے اس کی کسی اچھی رہنمائی کی۔

کشتی الٹ جانے کی وجہ سے شیلے کی لاش ریت میں جھنس گئی تھی اور وقت گزر جانے پر پتھروں میں جھنس گئی تھی۔ دادا کہتا ہے کہ ہمارا رویہ اس وقت بھیڑیوں اور شکاری کتوں سے بھی بدتر تھا کہ ہم پتھروں تلے سے اس کی لاش پانی کے اندر ہی گھینٹے گھینٹے ایک ہموار مقام کی طرف لے جا رہے تھے۔ مَرُودوں کو چونکہ زندہ کے افعال اور کردار پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا، اس لیے ہم شیلے کی خستہ اور برہنہ لاش کو نوچ نوچ کر آگے کی طرف کھسار رہے تھے۔ اس کھینچ تان میں شیلے کی لاش دور تک ادھڑتی، بجھتی، کھلتی اور گھٹتی گئی۔

میرا دادا اس سانچے کا ذکر کرتے ہوئے اکثر کہا کرتا "افسوس میں بھی لاش کی بے حرمتی کے خلاف کوئی احتجاج نہ کر سکا۔ مجبور تھی۔ اسے اسی طرح سے نکالا جاسکتا تھا۔"

شیلے کو جلانے کی آخری رسومات خاموشی سے اور دلسوزی سے ادا ہوتی رہیں۔ اس وقت سب پر ایسی گھڑی براہمان تھی کہ ہر کام چپ چاپ طے ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ بائرن بھی اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے چپ چاپ کھڑا تھا اور اس کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہوتا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب ہم پہلی پہلی ریت اور سرمی پتھروں سے شیلے کی لاش چھڑوا رہے تھے تو نیچے کی ایک ترچھی چوٹ شیلے کی کھوپڑی پر ایسی اونچی پڑی کہ اس سے ایک مہیب آواز بلند ہوئی۔ ہم

نے دیکھا کہ اس چوٹ سے اس کی کھوپڑی بالکل کھل گئی لیکن دوسری جانب جلد کے ساتھ چٹنی رہی۔ اس وقت بائرن نے کنارے پر کھڑے کھڑے کہا تھا "اس کی کھوپڑی اتار کر مجھے دے دو، میں اپنے پاس رکھوں گا!"

دادا نے کہا "میں نے اس وقت بائرن کی بات کا برا مانا اور کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک بیہودہ اور متکبر آدمی تھا۔ اس کے پاس پہلے بھی ایک انسانی کھوپڑی تھی جس میں وہ شراب ڈال کر پیا کرتا تھا۔ میں کسی بھی صورت میں شیلے کی توہین برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے گھور کر بائرن کی طرف دیکھا اور وہ میری گھوری کا مطلب سمجھ گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اب چپ چاپ کھڑا تھا اور صرف شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔"

شیلے کو جلائے کے لیے ہم نے ضرورت سے زیادہ لکڑیاں جمع کر لی تھیں تاکہ چتا اچھی طرح سے روشن ہو کر اس کے جسد خاکی کو جلد از جلد خاستر میں تبدیل کر دے اور کوئی کسرباقی نہ رہ جائے۔

دادا کہتا ہے کہ جب ہم نے چتا روشن کی اور اس کے لائو بیل کھاتے ستونوں کی طرح اوپر اٹھنے لگے تو ہم نے شیلے کی پٹلیوں سے کٹی پٹنی لاش کو شراب میں نہلا دیا اور اس کے پھولے ہوئے وجود پر خم کے خم اندھادیے۔ ہم نے شیلے کی لاش کے ساتھ اس کے جسد خاکی کو اتنی شراب سے تراریز کر دیا جتنی شراب اس نے ساری زندگی ملا کر بھی نہ پی ہو۔

دادا بتایا کرتا تھا کہ جب ہم نے شیلے کو اس بھڑکتی ہوئی چتا میں پھینکا تو شعلوں نے جھپٹ کر اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ گرمی کا موسم، آگ کی حدت اور دھوپ کی شدت سے ہمارے دیکھتے دیکھتے اس کا سارا بدن پھٹ گیا اور اس کا دل سینے کے پھٹے ہوئے شکاف سے باہر نکل آیا۔ کھوپڑی کا اگلا حصہ جو سینے کی چوٹ سے دراڑ کھا گیا تھا، اس آگ کے جہنم میں سیف کے ڈھکنے کی طرح کھل گیا۔ ہم سب نے اس کی کھوپڑی کے اندر شیلے کا بھیجا دیکھا جو ابلی، پھیلتی اور جوش کھاتی ہوئی ہنڈیا کی طرح کھد بکھد رہا تھا۔ بائرن سے یہ منظر دیکھنا نہ گیا، وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ساحل کی اس جانب چلا گیا جہاں لی ہٹ ابھی تک کبھی میں بیٹھا تھا اور خوف کے مارے چتا کے قریب نہیں آیا تھا۔

آگ اس قدر تیز اور ایسی بھڑکیلی تھی کہ دیکھتے دیکھتے سارے جسد کو چاٹ کر خاستر میں تبدیل کر گئی۔ اگر شیلے کا کچھ بچا تو ہڈیوں کے چند جوڑے۔ ایک جبر اور کھوپڑی کا ایک بڑا سا حصہ تھا۔

لیکن جس بات نے چتا کے گرد موجود سب لوگوں کو حیران کر دیا وہ شیلے کا دل تھا جو سلگتی ہوئی آگ کے اندر بدستور ویسے کاویا تھا اور اپنی اصلی حالت میں تھا۔

مار یو نے کہا "میرا دادا اکثر بتایا کرتا تھا اور ہمیشہ دکھایا کرتا تھا کہ سلگتی ہوئی آگ کے دیکھتے ہوئے کونکوں کے اندر بازو ڈال کر جب اس نے شیلے کا دل کھینچ کر باہر نکالا تو اس کا بازو کبھی سے اوپر تک بری طرح سے جل گیا اور ہاتھ کے اوپر کا چمڑا یوں داغا گیا کہ چمڑا کھینچ کر مستقل طور پر اکڑ گیا۔"

مار یو نے بڑے افسوس کے ساتھ بتایا کہ اس کے بعد ساری عمر دادا کو مٹھی بند کرنے اور کھولنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اور جہاں میں نے تمہارا فوٹو اتارا تھا، اس قبر میں شیلے کا وہی دل دفن ہے جو میرے دادا نے جان پر کھیل کر چتا سے نکالا تھا۔

مار یو کندوتی مجھ سے کافی بڑا تھا۔ میں نے اس سے اس کی عمر کے بارے میں تو کبھی نہیں پوچھا لیکن میرا خیال ہے جب میں چھبیس برس کا تھا تو اس کی عمر ساٹھ یا ساٹھ کے قریب ہوگی۔ مار یو بڑا مہذب، بے حد شائستہ اور پرانی روایات کا حامل تھا۔ روم میں اس کے فرنیچر کے دوشوروم تھے اور دونوں ہی کسی توجہ طلب میوزیم کی طرح ہر وقت گاہکوں سے بھرے رہتے تھے۔ آرہ کشی، نجاری اور فرنیچر سازی کا کام گورمینیو قصبے میں ہوتا تھا جو روم سے ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

مار یو کی ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ ایسی خوبصورت کہ اسے دیکھ کر بدن پر کچکی سی طاری ہو جاتی تھی اور اس سے بات کرتے وقت حلق میں تھوہا سا پھنس جاتا تھا۔ مجھ سے پورے پانچ سال چھوٹی تھی لیکن عقل و دانش، معلومات ہمارے اور سوچ بوجھ میں مجھ سے تقریباً پچاس سال آگے تھی۔ اس کے بال، اس کے کندھے، اس کی گردن وٹس ڈی مائیلو کے ٹخنے کی ہو بہو نقل تھی اور جب وہ مسکراتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے لیونارڈو نے جیو کوڈ سکراہٹ اس کو دیکھ کر اپنی تصویر میں برہنہ تھی، سارے روم میں وہ ایک ہی دیدنی لڑکی تھی جس کے ساتھ ٹوٹ کر محبت کرنے کو جی چاہتا تھا لیکن وہ چلنے پھرنے سے معذور تھی۔ بچپن میں اسے پولیو کا شدید ایک ہو گیا تھا اور اس کا نچلا دھڑ بالکل بے جان تھا۔

میں جب بھی ان کے گھر جاتا، آنچلا اپنی کرسی چلاتی ہوئی میری نشست کے قریب آ کر بڑی ملاحت سے ہاتھ ملاتی۔ دھیمے سے حال پوچھتی اور گردن گھما کر اندر باورچی خانے میں دیکھتے ہوئے ذرا سی اونچی آواز میں کہتی "کیا بیو گے؟" میں اسے اپنی پسند کا مشروب بتا کر اس کا منسا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر تھپتھپاتا اور ایسی آدمیوں کی طرح سر ہلا کر پوچھتا "کبھی ہو؟" اور وہ ہمیشہ خوش دلی کے ساتھ ایک ہی جواب دیتی "پہلے کے مقابلے میں اچھی ہوں۔" پھر اس کی ماں باورچی خانہ سے کھانا پکاتے ہوئے یا غسل خانے میں کپڑے دھوتے ہوئے یا پھیلیوں کو ان کی جن من ہی خوراک ڈالنے ہوئے اپہرن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی ہمارے پاس آ کر بیٹھ جاتی۔

آنچلا کی ماں مجھ سے ہر بار صرف ہاتھوں کے بارے میں پوچھا کرتی۔ ان کا وزن، عمومی قد، سوئٹھ کی موٹائی، ناگوں کی گولائی، کھانے کے انداز، پانی پینے کا طریقہ، اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ ماں باپ کا سلوک، اور انہیں کھانے پلانے اور نہلانے دھلانے کے طریقے۔

اتفاق سے میرا ملک بھی برما، سری لنکا اور آسام کی طرح ہاتھیوں کا ملک تھا۔ اس لیے میں ہاتھیوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ خود ہمارے باورچی نور الدین احمد کا باپ نوا کھالی کا مشہور مہاوت تھا۔ جوانی میں وہ سندربن میں کھینچا بھی کرتا رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں تین قوی الجیہ جنگی ہاتھی پکڑ کر انہیں سدھایا تھا اور بڑے مہنگے بجائے سرحد کے اس پار بیچا تھا۔

نور الدین احمد کے پاس ہاتھیوں کی کہانیوں کا نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا۔ میں نے وہ سارا خزانہ جوں کا توں آنچلا کی ماں کے قدموں پر نثار کر دیا اور اس سے وعدہ کیا کہ جب میں پاکستان واپس جاؤں گا تو پھر ہم اسٹے ہی مشرقی پاکستان چلیں گے اور پورا ایک مہینہ سندربن میں گزاریں گے۔ مجھ سے ملنے کے بعد آنچلا کی ماں زیادہ تر سندربن میں رہنے لگی تھی، حالانکہ میں نے خود ابھی تک اپنے وطن کا وہ حصہ نہیں دیکھا تھا۔

ایک روز جب میں اور آنجلا اس کے کمرے سے کھینچی ہوئی رنگیں سلائڈس دیکھ رہے تھے تو اس نے سلائیڈ دیکھتے ہوئے چہرہ میری طرف گھما کر کہا ”آج تم کو ایک نیا مشروب پلاتے ہیں۔ ابھی اس کی تعارفی سلائیڈ ہوئی ہے لہذا امید ہے اگلے ہفتے تک دکائوں، بھالوں، ریسٹورانوں میں عام ملنے لگے گا۔ نا میرے لیے اس کی چھ بولٹیں لائے ہیں اور میں نے ان سے میں سے ابھی ایک بھی نہیں کھولی۔“

”کیوں؟“ میں نے تھامل عارفانہ سے پوچھا۔

تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے چھوٹے بچوں کو مارنے کا نشان بنا کر کہا ”ان کے ڈھکنے نہیں کھلتے تھے۔ اوپر نہیں تھا جس سے اس نئے مشروب کا ڈھکنا کھولا جاسکے۔“

میں نے کہا ”بل گیا ہے؟“

کہنے لگی ”ملا تو نہیں، البتہ امید ہے کہ مل جائے گا۔“

پھر اس نے ملازم کو آواز دے کر کہا ”فرنیج سے کل والی ڈرب نکال کے لے آؤ۔۔۔۔۔ ساتھ شرابھی۔“

نورا چاندی کے خوبصورت طشت میں، بلور کے دو لمبے گلاس نسواری رنگ کے مشروب سے بھر کر چلے آئی۔ میں نے حیرانی سے اس مشروب کو دیکھا اور ذرا سی ناک چڑھائی۔ اس رنگ کا مشروب میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی درخت کی چھال کا ابلایا ہوا پانی ہو یا زہر مہرہ گھول کو کوئی کھلول بنایا گیا ہو۔ جب میں نے گلاس اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ وہی زہر ہے جو ستر اٹھ کو دیا گیا تھا اور جو دستورے کے عرق سے تیار ہوا تھا۔ میں نے گلاس کے اندر کا سٹرا تو نکال کر ایک طرف دیکھ دیا۔ پھر سٹرا مشروب پر اٹھتے ہوئے بلبوں کو دیکھتے ہوئے ایک لمبا ہار گھونٹ بھرا۔ اپنی میزبان کے حسن لا زوال کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اور اپنی جان ناتوں کو اس کے حکم لافنا سے معنون کرتے ہوئے!

لیکن اس دارو کے میرے حلق سے اترتے ہی اوپر کا سانس اوپر اٹھنے کا نیچے کا نیچے آکھوں میں آلو آگئے۔ ایک ہلکی سی چھینک جو منہ بند ہونے کی وجہ سے صرف ناک سے پھٹک سکتی تھی، مشروب کے چند قطرے میرے گریبان میں گر گئی۔

آنجلا نے گلاس میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا ”نہیں پیا جاتا؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

کہنے لگی ”بہت تیز ہے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور رومال سے آنکھیں پونپھنے لگا۔

وہ میری ہیئت کدائی دیکھ کر پہلے تو مسکرائی، پھر ہنسنے لگی۔ مجھے اس کا ایسے موقع پر ہنسا کچھ زیادہ اچھا نہ لگا۔ عجیب واریات قسم کا مشروب تھا۔ بچپن میں اماں بخارا جانے پر دیا کرتی تھیں۔ چار پانی پر لٹا کر اور قصاب کا سازانوں سے پر رکھ کر بڑے پیچ باچیس چیر کر پلایا کرتی تھیں جو ذرا سا دارو گوشہ دہن سے باہر نکلتا تھا تو اسے فوراً پیچ پر لے کر پھر منہ میں شلوس ڈال کرتی تھیں۔ اس دوائی میں سے رال، ہڑتال، بیکن کے جلے ہوئے بھرتے، نمک، اٹلی، مرغیوں کے ڈربے اور کمر کے

پھولوں کی بو آ کر تھی۔ اس دوا کا نام ”ڈائیا فریکٹ“ تھا اور جس کا نرس پر یہ رکھی ہوتی تھی، ادھر سے گزرنے پر خوف آتا تھا۔ بالکل وہی دوائی اتنے سالوں بعد آنجلا نے میری عزت افزائی کے لیے فرنیج میں رکھ کے اور برف میں لگا کر پلا دی تھی۔ یہ بارہ جولائی سن انیس سو باون کا واقعہ ہے کہ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ”کوکا کولا“ پیا۔ کوئی چھ مہینے سے اٹلی کے اخباروں، رسالوں، پرچوں میں فل پیج اشتہار آرہے تھے کہ دنیا کا اول درجے کا مشروب کوکا کولا اب اٹلی پہنچ کر رومیوں کے کام و دھن کی لذت کے سامان بہم کرنے والا ہے۔۔۔۔۔ بڑے بڑے رنگدار ہو رڈنگ جگہ جگہ لگے تھے۔ قد آدم اشتہار شہر کی دیواروں سے چسپاں تھے۔ جس گھرانے نے کوکا کولا تیار کرنے کا کارخانہ لگا یا تھا، ان کا ہر روز شام کے پانچ بجے ریڈیو پر انٹرویو ہوتا تھا۔ یہ انٹرویو کے سننے کے لیے لوگ دور دور مقامات سے اپنے گھروں کو بھاگتے تھے۔ اطالوی زبان میں انٹرویو کے دوران جب امریکی لڑکی انگریزی میں یہ کہتی کہ ”ڈربک کوکا کولا اینڈ کوچ آف ٹرسٹ“ تو گھر کے لوگ اس کے ساتھ مل کر خوشی کا نعرہ لگاتے اور ریڈیو کے گرد چھوٹی سی لڈی ڈال کے اس انتظار میں کھڑے ہو جاتے کہ دیکھیں پھر کب اشتہار آتا ہے۔

لوہاروں، تکرانوں، موچیوں اور گٹر صاف کرنے والے کارندوں کے نوجوان بیٹوں نے ابھی سے اپنا پیٹ کاٹ کر لیرے جمع کرنے شروع کر دیئے تھے کہ وقت آنے پر اپنی محبوباؤں کو ”کوکا کولا“ پلائیں اور تو اتر کے ساتھ پلا سکیں۔ اگر چہ روز نہیں تو ہر اتوار، دو تین بار نہیں تو کم از کم ایک بار ضرور۔۔۔۔۔ بلا تخفیف۔

کم تعلیم یافتہ بزرگوں کو زیادہ تعلیم یافتہ اور صاحب حیثیت بوڑھوں نے از خود بتا دیا تھا کہ کھانا کھانے کے بعد رات کو کوکا کولا کی ایک بوتل سارا کھانا سونے سے پہلے ہضم کر دیتی ہے اور اس سے کھل کر ڈکارا جاتے ہیں۔

میری لینڈ لیڈی کو یقین تھا کہ جب کوکا کولا آئے گا تو اس کے پرانے پھوسے پھنسیاں خود بخود دور ہو جائیں گے کیونکہ ”کوکا کولا“ جلدی امراض کا آخری اور واحد حل ہے۔

نوجوانوں نے امریکی فلموں میں ہیرو کو کوکا کولا کی بوتل گردن سے پکڑے اپنی محبوبہ کی کمر میں ہاتھ ڈالے دور دراز مرغزاروں میں چلتے دیکھا تھا۔ ہیر وینس تبسم کنان لنگ لنگ کر چلتی تھیں اور لہک لہک کر باتیں کرتی تھیں۔ نہ کوئی شکوہ تھا نہ جھگڑا، نہ مرد عورت کا تنازع نہ طعن نہ اہن! مرد جب چاہتا تھا ساتھ چلتی ہوئی لڑکی کو اپنی بوتل تھما دیتا۔ وہ ایک گھونٹ بھر کے بوتل واپس کر دیتی اور دونوں پھر چلنے لگتے۔

ہمارے محلے کا ڈاکٹر سینور کر دوٹی ٹانگیں کھول کھول کر اور سی کر کے چلتا تھا۔ اس بیچارے کو کافی دیر سے تکلیف تھی لیکن اب اس کا چہرہ پرسکون ہو گیا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ اس نے مجھے وہی کن گیسٹ کے سامنے روک کر کہا ”پروفیسور! آج تمہاری ڈاک تو نہیں البتہ ایک خوشخبری ہے کہ اگلے ہفتے ”کوکا کولا“ اٹلی میں آ رہا ہے۔ اس کے پینے سے پرانی اور پرینہ بوسیر ایک ہفتے میں دور ہو جاتی ہے۔ میرے بیٹے کا سر لندن میں رہ کر آیا ہے۔ اس نے تین ہفتے باقاعدگی سے ”کوکا کولا“ پیا اور اس کی بچپن کی بوسیر دور ہو گئی۔ میری تو ابھی صرف پندرہ سال پرانی ہے۔“

ہماری یونیورسٹی کی تقریباً ساری لڑکیوں نے کندھے پر لٹکانے کے خصوصی تھیلے بنوائے تھے جن میں کوکا کولا کی

ایک بوتل، ایک چھوٹا گلاس اور ساتھ شین لیس سٹیل کا ایک اوپنر رکھا جاسکے۔ یہ تھیلے ان کی سکرٹس سے بھی زیادہ جاذب نظر تھے اور ان میں غضب کی سیس اپیل تھی!

ہمارے پادری صاحب، پادری سانترلی جنگ کے بعد آسٹریا گئے تھے۔ وہاں دینا میں انہوں نے امریکن زون میں ایک امریکی پرائیویٹ کی مہربانی سے کوکا کولا کی پوری بوتل پی لی تھی۔ سارے روم میں کوکا کولا پینے والے تیرہ آدمیوں میں پادری صاحب کا نام بھی تھا۔ روزنامہ "ایل میا جیر" نے اپنے سنڈے ایڈیشن میں ان لوگوں کے نام اور سچ دیئے تھے جنہوں نے خوش قسمتی سے کوکا کولا پیا تھا۔ پادری سانترلی کہتے تھے کہ کوکا کولا پینے سے آدمی میں ایک سرمدی سرور پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی روحانی تفصیل بڑھ جاتی ہیں۔ انہوں نے میرے سامنے حضرت مریم کی قسم کھا کر کہا کہ جس روز انہوں نے کوکا کولا پیا، ان کو خواب میں حضرت یسوع کی زیارت نصیب ہوئی۔ بہت سے لوگوں کے گروہ میں ہمارے پادری صاحب حضرت یسوع کے بہت ہی قریب کھڑے تھے۔

مجھے معلوم تو تھا کہ ہمارے اٹلی میں کوکا کولا آ رہا ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس قدر جلد آ رہا ہے۔
آنجلانے کہا "اگر دل نہیں چاہتا تو نہ پیو۔"
میں نے کہا "دل تو بہت چاہتا ہے مگر پیا نہیں جاتا۔"
کہنے لگی "تم کو یقین نہیں آئے گا لیکن یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ ایک وقت آئے گا تم پکار پکار کر کوکا کولا مانگا کرو گے اور اگر نہیں ملے گا تو اس محفل سے اٹھ کر وہاں پہنچ جایا کرو گے جہاں کوکا کولا ملے گا۔"

میں نے کہا "کچھ خدا کا خوف کرو آنجلان۔ ایسی بدبودار، سیاہ رنگ، تلخ اور خردش آور دوا کو کون خوش دلی سے پی سکتا ہے بھلا؟"

پھر آنجلانے مجھے کوکا کولا کی تخلیق کی لمبی اور مسور کن کہانی سنائی کہ کس طرح ایک ڈاکٹر Pemberton پیرش کے معامل میں اس کے کپاؤ نڈر نے سر درد کا ایک محلول تیار کیا اور اسے بڑے بزرگوں کو یہ کہہ کر دینے لگا کہ بس ناک آ نکھیں بند کر کے چڑھا جاؤ، فعل ہائیمہ میں مددے گا۔ درد سے نجات ہوگی۔ وہ پیپارے اسی طرح کرتے رہے، لیکن کسی کا بھی سر درد دور نہ ہوا۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔" میں نے یہی پر زور دے کر کہا کہ اصل میں یہ ایک دوائی ہے اور اس کا ذائقہ ہمارے بچپن کی ڈائیا فریکٹ سے بہت ملتا ہے۔

"لیکن اب یہ دوا نہیں رہی پیارے۔ اس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ شامل کر کے بلبے اٹھا دیئے گئے ہیں۔ اب یہ ایک مشروب ہے اور جسم و جان کو تروتازگی عطا کرتا ہے۔"

پھر خود ہی کہنے لگی "البتہ اگر اس کو بخند کیا جائے اور اس میں برف نہ ڈالی جائے اور یہ روم ٹمپریچر پر گرم ہو جائے تو پھر یہ دوائی ہے۔ وہی دوائی جو کپاؤ نڈر بنایا کرتا تھا۔ بے ذائقہ، ناقابل برداشت۔"

میں نے پھر کہا کہ یہی تو میں کہہ رہا تھا لیکن آنجلانے میری بات کاٹ کر ایک دھیمے مزاج کی استانی کے انداز

میں کہا "کوکا کولا کمرشل کرنے سے پہلے کئی سال اس پر تحقیق ہوتی رہی ہے۔ امریکہ میں بسنے والی ساری قوموں کے نمائندہ روموں کو کوکا کولا پلا کر یہ دیکھا گیا کہ ان پر اس کا کیسا رد عمل ہوتا ہے۔ یورپی لوگوں نے تو اسے خوشگوار طریق پر برداشت کر لیا لیکن ریڈیٹین اور اسکیموؤں نے پہلا گھونٹ بھرتے ہی اسے بھڑاک سے زمین پر اگل دیا۔ اس میں پھر رد و بدل کیا جانے لگا۔ دو سال کی مدت کے بعد اسے ناپسند کرنے والے لوگ بھی پسند کرنے والوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد جب اسے بچوں پر آزمایا گیا تو دو سال تک کی عمر کے بچوں نے تو پسند کیا لیکن دس بارہ برس کے لڑکے اور لڑکیوں نے انکا کی کر دی۔ اب پھر اس میں ترمیم و تفتیح ہونے لگی۔"

میں نے کہا "کیا یہ انجیل مقدس میں لکھا ہے کہ دنیا کے سب لوگوں کو کوکا کولا پلایا جائے اور ان کی ناک میں دم کیا جائے۔" آنجلانہی اور کہنے لگی "تم بھی میرے نانا کی سی بات کرتے ہو۔ وہ بھی تمہاری طرح سے فرسودہ خیالات کے مانگ ہیں اور ایسی ہی بٹلی ہوئی باتیں کیا کرتے ہیں۔ امریکی ہم اطالویوں جیسے نہیں، وہ ترقی یافتہ لوگ ہیں اور ہر کام میں ہر ایک سے آگے ہیں۔ ان میں تحقیق و جستجو کا مادہ ہم یورپین لوگوں سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ایک مرتبہ جس کام کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، اسے آخر تک پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ ہر جزو کو ہر تفصیل کو محدب شیشے کے نیچے رکھ کر اسے جانچتے، آتکتے اور پڑاتے ہیں۔ جو نظر آتا ہے، وہ! جو نظر نہیں آتا۔۔۔۔۔۔ وہ! اور جو آگے چل کر نظر آنے لگے گا۔ یہ سب کچھ ان کے مطالعے میں ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ جب تک یہ مشروب بن کر اس پر مختلف المراج لوگوں کی پسندیدگی کی مہر نہیں لگ گئی، اس کو مارکیٹ کرنے کا پروگرام نہیں بنایا۔"

"کیوں؟" میں نے امریکیوں کی حماقت پر سر جھٹک کر کہا۔

آنجلانے کہنے لگی "سب سے مشکل کام اس مشروب کو ایسا نام دینا تھا جو دنیا بھر میں مقبول ہو سکے اور کہہ ارض کا ہر بندہ اس کو آسانی کے ساتھ ادا کر سکے۔ چنانچہ ماہرین لسانیات اور ماہرین صوت شناسی کے ایک گروہ نے پہلے پچاس ناموں کا انتخاب کیا۔ پھر انہیں امریکہ میں ٹیسٹ کر کے میں ناموں تک محدود کیا۔ اس کے بعد اس پیش نہاد کمپنی کے کارندے ساری دنیا میں پھیل گئے تاکہ ایک یونیورسل نام پر پسندیدگی کی مہر لگوا سکیں۔"

میں حیرت سے آنجلان کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ جو اپنے آپ کو امریکیوں کے مقابلے میں پسماندہ اور عقب افتادہ کہہ رہی تھی تو ان سب کے سامنے میں کس سطح پر ہوں!

کہنے لگی "اپنے مشروب کے لیے کوکا کولا کمپنی نے جتنے نام بھی چنے، وہ سارے کے سارے "واؤلز" میں ختم ہوتے تھے۔ واول میں ختم ہونے والے لفظ کی ادائیگی ہر کوئی کر سکتا ہے اور اس کے خراج میں کسی کو کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ چنانچہ دنیا بھر کے طویل چکر لگانے کے بعد کمپنی کے کارندے اس نتیجے پر پہنچے کہ لفظ "کوکا کولا" دنیا کا ہر شخص آسانی کے ساتھ ادا کر سکتا ہے۔ وہ چاہے عرب ہو، چاہے ہندوستانی یا بھوٹانی، افریقہ میں کالا ہاری کے جنگلوں کا شکار خور ہو یا ایمنز کے ناگہا معاشرے کا فرد، جاپانی ہو، آسٹریلیا کا مکھی ہو۔ قطب شمالی کا اسکیمو ہو کسی آسانی کے ساتھ، پورے خراج کے ساتھ اور صحیح تلفظ کے ساتھ "کوکا کولا" کہہ سکتے ہیں۔

میں نے کہا "آنکھلا ایسی سب باتیں تمہیں کون بتاتا ہے اور یہ تم کہاں سے سنتی ہو؟"

اس کی آنکھیں ذرا سی نمناک ہو گئیں۔ سر اوپر اٹھا کر کہنے لگی۔ "سارا دن اس ویل چیر پر گزرتا ہے۔ مگر باہر جانا نہیں ہوتا۔ بیٹھی پڑھتی رہتی ہوں اور سوچتی رہتی ہوں اور سوچتے سوچتے سوچ جاتی ہوں۔ اس کے بعد زندگی کا ایک پیر یڈ شروع ہو جاتا ہے۔"

لکھنے کا امکان نہ تھا۔ کبھی کبھی رک ضرور جاتا تھا لیکن انکار کے اس گھڑا سے نکل نہیں سکتا تھا۔ میرے بہت سے ساتھی ادیب ای رنگ میں کالم لکھنے لگے تھے جس قدر کسی پر نکتہ چینی کرتے، اسی قدر ان کی تعریف ہوتی جیسے جیسے لوگوں کے جوتے اڑتے، اس سے اونچی آواز میں تالی جیتی!

میں بڑی صدق دلی کے ساتھ سٹی کو اس کے مقام سے اکھڑتا رہا اور بالآخر اللہ کے فضل سے کامیاب ہو گیا۔ سٹی نے لوگوں کا پی ہاؤس میں زار و قطار روٹے ہوئے کہا کہ معروف کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں اور وہ اس کو ہر وقت طلاق کی دھمکیاں دیتا رہتا ہے۔ سنائیں اس کا باپ بڑھتی ہے اور موٹی نگڑی کا کام کرتا ہے۔ اس کی دو بیویاں اور نو بچے ہیں۔ کھلے میدان میں ٹین اور کیڑوں کی جھگیاں بنا کر ان میں رہتے ہیں۔

میں نے کہا "تمہیں کس نے بتایا؟"

کہنے لگی "اس کا ایک دوست وہاں سے آیا تھا۔ اس نے سب کچھ بتایا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا اے چھوڑ کر مجھ سے ہادی کر لو، میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا کیونکہ بھڑی منڈی میں میری آڑھت کی دکان ہے اور میں سربز علاتوں اور ارد گرد کے لکھتاؤں سے فروٹ بھی درآمد کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "پھر تم نے اس سے شادی کیوں نہ کی؟"

کہنے لگی "اگر وہ بھی جھوٹا نکلا..... پھر؟"

میں نے کہا "پھر یا قسمت یا نصیب۔ زندگی میں ایسے ہی ہوتا ہے، یہ زندگی کوئی گھوڑی تو نہیں کہ منہ میں لگام دے کر پیٹنے پر کاٹھی ڈال کر جھڑپا کر نکل گئے۔ یہ تو زندگی ہے، اپنی مرضی کا راستہ اختیار کرے گی، اپنی مرضی کی چال چلے گی۔" پھر میں نے اس کی سوجی ہوئی آنکھیں اور آنسوؤں سے نمکین گال دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "اس میں کوئی شک نہیں کہ حالات بخیر ہو رہے ہیں لیکن ہم سے ایک بڑی طاقت بھی تو موجود ہے جو حالات بدل دیا کرتی ہے اور کامیابی کے راستوں کو آپ ہی سامنے لے آیا کرتی ہے۔ بس ان پر قدم دھرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح جیسے اپنے تلاش کیے ہوئے راستوں پر اپنی مرضی سے چلنے کی کوشش کی جاتی ہے اور قدم جمتا نہیں ہے۔"

اس نے میرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے کچھ زیادہ ہی دبا کر پوچھا۔ "میرے دن بھر کتنے ہیں؟ میری زندگی میں بھارا آسکتی ہے؟ مجھے تم جیسا شوہر مل سکتا ہے؟"

مجھے اس آخری استفسار سے بے حد خوشی ہوئی لیکن ساتھ ہی میں ڈر کر آسب زدہ لڑکی جیسی آنکھیں پھاڑ کر منہ سے جھانک کر گولا نکال کر بیٹھ گیا۔ شروع شروع میں اگر سٹی مردیاتی مجھ سے یہ کہتی تو میں چھلانگ مار کے قبول کر لیتا لیکن اب وہ مجھے ایک بوجھ سا دکھائی دے رہی تھی جیسے مجھ سے کا ایک بڑا سا گھڑا میرے سر پر ہوا اور مجھے ادھ کھلے دروازے سے گزر کر اس کی دوسری طرف جانا ہو۔

کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے سے گلے شکوے کرتے اور طعنے الپنے دیتے ان وقتوں کی بات کرتے رہے جب اس نے نئے نئے اٹلی آئے تھے اور خوشیوں کے گہوارے میں زور زور کے جھومنے لیا کرتے تھے۔ ہمارے حلقہ احباب

سٹی مردیاتی نے انڈونیشیا جانے کے بجائے یہیں ایک عینی سے شادی کر لی تھی۔ اس کا شوہر معروف تھا۔ گورے رنگ کا ایک دراز قد طالب علم تھا جو کیلے ریٹا کے ایک شعبہ میں مجسمہ سازی کا فن سیکھ رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا تاجر بھی تھا۔ روم میں کچھ اموورٹ کرتا تھا۔ یمن کو کچھ ایکسپورٹ کرتا تھا۔ فٹبال کا کھلاڑی بھی تھا۔ کبھی کار خرید لیتا کبھی بیچ کر پھر سائیکل پر آ جاتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے کئی کتراتے تھے اور میل ملاقات سے گھبراتے تھے۔ سٹی کو اس بات کا بڑا دکھ تھا۔ اس کے خیال میں ہم دونوں ہی اچھے انسان تھے اور مسلمان ہونے کے باوجود آزاد خیال تھے۔

میں نے جب بھی اس سے معروف کے بارے میں پوچھا، سٹی کو اس کی تعریف کرتے ہی پایا۔ کبھی سٹی دو ایک اچھا شوہر، ایک دردمند ساتھی اور بڑا بخشتی طالب علم ہے۔ وہ پتھر کی ریلیف پٹینیں تیار کرتا تھا اور ان پر کوئی خطا نہیں قرآن شریف کی آیات ابھارتا تھا۔ سٹی مردیاتی کے مطابق معروف ایک متول گھرانے کا فرزند تھا اور سنائیں ان کا ایک بہت بڑا ولا تھا..... میرا خیال تھا کہ سٹی یمن ہو آئی ہے اور اپنے سرال والوں سے بری، عیدی، تحائف اور معروف کے حصے کا کچھ نقد نانواں بھی وصول کر لائی ہے لیکن یوں نہیں تھا۔ اس نے ابھی سنا کے دیو کا رڈ اور اپنے سرال والے کو فونوی دیکھے تھے۔ وہ اس شادی سے بہت خوش تھی اور ہر وقت معروف کا دم چھلانی لٹو رہی سی اس کے ساتھ گھومتی رہتی۔ میں نے کئی مرتبہ اسے معروف کے خلاف ابھارنا چاہا یا یوں کہیے اس کے دل میں معروف کے بارے میں کچھ شک و شبہ کے جالے لگانے چاہے۔ کچھ اپنی تسلی کے لیے اس سے استفسار کیے مگر وہ اپنے مقام پر جوں کی توں کھڑی رہی۔

جب ہم اپنی کسی عز کو اس کے سرال کے خلاف اکساتے ہیں اور اس کی ازدواجی اور سرال زندگی کے بارے میں تشویش کا اظہار کرتے ہیں اور وہ ہمارا ساتھ نہیں دیتی، تفریحاً بھی ہماری تنقید کا ساتھ نہیں دیتی تو ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ دل یہی چاہا کرتا ہے کہ ہم جس کی برائی کریں، مخاطب بھی اس میں شامل ہو۔ ہمارا ساتھ دے بلکہ بڑھ چڑھ کر ساتھ دے۔ کسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے، اس کی چٹکی کھاتے ہوئے، اس کی خرابیاں بیان کرتے ہوئے اگر اپنا ہی ساتھی ہوں ہاں اور چوں چاں کر کے رہ جائے تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ہمیں تو گفتگو کا مزاجی اس وقت آتا ہے جب کل کر بات ہو رہی ہو۔ سچ بولا جا رہا ہو اور حقیقت پسندی سے کام لیا جا رہا ہو۔ ہمارے یہاں حقیقت پسندی کسی کو لڑنے اور سچ کسی کو چھان پھانک کر خرابے اور بدنامی کا نام ہے۔ ہم کہیں جمع ہو کر یونانی فلسفیوں یا مسلمان علم الکلامیوں یا ہندو دودانوں جیسی باتیں تھوڑی کرتے ہیں، ہمارے پاس تو بس کرنے کی ایک ہی بات ہوتی ہے۔ کردار اور واقعات بدلنے رہتے ہیں، قصہ وہی چلا جاتا ہے جو کئی برس پہلے شروع کیا تھا۔ میری تو ساری زندگی اسی لیک میں گزر رہی تھی اور پیہر باہر

میں مشرقی پاکستان کا ایک رتج الدین اور بھی تھا جو ”چنے چتا“ میں فلم ڈائریکشن کی تعلیم لینے آیا تھا اور تین ماہ بعد سب سے پہلے چھوڑ چھا کر لندن چلا گیا تھا۔ اس رتج الدین احمد نے اٹلی آتے ہوئے عدن سے ایک گھوڑی بھی خریدی تھی جسے وہ اپنے ساتھ روم لے آیا تھا۔

رتج الدین احمد، دنیا نو سن تانا ایک نئی عمارت کی چوتھی منزل میں رہتا تھا اور مشرقی پاکستان کی پرائیویٹ کورپوریشن کے دفینے پر تھا۔ اس کے پاس اپنے بھی کافی پیسے تھے اور وہ ”چنے چتا“ کی براؤن بس میں سٹوڈیو جایا کرتا تھا۔ ہمارے ساتھ چلتے چلتے وہ دونوں ہاتھوں کی دونوں انگلیوں سے وکٹری کا نشان بناتا اور پھر ایک وکٹری کو دوسری وکٹری کے اوپر کر اس پور فورم اگلی جھری سے آؤٹ ڈور شوٹنگ کا شاٹ بنایا کرتا۔ ہم نے بھی اس کی دیکھا دیکھی فلم شوٹنگ کا اصل معلوم کر لیا تھا اور ہم بھی راہ چلتے دستاویزی فلمیں بناتے جاتے تھے۔ اس معاملے میں فرانس کی روزیت رتج الدین سے بہت تنگ کیا کرتی تھی۔ وہ انگلیوں کا آکٹو اپنا کر اس میں آنکھ لگانے کے بجائے اپنے سرخ سرخ پونٹوں سے اس کی ہر حرکت کیا کرتی تھی کہ سارے شرم کے مارے نظریں جھکا لیتے تھے اور رتج الدین بنگالی میں گالیاں ہی دینے لگ جاتا تو روزیت فرانس سے مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئی تھی اور وہ بیٹی کن کے علاوہ ہماری یونیورسٹی میں تقابل ادیبان کا سب سے اہم ایجنڈا کیا کرتی تھی۔ بڑی بد ذات لڑکی تھی، کسی کو معاف ہی نہ کرتی تھی۔ مذاہب کے بارے میں اسے ایسے لطفے یاد تھے جنہیں سن کر آدمی پانی پانی ہو جاتا تھا۔

”چنے چتا“ میں فلم ڈائریکشن کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب پروفیسر وٹوریو دے سیکا نے سٹوڈنٹس کے لیے سواری کے گھوڑے منگوائے تو رتج الدین نے گھوڑے پر چڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس کے ساتھ پروفیسروں، ایکٹروں اور پرانے ہڈا بٹکاروں نے اسے سمجھایا کہ گھڑ سواری اس کورس کا ایک اہم حصہ ہے۔ جب تک ڈائریکٹر خود گھوڑے پر سوار ہو کر ان راستوں، کھیتوں، جنگلوں اور لوکیشنوں کو نہیں دیکھے گا وہ کس طرح سے وہاں شوٹنگ سکے گا اور کیسے اس کا شیڈول بنا سکے گا۔ اٹلی میں فلم ڈائریکٹر کے لیے ڈائریکٹر کو اعلیٰ درجے کا گھڑ سوار ہونا ضروری تھا۔ رتج الدین احمد چونکہ گھوڑے سے بہت ڈرتا تھا، اس لیے اس نے اٹلی سے فلم ڈائریکشن کی ڈگری حاصل کرنے سے انکار کر اور لندن میں داخلہ لے لیا۔

اس کے اس دردناک فیصلے کا ہم سب کو شدید رنج تھا۔ ملینا جو چیکو سلواکیہ سے فلم ڈائریکشن کی تعلیم لینے آئی اور رتج الدین احمد کی ہم جماعت تھی، اس کو اپنے ساتھی کے اس اچانک فیصلے سے بڑا دکھ ہوا۔ اس نے کئی مرتبہ گھوڑے چڑھ کر اور اتر کر رتج الدین احمد کو یقین دلایا کہ یہ سب سے آسان سواری ہے اور اس میں کسی سے کچھ سیکنا بھی نہیں پڑے گا۔ بس گھوڑے کے کان میں منزل کا اور سفر کے راستے کا اعلان کرنا پڑتا ہے۔ باقی سارے معاملات گھوڑا خود طے کر لیتا ہے۔ گھڑ سواری کچھ بھی نہیں لیکن رتج الدین نہ مانا اور لندن جانے کی تیاری کرنے لگا۔

میں نے اپنی ٹکڑی سے ایک ماہر فن شخص کو الگ ہوتے دیکھ کر اسے سختی سے کہا ”اوگدھے آدمی کیوں اتنی اگلی اسٹی ٹیوشن چھوڑ کر لندن جا رہے ہو۔ لندن میں آج تک نہ تو کوئی اچھی فلم بنی ہے اور نہ ہی آئندہ بن سکے گی، پھر تم

نے کیا حاصل کرو گے۔“

اس نے کہا ”اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے اشفاق اور میں اپنے فیصلے کے ہاتھوں مجبور ہوں۔“

میں نے کہا ”اور وہ تمہاری گھوڑی؟“

کہنے لگا ”وہ ہے میرے پاس۔“

میں نے ہنسی کر کہا ”اور اس سے ڈر نہیں آتا بد بخت۔“

کہنے لگا ”بالکل نہیں۔۔۔۔۔ اس میں ڈر کی کیا بات ہے۔“

میں نے کہا ”کوئی قسم کی گھوڑی ہے؟“

کہنے لگا ”ڈورس ہے۔“

”اور رنگ؟“ میں نے پوچھا۔

بولا ”گولڈن۔“

میں نے کہا ”چلو میرے ساتھ اور دکھاؤ مجھے۔۔۔۔۔ تم بکواس کرتے ہو۔“

اس نے فوراً اپنے کف کاٹن کھولا اور آستین اوپر چڑھا کر بولا ”یہ دیکھو۔۔۔۔۔“

اس کی کلائی پر گولڈن رنگ کی ڈورس گھڑی بندھی تھی جو تارخ کے علاوہ چاند کی گردش بھی دکھلاتی تھی۔

میری طرف منہ اٹھا کر اور میرا کندھا ٹھوک کر بولا ”یہ میں نے آتے ہوئے عدن کی بندرگاہ سے خریدی تھی۔“

بالکل لچک لچک دے رہی ہے۔ ایک منٹ کا بھی فرق نہیں پڑا۔“

میں نے ملینا سے کہا ”اسے لندن چلے ہی جانے دو، یہ ہمارے ساتھ نہیں رہ سکے گا۔“

ستی مردیاتی کا دل لگانے کے لیے میں نے اسے آنکھلا کے حوالے کر دیا۔ ستی میں کوئی ایسی خاص بات تو نہیں تھی

کہ اس کے ساتھ دیر تک اور دور تک دوستی کی جاسکے لیکن آنکھلا میں یہ صفت ضرور تھی کہ وہ ایک مرتبہ جس کا ہاتھ پکڑ لیتی تھی،

چھوڑتی نہیں تھی۔ جب تک دوسرا خود چھڑانے کی کوشش نہ کرے۔ وہ اسے اپنے ہاتھوں میں ہی داب کے رکھتی تھی۔ ستی

مردیاتی کے ساتھ بھی اس نے خوب ساتھ بھجایا۔ وہ ہفتہ ہفتہ بھر آ کر اس کے پاس رہتی۔ اس کے کپڑے استعمال کرتی، اس

کے یہاں سے کھانا کھاتی۔ نانا اس کے لیے بس کا مینیجمر کا ٹکٹ بھی بناوا تا لیکن اتنی ساری آسائشوں کے باوجود ستی خوش

نہیں تھی۔ اصل میں زندگی کا جب کوئی غلط فیصلہ ہو جائے تو اس کے بعد اچھے اچھے حالات بھی اس غلط فیصلے کے آئینی سائے

میں دھونے ہوئے سے رہتے ہیں۔ ستی ہم سب کو بہت ہی عزیز تھی لیکن اب ہم اس کے عزیز نہیں رہے تھے۔ وہ ہم پر شک سا

کرنے لگی تھی اور کبھی کبھی رہنمیدہ ہو کر تلخ باتیں بھی کر جاتی تھی۔ اصل میں اس کا محبوب خاوند اسے چھوڑ کر ایسٹریڈیم چلا گیا تھا

اور اس نے وہاں سے طلاق بھی بھجوا دی تھی لیکن ستی اس راز کو اپنے ساتھ چھپائے پھرتی تھی۔

گر مینو قصبے میں جہاں مار پوکندوئی کے شور و مزے کے لیے فرنیچر تیار ہوتا تھا اور جہاں بیلے ڈانسرز کی تربیت کی

ایک بہت بڑی درس گاہ تھی وہاں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ گرجے کے پاس گھٹی آبادی میں ایک پرانے مکان کو آگ لگی

اور دیکھتے دیکھتے سارا گھراونچے اونچے شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ ان شعلوں کے حلقے میں ارد گرد کے گھر بھی پکڑے گئے اور پکھواڑے لکڑی کے ایک شہر کو بھی آگ لگ گئی۔

لوگ گرتے پڑتے، کھانستے پکارتے، جلتے جھنستے باہر کو بھاگے اور اپنے اپنے گھروں کو شعلوں کی نذر ہوئے دیکھنے لگے۔ درمیانی گھر کی جوان عورت نے چیخا چلانا شروع کر دیا، ہائے میرے بچے! ہائے میرے بچے! سب نے اس کا دایلا سنا لیکن کوئی بھی آگے نہ بڑھا۔ وہ اپنے دونوں بازو پھیلا پھیلا کر اپنے بچوں کو پکارتی رہی لیکن آگ کی اکی جاں سوز بجٹی میں کودنے کے لیے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ عورت گھٹنوں کے بل گر کر اور دونوں ہاتھ اوپر باندھ کر پاک مریم سے بچوں کو بچانے کی دعا کر رہی تھی لیکن اوپر سے بھی حکم بند ہو چکا تھا۔

قبیلے کا ایک جوان لوجا نو دارنیکس جو کوئی خاص کام نہیں کرتا تھا، بس لاریوں کے اڈے پر اور چڑھتے لوگوں کی پھڑوں تک اور شام کو میونسپلٹی کے براس بینڈ کے چکر پر ان کے ساتھ گھوما کرتا تھا۔ یہ خبر پا کر کہ گرجا محلے میں آگ لگ گئی ہے، بھاگ کر وہاں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں زیتون کی ایک موٹی شاخ تھی اور سر پر گنڈاریوں جیسی اونٹنی تھی۔ اس نے اپنے جوتے اور ٹوپی اتار کر پرے پھینکی۔ سوئی کوزمین پر آرام سے لٹایا اور جلتے ہوئے مکان کے اندر گھس گیا۔

سوا سال کا بمبینو دھوئیں اور گرمی سے گھبرایا ہوا گھٹنے چل کر باہر ڈیوڑھی کی طرف آ رہا تھا۔ وہ لوجا نو کے پاؤں سے ٹکرا کر زور سے چیخا تو اس نے جھک کر اسے گودی میں اٹھالیا اور باہر لے آیا۔ گریہ زاری کرتی ہوئی عورت نے لپک کر اپنے بچے کو سینے لگا لیا اور بین کرتے ہوئے بولی "ابھی دو اور ہیں، ابھی دو اندر ہیں۔"

لوجا نو دارنیکس پھر پلٹا اور شعلوں کی چادر سے تکی چوکھٹ کے اندر گھس گیا۔ وہ کہتا ہے جب اندر میری سانس گھٹ گئی اور میرا گلا بالکل بند ہو گیا تو مجھے اونچے اونچے رونے کی آواز آئی۔ میں نے رونے کی طرف ہاتھ پھیلا کر دو قدم آگے بڑھائے تو میری گرفت میں وہ بارہ سالہ لڑکا آ گیا جس کے کپڑوں کو آگ لگی ہوئی تھی اور وہ چلنے سے قاصر تھا۔ میں نے جلدی سے جھک کر اسے بوری طرح کندھے پر ڈالا اور جلتی ہوئی آبتار میں سے باہر آ گیا۔ لوگوں نے براہ و براہ اور زندہ باد کے نعرے لگائے اور جلتے ہوئے لڑکے پر کھل پھینک کر اسے پوٹی کی طرح لپیٹ دیا۔

وہ عورت اب بھی چلائے جا رہی تھی "میری بیٹی۔ میری بیٹی۔ میری بیٹی۔ پتورا۔ پتورا۔ پتورا سانا۔"

لوجا نو اسی پاگل پن، اسی بے ہوشی اور اسی بے خودی کے عالم میں ایک مرتبہ پھر آگ کے سمندر میں داخل ہوا اور تھوڑی دیر بعد گھوم کر دروازے سے ایک طرف ہو کر زور سے پوچھنے لگا "کدھر ہے، کس طرف ہے؟ کہاں ہے؟"

"بانوئیں بانوئیں" عورت چیخ کر بولی۔ "مسل خانے میں، نہانے کو داخل ہوئی تھی، پھر پتہ نہیں کیا ہوئی۔"

ہائے میری پتورا۔ میری پتورا۔ پتورا سانا۔ پتورا بیلا۔ "لوجا نے نے بھی اسی طرح اونچے اونچے بلکہ بہت ہی اونچے اور بے حد گرجدار آواز میں پتورا، پتورا کہہ کر پکارا اور اسے یوں لگا جیسے پتورا اس کے جواب میں یہ کہہ رہی ہے کہ میں یہاں ہوں، میں یہاں ہوں..... اور میں مر رہی ہوں۔ لیکن لوجا نے نے اسے مرنے نہ دیا اور اپنے انداز میں بوری کندھے پر پھینک کر باہر کو بھاگا۔

پتورا کے نیم برہنہ بدن پر پانی سے بھرا بڑا تولیہ لپٹا تھا اور اس میں سے سیم اٹھ رہی تھی۔ ننوں نے جو گرجے سے نکل کر وہاں جمع ہو گئی تھیں، جلدی سے پتورا کے بدن پر چادریں پھینکنا شروع کیں کیونکہ زمین پر ڈالنے سے وہ بالکل ہی برہنہ ہو گئی تھی اور گلابی سنگ مرمر کی تصویر نظر آتی تھی۔

لوگوں نے دیکھا لوجا نو ایک طرف بیٹھا اپنی پتلون کا پانچہ دونوں ہاتھوں میں پکڑے اس کی سلائی اڈیڑر ہاتھ۔ اس کی دائیں پنڈلی بری طرح سے جل گئی تھی اور جلد کے نیچے سے سفید سفید چربی نکل آئی تھی۔ قصبے کے ڈاکٹر نے چلا کر کہا "ظہر و! ظہر و! اسے ہاتھ مت لگانا، میں اس کا بندوبست کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر اپنا فرسٹ ایڈ باکس لے کر اس کے پاس پہنچ گیا اور قینچی سے اس کی پتلون کاٹ کر لوجا نو کا پنڈ چھڑانے لگا۔ آگ گلنے سے پہلے لوجا نو ایک سنہری رنگ کی بڑی خوبصورت اور گھنی داڑھی تھی۔ اب وہ بالکل صفا چٹ، کھین شیو بیٹھا تھا اور لوگوں کی طرف دیکھ کر شرمندگی سے مسکرا رہا تھا۔ دائیں طرف کی گال جل کر سیاہ ہو چکی تھی اور ابروؤں کے صرف نشان باقی رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر نے لوگوں سے کہا "لوجا نو کو ستر پچر پر ڈال کر ہسپتال لے آئیں کیونکہ اس کی مکمل مرہم پٹی ہسپتال میں ہوگی یہاں نہیں۔"

لوگ "لوجا نو زندہ باد۔ لوجا نو سینٹ زندہ باد اور گریمنوز زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے لوجا نو کو ستر پچر پر ڈال کر ہسپتال لے گئے۔ جب ڈاکٹر نے اسے نیپل پر لٹایا تو وہ بے ہوش ہو چکا تھا اور اس کے بدن سے جلے ہوئے ماس کی بو آرہی تھی۔

لوجا نو کو ہر روز گلو کوڈ لگتا رہا۔ نیپے لگتے رہے۔ اس کی پٹیاں تبدیل ہوتی رہیں اور اس کے سر ہانے بیٹھ کر پادری صبح و شام باقاعدگی سے انجیل مقدس کی تلاوت کرتا رہا۔

پندرہ دن بعد جب لوجا نو چلنے پھرنے کے قابل ہوا اور ہسپتال کے لان میں صبح و شام چہل قدمی کرنے لگا تو قصبے کے لوگوں نے سوچا کہ لوجا نو کو اتنے بڑے کام پر تحفہ حسن کارکردگی ملنا چاہیے۔ چنانچہ میونسپلٹی نے اپنے شہر میں اور شہر کے باہر اس بات کا اعلان کر دیا کہ "تیس اکتوبر کو لوجا نو کو اس کے جرأت مندانہ اقدام پر ایک تمغہ اور اس کے ساتھ ایک خصوصی سرٹیفکیٹ دیا جائے گا جس سے وہ معززین شہر کی فہرست میں داخل ہو جائے گا اور میونسپلٹی، تھانے اور کچہری میں خصوصی رویے سے نوازا جائے گا۔"

سارے قصبے نے تجیس اکتوبر کے جشن کی تیاریاں شروع کر دیں اور لوگوں نے اپنے اپنے رشتہ داروں کو خط لکھ کر اس جشن میں شرکت کی دعوتیں بھجوادیں۔

سکول کے عملے اور لڑکوں کے ذمے اس میدان کو سجانا تھا جہاں لوجا نو کا فنکشن ہو رہا تھا۔ فٹ بال کی مقامی ٹیموں کو نمائش میچ کھیلنے کی خصوصی دعوت دے دی گئی تھی اور فنکشن کے شروع کے لیے گرجے کو گھنٹے بجا کر سارے علاقے کو اطلاع دینے کی ذمہ داری سونپ دی گئی تھی۔

میونسپلٹی کا میئر تین دن سے اپنی چھوٹی فیٹ پر جگہ جگہ گھوم رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ میونسپلٹی کے کارندے اپنی

آنکھ لانے کہا "کیوں نہیں، راستہ ایسا کونسا لمبا ہے اور سڑک کونسی ایسی بل کھاتی ہے، یہ چلا لے گا۔" میں نے گھبرا کر اور سر کھجا کر اس کی ماں کی طرف دیکھا تو اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا "دیکھو آنکھ لانے لمبا سفر ہے۔ مختلف قسم کی گاڑی ہے۔ سٹیئرنگ بڑا ہے اور بریکیں دیکھ والی ہیں۔ اس لیے اشفاق کو بڑی دقت ہوگی۔۔۔۔۔ اور پھر ہم بھی صحیح سلامت فنکشن میں پہنچنا چاہتے ہیں۔"

آنکھ لانے کہا "آپ لوگ فکر نہ کریں، یہ بالکل ٹھیک گاڑی چلائے گا اور ہم کو وقت مقررہ پر پہنچا دے گا۔ میں نے اس کے ساتھ دم کی چھوٹی گلیوں اور کھلے بازاروں میں بڑے چکر لگائے ہیں۔ یہ بہت اچھا ڈرائیور ہے اور موٹر اس کی ماشق ہے۔۔۔۔۔ بیٹھو بیٹھو۔۔۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔۔۔ ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

مار یو کندوتی نے آنکھ لاگو گود میں اٹھا کر اگلی سیٹ پر بٹھا دیا اور میں، لم اندھ کہہ کر سٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگی "وہی بڑھ کر کنیشن لگاؤ جو بڑھا کرتے ہو۔" میں نے آیت الکرسی پڑھی اور چابی گھما کر گاڑی سٹارٹ کر دی۔

ستی مردیاتی کو یہ سارا انداز سفر کچھ اچھا نہیں لگا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو سارا شہر دھن کی طرح سجا ہوا تھا۔ گر بے کے گھنٹے بج رہے تھے۔ سرسبز لان پر کیمٹی کا براس بیڑا اونچی اور چلتی دھنیں اڑا رہا تھا۔ لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے پھرتے تھے۔ اکتوبر کی خوشگوار دھوپ میں چھ سات سو اعلیٰ درجے کی بنی کرسیاں کھلے پنڈال میں پڑی تھیں۔ پنڈال کے چاروں کونوں پر گیلی غباروں کے بڑے بڑے جھنڈے مضبوط دھن سے بندھے اوپر جانے کو بے قرار تھے۔

شیخ پرتمین کرسیاں تھیں۔ ایک اس ملک کے عظیم ہیر و لوچا نو کے لیے، دوسری میسر کے لیے اور تیسری گر بے کے بڑے پادری کے لیے جو بے کے اعتبار سے کارڈنیل بھی تھا۔

جب پنڈال مہمانوں اور میزبانوں سے کچھ کھج بھر گیا اور میسر کے حکم سے غباروں کی طنائیں کاٹ دی گئیں تو وقت کے عظیم انسان کے سامنے کبوتروں کا جال کھول کر زمین پر پھیلا دیا گیا۔ سارا آسمان دور دور تک اڑتے پرندوں سے مالا مال ہو گیا اور تماشا کی گردنیں گھما گھما کر کبوترن کا ساتھ دینے لگی۔

پھر بینڈ نے ایک چلتی دھن بجا کر ڈرم پر شاپ بیٹ دی اور خاموش ہو گیا۔ سارا مجمع خاموش تھا، نہ کوئی حرکت کر رہا تھا نہ سانس لے رہا تھا۔ نہ اپنے وجود سے واقف تھا، ابھی آنکھیں بنے بیٹھے تھے۔

میسر صاحب اپنی جگہ سے اٹھے، سپانسام کی پہلی سطروں کو سکروں کی طرح کھولا اور مرد عظیم کو مخاطب کر کے یہ اعلان شروع کیا کہ کوئی بھی خطہ زمین از خود کہتر یا بہتر نہیں ہوتا بلکہ اپنے لوگوں کی موجودگی سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کے برگ و بار، انجم و آثار اور کھسار جو تبار اس کے لوگ ہوتے ہیں۔ انہی کی بدولت علاقوں پر برکتوں کا نزول ہوتا ہے اور انہی کی خاطر آفتاب طلوع ہو کر ساری دنیا کو منور کرتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن میں سے ایک عظیم شخص اس وقت ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس شخص نے اپنی ہمت، جرأت، جوانمردی اور اخلاص و قربانی سے اس علاقے کی نئی تاریخ لکھی ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ پورے عالم انسانیت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

روایتی کام چوری سے اس عظیم فنکشن میں کوئی نہ کوئی پھنڈا ضرور ڈال دیں گے۔ کوئی کمی ضرور رہ جائے گی اور باہر سے آنے والے مہمان ہمارے شہر کے بارے میں اچھا گمان لے کر نہ جائیں گے۔ میسر نے اپنے سارے عملے کو سولی پر ٹانگ کر رکھا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے جو سپانسام لوچا نو کی شان میں لکھ کر دیا تھا، اس میں یکے بعد دیگرے تین تین بڑی تبدیلیاں کر کے میسر نے وہاں ہیڈ ماسٹر کو بھجوا دیا تھا۔ انہوں نے جو ناموس الفاظ اور مشکل تلفظ والی ترکیبیں سپانسام نامہ میں ڈال دی تھیں، میسر نے ان کے نیچے نشان لگا کر تبدیل کرنے کی درخواست کر دی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب چونکہ کیمٹی کے ملازم نہیں تھے، محکمہ تعلیم کے کارندے تھے، اس لیے وہ سپانسام لکھ کر دینے یا اس میں تبدیلیاں کرنے کے مکلف نہیں تھے لیکن چونکہ یہ سب ایک عظیم انسان کی پذیرائی اور کے لیے ہو رہا تھا، اس لیے سب آگے بڑھ کر ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے۔

سکول کے بچوں نے بہت سی نظمیں، تین ڈرامے اور دو ٹیلو اس مضمون پر تیار کیے تھے کہ "میں لوگ وہی جہاں میں اچھے کام آتے ہیں جو دوسروں کے"

ضلعی اخباروں کے علاوہ ملک کے بڑے اخباروں کے نامور رپورٹر اور کالم نویس بھی اس فنکشن پر پہنچ کر رہے تھے۔ ان کے ٹھہرنے کے انتظام، سکول بورڈنگ ہاؤس اور گر بے کی موٹیری میں کر دیئے گئے تھے۔ میسر صاحب نے گیلی غباروں کے علاوہ کبوتروں کے ایک پنجرے کا انتظام بھی کر لیا تھا جو کبوتر فروشوں نے اپنی طرف سے دان کیا تھا کہ کبوتروں کے اڑ جانے کے بعد میونسپلٹی سے کسی قسم کی اجرت نہیں لی جائے گی۔

میسر بزرگ دوست مار یو کندوتی اور آنکھ لانے ہم سب کو حکم دیا تھا کہ ہم اپنے سٹڈے بیٹ میں اس فنکشن میں شمولیت کے لیے آئیں اور اپنے ساتھ پھولوں کا ایک ایک گلدستہ بھی لوچا نو کو بھیجتے کرنے کے لیے لائیں۔

ہم سب وقت مقررہ پر مار یو کندوتی کے گھر جمع ہو گئے اور اس نے وہ بڑی وین سفر کے لیے نکالی جس پر اس کی لکڑی جنگل سے آتی تھی اور تیار شدہ فرنیچر روم جاتا تھا۔ اس وین کے اندر لکڑی کا ایک بہت بڑا کین کرین سے اٹھا کر اندر رکھ دیا جاتا تھا اور دیکھتے دیکھتے یہ وین ایک خوبصورت سفری وین میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ بیٹنی کے سیٹیں، لینے کے صوفے، چھوٹا سا منسل خانہ، فریج، کچنٹ، سامنے موسیقی کا سا گوانی ڈیک، ایک بارہ انچ سپیڈل کا ٹیپ ریکارڈر، ایک ڈسک پلیئر، کیسٹ ایبجی ایبجی ہو کر معرض وجود میں نہیں آتی تھی اس لیے میوزک ڈیک کچنٹ سے اور فریج سے بڑا تھا۔

جب ہم تیار ہو کر چلنے لگے اور آنکھ لانے اپنی دھنل چیر میں شیون کا ارغوانی لباس پہرائی ہوئی آگئی تو سستی مردیاتی نے کہا "میں اور آنکھ لانے ساتھ ساتھ بیٹھیں گی۔" آنکھ لانے کہا "سوری ڈیز آج تم ماما، بھائی، نانا اور ابو کے ساتھ پیچھے بیٹھو گی اور میں ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھوں گی۔"

"اور ڈرائیور کون کرے گا؟" ماما نے پوچھا۔

تو آنکھ لانے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر اپنے ابو کی طرف دیکھا اور کہا "یہ چلائے گا۔۔۔۔۔ پروفیسر!"

اس کے نانا نے کہا "تمہارا مطلب ہے اشفاق چلائے گا، سارا راستہ!"

پھر انہوں نے لوچانو کے گھرانے، اس کے آباؤ اجداد اور اس کے پرکھوں کے مختصر حالات بیان کیے۔ کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ لوچانو کے آباؤ اجداد اپنے جہاز بنا کر راہ لائے واکنگنز (Vikings) سے لڑا کرتے تھے اور پراسن بتیلوں پر معصوم بحری مسافروں کو ان کے ظلم و ستم سے نجات دلایا کرتے تھے۔ میٹر صاحب کا خطبہ کافی لمبا تھا جس میں تاریخی حقائق، فلسفہ بھی، اخلاقیات اور بیانات بھی اور ایک شخص کے لیے خراج عقیدت کا جذبہ بھی۔ ساتھ ساتھ مزاح کی چاشنی اور کچھ پھلکی کہانیوں کا امتزاج بھی تھا۔ حاضرین بالکل بور نہیں ہوئے بلکہ بات بات پر تالیاں بجاتے اور نعرے لگاتے رہے۔

جب میٹر اپنی تقریر ختم کر چکے تو انہوں نے کارڈنیل صاحب کی طرف دیکھ کر کہا ”قدس مآب! اب اس عظیم ہستی کو تمغہ لگانے اور انہیں حسن کارکردگی کا سرٹیفکیٹ عطا کرنے کا کام آپ کا ہے۔ میں اس کے لیے ایک بہت ہی چھوٹا اور حقیر آدمی ہوں اور یہ ہستی بہت ہی عظیم، بہت ہی معزز اور بے حد معظم ہے۔ آپ ہی ان کی خدمت میں یہ حقیر سائنس پیش کیجئے اور آپ ہی ان کو عطا دیجئے تاکہ ان کی وجہ سے ملی ہوا دعا اس سارے علاقے، سارے منطقے اور پورے اطالیہ پر پھیل جائے۔“

کارڈنیل صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور میٹر کی جگہ پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے پہلے تو انجیل مقدس سے کچھ آیات پڑھیں۔ پھر لوچانو کو اپنے پہلو میں کھڑا کر کے لوگوں سے اس کی شان میں نعرے لگوائے۔ اس کے بعد اس نے سینے پر بہادری کا تمغہ بڑی مشکل سے لگایا کیونکہ اس کی پن نئی قسم کی ہونے کی وجہ سے کھلتی نہیں تھی اور کارڈنیل صاحب اس کے کھولنے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔

تمغہ لگا کر اور حسن کارکردگی کی سکروں بنا کر انہوں نے آگے بڑھاتے ہوئے ایک ایسی دعا پڑھی جس میں قادر مطلق کی شان کریمی اور انسان کے دو زانو ہو کر اس کے شکر گزار ہونے کا بیان تھا۔ یہ دعا پڑھتے پڑھتے کارڈنیل صاحب آبدیدہ ہو گئے اور ان پر عجیب سی رقت طاری ہو گئی۔ انہوں نے رومال نکالنے کو جب اپنے پہلو میں ہاتھ ڈالا تو اچانک اس کے اندر سے پچھو نے کا نا۔ کارڈنیل صاحب نے چیخ کر کہا ”میرا بڑھ..... میرا بڑھ..... خواتین و حضرات کسی نے میری جیب کاٹ لی ہے، کوئی شخص پنڈال سے باہر نہ جائے۔“

جمع میں چھ مگوئیاں اور سرگوشیاں ہونے لگیں۔ سارا پنڈال بھنھناتی مکیوں کی آواز سے بھر گیا۔ میٹر نے آگے بڑھ کر اونچی آواز میں پوچھا ”پرس میں کیا تھا؟“ کارڈنیل صاحب نے بتایا ”میں ہزار لیرے۔ تیس امریکی ڈالر اور ایک مرصع فاؤنٹین پن۔“

کچھ لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے ساتھیوں اور ارد گرد کے لوگوں کو تلاشی دی۔ کچھ نے سٹیج پر چڑھ کر کارڈنیل صاحب کو جامہ تلاشی دینے کے لیے اپنا آپ پیش کیا لیکن بڑھ نہ ملتا تھا نہ ملتا۔

کارڈنیل صاحب نے اپنے غناک چہرے پر مسکراہٹ کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا ”خیر کوئی بات نہیں۔ یہ سب آتی جانی چیزیں ہیں۔ اصل چیز انسان ہے۔ وہ احسن التویم ہے۔ اس کا نام اونچا اور اسی کی کوشش سر بلند ہے۔ ہمیں ایسے نقصانات کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ یہ مادی چیزیں ہیں۔ فانی چیزیں ہیں اور ان کو ایک نہ ایک دن فنا ہونا ہے۔ اب

میں اس شہر کے بطل عظیم کو وہ سرٹیفکیٹ پیش کرتا ہوں جو خاص ان کے لیے تیار کیا گیا ہے اور انہی کے لیے سہرے لاطینی رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔“

لوچانو کو یہ سرٹیفکیٹ عطا کر کے انہوں نے اس کے دونوں گالوں پر باری باری بوسہ دیا اور اس سے ہاتھ ملا کر سٹیج سے نیچے اتر آئے۔

وہ جو ایک شیطانی صفت اور ابلیس رو سوکھا سٹرل بڑھا ٹھوڑی پردہ جیسی ڈاڑھی لٹکائے اور چندھی آنکھوں سے آگے چوچ جیسی ناک نکالے بیٹھا تھا، میٹر صاحب کو پکار کر بولا ”انسان بھولن ہار اور خطا کار ہے ایک نظر سینور لوچانو کو دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟“

لوگوں نے شیم شیم اور مردہ باد کے نعرے لگائے اور اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میٹر صاحب ہونے بچنے کی طرح منہ میں انگلی ڈالنے سٹیج پر ہیرہ کے ساتھ کھڑے تھے۔ سٹیج سے اترنے لگے تو انہوں نے لوچانو سے عقیدت مندانہ انداز میں مصافحہ کیا اور اس کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر پھر و لا پھر ولی شروع کر دی۔ لوچانو نے کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ میٹر کی اس مجنونانہ حرکت کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔

میٹر نے لوچانو کے نئے اور خوبصورت کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ایسا بڑھ برآمد کیا جس کے اندر تیس ہزار لیرے، تیس ڈالر اور ایک مرصع فاؤنٹین پن تھا۔ کارڈنیل صاحب جب اپنے دونوں ہاتھوں سے حسن کارکردگی کا تمغہ لگا رہے تھے تو موصوف بلینڈ پھیر کر ہاتھ کی صفائی دکھانے لگے۔

بہت سے لوگ پکار پکار کر کہہ رہے تھے ”معاف کر دو، معاف کر دو کہ یہی خداوند یسوع کا حکم اور یہی عیسائیت کی ریت ہے لیکن کچھ لوگ ان کے خلاف بول رہے تھے۔“ میٹر نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا ”ہم اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ خطا کار کو اس کی سزا ملے گی۔“

وہ سپاہی جو لوچانو کے گزرنے کے لیے بڑی دیر سے تلواریں کی لمبی محراب بنائے کھڑے تھے، ان میں سے ایک سپاہی نے سٹیج پر چڑھ کر لوچانو کو کھٹکھٹائی لگائی اور ڈھوکا دے کر آگے چلنے کو کہا۔

جب لوچانو سٹیج سے اتر رہا تھا تو اس کے ہاتھ میں حسن کارکردگی کی گول کی ہوئی سندھی اور سینے پر حسن کارکردگی کا تمغہ جھول رہا تھا۔

لوگ سر جھکائے ایک دوسرے سے نظریں ہٹائے، ہاتھ لٹکائے چپ چاپ اپنی اپنی سواریوں کی طرف جا رہے تھے۔ نہ کوئی بول رہا تھا، نہ پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ نہ اس احساس کے ساتھ چل رہا تھا کوئی اور بھی اس کے قریب موجود ہے۔ ہر کوئی غم کے غیر مرئی بگلے میں لپٹا دھیرے دھیرے سے قدم اٹھا رہا تھا۔ مردوں نے ہاتھ اپنی جیبوں میں ڈال لیے تھے، عورتوں نے ان بچوں کو گود میں اٹھالیا تھا جو ابھی بھاگتے دوڑتے ان کے ساتھ آئے تھے۔ یہ کینا غم تھا، کیسا دکھ تھا، کیسا کرب تھا جس نے سب کو آج واحد میں اس درجہ پریشان کر دیا تھا۔ کوئی کشتی نہیں ڈوبی تھی، کوئی زلزلہ نہیں آیا تھا۔ دھماکہ نہیں ہوا تھا، قحط نہیں پڑا تھا لیکن سبھی لوگ ان حادثات سے بھی بڑھ کر غمگین ہو گئے تھے۔ کیا انسان کے زوال سے

لوگ اس قدر ہم جاتے ہیں۔ ایک انسان کی ہستی سے سارا معاشرہ بے جان ہو جاتا ہے! یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کی کم اوقاتی سارے ماحول کو شرمندہ کر دے۔

پنڈال آہستہ آہستہ لوگوں سے خالی ہو رہا تھا۔ صرف ایک کرسی پر آنکھلا بیٹھی رہ گئی تھی۔ وہ بھی اپنی بھوری کی وجہ سے۔ میں اس کے قریب آ گیا تو اس نے اپنی نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کچھ پوچھے بنا اس کو گو میں اس کی وکیل چیئر میں ڈالا اور اسے آہستہ آہستہ دھکیلتا ہوا باہر آ گیا۔ وین کے پاس اس کا سارا کنبہ چپ چاپ اور خاموش کھڑا تھا۔

کسی سے کہے سنے بغیر ہم سب اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ نانا ماریو نے وین کے اندر سے درمیانی دیوار کو ہٹا دیا اور میں نے چابی گھما کر گاڑی سٹارٹ کر دی۔

ساتھ میل کے لیے راستے میں آنکھلا نے مجھ سے ایک بات بھی نہ کی۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں کے مسلسل آنکھ بھائی اور ان سے اپنا بہت ہی چھوٹا سا رومال بھگوتی مسلسل آہیں بھرتی رہی۔ اس ساری مسافت میں مجھے دوسرے اس کے دو بول سنائی دیے ”ہم سبھی اپنا ج ہیں۔ واقعی ہم سب لوگ اپنا ج ہیں! اور یہ کہ خطرہ ہر مقام پر موجود ہوتا ہے اور آگ خفی سانس کے آنے تک کچھ بھی ہو سکتا ہے!!“

جب میں ان کے گھر سے سڑک پر روٹی کو لے کر چلا تو کسی نے ہم کو روکنے کے لیے نہ کہا۔ نہ کسی نے شام کے کھانے کی صلہ ماری، نہ کل آنے کے لیے کہا!

اٹلی میں رہتے ہوئے مجھے تقریباً دو سال ہو گئے تھے لیکن اپنے قیام سے میں نے کچھ حاصل نہیں کیا تھا۔ میرے سویرے یونیورسٹی جا کر طالب علموں کو سندھ اور دور یڈر پڑھانا، پھر ان کی کاپیاں دیکھنا، تلفظ ٹھیک کرنا، گھر واپس آ کر قرعہ ڈھابے سے کھانا کھانا۔ پھر چلتون ذرا سی ڈھیلی کر کے نشریات کی مہم پر روانہ ہو جانا۔ ریڈیو سٹیشن پر ذرا سا اونگھنا، فارن سروس کے دوسرے اناؤنسروں سے گپ لگانا، اپنی پندرہ منٹ کی ٹرانسمیشن ختم کر کے یا گھر واپس آ جانا یا میٹرو سٹیشن کے لیے فضول ادھر ادھر نکل جانا۔ یہ تو کوئی زندگی نہیں تھی۔ اس میں تو کسی قسم کی دستیابی کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ کوئی انجام کمال کی نوید نہیں تھی۔ پھر میں کیوں خواہ مخواہ یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میری نوکری دیال گھگھ کالج میں پکی تھی۔ میری جگہ عوضی پر ایک اور لیکچرار کام کر رہا تھا اور مجھے آخر وہیں لوٹ کر جانا تھا اور مستحق اسی پیشے میں رہنا تھا۔

عام انسانی زندگی کافی بے مقصد ہوتی ہے۔ ہر کسی کو تو کوئی لگن یا کوئی دھن یا کسی قسم کا جنون یا کوئی ایسا شوق نہیں ہوتا جس کے لیے وہ اپنی ساری زندگی وقف کر دے۔ وہ لوگ تو خال خال ہوتے ہیں لیکن باقی کے لوگ صرف روٹی، کپڑا، مکان، آسائش اور خوش وقتی کے طلبگار ہوتے ہیں۔ ان کے بھانویں کوئی مرے کوئی جیے ان کا پیالہ پُر رہنا چاہیے۔ ان کا وقت اچھا گزرتا چاہیے اور ان کی آسائشوں میں اضافہ ہوتے رہنا چاہیے۔ میں اس دوسری قسم کے لوگوں میں سے تھا اور میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ میرا زادہ ابراہیم حنیف میرے پے در پے سوالوں سے کبھی رنج ہوتے تھے تو ایک ہی بات

کہا کرتے ”بھیتروں میں بھیتروں کی رہو بھائی..... عیش کرو اور مزے لوٹو، متفاوت ہو کر مرنا ہے! اپنے بھی جی کا ریاں دروں کے لیے بھی موت!“

میں بھی اپنا بریف کیس اٹھائے بھیتروں میں بھیتروں میں اور رات کی گردش کے اندر مدام چل رہا تھا۔ ٹرام سے اڑتا، بس کچڑا، پیدل چلنا، لفٹ سے چڑھنا، سٹیپ خریدنا، خط لکھنا، شیو بنانا، فون کرنا، یاروں سے ملنا، ٹھنڈے اڑانا، اچھا کھانا، مندا بولنا، پوشاکیں بدلنا، نوکری کرنا، افسروں کی خوشامد کرنا، ان کی بیویوں اور محبوباؤں کی سالگرہیں یاد رکھنا اور اپنی نواہ میں اضافے کی کوشش کرتے رہنا..... یہ سب کچھ کرنے کی وجہ سے میں ایک بھیتروں میں تبدیل ہو چکا تھا اور میرے درجے بھیتروں میں بڑھنے لگی تھی۔ میں نے شیشے میں اپنی شکل دیکھی تو وہ لاہور والی شکل نہیں تھی۔ ایک بھیتروں کا چہرہ تھا، ویسی ہی شرمندہ آنکھیں، اسی قسم کی نناک ناک ویسے ہی گرے ہوئے سے کان۔ میں سب کچھ تھابھ بھیتروں کی طرح مہیا نہیں سکتا تھا۔

انہی دنوں روم میں یہ خبر گشت کرنے لگی تھی کہ اٹلی میں بہت جلدی دی آ رہا ہے اور تفریح کی دنیا میں ایک بہت بڑے ذریعے کا اضافہ ہو رہا ہے۔ کچھ لوگ اس خبر پر یقین رکھتے تھے اور اس کی تصدیق کے لیے طرح طرح کی دلیلیں پیش کرتے تھے مگر ایک بہت بڑا سنجیدہ طبقہ اس خبر کو صحیح نہیں گردانتا تھا کہ اطالوی حکومت کے پاس اتنے فنڈز ہی نہیں کہ وہ انہی جیسے منصوبے کی تکمیل ہو سکے۔ ان کا خیال تھا کہ میلان ایک تجارتی شہر ہونے کی بنا پر جیمس آف کامرس کی طرف سے آدھے خرچے کا بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ اس لیے وہاں تو ایک مقامی قسم کا ٹی وی سٹیشن لگ سکتا تھا لیکن سارے اطالیہ میں اس کے پڑوں کا جال بچھنا ناممکن نہیں۔

میرا پڑوسی جو جی کہتا تھا ”پروفیسر یہ ہے تو گلٹری لیکن اگر اٹلی میں کسی کی مدد امداد سے ٹی وی لگ جائے تو سارے ملک کے بھاگ جاگ اٹھیں..... تو وہ اپنی مانس کی عینک کے پیچھے سے ستر سالہ گول گول بوڑھی آنکھیں گھما کر کہتا ”اس کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوگا کہ ملک سے جہالت اور کم علمی کا روگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ کبھی بھی سکول نہ گئے لوہار، ترکھان، کنجڑے، قصباتی، بھڑوے اور طوائفیں سب تعلیم یافتہ ہو جائیں گے۔“

جب میں نے جو جی کے اس بیان پر تعجب کا اظہار کیا تو اس نے میرے قریب ہو کر کہا ”ان لوگوں کو لکھنا پڑھنا تو نہیں آئے گا لیکن یہ پڑھے لکھے لوگوں جیسے آداب ضرور سیکھ لیں گے۔ ہر قسم کی معلومات اکٹھی کریں گے اور سائنسی موضوعات پر بلا تکان گفتگو کر سکیں گے..... علم ہوتا ہی کیا ہے.....“ میں کافی دیر اس کا فقرہ مکمل کرنے کے انتظار میں بیٹھا رہا لیکن جب وہ اپنے تبا کوئی نئی پتھری چبانے لگا تو میں نے پوچھا ”سینوز جو جی علم کیا ہوتا ہے؟“

کہنے لگا ”لوہد ہو گئی۔ کمال ہے بھئی ایک پروفیسر مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ علم کیا ہوتا ہے۔ یہ تو بچے بچے کو معلوم ہے پروفیسر کہ علم گفتگو کا نام ہے جس کو گفتگو آگئی، اچھی اور رواں گفتگو آگئی، بلا جھجک اور بے تکان بولنا آگیا وہ صاحب علم ہے۔“ پھر اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور میری کلائی پکڑ کر بولا ”کبھی وکیلوں کو عدالت میں دیکھا ہے؟ فلموں کے سینما میں سٹیج پر..... کلاس روم میں، بس وہ جو کچھ بول رہے ہوتے ہیں، وہ علم ہوتا ہے۔“

میں نے کہا "صرف بولنا؟"

کہنے لگا "صرف بولنا..... بے تکان بولنا اور بلا جھجک بولنا علم ہوتا ہے۔ اگر کبھی ٹیلی ویژن آگیا تو تم دیکھو کہ یہاں کا بچہ بولنے لگے گا۔ ڈائلاگ ڈیلیوری کرے گا اور ہر شخص زیور علم سے آراستہ ہو جائے گا لیکن حکومت پاس پیسہ نہیں۔" اس نے بائیں ہاتھ کا چلو اور دائیں ہاتھ کی مٹھی بند کر کے انگوٹھا چلو میں جھکاتے ہوئے کہا "یہ سیاست سب کھا دیا ہے۔ سارا مال اڑا جاتا ہے۔ عیش کرتے ہیں اور غریبوں کا خون کیانتی سمجھ کر پی جاتے ہیں۔ شکر کہ اٹالین نہیں ہو، تمہارے باپ دادا نے ضرور کوئی نیک کام کیے ہوں گے جو تم نے اٹلی میں جنم نہیں لیا۔ ہم تو سور لوگ ہیں سوروں کے حکمران مہاسور! شکر کیا کرو اور جب بھی کھڑی کھلے پوپ کے درشن کیا کرو۔"

فیور جی کی دکان پر ریٹا آکر کھڑا کرتی تھی "اٹلی میں ٹیلی ویژن نہیں آتا..... آیا بھی تو کم از کم ہماری زندگی پر نہیں آتا۔ ان وزیروں سفیروں کو اپنے طلوے مانڈے سے کام ہے۔ ان کو کسی کیا پروا۔ کوئی مرے کوئی جیے۔ کسی کا جان اٹھے یا آخری منڈیر پر قبر بنے، ان کو تو اپنی عیاشیوں سے غرض ہے، عوام کی کوئی فکر نہیں۔"

ٹیلی ویژن کی آمد کی بات تو بعد میں کریں گے۔ پہلے منڈیر پر قبر کی وضاحت کر دوں کہ اٹلی کے بڑے گھرانے پر ہجوم شہروں میں قبرستان زمین پر پھیلے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ دیواروں کی صورت منزل در منزل اور پوکھٹے جاتے ہیں..... لمبی لمبی فصیل نما دیواریں سات آٹھ فٹ چوڑی اور آدھی آدھی فرلانگ بھی ہوتی ہیں۔ آپ نے دیوار چین کی تصویر دیکھی ہوگی۔ بس اس کی چوڑائی ذہن میں رکھ لیجئے اور اس کا دیوار ہونا سوچ لیجئے۔ بس اس کی لمبائی چھوڑ دیجئے۔

ان سات آٹھ فٹ چوڑی فصیلوں میں ڈھائی فٹ مربع کے مستطیل خانے ہوتے ہیں جن میں میت کو ایک بار ڈبور پر لٹکا کر اندر دھکیل دیا جاتا ہے اور خانے کا منہ سنگ مرمر کی سلیب سے بند کر دیا جاتا ہے۔ اس سلیب کو مضبوطی سے بند کرنے کے لیے بہت ہی اعلیٰ درجے کا مسالا استعمال کیا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے قبر کے مرمر میں ڈھکنے کو سیسہ یا کر بند کیا گیا ہو۔ اندر کی دنیا اندر، باہر کی تال میل ہی نہیں رہتا۔ ہر سلیب کے باہر آگے کو بڑھے ہوئے دو دو تین تین انچ کے چھوٹے چھوٹے کانس ہوتے ہیں جن کے سوراخوں میں ایک طرف اگر بتیاں کھڑی کی جاسکتی ہیں اور دوسری طرف پھولوں کی ڈنڈیاں، پھولوں والے سوراخ کھلے اور اگر بتیوں والے تنگ ہوتے ہیں۔ ہر سلیب کے اوپر بہت موٹے حروف میں قبر کا نمبر ہوتا ہے بلکہ ایسا جیسے گاڑی کی نمبر پلیٹ ہوتی ہے اور ساتھ اگر کسی نے خصوصی رقم خرچ کی ہوئی تو مردے کا نام بھی لکھا ہوتا۔

ان دیواروں میں زمین کے ساتھ کی سب سے چٹلی قطار یعنی گراؤنڈ فلور کی قبریں سب سے مہنگی ہوتی ہیں اور جوں جوں خانے اوپر چڑھتے جاتے ہیں قبریں سستی ہوتی جاتی ہیں۔ چودھویں، پندرہویں منزل کی قبریں جنہیں زمین سے دیکھتے ہوئے ٹوپی کرتی تھی، کافی سستی ہوتیں جن میں غریب غربا اپنے مردے دفن کرتے تھے۔ یہ قبریں تو سستی تھیں لیکن ان میں "مردہ چڑھائی" کی فیس کافی تھی۔ ایک خصوصی کرین کے ساتھ میت اوپر اٹھائی جاتی اور اس کرین کے اندر سے ایک دھکیلو نکل کر مردے کو اس کے مطلوبہ موکھے میں آرام سے دھکیل دیتا۔ جیسے بندوق میں کار تو س فٹ ہو جاتا ہے

اور پھر یہی کرین نیچے اتر کر قبرستان کے معمار کو بعد سنگ مرمر کی نمبر پلیٹ کے اوپر لے جاتا اور مستری ٹافٹ موکھے کا منہ ابدی طور پر بند کر کے نیچے اتر آتا۔ قبر تو سستی تھی لیکن کرین کا کریم کافی تھا۔

سارا قبرستان، پھولوں، روشوں، سربسز پودوں اور گھنے درختوں کے اندر واقع ہے۔ کوئی بارہ تیرہ آدھ آدھ فرلانگ لمبی دیواریں ایک دوسری کے متوازی کھڑی ہیں۔ ہر دیوار کے دونوں طرف چھ فٹ موٹا، سیاہ رنگ میں دیوار کا نمبر لکھا ہے کہ بہت اونچے اونچے ہوائی جہاز سے بھی نظر آتا ہے اور ہر دیوار کے سنگین دروازوں میں ایک ایک مردہ دفن ہے۔ ہر دیوار میں بیس بائیس ہزار مردے ابدی نیند سو رہے ہیں اور ہر ایک کے باہر اس کی نمبر پلیٹ لگی ہے۔

میری استانی روز تینا جو مجھ سے عمر میں نو سال بڑی تھیں اور جن سے میں اطالوی گرامر اور بنیادی لاطینی کے ہفتہ میں ایک دن چھوڑ کر تین دن درس لیتا تھا، صرف میری زبان دانی ہی کی استاد نہیں تھیں بلکہ مجھے اطالوی تہذیب، رومن اطوار اور عیسائی مذہب سکھانے پر بھی کاربند تھیں۔ یہ ذمہ داری انہوں نے خود ہی اپنے ذمے لے لی تھی اور وہ ہر دسویں ہفتہ ہویں مجھے اپنے ساتھ بس پر، ٹرام پر یا ٹرائی میں لے نکلتی تھیں اور مجھے اپنی تہذیب سے روشناس کراتی تھیں۔ وہ کچی رومن کیتھولک، بے حد شرعی، نہایت کم آمیز اور اپنے اصولوں کی بڑی پکی خاتون تھیں۔ میرے ساتھ چلنے پھرنے، گھومنے گھمانے میں کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ میں بھی ایک پکا مذہبی، سخت دہائی، اخلاق گزیدہ اور کزنو جوان تھا۔ سینورینارونیتا کو ہر ہفتہ ہفتادہ کی سے ان کی فیس ادا کرنے اور ان کے ساتھ استاد کی شاگردی کے رشتے سے آزادانہ گھومنے، انہیں بس سے یا ٹرام سے ہاتھ پکڑ کر اتارنے، بھٹائی جگ پر انہیں اپنا بازو پیش کرنے، گرے پر لے جاتے وقت ان کے دونوں ہاتھ تھام کر دعا کی درخواست کرنے سے سینورینا میں اصولوں کی سختی نہیں رہی تھی اور میں بھی اپنا دہائی پن چھوڑ چکا تھا۔ انسان کو اتنا بھی پابند قیاد اور پین شرح و تحفظات نہیں ہونا چاہیے۔ انسان تو خدا کی کھلی عبادت کے لیے پیدا ہوا ہے۔

استانی صاحبہ نے ایک روز مجھے ایک نئی مہم پر لے جاتے ہوئے لفٹ میں کہا "مجھے محترمہ استانی صاحبہ یا سینورنا کہنے کے بجائے صرف روز تینا کہا کرو۔ اس سے اجنبیت نہیں رہتی۔ پھر روم کے لوگ اس انداز خطاب کو پسند کرتے ہیں اور خود مجھے بھی اچھا نہیں لگتا کہ ہمارے درمیان تکلف کی فضا باقی رہے۔"

میں اس اعتراف محبت پر خوش تو ضرور ہوا لیکن ایک دم سے اس پر عمل کرنا مشکل نظر آتا تھا۔ اب تک کی استانی کو ایک دم سے روز تینا کہنا شروع کر دینا کافی مشکل تھا۔ میں نے ان سے اس تبدیلی مخرج کے لیے چند دن کی مہلت طلب کر لی کہ جو نئی میرا اچھا کار دور ہو جائے گا، میں تم کو روز تینا کہنے لگوں گا۔ اس نے بڑی خوشی سے مجھے اس کی اجازت دے دی اور بتایا کہ آج میں تمہیں روم کے قبرستان لے جا رہی ہوں جہاں میری والدہ کی قبر ہے اور جہاں مجھے اس کی مغفرت اور آسائش ابدی کی دعا مانگنی ہے۔

جب ہم قبرستان پہنچے تو وہاں مرد، عورتوں، بچوں کا ایک میلہ سا لگا تھا۔ کوئی مذہبی تہوار تھا اور بے شمار لوگ اپنے اپنے عزیزوں کی قبروں پر دعا مانگنے آئے تھے۔

سینورینارونیتا نے پہلے مجھے قبرستان کا ایک جنرل ویو دیا۔ مرجانے فنا ہونے اور اگلی دنیا بسانے پر مذہبی اور

سیکولر تصورات اور عقائد سے روشناس کرایا۔ پھر اس خصوصی قبرستان کا پروژہ آئی ویو پیش کیا کہ زمین کی تنگی اور جگہ کی کمی کے باعث مردوں کو دفن کرنے کا یہ قابل احترام طریقہ دریافت کیا گیا۔ اس میں عقیدت اور محبت دونوں جذبے شامل ہیں۔ پھر پوپ سے اس کی اجازت لے کر شرعی جواز حاصل کیا گیا۔ کچھ لوگ اس کے مخالف رہے اور اپنے مرد و دروازہ قبیلہ اور گاؤں میں جا کر دفن کرتے رہے لیکن یہ طریقہ چونکہ زیادہ پریکٹیکل اور آسان تھا، اس لیے تنگ نظر اور بنیاد پرست مذہبی جنونیوں کا گروہ ہار گیا اور وہ بھی اسی قبرستان میں اپنے مردے دفن کرنے لگے۔

میں نے کہا ”سینور ینا یہ دفن کرنا تو نہیں، یہ تو دراز میں بند کرنا ہے۔ اس کے لیے کوئی نیا مصدر وضع کرنا چاہیے۔“
کہنے لگیں ”یہ دفن کرنا ہی ہے اور اس کو شرعی طور پر دفن کرنا ہی کہا جائے گا۔۔۔۔۔ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ دین
میں اجتہاد کرنا ضروری ہے۔ مناسب اور بروقت اجتہاد نہیں ہوگا تو دین کمزور ہو کر ختم ہو جائے گا۔“ پھر انہوں نے مجھے اجتہاد
کے معنی سمجھائے اور اس فلسفے پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے میرے سارے شکوک کے شافی جواب عنایت فرمائے۔
اتنے میں قبرستان کا کارکن مضبوط بانس کی ایک لمبی سی میڑھی لے آیا اور سینور ینا سے قبر کا نمبر پوچھنے لگا۔ جب
میڈم نے اسے چودہ ہزار تین سو بہتر بتایا تو ان کی آنکھوں میں مونے مونے آنسو آ گئے۔ یہ میری استانی کی ماں کی قبر
تھی۔ شاگر ہونے کے رشتے سے میں بھی آبدیدہ ہو گیا اور منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا تاکہ ان کو یقین ہو جائے کہ میں بھی ان کے
غم میں برابر کا شریک ہوں۔

جب میڈم نے سیڑھی والے سے نوک نرید لے کر اسے ہزار لیرے سیڑھی کا کرایہ دیا اور سیڑھی والے نے ٹھیک مقام پر سیڑھی لگا دی تو میڈم دعاؤں کی چھوٹی کتاب اور تین پھولوں کا گلہستہ لے کر سیڑھی پر چڑھ گئیں۔
دسویں منزل پر میری استانی کی والدہ کی قبر تھی۔ انہوں نے پہلے تو تینوں پھول چھوٹے طاقچے کے بڑے سوراخوں میں لگائے، پھر دعاؤں کی کتاب کھول کر جلدی جلدی دعائیں پڑھنے لگیں۔ ان کے ساتھ ہی ذرا نیچے نچلیں تھار میں ایک جھکی سا بڑا ہڈا، ڈاڑھی بڑھائے، بڑے سے سر پر چھوٹی ٹوپی پھنساے، اپنی بیوی کی نمبر پلیٹ سے ماتھا لگائے کسی انجیل یا دعاؤں کی کتاب کے بغیر زبانی کچھ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دعاؤں کی یا مغفرت کی التجاؤں کی نرمی نہیں تھی بلکہ ایک جھلکے دار غصہ تھا جو ہر مکالمے کی ادائیگی کے بعد اور شدید ہو جاتا تھا۔ مجھے اس کی آواز تو کیسا سنائی دینی تھی کہ وہ بہت دور تھا اور کافی بلندی پر تھا لیکن مجھے صاف پتہ چل رہا تھا کہ مرنے والی پر طعنوں، انہوں، بد دعاؤں کے کوڑے برس سا رہا ہے۔

بڑھا کہہ رہا تھا ”مرجا! مرجا!!“ دفع ہوجا۔ چلی جا اپنے یاروں کے پاس مجھے بھٹیڑیوں اور کتوں کے پاس چھوڑ کر..... آئے ہائے ہائے میں اپنے بابا پاس جاؤں گی۔ اپنی ماں پاس جاؤں گی۔ اب میرا وقت آ گیا ہے، اب دوا دارو ختم کر دو..... اوئے وقت کی بچی۔ دوا دارو کی شوگرٹی۔ پھوکی جھوکی۔ وہاں کون تیرے یار بیٹھے تھے جو میری ڈھونڈ پر لات مار کر چلی گئی۔ اب سنبھال ان کو۔ روک کے دکھا..... سامنے آ کے بتا، مجھے میرے ہی گھر سے نکال رہے ہیں۔ دونوں بے ایک ساتھ مل گئے ہیں۔ دونوں بہوؤں نے بارہ سال بعد صلح کر لی ہے اور وہ جو چوٹی کا یکہ ہے، اس نے عدالت میں عرض بھی دیدی ہے کہ گھر اصل میں بیٹوں کا ہے..... ہت تیری..... کتنی..... مردار..... سوؤں کی

بہی۔ مر جا مر جا، چھوڑ جا بڑھے کو پونٹے کا رلوپل کے نیچے ایڑیاں رگڑنے کو ہڈیاں جلائے کو..... سن لے سو رک کی بچی، دو بچوں کی ماں، ڈائمن بے وفا، من بھی اگر کیڑے پڑ کر نہ مرا تو میرا بھی نام رویر تو نہیں..... تجھ سے پوچھ لوں گا۔ سمجھ لوں چھوڑوں گا تو نہیں۔ مجھ سے استادی کر کے یہاں آ گئی۔ مر جا! مر جا!! دفع ہو جا..... جلتی جا، جہنم میں بتی جا، بھلتی جا..... تیرا استیاساں جائے..... دھو کے باز..... جعل ساز..... فرہی عورت.....“

یہ جتنی بڑھا جب میٹر سی سے اتر کر میرے قریب سے گزرا تب بھی اسی طرح ترپ ترپ کے بڑھیا کو جھانپتا ہوا تھا اور اس کو گالیاں دے رہا تھا۔ پھر جب میری استانی واپس میٹر سی سے اتری میں تو انہوں نے بھی یہی شکایت کی کہ اس نے ساری توجہ اور سارا خضوع ہلا کے رکھ دیا، پتہ نہیں میری کوئی دعا میری ماں کو پہنچی بھی یا نہیں۔

میں نے کہا ”میڈم آپ فکرنہ کریں، کسی روز میں خود یہاں آ کر عقیدت کے پھول آپ کی والدہ کی خدمت میں پیش کروں گا اور ان کے لیے میم قلب سے دعا کروں گا..... آخر میرا بھی تو کوئی حق ہے!“

روز تیانے محبت کے ساتھ میرا ہاتھ دبایا اور بڑی دیر تک اسے اسی طرح سے پکڑے رکھا۔ جب ہم گھر واپس آ رہے تھے تو میڈم نے بس کی ساری سواریوں کے سامنے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی گود میں رکھا ہوا اور آکھیں بند کر کے بیٹھی ہوئی تھیں۔

مجھے اچھا تو بہت لگا لیکن ساتھ شرم بھی آتی رہی۔ میں نے کسی سے آنکھ ہی نہیں ملائی، بس کے باہر ہی دیکھتا رہا۔ کوئی ایک ہفتہ بعد ہمارے یہاں اچانک ایک چھٹی آ گئی۔ شام کی ٹرانسمیشن ایک فوری منصوبے کے لیے مقرر ہو گئی اور ہمارا سارا بدن فری ہو گیا۔ میں بریف کیس کے بغیر سر پر جو کیوں والی ٹوپی اوڑھے اپنی میڈم کے گھر گیا۔ اس سے ہاتھ ملا کر یہ اطلاع دی کہ آج میں فارغ ہوں اور آپ کی والدہ کی قبر پر جا کر دعا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ان کا قبر دیکھنا بھیجنے اور ساتھ ہی دعا کی عبارت دے دیے۔

روز بتانے کہا ”مٹھرو میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“
میں نے کہا ”اس طرح سے تو میری محبت اور تقدیر میں فرق آ جائے گا۔ میں اکیلا ہی جانا چاہتا ہوں اور اکیلا
ملاؤں گا۔“

وہ میری اس پردگی اور میرے اس عزم سے بہت خوش ہوئیں اور پولیس "ماما کا قبر نمبر کاغذ پر لکھ لو وہاں جا کر فی کلمہ اجاتا ہے۔"

میں نے کہا ”حدر کرتی ہیں آپ۔ ماما کا نمبر اور میں بھول جاؤں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے! آخر میرا بھی تو کوئی رشتہ ہے۔“ انہوں نے خوش ہو کر کہا ”تو جیسے سنو..... دیوار نمبر سات..... قبر نمبر چھ کے بعد اٹھ ہے اور اس کے ساتھ ذرا چمچیں، پیچھے کو ہٹی ہوئی سات ہے۔“

میں نے کہا ”یہ تو پھر پر لکیر ہو گئی۔ اس کو تو ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ اب یہ بتائیے کہ مجھے وہاں جا کر پڑھنا کیا ہے؟“ انہوں نے کہا ”کچھ بھی پڑھ دو، دعاؤں کی کتاب ہے۔ بائبل ہے۔ تسبیح پر گنتی ہے۔ جو بھی تمہیں پسند آئے

پڑھ دو۔ ہر نیک عمل اور نیک تمناء مردے کو پہنچ جاتی ہے۔“

میں اپنی استانی کے کندھے اور کمر پر عقیدت کا لمبا سا ہاتھ ڈال کر ان سے رخصت لے کر واقعی قبرستان چلا گیا وہاں ایک چھوٹے سے کمرے میں وقف کی ہوئی چھوٹی بڑی بے شمار انجیلیں پڑی تھیں، میں نے جری جلدی ایک چھوٹی سی بائبل لے لی اور سیزھی والے سے آٹھ نمبر کی دیوار پر چلنے کو کہا۔

آج ریش کچھ زیادہ نہیں تھا۔ کم کم لوگ تھے۔ پھول والے اور اگر بتی والے بھی کم تھے۔ ایک بڑے سے دروازے کی اوٹ میں تین پادری لوڈ وکیل رہے تھے۔ جب سیزھی والے نے آٹھ نمبر کی دیوار کی طرف جاتے ہوئے مجھ سے قہقہہ ماکھا تو میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ میڈم نے آٹھ نمبر کی دیوار کہا تھا یا سات نمبر کی دیوار؟ انہوں نے کہا کہ تھا چھ کے برابر آٹھ آتی ہے اور وہ ذرا میزھی سی ہے۔ تو یہاں تو سات پیچھے کوئی ہوئی ہے اور وہ ترچھی سی ہے۔ یقین ہو گیا کہ آٹھ نمبر کی دیوار ہی کہا تھا۔ اب اس دیوار میں درمیان سے ذرا آگے وہی قبر تھی جہاں میڈم دعائے مغفرت کر کے گئی تھیں۔ میں سیزھی پر چڑھا، ماما کے لیے اگر بتی سلگا کر پتھر کے سوراخ میں اتاری اور کرسیوں کا باب لے کر پڑھنے لگا۔ کرسیوں کا باب مجھے ساری بائبل میں سب سے زیادہ پسند ہے۔ میں نے اسے اتنی مرتبہ پڑھا ہے کہ اس کا پہلا ڈیڑھ منٹ مجھے زبانی یاد ہو گیا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی دعا کو ڈیڑھ صفحے پر ہی ختم کر دیا اور سیزھی سے نیچے اتر آیا۔

قبرستان کے باہر ایک ٹیلے والا آکس کریم بیچ رہا تھا۔ اس سے منگنے پر گئی ہوئی ایک لولی آکس کریم خرید لی۔ قریبی بیچ پر بیٹھ کر کھائی اور جب فارغ ہو گیا تو سوچنے لگا کہ ابھی استانی کے پاس جاؤں یا کل شام! کابلی اور لاہوری کہا، کل چلے جانا یا پرسوں اترسوں جا کر رپورٹ بول دینا لیکن عقل نے رائے دی کہ آج ہی ٹھیک ہے، بلکہ ابھی اور اسی وقت مناسب ہے۔

جب میں نے لفٹ سے نکل کر اپنی استانی کے گھر کے گھنٹی بجائی تو اندر سے اس کا تانا نکلا جو نیچے تر تو رہا مگر شطرنج کھیلنے جا رہا تھا۔ میں نے بڑے تپاک سے اس کو سلام کیا، مگر اس نے میرے سلام کا کوئی جواب نہ دیا۔ شطرنج کی دھن میں اس نے اتنا بھی نہ سوچا کہ کوئی دروازے پر کھڑا ہے۔ جس نے ابھی گھنٹی بجائی تھی اور جس کے جواب میں آپ نے دروازہ کھولا تھا اور جس نے آپ کو بڑے خلوص اور نیاز مندی کے ساتھ سلام کیا تھا لیکن وہ اس وقت شطرنج کے لئے میں دھت تھا۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ لفٹ سامنے موجود ہے اور نیچے جانے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ اس نے آٹھویں منزل سے سیزھیاں اترنا شروع کیں اور بڑی دیر تک مجھے سیزھیوں کے اندر گھومتا ہوا نیچے جاتا نظر آتا رہا۔

میں نے دوبارہ گھنٹی بجائی تو میری استانی لمبا سا فرغل پہنے، ہاتھ میں انڈیا پیچھنے والا سپرنگ اٹھا، مسکراتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ اس نے صوفے کی طرف ہاتھ پھیلا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں نے کہا ”سوری میڈم! اس وقت میں جلدی میں ہوں بکل آؤں گا اور تفصیل سے آپ کے ساتھ باتیں کروں گا۔ اب تو میں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ اس وقت سیدہ صاحبہ قبرستان سے آ رہی ہیں اور آپ کی والدہ کے سر ہانے اگر بتی سلگا کر اور کلام پڑھ کر ابھی ابھی سیزھی سے اتر آئیں۔“ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر بڑی گرجوٹی سے مصافحہ کرتے ہوئے اسے دبایا اور بڑی گل پاشیوں کے ساتھ میرا

شکر ادا کرنے لگی۔

میں نے کہا ”آپ کی والدہ کی لحد کے سامنے مجھ پر ایک عجیب سی روحانی کیفیت طاری ہوئی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اس دنیا کا باشندہ نہیں ہوں، کسی اور ہی سیارے سے آیا ہوں اور کچھ اور ہی قسم کی مخلوق ہوں۔“ انہوں نے کہا ”اصل میں میری والدہ ایک بہت بڑی سینٹ تھیں اور ان پر کشف کا عالم ہر وقت طاری رہتا تھا۔ وہ ہر آنے جانے والے شخص کے آ پار دیکھ لیتی تھیں اور اس کی کیفیت اور اس کے مزاج کے مطابق بات کرتی تھیں لیکن انہوں نے کبھی اپنا آپ ظاہر نہیں ہونے دیا۔“

میں نے کہا ”بڑے بزرگوں اور روحانیت کے صحیح عاملوں کی یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنا آپ کبھی بھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ لوگ ہمیشہ بددعا میں رہتے ہیں کہ ہیں یا نہیں ہیں۔ کوئی چمکتا روکھائیں گے یا ایسے ہی ٹر خادیں گے۔“ لیکن انہوں نے میری بات کا کوئی جواب دینے بغیر جلدی سے پوچھا ”اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے انجیل مقدس کا کون سا حصہ پڑھا تھا اور کس قدر پڑھا تھا؟“

میں نے کہا ”مس! میں نے کرسیوں کا باب پڑھا تھا اور تقریباً آدھے سے بھی زیادہ پڑھ گیا تھا۔“ وہ میری بات سن کر بہت خوش ہوئیں اور یونہی بے دھیانی میں بولیں ”نمبر یاد رہا تھا کہ حسب عادت بھول گئے تھے؟“ میں نے کہا ”کمال کرتی ہیں مس آپ کی والدہ کی تربت شریف اور مجھے اس کا نمبر یاد نہ رہا۔ وہ تو میرے دل پر لکھا ہوا ہے۔“ دیوار نمبر آٹھ، قبر نمبر..... اور منزل نمبر گیارہ!“

روز تیار ہونے اپنے پورے ہاتھ کا طمانچہ میرے منہ پر مارتے ہوئے کہا ”گدھے یہ میری والدہ کا لحد نمبر ہے! تم نے کہا نہیں تھا کہ لکھ لو، بھول جاؤ گے لیکن تم نے کوئی پروا نہیں کی۔“

دیے تو وہ میری سچر تھیں، مارکتی تھیں لیکن مجھے اس تپہ نر کا دکھ اس لیے ہوا کہ تین چار روز چیشتر ہم نے ایک دوسرے سے گھٹ گھٹ کر جمیاں ڈالیں تھیں اور ہم عقرب کا کافی بے تکلف ہونے والے تھے۔

میں چپ چاپ سیزھیاں اتر کر نیچے آ گیا حالانکہ لفٹ کی ڈولی نیچے جانے کے لیے موجود کھڑی تھیں۔ رورہ کر مجھے اپنے بچپن کا وہ دن یاد آ رہا تھا جب ہماری جمعدارنی نے اماں سے کہا تھا کہ بڑے تھانیدار نے جو مدد لال کھری حویلی میں رکھی ہوئی ہے، بڑی خستہ دار بیگموں کی طرح رہتی ہے اور اس نے تھانیدار کی بیوی کو گھر سے نکلوا کر اس کے سینکے بھجوا دیا ہے۔

اماں نے کہا ”تو پھر میں کیا کروں؟“

بے بے جمعدارنی نے کہا ”کرنا کیا ہے بی بی وہ تو بڑی منہ زور ہے۔ کسی کی پروا ہی نہیں کرتی۔ تھانیدار کی گھڑی پر جو سائیکس ملازم ہے، رتو کا لیا، اس کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔“

”کون؟“ اماں نے چونک کر پوچھا ”صند لال کھری!“

”تو اور کون بی بی؟“ لالو جمعدارنی نے کہا ”میں خود کچی آگاہ ہوں اس کی۔ کچی ہار تو میں نے دیکھا۔“

اماں نے کہا "چل دفع کر، ہم کو کیا لینا ہے کسی کے عملوں سے۔ وہ جانے اور اس کا رب جانے۔"
 "وہ تو ٹھیک ہے بی بی" جعد رانی نے کہا "ہمیں کسی کے اندر باہر سے کیا۔ جس کا مجید اس کے رب نے پہنچا ہے، تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی چھپایا ہے ناں۔ اس کی بات نہیں ہے۔ بات دوسری ہے!"
 "دوسری کوئی!" اماں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"دوسری بات یہ بی بی کہ مندلاں سبھاؤ کی گرم اور دل کی کھوٹی ہے۔ کوئی دید لیا نہیں ہے اس میں۔ بندہ اس طرح تو نہیں کرنا چاہیے ناں۔"
 اماں نے کہا "کیا کیا ہے اس دل کی کھوٹی نے؟"

جے بے جعد رانی نے کہا "لے سن لے میرے سامنے کی بات۔ مندلاں نے رتو کا لے سے بخیری کا سامان منگا یا تو وہ شہدا کھمیس پنساری سے ایک ایک شے چھٹا نک بھر لایا۔ مندلاں نے پڑیاں گھول کر کہا، کمر کس اور کمر کمر کم ہے۔ پایہ پایہ تو نہیں، رتو نے کہا، پورا ہے بی بی آپ تلو کے دیکھ لیں تو کڑک کے بولی میں جھوٹ کبھی ہوں گدے کے بچے اور تاڑ سے اس کے منہ پر چھوڑ ماری۔ ہائے بی بی کوئی بندے بشر کا مان آد کرنا چاہیے۔ پھر ایسے بندے کا جس میں نے سود نقد دیکھا کہ ایک دوسرے کو گھٹ گھٹ کے چھپاں ڈال رہے ہیں۔ رتو اور مندلاں۔"

پتہ نہیں اس رات مجھے روم جیسے شہر میں مندلاں کھری کیوں یاد آنے لگی حالانکہ میں نے اس کو اپنے بچپن میں دیکھا تھا اور اب اس کی شکل و صورت بھی یاد نہ رہی تھی۔

اٹلی میں ٹیلی ویژن کے آنے کی خبر پر سارے ملک میں خیال آرائیاں ہو رہی تھیں اور ریٹا تا دھوین کبہ رہی تھی کہ اٹلی میں ٹیلی ویژن نہیں آتا۔ آیا تو کم از کم ہماری زندگی میں نہیں آتا۔ ان وزیروں سفیروں کو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ کوئی مرے کوئی جے، کسی کا جنازہ اٹھے یا آخری منڈیر پر قبر بنے ان کو تو اپنی عیاشیوں سے غرض ہے۔ عوام کی کوئی فکر نہیں۔ اور اب یہ بات آپ پر واضح ہوگئی ہوگی کہ تفصیل کی سب سے اوپر کی منڈیر پر قبریں سستی ہوتی ہیں اور غریب لوگوں کی ہوتی ہیں۔ میری استانی کی والدہ کی قبر بھی دیوار میں کافی اونچی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو اشرافیہ میں داخل سمجھتی تھی اور کسی کو اپنی والدہ کی قبر کا پتہ نہیں دیتی تھیں۔

فیور جی کے کینے کے سین سامنے دواؤں کی دکان تھی۔ اس کا مالک بڑھا یہودی ڈیٹل بڑا آدی تھا۔ اس کو مشکل اور چالاک پچھلی پکڑنے سے لے کر معصوم اور سادہ لوح لڑکی کو اپنے جال میں پھنسانے کے کئی طریقے آتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ چالاک اور نہ کارلڑکی کو پھنسا لینا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا بھولی بھالی اور معصوم لڑکی کو۔ بھولی بھالی اور معصوم لڑکی دام محبت میں پھنسنے بغیر ہی ان کا اعلان کر کے سارا معاملہ کھنڈت میں ڈال دیتی ہے۔ اس کو چھپانے، ورغلانے، بتانے اور اڑان گھائیاں بتانے کا فن نہیں آتا۔ وہ راہ شوق طے کیے بغیر منزل پر پہنچنے کا اعلان کر دیتی ہے۔ اسی لیے ہر ہمیشہ خراٹ، مکار، بے شرم اور دعا باز عورتوں کو پسند کیا کرتے ہیں۔

سینور ڈیٹل کا خیال تھا کہ بی بی کا خیال تھا کہ اس کے بغیر معاشرتی زندگی کا ایک حصہ مکمل نہیں ہوتا

لیکن ذرا دیر لگے گی۔ ویسے اس نے اپنی دکان کا ایک کاؤنٹر ابھی سے آلٹر کرنا شروع کر دیا تھا۔ جہاں وہ دواؤں کے ساتھ ساتھ ٹیلی ویژن سیٹ بیچنے کا منصوبہ بھی بنائے بیٹھا تھا۔ جو کوئی اس سے اس تبدیلی شدہ کارنر کی بابت دریافت کرتا تو وہ یہی کہتا کہ یہاں وہ ایسی قدیم دواؤں کا کاؤنٹر کھول رہا ہے جن کا ذکر بائبل میں اور دوسری پرانی مقدس کتابوں میں آتا ہے۔

میرے ساتھ ڈیٹل کا رشتہ بڑا گہرا، جذباتی اور روحانی تھا۔ جب میں اسے ہاتھ لہرا کر اپنے سکوتر سے سلام کرتا تو وہ اپنی دکان کے شیشوں کے پیچھے سے مجھے مکا دکھا کر سلام کا جواب دیتا۔ کہا کرتا تھا "پروفیسر ایک روز ہم تم کو اور تمہارے عرب ورلڈ کو ملیا میٹ کر کے دم لیں گے۔ ہم تو عیسائیت کو ہی نہیں مانتے تم بعد میں ایک اور خطو غز اسلام بھی نکال کر لے آئے۔ مذہب اس دنیا میں صرف یہود کا ہے۔ باقی سب وہم و گمان کے ناکام قصے ہیں۔ ایک دن تم سارے کے مارے مسلمان حضرت موسیٰ کے عصا کے سامنے رسیوں کے ٹوٹے بن جاؤ گے۔"

ڈیٹل بڑا شریف، بے حد کمینہ، غضب کا باقوتی، بہت ذہین اور کینہ پرور آدمی تھا۔ اس کی ہنسی میں بھی قتل کی سازش کا روپ لے کر ارادہ موجود تھا۔ وہ کوئی بھی بات کرتا تو اس کی بات وہ نہ ہوتی جو کر رہا ہوتا۔ اس کے پیچھے کوئی دوسری بات ہوتی جس نے ابھی سفر کا ارادہ بھی نہ پاندھا ہوتا۔

انتونیو تھا تو مجھ سے چھوٹا مگر بڑا ہی پیارا دوست تھا۔ اس کی شکل پوپا سے بڑی ملتی تھی۔ بہت خوبصورت تھا لیکن تھا بالکل بچہ! اس کے والد وکیل تھے اور کسی تجارتی مقدمے کے سلسلے میں لندن گئے تھے۔ وہاں سے ایک عدو فلپس کا بی بی سیٹ خرید لائے جس روز اٹلی میں ٹیلی ویژن آیا، وہ سب سے پہلے سب سے پہلا پروگرام دیکھیں گے۔ انتونیو نے اپنے دوستوں اور سہیلیوں کو ایوننگ پارٹی پر بلا رکھا تھا کہ ہم میں سے کسی نے بھی اس سے پہلے بی بی سیٹ نہیں دیکھا تھا اور وہ ہم کو پناہ دی سیٹ دکھا کر یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ بی بی سیٹ کی وی ہوتا کیا ہے۔

ہم ابھی اپنی اپنی ناؤ نوش پارٹی میں مشغول تھے کہ انتونیو کے والد گھٹے کا ایک بڑا سا ڈبہ اٹھائے ہانپتے ہانپتے اپنے کمرے سے برآمد ہوئے۔ ایدانے اپنا ہاتھ اوپر لہرا کر زور کا نعرہ لگایا ECCO niene it Cesare di oggi سب نے زور کی تالیاں بجاتیں۔ انتونیو نے گھٹے کا ڈبہ میز پر رکھا اور سب کو سٹیج ایکٹروں کی طرح سر جھکا جھکا کر سلام کیا۔

ہم سب دم بخود کھڑے تھے اور ہمارے سامنے ایک ایسی شے مندر پر آنے والی تھی جس کو ہم نے ابھی تک نہ دیکھا تھا۔ انتونیو کے ڈیڈی نے گھٹے کا ڈبہ کھولا اور اس کے اندر دونوں ہاتھ ڈال کر گوہر مقصود کو نکالنے کی کوشش کی تو ڈبہ اوپر ضرور اٹھ گیا لیکن اندر کے ہاتھ جوں کے توں رہے، باہر کچھ بھی نہ نکلا۔ ایدالپک کر ڈیڈی کی مدد کو پہنچی اور اس نے ڈبے کو باہر سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔

اندر سے کالے سیاہ رنگ کا ایک بھدا سا مندر وچ نکلا جس کے سامنے ایک گہا سا اندھا شیش لگا تھا۔ یہ مندر وچ ہاتھ لگائے تو ہاتھ جھک کر نکلا۔ ایدالپک کر ڈیڈی نے گھٹے کا ڈبہ کھولا اور اس کے اندر دونوں ہاتھ ڈال کر گوہر مقصود کو نکالنے کی کوشش کی تو ڈبہ اوپر ضرور اٹھ گیا لیکن اندر کے ہاتھ جوں کے توں رہے، باہر کچھ بھی نہ نکلا۔ ایدالپک کر ڈیڈی کی مدد کو پہنچی اور اس نے ڈبے کو باہر سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔

میرا خیال تھا کہ بی بی سیٹ کسی تصویر کے خوبصورت فریم کی طرح ہوگا کہ سامنے مہمانی کا فریم، اس کے اندر ہاتھ لگائے تو ہاتھ جھک کر نکلا۔ ایدالپک کر ڈیڈی نے گھٹے کا ڈبہ کھولا اور اس کے اندر دونوں ہاتھ ڈال کر گوہر مقصود کو نکالنے کی کوشش کی تو ڈبہ اوپر ضرور اٹھ گیا لیکن اندر کے ہاتھ جوں کے توں رہے، باہر کچھ بھی نہ نکلا۔ ایدالپک کر ڈیڈی کی مدد کو پہنچی اور اس نے ڈبے کو باہر سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔

لوچا ہے سامنے میز پر رکھ لوچا ہے کارنس پر دیوار سے ٹیک لگا کر رکھ دو۔ زندہ تاج گانا ہو رہا ہے اور حشیش بخاری تھیں گے تو کچھ اور ہی طرح کا لٹکا جیسے امریکی گھڑیاں کا سر ہو۔ کٹے پھولے ہوئے گردن لمبی، منہ کھلا اور ماتھا تنگ۔

انٹونیو کے ڈیڈی میز پر رکھے ہوئے ٹی وی سیٹ کو بڑی احتیاط کے ساتھ گھما پھرا کر اس کا ایک ایک پہلو دیکھ رہے تھے اور ہم سب آگے کو ہو کر اس کی تفصیلات سمجھ رہے تھے۔ ایدانے کہا "انگل اس پر رنگدار تصویر آئے گی۔ ٹیکر جیسی سینما گھروں میں آتی ہے؟" ڈیڈی نے بڑے وثوق کے ساتھ سر ہلا کر کہا "نوفونو۔" ٹی وی پر رنگدار پروگرام چل رہا تھا۔ اس کی ٹیکنالوجی ہی اس قسم کی ہے کہ ٹی وی صرف بلیک اینڈ وائٹ تصویر دکھا سکتا ہے۔ رنگدار ٹیکس اخباروں نے اپنے سنڈے اینڈیشنوں نے یہ بے پرکی ضرور اڑائی ہے کہ امریکہ میں رنگدار ٹی وی کے کچھ کامیاب تجربے ہوئے ہیں لیکن یہ سب ہستی صحافت اور زرد اخبار نویسوں کا کمال ہے۔ ایسا کوئی تجربہ کہیں بھی نہیں ہوا اور اگر ہوا بھی تو ہمارے کامند دیکھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھپ ہو گیا۔"

"اس کا مطلب ہے انگل....." ایک اور لڑکی نے پوچھا۔ "کہ ہم رنگین ٹیلی ویژن بھی نہیں دیکھ سکیں گے؟ تو ان کے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "انسان کے چاند پر جانے کی امید کی جاسکتی ہے لیکن رنگین ٹی وی کے ایجاد ہونے کی نہیں۔ ہم سب جو اٹلی میں رنگین تصویروں، مرقعوں، پینٹنگوں اور رنگین لباسوں کے اندر رہتے تھے، اس تجربے سنانے میں آگئے۔ پھر آہستہ آہستہ مایوس ہوئے اور بالآخر پتھر کر بیٹھ گئے..... ایدانے چونکہ انگل کی ہونے والی ہتھی اور اس کو اپنے ہونے والے سر کے تجربے پر بڑا ناز تھا، اس نے ہم سب کو مرعوب کرنے کے لیے انگل سے پوچھا "آفراس کی کیا وجہ ہے انگل کہ رنگین ٹی وی کبھی بھی معرض وجود میں نہیں آسکے گا؟"

انگل نے آنکھیں اوپر اٹھا کر پیسہ غائب کرنے والے مداریوں کی طرح کہا "بات یہ ہے پیاری بیٹی کہ رنگین ٹی وی کو رنگ عطا کرنے کے لیے تین رنگین لہروں کی ضرورت ہے۔ نیلی، پیلی اور سرخ۔ یہ تینوں ہماری ضرورت کے مطابق آپس میں مل کر مطلوبہ رنگ تیار کرتی رہیں گی اور سکرین پر جھلکتی رہیں گی لیکن مشکل یہ ہے کہ ان میں سے ایک لہر اور ایک رنگین لہر سائنس دانوں کا کہنا نہیں مانتی۔"

تقریباً ہم سب نے بہت ہی اونچی آواز میں چلا کر پوچھا "کوئی ویو انگل..... کوئی؟" انہوں نے ایک عظیم سائنس دان کی طرح سوچتے ہوئے مدھم سی سنجیدہ آواز میں کہا "سرخ ویو بچہ..... سرخ ویو؟" پھر انہوں نے ذرا سے وقفے کے بعد کہا "سرخ رنگ چونکہ بہت وزنی ہوتا ہے، اس لیے ایتھر اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ پکڑتے ہی گر دیتا ہے اور ہر لہر کو چونکہ ایتھر سے ہو کر آتا ہوتا ہے، اس لیے سرخ لہروں میں ایتھر میں گر کر ختم ہو جاتی ہے۔"

انٹونیو نے پوچھا "ڈیڈی اس ایتھر کو کھڑا نہیں کیا جاسکتا؟" "ضرور کیا جاسکتا ہے" وکیل صاحب نے یقین کے ساتھ جواب دیا۔ "لیکن اس پر خرچ بہت اٹھتا ہے۔ گناہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایتھر کو پانچ سینکڑ تک اس قدر طاقتور بنانے کے لیے کہ وہ سرخ رنگ کی لہر کو سہار سکے تقریباً ارب ڈالر کی لاگت اٹھتی ہے۔ اب تم ہی کو یہ خرچ کوئی حکومت برداشت کرے گی۔"

ہم رنگین ٹیلی ویژن کی ایجاد نہ ہو سکنے کا افسوس تو ضرور ہوا لیکن اس بات کی خوشی اس سے زیادہ ہوئی کہ ہمارے ایک ایڈووکیٹ ہونے کے باوجود سائنسی معلومات پر کیسی گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کا مطالعہ کس قدر وسیع ہے!

سہ پہر کے وقت جو جرجی اور رینا تانویرتی کی کافی شاپ کے کونے میں کراس ورڈ معے بھر رہے تھے۔ دونوں کے لیے یہ کام بے حد مشکل تھا کہ دونوں کا ذخیرہ الفاظ تین چار سو الفاظ سے زیادہ نہیں تھا۔ رینا تا تو اپنے فارغ اوقات میں پہلے ہی معے بھرتی رہتی تھی اور اس کو اس کام کا محاورہ ہو گیا تھا مگر جرجی خواخواہ زور لگا کر ماتھے پر تیریاں سی ڈالے بیٹھا فریجے اندر آتے دیکھ کر اس نے پکار کے پوچھا "کہو پروفیسر پھر آ رہا ہے ٹیلی ویژن کر نہیں؟" رینا تانے معے پر سر جھکائے اس طرح سے جواب دیا۔ "نہیں!"

جرجی نے کہا "میں پروفیسر سے پوچھ رہا ہوں۔ یہ سنا آدی ہے اور اخبار دیکھتا رہتا ہے۔" رینا تانے کہا "یہ بھی وہی کہے گا جو میں کہہ رہی ہوں..... ہاں پروفیسر؟" میں نے کہا "ٹیلی ویژن ہمارے ٹلی میں اتنی جلدی آتا دکھائی نہیں دیتا، اس پر کئی سال لگیں گے۔ حکومت کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ وہ ٹی وی کا بوجھ برداشت کر سکے۔ اس لیے مشکل ہے۔"

"زیادہ سے زیادہ کتنی مدت لگ جائے گی؟" جرجی نے پوچھا۔ "پانچ سال، دس سال، بیس سال۔" میں نے کہا "نہیں نہیں، میں نہیں ہوں گا۔"

"اور اس نے کہاں جانا ہے۔" رینا تانے سر اٹھائے بغیر کہا "اب یہ ہمارا وطن ہے۔ کیسٹولک ہے، اطالوی ہے۔" جرجی نے کہا "تم تو پروفیسر ہو پروفیسر! پروفیسر نہیں ہو؟"

میں نے کہا "نہیں، میں تو کیسٹولک ہوں لیکن تم نے کیسے اندازہ لگا لیا؟" کہنے لگا "برطانیہ کے تو سارے لوگ پروفیسر ہوتے ہیں تم کیوں نہیں ہو؟"

میں نے کہا "میں کوئی برطانوی تھوڑا ہوں، میں تو پاکستانی ہوں۔" کہنے لگا "میرا مطلب ہے جو برطانیہ کی ماتحتی میں رہے، وہ سارے ملک پروفیسر ہوتے ہیں۔ پھر تم کیسے کیسٹولک ہو؟"

میں نے کہا "میں نے روم ایئر پورٹ پر اترتے ہی اپنا عقیدہ تبدیل کر لیا تھا۔" وہ میری یہ بات سن کر خوش ہو گیا۔ جیسے کوئی غیر ملکی آپ کا ہم مذہب نکل آئے تو آپ اس پر سب کچھ بھاد کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

ہم اپنی خوش گیسوں میں مصروف تھے کہ درجیلو ڈاکیہ آ گیا۔ اس نے سائیکل دیوار کے ساتھ لگا لی اور کہنے میں داخل ہوتے ہی اونچی آواز لگائی "اچھا ہو گیا پروفیسر جو تو مجھے نہیں مل گیا ورنہ مجھے ایک سو سو لہر میزیاں چڑھ کر اوپر آنا پڑتا تھا۔ تیری فون سنا تا کا خط آیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو کیسے کہہ سکتا ہے کہ میری فون سنا تا کا خط ہے۔ میرے گھر والوں میں سے اور بھی کسی کا ہو سکتا

ہے۔ میری ماں کا، میرے بڑے بھائی کا، میری آپا کا۔ میرے کنبے کے اکٹالیس افراد ہیں۔“

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے..... تیرے کنبے کے اکٹالیس افراد ہی ہوں گے خدا ان سب کو زندہ سلامت رکھے لیکن یہ تیری فون ساتا ہی کا خط ہے..... دوسرے گھر والے اتنا ملہا، اتنا موٹا اور ایسا بھاری تھا کبھی نہیں لکھا کرتے، یہ کام عاشقوں کا ہے جن کے پاس فارغ وقت ہوتا ہے۔ دوسری نشانی یہ ہے کہ خط بھاری ہو گیا ہے اور اس نے کوئی پروا نہیں کی۔ رومان پسند لڑکیوں کو ڈاک خانے کے قواعد کا علم نہیں ہوتا۔ ان کو پہلے روز جو شرح بتادی جانی ہے، اسی کے حساب سے ٹکٹ لگاتی رہتی ہیں۔ چنانچہ اس کا بھی یہی حال ہے۔ خط بیرنگ ہو گیا ہے۔ اس لیے مہربانی کر کر ایک ہزار لیرے نکال دو۔“

میں نے کہا ”ایک ہزار لیرے سامنے فور جی صاحب سے لے لو اور جاتے جاتے اتنا بتا جاؤ کہ ہمارے یہاں ٹیلی ویژن آ رہا ہے یا نہیں؟“

کہنے لگا ”آ رہا ہے اور تیرا کتبہ برکی شام کے چھ بجے پہلا پروگرام ہو رہا ہے..... صدر کا قوم سے خطاب اس کے ساتھ ہی زندہ تاج گانا۔“

رینا تارپ کراچی کرسی سے اٹھی اور دائیں بائیں کو لیے ہلا کر گانے لگی۔

جواہی نے چیخ کر رینا تارپ کو گانے اور دم ہلانے سے روکا اور درجیلو سے کہنے لگا ”تمہیں کیسے معلوم ہے کہ آ رہا ہے؟“

درجیلو نے کہا ”ہم ڈاک خانے کے ملازم ہیں، ہم کو ساری باتوں کا علم ہوتا ہے۔ ذرا..... ذرا.....“

جواہی نے کہا ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ تیرا کتبہ برکی شام کو اس کی رسم افتتاح ادا ہو رہی ہے۔“

درجیلو نے بڑے سبباً کے ساتھ پھر اسی لہجے میں کہا ”اوہ بھائی! ہم ڈاک خانے کے لوگ ہیں، ساری خبریں ہمارے سامنے سے گزرتی ہیں اور ہماری مشینوں کے اندر سے ہو کر نکلتی ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم ہوگا تو اور کس کو ہوگا!“

جواہی نے کرسی سے اٹھ کر مسیو لینی کے انداز میں ”اطالیہ زندہ باد“ کے تین فلک شکاف نعرے لگائے اور رینا کو اپنے ساتھ لپٹا کر وہی گانا گانے اور ویسی ہی دم ہلانے لگا۔

درجیلو نے تالی بجا کر انہیں خاموش کرایا اور کندھے اوپر پڑھا کر ”اے اے اے“ کرتے ہوئے بولا ”خوش ہو ہو رہے ہو لیکن یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں اٹلی میں کنٹرولڈ ٹی وی آ رہا ہے، آؤ نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ رینا تانے پوچھا۔

”مطلب یہ کہ اس پر کنٹرولڈ پروگرام پیش کیے جایا کریں گے آزاد اور عوام پسند پروگرام نہیں..... پروگرام پر تمہارا کوئی اختیار نہیں ہوگا، دوسرے آزاد ملکوں کے ٹی وی کی طرح.....“

دنی بان ملکوں میں یہ نہیں ہے۔ وہاں کے تماشاخی اس میں تبدیلی کر سکتے ہیں، پروگرام میں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ سینور فیور جی نے کہا ”جن جن ملکوں میں دودو چینل کام کر رہے ہیں وہاں یہ آسانی میسر آ سکتی ہے، ہر ملک میں نہیں۔“

”چینل تبدیل نہیں کرتا۔“ درجیلو ڈاکے نے چیخ کر کہا ”چلتے ہوئے پروگرام میں تبدیلی کرنی ہے۔ اسی پروگرام میں۔“

ہم سب احمقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

درجیلو نے کہا ”ترقی یافتہ، آزاد منش اور آزاد خیال ملکوں کے ٹی وی سیٹ میں ایک خاص بن لگا ہوتا ہے۔“

”مچھوڑ سوچ!“ فیور جی نے حیرانی سے پوچھا۔

”بڑوں کے پروگرام کے لیے“ درجیلو نے کہا ”میری تمہاری عمر کے لوگوں کے لیے۔“

”اس میں کیا ہوتا ہے، اس سوچ میں؟“ رینا تانے پوچھا تو درجیلو بھونچکا سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا اور جواہی کی طرف منہ کر کے بولا ”تم کو تو معلوم ہی ہوگا سینور جواہی کہ ٹی وی سیٹ میں ایک خاص بن ہوتا ہے جو خاص چابی سے آپرٹ ہوتا ہے۔“

”مجھے پتہ ہے، پتہ ہے۔“ جواہی نے جھوٹ بولتے ہوئے اور اپنی عزت بچاتے ہوئے کہا ”میں اس سوچ کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔“

”تم نے ٹی وی سیٹ دیکھا ہے؟“ رینا تانے جل کر کہا تو جواہی شرمندہ سی ہنسی کر بولا ”دیکھا تو نہیں لیکن میں اس کی بابت جانتا ضرور ہوں۔ میرا ایک ہم زلف ریڈیو کی دکان میں کام کرتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔“

”لیکن یہاں نہیں ناں لگوانے دیتے ویسا سوچ۔“ درجیلو نے غصے میں الفاظ بھینبوڑتے ہوئے کہا ”یہ کتے باری احرام کے پلے، کالے لباس والے..... خود چاہے جو مرضی کر لیں لیکن لوگوں پر پہرے بٹھا کر ان کی زندگی حرام کریں گے۔ سوڑ کے بیچ۔ اخلاق کے مامے۔ پوپ کے گناہتے۔“

رینا تانے جب پادریوں پر اور پوپ برادر ویلی کن پر ایسی پھٹکار پڑتی سنی تو وہ اور تجسس ہو گئی اور فیور جی کی طرف منہ کر کے کہنے لگی ”اس سے پوچھو تو سبکی ڈاک چور سے کہ یہ کہنا کیا چاہتا ہے؟“

اپنے لیے ایسا بیہودہ رہنما رک سن کر درجیلو بھڑک کر اٹھا اور ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے“ کہتا ہوا تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ فیور جی نے کوئی باریک اوٹ سے نکل کر اس کا راستہ روک لیا اور فس کر کہنے لگا ”بس یار، اتنی سی بات پر ناراض ہو گئے۔ رینا تانی تو پرانی عادت ہے۔ سب کے نام دھرنے کی۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا جو تم سمجھتے ہو۔ آؤ..... آؤ..... میں تمہارے لیے کوئی کا ایک گرم کپ بناتا ہوں اور ہاتھ نکلن کو آری دکھاتا ہوں کہ مجھ سے بہتر کافی

مارے دم میں اور کوئی نہیں بنا سکتا۔“

رہے تھے اور سازندوں کے ساتھ اٹھیلیاں کر رہے تھے۔ سازندے بھی چرائی میں آکر اپنے فن کا مظاہرہ مبالغہ آلود حرکات سے کر رہے تھے۔ جب ڈرم بجانے والے نے بڑے ڈھول کے سامنے قلابازی لگا کر لے کو پھر پکڑ کر ڈکا ڈکا کر سارا مجمع خوشی میں آکر سڑک پر ہی ناچنے لگا۔ اس کے بعد ٹریفک نہ آگے جا سکا نہ پیچھے، ہر کوئی اپنی اپنی سواری سے ان رقص میں شریک ہو گیا۔

میرا علاقہ تو غیر چھوٹا سا تھا لیکن اگلے روز جب ہم نے خبروں میں دیکھا تو اندرون روم سارے کا سارا مجمع ہوا تھا اور اس کو روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ پیازا اسیدرا۔ دیاوینے تو اسپانوی میڑھیاں کھوسیم کے ماحقہ بازار سب رقص کر رہے تھے۔ لوگ تو تھک کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکے تھے لیکن علاقے ابھی تک ناچ رہے تھے۔

میں نے اپنے قریب کھڑے ہوئے مزدور سے پوچھا۔ ”آج کیا تاریخ ہے؟“ تو اس نے حیرت کے ساتھ میری طرف دیکھا اور گھور کر بولا ”تیرا اکتوبر“

میں نے کہا، واقعی ور جیلو سچا تھا۔ اس نے یہی تاریخ اور یہی وقت دیا تھا اور جب اس کی یہ بات سچ نکلی تو ہم اس کے سوچ والی بات بھی ٹھیک ہی ہوگی!

اگلے دن رات کے دس بجے والی خبروں میں پہلی خبر ہی دلہ و دلہلی۔ میلان کی ایک خوبصورت دراز اور بلوٹو میز ڈریسر نے اپنے سیلون میں بڑے عمر کے ایک گاہک کو ہلاک کر دیا اور پھر خود ہی قریبی قتل خانے اطلاع دینے چلی گئی۔

نیوز رپورٹر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس خبر کا ڈھانچہ تیار کیا تھا۔ اس میں واقعے کا ابتدائی تعارف سیلون کا تصویریں جائزہ۔ اس کرسی کی تفصیلی عکس بندی جس پر قتل ہوا مقتول کے تین پورٹریٹ، ایک جوانی کا، ایک ادھیڑ عمر کا اور ایک حالیہ۔ اس کے بیٹے اور بیٹی سے انٹرویو۔ مقتول کے کردار کے بارے میں سوالات، اس کے قریبی دوستوں کا اظہار۔ یہ سب کچھ اس خبر میں شامل تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے رپورٹر کئی سال سے ٹیلی ویژن میں کام کر رہا ہو اور اس کے سارے رموز و اسرار سے واقف ہو۔

لڑکی، تھانے میں پولیس آفیسر سے کہہ رہی تھی ”رات کے دس بجے ہوں گے۔ بارش کی وجہ سے سڑکوں پر دھڑ کم ہو گیا تھا اور ہمارے دائیں بائیں کی تقریباً ساری دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ میرے ساتھ ایک ایک کر کے جا چکے تھے اور دکان پر صرف میں ہی اکیلی رہ گئی تھی۔ میں بھی بڑی آسانی سے جاسکتی تھی۔ میرے اوپر کوئی پابندی نہ تھی لیکن میں نے سوچا کہ اس وقت کوئی گاہک آئے گا تو ہال کٹوانے یا شیو بنوانے کے بعد مجھے خاص ٹپ دے کر جائے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا، آپ لوگ جائیں میں خود ہی دکان بند کر کے چلی جاؤں گی۔“

”کچھ دیر تو میں فیشن کے رسالے دیکھتی اور کاکس پڑھتی رہی۔ اس کے بعد بارش کا نظارہ کرنے لگی۔ دور تک سڑکوں کے اوپر بیٹوں کا کھس اترائے تھے جنہیں ٹریفک کی گاڑیاں کاٹ کاٹ کر اور چاٹ چاٹ کر گزرتی تھیں۔ رات گہری ہو رہی تھی لیکن بہت ہی خوبصورت رات تھی۔“

”کوئی دس گیارہ بجے پینٹھ چھیاٹھ برس کا یہ بڑھا اعلیٰ درجہ کا ٹرائیکل سوٹ پہنے دکان میں داخل ہوا۔ اندازاً

ہے کہ اس کے پاس اپنی کوئی گاڑی نہیں تھی اور یہ پبلک ٹرانسپورٹ سے اتر اٹھا۔ ایسے بڑھے شکل و صورت کے ایسے، وضع لنگ کے جیلے اور ریت روئے کے ٹھکری ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں بڑی لمبے دار اور ان کے قصے بہت ہی سہانے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ یا تو بلی سینیا میں اپنی بہادری کے قصے سناتے ہیں یا دوپے کے ساتھ اپنے گہرے تعلقات کا ذکر کرتے ہیں۔“

”اس نے اندر آ کر کوٹ کھنٹی پر لٹکا دیا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ”میری پیاری چڑیا بال کاٹ دو۔ پیچھے سے اوپر اٹھا کر۔ سامنے کے ویسے ہی چھوڑ کر اور قلموں میں گھٹکر الیاں ڈال کر۔ یہاں کے بال سیدھے ہو گئے ہیں اور مجھے اچھے نہیں لگتے۔“ میں نے کہا ”ٹھیک ہے سینور جیسے آپ نے کہا ہے، ویسے ہی ہوگا لیکن کیا آپ شیو کرانا بھی پسند کریں گے؟“ کہنے لگا ”شیو تو میں نے صبح سویرے کر لی تھی۔ اس وقت شیو کرنے سے فائدہ! میں کچھ نظر بازیاں کر کے گھر واپس چلا جاؤں گا۔ تم جیسی لڑکیوں کے جلوے دیکھوں گا اور جا کر سو رہوں گا۔“

”میں نے الماری سے ایک وحلی آئرش لنن (Linen) کی سفید چادر نکالی اور اسے زور سے پٹک کر بیورو کا کپ کو گھنٹوں تک اس میں لپیٹ دیا۔ گردن کی لپیٹ کے اندر میں نے کاٹن وول کی پونیاں پیوست کیں اور حجامت بنانے کے لیے تیار ہو گئی۔“

”جب میں کھولتے ہوئے پانی سے حجامت بنانے کے اوزار نکال رہی تھی تو میں نے گردن گھما کر دیکھا کہ وہ غیبٹ بڑھا اسی طرح آئینہ رخ بیٹھا تھا لیکن اس کی نیت بدل چکی تھی۔ اس نے آئرش لنن کی چادر کے اندر اپنے ہاتھ گود سے ذرا آگے کھسکا کر اپنی چٹون کی فٹائی پر رکھ لیے تھے اور ان میں خفیف سی حرکت شروع ہو گئی تھی۔ میں نے کھولتے ہوئے پانی سے حجامت کے ہتھیار تو نکال لیے تھے لیکن اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔ مجھے اس کی نیت پر شک ہو رہا تھا کیونکہ اس کا چہرہ پہلے کے مقابلے میں بالکل تبدیل ہو گیا تھا اور اس کے ہاتھوں کی حرکت زوردار ہو گئی تھی۔ لیکن پیشتر اس کے کردہ اپنے طے شدہ منصوبے پر عمل کرتا تھا، میں نے ڈسلاڈ واٹر کی بڑی بوتل اٹھائی، اس کے اندر سے پھواری لگی ٹکالی۔ منہ پچھدار ڈھکنے سے بند کیا اور اس بڑھے فروت کے پیچھے جا کر بوتل کو موگری کی طرح گھما کر اس کے سر پر پورے زور سے دے مارا۔ اس نے نہ کوئی آواز نکالی، نہ ہی اپنی جگہ سے ہلا اور نہ ہی اس ضرب سے کوئی نمایاں خون نکلا۔ بس جیسے بیٹھا تھا، ویسے کاویا بیٹھا رہ گیا اور اس غیبٹ کے ہاتھوں کی حرکت ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔“

میرے ڈریسر لڑکی کے اس بیان کے بعد رپورٹر نے تین پولیس آفیسروں کو اس سیلون میں دکھایا جو کل واردات کا معائنہ کر رہے تھے۔ میرے ڈریسر کا مخوس ٹھکری بڑھا اسی طرح کرسی میں بیٹھا تھا۔ اسی طرح اس کے ہاتھ چادر کے اندر تھے۔ ویسے ہی اس کے گرد آئرش لنن کی چادر لپیٹی تھی۔ سامنے شیشے کے پاس وہی دو پونڈ وزنی پانی کی بوتل کھڑی تھی۔ ویسا ہی سارا ماحول تھا۔ فقط فوت ہو جانے کی وجہ سے اس بد بخت کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی تھی۔

پولیس آفیسر نے صورتحال کا معائنہ کرنے کو اور مضروب کے فوٹو اتارنے کو جب اس کے ارد گرد لپٹی ہوئی چادر کا غلی کھولا تو بڑھے فروت کے دونوں ہاتھ ابھی اس کی چٹون کی فٹائی پر تھے۔ وہ اپنی نزدیک کی عینک کے شیشے ٹشو پیپر سے رگڑ رگڑ کر صاف کرتا ہوا جس جہان فانی سے کوچ کر چکا تھا۔ ٹشو پیپر اس کو میرے ڈریسر کے ڈبے سے ملے تھے۔ جب اس

کے ہاتھوں کا اور اس میں پکڑی ہوئی عینک کا لشکارا مار کر فوٹو اتار گیا تو عینک کے دونوں شیشے ہلکی نیلی جوت کے برابر جگمگائے اور کیرہ لینز کی طرح نظر آئے۔

اس روز سارے اٹلی میں دھوم مچ گئی کہ ٹیلی ویژن کس قدر مفید چیز ہے اور اس سے کیسے کیسے کام لیا جاسکتا ہے۔

ہالینڈ سے شہاب صاحب کا خط آیا تھا کہ ان کا ششماہی کورس ختم ہو گیا ہے اور اب وہ اگلے ہفتے آٹھ دن لندن میں قیام کرنے کے بعد وطن واپس جا رہے ہیں۔ لکھا تھا میرے لیے کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں بنگلہ کراؤ بیچ اور دن کا تھوڑا سا وقت میرے لیے محفوظ کر لیجئے۔ کچھ باتیں کریں گے اور کچھ مقامات دیکھیں گے۔ میں تو پہلی مرتبہ دیکھوں گا، آپ کی تجدید دیدہ ہو جائے گی۔ چھٹی لینے کی ضرورت نہیں، شام کے وقت گھوم پھر لیا کریں گے۔ میں نے اس جواب لکھا، کہ آپ آئیں تو سہی، چشمہ مارڈن دل ماشاد۔ اپنے ہوٹل کی اور میری چھٹی کی پروا نہ کریں، دونوں ہی بے عمل ہیں۔ بس آپ کا آنا ضروری ہے۔

دوسرے دن مجھے کراچی سے حبیب درانی کا خط ملا کہ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں ایک مہینے کے لیے لندن رہا ہے۔ راستے میں روم ٹھہرے گا اور میرا مہمان ہوگا۔ ہوٹل کی بنگلہ اس نے کر لی ہے، فقط گھومنے پھرنے کے لیے۔ میرا ساتھ درکار ہوگا۔ اگر میں ابھی سے ایک ہفتے کی چھٹی کا بندوبست کر لوں تو مناسب رہے گا کیونکہ اس کے بعد دو مہینے آگے بڑھانے مشکل نہیں ہوں گے۔

جوتار نہیں حبیب نے اپنی آمد کی دی تھیں، وہ عین وہی تھیں جن دنوں شہاب صاحب میرے پاس آ رہے تھے۔ یہ خبر سن کر میرے تو ہوش اڑ گئے۔ درانی بھی میرا پیارا تھا اور اس کے ساتھ بڑے اچھے دن گزارے تھے۔ بڑا اچھا خوبصورت، نہایت بھولا اور بے حد کھی انسان تھا۔ میں اس کو تاں بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن شہاب صاحب کی موجودگی میں اسے ساتھ بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ اور طرح کا آدمی تھا۔ فیشن اسٹیل، ماڈرن آزاد خیال اور آسان گیر، وہ شہاب صاحب کے ساتھ کیسے چل سکے گا۔ اس طرح شہاب صاحب ایک خود پسند اور خود میں آئی سی ایس آفیسر ہو کر حبیب کو برداشت کر سکیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کو اپنے ادیب اور شاعر ہونے پر بھی بڑا گھمنڈ ہوگا، وہ درانی کے ساتھ کیسے گھل مل سکیں گے۔ پھر ان دونوں کے درمیان میں کس کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو سکوں گا۔ سوچ سوچ کر میں نے درانی کو کیبل بھجوا کر کہا کہ دونوں میں روم میں نہیں ہوں، جینوا میں ہوں گا جہاں مجھے زبانہانی کا ایک ماہی کورس مکمل کرنا ہے۔ اگر تم لندن سے واپس میرے پاس ٹھہرو تو میں ہر وقت تمہاری اردل میں موجود چلوں گا اور تم کو وہ باتیں یاد دلاؤں گا جو تم اب تک بھول چکے ہو۔ وہ دن بھی کیسے اچھے تھے!

اگلے ہی روز مجھے اپنے تار کا جواب تار میں ملا اور درانی اس بات پر رضامند ہو گیا کہ وہ لندن سے واپس میرے پاس ٹھہرے گا، جاتے ہوئے نہیں، اللہ درانی کو رہتی دنیا تک شاد و آ باد رکھے، وہ بے حد ماڈرن اور ناقابل یقین، تک آزاد خیال ہونے کے باوصف ایک بھولا بھالا اور مان لینے والے لوگوں میں سے تھا۔ وہ قسمت کا جتنی تھا اور ہونے کے

پچھے چل چلا کہیں کا کہیں پہنچ گیا تھا۔ اس کے سامنے غی سے غی راہیں آپ سے آپ کھلتی جاتی تھیں اور واپسی کے دروازے خود بخود بند ہوتے جاتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے ہمارے احاطہ افراں کی سڑکیاں چڑھ کر ایک جوڑا گرین روم میں داخل ہوا اور زوہبی اور اس کے ماؤں لیلا ڈی جیکسن کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم سب نے ان کو لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ مرد نے مڈنائٹ بلو سوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے گلے میں چاند جیسی بوگی تھی۔ لڑکی بہت ہی دہلی پتلی، ہوا کا جھونکا، سرخ و سفید ہولا، آہو چشم پورے قد سے ایسا دھنسی۔ ہم نے اس سے پہلے ایسے خوبصورت لوگ دلائی فلموں میں تو دیکھے تھے لیکن موجودہ حالت میں گوشت پوست کے روپ میں نہیں۔ ان کے سامنے صرف کبکی میں ملبوس فلاڈلفیا سے آئی ہوئی لیلا ڈی جیکسن بھی ایک مرحہ جند میں چھپ گئی اور جب براہد ہوئی تو پہلے والے زوروں میں نہیں تھی۔ کافی گرا کے نکلی تھی۔ زوہبی چکنی مٹی سے اس کا جسم بنا چکا تھا اور اب کئی دن سے اس کی ٹوک پلک درست کر رہا تھا لیکن اس وقت وہ ہماری توجہ کا مرکز نہیں رہی تھی۔ آنے والی لڑکی نے ہنر والی کی طرح ہم سب کو اپنے چاک میں لپیٹ لیا تھا۔

نوجوان نے کہا ”زوہبی صاحب! آپ نے مجھے پہچانا؟“ تو زوہبی نے مجھ سے لگا ہوا بغیر بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ کہا ”کیوں نہیں، آپ درانی صاحب ہیں۔ حبیب درانی اور میری آپ کی ملاقات کراچی کے کافی ہاؤس میں ہوئی تھی۔“

”اور میں نے آپ کو اپنا پتہ بھی دیا تھا۔“ نوجوان نے کہا ”جو آپ نے یقیناً ادھر ادھر کہیں پھینک دیا ہوگا۔ یہ میری بیوی ہے ار جند بانو۔ ہم سب اس کو لپیٹ کر کہہ رہے ہیں اور یہی ہی کے نام پر بولتی ہے ار جند کے نام پر نہیں۔“

لٹی نے فیس کر کہا ”مجھے تو یاد ہی نہیں پڑتا کہ میرا نام ار جند ہے۔ شروع سے لٹی ہی سنٹی آئی ہوں اور اسی پر چلی جا رہی ہوں۔“

زوہبی نے کہا ”یہ میرے دوست اشفاق احمد ہیں، نئے نئے افسانہ نگار اور شوقیہ مصور اور یہ حفیظ رومانی میں پلازہ کے نمبر۔ آپ ممتاز مفتی ہیں معروف ادیب، افسانہ نگار اور ایڈیٹر۔ پیر تاج میں مصوری اور مجسمہ سازی کے مہر لیکن ان کا رخ فارن سروس کی طرف ہے۔ جلد ہی ہم کو چھوڑ جائیں گے۔ یہ رمزد ہیں ایشیا کے نامور مثل فوٹو گرافر۔ اور آپ مسعود پرویز ہیں، ہماری فلمی دنیا کے خوبصورت، باوضع، سنجیدہ مزاج ہیر و اور اردو زبان کے شاعر۔“

ان دونوں نے ہم سب سے باری باری ہاتھ ملایا اور حفیظ کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے۔ لٹی نے اپنے نمبر سے سگریٹ کیس کو سب کے سامنے گھما کر پیش کیا اور پھر اکیلی ہی سگریٹ سلگا کر بیٹھ گئی۔ اس کا خاندان سگریٹ پیتا نہیں تھا اور ہم بسنے والوں نے اپنے اپنے سگریٹ پہلے سے سلگائے ہوئے تھے۔ ایک مخلوط مزاج لڑکی کو اس آزادی سے سگریٹ پیتے ہوئے دیکھ کر ہمیں ایک گونہ خوشی ہوئی اور ہمارے سرخرو سے بلند ہو گئے کہ اب لیلا ڈی جیکسن ہم کو غیر ترقی یافتہ، قدیم اور بدوی خیال نہیں کرے گی اور ہمارا نام مہذب دنیا کی فہرست میں درج کر کے ہمارے ساتھ اور بے تکلف ہو جائے گی۔

زوہبی نے کہا ”لٹی! اس وقت ہم سب لاہور سے پونے دوسو فٹ کی بلندی پر بیٹھے ہیں اور یہ ہمارے شہر کا مشہور

اب جو لٹی ہمارے درمیان آئی تو ہم سب کے دل کی کلی کھل گئی۔ باری باری ہم نے اس کو سانیکل کے ڈنڈے پر بٹھا کر مال روڈ اور میٹرو روڈ کی سیر کرائی اور اپنی شو بنائی۔ میں اس کو سیدھا چھوٹا کی سڑکوں پر لے گیا کیونکہ ادھر، شہر کی طرف، ہمارے کسی عزیز کے مل جانے کا خطرہ تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ لٹی بے حد بااخلاق اور اصول پرست لڑکی ہے اور اس کے ساتھ کسی قسم کی لبرٹی نہیں لی جاسکتی۔ وہ ایک ایسی طاقتور اور قلعہ بند لڑکی تھی جس کو سوائے اپنی زبان کے اپنے ایک ایک عضو پر پورا کنٹرول حاصل تھا۔ کیا خیال جو کوئی عضو چوک جائے یا کمزوری دکھا جائے۔ ہر وقت چوکس، ہر گھڑی اٹن شن!

اس کی زبان سے ہم نے ایسے ایسے لطیفے سنے کہ پہلی مرتبہ تو متنازعہ منشی کے کان بھی سرخ ہو گئے۔ ہر لطیفے کے ماتھے پر اس کا خاندان کہتا "جانی وہ واقعہ بتاؤ جب تم ایک کرٹل کے ساتھ کرس ڈانس سے واپس آئی تھیں یا اس ٹھری بڑھے کی ٹرکواہٹ بیان کرو جس نے تمہیں لان میں کھڑا کر کے دھوپ ساگری سے تمہاری آرتی اتارنی شروع کر دی تھی کہ تم سرسوتی کا روپ ہو۔"

لٹی اور درانی کا یہ طے شدہ فلسفہ تھا کہ انسان کو اخلاقی طور پر لنگوٹ بند ہونا چاہیے۔ زبانی کلامی چاہے دلوں میں حریفوں کے تئیں تان دے۔ ایک دوسرے کا دغا شاعر اور وفادار ہونا چاہیے چاہے بیس آدمیوں کو انگلی سے لپیٹ کر اوٹی اوٹی کر مارے۔ دل کا پردہ اور آنکھ کی شرم ہونی چاہیے۔ کپڑے چاہے پہن لے۔ دل نہیں مانتا تو نہ پہنے۔

دونوں میاں بیوی آرٹ کے رسیا اور مصوری مجسمہ سازی کے دیوانے تھے۔ ان کے پاس ملکی اور غیر ملکی مرنہوں کے نادر نمونے تھے اور انہوں نے گھر کا سب سے بڑا کمرہ عجائب گھر کے طور پر سجا رکھا تھا۔ درانی کبھی پنڈی، پٹار جاتا تو لٹی کو ہمارے پاس لاہور چھوڑ جاتا۔ وہ ریلوے سٹیشن کے پاس ایک چھوٹے سے ہوٹل میں رہا کرتی تھی جہاں ریلوے کے بڑے اینگلو انڈین آفیسر اور خیر میل اور ہوڈ ایکسپریس کے ڈرائیور بریک جرنی کیا کرتے تھے۔ رات کے وقت لٹی ہال روم میں بھینجیری کی طرح ناچا کرتی اور لٹو کی طرح وچیں کسی صوفے میں گر کر سو جاتی کرتی۔ جب بھی اس کا موڈ آتا ہوتا وہ اپنے ولایتی قصص کا نظارہ کمرانے کے لیے ہم کو اپنے ہوٹل ضرور بلوایا کرتی اور پھر صبح اذانوں کے وقت واپس ہانے دیا کرتی کہ رات کو نوٹے نوٹے کر کے استعمال کرنا اس کے نزدیک رات کے ساتھ زبردستی کرنے کے برابر تھا۔ اور رات کا بڑا احترام کرتی تھی۔ انگریز کی پرستار اور ولایتی تہذیب کی عاشق تھی۔ میلہ چرائیاں اس کے روم روم میں تھا اور وہ گند بھرے زیادہ میلہ چرائیاں کی بولیاں بولتا کہ سن سکتی تھی۔ ایک بولی پر دوسری، دوسری پر تیسری، ٹھک ٹھک ٹھک.....

ہکا ہکا ہکا.....

لٹی ایک اعلیٰ درجے کی آرٹ کرٹک ہی نہیں تھی، اعلیٰ اظہار کی مصور بھی تھی۔ آئینل میں کام کرتی۔ برش اور پچولا دونوں پر ایک سی قدرت تھی، رنگوں کے استعمال میں اس کی آنکھ استادانہ بخش جیسی تھی۔ موضوعات زیادہ تر لینڈ سکیپ تھے۔ کانسٹیبل کے انداز کے پھر بچوں کے چہرے اور جاتے ہوئے بزرگوں کی پشیمیں، ایسی اچھی مصور سخت کام چور اور ازل درجے کی ہذا حرام بھی تھی۔ تصویر شروع کر لینی اس کے بعد کینوس کو آئل پلا کر اور بنیادی رنگ لگا کر جکڑنسیاں میں پھینک کر بھول بھال جانا کہ کچھ شروع بھی کیا تھا اور جو کہیں درانی گودام میں سے اٹھا کر لے آئے تو اس کے ساتھ لڑائی کرنا

صحت افزا مقام ہے۔ اس کا نام اوپن ایئر تھیٹر ہے اور یہ لارنس باغ میں واقع ہے۔ شہر کے لوگ اس سے بالکل واقف نہیں ہیں۔ باغ کی سیر کرنے آتے ہیں لیکن آدھر نہیں آتے۔ اس پر ہمارا اور صرف ہمارا قبضہ ہے اور یہ میرا سٹوڈیو ہے۔ آج کل یہاں ملک کے مشہور ادیبوں اور شاعروں کے چہروں کے مجسمے بننا رہا ہوں۔ کسی کسی کا بسٹ (Bust) بنانا ارادہ بھی ہے۔ دیکھیں یہ سارا پراجیکٹ کب مکمل ہوتا ہے۔ آپ لوگ جب بھی لاہور آئیں یہاں ضرور آیا کریں۔ سب آپ سے مل کر بے انتہا خوش ہوں گے۔" ہم سب نے زوہبی کے تتبع میں مری مری سی ہاں ہاں، ضرور ضرور اور بالکل کی آواز نکالی اور پھر خاموش ہو گئے۔

اس وقت پاکستان کو وجود میں آئے ایک سال اور چند ماہ کی مدت گزری تھی۔ ہم لوگ کی علم کی وجہ سے ہندو شرمیلے، مخلوط مخللوں کے کم آئیز مہمان، غیرت مند، بہادر، کھڑکدار پاکستانی، جذباتی میزبان، مغرب نا آشنا بڑی ہندو ہاتھ راہی اور سیاست سے کوسوں دور تھے۔ ہمارے ملک میں ایک ہی تو یونیورسٹی تھی۔ اس کا پکا پکا نا بھی ابھی ولایتی گروڈیشن سے نہ لگا تھا تو پھر ایسے ہی ہونا تھا۔

اس عہد کے پاکستانی کچھ اور ہی قسم کے تھے۔ عورتیں پردہ کرتی تھیں اور بہت کم باہر نکلتی تھیں۔ سفید بلبے غیر برقعے بڑی عمر کی عورتوں کی نشانی تھے اور سیاہ، براؤن اور سیلیٹی برقعے مصری برقعے کہلاتے تھے اور دو حصوں میں منقسم تھے۔ اوپر کے حصے میں لمبی پٹی کا نقصان ہوتا تھا جس کے پیچھے کبھی کبھی گوری گوری جلد، بھورے بھورے بال اور کالی کار آنکھیں نظر آ جاتی تھیں۔ کسی لڑکی کا پورا چہرہ کبھی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ سر راہ چلتے ہوئے، بس میں بیٹھے ہوئے یا سٹیپل سے باتیں کرتے ہوئے ان کے چہرے نقاب میں مستور رہتے تھے۔ صرف نقاب کی جھری میں سے دیکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ کس شکل و صورت کی لڑکی ہے اور کس طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔

اتنے بڑے لاہور شہر میں لے دے کے بس ایک ہی طبقہ ایسا تھا جس کی لڑکیاں ستے پھولدار اور سائے کی کرکٹلے منہ تانگوں میں نکلتی تھیں۔ مال روڈ پر بائیکل چلاتی تھیں اور اپنے والدین اور گھروالوں کے ساتھ تاج گھر جاتی تھیں۔ ان میں کسی اکاڈکالو کی نے لاہور کی سڑکوں پر کار بھی چلانا شروع کر دی۔ وہ دن کے گیارہ بجے لوڑ مال کا جانب سے مال روڈ میں داخل ہوتی اور سیدھی لارنس باغ تک چلی جاتی۔ ہم لوگ بھی ٹھیک وقت پر بھنگیوں کی ٹوب کے چوڑے پر کھڑے ہو کر اس کا انتظار کیا کرتے۔ جن کا جیریلڈ رالسا کھینچ جاتا، وہ اس چلتے پھرتے جھروکے کے درشن سے محروم رہ جاتے۔

سعادت حسن منٹو، محمد عسکری، عزیز احمد، خواجہ احمد عباس وغیرہ اپنے افسانوں کے لیے یہی لڑکیاں مستعار لے کر افسانے لکھتے تھے۔ پاکستانی لڑکی میں اصلی اور منہ زور افسانے سے نکلنے کی تاب نہیں تھی۔ اس پر تو متنازعہ منشی نے "آپا" جیسے افسانے لکھے جاسکتے تھے۔ وہ بھی خوب تھے لیکن ان میں ڈنک نہیں ہوتا تھا۔ وہ ضرب شدید نہیں ہوتی تھی جن سے گیدڑ کمان کی تانت کھا کر مرا تھا۔ پاکستانی لڑکیاں گھروں کے اندر محصور رہنے کی وجہ سے بڑی شریف، متحمل، مزاج اور شعاع، صابروشا کر اور شرافت و اخلاق کی پیکر تھیں۔ ان پر اچھا افسانہ کس طرح سے لکھا جاسکتا تھا بھلا۔

کہ میری چیز کو بلا پوچھے کیوں ہاتھ لگاتے ہو اور کس لیے اٹھا کر لائے ہو۔ میں جانوں اور میرا کام۔ میرا کام جانے اور محبت، ہمارے گہرے اور قریبی رشتے میں تم کیوں دخل دیتے ہو۔

حبیب درانی کا کوئی انشورس کا کام تھا۔ بہت لمبا چوڑا اور کافی پیچیدہ، کئی بار اس نے سمجھانے کی کوشش کی مگر مرتبہ ہم نے سمجھنے کی کوشش کی لیکن ہم دونوں ہی کسی نتیجے پر پہنچے بغیر اس معاملے کو ایسے ہی چھوڑ گئے۔ اس کا صدر دفتر میں تھا۔ کام زیادہ تر جی ایچ کیو ہنڈی میں تھا۔ پھر اس کو رسالہ پورا اور میرن شاہ بھی جانا ہوتا۔ فوجیوں کی تو انشورس ہوتی ہوگی۔ ان کے سامان حرب کی ترسیل اور اس کی انشورس میں حبیب درانی کی کھپنی کا بھی کوئی گہرا عمل دخل تھا۔ کھپنی ایک انگریزوں، ڈچوں اور اطالوی جہاز رانوں کے ڈائریکٹروں پر مشتمل تھی لیکن ان گوروں کے درمیان وہ دیکھی گورا پورا گوروں سے بھی زیادہ گورا اور ان کے کلچر، تہذیب اور کلچر میں مکمل طور پر گندھا ہوا تھا، کھپنی کے لیے رگ جال کی طرح رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ درانی کھپنی کا ملازم ہونے کے باوصف اس کا حاکم اعلیٰ بن کر رہتا اور حاکم اعلیٰ ہی نظر آتا تھا۔

کھپنی کے لیے قیام، طعام، رخصت، ضیافت، ملاقات پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ خود اپنا لباس تھا۔ ہم اس کو جتنے دن چاہتے تھے میں روک لیتے، جب اجازت دیتے تو وہ چلا جاتا۔ اگر لٹی کو ہمارے ساتھ رہنا منظور ہوتا تو وہ ہمارے ساتھ خرچہ کرتا۔ مشغول رہتی۔ اگر جانا پسند ہوتا تو درانی کے ساتھ کراچی چلی جاتی۔

بڑے اچھے دن تھے اور بے حد سہانی راتیں۔ ہمارے اوپر تھیں کے شانتی ٹکٹین میں طلباء اور طالبات کی بڑھ رہی تھی اور ہم شام کے وقت اپنی اپنی مرگ چھالالے کر تھیں کی میز جیوں پر براجمان ہو جاتے۔ پھر جس کو جس کی رابطہ قائم کرنا ہوتا اس کے چرنوں میں جا کر بیٹھ جاتا اور گیان دھیان کے موتی پھینے میں مصروف ہو جاتا۔

ایک روز سہ پہر کے وقت جب ہم شام کی چائے پی رہے تھے اور کچے کچے فلسفوں میں مصروف تھے درانی اپنے سنڈے بیٹ میں ملبوس، چمک سکن کا بریف کیس اٹھائے دروازے میں داخل ہوا تو ہم سب نے اس کا استقبال میں ایک پر جوش نعرہ مارا اور تالی بجا کر اس کا استقبال کیا۔ اس نے ناف کے برابر ہاتھ اٹھا کر چوکے کا سلام کرتے ہوئے بازو بلند اور توس بنا کر نیچے لٹکا دیا۔

ممتاز مفتی نے پوچھا "تلی کہاں ہے؟" کہنے لگا "وہ نہیں آئی۔" حنیف رومانی نے کہا "بکواس مت کرو اور ہمارے ساتھ چلا کیاں نہ جھاڑو۔ اس کو نیچے کھڑا کر آئے ہو اور غچہ دیتے ہو۔"

لیکن چیشر اس کے کہ درانی کوئی جواب دیتا۔ ہم سب نے اونچی آواز میں پکارا "آ جاؤ تلی آ جاؤ، سر پران چکا۔ خبر ہوگئی۔ ب آ جاؤ۔"

لیکن کوئی بھی نہ آیا۔ سرتاج نے اور مفتی نے میز جیوں پر جا کر دیکھا۔ کوئی بھی نہ تھا۔ پہاڑی سے نیچے جانے لگا وہ والی تو سرک پر بھی کوئی موجود نہ تھا۔ ہم سب کو یقین ہو گیا کہ تلی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوگی اور ڈاکٹروں نے اسے

کہنے لگا "یہ موسٹ ماڈرن اور انٹرا کلاس عورتیں بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔ ان سے دوستی تو کی جاسکتی ہے، مگر بڑی نہیں۔ خواہو اور میرے نواس سال بڑا دیکھے اور میرے اعتماد کو بھیس پہنچا کر سارا گھر برباد کر دیا۔ میں آپ سب کو نصیحت کران کا کہ ایسی سنہری بلا سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا جائے۔ اپنے مستقبل کو محفوظ رکھا جائے، اپنی زندگی کو بچایا جائے۔"

درانی ہماری پروا کیے بغیر آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ پیتا رہا اور چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر غصے کے بحر کی آواز دیا گئی کے آثار نمایاں تھے۔ ہم میں سے کسی کو بات کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اصل میں تلی اس قدر کھلی ڈلی، شوخ چشم اور بے حیا عورت تھی کہ اس کے ساتھ دوستی لگانے میں تو یقیناً مزاح تھا لیکن اسے یہ بھی بنا کر گھر پر رکھنا مشکل کام تھا۔ کوئی کب تک دوسروں کو سمجھا سکتا ہے کہ ہم آرٹسٹ لوگ ہیں اور کھلی کھلی بات کیا کرتے ہیں۔ ایسی باتیں کرنے سے دل تنگ اور ذہن زنگ آلود نہیں ہوتے لیکن لوگ تو یہ دلیل نہیں مانیں گے، وہ اپنے چوکھے میں رکھ کر پرہیز گار بنیں گے۔

مفتی نے حوصلہ کر کے کہا "دیکھو درانی ہے تو مشکل بات اور ایسے تکلیف دہ موقع پر پروا جی غم خواری کچھ مدد بھی نہیں کرتی لیکن یاری یاری کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلا تو جاسکتا ہے، مدد چاہیے ہونہ ہوا۔"

درانی نے کہا "کچھ بھی نہیں مفتی جی، ہمارے مزاج ایک جیسے نہیں تھے۔ ہماری طبیعتوں میں بنیادی فرق تھا۔ ہمارے طبیعت مختلف تھے اور..... میں تو شاید نباہ کر لیتا اور کسی حد تک اپنی طبیعت بدل بھی لیتا لیکن وہ اپنی جگہ پر ایک حد تک، اڑیل چرخ کی طرح جی ہوئی تھی اور بٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔"

حنیف نے کہا "ذرا وضاحت سے بیان کرو، تمہاری بات سمجھ میں نہیں آئی۔" درانی نے کہا "یہ طلاق میری طرف سے نہیں ہوئی۔ اس کی طرف سے ہوئی ہے۔ اس نے زور ڈال کر اور زور مار کر شادی ختم کروائی ہے۔ میں تو اس واقعے سے چشم پوشی بھی کر لیتا لیکن وہ نہیں مانی۔ کہنے لگی اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہیں بول سکتی اور جھوٹی بن کر رہ بھی نہیں سکتی، اس لیے مجھے طلاق دے دو اور جلد دے دو۔ تم نے سب کچھ اپنی

آنکھوں سے تو دیکھ لیا ہے۔

جب ہم نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ کہنے لگا۔ ”میں بھی آخر خاندانی آدمی ہوں۔ درانی بڑے ہوں، میری غیرت یہ سب کچھ کیسے گوارا کر سکتی تھی۔ میں نے اس کو پکڑ لیا!“

”کہاں پکڑ لیا خان صاحب۔“ حنیف درانی نے مزاحیہ ہونے کہا۔

”اپنے گھر میں۔ اپنی کوٹھی کے اندر۔ بلا کا ہاؤس میں۔ موہنا بیس کے ساتھ۔۔۔۔۔ سب سے آخری کوٹھی میں گھسے ہوئے تھے حضرت صاحب۔ سٹوروم میں! حالانکہ ان کو پتہ تھا یہ میرے آنے کا وقت ہے۔ میں نے فون کیا تو ہار دیا تھا۔ ریسپشن پر جانے کا بتایا تھا۔“

”اور تم نے طلاق دے دی۔“ سرتاج نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”کسی نے صلح صفائی بھی نہیں کرائی؟“

”صلح صفائی کی کیا ضرورت تھی سرتاج بھائی! اس نے خود مجھ سے کہا۔ آپ مجھ کو دیا۔ خود وکیل صاحب کو لے کر کے بلایا اور مجھے سامنے بٹھا کر ذلیل کروایا۔“

”زوبی نے کہا“ اور وہ بھاگ گیا؟“

”بھانسی تھا ہی اور کیا کر سکتا تھا۔ میرے غصے کے سامنے تو پھر بھاگنا ہی پڑتا ہے۔ میری شکل دیکھ کر بھاگ گیا۔ جب ہم سے کوئی اگلا سوال نہ بن پڑا تو درانی نے خود ہی کہا ”دفع کر دیجی، جس کم جہاں پاک ہو گیا۔ نہ اس نے کوئی ڈیمانڈ کیا نہ میں نے۔ وہ اپنا اپنی کیس ہاتھوں میں اٹھا کر چلی گئی اور میں نے اٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔“

”مفتی نے کہا“ معاف کرنا یا درانی، مرد کی ذات ہوتی ہی ایسی ہے، تمہارے جیسی۔ میرے والد کی چار بیویاں تھیں اور وہ بے حد غصہ ور آدمی تھا۔ ہم نے بڑا مشکل وقت دیکھا ہے اور سارے کا سارا اپنے والد کے ہاتھوں کی غیرت سے کوئی دکھ نہیں دیا۔ بس والد صاحب ہی اس کھیل کے ولن تھے۔۔۔۔۔ تو یہ مرد کی ذات بڑی سنگدل اور بے وفا ہوتی ہے۔“

”تمہارے ادھر پنجاب میں ہوتی ہوگی۔“ درانی نے قدرے غصے سے کہا ”لیکن ہمارے ادھر ایسی نہیں ہوتی۔ افغانستان میں یا صوبہ سرحد یا علاقہ غیر میں!“

ہم نے اس کی دھمکی رگ کو مزید چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس سانچے کے بعد کافی دھکی معلوم ہوتا تھا اور اس کی آنکھوں میں لٹی کا پورٹریٹ اب بھی واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ اپنی جگہ سے تھوڑا سا کھسک گیا تھا اور اس کی گفتگو اس حادثے کی وجہ سے کافی بے ربط ہو گئی تھی۔ بار بار زور لگا کر وہ ہچکے مار کر وہ اپنی گاڑی کھو بے سے نکالنے کی کوشش تو کر رہا تھا لیکن اس کے پیسے دیکھتے دیکھتے اور نیچے دھسنے لگے رہے تھے۔ اس کو لٹی سے علیحدہ ہونے کا شدید غم تھا اور وہ اس کے بغیر نامکمل سا ہو کر بیٹھا تھا۔ اس کا آدمی سے کم تر ہونا چکا تھا اور باقی کا تیزی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ درانی کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے ساری زندگی ایک چوتھائی بن کر گزارنی پڑے گی اور اس پر صبر شکر کرنا ہوگا۔

”مفتی نے پوچھا“ تو وہ اب کہاں ہے۔۔۔۔۔ ہماری پیاری لٹی؟“

اس پر درانی نے آنکھیں چمکا کر کہا ”مجھے کیا معلوم! وہیں کہیں ہوگی کراچی میں۔ مجھ سے تو کبھی ملی نہیں لیکن آپ لوگوں سے ضرور ملے گی۔ آپ سب کی بڑی قدر ہے اس کے دل میں۔“

”مفتی نے کہا“ بھائی درانی تم نے جلدی کی۔ پٹھانوں والا کام کر دیا بھٹا پٹ اور نفاٹ۔“

درانی نے کہا ”میں نے جلدی کی یا اس نے؟ وہ تو میری جان کو آ رہی تھی کہ مجھے ابھی طلاق دو۔ ابھی کاغذ لکھ کر میں نے جلدی کی! میں نے!!“

”مفتی نے کہا“ مگر وہ تھا کون؟“

”کون؟ کون!“ درانی نے حیران ہو کر پوچھا ”کون کون تھا! کس کو پوچھ رہے ہو؟“

”مفتی نے کہا“ مجھی وی جو بھگا تھا تمہارے گھر سے!“

”ہمارے گھر سے کون بھگا تھا؟“ درانی نے حیرت سے پوچھا۔ ”ہم کو تو معلوم نہیں کہ کون بھگا تھا!“

”وہی جس کا تم ذکر کر رہے تھے۔“ مفتی نے کہا ”جو تمہارے غصے کے سامنے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔“

”اچھا وہ۔۔۔۔۔ وہ تو ہمارا وکیل تھا۔“ درانی نے کہا ”وہ کچھ کہنے سے بغیر بھاگ گیا تھا۔“

”تو یہ وکیل صاحب تھے جنہوں نے ایسی دراز دہی کی۔“ سرتاج نے پوچھا۔

درانی کو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا اور وہ ہمارے درمیان بدحوسا بننا بیٹھا تھا۔ مفتی کو اس سارے معاملے پر کچھ عجیب سا فک پڑنے لگا تھا۔ اس نے صورتحال کی وضاحت طلب کرتے ہوئے کہا ”ہمیں اصل بات بتاؤ، سیدھی طرح سے کہ کیا ہوا تھا۔ پھر تمہارا کیا رد عمل ہوا اور طلاق تک کیسے نوبت پہنچ گئی۔ آنا ٹانا!“

درانی نے کہا ”رات کو ایک ریسپشن تھی۔ لاسوٹا جہاز پر۔ یہ جہاز ان دنوں کراچی میں لنگر انداز تھا اور اس پر ہمارے کال کا جھنڈا لہرا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی ریسپشن تھی جو ہماری کمپنی کی طرف سے دی جا رہی تھی اور میں اس کا مڈارل مہم نمونہ میں اور میری بیوی۔۔۔۔۔ ظاہر ہے ہم دونوں ہی کو اپنی کمپنی کی نمائندگی کرنا تھی۔ مسز اینڈ مسز کی حیثیت سے۔۔۔۔۔ اس بارہا میں گورنر سندھ اور ان کی بیگم کے علاوہ کوئی بھی دیہی شخص مدعو نہ تھا۔ میں نے منج سویرے لٹی کو فون کر کے ساری سہرے والے آگاہ کر دیا اور وہ میرے ساتھ اپنے ڈریس اور میک اپ کے بارے میں تبادلہ خیال کرتی رہی۔ سہ پہر کے اٹن اس نے مجھے فون کیا کہ میں نے اپنے ڈریس میں تبدیلی کر لی ہے اور اس کا انداز بدل دیا ہے۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا درانی تم مائنڈ تو نہیں کرو گے۔ اگر میں اس میں تھوڑی سی عریانی ڈال لوں، اپنے لباس میں؟ میں نے کہا بالکل ٹھیک، ہرگز نہیں۔ میں تو بلکہ خوش ہوں گا کہ کافی ٹینٹ کے لوگوں سے ہمارے مشرق کا حسن کا مسوٹر کے بعد دوسری مرتبہ خلاف ہوا۔ اس نے کہا، ٹھیک ہے، شام کو دیکھنا۔“

”زوبی نے کہا“ یہ تو بہت اچھی بات سوچی اس نے۔۔۔۔۔ کام کی بات!“

سرتاج نے کہا ”اور اس بات نے اس کا بیڑا غرق کیا ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے!“

”بالکل ٹھیک کہا تم نے۔“ درانی نے انگلی سے سرتاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”ایک خان ہی خان کی

بات کو سمجھ سکتا ہے۔ اسی بات نے بیڑا غرق کیا اور اسی واقعے نے ہماری زندگی دو ٹکڑے کر دی۔“

”شام کے وقت جب میں جہاز پر دعوت کے سارے انتظامات کر کے، پھول چٹاں اور چنڈول فانوس لگا کر جب گھر پہنچا تو نوکر نے ڈرتے ڈرتے انگلی کے اشارے سے بتایا کہ میڈم اندر ہیں..... اگلے اندر.....!“

میں آوازیں دیتا اور سیٹی بجاتا جب اگلے اندر گیا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے ساتھ کی گیلری میں لڑکے دوڑائی وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ سٹور کی طرف میرا دھیان ہی نہیں جاسکتا تھا۔ نہ ہی میں اس کے بارے میں سوچ سکتا تھا کہ لٹی سٹور میں ہوگی۔ میں نے اور اونچے اونچے آواز دینا شروع کر دی تو مجھے سٹور کے اندر سے ہلکی ہلکی کراہوں کی اور مدد مہم سکیوں کی آواز سنائی دی۔

میں نے بھڑاک سے دروازہ کھول کر اندر جو دیکھا تو میرے ہوش غم ہو گئے۔ میرا عزیز ترین دوست مرزا سفاحر جو ایک یہودی سی لمبی تیغ روم ڈیکوریشن کے لیے اجیر سے لایا تھا، وہ لٹی کے ہاتھ میں ہے۔ آنکھوں سے قطارند قطارند آنسو چہرے پر رواں ہیں۔ ہونٹ بند ہیں۔ ہر سکی کے ساتھ ایک دانہ گرانی ہے۔ نیلے کنارے والی سفید دھونی ہاتھ میں ہوئی ہے جو آیا لوگ باندا کرتی ہیں۔ گلے میں یہودی قسم کے پھولوں کے ہار پہنے بیٹھی ہے۔ چہرے پر شدید خوف کے آثار ہیں۔ میں نے ایک دفعہ بلایا، دوسری دفعہ بلایا، پھر اونچی آواز میں بلایا لیکن وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ میں نے ارا کدھا پکڑ کر زور سے بلایا تو چہرہ اٹھا کر بولی ”جیب خان!“

میں نے چیخ کر کہا ”یہ سب کیا ہے اور تم کیا کر رہی ہو؟ اور ایسا کرنے کو تم سے کس نے کہا ہے؟“ وہ میری بات سن کر ان سنی کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی اور میں اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر گھر گھبرا گیا۔ مجھے پریشان دیکھ کر کہنے لگی ”سن درانی بابا، نہ میں کہیں گئی نہ آنی۔ نہ کسی سے کچھ طلب کیا۔ نہ میں اس کو باطن سے واقف تھی۔ خدا نے گھر بیٹھے اپنی نعمت عطا فرمائی۔ اب میں تمہارے کام کی نہیں رہی، نہ ہی تم میرے مطلب کے ہو۔ چلو! اپنا پنا کام کریں اور خوش رہیں۔“

ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ مفتی نے کڑک کر کہا ”اوتے عقل کے کوہو تجھ سے کس نے کہا تھا سیدانی سے ملانی کرنے کو..... یہ سید زادے بڑے ڈانڈے لوگ ہوتے ہیں۔ کیسے بھی ہوں، ان کا کنکشن بڑی دور لگا ہوتا ہے۔ پلگ ڈم ہو جائیں، تاریں کٹ جائیں، شارٹ سرکٹ ہو کر فیوز اوڑ جائیں تو دوسری بات ہے لیکن جو نبی کبھی کسی میں کرنٹ کی بجلی آگئی، اس نے پکڑ کے رکھ دیا، سب کچھ جلا جلنے کے خاک سیاہ کر دیا۔ تجھ سے کس نے کہا تھا سیدہ از جند سے ملانی کرنے کو..... اوتے جھگھو! ہم سے ہی پوچھ لیا ہوتا!“

جھگھو بیچارا ہمارے درمیان اور بھی جھگھو بنا بیٹھا تھا۔ جب حفیظ نے مفتی کو جھڑک کر کہا ”یہ نگار خانہ ہے اور ہم آرٹسٹ لوگ اپنے فن کی طلب کے لیے یہاں جمع ہوتے ہیں، روحانیت یا مذہبی پرچار کے لیے۔ آپ کی باتوں سے پرچار کی بات ہی ہے اور اس بوکا ایک پٹ اس سارے خوشگوار ماحول کو زہر آلود کر سکتا ہے۔ مگر ہم نے مذہب، روحانیت، خدا کی باتیں یہاں شروع کر دیں تو ہم اپنے مسلک سے پھسل جائیں گے اور ہمارا یہاں جمع ہونا بے معنی ہو جائے گا۔“

مفتی بے چارہ شرمندہ سا ہو کر خاموش ہو گیا۔

میں پھر ایم اے کا امتحان دیتے ہی آزاد کشمیر ریڈیو میں ملازم ہو کر رٹا کھیل چلا گیا۔ میرے بعد اس نگار خانے کا کیا ہوا یہاں کے دوستوں نے کسی زندگی بسر کی، اس کا ایک بڑا حصہ تو معلوم ہے لیکن اس کی تفصیلات سے آگاہ نہیں۔ لاہور سے تعلق ٹوٹ جانے کے بعد آدمی زندہ تو رہتا ہے لیکن ایسے جیسے اچھی بھلی چلتی موٹر گاڑی پر منتقل کر لیا جائے۔ چلتی تو رہتی ہے لیکن اس میں وہ روانی نہیں ہوتی، حرکت تو ہوتی ہے لیکن تھرسٹ نہیں ہوتا۔ لاہور سے جدا ہونے والے لوگ بڑے بڑے امیر کبیر اور ترقی یافتہ ملکوں میں اچھی اچھی عمدہ نوکریوں پر خوشحال اور فارغ البال ہوتے ہیں لیکن ان کو سونے کے کاغذ کا مرض ہو جاتا ہے۔ ہر وقت ریس ریس کرتے آہیں بھرتے رہتے ہیں۔ نوکری، چاکری، دولت، شہرت ان کے مرض کا مداوا نہیں کرتی۔ ساری عمر لاہور کو یاد کرتے گزر جاتی ہے اور لاہور آ نہیں سکتے۔ بس آیا ہی نہیں جاتا۔ کچھ پتہ نہ لال سے..... والا معاملہ ہو جاتا ہے۔

ادھر ان کے بغیر لاہور کا ایک حصہ بھی بکھر جاتا ہے۔ ٹوٹ کے گر پڑتا ہے۔ جیسے پرانی عمارت سے ایک اینٹ ٹوٹ کر دوسری خواہ مخواہ گر پڑتی ہے۔ کچھ اسی طرح سے لاہور سے چلے جانے والے کے بعد لاہور کا حال ہوتا ہے..... ہمارا نگار خانہ، وہ شانتی بکچن جو سچ لاہور سے ڈیڑھ دو سو فٹ کی بلندی پر تھا، زیادہ تر بند رہنے لگا۔ پاکستان آگے کو بڑھ رہا تھا۔ کام کرنے اور زندگی بنانے کے مواقع ریڑھیوں پر نکلے سیرک رہے تھے۔ سنہرا مستقبل شگرفی لودے رہا تھا۔ لوگ ترقی کی دھن میں باہر نکل گئے۔ گھروں کے دروازے بند ہو گئے۔ اماں بابے کہانیاں کہنا بھول گئے۔ کوئی گھر پر ہوتا ہی نہیں تھا، کہانی کسے سناتے، بات کسے بتاتے۔

میں چار روز کی چھٹی لے کر رٹا کھیل سے پنڈی آیا تو بڑے ڈاکخانے کے پاس مجھے حبیب درانی مل گیا۔ اپنی سرخ لینڈ سے کینکسر کی طرح چھلائیں بار کر باہر نکلا اور مجھ سے پٹ گیا کہ گھر چل، ابھی چل، فوراً چل..... تیرے لیے نئی قسم کا ڈیوڑھی چیز رکھا ہے! میں نے کہا ”کونسا گھر؟ کس کا گھر؟ کیسا گھر؟ تمہارا گھر سے کیا کام!“

کہنے لگا ”میں کراچی سے راولپنڈی منتقل ہو گیا ہوں۔ یہاں میری کمپنی کا کوئی دوسالہ پراجیکٹ ہے اور میں نے روز روز کے سفر سے تنگ آ کر اپنے آپ کو یہیں مقیم کر لیا ہے۔“

میں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا تو اس نے ایک سیلینڈر پورا دبا کر کچھ ایسے جھٹاک سے کچھ چھوڑا کہ گاڑی دس پندرہ فٹ کی زقند بھر کر پھر زمین پر آ رہی۔ میں نے کہا ”پہلے مجھے اتار دو، پھر یہ سر کی کام کرنا۔ مجھے تو چھٹی پینا کے واپس آ جانا ہے، تم سے پوچھنے والا کون ہے، خود اپنے پاس ہو۔“

میں نے کہنے لگا ”کیا کروں یاد میں ایک مرتبہ پھر وہی کنوارا لڑکا بن گیا ہوں جو اے ٹیم کا سینئر فارورڈ تھا۔ ایسٹ سوسائٹی کا سیکرٹری اور ڈرامہ سرکل کا سٹیج منیجر..... اصل میں کنوارا پنا پنا بی طاقتور چیز ہے۔ بہت اونچی چھٹاں مارتا ہے۔ واپس نہیں آتا۔ شیر سید حاتیرتا ہے، وقت رفتن آج میں.....“

میں نے کہا ”تلی سے ملاقات ہوئی؟“

کہنے لگا ”چھوڑ دو دفع کرو۔ جس کا نام ایک مرتبہ لسٹ سے بچاؤ دیا، اس کو آنا لگا کر جوڑنے سے فائدہ اٹھانے لگا ہے ہی بڑی دواہیات چیز۔ پتہ نہیں کس نے بنائی تھی اور کس نے اس کے حق میں پروپیگنڈہ کیا تھا کہ اچھی چیز ہے۔ اس سب پر۔“

میں نے کہا ”مگر مے آدمی ایسے نہ کہو، پتہ نہیں کون کون سے بڑے اور بزرگ انسان اس کے محرک ہوں گے تم بلا سوچے سمجھے بکواس کر دیتے ہو۔“

اس کا گھر پرانی وضع کی ایک بہت ہی بڑی پارسی کوٹھی پر مشتمل تھا جس کے سروٹش کوارٹر کے پاس گھوڑوں کا اصطبل تھا۔ مجھے اس میں دو گھوڑوں کی لمبی دھن نظر آئیں۔ وہ منہ دوسری طرف کیے دانہ کھا رہے تھے۔ کوارٹروں کے ہر ایک چھوٹے سے حوض پر تین ملازمائیں کپڑے دھو رہی تھیں۔ برآمدے میں ایک پیرا سفید وردی میں ملبوس گیت کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ اس نے صاحب کو کار سے اترتے دیکھا تو اندر کو بھاگا اور ایک چاق و چوبند اردلی نے اس کو برآمدے میں کمراس کیا۔

جب ہم گاڑی سے نکلے تو میں نے کہا ”یہ تمہارا بنگلہ ہے؟“

ہنس کر بولا ”میں نے کیا کرنے ہیں بنگلہ جنگل، یہ کمپنی کی کوٹھی ہے۔“

میں نے کہا ”ویسی ہی کوٹھی جیسی ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کیا کرتی تھی؟“

کہنے لگا ”بالکل وہی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔۔۔۔۔ اب کے جو کوشیاں قائم ہوں گی وہ پاکستان کو فتح کر کے دلائی سرکار کے زیر نگین نہیں لائیں گی صرف ان کو اپنے تصرف میں رکھیں گی۔ اقتصادی کنٹرول کمپنی کا ہوگا، بدنی زندگی پاکستان کی اپنی ہوگی۔“

میں نے کہا ”بکواس مت کرو اور خوفزدہ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں ایک آزاد شہری ہوں، ایسی باتوں سے ڈرا نہیں کرتا۔“

پھر اس کے کھلے بلکہ بہت ہی کھلے ڈرائنگ روم میں چائے آگئی جس کے ساتھ سوسو طرح کے لوازمات تھے۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے پھر تلی کی بابت پوچھا تو اس نے کہا ”خدا کی قسم مجھے ہرگز معلوم نہیں کہ کہاں ہے۔ اپنی اوڑنی یہ خبر سن تھی کہ سوات کے کسی گاؤں میں رہتی ہے۔ کوئی بابا پیر ہے، اس سے دینی اور اور روحانی تعلیم حاصل کرتی ہے اور والی کے نواسے نواسیوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہے۔ میں نے تحقیق نہیں کی لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہ بات ٹھیک ہی ہوگی۔۔۔۔۔ اور مجھے تحقیق کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔“

پھر درانی نے مجھے دماغی عوارض پر ایک لیکچر دیا جس میں اس کے گہرے مطالعے کی جھلک موجود تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بے حد فیشن زدہ، آزاد خیال اور آزاد منش، کھلی ڈھلی، عریاں نفس عورتیں جب وقت کے گونا گوں جھکوں میں سے گزرتی ہیں تو اور سارے پہلو تو آسانی کے ساتھ عبور کر جاتی ہیں لیکن روحانیت کے پہلو پر سے گزرنے

ہوئے اکثر اوقات اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتیں اور دریائے حقیقت میں گر جاتی ہیں، کبھی نہیں۔ لاکھوں نہیں، ایک یا اس سے بھی کم۔

اس نے مجھے حیران اور بھونچکا کر کر بڑی شفقت سے کہا۔ ”اس میں ان بیچاروں کا قصور نہیں ہوتا، اس جھانکا پہلو کا روش ہوتا ہے جو ان کے وجود کا بوجھ اٹھاتے ہی حق ہو کر کے دیوانہ وار جھولنے لگتا ہے اور اس کو حال پڑ جاتا ہے۔۔۔۔۔ پتہ نہیں تم نے پہاڑی علاقوں میں تار کے ایسے پہلو دیکھے ہیں یا نہیں۔ ان پر تو پرسکون اوقات میں چلنا مشکل ہوتا ہے، اگر سارا پہلو اور پہلو کو تھانے والے کناروں پر کھڑے فصیلوں جیسے سنگین مینار بھی جھولنے لگیں تو کون دریا پار کر سکتا ہے؟“

میں نے کہا ”پھر!“

کہنے لگا ”پھر یہ کہ شادی ہمیشہ ایک سیدھی سادی، نیک پاک، نیک چلن اور نیک اطوار، سادہ لوح اور احمق قسم کی لڑکی سے کرنی چاہیے۔ اس سے محفل تو نہیں بچتی لیکن زندگی بڑی خوشگوار رہتی ہے۔ سارا سفر بغیر محسن کے گزر جاتا ہے۔“

”تو اب تم کسی ایسی ہی لڑکی سے شادی کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”تو بہ تو بہ۔۔۔۔۔ تو بہ۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا ”میں اور شادی کروں! یعنی پھر شادی کروں!! ایک مرتبہ

پھر اس پہل صراط سے گزروں جس پر پورے نو برس اور تین مہینے گزارے، مجھے کون غفلت کہے گا۔ تو بہ تو بہ۔۔۔۔۔ تو بہ!!“

ہم چائے پیتے رہے۔ ایام گزشتہ کی باتیں کرتے رہے۔ اوپن ایر تھیر کے نگار خانے میں آنے والے ایک ایک مہمان کو یاد کرتے رہے اور بیچ بیچ میں اس کو دوبارہ شادی کرنے کی تلقین کر کے اس کا قصہ مول لیتا رہا۔

اب وہ واقعی اٹھارہویں صدی کے پینٹر لارڈ کی طرح زندگی بسر کرنے کا خواہشمند تھا اور زندگی کی ڈور اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر جیون پتلی کو اپنی مرضی سے نچوانے کا آرزو مند تھا۔ وہ ارادے کا مضبوط اور دھن کا پکا درانی تھا اور اس میں پٹنائوں والی ضد تھی کہ بند ہو کر اس کے آگے آگے چلتی تھی۔

جب اس نے مجھے چھوڑنے کے لیے کار سیدھی کی تو خانہ ماں اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ درانی نے دس دس کے دونوں اس کی طرف لہرائے جو اس نے بڑے ادب کے ساتھ ڈنڈوت کے انداز میں دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیے۔

اس کے بعد کپڑے دھونے والی تینوں عورتیں، ڈرتی ڈرتی، سبھی سبھی اس کی گاڑی کے قریب آئیں تو درانی نے ان کا تعارف کراتے ہوئے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور کہا ”یہ بے بے ہاجراں ہیں جو یہاں کسی قریبی گاؤں سے آئی ہیں اور یہ ان کی بیٹیاں ہیں داراں اور گوماں۔ دونوں بڑی محنتی، شریف اور دیانتدار لڑکیاں ہیں۔ اپنی ماں کا خیال بھی رکھتی ہیں اور اس کا ہر طرح سے ساتھ بھی دیتی ہیں۔“

لڑکیوں کی ماں نے اثبات میں سر ہلایا اور دس کا نوٹ اپنی اوڑھنی کے کنارے سے پاندھنے لگی۔ درانی نے ایک خوش دل جرگہ چیف کی طرح سے پوچھا ”بے بے کیا نام ہے بھلا تمہارے گاؤں کا؟“ تو ماں کی بجائے داراں نے گاؤں کا نام بتایا اور ذرا شوخی سے میری طرف دیکھا۔ اس کا بدن قدرے بھاری اور رنگ خوب گورا تھا۔ آنکھوں میں غمزدگی کی طلب بلکی سی اجازت اور مری مری طلب سے روکنے کی خواہش تھی۔ گوماں سانولے رنگ کی بے حد دلی پتلی،

سڑیل مزاج، اکل کھری لڑکی تھی۔ اس کو اپنی ماں اور بہن کا یہ رویہ پسند نہیں تھا اور چہرہ قدرے موڑ کر کھڑی تھی۔ اس کے نقوش کافی تیز تھے اور ناک میں پیتل کی ایک تیز سی تیلی تھی۔

ان کے جانے کے بعد سائیس آ کر کھڑا ہو گیا۔ سستے ہوئے بدن اور بھاری مونچھوں والا جھنگی شہسوار اس نے درانی کو کھائی، لگام اور دہانے کی مرمت کا بل دیا۔ بل دیکھ کر درانی کے ماتھے پر ہلکی سی ٹکٹیں ابھرا آئیں اور اس نے تنک کر کہا ”کاشی مرمت کرنے کے سو روپے؟“

”جی سرکار۔“ جھنگی شہسوار نے کہا ”ولایتی کاغھی ہے تو ولایتی چڑا اور ولایتی ڈور سی لگتی تھی۔ دونوں بک چڑی کے ہیں اور سامنے نگے کے کوکے۔“

”اوئے سو روپے میں تو نی کاغھی آ جاتی ہے۔ مکمل“ درانی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”بالکل آ جاتی ہے سائیس ضرور آ جاتی ہے۔“ اس نے یقین کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے کہا ”پراس پر چڑا نہیں ہوتا۔ اصلی چڑا اس کو کچھ اور کہتے ہیں۔ دیکھنے میں چڑا نظر آتا ہے، پر ہوتا نہیں۔“

درانی نے کہا ”یہ بڑا کرگیر آدی ہے۔ اچھا گھڑسوار تو نہیں البتہ اچھا بات سنوار ضرور ہے۔ اس کا والد جھنگ میں جاگیرداروں کے گھوڑوں کو ناچ سکھایا کرتا تھا اور اس۔“

”وہ جناب ولایت بھی گیا تھا ڈانسیا گھوڑا لے کر۔“ اس نے بات کاٹ کر کہا ”میرا والد بڑا قابل آدی تھا۔ ہم تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔“

”نہیں نہیں، تم بھی بڑے قابل آدی ہو۔“ درانی نے جلدی سے کہا ”تمہاری قابلیت کے سامنے تمہارے والد کی قابلیت بچ تھی۔ یہ جوفن تم کو آتا ہے، اس کو نہیں آتا ہوگا۔“

پھر اس نے بل واپس لوٹا تو ہوئے کہا ”تم یہ بل رکھو، کل میں شیخ صاحب سے فون پر بات کروں گا۔“ سائیس کے ایک طرف بٹنے ہی چوکیدار ہماری گاڑی کی طرف بڑھا تو درانی نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو

وہیں روک دیا اور ہم کپنی کی کوشی سے باہر نکل آئے۔

درانی پہلے کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ، زیادہ بروہار، بڑا خوشگوار اور بہتر انسان بن گیا تھا۔ اس کے اندر ایک عجیب طرح کی حس مزاج پیدا ہو گئی تھی جس کا پہلے شاید تک نہ تھا۔

تراڑ کھیل واپس پہنچ کر میں نے سوچا کہ یہ کس قدر اچھا ہوا کہ درانی مستقل طور پر پنڈی تعینات ہو گیا۔ میرے لیے ایک جذباتی مرکز تو طے ہوا۔ پہلے پنڈی آ کر سیکے کباب کھا کر اور دو تین شو دیکھ کر واپس جا کر یہ اعلان کرنا پڑتا تھا کہ

دورہ بہت کامیاب رہا اب بچ بچ نیک انجام اور عاقبت بخیر درانی کے ساتھ رہ کر بڑا لطف آتا تھا۔

کچھ دیر میرے اس کے درمیان تار برقی جیسی خط و کتابت رہی لیکن اس کے بعد شاید ہم دونوں کو اس کی ضرورت نہ رہی۔ میرا خیال تھا کہ جب کبھی میں پنڈی جاؤں گا، اس سے مل لوں گا۔ اس نے بھی شاید کچھ ایسے ہی سوچا

ہوگا۔ چنانچہ کسی کو سٹل دیئے بغیر ہماری معمولی قسم کی خط و کتابت بھی ختم ہو گئی۔

یوں تو یہ بات بڑی دیر سے چل رہی تھی لیکن اس کی کوئی عملی صورت نظر نہیں آتی تھی کہ آزاد کشمیر ریڈیو کو تراڑ کھیل سے کوہ مری منتقل کر دیا جائے۔ اس کے لیے سیکرٹری انفرمیشن نے بڑے وزنی دلائل دیئے تھے لیکن آپریشن ”اے“ ہوتے ہی ان سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ اتفاق تو شاید اپنی ضد کی وجہ سے نہیں کرتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ریڈیو سٹیشن کو واقعی مری منتقل ہو جانا چاہیے تھا اور یہاں سے صرف ڈسکوں اور تین مرتبہ کی خبروں کے علاوہ کچھ زندہ اور موقع پر موجود لوگوں کے پروگرام بھی ہونے چاہئیں تھے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتے تھے کہ متعلقہ لوگوں یعنی مقرروں، سیاستدانوں، مجاہدوں اور سرکاری افسروں کو پنڈی، مظفر آباد سے بلوا کر ان کے مندرجہ منہ پروگرام کرائے جاتے اور موسیقی کے خانے کو نامور گانگیوں سے اور ان کے ساتھ کیے گئے انٹرویوز سے براڈ کاسٹ کیا جاتا۔

یونٹ کے ایک نئے کمانڈر آئے اور انہوں نے آتے ہی وزارت اطلاعات کی رائے سے اتفاق کیا اور ریڈیو سٹیشن مری منتقل ہو گیا۔

بھر مگر میوں کے دن تھے لیکن پاکستان کے لوگ ابھی پورے زور سے امیر نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے مری خالی خالی سا تھا۔ کشمیر پوائنٹ پر تو پھر کچھ رونق تھی لیکن پنڈی پوائنٹ کے سارے بنگلے خالی پڑے تھے۔ مال روڈ پر صرف وہی پانچ چھ انگریزی وضع کی دکانیں تھیں جہاں سے اب بھی ولایتی پنیر، ڈوڈو تو تھ پاؤڈر، مونچھوں والے کاتیل، فریش گراپ وائر، ہوائی بندوق کے چھرے اور سیاہ سوہانی رومی سگریٹ مل جاتے تھے۔

ایک سہ پہر میں لوہ بازار سے کھانا کھا کر اوپر کی جانب ابھرا ہی تھا کہ مجھے ڈاکخانے کی سیڑھیوں پر درانی نظر آ گیا۔ وہ اپنی ڈاک کے کیڑھیاں اتر رہا تھا اور اس نے جو کیوں کی کٹ پہنی ہوئی تھی۔ بغل میں چابک تھا اور منہ میں بہت ہی ٹیڑھی چھوٹی سی جیسا پائپ تھا۔ اس نے ٹک کر پائپ کو نسنے سرے سے سلاگنے کی کوشش کی تو میں جھپٹ کر اس سے چھٹ گیا۔ پھر اس کا پائپ بھی گر گیا اور بغل کا چابک بھی اور ہم دونوں بھی گرتے گرتے بچے کہ اس زمانے میں ڈاکخانے کی سیڑھیاں بہت تنگ اور بے حد عمودی تھیں۔

درانی نے سیڑھیاں اترتے ہوئے مجھے بتایا کہ اس نے سارے فلسفے چھوڑ کر اور سارے بندھن توڑ کر پھر سے اپنا کمر آباد کر لیا ہے اور بہت خوش ہے۔ اس کی بیوی ایک شریف اور سادہ لوح گھرانے کی لڑکی ہے اور ماڈرن لائف کے ناگزروں سے زیادہ واقف نہیں۔

میں نے نوک کر کہا ”اگر وہ واقف نہیں ہے تو تم اسے سکھا دو گے۔“

کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا ”اس مرتبہ میری توبہ! ابھر پایا پہلے مجھے کونسا سکھ ملا تھا جواب ایسا کروں گا لیکن تم ابھی اسی وقت میرے ساتھ گھر چلو۔ اپنی بھالی سے ملو، اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیو اور تازہ دم ہو جاؤ۔“

میں نے کہا ”وہ بھی ساتھ آئی ہیں۔“

کہنے لگا ”مگر مے آدی کوئی شادی شدہ مرد مری بھی اکیلے آتا ہے۔۔۔۔۔ یا آ سکتا ہے؟ لیکن۔۔۔۔۔ چونکہ ابھی ناچر بہ کار ہو، کنوارے ہو، اس لیے ایسے احقنا نہ سوال کرتے ہو۔“

میں نے کہا ”لیکن ابھی تو ہماری شام کی ٹرانسمیشن شروع ہو جائے گی..... اگر.....“

اس نے میری کمر میں ایک زور کا دھموکا مارا اور کہا ”تمہاری ٹرانسمیشن شروع ہونے میں تو ابھی پورا ایک گھنٹہ اور بائیس منٹ پڑے ہیں۔ گھر چلو..... ہم ساتھ ہی تو رہتے ہیں روز دلا میں۔ دوسٹ کی واک بھی نہیں۔“

”روز دلا کا نام سن کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ یہاں سے میں روز گزارا کرتا تھا اور سوچا کرتا تھا، پتہ نہیں اس کے اندر کہاں کے سردار اور جاگیردار رہتے ہوں گے اور اندر کیسی زندگی گزارتے ہوں گے۔ کیا کھاتے ہوں گے اور کیا لندھاٹے ہوں گے لیکن میں نے اسے اندر سے دیکھنے کی کبھی خواہش نہ کی تھی، باہر سے دیکھ کر ہی مزا آ جاتا تھا۔“

جب ہم روز دلا کے اندر داخل ہوئے تو درانی نے پکار کر کہا ”ڈارلنگ باہر نکل کر دیکھو، میرا جگری یاد آیا ہے۔“ پہلو کے کمرے کا جالی والا دروازہ کھلا اور وہاں سے درانی کی نئی بیوی برآمد ہوئی۔ دھان پان، دراز قد، سالوٹی سلونی، سیاہ موٹی موٹی آنکھیں، گہری لپ سنک، آنکھوں کے اوپر ہلکا چمکدار سامسکارا اور کانوں میں ڈانٹھنڈے کے ٹاپلین۔ اس نے نفیس کاشن کے تیز کلف لگے کپڑے پہن رکھے تھے اور دو چونیاں کر رکھی تھیں۔

میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے عقیدت اور محبت سے سلام کیا!

وہ گوماں تھی، دارال کی چھوٹی بہن جو اپنی ماں کے ساتھ صاحب کے کپڑے دھونے آیا کرتی تھیں اور شام سے پہلے پہلے واپس اپنے گاؤں پہنچ جاتی تھیں۔

درانی نے کہا ”ڈارلنگ چائے! لیکن تمہارے ہاتھ کی، خاناسے کی نہیں۔“

گوماں نے دھیمی آواز میں ”ایکسیکے زئی“ کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

درانی نے کہا ”اب تم پوچھو گے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا، کیوں ہوا اور کیونکر ہوا تو میرے پاس اس کا کوئی منطقی جواب نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”بھائی وہ تو جب میں پوچھوں گا، اس وقت تم جواب دو گے۔ میری تو سخی گم ہو گئی ہے اور میرے پاس پوچھنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں۔“

وہ ہنسنے لگا اور میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا ”نہ مجھے گوماں سے کوئی عشق ہوا نہ ہی مجھ سے کوئی ایسی غلطی ہوئی جس کے بعد شادی کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ نہ میں نے کبھی اس کا نوٹس لیا نہ کبھی اس سے کوئی بات کی..... بس ایک روز دفتر میں بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اس طرح ٹھیک نہیں، اب مجھے شادی کر لینی چاہیے۔ چنانچہ ارادہ باندھ لیا اور سوچنے لگا کہ شادی کسی ایسی گھریلو لڑکی سے ہونی چاہیے جو ہمارے کلچر میں گندھی بسی ہو اور جس کو سوائے اپنوں کے اور کسی کا علم نہ ہو اور میں تم کو بھی یہی نصیحت کروں گا کہ شادی جب کرنا ایسی لڑکی سے کرنا جس کی جڑیں اس دھرتی میں گہری چلی گئی ہوں اور جو اس مٹی کی مورت اور اس ہوا کی سنسناہٹ ہو۔ معصوم ہو، سادہ ہو، تعلیم یافتہ نہ ہو، سادھارن ہو، گھریلو مارن ہو۔ اس سے اپنے پن کی اور اپنے ہونے کی خوشبو آئے..... اب تم بتاؤ کیسا ہے میرا فیصلہ؟“

میں نے کہا ”فیصلہ تو اچھا ہے مگر تم خود نالائق آدمی ہو۔ آگے چل کر کہیں یہ تمہارا فلسفہ نالائق کا شکار نہ ہو جائے۔“

اس نے کہا ”میں مانتا ہوں کہ میں سیانا، چالاک اور چرب زبان نہیں ہوں لیکن میرا خلوص مجھے کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ میری معصومیت میرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔“

میں نے کہا ”بھائی کا نام کیا رکھا ہے؟“

اس نے کہا ”وہی، گوماں! مجھے تو یہ بہت ہی پیارا نام لگتا ہے۔ گوماں..... اس میں فرانسیسی نام کی جھلک ہے اور اس کا ساؤنڈ اٹھلیکٹ موجود ہے۔“

میں نے کہا ”اور اس کی ٹیٹن کا کیا بندوبست کیا..... مسز گوماں کی؟“

چکر بولا ”میں اس وقت سے کیا بکواس کر رہا ہوں اور تم کو لہو کے تیل کی طرح وہیں گھوم رہے ہو..... میں اسے ٹیٹن دے کر اس کی معصومیت تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ اس سے وہ خلوص چھیننا نہیں چاہتا جو یہاں کی مٹی نے اس کے خیر میں کوہا ہے۔ میں اس کو اپنے آپ سے جدا کرنا نہیں چاہتا اب مجھے اس سے شدید محبت ہو گئی۔“

”کیا یہ ساری عمر اسی طرح سے رہے گی؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا ”ان پڑھ، گھامڑ، بے علم، ناشائستہ۔“

اس نے کہا ”میں نے گوماں کو انگریزی میں دستخط کرنا سکھا دیے ہیں اور بڑے لوگوں میں بس اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ دستخط کرنے آتے ہوں تو سب معاملے خود بخود دیکھتے چلے جاتے ہیں۔ ستر اوسطو چاہے کتنی کتابیں لکھ لیں، ان کا ایک چیک بھی کیٹش نہیں ہو سکتا..... اس کے تین اکاؤنٹ ہیں اور تینوں یہ خود ہی آپریٹ کرتی ہے۔“

”لیکن چیک بھرنا بھی تو پڑتا ہے۔“ میں نے کہا ”خالی دستخطوں سے تو کام نہیں چل سکتا ناں۔“

”وہ اس کے چیک بھر جاتے ہیں۔“ درانی نے فخر سے کہا ”اس کے بینک میں داخل ہوتے ہی سب کارندے، اسسٹنٹ منیجر بھاگے آتے ہیں اور حکم کے منتظر کھڑے ہو جاتے ہیں..... وہی اس کے چیک بھرتے ہیں یہ تو بس دستخط کر کے اور رقم لے کے آ جاتی ہے۔“

”اور اس کی ماں اور بہن دارال!..... وہ کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ابھی اپنے گاؤں میں ہی ہیں۔ ان کے لیے گوماں نے ایک کینال کا کپکا مکان بنادیا ہے۔ فور بیڈروم و باتھ، فٹ سلسم، غرق کے ساتھ۔ دو ان کے گھریلو ملازم ہیں، ایک چوکیدار۔“

میں نے کہا ”گاؤں میں ملازموں کے یہاں مشکل بھی ہوتا ہے اور مشکوک بھی۔“

کہنے لگا ”ایک نوکر تو دارال کا گھامڑوں ہے اور دوسرا اس کی ماں کا سب سے چھوٹا بچا۔ منڈی میں آڑھتے کی دکان پر جسے ٹولا کرتا تھا۔ گوماں پچاس روپے زیادہ دے کر اپنے گھر لے آئی..... اور چوکیدار بھی ان کا کوئی رشتہ دار ہی ہے مگر درکار۔“

میں نے کہا ”یہ تمہارے ساتھ خوش بھی ہے کہ نہیں۔“

”بس کر کہنے لگا“ میرے ساتھ خوش نہیں ہوگی تو اور کس کے ساتھ ہوگی۔ میں ایک بہت ہی رومانٹک عاشق اور ایک فتنہ دار اور وفا شعار شوہر ہوں..... گوماں میرے ساتھ بہت ہی خوش ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم ایک دوسرے کے لیے

بنے تھے۔ مگر کچھ عرصہ دور رہ گئے۔ اب خدا کا شکر ہے!"

اسنے میں بھائی چائے لے کر آگئی۔ اس کے پیچھے پیچھے وردی والا ایک خانساں تھا جس کے ہاتھ میں لہو اور کندھے پر پنا میز پوش تھا۔ گوماں نے میز پوش خانساں کے کندھے سے اتارا اور ہمارے سامنے بچھا کر بیٹھے۔ اس پر چائے کے برتن رکھ دیئے۔ میرا خیال ہے اس نے آگے کا ہلکا سا اشارہ کیا تھا جس کا استعارہ پکڑ کر خانساں کمر سے باہر چلا گیا۔ گوماں نے بڑے سلیقے اور صفائی کے ساتھ ہماری پیالیوں میں چائے ڈالنا شروع کی اور دونوں پیالیوں کو ایک سے لیول تک بھر دیا۔ پھر اس نے ایک جیسا ایک مقدار کا ایک وزن کا دودھ ڈالا اور بڑی نفاست سے ایک مرچہ بھی چلا کر دودھ اور چائے کو ہم آہنگ کر دیا۔

گوماں دراصل ایک گیشا گرل تھی جو غلطی سے پنڈی کے ایک قریبی گاؤں میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کم گو، کم کم سن ضرور تھی لیکن اس کا بدن ہر وقت بولتا، گنگنا تا اور سرگوشیاں کرتا رہتا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سی تنگ کمر کو اپنی اوڑھنی پر اس طرح لپیٹ کر تھمتی تھی کہ کمر کی تنگی اور کوکھ کا خالی پن اور نمایاں ہو جاتا تھا۔ بولنے کے معاملے میں وہ بڑی کجوں تھی مگر جس کے ساتھ بات کرنا چاہتی تو بڑی دیر تک اور بڑی دور تک چلی جاتی۔ میں نے محسوس کیا، اس کے اندر ولایت کے سیاستدانوں کا انداز نمایاں تھا۔ وہ بات چیت کرنے سے گریزاں تھی لیکن ڈائلاگ بڑی صفائی کے ساتھ کر سکتی تھی۔ جب وہ درانی کے سروس کو ادرے سے چوہے پر کپڑے دھونے آتی تھی تو میں نے اس میں ایک بھی خوبی نوٹ نہیں کی تھی اور اب جب وہ کپڑے نہیں دھو رہی تھی تو مجھے اس میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آنے لگی تھیں۔

گوماں ایک ٹھنڈی ٹھار، پرسکون اور اکبرے بدن لڑکی تھی۔ زیادہ خاموش اور تھوڑی سی خشکسین کے اس کے اعضائے بدن ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ انہی کندھوں نے سینے کو چھیرا تو سینے نے منہ کو کرٹھوڑی اور جڑوں سے جھگڑا شروع کر دیا۔ آنکھیں گالوں کو دھمکیاں دیتی تھیں۔ ہاتھ چلتے چلتے کولہوں کو جھکی کی دے جاتے تھے تو کولہے پیچھے سے پہلو نکال کر سامنے کے سارے جسم سے لڑائی مول لے لیتے تھے۔ گوماں خود تو خاموش رہتی مگر اس کے جسم کی اسمبلی میں ہر وقت ایک ہنگامہ سا بپا رہتا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے سارے اعضائے بدن حزب مخالف کے ارکان ہوں اور وقت بے وقت ہل بازی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہوں۔ میرا خیال ہے درانی کو بھی اس بولنے والے بدن میں یہی خوبی نظر آئی اور نہ گوماں میں ایسی تو کوئی بات نہ تھی کہ ایک سمجھدار، پڑھا لکھا، نفیس مزاج، صاحب سر کار اور ملک انڈیا اس سے شادی کرالیتا۔

میرا اندازہ ہے کہ اس کا آئی کیو تو بالکل معمولی تھا لیکن اس کا بدن ایک مافوق الفطرت جزیرہ تھا جہاں دیو مائیں دیویاں اور دیوتا قیام پذیر تھے۔ گوماں کے اسرار پہلے نہ کھلے تھے، اب ذرا سے نزدیک ہو جانے کی وجہ سے اس کا کچھ ہر سوال کا حیرت انگیز جواب دے رہا تھا۔

میں تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھا، پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ایکسپریس ہوٹل کی چڑھائی چڑھنے لگا۔

ایسے واقعات پر انسان سوائے سوچنے کے اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ حادثہ آپ کو مار پیٹ کر، ان ذکر اور ذلیل و خوار

کرنے کے بعد بڑے آرام سے سامنے کی کرسی پر بیٹھ کر مونچھ مروڑنے لگتا ہے اور آپ اس کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھائے بغیر صرف سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں کافی مشکل چڑھائی چڑھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ظہور پذیر ہوا۔ کس نے درانی سے کہا کہ اٹھو اور گاؤں جا کر گوماں کو بلاؤ۔ بلالانے کے بعد اس سے نکاح پڑھوا لو۔ نکاح پڑھوانے سے پہلے گوماں کو منانا اور راضی کرنا ہمارا ذمہ۔ گوماں کو نئے حالات میں فٹ ان کرنا حالات کے ذمے اور تم کو خوش اسلوبی کے ساتھ اس نئی صورتحال سے گزارنے کے لیے تمہارے خوش آئند اور خوشگوار ماحول کا حسن کارکردگی۔

میں نے ریڈیو نشین پہنچ کر مفتی کو یہ خوفناک، ولد و ز اور جانکاہ خبر سنائی تو وہ مزے سے بیٹھا پان چباتا اور پڑیا بتاتا رہا۔ مجھے ذرا سا گھبرایا اور کافی سارا شپٹا یاد دیکھ کر اس نے کہا "یہ ایسے ہی ہوتا ہے جن میرے! اور اسی طرح سے ہوتا ہے۔ اس میں برکت ہے۔ مرد بڑا گرم طبیعت ہوتا ہے۔ اس کو یہی کچھ کرنا چاہیے۔ اس میں حیرانی کی کیا بات ہے!"

میں نے کہا "غضب خدا کا۔ تلی کو چھوڑ کر گوماں سے شادی کرنا، کوئی حد تو ہونی چاہیے۔"

مفتی جی نے اپنی آنکھیں پوری کھول کر کہا "بھائی میرے تلی اور گوماں شواں ایک ہی عورت کے مختلف نام ہیں۔ مرد کو عورت درکار ہوتی ہے نام نہیں۔ تم دیکھنا یہ گوماں کے عشق میں بھی ویسے ہی غرق ہو جائے گا، جیسے تلی کے عشق میں لگا ہے۔"

"سے ہے مفتی" میں نے چیخ کر کہا "ابھی سے ہے اور اس سے زیادہ ہے۔ تلی تو اس کو یاد بھی نہیں، وہ تو گوماں کے گرد بھیمیری بن کر چر رہا ہے۔"

"شاہاں! شاہاں!!" مفتی نے خوش ہو کر کہا۔ "اس کو ایسے ہی ہونا چاہیے۔ ٹھیک جا رہا ہے، راست قدم، سیدھے سبھاؤ۔"

آپ کو یاد ہوگا کہ درانی کی کمپنی نے کراچی کے ساحل پر ایک بحری جہاز میں ریسپشن کا بندوبست کیا تھا اور مہمانوں میں سوائے گورنر سندھ کے اور کوئی دیسی مہمان نہیں تھا اور اس ریسپشن کی وجہ سے درانی اور تلی میں طلاق ہو گئی تھی! اب کے پھر اس قسم کی ضیافت تھی لیکن جہاز منوڑہ کے جزیرہ پر کھڑا تھا۔ مہمانوں کے لانے لے جانے کے لیے خصوصی کشتیوں کا انتظام کیا گیا تھا اور ہر کشتی کے ساتھ باوردی گائیڈ چلتے تھے۔ اب کی بار پھر اس ریسپشن میں کوئی دیسی مہمان نہیں تھا، سوائے گورنر سندھ، ان کی بیگم اور میری ذات کے۔ میں اتفاق سے کراچی میں تھا اور درانی مجھے زبردستی اس ریسپشن میں گھسیٹ لے گیا تھا حالانکہ اس میں شمولیت کے لیے میرے پاس مناسب لباس بھی نہیں تھا۔

تقریباً سارے مغربی ملکوں کے سفیران کی بیگمات، ان کی جوان لڑکیاں اور لڑکے۔ ولایتی فرموں کے گورے سٹرائیڈ مسز اور ان کے جوان بچے اور بہت سے امریکی فوجی جو کسی مشن پر کراچی آئے ہوئے تھے، اس دعوت میں مدعو تھے۔ جو گائیڈ مجھے منوڑہ لے جانے پر مامور تھا، وہ ایک سمارٹ سی موٹر بوٹ لیے کراچی کے ساحل پر الگ سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے سیٹ پر بٹھا کر وہ اسی طرح باادب کھڑا ہوا اور ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔

نہ لوگوں سے کیا کام؟“

ہم دونوں عرش کے ایک ایسے کونے میں جا کر بیٹھ گئے جہاں اندھیرا تھا اور روشنی سے آنے والے کو خاص پتہ نہیں پڑتا تھا کہ ادھر کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ کہنے لگی ”آپ کبھی یقین کر سکتے تھے کہ میری اور درانی کی شادی ہو جائے گی۔“

میں نے کہا ”شادی تو ایک طرف گویاں میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم درانی پر چھاپہ مارو گی اور اسے اپنے بیٹے کے لیے بیچ کر لو گی۔“

کہنے لگی ”اس میں چھاپے چھوپے کی کوئی بات نہیں بھائی جان، ان کو کسی ایسی بیوی کی تلاش تھی جو گھر گرہن ستن سا دھوا دھوا کر ایک کونے میں بیٹھ کر خاندان کی آرتی اتارتی ہو۔“

”اور اس معاملے میں تم سے بہتر اور کون لڑکی ہو سکتی تھی۔“ میں نے بات کاٹ کر کہا۔ ”تم گاؤں کے لوگوں کا

کہنے لگی ”جیب نے میری ماں سے بات کی تو وہ جھٹ راضی ہوئی اس سے اچھی پروپوزیشن اور کیا ہو سکتی تھی۔
ماں کی قولابی نکل رہی تھی..... اماں اور داراں تو دل و جان سے مان گئیں لیکن میں اڑ گئی۔“

میں نے کہا ”تمہارے اندر ایک ضدی بدھیا موجود ہے۔ آگے کو کھینچو تو وہیں کھڑی کھڑی کھینچ کے مر جائے گی۔ آگے قدم نہیں بڑھائے گی۔“

کہنے لگی ”ٹھیک ہے میں ضدی بھی ہوں اور اڑیل بھی اور جو بات مجھے پسند نہ آئے، اسے کسی بھی صورت میں نہ لیں ورنہ یکن نہ پروں پوزن مجھے بالکل ہی عجیب لگتا تھا۔“

میں نے کہا ”تو چاہتی تھی میری شادی کمالے کو جس سے ہو جائے اور تو اس کے بچپن کا منہ دھلاتے دھلاتے اس کو کوچ کر جائے یا حیرانیاہ بیٹھنے قضا کی کے بیکار کے سے ہو جائے اور وہ تجھے گھر چھوڑ کر آوارہ لڑکوں کے ساتھ رہے۔“

کہنے لگی ”اگر میری کمالے گوجر سے شادی ہو جاتی تو میں نے اس کے دو بچے پیدا کر کے اودھل جانا تھا اور لے والوں نے مجھے سرگودھا جا کر بیچ دینا تھا۔ وہاں سے میں نے ایک بچہ اور لے کر واپس اپنے گاؤں بھاگ آنا تھا لے گوجر کے گھر اس کی دوسری بیوی کے ساتھ رہنا شروع کر دینا تھا۔ کمالے نے مجھے مارنا تھا، کوٹنا تھا۔ بھاگ جانے سے دیے تھے اور مجھے صرف ایک وقت کی روٹی دینی تھی۔ ایسے مشکل وقت میں میں نے کمالے کے لیے ایک بیٹی اور ملا کر پیدا کرنا تھا۔ اب میں یہاں بیٹھی ہوں۔ عرشہ جہاز پر مسز درانی، چاؤ چو غلجی۔“

میں نے کہا، "تو پہلے بھی اس قسم کی باتیں کرتی تھی یا اب اس کلچر نے تیرا منہ کھول دیا ہے؟"

کہنے لگی، "باتیں تو میں پہلے بھی اسی قسم کی کیا کرتی تھی لیکن اس وقت کوئی میری سنتا نہیں تھا۔ اب میں صاحب ہوں۔ ایک پریزیڈنٹ کی مالک ہوں۔ ایک پوش خاتون خانہ اور ایک کامیاب مجلسی عورت ہوں، اس لیے سب میری بات سے سنتے ہیں اور سر جھکا کر رہتے ہیں۔"

جب میں منورہ میں کھڑے جہاز کے گیگ وے کی میز حیاں چڑھتا اوپر پہنچا تو عرش پر عین سامنے درانی گوماں کھڑے تھے۔ درانی نے ٹیل کوٹ اور دھاری دھار چٹلون پہن رکھی تھی اور ان لوگوں کے درمیان گورا صاحب بھی کھڑے تھے۔ گوماں البتہ اپنے ہلکے سلو نے بلکہ بہت ہی ہلکے سلو نے رنگ کے ساتھ اس کا بازو تھامے کھڑی تھی۔ اس نے ٹخنوں سے اونچی ایک ٹائٹ جینز پہنی ہوئی تھی اور اوپر لال کالر والے پوکا چمپر کو ناف سے اٹھا کر پھولدار گانٹھ دے کر باندھا ہوا تھا۔ اس کی بہت ہی چھوٹی سی کمر میں نشے میں ڈوبی ہوئی دھبی ہر حرکت کے ساتھ ارنگی سی دکھائی دیتی تھی۔

لوہاں نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے میرا بازو زور سے دبایا اور کہنے لگی ”بھائی جان ہاؤ ڈو آئی کک؟“
میں نے حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنا بایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا ”کارڈ جنس گوماں! کارڈ جنس“
اس نے کہا ”تھینک یو وری میچ ان ڈیڈ..... یو آر وری کانسٹیڈ“

اس کے بعد جرمنی کا سفیر اور اس کے بیوی بچ آگئے۔ گوماں نے ان کو پورے ڈیڑھ گھنٹے کے ساتھ رہا کر دیا اور تھوڑی دور ان کے ساتھ چل کر انہیں ہال کا راستہ دکھا آئی۔

پھر کسی اور ملک کا سفیر اور اس کا کنبہ آ گیا۔ سفیر کی بیگم شاید پہلے سے گوماں کی واقف تھیں۔ انہوں نے اسے
ی گوماں کے نازک نازک گالوں پر دو بڑے بڑے دئے اور جہاز کی بتیاں دیکھ کر کہنے لگیں۔ ”یہ چراغاں بھی خوب
ہے لیکن اس وقت تمہاری ذات کی جوت سارے ماحول پر چھائی ہوئی ہے..... یلوک مارو بس!“

کوماں نے ایک بہت ہی ریفا سنڈیہرو نسکی طرح مسز ایسیڈر کا شکریہ ادا کیا اور انہیں ساتھ لے کر ہال کے فرش پر لے گئی۔۔۔۔۔ واپسی پر میں نے اسے کہا ”تم اپنا کام کرو، میں جا کر اپنی سیٹ تلاش کرتا ہوں۔ پھر تم فارغ ہو جاؤ گی۔“
”خیر کرمپ کریں گے۔“

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ”نہیں بھائی جان، آپ کو ابھی نہیں ٹھہرنا پڑے گا اور اچھے میزبان کی طرح
مرے ساتھ ڈیوٹی دینی پڑے گی۔“

میں نے کہا ”دروانی جو تمہارے ساتھ ہے۔“
 کہے گی ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن دروانی کبھی کبھی بے وجہ فحش پڑتا ہے اور پھر کافی دیر تک ہنستا رہتا ہے۔ آپ کے
 نے سے ذرا تینلس رکھے گا۔“ اتنے میں مہمانوں کا ایک اور گروہ آ گیا جس سے میرا تعارف کراتے ہوئے گویاں نے کہا
 یہ میرے بڑے بھائی ہیں اور ریڈیو کے ایک بہت بڑے آفیسر اور آرٹسٹ ہیں۔“

ان سب نے بڑی مگر جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملائے کہ اس زمانے میں ریڈیو آرٹس، عزت اور وقار کی
نی تھی اور لوگ ریڈیو نائٹسوں سے ملنے کے لیے تڑپتے رہتے تھے۔

پھر جب سب مہمان آچکے اور مہمانوں کو لانے والی موٹر بوٹیں جہاز کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئیں تو بچے نے کی محفل آراستہ ہوئی۔ اس کی مہمان نوازی کے فرائض اکیلے درانی اور کمپنی کے ڈائریکٹروں کے ذمہ تھے۔

گواہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا ”آؤ بھائی جان، ہم چل کر ایک کونے میں بیٹھتے ہیں اور دکھ سکھ کہتے ہیں،“

میں نے کہا "گوماں تو نے ایسی اچھی انگریزی کہاں سے سیکھی۔ کوئی ٹیوشن رکھی، کسی مدرسے میں گئی۔ کوئی کلاس کورس کیا یا ولایت رہ کر پریکٹس کی؟"

اس نے کہا "ان سب راستوں میں سے میں نے کوئی بھی اختیار نہیں کیا۔ پہلے پہل مجھے بہت تکلیف تھی۔ انگریزی تو انگریزی مجھے اردو سمجھنے میں بھی خاصی دقت ہوتی تھی لیکن میں نے اپنی یہ دقت کسی پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ آدی چپ رہے، بالکل چپ رہے تو اس کے عیب ظاہر نہیں ہو پاتے۔ میں نے بھی جب کچھ سیکھنا ہوتا ہے تو اس کے آگے آگے نکلیں پوری کھول دیتی ہوں۔ سارا علم سانپ کی طرح بیل کے اندر چلا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن ایسی انگریزی جیسی تم بولتی ہو، ایسی تو درانی بھی نہیں بول سکتا۔" کہنے لگی "میں نے غیر ملکی عورتوں کے ساتھ انگریزی بول کر اور انگلش فلمیں دیکھ کر اپنی سپون انگلش مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر لیا۔ اس کے بعد میں نے لنگو افون کا پورا سیٹ خریدا اور اسے سن کر اپنے لفظ اور اپنے لہجے مطلوبہ تبدیلی کی۔ جیسا کہ کتابی اور دفتری انگریزی بولتا ہے، روزمرہ سے واقف نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اور پڑھنا لکھنا؟..... وہ؟" کہنے لگی "پڑھنے لکھنے کی میں بڑی چور ہوں۔ تھوڑا تھوڑا پڑھ تو لیتی ہوں اور پڑھ کر بخوبی سمجھ بھی لیتی ہوں۔ مجھے لکھنا نہیں آتا۔ سوائے اپنے دستخطوں کے اور کچھ نہیں لکھ سکتی۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑی شرمناک بات ہے۔ تم جیسی ذہین و فطین اور اونچے طبقے کی عورت کو انگریزی لکھنا آئے، بڑے شرم کی بات ہے۔" کہنے لگی "میں آنکھ کے بجائے کان سے سیکھتی ہوں۔ دیکھ کر پڑھنے کے مقابلے میں سن کر جلدی سیکھتی ہوں۔ آج کل میں نے فرنگ کا لنگو افون منگوا دیا ہوا ہے۔ ابتدائی کورس تو کر لیا ہے، اب اگلے اور اونچے درجے کے کورس

سنڈی کر رہی ہوں، وہ بھی ختم ہونے والا ہے۔..... فرانسیسی عورتوں سے ان کی زبان میں گفتگو کرتی ہوں اور مجھ پر کوئی سٹریس نہیں پڑتا۔ البتہ ان کے لٹریچر سے پورے طور پر واقف نہیں ہوں۔ وہاں مجھے ڈک جانا پڑتا ہے لیکن فیشن، جمیئر فلم، لٹریچر، خوشبوئیات اور فرنگ کیس کی تفصیلات سے پورے طور پر آگاہ ہوں۔..... اصل میں لٹریچر مجھے پسند ہی نہیں، ایسے ہی مجھے جھوٹی سی باتیں کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "جب تم نے اتنا کمال حاصل کر لیا ہے تو لکھنے اور پڑھنے پر کیوں توجہ نہیں دیتی ہو۔ کیوں اس پر حاصل نہیں کرتی ہو۔"

میں نے کہا "اس کا کوئی فائدہ نہیں بھائی جان۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد علم ایک مرتبہ پھر سپون ہو گیا ہے جو شخص اچھی انگریزی بول سکتا ہے، وہ اچھی انگریزی لکھنے والے کے مقابلے میں زیادہ عزت، زیادہ دولت، زیادہ شہرت کما تا ہے۔ یہ دور بول بچپن کا دور ہے اور اس میں گفتگو کرنے والے کا درجہ سب سے اونچا مقرر کر دیا گیا ہے۔ آپ کبھی یو این او کی تقریریں نہیں سنیں۔ بی بی سی ریڈیو پر نامور ٹاکر ز کو نہیں سنا۔ نامی گرامی پروفیسروں کے لیکچر نہیں

سارے گفتگو کے زور پر مشہور اور نامور ہوتے ہیں۔ اس لیے میں نے بھی ساری توجہ سپون کر دی ہے۔" اب میرے پاس اس کے علاوہ اور کیا رہ گیا تھا کہ میں اس کی دانش اور کمال فن کی داد دوں اور اس کی تحقیق کے آگے سر جھکا دوں۔

میں نے کہا "خالے اپنا نام تو بدل لینا تھا..... کیا دوسرے سارے معزز نام ختم ہو گئے تھے جو تو نے اس کجبت کر کے کوٹھلے لگائے رکھا۔" کہنے لگی "پہلے پہل تو میں نے اپنا نام نو شاہ رکھا تھا کیونکہ یہ ایک کرل کی بیٹی کا نام تھا اور وہ مجھے لڑکی بہت ہی پسند تھی۔ اس نام سے میں نے ایک بینک اکاؤنٹ بھی کھلوا دیا اور اس کے دستخطوں کی پریکٹس بھی کی لیکن جب میں نے پورے مرد اور عورتوں کے نام اپنے پرانے نام کے قریب تر دیکھے تو میں نے ارادہ بدل لیا۔"

میں نے کہا "میں سمجھا نہیں تھا ہمارا مطلب۔" بولی "فرانسیسی نام تھے، دیسیا، شرما، گویا، للیاں تو میں بھی اپنے پرانے نام "گوماں" پر واپس آ گئی۔ میں نے فرانسیسی بھوں کے ساتھ جی او ایم اے این فی لکھتی ہوں Gomant..... فرانسیسی میں آخری ٹی نہیں بولتی۔" پہلے تو میں پھر بھی اس سے کسی موضوع پر بات کر سکتا تھا لیکن "گوماں" کے ساؤنڈ ایفیکٹ کے بعد میری آواز

پھر وہ مجھ سے میری نوکری، میری پوزیشن اور میری شادی کے بارے میں پوچھتی رہی کہ کب تک ارادہ ہے اور اس کے ساتھ ارادہ ہے تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میری ایک کلاس فیلو ہے۔ بڑی اچھی بڑی نیک، شریف اور اعلیٰ اسی کے ساتھ کرنے کا ارادہ ہے تو اس نے بڑی محبت کے ساتھ کہا "ایک نظر مجھے دکھا دیجئے گا اور ایک مرتبہ ملا دیجئے گا۔" پھر میں جو کہوں اس پر غل سمجھنے لگا..... اگر آپ کی مرضی ہو تو۔"

میں نے کہا "مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں تو سب کے حکم کا غلام ہوں....." لیکن یہ فقرہ ابھی میرے منہ ہی سے نکلا تھا کہ ایک امریکی میجر نے ہمارے قریب آ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اپنے ساتھ اٹھا کر لے گیا۔

ساٹھ عرصے پر اب ڈانس شروع ہو گیا تھا اور پانچ چھ جوڑے میدان میں اتر آئے تھے۔ امریکی میجر نے پہلے ڈانس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ڈانس کی صحن پر کھلتے اور بند ہوتے قدموں کا ناچ کیا، پھر اس نے گوماں کو چھوڑ کر اور پیچھے ہٹ کر مل کر ڈانس کا سا پیٹرا بنایا تو گوماں نے چنگلی تالی ایک ساتھ بجا کر اپنی گرگاہ کی ایڈی چوبلی فرش پر ٹپکائی اور تالی کی آواز بھر پور آدھ ہو گئی۔ میجر بے وقوف نے اپنی شجی میں ڈانس تو شروع کر لیا لیکن گوماں کے سامنے اس کے ناچ کی گنگنی بندھ گئی۔ گوماں بنگلی کی سی تیزی کے ساتھ یہاں وہاں سیدھی ٹیڑھی کلاک وائر اینٹی کلاک وائر کچھ عجیب انداز سے بک بکھیریاں لے رہی تھی اور اسی کی ان بدنی لہروں میں چنگلی اور تالی کی ملی جلی صدا تسلسل کے ساتھ آ رہی تھی۔ وہ جو ڈانس کا سسٹمٹ بجا کر جیسی عورتیں ناچا کرتی ہیں، وہی کمال گوماں دکھا رہی تھی۔ گوماں کا لباس خاندہ بدوش عورتوں کے بالکل مختلف تھا لیکن اس کے بدن کا آہنگ اور وزن وہی تھا۔ امریکی میجر نے غل ہو کر جب اس کے اعزاز میں تالی

کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ دو بڑے شرابی ایک دوسرے سے کمریں جوڑ کر اور کندھوں کے اوپر ہاتھ پکڑ کر ناچنے لگے اور اچھا ناچے۔ دونوں ہی کسی یورپی ملکوں کے سفیر تھے۔

جب آکر کھڑے بیٹ کا آخری ٹھونکا مار کر جن بند کی اور گوماں اور درانی نے سر جھکا کر سب کو سلام کیا تو نا کام کیلکی والوں نے گوماں سے اس رقص کے بنیادی اصول کاراز پوچھا تو گوماں نے لڑکے کے ہاتھ ادا کر بتایا کہ تم کو ملٹی بند کر کے اپنے مضبوط انگوٹھوں کو کھڑا رکھنا ہے۔ بالکل تان کر اور لڑکی کو ان کھڑے انگوٹھوں کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر پراپنے اپنے بوجھ پیچھے پھینکنے ہوتے ہیں۔ تم لوگ تو ایک دوسرے کی کلائیاں تمام کر کھڑے ہو گئے ہو، اس طرح سے چکر کیسے لو گے۔

پھر جب انہوں نے اس ڈانس کا نام پوچھا تو گوماں نے مانگیر وفون پر آ کر کہا "اس ڈانس کا نام تو "کیلکی" ہے لیکن یہ مغلیہ بادشاہوں کی اختراع ہے۔ شہنشاہ جہانگیر نے اپنے قیام لاہور کے زمانے میں گھومتے ہوئے فواروں کو دیکھ کر حکم دیا تھا کہ اس طرح کا ایک ناچ تشکیل دیا جائے۔ جو دربار سے ہٹ کر باغ میں مرتب کیا جائے اور ناچنے والے فواروں کے درمیان، فواروں سے الٹ گھوم کر اپنے کمال فن کا مظاہرہ کریں۔ اس طرح یہ کیلکی ڈانس لاہور کے شاہی قلعے کے فواروں کے درمیان وجود میں آیا اور اس کے مختصر ناصربھگت تھے۔"

سب نے اپنی اپنی دائریاں نکال کر شاہی قلعہ لاہور، شہنشاہ جہانگیر، کیلکی ڈانس اور ناصربھگت کے نام محفوظ کر لیے۔ میں، گوماں کی ایسی جامع، پر تاثیر، تفصیلی اور رجسٹر کا پلندہ تعارفی تقریر پر انگشت بندناں رہ گیا اور دل و جان سے اقرار کر گیا کہ واقعی سچو کن ورڈ کے آگے اور کسی چیز کا جادو نہیں چل سکتا۔

جب ہمیں مری میں شیشن چلائے ایک طویل مدت گزر گئی تو فیصلہ کیا گیا کہ راولپنڈی میں ریڈیو پاکستان کا ایک نیا اور طاقتور شیشن قائم کیا جائے اور اس کے قریب ہی دوسری بلڈنگ میں آزاد کشمیر ریڈیو کو منتقل کر دیا جائے۔

ہمیں نئے ریڈیو شیشن پر کام کرتے کوئی تین مہینے گزرے تھے کہ مجھے درانی کا فون آیا کہ میں ایک مرتبہ پھر راولپنڈی آ گیا ہوں اور تمہیں دیکھنے کو ترس رہا ہوں۔ گھوٹو ابھی آ کر ساتھ لے جاؤں۔ کچھ دیر گپ کریں گے۔ شام کا کھانا ساتھ کھائیں گے اور پھر تم جہاں کہو گے، جہیں چھوڑ دوں گا۔

مجھے پانچ بج کا ایک آکسٹم بھگتا تھا لیکن استاد یوسف ظفر کے ہوتے ہوئے کسی بات کی فکر نہ تھی۔ اس نے ہلکار آکھیں شیشوں کے پیچھے سے گھماتے ہوئے کہا "فکر نہیں بھائی جی، سب ٹھیک ہو جائے گا، تم جاؤ اپنا کام کرو۔" میں نے درانی کو فون کر دیا کہ میں فارغ ہوں، ابھی آ جاؤ۔ وہ ایسا عتاں کینڈہ آیا کہ مجھے اس کی تصنیر برڈ کی آواز پشاور روڈ سے سنائی دی اور وہ چشم زدن میں میرے پاس پہنچ گیا۔

موٹر سے نہیں نکلا، اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ میں نے بیٹھے ہی پوچھا "بھائی گوماں نہیں آئی؟" کہنے لگا "اس کی طبیعت ناساز تھی، مگر پر ہی رہ گئی۔"

میں نے شرارتاً کہا "اچھا تو گویا طبیعت ناساز ہو گئی ہے بالآخر!"

بجائی تو سارا عرش تالیوں کی گونج سے تھرا اٹھا۔ گوماں اپنا ناچ ختم کر کے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی پھر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا "بہت زیادہ تھک گئی ہو گوماں؟" تو اس نے ہنس کر کہا "تھکنا کیسا بھائی جان، یہ تو ہمارا روز کا کام ہے۔ محفلیں سجانا اور محفلیں تھرانا، یہ ہماری زندگی کا ایک حصہ ہے۔"

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ چمپرے بدن کا ایک خوبصورت سانو جوان ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ گوماں نے بڑی شوقی کے ساتھ اسے "ہائے" کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ نو جوان سے میرا تعارف کراتے ہوئے گوماں نے انگریزی میں کہا "میرے بھائی سے ملے۔ ریڈیو کے ڈرامہ نگار اور مانگیر وفون کے میزبان۔ اور یہ ہے ان گرامن جو نیئر، ڈی جی ایس کی کھڑکی کا تھرو سیکرڈری، دو بیٹے کی چھٹی پروٹن واپس جا رہا ہے۔"

ہم دونوں نے گرم جوشی کے ساتھ ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور وہی گوماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بال رنگ میں لے گیا۔ پھر ان دونوں نے جو تباہی مچائی، اور جس جوش کے ساتھ آ کر کھڑے ان کی سنگت کی، اس سے سارے جہاز پر ایک نئی طرز کی روشنی اتر آئی۔ مرد اور عورتیں بار بار تابی بجانے کے بعد اب مسلسل تابی پر اتر آئے تھے اور سلسلہ ختم ہوتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ نہ تابی نہ رقص، نہ ہرے نہ انکور۔! میں نے دیکھا سمندر پہلے کے مقابلے میں کچھ اور ہو گیا تھا اور کھاڑی منوڑہ سے بہت دور چلا گیا تھا۔

اس مرتبہ جب گوماں واپس آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھی تو واقعی تھکی ہوئی تھی۔ اس کی سانس اور دھڑکن دونوں تیز تھیں اور جو ان گرامن تھا، وہ اپنی سیٹ کے پاس کھڑا اپنے چہرے اور گردن سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔

میں نے کہا "بس اب اور کسی کے ساتھ نہیں جانا تمہاری تو سانس اکھڑ گئی ہے۔" مسکرا کر کہنے لگی "یہ کیسے ہو سکتا ہے بھائی جان۔ کوئی ہاتھ بڑھا کر ڈانس کے لیے کہے تو اٹھنا ہی پڑتا ہے یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آج میرا گھبراہٹ ہے اس لیے گانے نہیں سکتا۔ یہاں تو اٹھنا ہی پڑتا ہے۔"

اور اس کے بعد گوماں کا جو نیا عاشق اس کی طرف دونوں بازو پھیلائے ہوئے بڑھا وہ درانی تھا۔ قریب آ کر میں نے کہا "اوئے گدھے، بھابی بالکل تھک چکی ہے۔ ذرا ٹھہر کے آتا۔" اس نے کہا "کوئی پروا نہیں۔ ناچنا گوماں کے لیے جنت کی سیر ہے۔ ہم تو اس کی ایک ایک موڈ پر اپنی جانیں بچا کر کر دیتے ہیں۔" وہ نسنے میں دھت ہو رہا تھا اور اس کی زبان گول ہو کر توتے جیسی ہو گئی تھی۔

گوماں اٹھتے پر چٹکن والے بغیر مسکراتی ہوئی ابھی اور اپنے خاندان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر پھر میدان میں چلی گئی۔ وہاں ان دونوں نے گاؤں کی الہڑنیاہوں کی طرح اپنے اپنے بازو کر اس کے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے۔ سر بالکل پیچھے پیچھے۔ پاؤں ذرا سے کھولے اور کیلکی ڈانس شروع کر دیا۔ ان کے اشارے پاتے ہی آکسٹرنے کیلکی کلیر دی۔ پگ میرے ویردی، دو پند بھر جانی دا۔ پھٹے منہ جوانی دا۔

بجانا شروع کر دیا۔ اس عجیب و غریب بھیمیری ڈانس کا دلائی لوگوں پر کچھ عجیب سا اثر ہوا۔ سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کبھی آ کر کھڑا کی جنم کے ساتھ تالیاں بجانے لگے۔ ایک دو نے ایک دوسرے کی کلائیاں پکڑ کر گھومناں لینے

کہنے لگا "وہی نہیں، ایسے ہی فلو سا ہو گیا ہے، اس لیے گھر پر ہی رہ گئی۔ تم ملو گے تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

پھر وہ میرے کام، نئے شیشن کی نئی ذمہ داریوں اور پروگرام "بوٹ پٹی چکا کے" کے بارے میں پوچھتا رہا جو

ان دنوں فوج کے جوانوں میں بہت مقبول تھا اور جس میں صوبیدار ضابطے خاں کا رول میں ادا کرتا تھا۔ ہم باتیں کرتے، گپ لڑاتے اور صوبیدار ضابطے خاں کی مخصوص فوجی زبان میں باتیں کرتے، اس کی کمپنی کی اسی کوشی میں پہنچ گئے جہاں وہ دو سال پہلے رہا کرتا تھا۔ دراصل یہ کوشی اس کی کمپنی کا مہمان خانہ تھی اور ہر طرح سے درانی کے چارج میں تھی۔

ابھی ہم ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھے ہی تھے کہ پردے کو حرکت ہوئی اور ایک پوربن آیا یا چاہے کی ٹرائی لے کر اندر آگئی۔ درانی نے میرے لیے چائے بنائی، اپنے لیے کافی گھولی اور میرے استفسار سے پہلے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا کہ تمہاری بھابی کو اطلاع دیتا ہوں اور بلا کر لاتا ہوں۔

وہ اٹھ کر اندر چلا گیا میں ان دونوں کا انتظار کرنے لگا۔ جب اسے اندر گئے پانچ چھ منٹ ہو گئے تو میں نے اپنی پیالی اٹھا کر چائے پینا شروع کر دی۔ تھی تو بری بات لیکن چائے تیزی سے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

درانی جلدی جلدی قدم اٹھاتا کرے میں داخل ہوا اور میرے پاس آ کر جھک کے بولا "تمہاری بھابی بھاگ گئی!"

میں نے کہا "کیا بکواس کرتے ہو اور کسے بہکاتے ہو، کوئی اور مذاق کرو۔"

وہ آرام سے اپنی کرسی پر بیٹھ کر پھر کافی گھونٹنے لگا اور بخجیدگی سے بولا۔ "وہ حرام زادی، سوڑ کی بچی، پچا پچا کئی آج نہیں، ایک سال، ایک مہینہ اور گیارہ دن پہلے مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔"

میں نے چیخ کر کہا "کیا کہتے ہو، کیا کہہ گئے ہو؟ تم ہوش میں تو ہو۔"

اس نے کہا "میری گوماں تمہاری بھابی، ہم سب کی آنکھ کا تارا ایک سال ایک مہینہ اور گیارہ دن پہلے مجھے دانا

مفارت دے گئی اور اس کی قبر کا بھی کوئی نشان باقی نہیں رہا۔"

میں نے کہا "مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا، نہ ہی تم نے اس واقعے کی اطلاع دی۔ نہ کسی نے مجھ سے ذکر کیا۔"

اس نے کافی گھونٹ کر کرسی کی پشت سے ڈھونڈ لگی اور دونوں ہاتھ کرسی کی پشت سے گزرا کر نیم دراز ہو گیا۔

میری پیالی پڑی کی پڑی کی رہ گئی۔

کہنے لگا "اس نے مجھ سے طلاق لے لی اور گلے پراٹھوٹھا رکھ کر لی۔"

میں نے کہا "یہ ڈراما اب سوچا ہے یا مجھے لینے آئے تھے، اس وقت کا سوچا ہوا ہے!"

کہنے لگا "میں مذاق نہیں کرتا، سچ کہہ رہا ہوں اور تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ کبھی کسی مخلص، سادہ لوح، پاکباز اور

دو شیرہ سے شادی نہ کرنا، یہ اندر سے بالکل حرام زادیاں ہوتی ہیں، طوائفوں سے بھی بڑی ناگئیں۔ تم کو گوماں کی مثل

معلوم ہے ناں؟" میں نے کہا "بالکل معلوم ہے!"

"کس طرح میں نے اس گندی موری کے کیزے کو اپنی چٹکی میں پکڑ کر باہر نکالا۔ کس طرح اس کو ٹشو پیپر میں

رکھ کر سکھایا۔ کس طرح اس پر یوڈی کلون کی سپرے کی اور کس اونچے پیڈل پر اس کو رکھ کر اس کی پوجا کی۔ اور کروائی۔"

میں نے کہا "یہ تو سب ٹھیک ہے۔"

"اور پھر کس محنت اور توجہ کے ساتھ میں نے اس کی ماں اور داراں کی خدمت کی۔ پہلے ان کو گاؤں میں پکا

مکان بنا کر دیا پھر یہاں، پنڈی میں ان کی خواہش کے مطابق ایک کوشی تعمیر کروائی۔ وہ حرامزادیاں، اب بھی مزے سے

وہاں رہتی ہیں اور وہ چھوٹی حرامزادی سوڑ کی بچی مجھے چھوڑ چھاڑ کر فارغ ہو گئی ہے۔"

درانی یہ بات کرتے ہوئے ایک دم خاموش ہو گیا اور اس کی آنکھیں بھرا گئیں۔ جب میں نے اس سے یہ

پوچھا کہ وہ اس وقت ہے کہاں؟ تو اس نے گندی گالی دے کر کہا "میرے دوست بھی حرامزادے، اس کے ساتھ ملے

ہوئے تھے۔ انہیں میری بجائے ہر وقت اس کٹنی کی خوشنودی مطلوب تھی۔ اور میں صرف انہیں کو دوش نہیں دیتا، تم بھی ان

میں شامل تھے اور پوری طرح اور پکی طرح!"

میں نے بھی اسی طرح غصے میں آ کر ترقی بہ ترقی جواب دیا۔ "گدھے کے بچے ہم کو الزام دے رہے ہو اور

نہیں بدنام کر رہے ہو لیکن یہ بکواس نہیں کر سکتے کہ وہ اس وقت ہے کہاں؟"

کہنے لگا "مجھے کیا معلوم! میں کوئی اس کا ٹھیکیدار ہوں۔ دلال ہوں۔ ولا ہوں۔ میری طرف سے بھاڑ میں جائے

بانویں میں کرے، مجھے اس کی پروا نہیں۔ لیکن تم دیکھ لینا۔ اور میری بات یاد رکھنا اور اس کو اپنی ڈائری میں لکھ کر چھوڑ جانا

کیا اس کا انجام غیر ناک ہوگا اور وہ دردی ٹھوکریں کھا کر مرے گی اور کوئی اس کے منہ میں پانی ڈالنے والا نہیں ہوگا۔"

میں نے نرگس کر کہا "کتے کے بچے، بکواسی مینڈھے وہ اس وقت ہے کہاں؟"

کہنے لگا "میں کوئی اس کا پرائیویٹ سیکرٹری ہوں، اس کا تنخواہ دار ہوں یا اس کا قرض خواہ ہوں کہ مجھے اس کا

لوگ نہ معلوم ہو۔ مجھے کیا ضرورت ہے۔ مرے، دفع ہوئے، آگ لگے، جسم ہو کر رکھ بنے، مجھے کیا؟"

میں نے زچ ہو کر کہا "اچھا پھر نہیں چلتا ہوں اور اپنے طور پر معلوم کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اٹھا اور کرسی سے نکل

کر پلٹے لگا تو اس نے منہ پکا کر کہا "وہ جو ایک ڈچ نوجوان نہیں تھا، ماں کا یار، ڈچ انجینیئری کا تھرڈ سیکرٹری۔"

"وان گراسمان جونیئر۔" میں نے بات کاٹ کر کہا۔

"وہی وان جو ہے وان کجرتسان! وہی۔ چنے منہ والا گورا۔ اس سے شادی کر لی ہے تمہاری بھابی نے اور وہ

انوں بالینڈ چلے گئے ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے۔"

"ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے!" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اوئے ہمیشہ ہمیشہ ہی ہونا ناں۔ وہ یہاں اپنی انجینیئری سے استعفیٰ دے گیا وان کجرتسان اور گوماں اس سے

ٹھوڑی کر کے اس کے ملک چلی گئی۔ اب یا قسمت یا نصیب، کون آتا ہے اور کون جاتا ہے۔"

میں نے کہا "اور وہ کیا کرتا ہے وہاں وان؟ نوکری کے بغیر؟"

اس جوڑے کی نمایاں تصویریں چھپی ہیں۔ اطالوی اخباروں میں جرمن اور فرانسیسی اخباروں میں ہالینڈ اور انگلینڈ کے اخباروں میں اور بلجیم کے دو اخباروں نے تو اس پر خاص نمبر بھی شائع کیے ہیں۔

میں اس کی یہ بات سن کر سکتے میں آ گیا اور اس سے مزید کچھ نہ پوچھ سکا۔ خود ہی کہنے لگا۔ وہ بیلجیئم بڈ حائلورپ میں ایلوٹیم کا سب سے بڑا صنعتکار ہے۔ اس کے اپنے ملک کے علاوہ چین اور کانگو میں بھی کئی کارخانے ہیں۔ اس کے کارخانے کی ہنڈی چلتی ہے۔

میں نے کہا "اور گوماں اس کو کہاں ملی؟"

"گوماں اس کو کہیں نہیں ملی۔ وہ گوماں کو ملا۔ جب وان ایلوٹیم کے صنعتکاروں کی میٹنگ میں برسلز گیا تھا تو گوماں کو ساتھ لے گیا تھا۔ بابے نے اس تر پھرت چلت چڑیا کو دیکھا تو ہزار جان سے فریفتہ ہو گیا۔"

"وہ تو ہونا ہی تھا۔" میں نے کہا۔

"ادھر اس حرا مزادی نے بھی کافی ماری، تمہاری ہشیرہ نے۔" وہ غصے سے بولا۔ "اور دونوں کی انٹ میٹلٹی اس بڈھے بابے کے سامنے اس ڈچ چوڑے کی کیا حیثیت تھی۔ طلاق دینی پڑی! پھر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فلسفیانہ انداز میں کہا "بھائی جان زندگی اور چیز ہے اور ناچ ناچنا کچھ اور ہے۔ اگر رقص کرنے سے زندگیاں بن سکتیں تو سب سے کامیاب لوگ رقص اور طبلہ نواز ہوتے۔ اس نے ایک منٹ نہیں لگا یا، تمہاری ہشیرہ نے اور گاڑی بدل کے لوپ لائن والی ایکسپریس پکڑ لی۔"

"تو اب وہ برسلز میں ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

کہنے لگا "اور کہاں ہوگی مال زادی۔ برسلز میں رہتی ہے اور بابے بلجیم کے سارے کاروبار کی نگرانی کرتی ہے۔ تین ہزار کارکنوں میں اس بابے کے برنس کو کنٹرول کرنا، کاروبار کی اونچ نیچ دیکھنا۔ نئے کارٹرکٹ حاصل کرنا اور ہمعصر کارخانہ داروں سے تعلقات بنا کے رکھنا یہ سب آپ کی ہشیرہ کا کام ہے۔"

"اور بابا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی دفتر آتا ہے لیکن ایک صوفے پر نیم دراز ہو کر اونگھتا رہتا ہے۔ اس جہانگیر نے اپنی ساری سلطنت نور جہاں کے حوالے کر دی ہے۔ اب تو وہ اپنی محبوب کے حسن جہاں سوز کا نظارہ کرنے کے لیے دفتر جاتا ہے۔ اور اسے کوئی کام نہیں۔"

میں نے کہا "تم اسے ملے ہو؟"

"میری ہمتی ہے جوتی۔" اس نے غصے سے کڑک کر کہا "میں درانی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ کوئی اچھا۔

بد معاش یا چور بھکاری نہیں جو اس کے حضور گھسٹھیا نے جاؤں۔ لعنت!"

میں نے پوچھا یہ ساری باتیں ایسی تفصیل کے ساتھ تمہیں کیسے معلوم ہوئیں تو اس نے ہنس کر کہا "مجھے ہفتے کے ہفتے وان اس کے متعلق تفصیل سے لکھتا ہے اور اگر ممکن ہو تو اس کی ایک آدھ تصویر بھی بھیج دیتا ہے۔ وہ انٹرنیشنل کانفرنس

میں ایلوٹیم کے دوسرے نمائندوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔ ایک سیشن کی صدارت کر رہی ہے۔ ڈنر پر ڈانس کر رہی ہے۔ غیر ملکی ساتھیوں کو اپنی اور مضمین پر گلے شکستہ دکھا رہی ہے۔ پرس میں کیٹ واک پر فیشن شو دیکھ رہی ہے۔ لیکن میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ یہ ساری چیزیں میرے لیے ایک پرکاش کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ مجھے تو بس تجسس کے طور پر وان کے خطوں کا اظہار ہوتا ہے کہ اس سالے پر کیا گزر رہی ہے۔"

میں نے کہا "اس سالے پر کیا گزر رہی ہے؟"

کہنے لگا "اس کا برا حال ہے۔ کاروبار اس کا ختم ہو گیا ہے۔ ماں باپ سے علیحدہ ہو گیا۔ ایک میوزیم میں نوکر ہے۔ وہاں دن رات کام کر کے دو وقت کی روٹی چلاتا ہے۔ آہیں بھرتا ہے اور بچوں کو گیا ہے۔ میں نے تو اس کو لکھ دیا ہے کہ چہا بوو گے ویسا کاٹو گے۔ ہم درانی لوگ ہیں، دشمن کو معاف نہیں کرتے۔ لوگ ہماری تلوار ہی سے نہیں بیچتے، ہماری آہ سے بھی ادٹ میں ہو کر چلتے ہیں۔ اب بھگتا اور مزالو۔"

میں نے کہا "اگر وہ معافی مانگ کر تم سے رجوع کرے تو کیا کرو گے؟"

کہنے لگا "میں اس کو معاف تو کروں گا لیکن اسے یہاں آ کر رہنا پڑے گا۔ پاکستان۔"

میں نے کہا "بھائی وہ اتنا بڑا ڈھنڈورا اور ایسا عالمی کاروبار چھوڑ کر یہاں کیسے آ سکتی ہے۔ اس کے لیے مشکل ہوگی۔"

کہنے لگا "پھر میرے لیے بھی مشکل ہے کہ وہ وہاں رہے اور میں یہاں رہوں۔ یہ تو بے غیرتی کی بات ہے۔"

میں نے کہا "اور اگر وہ تم کو اپنے پاس بلا لے برسلز۔ پھر!"

کہنے لگا "برسلز میں میں کیا کروں گا۔ وہاں تو میرے پاس کوئی نوکری نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "نہیں بھائی میرے۔ اگر وہ تم کو اپنے کسی کارخانے میں کوئی اونچی پوزیشن دے دے کوئی جزل نمبری یا یا تو پھر کیا رہے؟"

کہنے لگا "یہ ٹھیک ہے۔ میں ہاتھ کی کر کے کھاؤں گا، کسی کے نکلاؤں پر نہیں پلوں گا۔ اس شرط پر مجھے تسلیم جانے میں کوئی انکار نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا دیکھو، کچھ سوچتے ہیں۔ کوئی کرتے ہیں چارہ۔"

کہنے لگا "تم اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہو؟ بغیر کسی مشکل کے بغیر کسی اڑچن کے، اوپیکیشن کے!"

میں نے کہا "یار حبیب اللہ خان، اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ بس کوشش فرض ہے!"

بولا "یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کے لیے بڑی کوشش کرنی پڑے گی۔"

میں نے کہا "تو پھر اللہ نے ہمت کس لیے دی ہوتی ہے۔ ایسی جگہوں پر ہی تو استعمال کی جاتی ہے۔"

وہ میری بات سن کر کافی مطمئن ہو گیا اور کہنے لگا "میں ایک ماہ پیشتر اپنی کمپنی کے کسی کام سے لندن گیا تھا۔ وہاں سے میں جہاز پکڑ کر دو دن برسلز بھی لگا آیا۔ اچھا شہر ہے اور کافی مہنتی لوگ ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر کوئی مشترکہ کاروبار شروع کیا جاسکتا لیکن میں نے زیادہ چھان چھنگ کر نہیں دیکھا۔ دوسرے روز میری روانگی سے پہلے اس نے

چارلی چپلن روم آیا اور دفتروں میں چھٹی ہو گئی۔ سرکاری طور پر نہیں، ملازموں کی من مرضی سے۔ اس کی آمد کی نہیں، پریس کانفرنس، فورویں حاضرین سے اس کا خطاب، ان سب مصروفیات کی رنگین فلمیں ہر سینما میں دکھائی گئیں۔ میں نے اور رام سنگھ تو مرنے بھی ان فلموں کو دیکھا اور چارلی چپلن کو، زندہ چارلی چپلن کو قریب سے دیکھنے کی حسرت دل میں لے کر خاموش ہو گئے۔ تو مر جی کو تو اس بات کا بہت ہی دکھ تھا کہ گھر میں آئی ہوئی گزشتہ تین روز کے بعد واپس جا رہی تھی اور ہم اس کے درشتوں سے محروم ہو گئے تھے۔

وینا سینا پر میرا ایک بار ایلیو مونز مکتب تھا۔ اس کے ساتھ بڑی آسانی کے ساتھ ادھار چل جاتا تھا اور کئی مرتبہ وہ جان بوجھ کر بھول بھی جاتا تھا کہ اس کو ہاتھیوں کی زندگی کے بارے میں جاننے کا بہت شوق تھا اور میں نے اس کو ہاتھیوں کی ہنسی زندگی کے بارے میں ایسی ایسی کہانیاں سنائی تھیں کہ اگر ہاتھیوں کو پتہ چل جاتا تو مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتے۔ ایلیو کا پی کے دو کپ منگو کے سامنے رکھ لیتا اور ہاتھیوں کے بارے میں پوچھتا چلا جاتا۔ اس کے اسٹنٹ میری موٹر کے خاص دور کرنے میں مصروف رہتے اور ایلیو ہمارے ہاتھیوں کے بارے میں گھٹنا چلا جاتا۔ میں کہتا، میرے والد کا ہاتھی بہت بڑا تھا ہو گیا ہے اور اب اس سے ٹھیک طرح سے چلا نہیں جاتا لیکن وہ یہ گوارا نہیں کرتا کہ اباجی اس کے بجائے میرے کسی بھائی کے ہاتھی پر یا میری بڑی آپا کی ہتھنی موٹی پر بیٹھنے کی کوشش کریں۔ اس سے برداشت نہیں ہوتا اور وہ سارے دن میں ایک طوفان مچا دیتا ہے۔

اس روز میں اپنی ”توپو لینو“ ایلیو سے آکھ ملانے بغیر اس کے اسٹنٹ کو دے کر وہاں سے کھسکا کہ میرے پاس اس روز ہاتھی کی کوئی مناسب کہانی نہیں تھی۔ میں نے کہا ”میں ولا برگیزے کا ایک لمبا چکر لگا کر دوڑھائی گھٹنے بعد واپس آؤں گا اور اپنی گاڑی بیلوں گا۔“

جب میں ولا برگیزے جانے سے پہلے ”وینا سینا“ سے گزرا کہ ایک نظر امیر اور کلکیل اور تن آسان لوگوں کو رہنمائیوں سے باہر مختصر کپڑوں میں دیکھتا جاؤں تو میں نے ایک چھوٹے سے مگر مضبوط جھوم کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ مرد بوڑھوں کے اس مفتون جھوم کے درمیان چارلی چپلن بیچاری کے عالم میں ایک خوفزدہ چوہے کی طرح بھاگ رہا تھا اور اس کا منہ توڑ کر باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا تھا۔

میں اپنے محبوب ترین ایکٹر کو اس حالت میں دیکھ کر برداشت نہ کر سکا اور ڈھڈ مار کر جھوم کے حلقے کے اندر پہنچ گیا۔ میں نے اپنی مضبوط ہاتھوں کا کھلا حلقہ بنا کر چارلی چپلن کو اس کے اندر لے لیا اور ہر شدت کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گیا۔ اپنے ایک حمایتی کو اس قدر قریب پا کر اسے تھوڑا سا حوصلہ ہوا اور اس نے گھسکیائی ہوئی آواز میں ”ہوئل ہوئل“ کہا اور اپنے ہوئل کی طرف اشارہ کیا۔

اس جھوم میں سے ایک تو مندانا لین جو ان چھڑپہ مار کر میرے پاس آ گیا اور اس نے میرا ہاتھ ایک طرف سے دھکا دیا۔ اب ہم دو ہو گئے اور جب دو ہوئے تو نہ صرف چارلی چپلن کو سہارا ہوا بلکہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے تقویت حاصل ہوئی۔ ہم جھوم کی یورش، اس کے عتاب اور اس کے محلہ چنگال سے چارلی کو بچاتے حفاظت کنناں اسے اس کے ہوئل

پھولوں کا ایک زبردست بو کے میرے ہوئل روم میں بھیج دیا تھا۔

”کس نے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”کس نے؟“

”گومان نے۔“ اس نے ایک لمبا سانس لے کر کہا ”بہت ہی خوبصورت و دور قیہ کارڈ کے اندر سبز مار کر اس نے اپنے دستخط کیے تھے۔“

”ساتھ کوئی پیغام نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

کہنے لگا ”پیغام تو کوئی نہیں تھا لیکن پھولوں کا اتنا بڑا گلدستہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس کے دل میں میرے لیے اب بھی محبت کے بے پناہ خزانے موجود ہیں اور اس کو میں ہر وقت یاد رہتا ہوں۔“

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ وہ درانی تھا جس نے میرے پاس روم آنے کے لیے وہی تاریخیں دی تھیں جو شہاب صاحب نے اپنے قیام روم کے لیے لکھ کر بھیجی تھیں۔ میں بھلا اس کو کیسے انکار کر سکتا تھا اور اس کا دل کیونکر توڑ سکتا تھا کہ بڑے پہلے ہی شکستہ خاطر ولایت اور پاکستان کے درمیان گھومتا رہتا تھا۔ وہ تو خدا کا شکر ہو جو اس نے میرے کہنے پر اپنی آمد کا شیڈول بدل لیا اور نہ میرے لیے بڑی مشکل ہوتی۔

میری زندگی میں قابل ذکر اور توجہ طلب واقعات کا گراف کچھ ایسا عجیب ہے کہ اوپر تو چڑھ جاتا ہے، پھر اس کا کوئی اور چھوڑ نہیں ملتا۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ معاملہ ہوتا ہوتا کیوں رہ گیا اور میں جو سیرجی پر پہلا قدم رکھتے ہی ستانے سے نکل پہنچ گیا تھا، اٹھانے پر کس طرح سانپ کے منہ میں آ کر پھر سے ابتداء پر پہنچ گیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ ہوا کا جھونکا چا گیا۔ تماشا ختم ہوا، ہال کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ قدم خود بخود ایگزٹ کی طرف اٹھنے لگے۔ دروازے سے نکل کر ایک مرتبہ پھر اسی زندگی میں داخل ہو گئے۔ خواب گزر گیا، سامنے اصل سڑک آ گئی۔ چلا چل جانے منزل چلا چل۔

اب شہاب صاحب آ رہے تھے اور میرے یہاں قیام کر رہے تھے تو دل ہر وقت دھڑکتا رہتا تھا کہ اتنے بڑے آفیسر ہیں۔ ایسے سینئر رائٹر ہیں۔ اونچے عہدے پر براجمان ہیں۔ آئی سی ایس حکومت سے تعلق رکھتے ہیں، وہ میری قربت کیونکر پسند کریں گے اور مجھے کیسے برداشت کریں گے۔ ظاہر کہ ان کا ایک سر پرستانہ سارو یہ ہوگا اور وہ میری نگہبانی سی کر کے واپس وطن چلے جائیں گے۔ جس طرح ہر بڑا آدمی دیار غیر میں اپنے ملکی طالب علموں سے کام لے کر ان سے پارسل بندھوا کر اور ٹریک اٹھا کر اس خدمت طلبی سے ان کو سرشار کر کے واپس چلا جاتا ہے، اسی طرح یہاں بھی ہوگا۔ اصل میں میری زندگی میں چند ایسے واقعات پیش آئے تھے جن میں میں ہوتے رہ گیا تھا اور وہ واقعات میری برتری کا حصہ نہیں بن سکے تھے۔

جب چارلی چپلن اپنی فلم لائنس کی بے پناہ کامیابی کے بعد روم آیا اور اٹلی کی حکومت اور اٹلی کے لوگوں نے اسے شرف مہمانی بخشا تو اس نے ”فورور ومانو“ میں اپنی مختصر سی تقریر کے ساتھ صرف ایک جھٹک دکھانے کا وعدہ کیا۔ لوگوں نے دل و جان سے قبول کیا کہ زندہ چارلی چپلن کی ایک جھٹک اس کی سینکڑوں فلموں اور سینوں بچسوں پر بھاری تھی۔

کی طرف لے چلے۔ ہوٹل چند قدموں پر ہی تھا لیکن ایک مضبوط گردہ کا مقابلہ کر کے ایک گھرے ہوئے بلوگٹڑے کو اس کی حفاظت گاہ تک پہنچانا نہایت مشکل کام تھا۔ لیکن ہم خدا کے فضل سے اس میں کامیاب ہوئے۔

ہوٹل کے گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی ہجوم باہر رک گیا اور حواس باختہ چارلی چپلن ہم سے ہمارے ہر پوچھنے لگا۔ سالواتورے نے اپنا نام بتایا اور میں نے اپنا۔۔۔۔۔۔ چارلی چپلن نے ہانپتے ہانپتے ہمارا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ کڑی شام پانچ بجے میرے ساتھ یہیں چائے پیئیں اور مجھے عزت بخشیں۔ پھر اس نے میرا نام بڑی وضاحت سے اور اصل طریقہ کے ساتھ ادا کرتے ہوئے کہا ”دیکھنا اشفاق بھولنا نہیں۔ ٹھیک پانچ بجے اور نہ میں اور کاموں میں پھنس جاؤں گا سارا تورے، یاد رکھنا۔“ ہم دونوں نے سر ہلایا ”شکریہ شکریہ“ کہا۔ آگے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن اتنے بڑے اعزاز کے بعد ہماری زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔

جب ہم گیٹ سے باہر نکل رہے تھے تو چپلن نے ایک مرتبہ پھر پکار کر کہا ”دیکھو اشفاق، میں تمہارا انتظار کروں گا۔ مجھے مایوس نہ کرنا۔“ میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر یس سر یس پلٹ کر نہ دیکھا۔ وہ میرا نام اس وضاحت سے پکارتا تھا جیسے میرے بچپن کا ساتھی ہو اور ہم اکٹھے کھیتے رہے ہوں۔ فرسٹ ایئر میں میرے فارسی کے پروفیسر ہمالی صاحب میرا نام اسی وضاحت سے پکارا کرتے تھے۔!

اگلے دن ٹھیک پونے پانچ بجے ہم ہوٹل پہنچے تو پتہ چلا کہ چارلی چپلن صاحب اس وقت اطالوی ایکٹروں اور ایکٹروں سے خطاب کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ان کے اعزاز میں ایک ریسپشن ہے۔ ہم نے کہا ”ان سے کہہ دیجئے کہ سالواتورے اور اشفاق آئے ہیں۔ وہ خود ہی باہر آ جائیں گے۔“

سیکرٹری نے کہا ”ایسا ناممکن ہے۔ اس وقت ان سے بات نہیں کی جاسکتی۔“

میں نے کہا ”آپ ان تک ہماری چٹ پہنچا دیجئے، وہ خود ہی سمجھ جائیں گے۔“

سیکرٹری نے کہا ”ایسے بڑے فنکشن میں تم لوگوں کی چٹ دینا اصول کے منافی ہے۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔“

سالواتورے نے کہا ”ہم یہیں لاؤنج میں بیٹھے ہیں، جب وہ فارغ ہو جائیں گے تو ان سے مل لیں گے۔ اگر ہم چلے گئے تو چپلن کو بہت افسوس ہوگا۔ دیکھ نہیں رہے تھے، وہ کس محبت کے ساتھ ہم سے الٹا کر رہے تھے۔“

میں نے کہا ”ٹھیک ہے، جب یہ میٹنگ ختم ہو جاتی ہے تو ہم ان کو اپنا پیغام پہنچا دیں گے۔“

ہم دونوں لاؤنج میں بیٹھ کر رسالے دیکھنے لگے تھے۔ میٹنگ ختم ہوئی اور ایکٹروں اور ایکٹریوں کا قافلہ چارلی

چپلن کو اپنے جلو میں لے کر کھانے کے ہال کی طرف چلا۔ ہم دونوں اپنی جگہ سے تھوہ مار کر اٹھے اور اس قطار کی طرف لپکے جس میں ہمارا گوبرتا بار بار ہاتھ گارڈ نے ہاتھ بڑھا کر نہیں روکا کہ ہیں۔۔۔۔۔۔ پاگل ہو گئے ہو۔۔۔۔۔۔ کدھر چلے جا رہے ہو؟

ہم واپس آ کر پھر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے اور رات کے دس بجے تک انتظار کرتے رہے۔

سوا دس بجے کے قریب ہم نے پھر اسی سیکرٹری سے گزارش کی کہ ایک مرتبہ جا کر چارلی چپلن کو صرف اتنا بتا دیں

کہ سالواتورے اور اشفاق لاؤنج میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں، ہمارے لیے کیا حکم ہے؟

سیکرٹری کو ہم پر ترس آ گیا اور وہ ہمارا استقامت سے متاثر ہو کر ہمارا پیغام لے کر اندر صاحب کے پاس چلا گیا۔ کوئی پانچ منٹ بعد خوش خوش مسکراتا ہوا آیا اور کہنے لگا ”مبارک ہو، تمہارا پیغام ان کو دے دیا تھا۔ میو بیو چپلن کہتے ہیں، میں ان ناموں کے آدمیوں میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا۔ یہ دونوں نام میرے لیے آؤٹ لینڈز ہیں!“

ہم دونوں نے اپنے اپنے بیگ اٹھائے اور باہر آ گئے۔ باہر آ کر ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور ایک نظر بولے بغیر اپنی اپنی راہ چلے گئے۔

بڑا اچھا اعزاز تھا لیکن نارس سا ہو کر رہ گیا۔

لچتی فرانس جا رہا تھا۔ تقریباً انہی ایام میں میرا پیرس جانے کا پروگرام تھا لیکن کسی رہنما کے بغیر یہ سفر فضول سا نظر آتا تھا۔ میں نے لچتی سے کہہ کر اور اس کی منت خوشامد کر کے کچھ ایسا کر لیا کہ جن دنوں میں پیرس میں چلوں، وہ بھی ہر اساتھ دے۔ اس نے کمال مہربانی سے دو دن کا آگاہ چھپا کر کے تین دن ایسے نکال لیے جب ہم دونوں ایک ساتھ وہاں روکتے تھے اور کافی حد تک ایک ساتھ وقت گزار سکتے تھے۔

لچتی یوں تو چینی آرٹ، ادب اور چینی کلچر کا کار تھا لیکن اس کا فرانسیسی ادب کا بھی گہرا مطالعہ تھا اور اس نے فرنج میں کچھ ایسے تنقیدی مضمون لکھے تھے جن کا فرانسیسی کارلوں نے بطور خاص نوٹس لیا تھا۔ انہی دنوں فرانسوا ساگال کی شہرہ آفاق تصنیف ”یوں ڈور تریس“ مارکیٹ میں آئی تھی اور دیکھتے دیکھتے دو مہینے میں اس کے آٹھ ایڈیشن ختم ہو گئے تھے۔ لچتی نے اس پر ایک سیر حاصل مضمون لکھ کر ”لوڈگارو“ کے سنڈے ایڈیشن میں چھپوایا تھا اور اس کے پاس مضمون کے حق میں اور اس کے خلاف خطوں کے انبار لگ گئے تھے۔ وہ فکشن کا آدمی تو نہیں تھا لیکن اس نے ساگال پر تنقید کرتے ہوئے چند ایسی خیالات گنیز بائیں کی تحسین کی طرف فرنج مبصروں کی نظر بھی نہیں گئی تھی۔

جس شام ہمیں پلاس پگال چاکر تو لولو ٹریک والی ونڈل کلب میں رات گزارنی تھی، اس شام اس نے کسی فرنج مصنف سے ملنے کا وعدہ کر رکھا تھا اور اس سے جائے ملے کر رکھا تھا۔ ہمارے پلاس پگال جانے سے کوئی دو گھنٹہ چوشتہ اس نے مجھے میرے پاسیوں سے لیا اور دریائے سین کے کنارے ایک پرانی وضع کے کینے میں بیٹھ گیا۔ اس نے کہا ”بس ذرا سی دیر کو ہم یہاں بیٹھیں گے اور پھر اگلی مہم پر چل دیں گے۔ اس کے بعد ساری رات تمہاری ہے۔“

دریائے سین کے کنارے پرانی کتابیں بیچنے والے، پرانی تصویروں اور فریموں کے کہاڑیے، پرانی ڈسکوں، ہارے ہاجوں اور نوٹے پھوٹے سازوں کی بے شمار دکانیں ہیں۔ کچھ دکانیں مستقل ہیں۔ کچھ دن کے وقت فٹ پارے کے ساتھ اڑا جاتی ہیں اور شام کو اپنا سودا سامان اٹھا کر ختم ہو جاتی ہیں۔ کل دوسرا دن۔ ان دکانوں کے ساتھ ساتھ آگے پیچھے ہلے ہوئے اور چھپے ہوئے ڈھابے ہیں جہاں کافی اور میز کے دور ہر وقت چلتے ہیں اور جہاں پورے فرانس کے آرٹسٹ، ادیب، شاعر، نقاد اور دوسرے فنکار جمع ہو کر اپنے اپنے خیالات کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ اونچے، چپٹے، مدہم، کوئل اور جیسے لچوں اور رواں فرانسیسی میں۔

لچو نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا ”ابھی سات منٹ باقی ہیں، وہ ختم ہوئیں تو پھر اندر چل کر ہم سارے سے ملیں گے اور جلدی فارغ ہو جائیں گے۔ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ میں سات منٹ تک بڑے غور سے ان کباڑیوں کے کھوکھوں اور رشتوں کو دیکھتا رہا جہاں آرٹ اور فن کے دلدادہ انہیں ایسی عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے کسی درگاہ پر زیارت کو آئے ہیں۔

وقت مقررہ پر جب ہم رستوران کے اندر داخل ہوئے تو ایک طرف کچھ آرٹ اپنے چوکھٹے سامنے والی دیوار کے ساتھ رکھ رکھ کر اپنے ساتھیوں کو مرعوب کر رہے تھے۔ اس جگہ ایک شخص ہاتھ باندھ کر بائیں ٹانگ تہہ کیے دائیں ٹانگ پر ایک کونے میں کھڑا تھا۔ کچھ لوگوں کے ہاتھ میں کافی کے گگ، باقیوں کے پاس بیئر کے کپے جگ۔ وہ بار بار اپنی کونڈ لگا کر بیئر پی رہے تھے اور ناموجود خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

کوئی ڈیزل گز چوڑی گیلری میں سے گزر کر ہم ایک کمرے کے سامنے پہنچے جس کا دروازہ نیم وا تھا۔ لچو نے ہلکے سے دستک دی تو اندر سے آواز آئی ”آترے! آترے!“

ہم اندر داخل ہوئے تو دریا کی طرف کھلنے والی گھڑی کے پاس میز کرسی ڈالے دو ہرے بدن کا ایک آدمی کھلے گریبان اور چرمی ہوئی آستینوں کے ساتھ بیٹھا لکھ رہا تھا۔ اس کا کوٹ دیوار سے لٹک رہا تھا اور وہ سارے کا سارا اپنی میز پر جھکا ہوا تھا۔

ہماری آہٹ پاتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ لچو نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے فرانسسی میں کہا ”یہ ہمارے بہت ہی پیارے دوست اشفاق احمد ہیں، پاکستان سے آئے ہیں اور مختصر کہانیاں لکھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے، دوسرا تیار ہے۔“

اس شخص نے بڑی گرجی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور ”آں شانے۔ آں شانے“ کہہ کر خوشی کا اظہار کیا۔ اس آدمی کا چہرہ بے حد سہل اور آنکھیں کافی بھینگی تھیں۔ وہ ایک بور شخص تھا، شریف اور مہذب بور!

لچو نے اس سے باتیں شروع کر دیں جن میں زیادہ ذکر اس کے مضمونوں کا تھا اور جن کو وہ ایک ایک کر کے پڑھ چکا تھا۔ پھر اس نے لچو سے اپنے اختلاف کی بات کرتے ہوئے کچھ انداز سے بات کی کہ میں بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ دونوں فرانسسی میں گفتگو کر رہے تھے اور مجھے ان کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کچھ اسماء معرفہ اور کچھ سیاسی تراکیب کے اشارے ضرور ملتے تھے لیکن نفس مضمون کی تفصیلات کا مطلق پتہ نہیں چلتا تھا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔

اول تو مجھے ان کی بات نہایت خوشگوار لگی لیکن بعد میں میں پھر بور ہو کر جمائیاں لینے لگا۔ اس بھیجے شخص نے ازرا تشویف و خوشنودی مجھ سے پوچھا ”آپ کے افسانوی کردار اختیاری زندگی بسر کرتے ہیں یا اضطراری؟“ تو لچو نے اطلاع میں ترجمہ کرنے کے ساتھ اختیاری اور اضطراری کی مختصر وضاحت بھی کی۔ میں نے کہا ”انہیں کہہ دیجئے کہ زندگی نہ تو اختیار ہے نہ اضطراری، زندگی تو زندگی ہے جو ہمیشہ بڑے سائز میں دستیاب ہوتی ہے۔ اب اتنے بڑے بڑے کے سامنے اتنا چھوٹا کیا کرے اور کدھر مرے۔“

اس نے میری بات کو ایک بڑے کی طرح پسند کیا اور بزرگ کے انداز میں داد دی۔ پھر اس نے مجھ سے میرے پچ کر داروں کے بارے میں پوچھا کہ وہ عام طور پر تمہاری کہانیوں میں کیا کرتے ہیں؟ میں نے کہا ”میری کہانیاں زیادہ تر بچوں کے بارے میں ہیں۔“

”بچوں کی انفیات کے بارے میں؟“ اس نے جلدی سے پوچھا۔ میں نے کہا ”نہیں، بچوں کی روح کے بارے میں۔ نا آسودہ روح اور بے یقینی کے بارے میں۔۔۔۔۔ میرا ایک کردار اپنے کتے کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے اور اپنے کتے سے بھی زیادہ گم ہو جاتا ہے۔ میرا ایک کردار اپنے رکھوں کے بارے میں اپنی نانی سے بہت سارے واقعات سن رہا ہے اور دیکھی ہو جاتا ہے کہ وہ اب اس کے گرد کیوں موجود نہیں رہے۔ ایک اور بچہ ہے جس کا باپ اس کی ٹلی اپنے پاس کور شوت کے طور پر دے دیتا ہے۔ ایک لڑکا اپنے باپ سے ہر روز بلا وجہ ہٹا ہے اور پٹائی چلا جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔“

انہوں نے میرے ان موضوعات کو بنظر استحسان دیکھا اور لچو نے اس کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ کی تیز و طرار بک بک کے بعد لچو نے وہاں سے اٹھا اور اجازت چاہی، ہم دونوں نے اس بھیجے آئی سے ہاتھ ملایا اور باہر نکل آئے۔ باہر کی ہوا تازہ تھی اور فضا خوشگوار۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ ٹیوب سٹیشن کی طرف چلے جا رہے تھے اور تھکاکٹ کی وجہ سے خاموش تھے۔ ایک جگہ ایک گراں نے کون آکس کریم لی اور ہم اسے چانتے ہوئے پھر آگے جانے لگے۔ کون آکس کریم ختم ہوئی۔ ہم نے کافی راستہ طے کر لیا۔ ایک جگہ رنگ کریم نے کون کی چمکنی دم کو کوڑے کی نوکری میں پھینکنے کے لیے سڑک کراس کی تو میں نے ٹکاؤٹ سے چڑ کر کہا ”ایک تو تم نے اس ہوٹل فیجر سے بھی گفتگو شروع کر کے سارا وقت ضائع کر دیا۔۔۔۔۔“

لچو نے کہا ”خدا کے واسطے، وہ ہوٹل فیجر نہیں، فرانس کا بہت بڑا ایب ہے۔“ میں نے کہا ”ٹھیک ہے، میں زبان تو نہیں سمجھتا لیکن وہ کافی ذہین آدمی دکھائی دیتا تھا۔۔۔۔۔ مگر اس کے پاس اتنا سارا وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

اس نے کہا ”کچھ خدا کا خوف کرو، یہاں کا بڑا نامی گرامی رائٹر ہے۔“ میں نے کہا ”میں کب کہتا ہوں کہ رائٹر نہیں ہے۔۔۔۔۔ ہے اور ضرور ہے۔ ہمارے یہاں بھی ایسے بہت سے رائٹر ہیں جو جیلوے میں گڈ زئیرن کلرک ہیں اور اعلیٰ درجے کے افسانہ نگار ہیں۔ میوہسپتال میں کمپاؤنڈر ہیں اور سلسلہ وار ناول لکھ رہے ہیں۔ یہ کوئی کمال کی بات نہیں۔ میں تو اپنے وقت ضائع کرنے کو رو رہا ہوں۔“

لچو نے ٹک کر اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”وہ ہوٹل فیجر نہیں ہے، فل ٹائم رائٹر ہے اور اس رستوران کے مالک نے اسے یہ کمرہ مستقل طور پر اس لیے دے رکھا ہے کہ یہ ایک عزت افزائی کی بات ہے۔ مالک کی توقیر ذات ہے۔“ میں نے کہا ”چلو فل ٹائم رائٹر سہی، لیکن ایسے تو بہت سے رائٹر ہوئے ہیں۔ ہر ایک کے پاس تو گاڑی نہیں روکی ہائیں ناں۔“

ہے اور ان کے آنے پر میرے مرحوم شوہر کی روح بڑی خوش ہوگی کیونکہ اس کو دعوتیں دینے کا اور اپنے ہاتھ سے پاکر کھلانے کا بڑا شوق تھا۔

میں نے آکر حلقہ یاراں میں اس کا اعلان کیا تو سب نے خوشی کے فلک شکاف نعرے لگائے اور جیک، المنزلہ، کیتھی میرا گھر دیکھنے آ گئیں۔ کمرے کی گنجائش دیکھ کر انہوں نے اعلان کیا کہ بالکل تسلی بخش ہے اور مادام مونسے سے مل کر وعدہ لیا کہ وہ پھر بھی یہاں آنا چاہیں تو ان کو روکا نہیں جائے گا۔

میری اس ضیافت میں اٹھارہ لڑکے اور لڑکیاں شریک ہوئے اور سب نے چھوٹے ہی یہ رٹا ڈال دیا کہ اگر وہی کرو گے تو ہم یہ دعوت قبول کرتے ہیں ورنہ سترے پانی کا ایک ایک گلاس پی کر واپس چلے جاتے ہیں۔ ان کو بہتر سمجھا، سر پٹکا۔ اپنے کلچر کے رموز بتائے لیکن وہ نہیں مانے۔ چنانچہ متفقہ طور پر یہ فیصلہ ہوا کہ کل یونیورسٹی کینے میرا میں بیڑ کر حساب کر لیا جائے گا اور لاگت وصول کر لی جائے گی۔

اس ضیافت میں ہم سب نے اپنے ملکوں اور علاقوں کے گیت سنائے۔ ناچ کے ٹوٹے بھی پیش کیے گئے لیکن صبیحہ کی مزاحیہ نظمیں سب سے نمبر لے گئیں۔ اس نے ہر استاد اور ہر استانی پر کمال کی چومصرعیاں لکھی تھیں جو ان کی شخصیتوں پر فٹ بیٹھتی تھیں۔ ہم نے تو ان چومصرعیوں کا فرانسیسی ترجمہ بھی سنا اور وہ بھی صبیحہ بیگم کا کیا ہوا۔ اصل ملائی میں تو وہ دودھاری تلوار ہوں گی۔ میں نے حاضرین کو بتایا کہ میری زبان اردو اور صبیحہ کی زبان ملائی کا رسم الخط ایک ہی ہے۔ ہم دونوں کے حروف سبب بھی ایک سے ہیں۔ اس کی زبان میں بھی عربی الفاظ کی آمیزش ہے، میری زبان میں بھی۔ یہ بھی دائیں سے بائیں کی طرف لکھتے ہیں، ہم بھی رائے سے لیفت کی طرف۔ سب نے ہماری خوشنودی کے لیے بھرپور تالیاں بجانیں۔

کمراسامی، پانے درود، ٹوٹ اور کرکیز پر مارم مونسے کا گھر بنایا ہوا مرہ اور مارمائیڈ لگا کر ہم کافی کی چسکیاں لے رہے تھے اور مادام کا شکر یہ یاد کر رہے تھے کہ صبیحہ نے میرے پاس آکر ہولے سے کہا ”اب ہم نے اپنی ملائی کا رسم الخط تبدیل کر لیا ہے۔ اب ہم اسے رومن حروف میں لکھتے ہیں اور تلفظ اور ہجوں کے معاملے میں انگریزی کے اصول برتتے ہیں۔ اس وقت سوائے پرانے بزرگوں کے یا موجودہ سکالرز کے ملائی کا پرانا، عربی والا رسم الخط کوئی نہیں پڑھ سکتا گورنمنٹ نے سب کی آسانی کے لیے رومن سکرپٹ اختیار کر لیا ہے اور اب بڑی آسانی ہو گئی ہے۔ لیکن اس سے ہمارا حقوز اسرافتصان بھی ہوا ہے کہ ہمارا سارا دینی سرمایہ اسی پرانے رسم الخط میں ہے جو ہم پڑھ ہی نہیں سکتے۔“

جیک نے کہا ”یہ کیا گھس گھس کر خبیہ باتیں ہو رہی ہیں۔ ہم ایسا ڈاؤن ٹیل کھیل کھیلے نہیں آئے۔ ہمیں بتایا جائے کہ صبیحہ، اشفاق سے کیا کہہ رہی تھی۔“

اس پر سب نے فاول فاول کا شور مچایا تو صبیحہ نے ہنس کر کہا ”میں اس مونسے بھدے پاکستانی سے اظہار محبت کر رہی تھی اور یہ سمجھ نہیں رہا تھا۔ اس پر تم نے شور مچا دیا اور ہمارا ڈائلاگ سچ ہی رہ گیا۔“ اس پر کیتھی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر انگریزی میں کہا ”آرڈر آڈر۔ ایسے اچھے اظہار و اقرار کے لیے سب کو چھٹی ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی بات باؤس کی

مرضی سے نہیں ہوگی۔“

اگلے دن روتھ نے مجھ سے پوچھا ”کیا واقعی وہ تم سے اظہار محبت کر رہی تھی؟“ میں نے کہا ”بکواس کر رہی تھی بالکل۔ سب کو الو ہار ہی تھی۔ تم نے اس کی چومصرعیاں نہیں سنی تھیں، وہ تو بخوبی لڑکی ہے۔“

روتھ کی تسلی ہوئی اور اس نے دل و جان سے یقین کر لیا۔ گو ہم دونوں کے درمیان کوئی بھی ایسی بات نہ تھی لیکن یہ فیلو ہونے کے رشتے سے ایک طے شدہ تعلق ضرور تھا۔ کوئی بھی ہمارا راستہ کاٹتا تھا تو ہمارا استحقاق مجروح ہو جاتا تھا۔

اس کے بعد جیک نے پہاڑ کی چوٹی پر ہماری دعوت کی۔ وہاں لوہے کے تاروں پر چلتے ہوئے ہنڈولوں سے جاتے تھے۔ ایک ہنڈولے میں دس بارہ مرد عورتیں ایک ساتھ کھڑے ہو جاتے تھے۔ بیٹھنے کے لیے کوئی سیٹ نہیں تھی۔ بچہ لوگوں کے باہر جھانکنے کے لیے ہنڈولے کی ایک دیوار میں پتلی جھریاں سی بی تھیں۔ بچے اترتے چڑھتے ان بکروں کی جبری میں سے نشانہ باندھ کر نیچے کے مناظر دیکھا کرتے تھے اور سارے سفر میں اپنی ماؤں اور داداؤں کو شریک نظارہ کرنے کے لیے بلاتے رہتے تھے۔

پہاڑ کے اوپر بہت بڑی بستیاں آبا تھیں۔ یہاں زیادہ کسری کا کام ہوتا تھا۔ جدھر مرغزاریں تھیں، وہاں دودھ، دی، پیڑ ڈیوں میں بند کیا جاتا تھا۔ لوگ خوشحال اور فارغ البال تھے۔ زیادہ تر منڈولین اور گٹار بجاتے تھے۔

جیک کی دعوت بڑے ٹھانڈے تھی۔ وہ کسی بہت ہی بڑے کھاتے پیتے گھر آنے سے تعلق رکھتی تھی کیونکہ اس کے پاس ٹریولر ویکس کی کئی کاپیاں تھیں۔ اس نے اپنی ضیافت کا انتظام ایک بہت ہی اعلیٰ درجے کے ریسٹوران میں کیا تھا اور چار ساز بجانے والے تمام وقت ہمارے سروں پر کھڑے ساز بجاتے رہے تھے۔ یوں تو اس نکلڑی میں سب سے غریب میں تھا لیکن مجھ سے بھی زیادہ غریب رہتے تھے۔ اس کا والد بلیک فارمسٹ کا ایک تربیت یافتہ لکڑہارا تھا اور اس کے پاس بڑے درخت گرانے کا لائسنس تھا۔ یہ بات میں نے روتھ سے بڑی مشکل کے ساتھ نکلوائی تھی اور مجھے اس بات کی خوشی ہونے لگی تھی کہ یورپ کے گورے بھی غریب ہو سکتے ہیں۔

کیتھی کے پاس جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں کی بے پناہ کہانیاں تھیں۔ اس نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں پڑھ رکھی تھیں اور اس کا خیال تھا کہ امریکہ کی نوریاتیں باختر ریاستیں ہیں جن پر شیطان کی اور اس کے شیطونگوں کی حکمرانی ہے۔ وہاں کے سارے گربے ٹھلا بند ہو چکے ہیں اور لوگوں کا دین دھرم پر اعتماد اٹھ گیا ہے۔

ہمارے دوست جیک جدید خیالات کے تھے، ان کو یقین تھا کہ لوگوں کو غریب رکھنے کے لیے مذہب پرانے بادشاہوں کی اختراع تھی جنہوں نے اپنے اپنے دور حکومت کو طویل تر کرنے کے لیے مذہب کے ساتھ بہت ساری پھول کناریاں لگا کر انہیں دلچسپ اور توجہ طلب بنا دیا تھا۔ ہسپانوی اور پرتگالی رومن کیتھولک سنوڈنٹس ان سے چوکھی لڑائی لڑتے تھے اور جب مشکل مقامات پر سب کی فرانسیسی ختم ہو جاتی تھی تو وہ اپنی اپنی زبان میں مندا بولنے پر اتر آتے تھے۔

کیتھی کو خیر ناستیک تھی لیکن نور اور جیک کا مزاج دینی تھا۔ وہ پادریوں کے لطیفے تو سن جاتی تھی لیکن ایک خاص حد

جب میں پاکستان واپس آ گیا۔ میری شادی ہو گئی اور ہم سخن آباد کے ایک کوارٹر میں رہنے لگے تو ایک صبح ہمارے گھر چھوٹے سے بیرونی برآمدے میں ہم کا دھماکا ہوا اور میں دہشت سے تھرا کر برآمدے کی دیوار سے جا ٹکرایا۔

میرے سامنے برآمدے میں صبح کا اخبار پڑا تھا اور اس کے فرنٹ پیج پر امریکہ کے صدر کینیڈی کی بڑی سی تصویر تھی اور اس کے ساتھ ہماری جنگی کھڑی تھی۔ اب اس کا پورا نام جنگی لین کینیڈی تھا۔

میں نے اس کے نام ایک لمبا چوڑا یادوں سے بھرا اور تمناؤں سے لبریز مبارکبادی کا دعائیہ خط لکھا لیکن میری پوری نے اسے پوسٹ کرنے سے منع کر دیا۔ ہمارے درمیان تھوڑا سا جھگڑا بھی ہوا لیکن بانو نے کہا ”یہ ایک میراثی خط ہے جو آپ نے نواب صاحب کے نام لکھا ہے۔ اس میں ہمسری اور برابری والی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا اسے بھاڑ کر ایک دوسرا خط لکھ دیتا ہوں، خودی اور خودداری سے لبریز۔ آخر ہم دوست ہیں اور ایک دوسرے کے کلاس فیلوں ہیں۔

بانو ضد کی بچی اور ہٹ کی پوری ہے، اس نے مجھے دوسرا خط لکھنے سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ ہم جیسوں کی طرف سے امریکہ کو جو بھی خط لکھا جائے گا، اس میں گھٹکیا ہٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا اور ہماری ساری خودی اور خودداری میراثی بن میں ٹرانسلیٹ ہوتی جائے گی۔ اپنے در اور اللہ پر بھروسہ رکھو!

ایک مرتبہ پھر کیسے بڑے اعزاز کا چانس ملا تھا۔ وہ بھی نارس ہو کر بلبلے کی طرح بیٹھ گیا!

اب مجھے ایک اور اعزاز مل رہا تھا کہ ایک بڑا بلکہ بہت ہی بڑا آئی سی ایس آفیسر خود اپنے منہ سے کہہ کر میرے پاس آ کر ٹھہر رہا تھا اور روم کی سیر کے دوران مجھ سے باتیں کرنے کا خواہش مند تھا۔ یہ خدا کی ایک خاص عنایت تھی جو مجھ پر ہونے والی تھی اور جس کو ہر زاویے سے کیش کرنے کے لیے میں نے ذہن کے مختلف خانوں میں الگ الگ پروگرام طے کر رکھے تھے۔ وہ پروگرام نہ بھی صورت پذیر ہوتے پھر بھی یہ کوئی کم اعزاز تھا کہ میں نے ایک آئی سی ایس آفیسر کی آشنائی کا دم بھرا تھا اور اسے اس قدر قریب ہو کر ہاتھ لگا کر دیکھا تھا۔

ایک آئی سی ایس آفیسر سے میری آخری ملاقات کئی برس پرانی تھی۔ جب میں نے جناب اختر حسین آئی سی ایس ایس، ڈپٹی کمشنر فیروز پور کو پندرہ سولرٹ کے فاصلے سے دیکھا تھا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب ہمارے شہر تحصیل مکتسر کا معائنہ کرنے آئے تھے اور انہوں نے عائدین شہر کی درخواست پر ہمارے سکول میں ایک جلسے کی صدارت کی تھی۔

اختر حسین صاحب آئی سی ایس کے بارے میں ایک خبر سارے شہر میں گشت کر رہی تھی کہ ڈپٹی کمشنر صاحب محکمہ مال کے بڑے ماہر ہیں اور انہوں نے یہ علم پنوار یوں کی ٹیوشن رکھ کر حاصل کیا ہے۔ ہم سکول کے چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی ایک دوسرے کو یہی بتاتے تھے کہ ڈپٹی کمشنر صاحب محکمہ مال کے بڑے ماہر ہیں اور انگریزوں سے بھی زیادہ علم رکھتے ہیں۔ نہ ہم کو مال کا پتہ تھا، نہ انگریزوں کو دیکھا تھا۔ نہ ماہری کا کوئی تصور ہمارے ذہنوں میں موجود تھا۔ ہم سب اس بات پر خوش تھے کہ ڈپٹی کمشنر ہمارے شہر میں تحصیل معائنہ کے لیے آئے ہوتے ہیں۔

ہمارے سکول کے جلسے میں سٹیج پر صرف ڈپٹی کمشنر اختر حسین صاحب آئی سی ایس اور ان کا ماتحت ایک گورا

سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ آئر لینڈ کے تینوں خوبصورت نوجوان حد درجہ مذہبی تھے اور مذہب سے کسی قسم کا مذاق برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جب ان کے گورے گورے چہروں کو لال لال کرنا مقصود ہوتا تو ہم سب کے اوپر یا پوپ پر کوئی اور چھاپا وار کے پیچھے ہٹ جاتے اور وہ برنارڈشا کی انگریزی میں ہم سب کو تارتے۔

جنگی کا میرے ساتھ بڑا یار نہ تھا۔ وہ پاکستان کے بارے میں کچھ تو جانتی تھی لیکن اس سے زیادہ جاننے کی خواہش مند تھی۔ اس کو یہ تو معلوم تھا کہ سیالکوٹ میں فٹ بال ہیں لیکن وہ ٹکڑی ٹکڑی جڑ کر بالکل گول کیسے بن جاتے ہیں یہ عقدہ اس پر نہ کھلتا تھا۔ چونکہ وہ خود بارانی علاقے کی رہنے والی تھی کہ امریکہ میں سارے رقبے بارانی ہیں، اس لیے پاکستان کے نہری علاقوں اور نہروں سے سیراب ہونے والے کھیتوں کا کوئی تصور نہیں رکھتی تھی۔ اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ نہری کوٹنیاں کھول کر کھیت کھیت سیراب کیا جاسکتا ہے۔ وہ برقعہ پوش عورتوں اور ان کے رشتہ دار مردوں کے بہت خلاف تھی کہ بھڑکریوں کے ریوڑوں کو قید کر کے کیوں رکھا جاتا ہے! اس کے پاس ہماری عورتوں کی کچھ ایسی تصویریں بھی تھیں جن میں عورتوں کو پاب زنجیر کے اور ان کے گلے میں لوہے کی ہسلی ڈال کر ان سے کھیتوں میں کام لیا جا رہا تھا۔

جب ہماری کانوکیشن ہوئی اور ہمیں یونیورسٹی کی طرف سے مانگے کے گاؤں فراہم کر کے قطاروں میں کمر کر کے ڈگریاں دی گئیں اور ہماری کامیابی کا اعلان کر کے یونیورسٹی کو میڈیم بھر کے لیے بند کر دیا گیا تو وہ جوفلی کا ناہوا کرتا تھا کہ آندھیاں غم کی یوں چلیں، باغ اڑے رہ گیا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت ہماری ہوئی، ہم تو ہم وہ جو چھوٹا شہر گریونیل کا تھا، وہ بھی خاموشیوں میں ڈوب گیا اور اہالیان گریونیل نے ہمارے رخت سفر باندھنے کا بڑا سوگ منایا۔ شہر کی چہل پہل کم ہونے لگی اور سٹوڈنٹس اپنے اپنے ذرائع سفر اختیار کر کے شہر سے رخصت ہونے لگے۔

ہمارا گروپ جس کا نام جنگی اور اینڈرسن نے کھل جاسم سم کے معنوں میں لاکلف (Laclef) رکھ دیا تھا۔ اس کے ارکان بھی واپسی کا بوریا بستر باندھ کر تیار ہو گئے۔ جمہرات کی شام ہم نے یونیورسٹی لان میں ایک الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا۔ کھانا پینا تو کیا تھا، رونا، آہیں بھرنا اور وعدے وعید کرنا ہی ہوتا رہا۔ جوڑے اور جو جوان بڑے مضبوط نظر آتے تھے اور جن کے کندھوں پر سارے گروپ کا بوجھ تھا، وہ بہت ہی بودے ثابت ہوئے اور بار بار چوری چوری آستینوں سے آنکھیں پونچھتے رہے۔ ہم جنھیں ڈال ڈال کر اور گال چوم چوم کر ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے کہ شاید وہ رک کر ہمیں آواز دے اور ہم بھی رُک جائیں۔

اگلے روز جب میں مادام مونسے سے رخصت ہو رہا تھا تو انہوں نے چاکلیٹ کا ایک ڈبہ کافی ٹرے کے لیے کروشیے اور گراس کا انمول آفر شیولوشن نہایت ہی چمکدار پیرٹ گرین کاغذ میں لپیٹ کر دیا۔ میں نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”ماما میں آپ کو ساری عمر یاد رکھوں گا اور باقاعدگی سے خط لکھتا رہوں گا۔“

مادام نے کہا ”جو تجھ سے پہلے یہاں رہ کے جاتے رہے ہیں، وہ بھی یہی وعدہ کر کے جاتے رہے ہیں۔ ایسے وعدے ہوتے رہتے چائیں اور ان پر عمل زکا رہنا چاہیے۔“

اسٹنٹ کسٹمر بیٹھا تھا اور کسی کو سٹیج پر بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ سامنے کرسیوں پر ہمارے علاقے کے کچھ جاگیردار، نمبردار، سفید پوش اور ذیلدار بیٹھے تھے۔ ان سب نے آج اپنی اپنی پگڑیاں بڑے سلیقے سے باندھی ہوئی تھیں اور ان کے کھد اور لہجے کے تہندہ دھوبی سے دھل کر آئے تھے۔ ان کے پیچھے مسلمان زمیندار تھے اور مسلمان اہلکار تھے جن کی تعداد سات آٹھ سے زیادہ تھی۔ ان کے پیچھے کھڑی کے پٹھوں پر ساہوکار اور دکاندار بیٹھے تھے جن کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ پھر چھوٹے چھوٹے رقبوں کے دوسرے کسان تھے جو سر جھکا کر اور سینے پر ہاتھ باندھ کر بڑے باادب طریقے سے بیٹھے تھے۔ اس لمبے کے ارد گرد ہمارے سکول کے بوائے سکاؤٹ وردیاں پہن کر اور لٹائیاں پکڑ کر اسٹیشن کھڑے تھے۔ سکول کے استادوں کو ان سکاؤٹوں کے درمیان گھومنے پھرنے اور حرکت کرنے کی اجازت تھی۔ شامیانے کے باہر سارے جلے کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ہمارے تھانے اور سی پولیس کی نفری چونکہ کم تھی اس لیے ضلع ایس پی صاحب نے فیروز پور سے نئی گادریں بھجوا دی تھیں۔

ان گادروں کے آنے سے پہلے ہمارے سکول کے پاس ہاکی گراؤنڈ میں ان کے لیے چھوٹے چھوٹے خیمے لگائے گئے تھے۔ خیمے میں دو سپاہی اور ہر دس سپاہیوں کے بعد ایک حوالدار تھا جو اکیلا اپنے خیمے میں رہتا تھا۔ خیمے لگانے کے دوران ضلع سے ایک بڑا سا برآمدہ بھجوا گیا جس کی بٹ کا قطر آٹھ انچ تھا۔ ایک بڑے سینڈ کے اندر لوہے کی پچھلا لکھ گھومتی تھی اور یہ برآمدہ ہاکی گراؤنڈ کی مضبوط زمین میں آٹھ انچ گول سوراخ کرتا جاتا تھا۔ ہم ہر روز سکول جانے سے پہلے پھر تفریح میں اس کے بعد پوری چھٹی پر اپنی زمین کے اندر گول سوراخ ہوتے دیکھ رہے تھے۔ پولیس کے مسز نے بتایا کہ یہ سوراخ کم از کم ستر فٹ گہرا ہوگا اور اس پر پولیس گارڈ کے لیے بم پولی بنایا جائے گا۔

جب سوراخ گہرے کھد گئے اور ان پر پتھر کی ایسی سلیمیں رکھ دی گئیں جن میں آ رہا تالے میں چابی لگنے والے نشان تھے تو ہم سب بہت حیران ہوئے کہ گادروں کے لیے ایسے بم پلس کیوں بنائے جاتے ہیں۔ مسز نے پتھر کی سلیب پر بیٹھ کر ہمیں ان کا طریقہ استعمال بتایا۔ ہم نے جا کر گہریات کی۔ بہت بڑے بڑے سکھ سردار، اگر والی، بانے، جینی دکاندار اور دو ایک مسلمان جاگیردار بھی ان کھد یوں کو دیکھنے آئے اور انگریز کی عقل پر عرش عیش کرتے ہوئے گھر واپس چلے گئے۔ سردار موہن سنگھ نے میرے ابا جی سے کہا ”ڈاکٹر صاحب! میں بھی گھر پر ایسی ہی کھدی بنواؤں گا۔“

ابا جی نے کہا ”سردار جی، یہ ڈیزائن تو خالص پولیس گارڈ کے لیے ہوتا ہے۔ جب وہ کسی بڑے آئی سی ایس کے دورے پر ضلع کا انسپکٹر سے نکلتی ہیں تو ان کے لیے ایسے بم پلس موقع پر تیار کیے جاتے ہیں۔“

تایا موہن سنگھ نے کہا ”دیکھو جی ڈاکٹر صاحب، آئی سی ایس لکنا بڑا آفیسر ہوتا ہے۔ اس کے بعد تو افسری فیم ہو جاتی ہوگی۔“

ابا جی نے کہا ”اگر غور سے دیکھا جائے تو آئی سی ایس آفیسر داسرائے سے بھی بڑا ہوتا ہے۔ جو نقصان وہ پہنچا سکتا ہے، وہ داسرائے بھی نہیں پہنچا سکتا۔“

یہی وجہ تھی کہ ہمارے سکول والے جلے میں کل عمائدین شہر جمع تھے اور سب ٹکٹنگی باندھے ہوئے اختر حسین

صاحب کو دیکھ رہے تھے اور اس بات پر خوش ہو رہے تھے کہ گوری رنگت اور بھورے بالوں والا ولایتی بلا اختر حسین صاحب کے ماتحت ہے اور جو حکم بھی وہ دیں، بلا چوں چرا بجالانے پر مجبور ہے۔

جلے کے شروع میں، سب سے پہلے چھوٹے چھوٹے سکھ لڑکے اور لڑکیاں کا ایک گروپ اختر حسین صاحب آئی سی ایس کے سامنے زمین پر کھڑا ہو گیا۔ ماسٹر جی نے زور کی ایک سیٹی بجائی اور انہوں نے کورس گا نا شروع کر دیا:

تسیں آؤ اختر جی

میں عرض کراں ہتھ جوڑ کے

جب وہ ”میں عرض کراں“ کہتے تو اس کے ساتھ ہی اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ جوڑ کر اختر حسین صاحب آئی سی ایس کے سامنے سر جھکاتے۔ جن سرداروں کے یہ پوتے پوتیاں تھے وہ بڑے فخر سے چہرے اٹھائے ڈپٹی کسٹمر صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے اور ہولے ہولے شاباش! شاباش! کہہ رہے تھے۔

ان کے بعد میری اور کلدھ پ کے سٹ کی باری آئی۔ اسی سٹ میں میں بندر اور کلدھ پ بلا بنا تھا۔ ہم سٹیج پر بے معنی انداز میں اچھلتے پھدکتے تھے اور اپنے پیچھے کمر سے بندھی ہوئی ڈموں کو ڈور کی کھینچ مار کر زور زور سے ہلاتے تھے۔ میری ڈم اوپر کواٹھی تھی اور کلدھ پ کی اندر گھسٹ تھی۔ ہمارے ان لایسنی کدکڑوں سے حاضرین محفل بہت محظوظ ہوئے اور بار بار تالیاں بجاتے رہے۔ گورا اسٹنٹ کسٹمر بھی مسکرایا لیکن اختر حسین آئی سی ایس صاحب اسی طرح ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بنیدہ صورت بیٹھے رہے۔

ہمارے بعد میرے بڑے بھائی اسحاق کی باری تھی۔ وہ نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور بہت ہی اچھا تخلیقی فنکار تھا۔ اس نے ایک سرکس جوکر کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور سر پر بوٹوں کے ڈبے کی ترمیم شدہ ٹوپی تھی۔ اس وقت وہ ایک مرغی چور کا رول ادا کر رہا تھا۔ اس سٹ میں سب کچھ اسی کا تھا۔ موضوع، شمار، یو، ڈائیلاگ، مرڈو لاگ اور نظم کے ٹوٹے۔ وہ جب وہ سٹیج پر آیا تو زور کی تالیاں بجیں۔ اس نے بڑی ڈھنائی سے اختر حسین صاحب آئی سی ایس کی طرف منہ کر کے اونچی اور واضح آواز میں کہا:

منکہ ہوں اک مرغی چور

ہاتھوں میں رکھتا ہوں زور

پھر اسحاق بھائی نے ایک شاطرا کیلٹر کی طرح آگے پیچھے دائیں بائیں تیز تیز نظریں دوڑاتے ہوئے پھدکیاں مارتے، ذرا جھک کر جب ماہی گیروں کے سے ہاتھ چلائے اور شوخیاں کرتے ہوئے اختر حسین صاحب آئی سی ایس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا

پاس کے ڈھیر پہ دھاگادے کر پھینک دیتا ہوں کوڑی

جب پھنس جائے اس میں مرغی کھینچوں تھوڑی تھوڑی

ابے دے ڈھیل

لے ڈھیل

ابے دے ڈھیل

لے ڈھیل

یہ ایک لمبا سا گانا تھا جس کے ساتھ نرت کرتے ہوئے اسحاق بھائی نے اپنے کمال ہنر کے ساتھ الفاظ کا جادو جگاتے ہوئے، کھڑاک سے سٹیج پر گر کر جھپاک سے اس خیالی مرغی کو دبوچا کہ اس سے پھروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور خوف کی کٹکٹاہٹ سے سارے تماشا کی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر اختر حسین صاحب آئی سی ایس تیز تیزی سے بجاتے ہوئے ایسے بے باکانہ ہنسے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے جیب سے دو مال نکال کر آنکھوں پر رکھ لیا۔

تحصیلدار صاحب اور نائب تحصیلدار صاحب، دونوں نے ایک ساتھ ہاتھ باندھ کر اوپر آسمان کی طرف دعا دیئے اور دعا کا لہر کال پر کھ کا شکر ادا کیا کہ ان کی تحصیل میں ان کے سکولی لڑکے کی وجہ سے ڈپٹی کمشنر صاحب ہنسے اور ان کے ساتھ گورا اسٹنٹ کمشنر بھی ہنسا۔

اختر حسین صاحب آئی سی ایس کے بعد میں نے جو دوسرا آئی سی ایس دیکھا تھا، وہ قدرت اللہ شہاب تھا جو اسٹنٹ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر رہنے کے بعد ڈیڑھ بیگ پردی بیگ آیا ہوا تھا اور جس نے خود اپنے دست مبارک سے مجھے خط لکھا تھا کہ واپس جاتے ہوئے وہ چند روز میرے ساتھ گزارنا چاہتا ہے۔

کتنے بڑے اعزاز کی بات تھی اور مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں یہ اعزاز بھی نارس ہی نہ رہ جائے!

اس لڑکی کی شکل آنکھلا سے بہت ملتی تھی بلکہ ایک لحاظ سے وہ عین عین اسی کی تصویر نظر آتی تھی۔ اگر آنکھلا معذور

ہوتی اور اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی اور اس نے اطالوی لباس کے بجائے انگلش میموں جیسا لباس پہنا ہوتا تو وہ ہو بہو اس لڑکین کا بی نظر آتی لیکن یہ کوئی اور لڑکی ہے۔ اس کا ہاتھ کشادہ اور جلد کا رنگ سفید تھا۔ شاید ملائم اور ہموار ہونے کی وجہ اس کی جلد زیادہ سفید نظر آتی ہو یا قدرتی طور پر اس قدر سفید ہو۔ کچھ بھی ہو اس کی رنگت آنکھلا سے مختلف تھی۔ پھر اس کے چلنے کا انداز بھی اوپر سا تھا۔ اس کی سرپٹلی اور کولہے بھاری تھے۔ آنکھلا کا پیٹ ذرا ذرا باہر کو نکلا ہوا تھا اور اس کی رانیں بھی ہوتی تھیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اور ایسے بین فرق کے باوصف وہ عین عین آنکھلا ہی نظر آتی تھی۔

آنکھلا کہ اس سے بھی زیادہ!

جب اس نے مجھے مقابل پایا تو انگشت شہادت کے کھونٹی نما اشارے سے مجھے ساتھ آنے کی تاکید کی تو میں اس اشارے کی حکم عدولی نہ کر سکا۔ گیارہ بیڑھیاں اتر کر جب میں چلی فلائٹ پر پہنچا تو وہاں آنکھلا کی والدہ کھڑی تھی۔ وہ والدہ رالپک کر مجھ سے لپٹ گئی اور ”دیکھو دیکھو کیسا شفاق، ہمارے ساتھ کیا معجزہ ہوا ہے۔“ کہہ کر اونچے اونچے رونے لگی۔ اس کے اندوہناک گریہ کے دوران میں نے غور سے دیکھا تو ہمارے ساتھ آنکھلا ہی کھڑی تھی۔ پھولدار کپڑے پہنے، لڑکی میں اپنے نوکر کا بھر بال چھپائے اور بند چھتری ہاتھ میں تھامے آنکھلا اپنے پاؤں پر کھڑی تھی۔ میں نے اسے اس کی سرکھٹ سے پچانا اور اس کی ماں کے ہاتھ چھو کر آنکھلا کو گھٹ کے چھٹی ڈال لی۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے گال باری باری ایک دوسرے سے ملا کر بڑے بڑے چمے دیئے۔

ہماری ہنگامہ خیزی اور خوشی کے نعروں کی صدائیں سن کر سینور مار یو کندوتی بھی نچلے فلیٹ سے اوپر آ گیا اور ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ میں اونچے اونچے بہت ہی اونچے اونچے مار یو کو زور زور سے ہلاتے ہوئے پوچھ رہا تھا ”یہ آنکھلا کیا یہ آنکھلا ہے؟ کیا یہ وہی آنکھلا ہے جو ہر وقت وکیل چیئر پر بیٹھی رہتی تھی۔ جو چلنے سے معذور تھی۔ مادرزاد پاچ تھی؟ اس کا ناما سینور کندوتی موٹے موٹے آنسو گراتے ہوئے اثبات میں سر ہلائے جاتا تھا۔“

اس کرم گستری پر ہم سب کو جذباتی ہوتے دیکھ کر آنکھلا کی ماں رونے لگی۔ پہلے تو اس کی آواز ہم تینوں کی سماعت سے محروم تھی۔ پھر اس میں اضافہ ہو گیا اور وہ اونچے اونچے بین اور شکرین کرتے ہوئے بھیس بھیس رونے لگی۔ ہم جس فلیٹ پر کھڑے تھے۔ وہاں کے دونوں گھروں کے دروازے ایک ساتھ کھلے اور اہل خانہ خوفزدہ ہو کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔

آنکھلا کی ماں انہیں دیکھ کر اپنی گریہ و زاری پر قابو نہ رکھ سکی اور وہ اور زور زور سے رونے لگی۔ روئے جاتی تھی اور ساتھ ساتھ ہاتھ باندھ کر اوپر آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے پکار کرتی جاتی تھی ”ہمارے ساتھ معجزہ ہو گیا۔ ہمارے گھر کو معجزہ ہو گیا۔ ہمیں خداوند یسوع مسیح نے اپنا ملازم رکھ لیا۔ ہمیں عمر بھر کی نوکری دے دی۔ بی بی پاک مریم نے میری بیٹی کو اپنی کیزوں میں رکھ لیا۔“ پھر وہ اور زور زور سے رونے لگی اور ناک صاف کرتے ہوئے بولی ”یہ میری بیٹی ازل کی لولی تھی، مادرزاد پاچ تھی، پولیو زدہ بچہ تھی۔ اس پر رحم ہو گیا۔ کرم ہو گیا۔ یہ دیکھو۔ یہ دیکھو۔ آپ کے سامنے کھڑی ہے۔

لمبی سیر پر جانے کے لیے میں پاؤں میں کینوس کے جوتے ڈال کر ابھی تسے باندھ ہی رہا تھا کہ میرے دروازے کی کھنٹی بجی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک خوش رنگ خوش قدم اور خوش اندام لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے سر پر کپڑے کی پھولدار ٹوپی تھی۔ بدن پر فریوٹ والا گاؤں اور پاؤں میں نازک نازک کنڈشوز تھے۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک بند چھتری تھی جس کی دھنکی بہت ہی لمبی اور بے حد نازک تھی۔ میں نے اس لڑکی کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی اس سے کبھی ملاقات، نہ اس کے متعلق کچھ جانتا تھا۔

وہ اس طرح میرے سامنے کھڑی مسکراتی رہی اور میں گونگا بہرا اس پر نگاہیں گاڑے گم سم کھڑا رہا۔ اس نے سر کے اشارے سے مجھے کہا ”آؤ چلیں۔“

میں نے کہا ”کدھر؟“

تو میری بات کا جواب دینے کے بجائے وہ چلنے کے لیے ہلٹی جیسے اسے میرے ساتھ دینے کا یقین پیدا ہو گیا ہو۔ دو تین قدم اٹھا کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میں اسی طرح کھڑا تھا۔ اس نے پھر سر کے اشارے سے ساتھ چلنے کو کہا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگی۔ اب اس کو بھی یقین ہونے لگا کہ اس نے غلط گھر کی کھنٹی بجادی تھی اور اندر سے

بی بی مریم کی کنیز۔ ہمارے گھر میں رہتی ہے۔ بی بی مریم کی نوکرانی اور ان کی ملازمہ ہے۔ انہی کا سب کچھ ہے۔ انہی کا دین ایمان ہے۔ انہی کی کرپا ہے۔“

دونوں گھرانے اپنے اپنے دروازوں میں چپے ہوئے ہم کو دیکھ رہے تھے۔ بنیان اور نیکر پہنے ایک بڑھا بابا اندر کو بھاگا اور کیا نئی کی بوتل اٹھالایا۔ اس کی پوتی نے بھگم بھاگ باورچی خانے سے مختلف النوع جام نکالے اور پہلے ہم کو پھر سامنے گھروالوں کو دیئے۔

سب مل کر ”آوے مرزا“ گانے لگے۔

اس وقت سینور مار یو کندوتی سب کو لے کر ”تراس تیورے“ کے ایک قدیم رستوران میں لے جا رہا تھا جہاں اس کے خاندان کے سارے لوگ دعوت شکرانہ کے لیے جمع ہو رہے تھے۔ مجھے بلانے کے لیے انہوں نے آٹھواں بھیجا تھا اور خود سبز جیوں کی چٹنی فلاٹ پر رک گئے تھے۔ کتنا بڑا تعجب، کیسی حیرت، کیا ناقابل یقین بات تھی۔ ایسے کبھی ہو سکتا ہے۔ کبھی ہوا، پھر بھی ہو سکے گا۔ ہوتا رہ سکے گا؟ مشکل اور ناممکن سی بات تھی۔ یہ بھی نظر کا دھوکا تھا۔ کوئی سچا یا چٹکار نہیں تھا۔ اس کے پیچھے کوئی غیر مرئی قوت یا روحانی طاقت نہیں تھی۔ جسم کی دیرینہ خامی کسی وجہ سے کسی بدنی قوت کی کمی نئی رو سے عضلات یا اعصاب کی کارکردگی میں نئی تبدیلی کی وجہ سے کسی بدنی، برقی یا مقناطیسی روک کی بدولت خوراک تبدیل ہو جانے سے، روشنی میں نئے زاویہ کا انعکاس کی بدولت یا گرے وئی کی کسی طاقتور رو کے اچانک مریض کے نیچے سے گزر جانے سے یہ حیران کن تبدیلی تو ہو سکتی تھی لیکن کسی روحانی، معجزاتی یا ملکوتی رہبری اور ہدایت و حکومت کی وجہ سے ہرگز نہیں۔

ہم رات گئے تک دھارمک گیت گاتے اور مسیح ابن مریم کی شبیہ کی آرتی اتارتے رہے۔ آنکھ کی چوچھی ایک موٹے پادری کو بھی بلا لائی تھی جو شراب کے نشے میں صبح تک مختلف قسم کے معجزات کی لڑیاں پروتا رہا اور ان کی ہسٹری بیان کرتا رہا۔ کسی نے بھی اس موٹے کی باتوں کا نوٹس نہیں لیا اور کھاتے، لٹدھاتے اور گاتے بجاتے رہے!

اتوار کے روز یونیورسٹی میں اپنے لاکر سے ایسٹسی کی عنایت کردہ سگریٹوں کا ڈبہ نکال کر میں باہر جا رہا تھا کہ سامنے لان میں پروفیسر فیرا کوئی اپنے بیمار کتے کو سیر کرانے جا رہے تھے۔ کتے کی کمر پر سفید فالین کا جھول تھا اور دم دبی باندھ کر پٹے سے جکڑی ہوئی تھی۔

میں نے قریب جا کر سلام کیا۔ اپنے آنے کی وجہ بیان کی۔ ان کے کتے کی بیمار پرسی کی تو وہ کہنے لگے ”کل ہمارے علاقے کے تین کتوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ یہ تو پھر کم زخمی ہوا، باقی دو کا برا حال ہے۔ ڈاکٹر نے پینسلین ڈے دی ہے لیکن خدشا ظاہر کیا ہے کہ نمونیا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ایکس رے صاف نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”آپ فکر نہ کریں۔ جلد ٹھیک ہو جائے گا اور جلد ٹھیک ہونے کے لیے دواؤں اور پلستروں کی ضرورت نہیں ہوتی، کچھ احوال بھی ہوتے ہیں جن سے بیماری آپ سے آپ دور ہو جاتی ہے۔“ وہ پلوئی کو زنجیر ہاتھ میں تھا غور سے میری بات سنتے رہے لیکن کچھ بولے نہیں۔

میں نے کہا ”سراس اسباب و ملل کی دنیا میں کیا معجزہ بھی کوئی چیز ہے؟ کیا یہ پہلے بھی ہوتے رہے ہیں اور اب بھی ہو سکتے ہیں۔ اور کیا یہ قدرت کے طے شدہ اصولوں اور کلیوں کو اس قدر آسانی کے ساتھ توڑ سکتے ہیں؟“

وہ پھر بھی خاموش رہے تو میں نے کہا ”سر دوسرے مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں ہمارا اعلیٰ بہت ہی مبہوم پرست اور خرافاتی ہے۔ اس کے لوگ ایسے ضعیف الاعتقاد ہیں کہ آپ کی سائنس کے طے شدہ اور تصدیق کردہ اصولوں سے انحراف کر کے معجزوں، کرشوں، کرما توں پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا کیا بنے گا؟“

انہوں نے ہنس کر کہا ”بنا کیا ہے، وہی کچھ بنے گا جو اس قسم کے لوگوں کا بنا کرتا ہے۔“

میں نے کہا ”سر میرے ایک دوست ہیں۔ بڑی عمر کے دوست۔ ان کی نواسی پیدائشی طور پر پولیو کی مریضہ تھی۔ بائیس برس تک وہیل چیئر پر بیٹھی رہی۔ ایک رات اس کی ماں نے خواب میں دیکھا کہ اس کو سینٹ فرانس آف اسی سینی بلار ہے ہیں۔ کوئی خاص مذہبی خیالات کی عورت نہیں ہے سرنہ ہی کوئی روحانی شخصیت ہے، بس ایسے ہی ایک گھریلو سی خاتون ہے۔ نہایت معمولی، مجھ سے ہاتھیوں کی کہانیاں سنا کرتی ہے۔“

”پھر؟“ پروفیسر نے شوق سے پوچھا۔

”پھر کیا پروفیسر صاحب۔“ میں نے افسوس کا سر جھٹکتے ہوئے کہا ”وہ اس کو وہیل چیئر میں بٹھا کر اور وین میں ڈال کر ”اسی سینی“ لے گئی۔ وہاں کوئی پادری ہے جو ایکس سال سے سینٹ کے مزار پر چلہ کشی کرتا رہا ہے۔ اب اس میں ایسی مقناطیسی کشش پیدا ہو گئی ہے جس سے وہ لا علاج مریضوں کا علاج کرتا ہے اور مایوس اور دکھی انسانیت کی دھنگیری کرتا ہے۔“

”یعنی وہ اپنے علاج سے بیمار لوگوں کو ٹھیک کر دیتا ہے؟“ پروفیسر فیرا کوئی نے پوچھا۔

”علاج سے کیا سر، جواہر اور مریض۔“ میں نے جمل کر کہا ”وہ ایسے ہی ماؤف بدن پر ہاتھ پھیرتا جاتا ہے اور کوئی اپنی پڑھتا ہے ساتھ ساتھ اور مریض یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی بیماری دور ہو رہی ہے۔ ایسے کبھی ہو سکتا ہے سر؟“

”اور تمہارے دوست کی نواسی؟“ پروفیسر صاحب نے پوچھا ”اس کا کیا بنا؟“

”وہ سر! پہلے تو اپنی کرسی میں بیٹھی کسمائی۔ پھر دائیں بائیں تیزی سے گھومنے لگی۔ پھر اور اسی گھوم گردش میں اونچے اونچے رونے لگی اور آخر میں سر کو اس شدت کے ساتھ اوپر نیچے جھٹکنے لگی گویا گردن سے توڑ کر الگ کر دے گی۔ اس بے چینی اور کرب کی حالت میں کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور تیزی سے سر کو بڑے بڑے دائروں میں جھلانے لگی۔ اس کی ماں بتاتی ہے کہ وہ اپنے سر کو اتنی دو دو روتک جھلا کر حلقے بناتی تھی کہ اپنے پاؤں پر قائم اس کا سارا وجود مرکز ثقل سے باہر نکل جاتا تھا، پھر بھی وہ کھڑی رہتی تھی۔ گرتی نہیں تھی۔“

”اور اب وہ ٹھیک ٹھاک ہے؟“ پروفیسر صاحب نے پوچھا ”چلتی پھرتی ہے؟“

میں نے کہا ”اب تو وہ اپنے باپ کے ساتھ چنگ پانگ کھیلتی ہے اور اس کو ہرا دیتی ہے۔“

پروفیسر صاحب نے اپنے کتے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا ”میرے لیے اس بات کو تسلیم کرنا اور اس واقعے پر اعتبار کرنا کافی مشکل ہے لیکن یہ بات ہمارے درمیان بڑی دیر سے چلی آ رہی ہے اور پتہ نہیں، یہ اختلاف ہم کو

ایک دوسرے کے ساتھ باندھ کر ابھی اور کب تک اور کہاں تک چلتا رہے۔

میں نے کہا ”سر میں آپ کی بات نہیں سمجھا!“

کہنے لگے ”انسانی تاریخ کے اندریوں بھی ہوا ہے۔ بلکہ بدستوریوں ہوا ہے۔ کہ سائنس کی نئی دریافتوں اور ایجادوں کو مذہبی اداروں اور دینی تحریکوں نے بڑی تاخیر کے ساتھ قبول کیا۔ وہ بڑی دیر تک اس شش و پنج میں رہے کہ ایسے کیونکر ہو سکتا ہے اور یہ بات کیسے مانی جاسکتی ہے۔ اسی طرح سائنس نے بھی صوفیانہ روشوں اور روحانی مہارتوں کو بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ کافی دیر بعد، قابل توجہ سمجھا اور ان پر غور کرنے کے لیے وسعت نظری کا ثبوت دیا۔“

میں نے کہا ”سر! میرے حساب سے تو دونوں کو اتنی دیر نہیں لگانی چاہیے تھی!“

بہن کر بولے ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم سب اس قدر کامل و بالغ ہیں اور ایسے پختہ کار ہو گئے ہیں کہ کسی تکنیک کے ماخوذی خاصاً، اس کی تاریخ، اس کے نیرنگ و انفسوں سے بے نیاز ہو کر اونچی آواز میں پکار کر پوچھیں کہ کیا یہ واقعی درست ہے؟ کیا ہم تمہارے دعووں پر عمل کر کے مطلوبہ نتائج نکال سکتے ہیں۔ کیا تمہارا کہا ہم کو واقعی وہاں پہنچا سکتا ہے جہاں ہم جانا چاہتے ہیں اور جس کی ہم خواہش رکھتے ہیں؟“

”نہ ہم مان سکتے ہیں، نہ آواز دے کر پوچھ سکتے ہیں، نہ کسی کی بتائی ہوئی راہ اختیار کر سکتے ہیں تو پھر ہم کیا ہیں؟“

”ہم اپنی حیات کا مجموعہ ہیں۔“ پروفیسر فیراکوٹی نے کہا ”اپنے حواس خمسہ کے غلام اور بردے، انہی کے زور پر ہم نے دنیا کو دیکھا ہے۔ انہی کے زور پر جانا ہے اور انہی کے زور پر پہنچانا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ہماری حیات محدود، مشروط ہیں اور دنیا کے بارے میں ہمارا نظریہ اور عقیدہ بہت ہی لمبیٹا ہے لیکن یہ حقیقت ان لوگوں کے لیے بہت ہی حوصلہ شکن اور اضطراب انگیز ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جب کوئی چیز مجھے دکھائی ہی نہیں دیتی، سونگھائی نہیں دیتی، سنائی نہیں دیتی، جیسے میں چھو نہیں سکتا، چکھ نہیں سکتا، اس کو میں کیسے مان لوں کہ ہے اور میرے ساتھ ساتھ میرے ارد گرد موجود ہے۔ اگر ہو بھی تو اس کا کیا فائدہ، جیسی ہوئی ویسی نہ ہوئی۔ دفع کرو، چھوڑ دو۔ بھول جاؤ اس الف لمبلی کو!“

”لیکن اگر!“ پروفیسر صاحب نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا ”اگر میں یہ کہوں کہ اس وقت ہزاروں تصویریں، لاکھوں نئے، ان گنت آوازیں ہمیں گھیرے ہوئے ہیں لیکن ہمیں ان کا ادراک نہیں ہوتا، نہ کوئی نظر آتی ہے نہ سنائی دیتی ہے۔ تو تم کیا کہو گے؟“

میں ان کی اس بات کا کیا جواب دے سکتا تھا بھلا!

کہنے لگے ”اسی طرح تم اس وقت توانائی کی لہروں میں جکڑے ہوئے ہو۔ انہی نے تمہاری مشینیں کسی ہوئی ہیں لیکن تم کو یہ نہیں چل رہا۔ محسوس نہیں ہوتا۔“

”محسوس یوں نہیں ہوتا کہ تمہاری حیات میں وہ میٹر، وہ پیمانہ، وہ دیگا وہ موجود نہیں جو کھینچی بڑھتی ڈگری دکھا کر تم کو مطمئن کر سکے کہ یہ ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ ہاں تمہارے پاس کوئی ریڈیو، کوئی ٹی وی، کوئی لہریا ہو تو تم اپنے ارد گرد کی لہروں میں سے اپنی پسندیدہ لہر اختیار کر سکتے ہو۔“

”تمہارے پاس ان غیر مرئی چیزوں کا احساس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں لیکن ایک کتاب بہت ہی ہلکی خوشبو، چاہے وہ کتنے پردوں میں ملفوف ہو، آسانی سے سونگھ کر بتا سکتا ہے کہ اس میں بہروئن ہے۔ اس میں چرس ہے۔ اس میں آنفریڈکوشن، ہوانا کے گاروں کا ڈبہ، چوکے کے سکت اور گوند کی ٹیوب ہے۔“

”ہلی انڈجرے میں دیکھ سکتی ہے اور دور تک دیکھ سکتی ہے۔ پرندے دور کی حرکت پہچان لیتے ہیں اور تو اور یہ کہی، یہ عام اور گھریلو کبھی، تمہارے میز پر بیٹھی ہوئی یہ بھی اچھی طرح سے جان جاتی ہے کہ تم اخبار کا طمانچہ یا پتلیکا کا تھپیڑا یا کراسے ختم کرنے کی کوشش میں ہو۔ تو وہ تمہارے ارادے سے پہلے ہی بھانپ کر فوراً اڑ جاتی ہے لیکن انسان میں یہ صلاحیتیں موجود نہیں، ہم سب ان سے عاری ہیں!“

پروفیسر صاحب کہنے لگے ”پرانے وقتوں کے بھگت بھکاری اور سادھ، صوفی ایک ہی بات کہا کرتے تھے کہ یہ مادہ اور اس کے ساتھ وجود میں آئی ہوئی مادی زندگی دراصل توانائی ہی کا ایک روپ ہے۔ یہ سب شکتی ہے اور سارا سنسار شکتی کی لپلا ہے۔“

لوگ کہتے تھے، یہ بھگتوں کا وہم ہے!

پھر ڈھائی ہزار برس پہلے یونانی فلسفیوں نے کہا کہ زندگی اینٹوں کا مجموعہ ہے اور اینٹ توانائی کی ایک شکل ہے۔ چنانچہ اس نظر کے تحت سائنسی گروہ پیدا ہو گیا۔ انہوں نے بھی کہا، زندگی توانائی ہے۔

تو لوگوں نے کہا ”کوئی ثبوت!“

اب سائنس دانوں کے پاس ایسے نفیس اور حساس آلات تو تھے نہیں جس کے زور پر وہ دکھا سکتے اور لوگوں کو ثبوت ہم پہنچا سکتے۔ شرمندہ سے ہونکر رہ گئے۔

تو مترضین نے کہا ”جھوٹ“

پرانے بھگتوں اور سیانوں نے بھی یہی کہا کہ ہمارے پاس کوئی ثبوت تو نہیں البتہ ہم اپنی کشفی زندگی سے بتا سکتے ہیں کہ مادہ دراصل شکتی ہی ہے۔

لوگوں نے کہا ”یہ بھی جھوٹ!“

بڑی دیر تک صوفی اور سائنس دان کے درمیان جھگڑا چلتا رہا مگر کوئی بھی گروہ اپنے دعوے کا ثبوت فراہم نہ کر سکا۔ پھر 1900ء میں ایک شخص آئن سٹائن نامی نے ریاضی کی ایک مساوات حل کر کے اعلان کیا کہ ”توانائی مادہ ہے۔“

$E=mc^2$ یعنی توانائی کو اگر روشنی کی رفتار کے مربع سے ”متعلق“ کر دیا جائے تو یہ مادے میں تبدیل ہو جائے گی۔ میرے لیے ان کی یہ باتیں سمجھنا کافی مشکل ہو رہا تھا کہ ان میں حساب اور ریاضی کے جبرے آنے لگے تھے۔ انہوں نے کہا ”اس کلیہ کے بعد سائنس دانوں نے متفقہ طور پر اقرار کیا کہ پرانے وقتوں کے لوگ ایٹم کی جسامت اور شہادت کے بارے میں جو تصور رکھتے تھے، اینٹم اس سے بھی چھوٹا ہے اور دوسری طرف بہت ہی بڑا ہے یعنی جو ایٹم پیٹ پیٹر کے گنبد جتنا ہوگا اس کا مرکز تک کے ذرے کے برابر ہوگا۔ ایٹم کی خوش حالت کا 99.95 باقی سب کچھ اس

حق اور نہی اس کی امید تھی۔

پروفیسر فیرا کوئی کہنے لگے "یہاں تجربے پر اور علمی مشاہدے پر اور اس کے قدرتی نتیجے پر حقیقت کا اطلاق نہیں کیا تجربہ کرنے والے کی مرضی اور منشا کا اختیار ہے۔ یہ مشاہدہ کرنے والے کا شناس کے من چلے کا سودا ہے۔ موج چاہے موج دیکھ لے، ذرہ چاہے ذرہ..... موجی کو موجیں ملیں گی، ترابی کو ذرے!"

کہنے لگے اس حیرت انگیز انکشاف نے دنیا کے سائنس کا صدیوں پرانا اصول توڑتاڑکے خاک میں ملا دیا کہ تجربہ چاہے کہیں بھی کیا جائے، کبھی بھی کیا جائے، کوئی بھی کرے اس کے نتائج ایک جیسے برآمد ہوں گے! یہاں سب انا تک سطح پر سارا اختیار تجربہ کرنے والے کے تصرف میں آ گیا اور ایٹم نے اپنی روح تجربہ کرنے والے کے اختیار میں دے دی۔ اس کو گورو، مرشد اور مالک مان کر اور خود اس کا بردہ بن کر تھرکے اور لہرانے لگا۔

پروفیسر فیرا کوئی یہ کہہ رہے تھے اور میرے کانوں میں رینگ بازار جالندھر میں تخت پوش جوڑ کر اوپر بیٹھے مہاراج علی خان فتح علی خان کی آواز گونج رہی تھی۔

تو ہر دم کی نمائی جلوہ من ہر باری رقص
یہ ہر رنگ کی رقصا نیم اے یاری رقص

اس کے ساتھ میرا پیگ گھٹکھرو باندھ کر ناچ رہی تھی
سارا شوق اسی موضوع میں ڈوبا ہوا تھا:

مجھے بڑی دیر تک بچے خیر پا کر دوپہر چہرہ دیکھتے رہے اور پھر شاید میرے اندر کا کلانڈر سکوپ بھانپ کر ہو لے سے میوا کندھا چھو کر ہو لے "میں تم کو زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتا لیکن چونکہ تم نے معجزے اور کرامت کے بارے میں پوچھا ہے، اس لیے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ایک معجزے یا کرامت کے بارے میں ایک سائنس دان کی حیثیت سے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نہ اس کا بطلان کر سکتا ہوں، نہ اس کی تصدیق کر سکتا ہوں۔ میں تو تم کو صرف یہ بتا رہا ہوں کہ ہماری روزمرہ زندگی کے تغزل یا تصور ایسی سکیل پر بالکل معتبر اور موثر نہیں ہیں۔ نہ ہی ان کو اپنے حساب سے درست اور صحیح کر سکتے ہیں۔"

مثال کے طور پر یہ کتاب جو اس وقت تمہارے ہاتھ میں ہے (بال جبریل تھی جو میں باؤسانی سے ادھار مانگ کر لایا تھا) اس کتاب میں ٹھوس اور ذہنی کے مقابلے میں خالی زیادہ ہے۔ اس کا قابل محسوس وجود کم ہے اور ناقابل محسوس غالی کم زیادہ ہے، یعنی وہی، پرانی بات کہ Some thing کے مقابلے میں Nothing زیادہ ہے۔ اس کتاب کے انہوں میں الیکٹرون ایسی تیزی سے گھوم رہے ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کو ایک ٹھوس وجود عطا کر رکھا ہے۔ انہی کی وجہ سے اس کتاب کی جلد، جلد کے ڈورے، جروف اور سیاہی عنوانات کی گرفت موجود ہے۔

یہ ایک دھوکا ہے، ایک Illusion ہے۔ اگر اس کتاب کے سارے الیکٹرون ایک ساتھ نہ کر کے گھومنا چھوڑ

کے گرد گھومتا ہوا الیکٹران ہوگا لیکن نمک کے اس ذرے کے گرد سارا خول الیکٹران کا ہوگا..... بچپن میں تم نے چوبیسے ایک سینک سلائی نکال کر تیزی سے گھما کر دیکھی ہوگی۔ ایک سلائی ہوا دائرہ بنا کرتا تھا۔ اس دائرے کی حقیقت سلائی ہوگی سینک سلائی کے تیزی سے گھومنے کے ساتھ وابستہ تھی ورنہ وہ دائرہ محض ایک التباس تھا، ایک الوژن تھا۔

جس طرح سینک سلائی تیزی سے گھوم کر دائرے بناتی ہے، ایسے ہی الیکٹران اپنے مرکزے کے گرد چار سو میل فی سیکنڈ کی رفتار سے گھوم کر ایٹم کو اس کا "اوپری وجود" مہیا کرتا ہے جس طرح مرکزے کے گرد الیکٹران گھومتے ہیں اس طرح مرکزے کے اندر پروٹون اور نیوٹرون گردش کر رہے ہوتے ہیں۔ اپنی تیز رفتاری میں یہ الیکٹران کے بھی گورو ہیں چالیس ہزار میل فی سیکنڈ!

"چالیس ہزار میل فی سیکنڈ کے حساب سے گھومتے ہیں۔" میں نے چیخ کر کہا تو پروفیسر صاحب بولے "پھر مدت تک تو ہم یہی سمجھتے رہے کہ پروٹون اور نیوٹرون بھی ایسے ہی تیز رفتار چکر ہوتے ہوں گے جیسے سلائی ہوگی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو باقاعدہ وجود رکھتے ہیں اور سب انا تک ذرات ہیں۔ اس دریافت کے بعد دنیا کے سائنس میں ایک فساد برپا ہو گیا۔ وہ جو مادے کو ٹھوس اور زندگی کو سالمہ سمجھتے تھے، پھر شیر ہو گئے اور وہ جو زندگی کو توانائی گردانتے تھے پھر صفائی کے کنبہ میں آ گئے۔"

"پھر پتہ چلا کہ یہ جو جوہری ذرات میں انا تک پارٹیکلز ہیں جن سے پروٹون اور نیوٹرون کا ہیولا بنتا ہے، اصل میں پارٹیکل نہیں ہیں بلکہ موج ہیں، لہر ہیں، بس ارتعاش ہیں۔ ان میں کچھ بھی ٹھوس نہیں ہیں۔ ان کی حقیقت سالمہ نہیں ہے..... چنانچہ اب، اس وقت اس لمحے جب میں اور تم آئے منے سامنے کھڑے ہیں، فزکس کے سامنے ایک مسئلہ ہے ایک بہت ہی گھمبیر اور اہم مسئلہ: کیا "سب انا تک پارٹیکلز" ٹھوس ذرات ہیں یا صرف موجیں اور لہر ہیں؟"

پروفیسر صاحب نے کہا "ابھی ہمارے آلات ایسے حساس اور درست و دقیق نہیں ہیں اور نہ ہی ان میں کوئی کشفی طاقت ہے جو اصل حقیقت کھول کر بیان کر سکیں..... ہمارے پے در پے تجربوں سے یہ ثابت ہوا ہے کہ کوئی جگہ زندگی کے بنیادی یونٹ موجوں کی صورت میں نظر آتے ہیں اور کئی مقامات پر یہ ذرات کی صورت میں اجاگر ہوئے ہیں۔ اب کیا اعلان کریں؟ موج کہ پارٹیکل؟"

چنانچہ اب تک یہی معلوم ہو سکا کہ سارا کچھ تجربہ کرنے والوں کا ہے۔ اگر تو تجربہ کرنے والے کے ذہن میں، روح میں، بدن میں، تصور میں یہ بات جاگزیں ہے کہ یہ سب انا تک پارٹیکلز ہیں تو اس کو پارٹیکلز ہی دکھائی دیں گے۔ ذرے ہی نظر آئیں گے اور اگر اس کے دھیان میں، اس کے خیال میں، اس کے گیان میں، اس کے بدن میں، اس کی آواز میں یہ تصور ہے کہ یہ موجیں ہیں، ارتعاش ہے، لہر ہیں تو پھر اس کو وہ موجیں ہی دکھائی دیں گی۔ جب کبھی وہ تجربہ کرے گا، سب انا تک پارٹیکلز موجیں بن کر ہی اس کے سامنے آئیں گے۔

میں نے پہلی مرتبہ سائنسی تجربے کو اس قدر مجبور و معذور پایا تھا کہ وہ اصل حقیقت اجاگر کرنے کے بجائے تجربہ کرنے والے کی خواہش اور ہوس و وسا کا تابع ہوا بیٹھا تھا لیکن شاید میں غلط سمجھا تھا کہ سائنس کی دنیا میں ایسا نہ کبھی

پر کھڑا تھا لیکن تنہا تھا۔ کوئی بھی اس کا دوست، سنگی، ساتھی نہ تھا۔ کسی کو بھی اس سے کوئی کام نہ تھا۔ کسی کو بھی اس سے کوئی مطلب نہ تھا۔ بے سنگوں کی خوبصورت بادائیں بھی ترائی میں چرچک رہی تھیں لیکن کوئی بھی اوپر سر اٹھا کر نہیں دیکھ رہی تھی کہ کون کھڑا ہے!

شہاب صاحب کو اعلیٰ درجے کے قیمتی لباس پہننے کا بہت شوق تھا۔ سرخ رنگ کی شونگ واسٹ میں خالص سوٹ کے بن لگے تھے۔ ٹوٹل کی قیمتی ترین ٹائیاں باندھے تھے۔ پاؤں میں کڈشوز، پاپینٹ لیدر کے موکیشن ہوتے۔ رول جرائیں، پن، گھڑی، ڈائری غرض ہر شے بیش قیمت استعمال کرتے لیکن اتنا بکھیرا کرنے کے بعد ان چیزوں سے بالکل نہیں تھے۔ یہ ساری چیزیں ان کے جسم پر موجود ضرورتیں لیکن ان پر سوار نہیں تھیں۔

دودن کی بہت ہی طویل گفتگو اور روز و شب کی بک بک سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ وہ بڑا آدمی نہیں ہے جس کا مجھے بچپن سے انتظار تھا اور جس سے میں نے اپنے کامیاب اور روشن مستقبل کو وابستہ کر رکھا تھا جس سے مجھے بکریافت کی امید ہو سکتی تھی۔ کچھ ترقی کرنے کا سہارا مل سکتا تھا۔ کچھ آگے بڑھنے کی راہ نکل سکتی تھی لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ بس اک ساٹ سا بے وعدہ آدمی تھا جس کے پاس اپنے دینے کو بھی کچھ نہیں تھا۔ ان کی بے وقعتی دیکھ کر میں ان سے کٹنے کے بجائے ان سے کچھ بے تکلف سا ہو گیا۔ ان میں کوئی بات ضرورتی جو مجھے روک رکھتی تھی۔ ان کے ساتھ رہنے پر مجبور کرتی تھی۔ ان کی قربت کی طلب بنتی تھی۔

شہاب صاحب سے باتیں کرنے میں ایک عجیب طرح کا لطف تھا۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی بول رہا ہوتا، لطف برقرار رہتا۔ یہ ان کی موجودگی کا کمال تھا۔ ان سے ہٹ کر وہ لطف باقی نہ رہتا۔ دودن بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ کوئی بات، کوئی مختلف بات۔ ایسی بات جو وہ جھینے ہتھوڑی سے تراش کر میرے اندر اتارنا چاہتے ہیں لیکن ان کو حوصلہ نہیں پڑتا، یقین نہیں ہوتا۔ میرے اندر کا سراپکارائی نہیں دیتا۔

ایک دن مجھ سے پوچھنے لگے ”تمہارے پاس کونسا قرآن شریف ہے؟“ میں نے کہا ”جی وہی، وہی ایک عام سا قرآن شریف، جو عام طور پر گھروں میں ہوتا ہے جو میری والدہ پڑھا کرتی ہیں۔۔۔۔۔ وہی ہے۔“

کہنے لگے ”یہ تو بڑی برکت والی بات ہے۔ بندے کے پاس وہی قرآن شریف ہونا چاہیے جو عام طور پر اس کے گھر میں پڑھا جاتا ہے۔“

ان کے چہرے سے صاف دکھائی دیتا تھا کہ انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ میرے پاس کوئی قرآن شریف نہیں، اصل میں کوئی بھی مسلمان ولایت اس لیے نہیں جاتا کہ وہاں جا کر تلاوت کرے۔ اس کو اور بھی بہت سے ضروری کام ہوتے ہیں جن کے لیے وہ گھر سے نکلا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ واپسی پر گھر پہنچ کر البتہ تلاوت کی جاسکتی ہے لیکن ولایت میں یہ کیسے ممکن ہے! شہاب صاحب نے کہا ”میرے پاس ایک کتابی سا قرآن شریف مولانا فتح محمد جالندھری کے ترجمے کا ہے۔

وہ میں آپ کے لیے چھوڑ جاتا ہوں۔ آپ اپنے قرآن شریف کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار اسے بھی دیکھ لیا کیجئے۔ بہت اچھا

اور اس ترجمہ ہے۔“

میں نے کہا ”شہاب صاحب میرے پاس ہے جو اپنا۔ اس کے ہوتے ہوئے اس کی چنداں ضرورت نہیں، پھر آپ کو راستے میں بھی اس کی ضرورت ہوگی، گھر جا کر بھی۔۔۔۔۔“

میری بات کاٹ کر بولے ”میرے پاس ایک اور ہے مولانا اشرف علی تھانوی کے ترجمے والا، میں آج کل وہ پڑھ رہا ہوں۔ دراصل مولانا اشرف علی تھانوی سے میری عقیدت ان دنوں کچھ زیادہ ہی گہری ہو گئی ہے۔“

”بہشتی زیور والے مولانا اشرف علی؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا تو انہوں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلادیا۔

ہمارا گھر تھا تو دیندار لوگوں پر مشتمل لیکن ہم سارے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ پڑھے لکھے مسلمان کا مذہب دوسرے عام مسلمان سے کافی مختلف ہوتا ہے۔ اس میں منطق، دلیل، عقل اور خود رائی کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اصل میں تو خود رائی ہی ہوتی ہے اور منطق، دلیل اور عقل سہاروں کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو خود رائی کا مجموعہ بغیر سہاروں کے ہی اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ ہمارے گھر میں بہشتی زیور کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور عورتوں کے مسائل کی جزئیات پر دل کھول کر سننے کا سامان پیدا ہوتا تھا۔۔۔۔۔ مجھے شہاب صاحب کی دانش پر تھوڑا سا افسوس ہوا۔ اگر وہ مجھ سے سمجھنا چاہتے تو میں ان کو دلائل سے قائل کر سکتا تھا کہ ان مولویوں کے پاس علم اور عقل نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔

دوپہر کے وقت میں نے اپنے چھوٹے سے ستود پر شہاب صاحب کے لیے آلوٹھا اور شیلے کی مریچوں کا سالن تیار کیا تھا۔ زیتون کے تیل کی بیک چونکہ ان سے ذرا کم برداشت ہوتی تھی، اس لیے میں مکھن میں ان کا کھانا تیار کرتا تھا۔ کھانا کیا تھا، صبح و شام سبزیاں ترکاریاں یا رات کے وقت نمکین چاولوں میں آلو کے قتلے، گوشت بالکل نہیں کھاتے تھے۔ مچھلی بہت پسند تھی لیکن پختہ نہیں چلتا تھا کہ کونے روغن میں پکی ہے۔ اس لیے مجبور تھے۔ شیم میں، بھویل میں یا دودھ میں پکی مچھلی کے دیوانے تھے اور ہمارے یہاں اس نوعیت کی مچھلی عام تھی۔

جب کھانا پکاتے پکاتے مجھے فون سننے کے لیے پانچ مرتبہ اندر جانا پڑا تو انہوں نے زچ ہو کر کہا ”آپ کے یہاں یہ بڑی مشکل ہے، گھر پر ہر فون فون نہیں چھوڑتا، باہر جا کر بیٹھیں تو دل کی بات نہیں ہوتی، کیا کریں؟“

میں نے کہا ”سر سید جی سی بات ہے۔ روم چھوڑ کر کہیں اور چلتے ہیں۔ چار پانچ دن کا سارا وقت ایک ساتھ گزاریں گے اور جتنی باتیں رہ گئی ہیں، ان کو ایک ہی دن میں سمیٹ لیں گے۔“

پوچھا ”روم سے دور؟ کافی دور؟“

میں نے کہا ”سرائلی میں کافی دور تو کہیں بھی نہیں ہوتا البتہ فراغت کے لمحوں اور آسودگی کی جان کے کئی مراکز ہیں۔ آدمی ساری جدید سہولتوں کے ساتھ سولہویں صدی میں پہنچ جاتا ہے اور جب تک پسند کرے وہاں رہ سکتا ہے۔“

کہنے لگے ”ٹھیک ہے!“

پہلے میرا ارادہ بیزار کے پاس ایک چھوٹے سے سرسبز گاؤں فلیمنو میں جانے کا تھا لیکن صبح گاڑی میں سامان

رکھتے ہوئے میں نے ارادہ بدل لیا۔

جب ہم شہر سے نکلے تو شہاب صاحب نے پوچھا ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

میں نے کہا ”سر ہم اٹلی چھوڑ کر ایک دوسرے ملک میں جا رہے ہیں۔ کیا آپ کے پاس آپ کا پاسپورٹ ہے؟“

انہوں نے کچھ پریشان ہو کر کہا ”پاسپورٹ تو میرے پاس موجود ہے لیکن کسی دوسرے ملک جا کر ہم اتنی جلدی کیسے لوٹ سکتے ہیں۔ میرے پاس صرف تین دن ہیں اور چوتھے روز میری سیٹ بک ہے۔“

میں نے کہا ”آپ فکر نہ کریں، ہم تین دن ختم ہونے سے پہلے لوٹ آئیں گے۔ بڑا وقت ہے اور بڑی فراخ رو ہے۔ وہاں آپ کو موسم بھی اچھا ملے گا اور سیم کی ہوئی مچھلی بھی اعلیٰ درجے کی دستیاب ہوگی۔ بس آپ دیکھتے جائیں۔“

ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد جب میں نے ایک کیوسک سے کافی کی دو گرم پیالیاں اور چینی لگے دو بند لپٹے انہوں نے اپنی مخصوص دھیمی سی آواز میں پوچھا ”لیکن ہم جا کہاں رہے ہیں؟“

میں نے کہا ”شہاب صاحب ہم چوڑائی کے رخ اٹلی کو کراس کر رہے ہیں اور دو گھنٹے میں اڈر یا لنک سمندر کے کنارے پہنچ جائیں گے۔ وہاں ایک چھوٹا سا خوبصورت سا بیاراس ملک ہے جس کے لوگ بڑے دھیمے اور میٹھے مزاج کے ہیں۔ آپ ان سے مل کر یقیناً خوش ہوں گے۔“

انہوں نے اپنی جغرافیہ دانی پر زور دیتے ہوئے کہا ”ادھر تو شاید یوگوسلاویہ ہے لیکن وہ تو اوپر ہے نارتھ کی طرف۔“

میں نے کہا ”یہ ملک اٹلی کے اندر واقع ہے اور اٹلی کی سرزمین سے الگ نہیں ہے۔ جس طرح ضلع لاہور کی تحصیلیں ہیں، لاہور میں لاہور، چوئیاں، قصور اسی طرح اٹلی تین ملکوں پر مشتمل ہے۔ اٹلی میں اٹلی، ویٹی کن اور سان مرینو۔“

پوچھنے لگے ”یہاں بھی چوئیاں اور قصور کی طرح اٹلی کی تحصیلیں ہیں؟“

میں نے کہا ”نہیں سر یہ پورے ملک ہیں۔ ان کا اپنا گٹ اور سک ہے۔ اپنی اپنی حکومت ہے۔ اپنے اصول و قوانین ہیں اور اپنے سفیر ہیں۔“

میں موٹر چلا رہا تھا اور وہ حیرانی کے ساتھ مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے کہا ”اس وقت ہم سان مرینو جا رہے ہیں جو بحیرہ اڈر یا لنک پر آباد ہے اور دنیا کا سب سے پرانا جمہوری ملک ہے۔ سقراط نے تو جمہوریت کا تصور ہی دیا تھا، یہ ملک بغیر کسی تبدیلی کے پچھلے گیارہ سو سال سے تواتر کے ساتھ جمہوری طرز پر حکومت اپنا کر چلا آ رہا ہے۔ دنیا کا قدیم ترین جمہوریہ۔ سان مرینو!“

شہاب صاحب نے کہا ”مجھے تو وہ اساتو یاد پڑتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں اس ملک کے بارے میں انسائیکلو پیڈیا میں ایک پیرا گراف دیکھا تھا لیکن وہ پیرا بہت ہی چھوٹا تھا اور کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ ایسی بستی ملک کیونکر کہا سکتی ہے۔“

میں نے کہا ”شہاب صاحب، یہ ملک کوئی چالیس مربع میل پر پھیلا ہوا ہے بلکہ شاید اس سے بھی کم اور اس کی کل آبادی انیس بیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔“

اس ملک کے بارے میں شہاب صاحب نے اور بھی چند سوال کیے لیکن میں ان کا تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔

میں نے کہا ”سر ہم اٹلی چھوڑ کر ایک دوسرے ملک میں جا رہے ہیں۔ کیا آپ کے پاس آپ کا پاسپورٹ ہے؟“

انہوں نے کچھ پریشان ہو کر کہا ”پاسپورٹ تو میرے پاس موجود ہے لیکن کسی دوسرے ملک جا کر ہم اتنی جلدی کیسے لوٹ سکتے ہیں۔ میرے پاس صرف تین دن ہیں اور چوتھے روز میری سیٹ بک ہے۔“

میں نے کہا ”آپ فکر نہ کریں، ہم تین دن ختم ہونے سے پہلے لوٹ آئیں گے۔ بڑا وقت ہے اور بڑی فراخ رو ہے۔ وہاں آپ کو موسم بھی اچھا ملے گا اور سیم کی ہوئی مچھلی بھی اعلیٰ درجے کی دستیاب ہوگی۔ بس آپ دیکھتے جائیں۔“

ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد جب میں نے ایک کیوسک سے کافی کی دو گرم پیالیاں اور چینی لگے دو بند لپٹے انہوں نے اپنی مخصوص دھیمی سی آواز میں پوچھا ”لیکن ہم جا کہاں رہے ہیں؟“

میں نے کہا ”شہاب صاحب ہم چوڑائی کے رخ اٹلی کو کراس کر رہے ہیں اور دو گھنٹے میں اڈر یا لنک سمندر کے کنارے پہنچ جائیں گے۔ وہاں ایک چھوٹا سا خوبصورت سا بیاراس ملک ہے جس کے لوگ بڑے دھیمے اور میٹھے مزاج کے ہیں۔ آپ ان سے مل کر یقیناً خوش ہوں گے۔“

انہوں نے اپنی جغرافیہ دانی پر زور دیتے ہوئے کہا ”ادھر تو شاید یوگوسلاویہ ہے لیکن وہ تو اوپر ہے نارتھ کی طرف۔“

میں نے کہا ”یہ ملک اٹلی کے اندر واقع ہے اور اٹلی کی سرزمین سے الگ نہیں ہے۔ جس طرح ضلع لاہور کی تحصیلیں ہیں، لاہور میں لاہور، چوئیاں، قصور اسی طرح اٹلی تین ملکوں پر مشتمل ہے۔ اٹلی میں اٹلی، ویٹی کن اور سان مرینو۔“

پوچھنے لگے ”یہاں بھی چوئیاں اور قصور کی طرح اٹلی کی تحصیلیں ہیں؟“

میں نے کہا ”نہیں سر یہ پورے ملک ہیں۔ ان کا اپنا گٹ اور سک ہے۔ اپنی اپنی حکومت ہے۔ اپنے اصول و قوانین ہیں اور اپنے سفیر ہیں۔“

میں موٹر چلا رہا تھا اور وہ حیرانی کے ساتھ مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے کہا ”اس وقت ہم سان مرینو جا رہے ہیں جو بحیرہ اڈر یا لنک پر آباد ہے اور دنیا کا سب سے پرانا جمہوری ملک ہے۔ سقراط نے تو جمہوریت کا تصور ہی دیا تھا، یہ ملک بغیر کسی تبدیلی کے پچھلے گیارہ سو سال سے تواتر کے ساتھ جمہوری طرز پر حکومت اپنا کر چلا آ رہا ہے۔ دنیا کا قدیم ترین جمہوریہ۔ سان مرینو!“

شہاب صاحب نے کہا ”مجھے تو وہ اساتو یاد پڑتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں اس ملک کے بارے میں انسائیکلو پیڈیا میں ایک پیرا گراف دیکھا تھا لیکن وہ پیرا بہت ہی چھوٹا تھا اور کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ ایسی بستی ملک کیونکر کہا سکتی ہے۔“

میں نے کہا ”شہاب صاحب، یہ ملک کوئی چالیس مربع میل پر پھیلا ہوا ہے بلکہ شاید اس سے بھی کم اور اس کی کل آبادی انیس بیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔“

میں نے کہا ”شہاب صاحب، یہ ملک کوئی چالیس مربع میل پر پھیلا ہوا ہے بلکہ شاید اس سے بھی کم اور اس کی کل آبادی انیس بیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔“

صاحب سے مصافحہ کیا اور ان سے بھی یہی پوچھا۔ ان کی طرف سے میں نے ایک بار پھر ساری بانی و ہرائی اور ہم دونوں نے "شکر! شکر! شکر!!!" کہہ کر ایک دوسرے کی تسلی کی۔

پھر اس نے پوچھا "مادام اور بچے ساتھ نہیں آئے؟"

میں نے کہا "وہ فرانس چلے گئے، چھٹیاں گزارنے۔"

کہنے لگا "فرانس سے تو ہمارا سان مرینو لاکھ درجے اچھا ہے۔ وہ فرانس کیوں چلے گئے؟ چلو خیر، ان کی مرضی ان کی پسند!" پھر مجھے آنکھ مار کر بولا "بیگمات کی پسند میں دخل نہیں دینا چاہیے، جو وہ کریں، وہی ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا "کیوں نہیں، کیوں نہیں..... آخر وہ بیگمات ہیں، ان کی نہیں مانی جائے گی تو گزارہ کیسے ہوگا۔"

اس قدر محبت آمیز گفتگو کے بعد اس نے سنجیدہ چہرہ بنا کر گھمبیر آواز میں کہا "آپ کا پاسپورٹ؟"

میں نے آرام سے دونوں پاسپورٹ اٹھا کر اس کو دیئے اور وہ ان کی ورق گردانی کرنے لگا۔ پہلے اس نے ایک ایک کر کے ہماری شکلیں پاسپورٹ کی تصویروں سے ملائیں۔ پھر کہنے لگا "یہ پاکستان کو نہ ملے گا؟ میں نے تو کبھی نہیں سنا۔"

میں نے کہا "بہت کم عمر ملک ہے۔ ابھی ابھی بنا ہے۔ آپ کو واقعی اس کا علم نہیں ہوگا۔"

اس نے کہا "آپ کے یہ ساتھی کیوں نہیں بولے، کچھ ناراض ہیں؟"

میں نے کہا "ان کو اطالوی نہیں آتی، اس لیے نہیں بولتے۔"

اس نے حیرانی کے ساتھ اپنا چہرہ کھڑکی کے لیول پر لا کر شہاب صاحب کو غور سے دیکھا اور تعجب بولا "اطالوی نہیں آتی؟ کمال ہے، اتنے بڑے ہو گئے اور اطالوی نہیں بول سکتے..... اطالوی نہیں بول سکتے تو بات چیت کیسے کرنے ہیں۔ زندہ کیسے ہیں؟"

میں نے کہا "اب ہمیں اجازت ہے؟"

بولا "بالکل اجازت ہے۔ خوشی سے رہیے۔ خوشی سے سیر کیجئے۔ پہاڑوں کو دیکھئے، ہمارے ملک کی سیاحت کیجئے..... اسے اپنا ہی گھر سمجھئے، اپنا ہی ملک سمجھئے۔"

میں نے کہا "شکر یہ! شکر یہ۔ آپ کی مہربانی، ذرہ نوازی، محبت!" لیکن جب میں نے پاسپورٹ لینے کو ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور کہنے لگا "یہ آپ کو کل ملیں گے!"

میں نے کہا "کہاں؟"

کہنے لگا "آپ کے ہوٹل میں یا آپ کی پائیکوں میں یا آپ جہاں بھی ٹھہرے ہوں گے۔"

میں نے کہا "آپ کو کیسے معلوم ہوگا کہ ہم کہاں ٹھہرے ہیں؟"

اس نے کہا "یہ ہمارا ملک ہے..... سان مرینو..... دنیا کا سب سے چھوٹا ملک۔ اس میں ہر کوئی ہر کسی کو جانتا ہے اور ہر شخص دوسرے کو پہچانتا ہے۔ آپ کدھر گم ہو سکیں گے بھلا! فکر نہ کیجئے، آپ کے پاسپورٹ کل دوپہر تک آپ کے دروازے پر پہنچ جائیں گے۔"

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

میں نے ڈرتے ڈرتے، مسکراتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے سینور، کل سہی لیکن ان کو سنبھال کے رکھنا۔" میں اس کے سوا اور کبہ بھی کیا سکتا تھا۔

اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا "بے فکر رہیں، یہ میری ذمہ داری ہے اور میں اپنی ذمہ داریوں کو خوب سمجھتا ہوں۔"

جب میں نے موٹر سائیکل کے گیسٹر بدلا تو شہاب صاحب نے پریشان ہو کر کہا "ہمارے پاسپورٹ!"

میں نے کہا "مل جائیں گے سر، کوئی ٹکڑی بات نہیں۔ وہ ان کے کوائف اپنے رجسٹروں میں درج کرنا چاہتے ہیں۔ بعد میں لوٹا دیں گے۔"

انہوں نے بات سن تو لی لیکن ان کی تشفی نہ ہوئی۔

چوک میں ٹریفک کا سپاہی ہماری طرح کے گول پتھر پر کھڑا ٹریفک کنٹرول کر رہا تھا۔ ہماری کار دیکھ کر وہ خوشی سے مسکرایا اور ہم کو سیلوٹ کیا۔ پچھلے پندرہ منٹ سے چوک میں سے کوئی بھی سواری نہیں گزری تھی جس کو وہ اشارہ دے کر راستے پر اٹلتے۔ ہماری رہنمائی کر کے اسے خوشی ہوئی۔ میں نے اس کے قریب کار روک کر پوچھا "یہاں کونسا ہوٹل بہتر ہے؟"

وہ پتھر سے نیچے اتر آیا اور کھڑکی میں سر ڈال کر بولا "دو فرد ہو؟"

میں نے کہا "ہاں۔"

کہنے لگا "خواتین نہیں ہیں ساتھ؟"

میں نے کہا "نہیں۔"

کہنے لگا "ان کو بھی ساتھ لے آتے تو بڑا لطف رہتا۔ یہ جگہ تو مزے اڑنے اور موج میلہ کرنے کی ہے۔ تم نے کیا کیا کہ خواتین کو پیچھے چھوڑ آئے۔"

میں نے کہا "بس ایسے ہی ہے..... پھر کبھی سہی۔"

کہنے لگا "ہوٹل تو بہت سے ہیں لیکن تمہارے قابل ہوٹل قی تانو ہے۔ صاف ستھرا۔ آٹھ سو برس پرانا۔ تاریخی

مہارت، پہاڑ کے عین وسط میں، عالی شان نظارہ، خوبصورت راہرو، دلربا آتی جاتی لڑکیاں۔"

میں نے اس سے ہوٹل "قی تانو" کا پتہ پوچھ کر گاڑی پہاڑ کی چڑھائی پر ڈال دی۔

ہوٹل "قی تانو" یورپ کے اچھے، اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں سے تھا۔ اس کی دیواروں پر "تورتا" وائن کے خوبصورت اشتہار لگے تھے اور ساتھ ہنسی کی کھینچ میں پھنسی ہوئی پھیلیوں کی رنگدار تصویریں تھیں۔ یہ ہوٹل اپنی خوراک کی

وجہ سے سارے ملک میں مشہور تھا اور اس کے مختلف النوع کھانے یورپی کورین کے پسندیدہ کھانے تھے۔

ہوٹل کے کاؤنٹر پر چکیسی مونچھوں والے نوجوان نے انگریزی میں پوچھا "ڈبل بیڈروم، الگ الگ بستر؟"

شہاب صاحب نے فوراً کہا "دو سنگل روم، الگ الگ لیکن قریب قریب۔"

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سیٹی بجائی اور رجسٹر ہمارے آگے دھکیل دیا۔

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

میں نے کہا "پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں....."

کہنے لگا "کوئی مضائقہ نہیں، ہم پاسپورٹ پر اتنا زیادہ اصرار نہیں کرتے نہیں ہیں تو نہ سہی۔"

میں نے کہا "تھے ضرور لیکن وہ راستے میں امیکریشن والوں نے رکھ لیے۔"

اس نے حیرانی سے باری باری ہمارے چہروں کو دیکھا اور ہمیں کمرہ نمبر 113 کے بجائے فون کرنے لگا۔ "پروڈنٹو! پروڈنٹو!! کی پارلا سکوزی۔"

وہ فون پر پوچھ رہا تھا کہ فارن منسٹر صاحب گھر پر ہیں یا نہیں۔ ادھر سے پتہ چلتا تھا کہ نہیں ہیں۔ یہ کہہ رہا تھا کہ جب بھی آئیں انہیں فوراً ہمارے پاس بھیجیں۔ آپ کی مہربانی۔ آپ کا شکریہ۔

پھر اس نے فون بند کر کے ہمیں اکاون اور باؤن نمبر دو کمرے دیئے جو ساتھ ساتھ تو نہیں تھے، آگے پیچھے تھے۔ شہاب صاحب کا چٹنی میں اس کے ساتھ باؤن نمبر میں چھوڑ آیا اور خود اکاون کے کونے میں اپنا تھیلا پھینک کر بستر پر دراز ہو گیا۔ میں کوئی ایسا خاص تھا تو نہیں تھا لیکن بستر پر گرتے ہی نیند آگئی اور میرا خیال ہے کہ میں کوئی گھنٹہ ڈیرہ گھنٹہ گھوڑا گھوڑا سو یا رہا۔ شہاب صاحب نے بتایا کہ اس عرصے میں انہوں نے دوبارہ آکر میرے دروازے پر دستک دہلی لیکن مجھے ایک بار بھی پتہ نہ چلا۔

جب ہم غروب سے پہلے، شہر کی سیر کو باہر نکلے اور کاؤنٹر پر اپنی اپنی چابی جمع کرائی تو کاؤنٹر کلرک نے کہا "فارن منسٹر صاحب بڑی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم نے آپ کے کمرے میں گھنٹی دے کر اندازہ لگایا تھا کہ آپ سوئے ہوئے ہیں، اس لیے ہم نے ڈسٹرپ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

میں نے ذرا گھبرا کر دریافت کیا کہ فارن منسٹر صاحب ہماری تلاش میں کیوں آئے تھے تو اس نے لابی کے بڑے صوفے کی طرف اشارہ کر کے کہا "آپ خود یہ پوچھ لیجئے۔ وہ تو اس وقت سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ہم دونوں اس صوفے کی طرف بڑھے جہاں ایک موٹا آدمی بٹرت پینے کے اس درڈ پر لڑھلڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے اخبار پر ہمارے بڑھتے ہوئے سائے کی چھایا دیکھ کر اٹھا اور ہاتھ بڑھا کر بولا "میرا نام گولاپند ہے اور میں سان مریٹیکا فارن منسٹر ہوں۔ میں آپ لوگوں سے معافی مانگنے آیا ہوں کہ میرے کارندے نے انتہائی حماقت کا ثبوت دے کر آپ سے پاسپورٹ لے کر رکھ لیے۔ وہ ایک انتہائی درجے کا افسر اور حد سے زیادہ باتوئی انسان ہے۔ باتیں کرنے کے شوق میں وہ کئی حماقتیں کر جاتا ہے اور آج تو اس نے کمال ہی کر دیا۔۔۔۔۔۔ یہ رہے آپ حضرات کے پاسپورٹ اور مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے، میری منسٹری اور میرے شاف کو معاف فرمادیں گے۔ ایسی تو کوئی بات ہی نہیں تھی، پاسپورٹ تو ہم مانگتے ہی نہیں، اس کا تو ہم تقاضا ہی نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "کوئی نہیں منسٹر صاحب۔ ہمیں تو یاد بھی نہیں تھا۔ اس نے پاسپورٹ مانگے، ہم نے دے دیے۔ فارن کنسریٹ میں داخل ہوئے وقت ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔"

منسٹر صاحب دائیں بائیں موڑ کھا کر اعلیٰ سے اعلیٰ الفاظ میں معافی مانگ رہے تھے اور ہم کو بولنے کا موقع ہی نہ دیتے تھے۔ جب میں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر ان کی معافیوں کا جواب دینے کی کوشش کی تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر

کہا "اچھا یہ بتائیے کہ چرا ہے کورات ریوڑ لے کر لوٹنے وقت روشنی کی ضرورت ہوتی ہے یا کتے کی؟" میں نے پہلے ہی بھرا تھا لیکن پھر سوچا کتے کا کیا فائدہ، اگر سارا راستہ اندھیرا ہے اور ہاتھ کو ہاتھ سجاتی نہیں دیتا تو وہاں کتا کیا کرے گا۔ پھر میں نے اس کی جگہ چراغ بھرا لیکن اب سوچ رہا ہوں کہ چراغ سے روشنی تو ہوگی لیکن خالی روشنی بھیڑیے یا بچوں کا کیا مقابلہ کرے گی۔

میں نے کہا "منسٹر صاحب میرے خیال میں تو چراغ ہی ٹھیک ہے۔ روشنی ہوگی تو چراغ ہاں کچھ دیکھ تو سکے گا اور نہیں تو اپنی بلم برچھی سے حملہ آور کا بدن تو چھڑ سکے گا۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ میرا ذاتی خیال ہے۔"

کہنے لگے "اچھا اگر یہاں چراغ، کھدیں تو دوسری طرف "آبشار" ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ وہاں تو پ ہونی چاہیے۔۔۔۔۔۔ ایک منٹ ٹھہریے، میں آپ کو اشارہ پڑھ کر بتاتا ہوں۔"

میں نے لجاجت سے کہا "اس وقت ہم شام کا نظارہ کرنے جا رہے ہیں، پھر وقت نہیں رہے گا اور ہم تین دن سے زیادہ یہاں ٹھہر بھی نہیں سکتے کہ انہیں واپس جانا ہے۔"

کہنے لگے "ضرور ضرور۔۔۔۔۔۔ میں آپ کو بالکل نہیں روکوں گا۔ سان مریٹیکا شام ہی تو دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ آپ بچہ اور یا بک کی طرف منہ کر کے شام کا نظارہ کرنا، سمندر آپ کے بالکل قریب آ جائے گا۔ حالانکہ یہاں سے تیرہ چودہ میل کے فاصلے پر ہے۔"

آدھے ملکہ کا چکر لگا کر جب ہم ہوٹل لوٹ رہے تھے تو بڑے گرجے کے پاس ایک کافی ہاؤس، لوگوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا، لوگ کانوں کی تانیں اُڑا رہا تھا۔ شہاب صاحب نے کہا "یہاں بیٹھ کر ایک ایک کپ کافی پیتے ہیں، بہت ہی اچھی خوشبو ڈال رہی ہے۔"

کافی دیر انتظار کرنے کے بعد ہمیں تین کرسیوں والی ایک چھوٹی سی گول میز ملی۔ اس کی ایک کرسی پر پہلے ہی ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بخوشی ہم کو ساتھ بٹھانے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ یہ نوجوان تھوڑی تھوڑی انگریزی جانتا تھا لیکن اس کے فقر کو سیدھا کر کے ان سے مطلب نکالنا کافی مشکل ہو جاتا تھا۔ شہاب صاحب محض اس کی خوشنودی کے لیے اس سے گفتگو کر رہے تھے لیکن میں مکمل طور پر زچ ہو چکا تھا۔

وہ انگلستان جا کر قانون پڑھنا اور پھر سر بننا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس مناسب رقم نہیں تھی۔ شہاب صاحب اس سے کہہ رہے تھے کہ اگر تم ایک مرتبہ زور لگا کر کسی طرح انگلستان پہنچ جاؤ تو تمہیں وہاں بہت کام مل جائے گا، پڑھ بھی لو گے اور روٹی بھی کما لو گے۔

اس نے بتایا کہ یوں تو برطانیہ ایک طرح سے ہمارا قرضدار ہے لیکن وہاں کے لوگ اور گورنمنٹ بہت چالاک ہے۔ وہ وعدہ کر کے کمر جاتے ہیں اور سخت نادمہ قسم کے لوگ ہیں۔ شہاب صاحب کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ جب جرم فوجیں مختلف محاذوں پر شکست کھا کر واپس ہوئیں تو ان میں سے ایک بڑی ٹکڑی نے سان مریٹیکا کچھ دن پناہ لی۔ انگریزوں کو پتہ چل گیا۔ ان کے جہازوں نے اسی ٹکڑی پر ایسی اندھا دھند بمباری کی کہ ہمارا آدھا ملک ادھیڑ کر رکھ دیا۔

ہمارا جانی نقصان تو کم ہوا البتہ مالی اور ملکیتی نقصان بہت زیادہ ہوا۔ بڑی بڑی تاریخی عمارتیں ڈیہ گئیں اور سرکاری اور راسے مسئلہ علاقوں سے کٹ گئے۔ سان مریٹو کی ساری تجارت تباہ ہو گئی اور ملک دیوالیہ کی حد تک پہنچ گیا۔ پھر ہمارے سیانوں کے اصرار پر برطانیہ نے کچھ لاکھ پاؤنڈ پر جانبدارینے کا وعدہ کیا اور اس معاملے میں لکھت پڑت بھی ہو گئی مگر سات سال بیت چکے ہیں، ایک وزی تک نہیں ملی..... اگر وہ رقم مل جائے تو ہمارے کئی سٹوڈنٹس باہر کے ملکوں میں جا کر تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے ملک کا معیار زندگی بلند کر سکتے ہیں۔

”لیکن!“ وہ لیکن کہہ کر خاموش ہو گیا اور اس کے چہرے سے مایوسی چمکنے لگی۔ شہاب صاحب نے پوچھا: ”کیا بات ہے؟“ تو اس نے اپنی پیچیدہ انگریزی میں کہا: ”ایسے ملک کا قانون پڑھنے سے کیا فائدہ جو خود نادمہندہ ہے اور اپنے معاہدوں پر عمل نہیں کرتا۔“

شہاب صاحب نے ایک اچھے آئی سی ایس آفیسر کی طرح انگریزوں کا پورا پورا ساتھ دیتے ہوئے اس کی بہت تشفی کی کہ علم کے میدان میں ان سے بہتر اور کوئی تو نہیں، اس لیے ان کا علم حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوتا ہے۔ اس نوجوان کے ذہن میں ایک عجیب سا لٹاکرا اتر اور وہ فنی میں سر ملاتا ہوا ہم سے ہاتھ ملا کر کافی پارلے سے باہر نکل گیا۔

جس لڑکی نے ہمارے سامنے کافی کا سامان لا کر رکھا، اس کا قد بہت بہت ہی کمال کا تھا مگر شکل و صورت کی معمولی تھی۔ شہاب صاحب نے ایک دیسی آدمی کی طرح اس پر کوئی توجہ نہ دی لیکن میں جو دلالت میں رہ کر قد و گیسو کی قدر و قیمت پر جان گیا تھا، اسے دیر تک اور دور تک دیکھتا رہا۔ اس کا جسم ایسے موسمی جیسے تھا جس میں ابھی ابھی جان پڑی ہو اور کسی نے اسے ہاتھ لگا کر بھی نہ دیکھا ہو۔ میں نے سوچا کہ جب وہ برتن اٹھانے آئے گی تو میں اسے اور غور سے دیکھوں گا، خاص طور پر جب وہ جھک کر برتن اٹھائے گی اور چھوٹے تولیے سے میز صاف کرے گی۔

شہاب صاحب نے کہا: ”مرد روز ازل سے عورت کی محبت میں گرفتار چلا آتا ہے اور اس کو سمجھ نہیں آتی کہ اس معاملے میں کیا کرے۔ دنیا کا ہر مرد عورت سے خواہ وہ کہیں کی رہنے والی ہو، کسی بھی رنگت اور شکل کی ہو، کسی بھی سوشل اور اکنامک سٹیشن کی ہو، مرد اس پر ضرور پیشہ غلطی ہو کر نکلے گا اور دور تک اسے یاد کرتا جائے گا۔“

میں نے کہا: ”سراگر یہ نہ ہوتا تو دنیا کا اتنا بڑا لٹریچر ابھی اپنی ابتدائی شکل میں ہوتا اور اس وقت تک مشکل سے سو تیرہ کتابیں چھپی ہوتیں۔ اب یہ جو آپ کتابوں کا ایک سمندر دیکھ رہے ہیں، اپنے آگے پیچھے اور دائیں بائیں تو یہ سب عورت کے وجود ہی کی برکت سے ہے..... کیا دنیا میں کوئی لٹریچر عورت کے ذکر کے بغیر وجود میں آ سکتا ہے؟“

کہنے لگے: ”شاید تم ٹھیک کہتے ہو، بظاہر تو ایسا ہی نظر آتا ہے مگر حقیقت اس سے مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔“

پھر ہم ایسے ادب کے بارے میں باتیں کرنے لگے جس میں بھلے عورت کا ذکر تھا لیکن وہ اس کی چول نہیں تھی کہ سب کچھ اسی پر گھومے جاتا۔ ہوتا پیدائش تھے۔ کلیہ دوم نہ الیپ کی کہانیاں۔ بدھ جاک اور باؤل کہانیاں۔ ان سے بڑا

شہاب صاحب نے دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا: ”کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ آپ کیوں تلف کرتے ہیں۔ معمولی سی بات تھی، آئی گئی ہو گئی۔ غیر ملکی سفر میں تو یہ معمولی سی بات ہے۔ کبھی پاسپورٹ رکھ لیے جاتے ہیں، کبھی بذریعہ ڈاک واپس بھیج دیئے جاتے ہیں۔“ پھر انہوں نے میری طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا: ”ان سے ملیے، میرے دوست اشفاق احمد، ہمارے ملک کے نامور کہانی نویس۔“

مشرق وسطیٰ میں اچانک بڑھ گئی اور ہم کو کثیر زرمبادلہ کی نوید مل گئی۔ ہم نے پرسوں ہی اپنی فوج میں دس جوانوں کا اضافہ کیا ہے جو بڑے اچھے نشانہ باز اور قابل شمشیر زن ہیں۔ ان کی تربیت کے لیے زیادہ زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔“

شہاب صاحب نے ایک ذہین بیوروکریٹ کی طرح پوچھا۔ ”جنرل صاحب آپ کی فوج کتنے نفوس پر مشتمل ہے؟“ تو انہوں نے فخریہ انداز میں سرا پر اٹھا کر کہا ”بارہ سو افراد پر..... لیکن اب وہ بڑھ کر بارہ سو دس ہو گئی ہے۔ سب کے سب سو ما سپاہی اور اعلیٰ پائے کے آفیسر ہیں۔ یہ ایک مرتبہ ایڈوانس کر کے پسپا ہونا نہیں جانتے۔ جہاں ڈٹ جائے ہیں، کٹ جاتے ہیں لیکن واپس نہیں ہٹتے۔“

شہاب صاحب نے کہا ”آپ بہت خوش قسمت جرنیل ہیں جن کو ایسی اچھی فوج ملی ہے ورنہ دوسری جنگ عظیم کے بعد تو سب کرائے کے سپاہی بن گئے ہیں۔“

انہوں نے کہا ”ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے۔ ہم دوسری جنگ عظیم میں نیوٹرل تھے، نہ اتحادیوں کے ساتھ نہ دشمنوں کے ساتھ۔ اس فیصلے سے ہم پر کافی مصیبت آئی لیکن ہم نے میدان نہیں چھوڑا اور ہماری ساری فوج نے ہر طرح کے دشمنوں میں دل کھول کر دوا و شجاعت دی۔“

دوا و شجاعت کے بارے میں مجھے ہمیشہ یہی لگتا تھا کہ ایک فوجی مشاعرہ ہو رہا ہے اور سارے جوان سادہ دلوں کے بجائے بڑھ چڑھ کر دوا و شجاعت دے رہے ہیں اور شاعروں کا دل گرام رہے ہیں..... اطالوی زبان میں بھی کچھ کچھ اسی طرح کی دوا و شجاعت کا محاورہ عام ہے جس کا مطلب شجاعت سے کچھ کم درجے کی بہادری اور بازاری ہے فوجی ہوتی ہے۔

جنرل نے کہا ”میں تو خیر بعد میں بھرتی ہوا لیکن میرے پیش رو آفیسر اور جوان بتاتے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم میں برطانوی بمبارطیاروں نے ہم پر شدید بمباری کی۔ ہماری فوج اس بمباری سے گھبرائی نہیں اور ڈٹ کر اس آفت کا مقابلہ کرتی رہی۔ ہمارے بہت سے جوان مارے گئے لیکن برطانیہ کا ایک حملہ آور جہاز ایک ایک میں کسی اندرونی خرابی کی وجہ سے کریش کر گیا۔ اس کے دونوں آفیسر، پائلٹ اور گریجویٹ اسٹوٹ کے ذریعے نیچے اتر آئے۔ ابھی ہم ان کو گرفتار کرنے جا ہی رہے تھے کہ ان کے اپنے جہازوں نے اندھا دھند سٹرٹنگ سے ہماری جوانوں کے ساتھ ان کو بھی جہنم واصل کر دیا لیکن ہم نے ان کی بڑی عزت افزائی کی۔ ان کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا۔ سارے شہر میں ان کے جنازے کو گھمایا۔ جگہ جگہ جنازہ رکھنے کے اعلان کیے۔ لوگوں نے کھڑکیوں اور دروازوں سے ان پر پھولوں کی بارش کی..... کیا آپ نے ان کے مزار دیکھے ہیں؟“

میں نے کہا ”نہیں، ابھی تک تو ان کی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔ البتہ کل ضرور جا کر دیکھیں گے۔“
کمانڈر انچیف صاحب نے کہا ”ان کے ساتھ ایک بڑا خوبصورت بانچہ ہے۔ لڑکے لڑکیاں شام کو وہاں مہمانی کرنے آ جاتے ہیں اور صبح تک محبتوں میں مصروف رہتے ہیں..... ان دونوں قبروں کی نگہداشت اور اس بانچے کی نگرانی پر داخت کے لیے برطانیہ سے ایک سو پانچ ماہانہ وصول کرتے ہیں جو روم میں برطانوی ایجنسی ہمیں پہلی کی پہلی بھجوا دیتی

ہے۔ بڑا یادگار مانومنٹ ہے، ضرور دیکھیں گے۔“

میں نے کہا ”سرمہارا پہلے ہی سے پروگرام ہے اور اس کے لیے ہم نے کل شام کا وقت مقرر کیا ہے۔“
پھر وہ تینوں ایک دم اچانک اٹھے اور ہم سے معذرت مانگ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ شہاب صاحب نے کہا ”آپ بیٹھیں، میں ابھی اپنے کمرے سے ہو کر آتا ہوں۔“

شہاب صاحب جب بھی اپنے کمرے سے ہو کر آتے ان کی آنکھیں سرخ اور چہرہ جھٹمایا ہوا سا ہوتا تھا تو دیر تک وہ بات کرنے کے قابل نہ ہوتے۔ پھر جب گفتگو شروع کرتے تو ان کے منہ سے ہلکے ہلکے بھپارے سے اٹھتے۔ میں نے اس قسم کی شراب کی خوشبو اس سے پہلے کہیں محسوس نہ کی تھی۔ ایک ڈچ لڑکی جو باؤ سانی سے فارسی پڑھتی تھی، اس کے منہ سے البتہ ایسی سنگدہ آ کر تھی لیکن کبھی کبھی شہاب صاحب بھی چونک۔ ہالینڈ سے تشریف لائے تھے، اس لیے اس قسم کی شراب کے عادی دکھائی دیتے تھے۔ ان کا کوئی ان کے اٹیچی کیس میں بند تھا اور وہ مقررہ وقت پر جا کر اس میں سے ایک چمکی لگا آتے تھے۔

پتہ نہیں ان کو اسے چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بھی پڑھے لکھے تھے، میں بھی تعلیم یافتہ تھا۔ پھر ہم دونوں اب کے طالب علم تھے۔ لکھنے لکھانے والے اس فعل کو چھپاتے نہیں بلکہ اجاگر کرتے ہیں۔ اس میں جتنا نہ بھی ہوں تو بھی اس کا ذکر بڑے شوق و متاعش سے کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک انسان خطا کا پتلا ہوتا ہے اور اس کی ہر خطا قابل عقید اور قابل معافی ہوتی ہے۔ پھر شہاب صاحب اپنا فیصل مجھ سے چھپا کیوں رہے ہیں اور اس پر شرمندہ ہو کر کنارہ کشی کا رویہ کیوں اختیار کر رہے ہیں؟ میں تو کچھ نہیں کہتا، مجھے تو اس قسم کے فعل اور ایسی زندگی دل و جان سے پسند ہے۔ پھر وہ کیوں گھبراتے ہیں اور خود کو چور کس لیے محسوس کر رہے ہیں۔

اصل میں شہاب صاحب ایک متوسط گھرانے کے فرزند تھے۔ اس لیے ان پر آئی سی ایس کی قلمی ٹھیک سے نہ چڑھی تھی۔ جب تک وجود پر نخوت کے سہاگ کا چھوڑا نہ دیا جائے تب تک قلمی پکڑ نہیں کرتی۔ پہلے چٹاخ پڑتے ہیں پھر ساری ہلک دمک ختم ہو جاتی ہے۔ ایک اچھے بیوروکریٹ کے لیے آؤل تو ایک منکبہ گھرانے کا فرد ہونا ضروری ہے، اگر نہ ہو تو خود اپنے اندر ایسے خناس کو جنم دینے کی احتیاط رہے جو ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی اس کو نہ چھوڑے۔ پہلے اوروں کو ڈراتا رہے پھر صاحب کے خاتمے کا باعث بن کر جنازہ گاہ تک اس کے ساتھ جائے۔

آپ کو زندگی میں بڑے اچھے اچھے اور پیارے پیارے بیوروکریٹ ملیں گے۔ ان کے چہرے مختلف اور آنکھیں روشن ہوں گی۔ بڑے خوش مزاج اور بذلہ رخ ہوں گے لیکن ان کے اندر بھی نخوت اور خناس کی چمکی خناس کی ڈبیہ میں بند نہ کسی جیب میں موجود ہوگی۔ اچھی حالت اور خوشگوار موڈ میں بھی ڈبیہ نکال کر، چمکی مار کر اندر سے خناس کی نثار کی ایک چمکی اٹھائیں گے اور دونوں نکتوں میں باری باری لے کر اتنے زور کی چھینک ماریں گے کہ سارے ماحول کو خوفزدہ کر دیں گے۔ محفل میں کچھ لوگ سبحان اللہ، یرحمک اللہ کہیں گے، کچھ شرمندگی کی ہنسی فہس کر کہیں گے ”میں تو ڈری گیا تھا“ باقی کے حاشیہ بردار سمجھائیں گے کہ اسی دبدبے نے تو ان میں بے خوفی پیدا کی ہے۔ ایسا سچا۔ آئسٹ، شفاف اور

بے خوف آفسر آج تک اس محکمے میں آیا ہی نہیں..... مبارک ہو!

شہاب صاحب بڑے دو، شرمیلے، محجوب اور دھیمے انسان تھے۔ ان کے اندر ڈرانے کی صلاحیت نہیں تھی۔ رسانی اور اذیت ارزانی کی صلاحیت سے بھی محروم تھے۔ چند روز میں میں نے بھانپ لیا کہ یہ تو مجھ سے بھی زیادہ کمزور اور ڈرپوک آدمی ہیں۔ ان کو آئی سی ایس ہونا زیب نہیں دیتا۔ وہ جو میں نے اپنے سکول میں ایک آئی سی ایس کی آمد کا وہاں دیکھا تھا اور جس شیر کا نقشہ اپنے تصور میں باندھا تھا، ان میں سے ایک بات بھی شہاب صاحب میں موجود نہیں تھی۔ میرا ان سے کچھ مایوس سا ہوا تھا!

ادب پر بات کرتے ہوئے جب میں نے ان کی شاعری کی تعریف کی اور انگریزی شاعروں کے ترجموں سے لطف اندوز ہونے کا اظہار کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ وہ طالب علمی کا زمانہ تھا اور ان کی باتیں ہر طالب علم سے سرزد ہو جاتی ہیں، ان میں کوئی کمال کی بات نہ تھی۔

جب معاملہ ان کے معرکتہ آرا ناول پر آتا تو سر جھٹک کر کہتے، بڑی بھول ہو گئی۔ مجھے ایسا ناول لکھنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ مثبت کی بجائے منفی رنگ اختیار کر گیا، کاش میں اعلان کر سکتا کہ میرا اس ناول سے کوئی تعلق نہیں۔

پھر پہاڑ کی ڈھلان پر کسی اونچی سی سنگلاخ چٹان کے ایک چھوٹے سے قبوے خانے میں اردو ادب کی عکس اور جلالت کا ذکر ہوتا تو وہ ہوں ہاں کہہ کر بات آئی گئی سی کر دیتے، وہ گرجوٹی جوان سے پہلی ملاقات میں محسوس ہوئی تھی اور جس کا اظہار انہوں نے ایک سحر طراز مقرر کی طرح نظام ہونٹ میں کیا تھا، اب وہ مفقود تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی اور شہاب صاحب سے مل رہا ہوں جن کی صرف شکل پرانے شہاب صاحب سے ملتی ہے۔

کبھی کبھی گفتگو کے دوران وہ اپنی ہوں ہاں کے درمیان کچھ ایسے فقرے بھی چھوڑ جاتے جن کا بظاہر ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہ ہوتا لیکن رات کو سوتے وقت ان کی گونج دوسرے سارے مباحث پر چھا جاتی۔ ایک اور ہی دنیا ہم لے کر سامنے آ موجود ہوتی۔

میں بڑے سائز کے ”ادبی دنیا“ اس کے میراجی، اس کے نامور افسانہ نگار عاشق حسین بناوٹی کا ذکر مزے لے لے کر کر رہا تھا شہاب صاحب نے مسننا تو ہوئے کہا ”اشفاق صاحب! کسی شخص کو بھی اس کی شخصیت اور فردیت بنی بنائی نہیں ملتی۔ یہ اس کو محنت کر کے اور مشقت اٹھا کر بنائی پڑتی ہے۔ یہ رحمت بھی ہے اور زحمت بھی۔ رحمت تو اس لیے کہ انسان کو مکمل آزادی عطا کرتی ہے کہ جو بھی راستہ چاہو چن لو، جہیں اختیار ہے اور زحمت اس لیے کہ ہر دم اس بات کا ہرجا لگا رہتا ہے کہ موت اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ کسی وقت بھی مار گرائے گی اور انسان کچھ کیے بغیر انسان بنے بغیر اس دنیا سے چلا جائے گا۔“

میرے دل میں ان کی یہ بات سن کر ایک خوفناک سوال پیدا ہوا لیکن میرا سوال سننے سے پہلے انہوں نے کہا ”آپ کو یہ تو پتہ ہے کہ آپ ہیں۔ آپ کا وجود موجود ہے لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں کہ آپ کون ہیں تو پھر آپ کس طرح سے اپنی رہنمائی کر سکتے ہیں؟ کیسے خود کو ڈرائیو کر سکتے ہیں کیونکہ اپنا گیئر بدل سکتے ہیں..... دنیا میں سب سے بڑا عذاب

بہرپ ہے یعنی آپ وہ بننے کی کوشش کریں جو آپ نہیں ہیں۔ گوساری دنیا اس عذاب میں مبتلا ہے لیکن اس سے عذاب کی بجائی میں تو کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ ہماری اکثریت، ننانوے فیصد لوگ بہرپ کے عذاب میں زندگی بسر کر کے چلے جاتے ہیں اور آگے چل کر بھی اس عذاب کا تسلسل قائم رہتا ہے۔“

میں نے کہا ”پھر.....؟“

کہنے لگے ”بہتر یہی ہے کہ آپ اپنے آپ کو چائیں، خود کو پہچانیں، اپنی اصل کہنہ ڈھونڈیں اور اس کے مطابق زندہ رہیں۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ ایسی زندگی سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں۔ جان کا رلوگ اسی کو دنیا میں جنت کہتے ہیں اور اسی کو سوگ کے جھونے بولتے ہیں۔“

میں نے کہا ”شہاب صاحب، معاف کیجئے گا، ہم ادبی دنیا کی اور ادب کی بات کر رہے تھے اور ان بڑے لوگوں کا ذکر کر رہے تھے جنہوں نے علم کے دریا بہائے ہیں۔ جن سے ہم نے لکھنا سیکھا ہے اور جن کے افکار کی خوشہ چینی کر کے ہم یہاں تک پہنچے ہیں.....“

”بے شک! بے شک!!“ انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا ”وہ واقعی کمال کے لوگ ہیں اور بڑی نامور ہستیاں ہیں لیکن اصلی علم کی نشانی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ عاجز، دھیمے، نرمل اور فروتن ہوتا ہے۔ جو علم عاجز، دھیمے اور نرمل نہ ہو، وہ علم نہیں ہے۔ علم کا زور دار اظہار اور اس کا نمائندگی انداز اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ علم اپنا نہیں گھنیں سے اٹھایا ہوا اور چرایا ہوا ہے..... آپ نے کبھی سائنس دانوں کی تحریریں دیکھی ہیں؟“

میں نے غمی میں سر ہلایا تو انہوں نے کہا ”سائنس دان اور صوفی چونکہ اپنے اوپر گزرے ہوئے واقعات اور اپنے پرکھے ہوئے مشاہدات کا اظہار کرتے ہیں، اس لیے ان کا علم بڑا سچا، سچا اور دھیمہ ہوتا ہے۔“

میں چونکہ ان دونوں فرقوں میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا تھا، اس لیے مجھے ان کی بات نے متاثر نہ کیا اور میں نے اس کے اس خیال کی تائید نہ کی۔

وزیر خارجہ سینو گولا کی طبیعت پر ہمارے پاپیوٹ روڈ کے جانے کا ایسا بوجھ تھا کہ وہ دن میں کم از کم دوسرے فون کر کے ہماری خیریت معلوم کرتا، آج شام اس نے کھانے پر بلایا تھا اور اصرار کیا تھا کہ میں گاڑی لے کر آؤں گا اور خود ساتھ لے کر جاؤں گا۔

ٹھیک سات بجے وزیر خارجہ اپنی ”نیل و دیرے“ گاڑی لے کر آ گئے۔ ان کی یہ گاڑی میری گاڑی سے آٹھ انچ لمبی اور چار انچ چوڑی تھی اور اس کے وائپر بن و پانے سے خود بخود چلنا شروع کر دیتے تھے۔ میری گاڑی میں سٹیرنگ سے ایک طرف گراموفون جیسی چابی لگی تھی جس کو گھمانے سے وائپر چلتے تھے۔ جب وائپر سکرین بارش کی وجہ سے بالکل اندھی ہو جاتی تو گاڑی چلانے والا بار بار چابی گھما گھما کر وائپر چلاتا تھا اور پانی کی چادر تار لیتا تھا۔ اگر بارش زیادہ تیز ہو جاتی تھی تو گاڑی سڑک کنارے روک لی جاتی تھی اور بارش کے رکنے کا یا اس کے مدہم ہونے کا انتظار کیا جاتا تھا۔ تیز بارشوں میں آدمی سڑکوں کے کنارے میری جیسی گاڑیوں کی قطار لگ جاتی تھیں۔

خیال میں تین کم ہیں بعد میں ہمیں اور منگوانا پڑے گی۔“

شہاب صاحب نے کہا ”اس سے کہو کہ ایک ہی کافی ہے۔“

میں نے کہا ”عرض کر دیا ہے سر! لیکن یہ نہیں مانتا، اس کے خیال میں آخر میں ایک اور منگوانی پڑے گی۔“

ہماری باتوں کی سنک پا کر اس نے کہا ”وہ لائے گی تو ایک ہی اور اپنی طلائی تھالی میں ڈالنے کے بعد واپس چلی جائے گی۔ پندرہ بیس منٹ بعد دوسری لے کر آئے گی اور پھر اتنی ہی دیر بعد تیسری۔ اس پھلی کا ذائقہ بھی غضب کا ہے لیکن لوگ یہاں پر پھلی کے پنجر سے گوشت چھڑانے کا نظارہ کرنے آتے ہیں۔ یہ کام ان روپوش لڑکیوں کو ہی آتا ہے اور کوئی نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔ وہ جب آئے گی تو آپ خود دیکھ لیں گے!“

شہاب نے گردن گھما کر دور دور تک پھیلے برآمدوں کا جائزہ لیا اور پھر کہنے لگے۔ بہت ہی عجیب سا آرکٹیکچر ہے۔ ہوٹلوں کی شکل و صورت سے ماوراء لیکن ان بھوجن گھروں نے اس میں کیا حسن پیدا کر دیا ہے۔ میں نے ایسی شایہ طعام گاہ اور کہیں نہیں دیکھی۔

وزیر خارجہ نے کہا ”اپنے ساتھی کو بتائیے کہ اصل میں یہ طعام گاہ نہیں ہے بلکہ ہمارے ملک کی جیل کی بلڈنگ ہے۔ ملکی کاکرٹیس نے زرعی خرچ کر کے اور معروف اطالوی آرکیٹیکٹ سے نقشہ بنوا کر تعمیر کی تھی لیکن افسوس کامیاب نہ ہو سکی۔“

ہم دونوں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا!

چھپنے لگا۔ پندرہ تیس سال تک یہ جیل خالی اور ویران پڑی رہی۔ سارے ملک میں کوئی کرائم ہی نہ ہوا کہ جرم کو پکڑ کر اس میں قید کرے، ہمیں لیے نہ تو اسے استعمال میں لایا جاسکا اور نہ ہی اس کی کوئی افادیت رہی۔ چنانچہ آٹھ برس پیشتر قومی اسمبلی نے فیصلہ کیا کہ اس بلڈنگ کو فروخت کر دیا جائے۔ پھر ہمارے ملک کے علاوہ پڑوسی ملک اٹلی سے بھی کچھ خرید آئے لیکن کسی کے ساتھ سودا نہ ملے ہو سکا۔ آخر کار اس جیل کے جیلر کی عرضداشت پر کہ میں نے تینیں برس تک اس جیل کی نگہداشت کی ہے اور ایمانداری اور نیک نیتی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی ادا کیے ہیں اس لیے جیل کی یہ بلڈنگ مجھے قسطوں پر فروخت کر دی جائے۔ گجینٹ نے متفقہ طور پر اس عرضداشت کو منظور کر لیا اور جیل کی بلڈنگ جیلر کے حوالے کر دی۔“

ہم بڑے شوق سے اس کی کہانی سن رہے تھے اور میں حسب ارشاد بڑی تیزی کے ساتھ اس مکالمے کا ترجمہ کیے جاتا تھا۔ شہاب صاحب نے چھوٹے چھوٹے چپوں کی طرح کہا ”پھر کیا ہوا؟“

تو وزیر خارجہ نے کہا ”پہلے تو اس نے جیل کے گیٹ پر پھولوں کی فروخت کا اہتمام کیا اور خود گل فروش بن کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے ساتھ والی دیوڑھی میں ہتیرا کا تنور لگا لیا اور گتے کے ڈبوں میں ہتیرا سپلائی کرنے لگا۔ بس اس ایک شاپ نے اس کی قسمت بدل دی۔ اور اس نے دو بڑی بیرکیں کھول کر وہاں ہتیرا اور پاستا کا کام شروع کر دیا۔ کچھ میزیں اور کرسیاں بھی لگا لیں۔ لوگ شام کے وقت گھروں سے آنے لگے اور جیل خانے کا ابتدائی دنگ ایک اعلیٰ درجے کی طعام گاہ بن گیا۔“

وزیر خارجہ جب ہم کو اپنے ساتھ بٹھا کر ہوٹل سے باہر نکلے تو انہوں نے غلطی سے واپس کاٹھن دیا۔ واپس دو تین دفعہ خشک شیشے پر ناصیر فرسائی تو انہوں نے جان بوجھ کر معذرت کرتے ہوئے کہا ”معاف کیجئے گا، بے خیالی میں بٹن دب گیا۔“ وزیر خارجہ سینورنگولا پندے دنیا کے کسی بھی وزیر خارجہ کی طرح فراخ قدم، آکڑی گردن، مکلف لباس اور ڈوری والی عینک کا حامل تھا۔ یہ ایک شیشہ موڈکل نہ تھی، دو شیشوں والی پوری عینک تھی مگر اس کی کمائیاں نہیں تھیں۔ یہ ڈوری سے بندھی گئے میں لگتی تھی اور لگاتے وقت دو شیشوں کی درمیانی خشکی ناک پکڑ لیتی تھی۔ میں نے تجربے کے طور پر عینک لگا کر دیکھی تو آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ وزیر خارجہ نے کہا ”شروع شروع میں ایک دو دفعے ہلکا سا گرہ ہوتا ہے اس کے بعد پریکٹس ہو جاتی ہے۔“

جس ریسٹوران میں ہم کھانا کھانے لگے، وہ کوئی ہوٹل نہیں تھا، ایک لمبی چوڑی خوبصورت سی جو ملی تھی جس کے برآمدوں میں نیزوں پر روشنی شمعیں روشن تھیں اور ملحقہ بالوں میں انواع و اقسام کی اشیائے خورد و نوش منجھیں۔ ایک امریکی طرز کا باربی کیو تھا۔ دوسرے ہال میں اطالوی موسیقی کے ساتھ ہتیرا اور پاستا کھانے والے تھے۔ ساتھ بڑے بڑے سان مریو کی مقامی وائن ”تورتا“ کا چھت تک اونچا پہاڑ تھا۔ ایک زاویے میں سمندری خوراک کے کئی مثال تھے۔ ایک قطار میں ایسے کھا جاسٹینڈ تھے جہاں سبزی خوروں کی طلب کا سامان بہم تھا۔

ایک دوسرے کو کراس کرتے برآمدوں کے پیچھے عجائب گھروں جیسے بڑے بڑے ہال تھے جہاں انہوں نے کھانوں کا ٹھانڈہ بندھا تھا اور جہاں بیٹنے والی موسیقی خاص انہی بالوں کے لیے ترتیب دی جاتی تھی۔

وزیر خارجہ نے کہا ”آج آپ کو بٹی میں لپنی اور بھول میں دم پخت ایسی مچھلی کھاتے ہیں جس کے گوشت بڑا دام کے شگوفوں کی سی خوشبو ہے۔“ شہاب صاحب مچھلی کا نام سن کر اور وہ بھی بھول میں پکی ہوئی کی خبر پا کر پر ہائے ہو گئے۔ انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے بھابی میں کہا ”وزیر خارجہ کی تنخواہ ہمارے یہاں کے محمد دین ہیڈ کلرک سے زیادہ نہیں ہوگی، اس لیے اس پر مناسب بوجھ ہی ڈالنا۔ میرے خیال میں ایک مچھلی کافی رہے گی۔ باقی ہم روٹی توں ہاں خیر و غیرہ ٹھوس کر پیٹ بھر لیں گے۔“

جب لڑکی آرڈر لینے آئی تو میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ سفید چادر میں ملبوس دو دھیا بدن کی لمبی سی لڑکی، ایک کندھا ننگا، دوسرے پر سے گزرتی ہوئی یک جہی چادر، کانوں میں آدیزے، بالوں میں پھول، لمبی پانبوں میں بلور کے فقیرانہ کڑے۔ ہاتھ میں گول طلائی سینی میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ تیلن آف ٹرائے تھی جو ہماری خوشنودی کے لیے یہاں تک آچکی تھی۔

وزیر خارجہ نے اسے تین مچھلیوں کا آرڈر دیا۔ تو میں نے کہا ”ہم کچھ زیادہ مہاشور نہیں ہیں۔ نہ ہی ہم کو اس کا عادت ہے۔ تین مچھلیاں زیادہ ہیں، ایک ہی منگوا لیجئے۔ یہاں اور بھی تو اچار چٹنیاں، مرے اور سلا د رکھا ہے وہ کھا کر آئے گا بھلا۔“

وزیر خارجہ نے کہا ”یہ مچھلی کچھ زیادہ بڑی نہیں ہوتی، ایک ایک کھا کر بھی ہم بھوکے ہی رہیں گے۔ میرے

”اس جیل خانے کا جو شاف بے کار اور بیروزگار پھر رہا تھا۔ وہ ایک وفد بکر جیلر کے پاس آیا کہ ہمارے لیے بھی روزگار کا کوئی بندوبست کرو اور ہماری وفاداریوں کا بھی کچھ پاس کرو تو اس نے بندی خانوں کے چند روپے سپاہیوں کو بیروں کی وردی پہنا کر بیرے رکھ لیے جو تین بیدارنے والے شلاق زن تھے، ان کو آنا گوندھنے اور پیڑے بنانے پر مامور کر دیا۔ دو پچاسی گھر کے جلاد تھے، انہیں گوشت کاٹنے اور قیہ بنانے کا ہنر سکھا کر ملازم رکھ لیا۔ اس وقت پرانی جیل کا شاف اس کا ملازم ہے۔ پچھلے تیس سال تو انہوں نے تنکا دہرا کر کے نہیں دیا لیکن اب بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کرتے ہیں اور اس سارے کارخانے کی دیکھ بھال ان کے ذمے ہے۔“

شہاب صاحب پچھوانے لگے ”اب اس گل فروش اور نیک دل جیلر کا کیا حال ہے؟“

وزیر خارجہ نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا ”اب ایک طرح سے وہ اس ملک کا بے تاج بادشاہ ہے اور بڑے بڑے سرکاری افسر اور سیاستدان اس کی منشی میں ہیں، رشوتیں دیتا ہے۔ ملازموں پر جرمانے کرتا ہے۔ بھاری بھاری پکڑی لے کر کسی برآمدے کا ایک کونہ دکان کے طور پر دیتا ہے۔ پورا اکرم نکس نہیں دیتا۔ لڑکیوں کے ساتھ بدزبانی کرتا ہے۔ جب وہ جیلر تھا تو بہت ہی نفیس انسان تھا۔“

”وہ اس وجہ سے“ شہاب نے کہا کہ ”جیل خالی تھی اور اب بازار بھرا ہوا ہے، بھری ہوئی چیز طاقت کا سرچشمہ ہوتی ہے اور طاقت کبھی بھی سیدھی راہ پر نہیں رہتی۔ اسے سیدھا رکھنے کے لیے بڑے مضبوط بند اور قوی جیکل ڈیم بنانے پڑتے ہیں۔“

سینور گولانڈے نے کہا ”آپ کے دوست بالکل ٹھیک کہتے ہیں، شاید سب جگہ ایسے ہی ہوتا ہے۔“

میں نے کہا ”آپ کو بتایا تو تھا کہ یہ ہمارے ملک کے سب سے بڑے رائٹر ہیں اور انہوں نے.....“

لیکن میری بات سچ ہی میں رہ گئی کہ ہیلن آف ٹرائے مچھلی لے کر آ گئی۔

اس نے اپنی گول طلائی فٹسٹری ہمارے سامنے رکھی۔ موی تھیلے سے مچھلی نکالی۔ اس کے اوپر کی مٹی اتار لی اور مچھلی کو دم سے پکڑ کر ہمیں اس کی دونوں سائڈیں دکھائیں۔ دم دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ کر اور بائیں بازو فرش کے متوازی کر کے اس نے لٹکتی ہوئی مچھلی کو اس طرح سے جھٹکا دیا کہ سارا گوشت نیچے رکھی ہوئی رکابی میں جمع ہو گیا اور دراپوش لڑکی کے ہاتھ میں مچھلی کا خالی پنجبرہ گیا۔ اس نے پنجبرہ کو اس موی لفافے میں ڈالا اور ”بھوک مبارک“ کہہ کر واپس چلی گئی۔

وزیر خارجہ نے کہا ”آپ نے جھٹکا دیتے وقت اس لڑکی کا بدن دیکھا تھا؟“

ہم دونوں نے ایک ساتھ کہا ”نہیں..... ہماری توجہ تو صرف مچھلی پر تھی جو ایک ہی جھٹکے کے اندر تھی میں قیہ بن کر جمع ہو گئی تھی..... بدن کو کیا ہوا؟“

اس نے کہا ”میں لوگ مچھلی کھانے تو کم آتے ہیں، چادر کے نیچے لڑکی کے کھلے بدن کی نرت دیکھنے آتے ہیں..... تم نے بالکل کچھ نہیں دیکھا؟“

ہم نے ایک زبان ہو کر کہا ”نہیں۔“

سینور گولانڈے نے کہا ”اچھا جب دوسری مچھلی لائے تو غور سے دیکھنا۔“

جب دوسری مچھلی آئی تو ہم نے اپنی نگاہیں ہیلن آف ٹرائے پر مرکوز کر دیں۔ ہمارے اس شعوری ارتکاز کو بہاؤ کر دہ مچھلی سے مٹی اتارتے ہوئے ذرا سا سکرانی اور پھر مچھلی کو دم سے پکڑ کر اس نے داد طلب نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا۔

ہاتھ کے ایک خفیف سے جھٹکے سے اس کا سارا بدن سر سے پاؤں تک کچھ انداز سے دھڑکا کہ ہمیں ردا کے اندر سے بدن کی آواز آئی۔ اس اک ذرا سی حرکت سے مجھے ایسے لگا جیسے کسی گھابن نے خوف کی بو پا کر اپنی نشست سے پہلی چوڑی بھری ہوا اور پھر اس کا دم نظروں سے اوجھل ہو گیا ہو۔

ہمیں حیرت میں گم دیکھ کر ہمارے میزبان نے کہا ”یہ بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔ جس طرح نیلے افس کے لیے چھوٹی بچیوں کو شروع سے تیار کیا جاتا ہے، اسی طرح مچھلی جھٹکنے کا فن بھی اوائل عمر ہی سے سکھایا جاتا ہے۔“

سینور گولانڈے نے اپنے جسے کی مچھلی کا ایک بڑا سا جھج اپنی قاب میں ڈالتے ہوئے کہا ”ایسا ہی ایک روح و بدن کا اجراع میں نے ترکی کے رقاص درویشوں میں دیکھا تھا۔ انہیں بھی بچپن سے پاؤں کے انگوٹھے میں کیل پکڑ کر بدن کو ہلکا کرنا سکھاتے ہیں۔ وہ بھی بڑا مشکل فعل ہے..... آپ نے دیکھا ہے؟“

ہم دونوں نے نفی میں سر ہلایا تو اس کو بڑا افسوس ہوا کہ وہ رقص ہمارے دیکھنے کی چیز تھی۔

بڑی دیر تک ہم اس جوبلی کے بظنی دالان میں بیٹھے گپ کرتے رہے۔ سینور گولانڈے ہم کو بیوے میں سے نکال کر اپنی فلمی کی تصویریں دکھائیں جن میں اس کے بچے، پوتے، بیٹے، بیویں بھی شامل تھے۔ ہمارے دیکھ چکنے کے بعد اس نے اس تصویر کو ایسے غور سے دیکھا شروع کیا جیسے وہ اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو۔ اس کی آنکھوں سے محبت اور پردگی کے چشمے پھوٹ رہے تھے اور وہ اپنی فلمی پرستار ہو جاتا تھا۔

سان مارینو کے لوگ بڑے خوش طبع، خوش شکل اور خوش بیان لوگ ہیں۔ بہت اچھی، بے حد خوشگوار، دلچسپ اور عمدہ دار باتیں کرتے ہیں۔ کسی سے لڑتے جھگڑتے، اونچا بولتے یا راست کاٹ کر آگے نہیں بڑھتے۔ سر ہلکا کر مسکرا کر سلام کرتے ہیں اور سر ہلکا کر ہاتھ پھیلا کر سلام کا جواب دیتے ہیں۔ مالی طور پر خوشحال اور فارغ الباس ہیں۔ یوں تو کھیتی باڑی، سنگ تراشی، پارچاٹ بانی اور شیشہ سازی بھی ان کی آمدن کا ذریعہ ہے لیکن سب سے زیادہ آمدن ان کو ڈاک کی ٹکٹوں سے ہوتی ہے۔ اب تو تقریباً ہر تیرے سان مرینوئی کے پاس اپنی ذاتی گاڑی ہے لیکن اگر یہاں ڈاک ٹکٹوں کی خرید و فروخت ہو جائے تو پھر اس کی ساری کاٹو می بر باد ہو کر اس ننھے سے ملک کی خوشحالی میں اندھیرے گھول دے گی لیکن ایسا ہر گز نہیں۔ دنیا کے سارے ملک اور سارے ملکوں کے لاکھوں سیاح اس ننھے سے ملک سے بڑی محبت کرتے ہیں۔

یہ مہمان نواز، سلیقہ شعار، باوقار اور دل والے لوگوں کا ملک ہے۔ جب ابراہم لنکن نے امریکہ میں سیاہ فام لوگوں کی حمایت میں اپنے ہم وطنوں کے خلاف جنگ کی تو سب سے پہلے سان مارینو کے صدر نے ابراہم لنکن کو مبارکباد کا خط

لکھا اور اس کو دل کھول کر شاپاش دی۔ ساتھ ہی اس نے ابراہم لنگن کو سان مارینو کے اعزازی شہری ہونے کی دعوت دے کر اس کا اجازت نامہ بھی روانہ کر دیا۔ ابراہم لنگن نے اپنے مخصوص انداز میں شاعری جیسی نثر لکھ کر سان مارینو کے لوگوں کا شکر یہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اپنی پہلی ہی فرصت میں اس عظیم ملک کی زیارت کے لیے ضرور حاضر ہوگا۔

اگر ابراہم لنگن ایک جانکاہ حادثے سے اچانک فوت نہ ہو جاتا تو وہ سان مارینو ضرور آتا کیونکہ یہ اس کے ایجنڈے میں شامل تھا اور وہ اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں سے اپنے ارادہ سفر کا تفصیلاً ذکر کیا کرتا تھا اور سان مارینو جانے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

ابراہم لنگن تو اس ننھے سے خوبصورت ملک کی زیارت نہ کر سکا لیکن اس کا مجسمہ آج بھی شہر کے بڑے چوک میں لگا ہے جس کی عزت سان مارینو کے لوگ اپنے ایک نامور سپوت کی طرح کرتے ہیں جس نے اس ملک کی شہریت قبول کر کے اسے اپنا وطن تسلیم کیا۔

فوجی لوگ بڑے سیدھے، دیانتدار اور مربوط و وضع دار قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کو زیادہ مٹا کر نہیں آتے یا کم از کم اس زمانے میں نہیں آتے تھے۔ جب وہ سیاست میں داخل نہ تھے..... ایک شام ہمیں کمانڈر انچیف صاحب بڑے چوک میں مل گئے۔ وہ اپنی جیب میں راؤنڈ کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر گاڑی روکی اور ہوٹل چھوڑ آنے کی آخر دی۔ ہم نے کہا ہم تو مسرتی کے لیے باہر نکلے ہیں، ابھی واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔

کہنے لگے "تو پھر ہمارے ساتھ کافی کا ایک پیالہ پیجئے۔"

ہم نے عرض کیا "چہ خوب! کافی ہی کی طلب میں ہم گھر سے نکلے تھے۔"

شہاب صاحب کو وہ دن سے یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ ملک اچھا ہے۔ لوگ نیک اور نفیس ہیں، شریف الخ اور متسلط ہیں۔ ملک ہر طرح کے حسن سے مالا مال ہے۔ جموں اور فرادوانی ہے لیکن صرف ڈاک کی ٹکٹوں پر ساری کالونی کا بوجھ ڈال کے بیٹھ رہنا دانا نہیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ہونا چاہیے۔ میں نے شہاب صاحب کی اس چٹنا کا سی ان سی سے ذکر کیا تو اس نے قہقہہ مار کہا "ڈاک کی ٹکٹوں کے علاوہ ہمارے یہاں معیشت کے اور بھی مضبوط سہارے ہیں۔ مثلاً کھٹی باڑی، اناج اور اعلیٰ درجے کا فروٹ، بے داغ سنگ مرمر کی برآمد، تبا کو اس کے علاوہ اپنے استعمال کا کپڑا، ٹائلز اور شیشے کا سامان..... کچھ ایسی فکر کی بات نہیں..... وہ جو ڈاک کے ٹکٹوں کا معاملہ ہے تو وہ ہماری اول درجے کی آمدن ہے جس نے ہمارے ملک کی ستر فیصد معیشت کا بوجھ اٹھایا ہوا ہے لیکن وہ بھی کچھ نہیں ہے..... ہم بڑے آسودہ حال لوگ ہیں۔"

کمانڈر انچیف کی یہ بات سن کر بھی شہاب صاحب کی تشفی نہ ہوئی۔ ان کے ذہن میں یہ بات آتی نہیں تھی کہ ڈاک کے ٹکٹ بھی ملکی معیشت میں کوئی اہمیت رکھ سکتے ہیں۔ وہ بڑے افسر تھے۔ اپنے مراسلات سپرنٹنڈنٹ، ہیڈ کلرک یا چیپراسی کو دے دیتے تھے۔ وہی ان پر ٹکٹیں لگا کر پیرڈاک کر دیتے۔ شہاب صاحب نے تو کبھی اپنے پوٹل سٹپ کی شکل بھی دیکھی تھی۔ انہیں پتہ ہی نہ تھا کہ پاکستان میں ڈاک کا ٹکٹ چوکور بنتا ہے یا کھوتا! انہیں تو بس کھلی کھلائی ڈاک مل جاتی تھی اور کھلے کاغذات بند ہو کر آپ سے آپ اپنی منزل پر روانہ ہو جاتے تھے۔

جب میں نے سی ان سی صاحب سے کہا کہ "میرے ان ساتھی کی ابھی بھی پوری تسلی نہیں ہوئی۔" تو انہوں نے قہقہہ مار کر کہا "ایک اور ایکسپورٹ تو میں بھول ہی گیا۔ اس سے بھی ہمیں کافی آمدنی ہو جاتی ہے اور ایک خطیر رقم زرمبادلہ کے طور پر مل جاتی ہے۔"

پھر انہوں نے ذرا سوچ کر کہا "ہم اپنے ملک سے طلاق ایکسپورٹ کرتے ہیں!"

"طلاق!" میں نے چیخ کر کہا "طلاق..... یہ جو شادی شدہ لوگوں کے درمیان ہوتی ہے..... تنسیخ نکاح؟"

کہنے لگے "بالکل بالکل..... یہی..... تنسیخ نکاح..... ہمارے یہاں اس کے لیے الگ سے ایک کورٹ ہے جہاں صرف طلاق کے مقدموں کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر وکیل، قانون دان اور مقنن بھی کام کرتے ہیں۔"

ہم جو نچکے سے بیٹھے تھے کہ شہاب صاحب نے کہا "آگے پوچھو!" میں نے عرض کیا "آگے کیا پوچھوں۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا، شاید میں غلط سمجھ گیا ہوں۔"

ہمیں یوں سراسیمہ اور حواس باختہ دیکھ کر کمانڈر انچیف نے کہا "کیسٹولک مذہب میں طلاق کی اجازت نہیں ہے۔ ہم بھی کیسٹولک ہیں لیکن ہم دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا دیتے ہیں سر؟"

کہنے لگے "طلاق دیتے بھی ہیں اور دلو اتے بھی ہیں۔ ہم مذہبی لوگ ضرور ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ جمہوریت پسند بھی ہیں۔ ہمارا ملک دنیا بھر میں سب سے پرانا جمہوری ہے۔ تیرہ سو برس قدیم۔ ایک مرتبہ بھی ہماری جمہوریت کے اندر کوئی نیزہ آئی نہ انقلاب۔ ہم اپنے اصولوں کی ہموار سطح پر خوشگوار اور پرسکون کشتی رانی کر رہے ہیں۔ ہمیں آج تک کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ ذرا غور فرمائیے یہ از دو ابی سمبندھ دو دلوں کا باہمی سودا ہے۔ جب تک خوشی سے رہیں، ہر ہنر ہنر مارشون دل ماشا دھرجب یہ خود اکر وا ہو جائے اور پسند ناپسند میں بدل جائے تو پھر ایک دوسرے کو گروہ بند کر کے اور گانٹھ مار کے رکھنے سے حاصل کی بہتر یہی ہے کہ دونوں آزاد ہوں اور خوشی و دار فضاؤں میں سانس لیں، بھلیں، بھولی، قلعہ نہیں بھریں۔"

کمانڈر صاحب کی اس شاعرانہ گفتگو نے ہمیں متاثر تو بہت کیا لیکن ہم اس ایکسپورٹ کی تفصیلات سے واقف نہ ہو سکے۔

انہوں نے بتایا کہ ڈیڑھ سو برس پہلے ہماری قانون ساز اسمبلی نے تنسیخ نکاح کا قانون پاس کیا تو پوپ نے اس کا سختی سے ٹکس لیا، ہماری قانون ساز اسمبلی بھی اپنی جگہ ڈنی رہی، چنانچہ دس سال بعد پوپ اس مطالبے سے از خود دستبردار ہو گئے اور ہمارا قانون کچھ طور پر پاس ہو کر مل میں آ گیا..... اب کوئی بھی کیسٹولک، کسی بھی ملک کا رہنے والا، ہمارے ملک کی شہریت اختیار کرنے کے بعد عدالت میں تنسیخ نکاح کا دعویٰ دائر کر کے طلاق حاصل کر سکتا ہے؟

"اور دوسری پارٹی؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"ان کو عدالت میں اصالتاً یا وکلاً حاضری دینی پڑتی ہے۔ آنے جانے کا خرچہ ہم طلاق مانگنے والے سے

دلو اتے ہیں۔ بیج صاحب کے سامنے عدالت میں لین دین، چنگیر پوٹ، خرچی کے معاملات ملے پاتے ہیں اور طلاق کا اعلان ہو جاتا ہے۔ اب دونوں آزاد ہیں، دوبارہ شادی کریں یا دفع کریں اس دھندے کو اور کوئی سنجیدہ کام کریں۔ پھر کرکمانڈر صاحب ہنسے اور دیر تک ہنستے رہے۔

میں نے کہا ”اور آپ کے ملک کی شہریت! وہ آسانی سے مل جاتی ہے؟“

فرمانے لگے ”ایک مہینہ مسلسل سان مارینو میں قیام کرنے کی شرط ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہاں کی شہریت مل جاتی ہے لیکن لوگ عام طور پر طلاق دینے کے لیے شہریت حاصل کرتے ہیں اور تو یہاں کوئی کام ہے نہیں، کوئی بزنس تجارت۔ بس یہی ایک کشش ہے!“

شہاب صاحب نے کہا ”پھر تو دور دور سے لوگ یہاں آتے ہوں گے؟“

کہنے لگے ”زیادہ تر اٹلی، فرانس، سپین اور پرنسپل کے لوگ آتے ہیں۔ خرچہ تو کافی ہو جاتا ہے لیکن ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جاتی ہے۔“

میں نے کہا ”اس سے تو ٹیٹ کو کافی آمدن ہو جاتی ہوگی۔“

کہنے لگے ”اب خود ہی اندازہ کر لو، ساری کیتھولک دنیا میں بس ایک ہماری ہی مناپلی ہے جیسے جوٹ ہر تمہاری ہے، اس لیے آمدن تو ہوگی۔“

شہاب صاحب کو جوٹ کی بات سن کر بڑی خوشی ہوئی اور انہوں نے ہمارے ملک کے بارے میں جاننے پر کمانڈر انچیف صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

انہوں نے کہا ”میں تمہارے ملک کے دونوں بازوؤں کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ ہم فوجی لوگ ہیں۔ ہم کو ہر طرح کی معلومات کا علم ہونا ضروری ہے۔“

جب ہم اپنے ہوٹل کے گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے تو شہاب صاحب نے سارے ملک پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا ”یہ تو ایک عجیب سا چاند نگر ہے۔ یہاں سے تو جانے کو بھی نہیں چاہتا۔“

میں نے کہا ”ایک مہینہ ٹک جائے اور شہریت حاصل کر لیجئے۔“

کہنے لگے ”وہ تو پھر شادی کے بعد ہی ہو سکتا ہے، خالی شہریت لینے سے فائدہ!“

چار دن بعد جب ہم اپنے بہت ہی پیارے دوستوں سے مل کر اور گال سے گال ملا کر اونچے اونچے چھوڑے وہاں سے رخصت ہوئے تو شہاب صاحب نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا ”آج اچھی طرح سے پتہ چلا ہے کہ بادل اندھ گئیں! دیکھو خوبنار۔۔۔ کیا مطلب ہوتا ہے۔ میں تو زندگی میں پہلی مرتبہ کوئی جگہ چھوڑتے ہوئے آبدیدہ سا ہو گیا ہوں۔“

واپسی پر جب ہم سان مارینو کے خوش آمدیدی استقبالیہ کے آگے سے گزرے تو فوج کے ایک چاق و چوبند دستے نے ہمیں گارڈ آف آزدیا اور گارڈ کے تینوں چاق و چوبند سپاہیوں نے ہوا میں فائر کر کے ہم کو الوداعی سلامی دی۔ جب ہم اٹلی کی سرحد میں داخل ہو گئے تو شہاب صاحب نے کہا ”دراصل یہ ملک اے حمید کے دیکھنے کا ہے۔“

میں نے کہا ”میں اس سے بڑی محبت کرتا ہوں اور میری یہ محبت صرف اس کی تحریروں کی وجہ سے ہے۔ وہ ایک اچھا انسان نہ رہا ہی نہیں، ایک اچھا یار اور ایسا ماہ تنہا خرام ہے جو ساتھ چلتے چلتے غائب ہو جاتا ہے۔ میں واقعی اس سے بڑی محبت کرتا ہوں۔“

شہاب صاحب نے پوچھا ”کیا اسے معلوم ہے کہ آپ اس سے محبت کرتے ہیں؟“

میں نے کہا ”ہم بہت کم ملے ہیں، اس لیے میں نے اس سے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔“

کہنے لگے ”اس کا اظہار ہونا چاہیے کہ اس کا حکم ہے!“

میں ان کی یہ بات سمجھ نہ سکا کہ کس کا حکم ہے۔ کیا حکم ہے اور کس ضمن میں آیا ہے۔ نہ میں نے ان سے پوچھا،

انہوں نے اس کی وضاحت کی۔

واپسی پر جب بارش تیز ہو گئی اور ڈرائیو کرتے ہوئے وائپر کی تھکی بار بار گھمانا میرے لیے مشکل ہو گیا تو میں نے گاڑی سڑک کنارے کھڑ کر دی اور شہاب صاحب سے کہا ”آپ نے وزیر خارجہ کی گاڑی دیکھی تھی۔ اس میں کیا اچھا سسٹم تھا کہ وائپر جیٹے سے خود بخود چلتے رہتے تھے۔ ڈرائیو مزے سے ڈرائیو کر سکتا اور اس کا شیشہ بھری بارش میں بھی صاف رہتا تھا۔“

شہاب صاحب نے کہا ”میرا خیال ہے اگر تم چاہو تو اپنی گاڑی میں یہ تبدیلی کر دیا جاسکتی ہے۔ میں نے ہالینڈ میں بہت سی پرانی گاڑیاں دیکھی تھیں جن سے بھی نکال کر وہاں آٹومیک سسٹم لگا دیا گیا تھا۔ ایک چھوٹی موٹر ہی تو ہوتی ہے جو وائپر چلانے لگتی ہے اور کیا کرتا ہے۔“

میں نے کہا ”دیکھئے شہاب صاحب سائنس نے کس قدر ترقی کی ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا ملک بلکہ ایک چھوٹا سا شہر تھا کہ اس میں انسانی آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ ٹیلی فون، تار، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹریک کنٹرول لائسنس، فلی آٹومیک موٹریں، گیس، بجلی۔۔۔ کیا کیا بتاؤں اور کیا کیا گنواؤں۔۔۔ کیا یہ ساری چیزیں کبھی ہمارے ملک میں بھی آسکیں گی۔ کبھی ہمارا پاکستان بھی ایسا ترقی یافتہ ملک ہو سکے گا۔ اس چھوٹے سے ملک جیسا جو ہماری تحصیل پاکپتن سے بھی چھوٹا ہے۔“

شہاب صاحب نے کہا ”ہو جائے گا، ہو جائے گا۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ ابھی تو ابتداء ہے۔ بہت سے کام ہوتے ہیں، بہت سے کرنے ہیں۔ بہت سے شروع ہونے ہیں، آہستہ آہستہ سب کچھ ہو جائے گا۔“

بارش کم ہو گئی تھی۔ میں نے گاڑی ایک دھچکے سے سڑک پر ڈالی اور چڑھ کر کہا ”کیا ہو جائے گا۔ کب ہو جائے گا، کہاں ہو جائے گا۔ اس دیرانے میں، جہالت کے جنگل اور قلت و کمیابی کے ریگستان میں۔۔۔ ایک تو یونیورسٹی ہے سارے ملک میں۔۔۔ ایک شہاب صاحب، ایک! اور آٹھ فیصد شرح تعلیم ہے۔ اس سے آپ کیا توقع کر سکتے ہیں۔ خاک ہو

جائے گا، سواہ اور مٹی ہو جائے گا۔“

شہاب صاحب نے کہا ”بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن کیا کیا جائے، ہم بڑی طویل غلامی سے حال ہی میں نکلے ہیں۔“

میں نے کہا ”سر! کیا آپ توقع کرتے ہیں کہ پاکستان میں کبھی سائنس کا دیا روشن ہو سکے گا۔ یہ ملائکہ ملوئے اس کی اجازت دیں گے۔ کیا یہ مستویئے سائنسی علوم کے پھیلاؤ کو پھیلنے دیں گے؟ بتائیں ناں ذرا۔ آپ تو ارباب بست کشاد میں سے صاحب اختیار ہیں۔“

شہاب صاحب نے کہا ”سائنس اللہ کا عطا کردہ وسیلہ ہے اور اس کی بڑی نعمت ہے لیکن سائنس بنی نوع انسان کے لیے امن، مسرت، فلاح اور خوشیوں کا پیام نہیں لاسکی۔ یہ انسانوں کے لیے آسائش کا مکان یا ضروریہ کارکن ہے۔ انسان کو جسمانی آسائیاں عطا کر سکتی ہے لیکن یہ ساری آسائیاں اور ساری آسائشیں انسان کے دکھوں کو دور نہیں کر سکتیں۔ وقتی طور پر انسان کو ریلیف ضرور ملتا ہے لیکن جلد ہی یہ رحمت زحمت میں بدل جاتی ہے اور انسان پھر پہلے جیسا کہ ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ایسی آسائشیں اس کی بچاؤ اور جی دیتی کا علاج نہیں کر سکتیں۔ اس کو وقتی ریلیف ضرور دے دیتی ہیں۔۔۔۔۔ ان آسائشوں کے عادی ہونے کے بعد ہم مزید آسائشوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں اور ہر بار یہ چکر چلتا ہی جاتا ہے۔“

میں نے ڈرائیونگ کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنا پورا چہرہ گھما کر شہاب صاحب کو دیکھا کہ یہ کیسی اطمینانہ بات کر رہے ہیں لیکن انہوں نے پلٹ کر میری طرف نہ دیکھا اور ششے میں سے سامنے دیکھتے ہوئے بولے ”ان خوشیوں اور آسائشوں کا ساز و سامان جس قدر بدن پر بڑھتا جائے گا، اسی نسبت سے اندر کھوکھلا ہوتا جائے گا۔ اندر کی غلطی بروہی جاتی گی۔“

پھر وہ درار کے اور پلکے سے میری جانب جھک کر بولے۔ ”اور یہ جن ملاؤں اور ملوثوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، انہوں نے باہر کی زندگی سے آنکھیں موند کر اندر کا نقارہ بجانا شروع کر دیا۔ انہوں نے حقیقت کا سامنا کرنے کی بجائے آنکھوں پر اندھیریایاں باندھ لیں اور طرزِ ذہن کے غیر تحقیق شدہ اعتقادات کو زندگی کی بنیاد بنا لیا۔ انہوں نے آپ کے نزدیک لایا ہی ڈبڈی۔“

”اصل میں دونوں ہی ایک جیسے ضدی ایک سے جا مل ہیں۔ زندگی نہ صرف اندر ہے اور نہ محض باہر۔ یہ اندر اور باہر دونوں ہی ہے۔۔۔۔۔ جو شخص زندگی کے صرف اندر کا داعی ہے، وہ مرکز پر بیٹھا محیط سے بالکل بے نیاز ہے اور جو محیط کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے، اس نے اپنا مرکز کھو دیا ہے۔ بھلا مرکز کے بغیر کبھی بھی کوئی محیط ہو سکا ہے؟“

میں کچھ کہنے لگا تو انہوں نے کہا ”زندگی عطا کرنے والا سائنس نہ صرف اندر کھینچنے والا ہوتا ہے باہر جانے والا بھی ہوتا ہے۔ یہ دونوں ہی ہوتا ہے۔ دونوں کے سہارے زندگی چلتی ہے۔ صرف ایک کا عمل اختیار کریں گے تو زندگی ختم ہو جائے گی۔ حیات کا سلسلہ رک جائے گا۔“

پھر وہ خاموش ہو گئے اور بڑی دیر تک اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔ میرے لیے باہر کا راستہ تو نیا تھا ہی اب اندر بھی ایک نئی چمکندنی پیدا ہو گئی۔ میں نے اس طرح سے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ نہ میرا مطالعہ تھا، نہ مشاہدہ۔ نہ میرے اندر اس طرح سے تجربہ کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ اس وقت میں کچھ سوچتا، کچھ بولتا، زیادہ لڑتا جھگڑتا، اعتراضوں پر اعتراض کرتا چلا جا رہا تھا اور خاموش تھا!

میرے چہرے پر ناخوشی کے آثار دیکھ کر انہوں نے کہا ”اصل میں مذہب سائنس کے خلاف نہیں۔ اگر ایسا کوئی مذہب ہے تو پھر وہ مذہب نہیں ہے۔ جس طرح مذہب سائنس کے خلاف نہیں ہے، اسی طرح مذہب کبھی دنیا کے خلاف نہیں ہوتا۔ دنیا مذہب کے خلاف ہو سکتی ہے اور ہوتی رہی ہے لیکن مذہب کبھی بھی دنیا سے متصادم نہیں ہوا۔ مذہب پارے کا پورا اور سارے کا سارا آزاد اور غیر متنازعہ ہوتا ہے۔ اگر دنیا میں کوئی مذہب نزاعی اور تکراری ہے تو وہ مذہب نہیں ہے کچھ اور ہے۔ جہاں بھی تکرار ہوگی، نزاع سے ہوگی۔ وہاں امن نہیں ہوگا، شائقی نہیں ہوگی اور مذہب سلامتی اور اسلام کا اور امن و امان کا دوسرا نام ہے۔“

سائنس نے اس دنیا میں بڑا کام کیا ہے اور بڑا نام پیدا کیا ہے۔ اس کے اندر ہونے والی لگا تار ریسرچ نے اسے ایک بلند مقام پر پہنچا دیا ہے لیکن انسان کے اندر کی آگ ویسے ہی جل رہی ہے۔ اندر وہی پرانا دھواں دھنک رہا ہے۔

باہر کی ترقی کو باہر کی دریافت اور بیرون در کی یافت نے انسان کو تباہی کے اور قریب کر دیا ہے۔ وہ وہ بہن اور وہ وجود جو پریشان ہے، جھگڑا لہو ہے اور مکمل طور پر مایوس اور خائف ہے، وہ دوسروں کو اذیت پہنچا کر اور عذاب دے کر ہی خوش ہو سکے گا۔ اس کے اندر دوسروں کو دینے کے لیے بس یہی ایک تھنہ ہے۔ عطا شے شعلہ شر کے سوا کچھ اور نہیں۔ وہی اذیت ناک تھنے لوگوں کو دے کر خوشی چھوٹی کرے گا۔ اب تک یہی ہوتا آیا ہے اور یہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔

میں شہاب صاحب کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور ان کو سچ میں ٹوکنا نہیں چاہتا تھا اور نہ میرے پاس بھی بہت سے ایسے دودھارے دلائل اور چوکھی جہتیں تھیں کہ میں ان کے مکالمے کا ناطقہ بند کر سکتا تھا۔۔۔۔۔

انہوں نے کہا ”انسان خواہش و غرض کا مارا ہوا ایک ایسا جانور ہے جس کی طلب اور ضرورت کبھی بھی پوری نہیں ہوتی۔ ہر شخص اپنے آپ سے ہٹ کر کچھ اور ہونے کا خواہش مند ہے۔ انسانوں کے درمیان ایک ایسی دوڑ لگی ہے کہ ہر انسان یہ بھول چکا ہے کہ وہ اصل میں کیا ہے اور اس کے مزاج کے شائق کارڈ پر کیا کوائف درج ہیں۔ اپنے آپ سے بڑھ کر اور اپنی ذات سے مختلف ہو کر کچھ اور ہونا ایک ناممکن اصول عمل ہے۔ ایسا ہونی نہیں سکتا، جو کچھ سچ ہی نہیں ہے، وہ درخت میں کدھر سے آ سکتا ہے۔ درخت تو اپنے بیج ہی کا ہوگا اور وہ اس پر ساری عمر خوش بھی رہے گا لیکن انسان اپنی موجودہ صورت سے خوش نہیں ہوتا۔ اپنے دیئے گئے وجود پر راضی نہیں ہوتا۔ اس سے مطمئن نہیں رہتا۔ ہر وقت کچھ اور ہونا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ چنانچہ انسانی معاشرے کی ساری خرابی کی بس ایک یہی وجہ ہے۔ انسان جب اپنا موازنہ دوسروں سے کرتا ہے تو حسد، کراہ، غم میں مبتلا ہو کر لڑائی، مار کٹائی اور جنگ و جدال پر آمرا آتا ہے۔ جنگ و جدال زندگی کا چلن نہیں، یہ زندگی نہیں۔ یہ تو زندہ موت ہے! چلتی پھرتی لاشوں سے زندہ اور خوشحال معاشرے کیسے تعمیر کیے جاسکتے ہیں!“

انسان میں خواہش، غرض و غایت، طلب اور چاہ کیوں پیدا ہوتی ہے تو اس بیماری کی ایک ہی جڑ ہے۔ احساس کمتری!..... اپنے اندر ہر شخص اپنے آپ کو کمزور، نالائق، دہیل سمجھتا ہے۔ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ اندر خالی ہے اور حقارت ہے لیکن اس خالی اور ویران گھر کو آباد کرنے کے بجائے وہ وہاں سے بھاگتا ہے اور پھر ساری عمر بھاگتا ہی رہتا ہے۔ اپنے خیالی دشمنوں سے لڑتا ہے، بڑی بڑی جنگیں آراستہ کرتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں مول لیتا ہے۔ انقلابیوں کی جھڑپیں اور گوریلوں کے یدھ مرتب کرتا ہے۔ دست بدست بھی لڑتا ہے۔ گولہ بارود سے بھی لڑتا ہے اور دور بیٹھ کر اپنے ڈرائنگ روم سے بھی جدال کرتا ہے۔

میں نے حوصلہ کر کے کہا ”شہاب صاحب میں نے آپ سے سائنس اور سائنس کی تعلیم کے بارے میں پوچھا تھا لیکن آپ کسی اور طرف ہی چل نکلے۔ کیا آپ لوٹ کر پھر اس موضوع کی طرف آ سکتے ہیں؟“

”ضرور! ضرور! کیوں نہیں، کیوں نہیں۔“ شہاب صاحب نے معذرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ”میں خبر یہی بات سوچ رہا تھا کہ بیسویں صدی انسانیت کو ایسی چوٹی پر لے کر پہنچ چکی ہے جہاں سے شعوری عمل کا ایک اور راستہ نکلا والا ہے۔ اعتقاد کی گرفت و دھمکی پڑتی جا رہی ہے اور ایک بہت بڑی تبدیلی کی خبر کا ضمیمہ شائع ہونے والا ہے۔ ہم اپنے فاضل کی دلدل سے تو نکل آئے ہیں لیکن ابھی ہماری پیڑی مستقبل کے اندر نہیں لگ سکی..... اصل میں ہم انسان کے ایک نئے ارتقائی دور میں داخل ہونے والے ہیں۔ اب انسان، صورت میں تو ویسا ہی رہے گا لیکن مصنوعی طور پر اس میں عظیم اور خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہو جائیں گی۔ دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی ہے اور جاننے والے لوگ جان گئے ہیں۔ انسان اب ویسا نہیں رہے گا جیسا کہ اب ہے۔“

”سائنس نے پرانے خیالات اور فرسودہ اعتقادات پر ضرب کاری لگائی ہے۔ اس نے ذہنوں کو آزاد کر کے ایک نئے مذہب کی طرف رجوع کیا ہے۔ ایسا مذہب جو اندھے بہرے اعتقاد کے بجائے تفکر اور تدبیر پر اپنی بنیادیں استوار کر رہا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ بہت جلد مذہب شعور ذات کی سائنس بن جائے گا اور یہ سب کچھ اس عہد کے سائنسی عمل کی بدولت ہوگا۔“

”مذہب کی سائنس ازل سے روشن فکر بزرگوں اور روشن ضمیر بابوں کے اختیار میں رہی ہے لیکن یہ عوام اور لوگوں کے عمومی گروہوں میں نہیں پھیل سکی لیکن اب سائنس کی برکت سے اصل، صحیح اور سچے مذہب کو عروج حاصل ہوگا اور اساطیری عقیدے ختم ہو جائیں گے۔ سائنس کی آتش مذہب کے اندر سے ہر طرح کی ملاوٹ جلا کر اسے زرخیز خالص بنائے گی اور مذہب اس کے شکرانے کے طور پر انسانی شعور کو مظاہرہ پر نور عطا کرے گا اور انسان بڑی آسانی کے ساتھ اس مقام موعود پر پہنچ جائے گا جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے۔“

پھر انہوں نے سرگھما کر میری طرف دیکھا اور کہا ”پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اس کے نظریے کو کوہِ عطا کرنے کے لیے سائنس اور سائنس کی حکمت اور اس کے گیان کے اشد ضرورت ہے۔ اصل اور صحیح سائنس کے افلاک مصدر کی، بی ایس سی، ایم ایس سی، ایم بی بی ایس اور انجینئرنگ سائنس کی ڈگریوں کی نہیں!“

میں نے اس وقت بولا، نہ گھر آ کر کوئی بات کی۔ نہ شہاب صاحب کی بی ایس سی کی ڈگری کا مذاق اڑایا۔ نہ اس منہ کوئی طرف کوئی اشارہ کیا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ ان کے اور میرے درمیان ایک شدید اختلاف اور وسیع پھیلاؤ تھا۔ اس پر کسی قسم کا بھی پل نہیں باندھا جاسکتا تھا۔ نہ کسی اور ذریعے سے باہمی ملاقات ہو سکتی تھی۔ اس لیے میں ایک اچھے اور شریف انٹرنیشنل میزبان کی طرح اسے پی ہی گیا۔

اگلے روز شہاب صاحب کی دن کے گیارہ بجے فلائٹ تھی اور وہ وطن واپس جا رہے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں سوائے ایک مرتبہ کے اور کبھی اتنی اداسی محسوس نہ کی تھی۔ وہ کمال احتیاط کے ساتھ اپنا سامان باندھ رہے تھے اور میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ مجھے حکم نہیں تھا کہ میں ان کی چیزوں کو ہاتھ لگاؤں یا ان کا ہاتھ بناؤں۔ مجھے صرف اٹنی کرسی تیار ہوتے دیکھنے کی اجازت تھی۔

اپنا بڑا بکس بند کرنے کے بعد انہوں نے مجھے تین کتابیں دیتے ہوئے کہا ”مجھے اندیشہ ہے کہ میرے سامان کا وزن زیادہ نہ ہو جائے، اس لیے یہ کتابیں آپ اپنے پاس رکھیں، اور واپسی پر احتیاط کے ساتھ لے آئیں۔“

ان میں ایک تو مولوی فتح محمد جاندھری کے ترجمے والا قرآن شریف تھا۔ دوسری ایک چھوٹی سی کتاب مولانا اشرف علی تھانوی کے دلیلیوں کی تھی اور تیسری نہایت ہی نامانوس سی کتاب ”فوائد الفوائد“ تھی جس کا میں نے کبھی نام بھی نہ سنا تھا۔ مولانا اشرف علی سے تین یوں واقف تھا کہ ان کی بہشتی زیور ہمارے گھر میں موجود تھی جسے میری بہنیں اور کبھی کبھی اماں پڑھا کرتی تھیں۔

جب میں نے کتابیں بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی گود میں رکھ لیں تو انہوں نے کہا ”میں یہاں سے سیدھا قاہرہ جا رہا ہوں۔ اس کے بعد واپس جاؤں گا۔“

میں نے کہا ”قاہرہ! یہی اہرام مصر اور ابوالہول والا؟“

کہنے لگے ”ہاں۔“

میں نے کہا ”شاہ فاروق والا۔“

کہنے لگے ”ہاں۔“

میں نے پوچھا ”جہاں مصر کے مشہور بازار ہوتے ہیں؟“

خس کر کہنے لگے ”بالکل وہی۔“

میں نے کہا ”سر! وہاں جانے سے مطلب! اب سیدھے سبھاؤ گھر جائیے، مصر کی سیر پھر کبھی سہی۔“

کہنے لگے ”پھر میں بذریعہ آبی جہاز جدہ جاؤں گا۔“

میں نے کہا ”جدہ؟“

کہنے لگے ”ہاں۔“

میں نے کہا "جو حاجیوں کی آمد و رفت کے مشہور ہے؟"

کہنے لگے "بالکل وہی۔"

میں نے کہا "وہاں آپ کا کیا کام؟"

کہنے لگے "میں حج کرنا چاہتا ہوں اور حج کے بعد وطن واپس جانا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "ج؟"

کہنے لگے "ہاں!"

میں نے پوچھا "وہ جو بڑی عمر کے لوگ کیا کرتے ہیں..... وہی؟"

کہنے لگے "بالکل وہی!"

میں نے کہا "اتنی گرمی میں..... صحرا کے اندر..... وہ تو آپ برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

کہنے لگے "احتمال مجھے بھی ہے کہ برداشت نہ کر سکوں گا لیکن دل بہت چاہتا ہے اور دل کے آگے کسی کا بس نہیں چلے گا۔"

میں نے کہا "شہاب صاحب اول تو اس عمر میں حج کی چنداں ضرورت نہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہے تو پھر اور"

ظہر جائے گا اور سردیوں میں کیجئے گا۔"

بڑی لجاجت سے بولے "اب میں نے ضروری کاغذات بھی جمع کرادیے ہیں۔ فیس بھی ادا کر چکا ہوں۔"

اجازت بھی مل گئی ہے۔ معلم کا نام اور پتہ بھی موصول ہو گیا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ خوش دلی سے اجازت دے دیں۔"

لو بھلا میں کون تھا اجازت دینے والا، کیا پدی کیا پدی کا شور بہ، میری بھلا کیا بساط تھی ان کو اجازت دینے کی۔"

میں آبدیدہ سا ہو گیا۔

شہاب صاحب کہنے لگے "اجازت طلب کرنا ہمارے یہاں کا ایک معروف طریق معاشرت ہے۔ اس میں"

چھوٹے بڑے کا سوال نہیں ہوتا۔ محبت اور عقیدت کی بات ہوتی ہے۔ بڑے بڑے جید بزرگ چھوٹے چھوٹے"

صاحبزادگان سے دست بستہ اجازت طلب کر کے خانقاہوں سے نکلا کرتے تھے..... یہ محبت و موانست کی بات ہوتی ہے"

ورنہ کون چھوٹا اور کون بڑا۔"

میں پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا، ان کی یہ بات سن کر سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ وہ شرمیلے اور جھینپو سے آدمی صرف ایک"

قدم آگے بڑھا کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔

اصل میں یہ بات نہیں تھی۔ بات کچھ اور تھی۔ چنانچہ وہ دن ایسی قربت کے بعد اگر بکری کا بچہ بھی آپ سے ہا"

ہونے لگے تو آپ اسے گود میں اونچا اٹھا کر غشوڑی سے دبانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ یہ تو میرے ساتھی، میرے گنا"

میرے مہمان تھے۔ ان کی جدائی کیسے شاق نہ گزرتی بھلا!"

میں ان کو ان کے ہوٹل میں چھوڑ کر گھر آ گیا کہ یہ ان کی خلوت کا وقت تھا اور مجھے ان کے سارے اوقات یاد"

ہو گئے تھے۔ پتہ نہیں وہ اس تنہائی میں کیا کرتے تھے!

رات کا کھانا ہم نے وہیں کمرے میں سٹو و جلا کر اور آلو، ٹماٹر، شیلے کی مرچ اور مٹن مشروم ڈال کر پکایا اور پلیٹ

میں ڈال کر ادھر پر سیاہ مرچ کا دبیر دھوڑا دیا۔..... (اس کھانے کو وہ اپنے آخری دم تک یاد کرتے رہے اور مجھے اعلیٰ درجے کا

ادھر ہی تسلیم کرتے اور کراتے رہے!)

شہاب صاحب کے چلے جانے کے بعد اگلا پورا ہفتہ بڑی اذیت میں گزرا۔ میں رویا تو نہیں البتہ گرمی کی کیفیت

بردق طاری رہی۔ میرے ساتھیوں کو ٹھیک سے سمجھ نہ آیا کہ یہ سب کیا ہے لیکن اس قدر ضرور جان گئے کہ بھائی کسی مشکل

میں ہے!

فراق کا ایک ایسا دور مجھ پر پہلے بھی آیا تھا جب میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس وقت تو میں مرتے

مرتے بچا تھا اور میرے گھر والے کافی پریشان ہو گئے تھے لیکن یہاں مرنے جینے والی بات تو نہیں تھی البتہ جدائی کے دکھ

نے دلی پر خاردار تار کا ایک چٹکوسا پڑھا دیا تھا جو دل کو ہر وقت زخمی کرتا رہتا تھا.....!

جو کتا میں شہاب صاحب میرے پاس چھوڑ گئے تھے، ان میں سے قرآن شریف اور وظائف کی کتاب تو میں

نے ایک نئے خانے کاغذ میں لپیٹ کر ان پر بریڈنڈ چڑھا کر الماری کے سب سے اوپر والے خانے میں رکھ دیا البتہ

"فوائد الفوائد" نامی کتاب کو کھول کر ادھر ادھر سے پڑھا۔ یہ کسی خواجہ حسن دہلوی کی کتاب تھی جو اس نے اپنے مرشد کے

ارشادات کو جمع کر کے مرتب کی تھی۔ مرشد اس کے کوئی نظام الدین اولیاء صاحب تھے جن کا نام کچھ مانوس سا تھا۔ میں نے

اپنے قصبے میں برسات کے موسم میں تو انہوں کو گائے سنا تھا جن کے گانوں میں ان کا نام بار بار آتا تھا۔ پھر میں نے تاریخ

تذکرہ میں بھی ان کا ذکر دیکھا تھا لیکن وہ اس قدر تھوڑا تھا کہ اب مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ اصل میں میں ادب کا طالب علم

تو ادب میں چونکہ اس قسم کے لوگوں کا کوئی ذکر آتا نہیں ہوتا، اس لیے میں ان سے واقف نہیں تھا۔

ادب کے علاوہ مجھے تاریخی واقعات اور تاریخی افکار کا بہت اچھا علم تھا اور میں تاریخی کرداروں خاص طور پر

مظہر ہمد کے لوگوں، ان کے شہروں، ان کے گلی محلوں اور ان کے اندرون خانہ واردات سے بہت قریب سے واقف تھا۔

میں نے ان کی زندگیوں کو نزدیک سے دیکھا تھا اور ان واقعات کی ساری جزئیات جانتا تھا جو ان پر وارد ہوئے تھے لیکن

ان لوگوں کے ناموں تک سے ناواقف تھا جو "فوائد الفوائد" جیسی کتابوں میں گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ

ان لوگوں کا ذکر نہ تو اپنی کہانیوں میں نہ کبھی نیاز فتح پوری، ل اکبر آبادی، ظ۔ انصاری، مہاشہ شدرش یا غشی پریم چند نے

کیا تھا نہ بعد کے آنے والے کرشن، بیدی، منو، عصمت، ندیم، رشید جہاں، اشک، غلام عباس اور عسکری جیسے عظیم افسانہ

کاروں نے کیا تھا۔ ہماری پڑھت اور ہمارے مطالعے میں ایسے لوگ آئے ہی نہ تھے، اس لیے ہمارے نزدیک ان کا

انکس وجود ہی نہیں تھا۔

فراغت کے اوقات میں میں جب بھی "فوائد الفوائد" کو ادھر ادھر سے دیکھتا تو سناتے میں آ جاتا۔ یہ سارے کا

سارا نولہ علم اقتصادیات سے بالکل بے بہرہ تھا اور اس کو معاشیات کی الف بے سے بھی واقفیت نہیں تھی۔ اپنی آمدن کو اپنی بچت کو سنبھال کر رکھنے کے بجائے ضرورت مندوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور خود بالکل خالی ہاتھ ہو کر واپس گھر جا کر نئے سرے زندگی شروع کر دیتے تھے۔

اپنے لوگ کس طرح سے ترقی کر سکتے تھے اور اپنے بد حال معاشرے کی کیونکر تعمیر کر سکتے تھے۔ یا تو کسی نے ان کو بتایا سمجھایا نہیں تھا یا انہیں مکتب میں اور درس گاہ میں یہ علم نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ یہ کتاب پڑھتے ہوئے کسی کی جگہ تو لے یوں لگتا تھا جیسے ان لوگوں کو اپنی محنت کی کمائی اور اپنے خون پسینے کی یافت کے ساتھ کوئی ہمدردی ہی نہیں تھی۔ اپنے ہال پر اور گھر والے اعلیٰ درجے کی زندگی بسر کرنے کے بجائے دو وقت کی روٹی پر محصور و محدود کر دیئے گئے تھے۔ اپنے گھر کا معیار زندگی بلند کرنے کے بجائے دوسروں کی ضرورتوں کی ٹوہ لگاتے پھرتے تھے۔

میں کبھی تاریخ کا طالب علم تو نہیں رہا لیکن اس کتاب کو پڑھ کر میرا یہ خیال یقیناً میں تبدیل ہو رہا تھا کہ ایسے لوگوں نے اپنے معاشرے کی معاشی، معیشتی اور اقتصادی زندگی پر برے اثرات ڈالے اور اپنے سماج کو سناٹا بنا دیا۔ سرمایہ دارانہ بنیادوں پر استوار نہیں ہونے دیا۔ لوگوں کے درمیان ازمنہ قدیم کی اخوت اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنے کی کوشش میں لگے رہے اور ترقی کرنے سے معذور ہو گئے۔ تجارت کا یہ حال تھا کہ عام بردہ فروش بھی ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے بجائے رزق حلال کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ لکھا تھا

قدم بوسی کی دولت نصیب ہوئی۔ حضرت شیخ عثمان خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ہو رہا تھا۔ آپ نے فرمایا: بہت بڑے بزرگ تھے۔ انہوں نے قرآن کی ایک تفسیر بھی لکھی ہے۔

وہ غزنی میں رہتے تھے۔ سبزی پکاتے اور بیچتے۔ خانم، چندہ اس قسم کی چیزیں دیگ میں پکاتے اور بیچتے تھے۔ اگر کوئی شخص آپ کے پاس آتا اور کھانا درہم دے کر جو کچھ آپ کے پاس پکا ہوتا، اسے خریدنا چاہتا تو وہ اس سے کھانا درہم لے لیتے۔ اگر چہ انہیں پتہ ہوتا کہ درہم کھانا ہے لیکن وہ خریدار کے منہ پر کچھ نہ کہتے۔ نیز جو کھر اور ہم لانا، اسے بھی اسی طرح پورا سالن دیتے۔ حتیٰ کہ لوگوں کو گمان ہونے لگا کہ وہ کھوٹے اور کھرے میں امتیاز ہی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ بہت سے لوگ آتے اور انہیں کھوٹے درہم دے کر چلے جاتے، وہ انہیں کھر سمجھ کر لے لیتے۔ مگر ان پر ظاہر نہ کرتے اور انہیں سالن دے دیتے۔ جب ان کے انتقال کا وقت آیا تو انہوں نے اپنا منہ آسمان کی طرف کیا اور کہا: "اے خداوند تعالیٰ! تو دوسروں سے زیادہ آگاہ ہے کہ لوگ مجھے کھوٹے درہم دیتے تھے اور میں انہیں کھر امان کر قبول کر لیتا تھا اور ان کو رو نہیں کرتا تھا۔ اب میں تیرے پاس اپنی کھوٹی عبادت لے کر حاضر ہو رہا ہوں، تو اسے اپنی عنایت سے قبول فرما لینا۔ اس کو رد نہ کرنا، تیری مہربانی!"

بعد ازاں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے فرمایا کہ ایک مرتبہ ایک صاحب دل

درویش ان کے پاس آیا اور ان کی دیگ میں سے سالن طلب کیا۔ شیخ عثمان نے کفگیر دیگ میں ڈالا کہ اس سے شور بے نکالے تو جب اسے باہر نکالا تو وہ موتیوں اور ہیروں سے بھر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر درویش نے کہا: "اوبھائی میں انہیں کیا کروں!" جب شیخ نے پھر کفگیر ڈالا اور دیگ سے باہر نکالا تو سرتا سر سونا برآمد ہوا۔ اس نے درویش نے کہا: "وہ سب سنگ ریزے تھے اور یہ سب سنگ ہے۔ میرے کس کام کے!..... اس دیگ میں سے کوئی دوسری چیز نکالو جو میں کھاؤں۔" تیسری مرتبہ شیخ نے کفگیر دیگ میں ڈال کر نکالا تو وہی سبزی برآمد ہوئی جو اس دن انہوں نے پکائی تھی۔ اس درویش نے جب یہ دیکھا تو شیخ عثمان سے کہا کہ اب اس سے زیادہ تمہیں اس دنیا میں نہیں رہنا۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ چند دنوں کے اندر اندر شیخ عثمان رحمۃ اللہ علیہ اس دنیا سے رخصت کر گئے۔

ان دنوں میں باقاعدگی کے ساتھ فٹ بال پول خرید کر لیا تھا۔ تنخواہ معمولی تھی لیکن میں اس کا ایک بڑا حصہ اس فٹ بال لاری پر خرچ کر دیتا تھا۔ اکیلا میں ہی نہیں ہمارے محلے کے سارے لوگ خریدتے تھے۔ ڈاکٹر بالدی، فیوریتی، رہا، جواہی، سانیتا، جوہے، مارچلا، ہم سب بیٹھ کر مناجات کے ساتھ اپنے نمبر ملاتے تھے اور خاک سیاہ ہو جاتے تھے کہ ہر بار ہر کسی کی ایک آنچ کی کسر رہ جاتی تھی۔..... امیر ہونے کو کس کا دل نہیں چاہتا۔ ہر کوئی ہر وقت اسی خیال میں رہتا تھا کہ اسے دولت ملے، بے شمار ملے اور چھپر پھاڑ کر ملے۔ میں نے تو آج تک نہیں سنا تھا کہ کوئی شخص اس دنیا میں ایسا بھی ہے جس کو دولت ملے اور روپیہ پیسے سے رغبت نہ ہو اور وہ کڑے جیسے میں زرد جوہر اور سونا دیکھ کر اسے لینے سے انکار کر دے۔ میں نے تو آج تک جتنی کہانییں پڑھی ہیں اور جتنا لٹریچر کھنگالنا تھا، اس میں انسان کی جہتوں کے لاکھوں شدید بیان کیے گئے تھے۔ کہیں ایسی باتیں نہیں تھیں جو اس کتاب میں نظر آئیں۔ دولت تو دولت یہ لوگ اپنی کسی خصوصی نعمت کو بھی بانٹنے یا پوری کی پوری اٹھا لینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

حضرت خواجہ نے فرمایا کہ لاہور میں ایک صاحب تھے جنہیں "شیخ زندہ دل" کہتے تھے۔ وہ بڑے بزرگ تھے۔ عید کے دن جب لوگ عید کی نماز پڑھ کر واپس لوٹے تو ان بزرگ نے آسمان کی طرف منہ کیا اور کہا: "آج روز عید ہے۔ ہر بندے اور بچے نے اپنے آقا، خواجہ اور بڑے سے عیدی لی ہے۔ مجھے بھی عیدی عطا ہوا!"

جب انہوں نے یہ بات کہی تو آسمان سے روشنی کپڑے کا ایک ٹکڑا نیچے آیا جس پر لکھا تھا کہ ہم نے تجھے دوزخ کی آگ سے فلاح دی!

جب لوگوں نے یہ دیکھا تو برکت حاصل کرنے کے لیے ان بزرگ کے ہاتھ پاؤں چومنے لگے اور ان کی بہت عزت و تکریم کی۔ اسی دوران ان بزرگ کے دوستوں میں سے ایک دوست ان کے پاس آیا اور ان سے کہا: "آپ نے حضرت رب العزت سے عیدی لے لی،

اب مجھے آپ عیدی دیجئے۔“

اس بزرگ نے جب یہ بات سنی تو ریشمی کپڑے کا دو ٹکڑا اپنے اس دوست کو دے دیا اور کہا ”جاؤ یہ تمہاری عیدی ہے۔ کل قیامت کے دن میں جانوں اور دوزخ“

محنت سے حاصل کی ہوئی چیز کو یوں الٹے تلے کر کے ضائع کر دینا یہ بھی تو کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ پہلے اپنی اس کے بعد اپنی ذات کا حق، پھر اپنے وجود کا حق، اس کے بعد اگر کچھ بچے باقی رہ جائے تو اپنے خویش واقارب کو دینا میں کوئی حرج نہیں لیکن اپنی ضرورت کے مقابلے میں دوسرے کی ضرورت کو اہم جاننا اور اسے مقدم گردانا علم اقتصادیان کے کسی بھی نوشتے میں موجود نہیں..... یہ کیسے لوگ تھے اور انہیں کیا ہو گیا تھا کہ دوسروں کا حق اپنے حق پر فائق سمجھتے تھے دوسروں کی زندگی برقرار رکھنے کے لیے اپنی زندگی قربان کر دیتے تھے۔

پھر دولت کمانے اور رزق جمع کرنے کی طرف بھی ان کا کوئی دھیان نہیں تھا لیکن آنے والے وقت اور مستقبل سے پورے طور پر غافل ہو کر زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ ان کو بیچ سالہ منصوبہ بنانے کی سمجھ تھی، نہ کوئی اقتصادی پلان میں کرنے کا علم تھا۔ بس جو زندگی میں مل گیا، اسی پر کفایت کر لی، جو جیبوئی میں گر گیا، اس کو نعمت کا پہاڑ سمجھ کر قبول کر لیا۔ جب بے فکرے لوگ تھے کہ رزق کی تلاش میں سرگرداں نہ تھے اور مال و متاع کے حصول کے پیچھے بھاگتے دوڑتے نہ تھے۔ جو سامنے آ گیا اسے قبول کر لیتے تھے اور اپنی اس کم کوشی کو شیری اور بنگلی کا نام دیتے تھے۔

فرمایا مولانا حافظ الدین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ جس طرح شکاری کتے کو شکار کے لیے سدھایا جاتا ہے اسی طرح چیتے کو بھی شکار کرنا سکھاتے ہیں۔ البتہ چیتے کے ساتھ یوں شکار کیا جاتا کہ اسے شکاری آمد و رفت کے راستے پر لے جاتے ہیں اور جب شکار نزدیک آتا ہے تو چیتے کو اس پر چھوڑ دیتے ہیں۔ چیتا جست لگاتا اور شکار پکڑ لیتا ہے۔ اس کے برخلاف کتے کو بہت دوڑنا پڑتا ہے۔ وہ شکار کے پیچھے دور دور تک دوڑا چلا جاتا ہے۔

مولانا حافظ الدین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ آدمی کو چند خصلتیں چیتے سے سیکھنی چاہئیں۔ ان میں سے ایک خصلت یہ ہے کہ چیتا کتے کی طرح رزق کے پیچھے بھاگتا نہیں۔ اگر اس کے سامنے کوئی چیز میسر آ جائے تو لے لیتا ہے ورنہ چھوڑ دیتا ہے۔ دوسرے چیتا جب شکار کے لیے نکلتا ہے تو اگر شکار ہاتھ آ جائے تو شکار کر لیتا ہے لیکن اس کا پیچھا نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے لیے بہت زیادہ دوڑتا ہے..... اسی طرح آدمی کو بھی چاہیے کہ ضرورت کے مطابق رزق طلب کرے۔ نہ تو وہ بہت زیادہ طلب کرے اور نہ اس کے پیچھے پیچھے مارا مارا پڑے۔

یہ تو ہوئی اقتصادیات اور معاشیات کے علم کی کمی اور مستقبل کو کسی نامعلوم طاقت کے سپرد کر دینے کا نام۔ ان لوگوں نے اپنی جبلت اور خواہش کے خلاف بھی بند باندھ کر اپنی فطرت کا رخ موڑنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ فطرت اور جبلت تو اللہ کی مخلوق ہے۔ خدا نے ہر شے کی فطرت اور اس کے مزاج کو اپنی مرضی سے

اور اپنے حکم سے وضع کیا ہے۔ اس کے آگے بند باندھنے یا اس پر پابندی لگانے کو میں خدا کے کاموں میں دخل دینے کے مترادف سمجھتا تھا لیکن وہاں لکھا تھا:

ایک دفعہ ایک شخص دہلی سے اجودھن کی طرف روانہ ہوا تاکہ وہاں جا کر شیخ الاسلام بابا فرید خج شکر کی خدمت میں حاضر ہو..... راستے میں ایک لڑکھاتی ہوئی مٹریہ اس کے ساتھ ہو گئی۔ وہ مٹریہ بہت چاہتی تھی کہ اس شخص کے ساتھ اس کا تعلق ہو جائے اور وہ اسے بھانس کر اپنے راستے پر لگالے لیکن وہ شخص چونکہ کچی نیت کے ساتھ تائب ہونے کے لیے اجودھن جا رہا تھا، اس لیے اس نے اس بدکار عورت کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

راستے کی منزلوں میں سے ایک منزل پر ایسا بھی ہوا کہ وہ شخص اور مٹریہ دونوں ایک ہی پہلی میں سوار ہوئے۔ وہ مٹریہ آگے کھسک کر اس شخص کے نزدیک ہو گئی۔ اب چونکہ دونوں کے درمیان کوئی حجاب مانع نہ تھا، اس لیے اس حالت میں اس شخص کا دل چاہا کہ اس مٹریہ سے بات کرے یا اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھائے۔ یہ فیصلہ کر ہی رہا تھا کہ اس شخص نے دیکھا کہ ایک آدمی آیا اور اس نے اس کے منہ پر زور کا پتھر مارا اور کہا تم توبہ کی نیت سے بابا فرید کی خدمت میں جا رہے ہو، یہ کیا حرکت ہے؟ وہ شخص فوراً متنبہ ہو گیا اور اس کے بعد اس نے اس عورت کی طرف نہ دیکھا نہ کچی جسم کی توجہ دی۔

الغرض جب وہ شیخ الاسلام بابا فرید کی خدمت میں پہنچا تو سب سے پہلی بات جو حضرت شیخ بابا فرید نے ان سے کہی، وہ یہ تھی کہ خدا تعالیٰ نے اس شخص کو وقت میں آپ کی بڑی عبادت کی۔

میں جو کہ ایک بہت ہی چھوٹا انسان تھا اور ابھی اس میدان میں بلوغت کو نہ پہنچا تھا۔ میں بھی لڑکھاتی مٹریہ پر کمال کا بھڑکیلا افسانہ لکھ سکتا تھا لیکن اگر کہیں منہ پر عصمت آ پا اس پلاٹ پر ہاتھ ڈالیں تو ”تجھ مستیالی“ کے عنوان سے دیائے ادب کو ایک یادگار کہانی دے کر جائیں لیکن انہوں نے ایسی کتابیں ان کی نظر سے نہ گزری تھیں ورنہ وہ ایسے واقعات کے لفظیاتی تجزیے کے بعد انسانی فطرت پر ایک شش جہات تحلیس زمانے کو عطا کرتیں۔

بھلا یہ کس طرح سے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک جنپل ہنٹ کھٹ، شوخ مٹریہ، ایک جوان آدمی کی ران سے ران ملا کر تجھ نیم ٹیٹھی رہے اور جوان رعنا کی جبلت اپنے پورے پنچ کھول کر اس پر حملہ آور نہ ہو۔ کیسی ناقابل یقین اور انہونی کی بات ہے کہ وہ تجھ میں دو راتیں اور ایک دن کا طویل سفر گزار کر ویسے ہی دھلے دھلائے برآمد ہو جائیں۔ کم از کم ادب کی دنیا میں تو ایسے کبھی نہیں ہوا۔ ان مرشدوں، شیخوں، خواجوں، مخدوموں اور درویشوں کی زندگیوں میں ایسا ہوتا ہو تو ہمیں معلوم نہیں۔ معلوم ہو بھی تو ہمیں یقین نہیں۔ یقین ہو بھی جائے تو ہمارا اندر نہیں مانے گا۔

”فوائد الفوائد“ کی دنیا کے سارے آدمیوں کی ہر بات نرالی تھی۔ کوئی بھی ہم سے نہیں ملتا تھا۔ شکل و صورت وضع قطع، کلام و پیام، زندگی کا چلن اور انداز زیست ہم سے بالکل مختلف بلکہ ہمارے عین برعکس تھا۔ اس طرح کوئی شخص زندہ رہ

سکتا ہے بھلا؟ لکھا تھا۔

چند لمحے قضاوت در کی طرف سے جو کچھ ہوا، اس کو تسلیم کر لے اور اس پر راضی ہو جائے۔ نہ شکوہ کرے، نہ طعن الہنادے نہ رد و قدح کرے۔ اس موقع پر آپ نے ایک حکایت بیان کی کہ ایک درویش بیٹھا ہوا تھا۔ ایک کبھی آئی اور آ کر اس کی ناک پر بیٹھ گئی۔ درویش نے اس کبھی کو اڑایا اور وہ پھر آ کر اس کی ناک پر بیٹھ گئی۔ اس نے پھر اسے اڑایا اور وہ پھر آ کر اس کی ناک پر بیٹھ گئی۔ جب درویش نے تیسری مرتبہ اسے اڑایا اور وہ تیسری مرتبہ آ کر اس کی ناک پر بیٹھ گئی تو درویش نے کہا ”اے خدائے بزرگ و برتر، میں چاہتا ہوں کہ کبھی میری ناک پر نہ بیٹھے اور تو چاہتا ہے کہ میری ناک پر بیٹھے۔ میں نے اپنی خواہش چھوڑی اور جو تیری خواہش ہے اس سے موافقت کر لی۔ اب میں اس کبھی کو اپنی ناک سے نہیں اڑاؤں گا۔“ جب درویش نے یہ کہا تو کبھی اس کی ناک پر نہیں بیٹھی!

یہ کام چور اور بے عمل لوگوں کی نشانی ہے۔ ہمارے مشرق میں اور ہماری تیسری دنیا میں کروڑوں افراد ایسے ہیں جنہوں نے کوشش، جدوجہد، عمل پیہم اور مسلسل محنت کا راستہ چھوڑ کر تسلیم و رضا اور فقر و استغنا کی چور بیٹھک دریافت کر لی ہے۔ وہ اپنی ساری زندگی اس بے عملی کے منہذ میں گزار کر ”فوائد الفوائد“ جیسے لوگ اس دنیا میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح کے اور بہت سے لوگوں کے قصے میں نے اپنے ماموں نذر کی زبانی سنے تھے لیکن بزرگوں کی جذباتی اور رقیق باتوں کا نہ کبھی میں نے بطلان کیا نہ ان پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ بس ہر وقت یہی پیش نظر رہتا تھا کہ اگلے وقتوں کے ہیں، یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو جو وہ فائدہ کو اندوہ رہا کہتے ہیں!

گوالگلے وقتوں کے یہ سارے لوگ اس جہان فانی سے کوچ کر چکے تھے لیکن ان کے احوال پڑھ کر مجھے دکھ ہوتا تھا کہ انہیں اقتصادیات کے اسرار و رموز سمجھانے والا کوئی شخص بھی اس وقت موجود نہ تھا جو زر کے اصول ان کے ذہن نشین کر کے انہیں ایک اچھی، خوشحال اور خوشگوار زندگی بسر کرنے پر مائل کرتا۔ یہ سارے لوگ یوں تو بڑی بھمداری اور دانش کی باتیں کرتے تھے لیکن مال و دولت، دنیا اور رشتہ و پیوند کے سلسلے میں ان کا نشانہ ہر بار چوک جاتا تھا۔ چوک کیا جاتا، ان کا کوئی ہدف ہی نہیں تھا۔ بس ایسے ہی زندگی کی چاند ماری میں مصروف تھے، ایک حکم اور ایک فرض سمجھ کر ورنہ ان کو اس تعلق سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔

پھر کچھ دیر یہ گفتگو رہی کہ آدمی کو چاہیے کہ کسی سے کوئی چیز نہ مانگے، نہ زبان سے مانگے، نہ دل میں یہ سوچے کہ اگر فلاں شخص مجھے کوئی چیز دے تو بڑا اچھا ہو لیکن اگر بغیر مانگے اور بغیر اس کی خواہش کیے کوئی چیز اس کے پاس آئے تو وہ جائز ہوگی۔

پھر اسی کتاب میں لکھا تھا کہ:

لبوس تھی۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا ”میں نے رات اس طرح کا خواب دیکھا ہے.....“ دوسرے نے اس کی تعبیر کرتے ہوئے کہا ”یہ تو بڑی ہی اچھا خواب ہے جو تم نے دیکھا ہے..... تمہارے حالات اچھے ہو جائیں گے۔ تمہیں اسباب دنیا مہیا ہوں گے۔ اور تمہاری معیشت بہتر ہو جائے گی۔“ میں نے چاہا کہ اس شخص سے کہوں کہ اسے خواب! جس لباس میں تم ہو، کیا اس لباس والے خوابوں کی تعبیر اس طرح کرتے ہیں جیسی تم نے کی؟..... پھر میرے دل میں خیال آیا کہ میں کون ہوں کہ اس طرح کی بات ان سے کہوں۔ یہ جانیں اور ان کا کام، چنانچہ میں نے کچھ نہ کہا اور ان بزرگوں سے الگ ہو گیا۔

اس وقت چونکہ ہم کو نئی نئی آزادی ملی تھی اور ہم پارلیمانی جمہوریت کی عظیم نعمت سے بہرہ ور ہو رہے تھے، اس لیے بادشاہوں اور بادشاہت کے تصور سے اور ماضی کے اس خیال سے جن کے اندر بادشاہوں کی حکومتیں رہی تھیں، تھر تھر کانپ رہے تھے۔ شہنشاہیت اور ملوکیت کے اندر بادشاہوں نے جو ظلم انسانوں پر روا رکھے تھے، انہیں یاد کر کے ہماری راسخ کانٹنی تھیں لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ ایسے تاریک ادوار گزر گئے تھے اور نسل انسانی امن و آشتی کے گہوارے میں بھوم رہی تھی۔

”فوائد الفوائد“ میں ایک ظالم اور جابر بادشاہ کا قصہ درج تھا کہ:

خلفاء میں سے ایک خلیفہ نے ایک نوجوان کو قید کر لیا۔ اس نوجوان کی ماں خلیفہ کے پاس آ کر آہ و زاری کرنے لگی اور خلیفہ سے درخواست کرنے لگی کہ میرے بیٹے کو چھوڑ دو، وہ بے قصور ہے۔

خلیفہ نے کہا، میں نے حکم دیا ہے کہ تیرا بیٹا اس وقت تک برابر قید میں رہے جب تک کہ میری آل و اولاد میں سے ایک فرد بھی باقی ہے۔ پھر اس نے خوفناک آواز میں کہا ”کان کھول کر سن لو بڑھیا کہ جب تک اس علاقے میں میرے خاندان کی حکومت ہے، تیرا بیٹا قید خانے سے باہر کی ہوا میں سانس نہیں لے سکے گا۔“

بڑھی عورت نے جب یہ بات سنی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا ”خلیفہ نے تو اپنا حکم سنا دیا، اب تو کیا حکم دیتا ہے کہ تیرے حکم کی منتظر ہوں۔“

خلیفہ نے یہ بات سنی تو اس کا دل پھیل گیا۔ اس نے بڑھیا کے بیٹے کو رہا کرنے کا حکم صادر فرمایا اور ساتھ ہی یہ فرمان بھی جاری کیا کہ ایک قیمتی گھوڑا بڑھیا کے بیٹے کو مع خلعت کے دیا جائے اور اس نوجوان کو گھوڑے پر سوار کر کے سارے بغداد میں پھرایا جائے اور اس کے آگے آگے یہ اعلان کیا جائے کہ یہ نوجوان اللہ کے خلیفہ کی مرضی کے خلاف خود اللہ کی طرف سے آزاد کیا

گیا ہے اور یہ خلیفہ کی مرضی کے خلاف اللہ کی بخشش ہے۔

پھر اسی طرح کتاب میں ایک جگہ مجھے تھوڑی سی امید کی کرن نظر آئی لیکن آخری فقرے تک پہنچتے ہوئے دیکھی ماند پڑ گئی۔ لکھا تھا:

ترک دنیا یہ نہیں کہ کوئی شخص کپڑے اتار کر برہنہ ہو جائے اور لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائے۔ ترک دنیا یہ ہے کہ وہ لباس بھی پہنے، کھانا بھی کھائے۔ البتہ جو کچھ اس کے پاس آئے اسے خرچ کرتا رہے، جمع نہ کرے۔ اس کی طرف راغب نہ ہو اور دل کو کسی چیز سے وابستہ نہ کرے۔

اب یہ بھی عجیب دوری ہے کہ کپڑے اتار کر برہنہ نہیں ہونا لنگوٹ باندھ کر اور بھسوت مل کر جنگل میں بھی نہیں بیٹھنا۔ دنیا کو تیاگنا نہیں۔ اس دنیا میں انہی لوگوں کے درمیان رہنا ہے لیکن اس دنیا سے دل نہیں لگانا اور دل نہ لگانے کا آسان نسخہ یہ بتایا ہے کہ جو کچھ کمائے جو کچھ پاس آئے، اسے خرچ کرتا رہے۔ جمع نہ کرے۔ اس کی طرف توجہ نہ دے اور دل کو کسی چیز سے وابستہ نہ کرے!..... اب آپ ہی خیال فرمائیے کہ اس طرح سے کوئی ملک کوئی معاشرہ، کوئی گروہ ترقی کر سکتا ہے؟ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کا دامن چھوڑ کر زندگی بسر کرنا اور کرہ ارض پر سکونت اختیار کر کے اس خاکدال سے وابستگی ترک کر کے زندہ رہنا کبھی ممکن ہو سکتا ہے!

یہ سارے منطقی دلائل، دن بھر، قدم قدم پر میرا دامن تھام کر چلتے اور ہر گام پر میرا خیال یقین میں تبدیل ہوتا رہتا لیکن جب رات آتی اور میں اپنے کمرے کی جی بجا کر بستر پر لیٹ جاتا تو باہر کی سڑیٹ لائٹس میری کھلی کھڑکی سے اندر داخل ہو کر درود یوار پر کچھ عجیب قسم کے نقشے بنانے شروع کر دیتیں۔ میں پچھلے ڈیڑھ برس سے ان روشنیوں کا عادی مزے سے میٹھی نیند سوتا تھا اور کبھی مجھے اس بات کا احساس تک نہ ہوا تھا کہ میرے سامنے کی دیوار اور پاؤں سے اوپر کی چھت پر کچھ تصویریں بھی بنی ہیں۔ ان میں حرکت بھی ہوتی ہے اور ان کے کچھ مطالب بھی ہیں۔

ان سایوں کو دیکھتے دیکھتے میں ایک ایسے وہم میں مبتلا ہو گیا کہ یہ سائے نہ صرف حرکت کرتے ہیں بلکہ بولنے بھی ہیں، میرے ساتھ نہیں، آپس میں گفتگو کرتے ہیں اور ان کی میٹنگیں ہوتی ہیں۔ اب وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہیں تھی، اٹلی کے پیچارے ڈاکٹر اسے کہاں سے فراہم کرتے! میں اس بیماری سے نکل نہ سکا۔ دن کو تو بالکل ٹھیک ٹھاک پورے طور پر ناظر رہتا لیکن رات کے وقت میرے کمرے میں ان سایوں کا میلہ سالگ جاتا۔ پرانے سایوں میں کچھ نئے سائے آکر شامل ہو جاتے۔ بیٹھے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ کھڑے ہوئے ایک طرف ہو کر راستہ دے دیتے۔ کچھ باہر نکل جاتے اور کچھ تھوڑی دیر بعد اسی راستے سے اندر آ جاتے۔

وہ کوئی انسانی شکلوں کے سائے نہ تھے۔ نہ ہی ان پر جانوروں کے وجود کا گمان ہوتا تھا، نہ ہی وہ اساطیری پیکر تھے۔ ان کا ڈول عجیب سا تھا۔ آپ انہیں سائے بھی نہیں کہہ سکتے، وہ کچھ علامتیں اور نشان سے تھے جو اپنی نشوونما کا انتظار کر رہے تھے..... میں ان سے کچھ اس قدر مایوس ہو گیا تھا کہ اس عین اطمینان نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہماری

حقیقت کے علاوہ ایک اور حقیقت بھی ہے جس کا ہمیں پورا پورا ادراک نہیں۔ وہ جداگانہ اصلیت ہمارے ساتھ ساتھ ہمارے ارد گرد ہمارے قرب و جوار میں رہتی ہے لیکن ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ شاید وہ لوگ جو ”فوائد الغواذ“ میں نظر آتے ہیں، ان کو اس حقیقت کا احساس ہو اور ان کو دونوں حقیقتوں کے درمیان زندگی بسر کرنے کا فن آتا ہو اور ہم ان کے کرداروں کو اس لیے اچھی طرح سے نہ سمجھ سکتے ہوں کہ جب وہ ہمارے والی حقیقت سے نکل کر دوسری حقیقت میں داخل ہوتے ہوں تو ہماری گرفت سے نکل جاتے ہوں۔ غالباً ان کی ساری یکسوئی تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ ایک نئی ریاضانی سارات میں ڈھل جاتے ہوں۔ یہ اور ایسی اور بہت سی بے معنی باتیں میرے اندر سے ہو کر جھنجھٹاتی ہوئی باہر نکل جاتی ہیں جیسے شہوت کی لہر سارے بدن کی بنیادیں ہلا کر باہر نکل کے اترتے ہو جاتی ہے۔

میں نے آپ سے کہا تھا کہ وہم کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں تھی، اس لیے میں تھکا ہارا مشکلوں کا مارا جوں جوں کر کے زندگی گزار رہا تھا۔ اوپر سے کچھ ان ہونے واقعات اس طرح سے ہو گئے تھے کہ ان سے پنڈ نہیں چھڑایا جاسکتا تھا۔ یہ واقعات میری محبوبہ کے وہ پیارے بچے تھے جنہیں لے کر وہ میرے گھر آ گئی تھی۔ اب میں ان کو گھر سے نکال تو نہیں سکتا تھا۔ وہ تو ہو گئے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ مجھے بھی اچھنے لگے تھے اور میری خوش آغوش کی طرح میرے بھی پیارے ہو گئے تھے..... بھلا آپ کبھی یقین کر سکتے ہیں کہ بچپن سے پولیو کی شکار آنجلا آکس برس بعد اٹھ کر اپنے پاؤں پہ کھڑی ہو جائے۔ سینٹ فرانس آف اسمزڈی کے مزار پر یہ کرامت رونما ہو اور وہ اپنی ذہیل چیز و ہیں چھوڑ کر پاؤں چلتی ہوئی آکر اپنے نانا کی موٹر میں بیٹھ جائے۔ یہ سینٹ فرانس جو گھر سے نکل کر جنگلوں میں جا بیٹھے تھے اور جانوروں سے باتیں کرتے تھے۔ ان کو ہمیشہ پیار سے مخاطب کیا کرتے کہ کن بہن لومڑی میری بات سن! بیٹا، بیٹھ بیٹھ ذرا رک تو سہی، میں نے کئی دن سے تجھے دیکھا نہیں۔ خداوند سب کا چاہتا ہے۔ اس قدر حرص و ہوا اچھی بات نہیں۔ آ جا بیٹا! بھالو آ جا..... اکیلے بیٹھے بیٹھے آدمی کا دل آداس ہو جاتا ہے۔ میں نے تو تمہیں کئی دن سے نہیں دیکھا۔ اس گھنے اور سنسان جنگل میں اتنی دیر تک کون اکیلا رہ سکتا ہے۔ پھر چڑیوں، چکوروں، سارسوں اور کچھوؤں سے بھی ان کے طویل ڈائیلاگ ہوتے۔

آنجلا کے گھر والوں نے ایک مرتبہ پھر آئینہ جپانے کا پروگرام بنایا کہ سب مل کر ایک مرتبہ پھر سینٹ کا شکر یہ ادا کر سکیں اور آنجلا ان کے مزار پر مراقبہ کر کے مستقبل کی زندگی کے لیے تقویت حاصل کر سکے۔ جب سے آنجلا چلنے پھرنے لگی تھی، وہ لوگ سات مرتبہ سینٹ کے مزار پر حاضری دے آئے تھے۔ اب کی بار انہوں نے مجھے بھی زبردستی اپنے قافلے میں شامل کر لیا۔ میرا ایسی چیزوں پر بالکل اعتقاد نہ تھا اور میں مافوق الفطرت چیزوں پر اعتبار کرنے کو ذہنی، فکری، عقلی اور روحی کمزوری خیال کرتا تھا لیکن جب سے شہاب صاحب کے ساتھ ان کی قربت میں چھ سات روز گزارے تھے، میری توجہ کافی حد تک پلٹ کر ادھر ہو گئی تھی۔ گواہیوں نے نہ تو اس موضوع پر کوئی بات کی، نہ اس کی طرف کوئی اشارہ کیا۔ نہ مجھے نماز پڑھنے کی تلقین کی نہ حج پر ساتھ لے جانے کے لیے اکسایا۔ ہم تو کچھ اور ہی باتیں کرتے رہے۔ خراب خراب، ناگفتنی، ہنسی ادب کے فروغ کے متعلق اور آزادی اظہار کی ضرورت کے متعلق۔ بس واپسی پر انہوں نے کچھ باتیں کی تھیں جو مذہب سے زیادہ سائنس کے بارے میں تھیں۔ پھر یہ کیا ہونے لگا تھا کہ گاڑی پیچھے کو چلنے پر زور مارنے لگی تھی۔ مجھے ڈر

ہوئے۔ ان کا سارا فلسفہ فقیری پر فخر کی بنیاد پر قائم ہے جو بے زری کی آزادی کو زرداری کی غلامی پر ترجیح دیتا ہے۔ جب آنکھلا میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اور میں سینور داندی کا ہاتھ پکڑ کر گرے کے اندر داخل ہوئے اور سینٹ کے حراز کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی قبلائی اور پھر وہ دونوں اور پوتی نوای گھٹنوں کے بل ہو کر سر جھکا کے دعا مانگنے لگے تو میرے اندر ایک شدید شخصی سی پیدا ہوئی، پتہ نہیں یہ اس ماحول کا اثر تھا۔ اس معجزے کا رد عمل تھا جس نے آنکھلا کو اس کے پاؤں پر کھڑا کر دیا تھا۔ یا یہ اس خوف کا کچھ تھا جو مجھے آنکھ مار کر کہہ رہا تھا کہ کچھ ہوش کر کیا کر رہا ہے یا شاید گرے کے اندر آ سکیں کم تھی جس نے مجھے منہ بھر کے سانس لینے پر مجبور کر دیا تھا یا میرے اندر کچھ نہیں ہوا تھا اور باہر سے کسی کچھ نے مجھے پکڑ لیا تھا، کچھ تھا ضرور جس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ یہ شخص ختم نہیں ہوئی تھی۔ خوفزدہ لڑکی کے پاؤں سے نکلی ہوئی جھانجھری طرح ڈھلوان چٹان پر بجتی چلی جا رہی تھی۔

مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا کیونکہ میں اس یا ترا پر اندر سے کافی ڈر گیا تھا۔ پھر اٹلی میں بالعموم اور روم میں بالخصوص ایسے ایسے کہنہ مقامات کے ارد گرد سے گزرتا پڑتا تھا جہاں اور کچھ نہیں تو تاریخ ہی لوٹ لوٹ کر جملے کرتی رہی تھی۔ جب رومی اور یہودی مسیحیوں پر ظلم کرنے سے رک جاتے تو پھر تاریخ آگے بڑھ کر کچھ ایسے حالات پیدا کر دیتی کہ نیک نفس راہب اور برترتیدہ خلوت نشیں اپنی اپنی گوشہ گیریوں کے اندر ہی ختم ہو جاتے۔ شہر روم کی سطح کے اندر بے شمار ایسے قبرستان ہیں جہاں ہزاروں لاکھوں عیسائی عارف، شیروں، چیتوں کے پھاڑے عیسائی غلام اور خوفزدہ چھپے ہوئے عوام دفن ہیں۔ جب ان چھپے ہوئے گروہوں کا کوئی فرد مر جاتا تھا تو وہ اس کو وہیں اپنے قریب اپنی کچھاؤں اور کینن گاہوں میں دفن کر لیتے تھے۔ سینٹ اگنیو، سینٹ کالکس ٹس اور سینٹ سیپتیا کے گرجوں میں دور دور تک ایسے کینا کو مز پھیلے ہوئے ہیں جن میں پرانے مردوں کی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کے انبار لگے ہیں۔ نوجوان، شرارتی، فراخ نظر اور آسان گیر قسم کی لڑکیاں جب اپنے محبوبوں کے ساتھ ان گرجوں میں آتیں تو دیواروں کے ساتھ ساتھ لمبی لمبی کھڑکیوں سے ران یا کولہ کی کوئی بڑی سی ہڈی یا کھوپڑی اٹھا کر اپنے منگیتروں سے کہتیں یہ تمہارے پڑدادا کی کھوپڑی معلوم ہوتی ہے۔ تیسری صدی عیسوی کا یہ مذہبی بڑھا کا تھا جیسی اس کی ایک ساکٹ سکڑی ہوئی ہے۔ لڑکے کو لمبے کی ہڈی اٹھا کر اپنی محبوبہ سے کہتے یہ تمہاری سکڑائی کے کو لمبے ہیں جو اپنی چوڑائی کی وجہ سے واضح اشارہ کرتے ہیں کہ تمہاری سکڑائی ایک بد معاش عورت تھی اور اس کے اپنے گاؤں سے بھی باہر کی بات تھی۔ پھر وہ زور کا ایک قبچہہ لگاتے اور کوئی پادری اپنی تیج ہاتھ میں لیے ان کے قریب آ کے اپنا تیج والا پنچہ اوپر اٹھاتا اور کچھ کہے بغیر ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ اس پر وہ پہلے سے بھی زیادہ اونچا قبچہہ لگاتے اور پوچھتے "پادری جی اس ران کی ہڈی والے کی روح کہاں گئی؟" پادری غریب اس بات کا کیا جواب دیتا! امونے مونے چپلوں والے گورے گورے پاؤں اٹھاتا واپس اپنے صومعہ میں چلا جاتا۔ ان دنوں چونکہ میری زبان بھی خوب چلتی تھی اس لیے میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ اس ناسزا گوئی اور توہین مقدمات میں برابر کا شریک ہوتا۔

لیکن اب مجھے ان کینا کو مز سے اور زیر زمین پھیلے ہوئے ان قبرستانوں سے خوف آنے لگا تھا۔ پہلے جو میرا چہرہ ہارے کا پورا اور تھا اب آہستہ آہستہ رخ بدلنے لگا تھا اور مجھے اس بات کا سخت افسوس تھا کہ میں ترقی خواہ ہونے کے

لگ رہا تھا کہ میں رجعت پسند ہو جاؤں گا اور جہاں سے دنیا چلی تھی، اس پتھر اور دھات کے زمانے میں پہنچ جاؤں گا۔ ہم نے کوستر کے اندر ہنری، چیز اور ٹیونا کے سینڈو چڑکھائے اور تھرموس سے گرم گرم کافی پی۔ آنکھلا کی ماں نے جلدی جلدی ساری چیزیں سینٹ کرانٹس ڈبے میں پیک کیا۔ سر پر سیاہ رومال باندھا۔ پرس سے دعاؤں کی ایک چھوٹی سی کتاب نکال کر آنکھلا کو دی اور دوسری خود پڑھنے بیٹھ گئی۔ آئینزی قریب آ رہا تھا۔ میں نے سر سے ٹوپ اتار کر زانو پر رکھ لیا تھا اور آنکھلا دونوں ہاتھوں کی کنگھی گود میں ڈال کر سیدھی ہو کے بیٹھ گئی تھی۔

میں نے سائیں فرانس کے حراز کے سامنے کھڑے ہو کر دل ہی دل میں کہا "کہو سائیں بابا مزاج اچھے ہیں طبیعت خوش ہے؟ کیا وقت گزر رہا ہے اور اب کن مدارج میں ہو۔ میری ان باتوں کا تو کیا جواب ملتا البتہ مجھے سائیں بابا کا وہ زمانہ یاد آ گیا جب وہ اپنے امیر کبیر باپ کے گھر میں عیش و عشرت کا لڑکپن گزار رہا تھا۔ نہ کوئی بھگوان نہ حمیرا نہ گلر نہ فاقہ، عیش ہی عیش، سرور ہی سرور۔

پھر ایک روز اس لڑکے کو بخار چڑھا اور لمبا ہی چڑھتا گیا۔ بڑے معالج بدلے لیکن کوئی افاق نہ ہوا۔ ماں باپ جان کے لالے پڑ گئے۔ بخار ٹوٹا تو نہیں باری میں تبدیل ہو گیا۔ اس باری کے بخار نے بچے کو بالکل لاغر اور پامال کر دیا۔ والدین ڈاکٹروں کا پچھا چھوڑ کر بچے سے دعا کرانے کے لیے اسے گاؤں کے گرجے میں لے گئے۔ وہاں نوجوان فرانس کو مراقبہ میں یوں محسوس ہوا جیسے یسوع اس کے سامنے کھڑے کہہ رہے ہوں "فرانس واپس جاؤ اور میرے اس خراب خستہ گھر کو تعمیر کرو۔ دیکھتے نہیں ہو کہ سارے کا سارا ایک خرابے میں تبدیل ہو رہا ہے۔"

فرانس اپنے گھر سے باپ کی نقدی چہ اگر گرجے کی مرمت کے لیے مزدور اور مستری لے آیا اور اپنی مگرانی میں اس کی مرمت شروع کرادی۔ باپ کو اپنے جمع جتنے میں سے جب ایک بھاری رقم کی کمی کا احساس ہوا تو اس نے نوجوان فرانس پر سرقہ کا مقدمہ دائر کر کے اسے ہشپ کی عدالت میں پیش کروا دیا۔ یہاں سے باپ بیٹے کے درمیان ایک اصولی جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ میں ماں نے شوہر کا ساتھ دیا کہ اس کا مستقبل دولت اور پر سکون زندگی سے وابستہ تھا۔

ہشپ کی عدالت میں جب فرانس کا مدعی باپ اس پر الزامات کی بوچھاڑ کر رہا تھا تو فرانس نے اپنے گھر کا دعا کردہ ریشمی لباس اتار کر وہ پیکھا اور اس کی جگہ ایک مزدور کی گدڑی پہن کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک علامتی لڑائی تھی جس میں فرانس نے ہار نہ مانی اور ساری دنیا کے کہنے کے باوجود اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ اس کے بعد اس نے کسی قسم کی مذہبی تربیت یا فقہی مطالعے کے بغیر حضرت عیسیٰ کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ جس کی بنیاد محبت اور صرف محبت تھی۔ فرانس کی ساری طاقت اس کی سادگی اور معصومیت میں تھی۔ اس کو محبت پر اندھا یقین تھا اور اس کے سوا اس کا کوئی اور سہارا نہ تھا۔ محبت! محبت! محبت! بے غرض و عنایت بغیر مقصود و مطلب، بغیر حرص و مطلب صرف ہوا کے جھوکے جیسے تعلق اور نگہت گل جیسی قربت!

سینٹ فرانس آف آئینزی نے غریبی اور مفلسی کے ساتھ ایک گہرا تعلق پیدا کر لیا تھا اور وہ ہر وقت بے مانگی اور بے زری کے گن گاتے تھے کہ چھانک اور پھلکڑ لوگ آزاد، بے باک اور بے غم ہوتے ہیں۔ کسی کے محتاج اور دست نگر نہیں

بجائے اور یورپ سے استفادہ کرنے کے بجائے واپس اپنی ماں کی گود کی طرف دیکھنے لگ گیا تھا۔ اس قدر اوپر پہنچ کر بچے کی طرف دیکھنے لگ جانا اور بچے کے نظاروں میں کھو کر ان میں انہماک پیدا کر لینا کیسے انخطاط، کس قدر پستی اور تنہا رتبہ کی بات ہے! لیکن بچے کو کچھ واقعات نے کچھ بولنے اور کچھ خاموش واقعات نے مجھے مجبور سا بنانے کے رکھ دیا تھا۔ اب میں زیادہ مزاحمت نہیں کرتا تھا۔ مدافعت نہ کرتا تھا اور معترضین کی صف سے نکلتا جا رہا تھا۔

جب میں نے آنکھلا کے مجھے بڑے واقعہ پر و فیساں نگار جی کو سنایا اور ان سے خرق عادت اور کرامت وغیرہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے سر جھکا کر کہا "فلسفی اور دانشور تو مجھے بڑے کی تردید کرتے ہیں اور اس تردید کی اور ابطالی دعوے میں سب سے اول نمبر پر ڈیوڈ ہیوم ہے جو ایک بہت ہی لائق اور عیسائی فلسفی ہونے کے رشتے سے ہیں۔ اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم بھی اس کا ساتھ دیں لیکن سائنس دانوں کا رویہ فلسفیوں سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کوئی بات، کوئی واقعہ، کوئی حادثہ قانون قدرت کے خلاف رد نہیں ہو سکتا۔ "لاز آف نیچر" سے واقف نہیں ہیں اس لیے ہم اس ممکنہ صورت سے اجتناب نہیں کر سکتے کہ ایک نامعلوم "لاز آف نیچر" نے طے شدہ قانون قدرت پر سبقت حاصل کر کے اسے ناکارہ کر دیا اور اس کی جگہ خود ممکن ہو کر قائم ہو گیا۔"

میں نے کہا "استاذی مری آپ کی یہ بات بالکل دل کو لگتی ہے اور اس میں منطقی جواز نظر آتا ہے لیکن یہ مجھ پر اصل میں ہے کیا؟"

انہوں نے ڈرار کستے کستے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ کوئی فعل، کوئی عمل یا کوئی واقعہ جو فوق بشری بنش یا فوق انسانی خبر گیری کی دلالت دے۔ میرا مطلب ہے دلالت ضمنی فراہم کرے، اس کو ہم مجھے اور کرامت کی بنیاد کہہ سکتے ہیں۔" لیکن سراہیوم کہتا ہے..... "میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کی "کہ انسان کتنی بھی شہادتیں فراہم کر لے، وہ مجھے کو ثابت نہیں کر سکتا..... شاید یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے دانشوروں اور سائنس دانوں نے بھی اس مفروضے پر بلا تحقیق ایمان رکھا اور اس کے وجود کو اپنے لیے بارشری میں لے جا کر پرکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

پروفیسر انگار جی نے آنکھیں بند کر کے اور سر اوپر اٹھا کے کہا "اس کی وجہ شاید یہ ہے..... اور یہ میری سوچ نہیں پروفیسر رکت کا نظریہ ہے کہ آج کی خلاف عقل، بعید از قیاس اور غیر اغلب باتیں آنے والے کل کی بنیادی سچائیاں ہوں گی۔ دنیا کے سب سے بڑے سائنس دان نیشن کو اپنا نظریہ متعارف کرانے کے لیے اتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ اس نے رنجیدہ ہو کر گلوگرو انداز میں کہا "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یا تو انسان کوئی نئی شے سامنے لانے کا تہیہ ہی نہ کرے اور اگر کر لے تو پھر ساری عمر اس حذر داری اور اس کی تائید کا غلام بن کر گزارے۔"

میں نے کہا "مائیسٹرو (meastro) جب ہمارا گیلیلو زمین کی گردش کا دعویٰ کر بیٹھا تھا تو اس پر کیا گزری تھی۔" انہوں نے بات کاٹ کر کہا "یہ بات تو ساری دنیا جانتی ہے اشفاق! لیکن جب گیلیلو بیچارہ اپنی دور بین ٹیلا کر کے کہتا تھا، اس میں ایک مرتبہ دیکھو تو سی تم کو دور کی چیزیں نزدیک نظر آئیں گی اور ستارے تمہارے بالکل قریب

آجائیں گے تو بڑے بڑے جید عالم اور نامی گرامی فلسفی یہی کہا کرتے تھے کہ ہم نے بڑی دیکھی ہیں ایسی مریلیاں۔ خوب جنت ہیں۔ تیری مری تو بچنے کی بھی نہیں، اس میں تو پھونک مارنے کو بھی کوئی سوراخ نہیں! پھل بھاگ یہاں سے۔ تم مضبوطی سے جی ہوئی دھرتی کو حرکت میں لا کر "لاز آف نیچر" کو توڑنا چاہتے ہو؟ تم احمقوں کے سردار اور ہاؤس کے سرخیل ہو۔"

میں نے کہا "سر ہمارے گالوانی کو بھی تو لوگ چور ہوں پہ نعرے مار مار کے چھیڑا کرتے تھے کہ مینڈک کا بچپا آگیا۔ مینڈک کا مداری آگیا اور اب گلیو میسٹر کے بغیر کوئی لیبارٹری کوئی ورکشاپ مکمل ہی نہیں۔" "فرانس کی رائیل سائنس اکیڈمی کے چیئرمین نے کہا....." یہ بات کہہ کر پروفیسر انگار جی رکے اور بولے "فرانس کی رائیل سائنس اکیڈمی ہے یا خالی سائنس اکیڈمی؟"

میں نے کہا "سر خالی سائنس اکیڈمی آف فرانس ہی ہوگی۔ رائیل کا لفظ ان کے ذیل میں کہیں بھی نہیں آتا۔" کہنے لگے "سائنس اکیڈمی آف فرانس کے چیئرمین نے کہا کوئی عقل کی بات کرو، اور سائنس دان ہوتے ہوئے فرضی باتیں چھوڑ دو۔ آؤن کٹھولے اور اڑن ٹالے صرف کہانیوں میں مل سکتے ہیں۔ حقیقت کی دنیا میں نہیں۔ فزکس کا سیدھا اصول ہے کہ ہوا سے بھاری کوئی شے ہوا میں اڑ نہیں سکتی۔ پھر ہوائی جہاز بنانے کی باتیں کیوں ہو رہی ہیں۔ انفل کی جنت ہے باہر نکل آؤ اور الف لیلا کی باتیں چھوڑ دو۔ ہوائی جہاز کا بننا "لاز آف نیچر" کے خلاف ہے۔ قدرت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن اپنا قانون توڑنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔"

"لیکن اس اصول کو توڑ کر ہوائی جہاز بنا....." میں نے کہا "اور اب تک اڑ رہا ہے اور اب تو اس کی اڑائیں کرۂ

ارض کے ارد گرد روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔" کہنے لگے "اب نفسیات دان یہاں تک سمجھتے ہیں کہ ذہن انسانی حتیٰ کہ لاشعور ذہن، بدن پر اور وجود پر اور جسم پر اور حاکمیت سے حاوی ہے اور اس کا اختیار دوسری تمام چیزوں سے قوی تر ہے جن کو سائنس دان میکینیکل تھیوریوں کی بنا پر آج تک مادے کے حوالے سے قوی اور با اختیار سمجھتے تھے..... چنانچہ بہت سے سائنس دان اب شیکسپیر کے اس ڈیلاگ کے قائل ہو گئے ہیں جو سہلست میں کہتا ہے کہ اس دنیا میں زمین و آسمان کے مابین بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کو نہ تو ہم جانتے ہیں اور نہ ہی الحال انہیں سمجھ ہی سکتے ہیں..... اب باہر سے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا کافی مشکل ہے کہ کون سے واقعات مجھے کے ذیل میں آتے ہیں اور کون سے قدرتی نوعیت کے ہیں۔"

پروفیسر انگار جی نے اسکندریہ میں اپنی جوانی کے ایام کو یاد کرتے ہوئے کہا "اسلام اصول نظری اور فرض علمی کے طور پر مجھے کو تسلیم کرتا ہے لیکن بغیر خدا نے مجھے دیکھانے سے کئی طور پر انکار کر دیا اور اپنی امت کو بتایا کہ اللہ اپنی نوت کا کلام سے کچھ بھی کر سکتا ہے لیکن ایسا سب کچھ اس کے اختیار میں اور اس کی قدرت میں ہے۔"

پھر انہوں نے ٹکٹے ٹکٹے کہا "میرا ذاتی خیال ہے کہ عقیدے، اعتقاد اور دلیل و استدلال میں کوئی اختلاف نہیں، میرا مطلب ہے سائنس اور اعتقاد و ایمان میں کوئی تضاد نہیں، کوئی ضد نہیں۔ وہ خدا بزرگ و برتر جو اپنے آپ کو

ہم کر اپنے ساتھیوں میں کچھ اونچے درجے کی چیز بن جاتا تھا۔ فی ہاؤس میں ہم مذہب کی خرابیوں، فتنہ ساز یوں اور تحریک کاروں کے قصے بیان کیا کرتے۔ ان دنوں ہر گفتگو اس فقرے سے شروع ہوتی کہ ”مذہب عوام الناس کے لیے اونیوں ہے“ اور آخر میں اسی فقرے پر ختم ہو جاتی۔ پھر ہم اپنے اپنے گھر چلے جاتے اور مضبوط جلد کی، سفید کاغذ والی، تصویروں سے مزین وہ سستی کتابیں پڑھتے جو روس سے آتی تھیں اور ڈیڑھ دو روپے میں مل جاتی تھیں۔ ایسی کتابوں کی لاگت تو پچاس ساٹھ روپے سے کم نہ ہوتی لیکن ماسکوا شاعت گھر انہیں مالی کمک دے کر برائے نام قیمت پر بیچتا تھا۔ اس کے مقابلے میں مولویوں کے درس، جمعہ کی نمازیں، دینی جلسے، رجعت پسندی کے بے معنی نمونے نظر آتے تھے۔

ماموں نذر نے بتایا کہ یہ جو مفتی صاحب ہیں، یہ ایک بزرگ کے شاگرد ہیں جو دنیا کے اسلام کے بہت بڑے عالم تھے۔ وہ بزرگ یہاں سے بہت دور تھانہ بھون میں رہتے تھے اور ان کا نام اشرف علی تھانوی تھا۔ اسلامی دنیا کے بڑے بڑے چوٹی کے عالم تھانہ بھون آکر مولوی صاحب سے تربیت حاصل کرتے رہے ہیں اور واپس جا کر ان کے پیغام کو دنیا بھر میں پھیلاتے رہے ہیں۔ پھر میرے ماموں نے اپنی محبت کا ہاتھ عقیدت کے دل پر رکھ کر کہا ”اور یہ جو ہمارے مفتی محمد حسن صاحب ہیں، یہ مولانا اشرف علی تھانوی کے چہیتے شاگردوں میں سے ہیں۔“

مجھے اور میرے بڑے بھائی کو شہر بھون کے ساتھ ”تھانہ“ کے لفظ نے بڑے منفی انداز میں متاثر کیا اور ہم ہر وقت تھانہ تھانہ اور بھون بھون کے فقرے لگانے لگے۔ میری ماں اور میری آپا کو یہ بنگاریں کچھ اچھی نہ لگیں۔ انہوں نے اپنے دھیمے انداز میں ہمیں روکنے کی کوشش کی لیکن ہم اور شیر ہو گئے۔ میرے بڑے بھائی نے بتایا کہ اس علاقہ میں ایک بڑا تھانہ ہے جہاں مولویوں اور ملوانوں کو بلا کر ہر دے ان کی مرمت کی جاتی ہے اور ان کا لڑکا کران کی چھترول ہوتی ہے۔ میں نے کہا ”یار بھائی اوہاں تو ہمارے پیارے ماموں بھی گئے تھے، بیعت ہونے لگا“ تو بھائی نے کہا ”ان کی بھی مرمت ہوئی تھی اور پورے چھ روز تک ان کو تھانہ میں رکھا گیا تھا۔“ مجھے اس بات پر تھوڑا سا افسوس بھی ہوا لیکن ہم کیا کر سکتے تھے۔ یہ انہوں جان کا اپنا چار کس تھا۔

یہ جو مفتی محمد حسن صاحب تھے، ان کی ٹانگ پر کوئی پھوڑا تھا۔ بہت ہی زہریلے قسم کا جس کی جڑیں ان کی ٹانگ کے اندر دور دور تک پھیل گئی تھیں، میرے ابا جی اور ماموں جب بھی ملتے، جہاں بھی ملتے اور جب بھی کوئی بات کرتے، وہ مفتی صاحب کی بیمار ٹانگ کے بارے میں ہوتی۔ میرے ابا جی چونکہ امراض جلدی کے ماہر ڈاکٹر تھے، اس لیے انہوں نے اپنا پورا زور لگا کر تین مرتبہ ایسے مرہم تیار کیے جن سے شفا لازمی تھی اور جن کی دو پٹیوں کے بعد ہی مفتی صاحب کی بیمار ٹانگ میں صحت مندی کے آثار نمایاں ہو جانے لگے لیکن ان کی ہر پٹی ناکام رہی اور ہر مرہم بیماری کا بال بھی بیکانہ نہ لگا۔ یہ دونوں بزرگ مفتی صاحب کی ماؤف ٹانگ کا اس درد مندی کے ساتھ ذکر کرتے تھے اور اس ذکر میں ان کی بات کی ایسی ایسی تفصیلات سامنے آتی تھیں جنہیں سن کر ہم جیسوں کے بھی روئے کھڑے ہوتے تھے۔

ابا جی بتاتے تھے کہ مفتی محمد حسن صاحب کی ٹانگ پر ایک ایسا زہریلا پھوڑا تھا جس سے کسی رطوبت خارج ہو ہو کران کی ساری ٹانگ میں سرایت کر گئی تھی۔ اس زہر نے پوری پنڈلی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور جلد کی حالت ایسی

آشکار کرتا ہے (وہی کلام کے ذریعے) وہی خدا ہے جس نے یہ طبعی دنیا بنائی ہے اور اس کے ساتھ انسانی ذہن بھی تخلیق کیا ہے تو ایسا خدا، نمود باللہ اپنے آپ کی مخالفت یا اپنی خلاف گوئی نہیں کر سکتا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اور کراماتیں قدرت کی راہ میں ایک مداخلت یا قوانین قدرت کی روش و جہت میں توقف اور تعطیل ضرور ہیں لیکن یہ قوانین قدرت کا بطلان نہیں کرتے اور یہ کسی مذہبی ضرورت کے تحت عمل میں آتے ہیں۔“

پروفیسر انگار جی کمال کے استاد تھے۔ اپنی تعلیم تو وہ کسی بھی لحاظ سے پوری نہ کر سکے تھے لیکن ان کی فخریہ عمیق اور مربوط بہ موضوع ہوتی تھی۔ میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ ان کو کشف بھی ہوتا تھا۔ وہ شاعر کے علاوہ ایک صاحب کشف بزرگ بھی تھے جن کی صحبت میں بہت سے اسرار آپ سے آپ کھلتے جاتے تھے۔

میں جب ان کے گھر سے لوٹا تو ہفتہ کی شام ہونے کی وجہ سے ٹریفک کا دباؤ بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ جو کورس ہاؤس کے درمیان سان کار لوگر جے کے پاس راستے کی ایک قینچی سی بنتی ہے وہاں کافی دیر رکتا پڑتا ہے اور جی کے انتظار میں ہر کامظارہ کرنا ہوتا ہے۔ جی کی تبدیلی کے انتظار میں قینچی پر کھڑے کھڑے مجھے نیلا گنبد میں بڑی مہر میں بنائے والی دکان اچانک یاد آگئی جہاں سے میں روز گزرا کرتا تھا۔ گورنمنٹ کالج سے واپسی پر میرے گھر کا راستہ نیلا گنبد سے ہو کر ہاؤس تک جاتا تھا۔ یہاں گنبد دو گھنٹے گزارنے کے بعد میں اے جی آفس کے پہلو میں واقع اپنے گھر پہنچتا۔ ہر روز وہاں سے جھگڑا ہوتا کہ میں نے روٹی نہیں کھائی نہ پکایا کریں۔ ہر روز وہ میرے لیے روٹی پکاتیں اور رات کو وہی کھا کر سو جاتیں۔ میں قینچی شش راہ پر کھڑا اپنے گھر کو، اپنی ماں کو اور مہر میں بنائے والی اس دکان کو دیکھ رہا تھا جہاں ایک بڑے سے سائے بورڈ پر بہت ہی بڑی قینچی بنی تھی اور اس کے نیچے جلی قلم سے ”ادھار محبت کی قینچی ہے“ لکھا تھا۔ میں اس بورڈ کو دیکھ کر ہر روز چڑتا تھا کہ یہ سلوگن اب اتنا پرانا ہو گیا ہے، اس میں کوئی جاذبیت باقی نہیں رہی۔ پھر مولوی صاحب نے اسے اپنی دکان پر کیوں لٹکا رکھا ہے۔ ہر شام اتنے بڑے بورڈ کو اٹھا کر اندر رکھتے ہیں اور صبح آ کر پھر لٹکا دیتے ہیں۔

اب میرے شش راہے کا راستہ کھل گیا تھا اور مجھے وہ بزرگ یاد آنے لگے تھے جن کے پاس تین چار مرہم میرے ابا جی اور میرے ماموں نذر محمد مجھے پکڑ کر لے گئے تھے۔ ان کا قیام بڑی مہروں والی دکانوں کے پیچھے تھا اور وہاں گنبد مسجد میں درس دیتے تھے۔ بڑے اچھے، شفیق، حلیم، خوش وضع اور خوش پوش بزرگ تھے۔ چہرے پر طمانیت اور بوڑھوں پر مسکراہٹ تھی۔ آنے جانے والوں کے ساتھ بڑی عاجزی اور فروتنی کے ساتھ ملتے لیکن دین کے معاملے میں بڑے سخت تھے اور اس میں کسی قسم کی رعایت دینے پر مائل نہ ہوتے تھے۔ تقریباً سارا لاہور ان کا گرویدہ تھا اور ان کا درس سننے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ خود میرے ماموں جو اوکاڑہ میں قیام پذیر تھے، محض ان کا درس سننے کے لیے لاہور آتے اور پھر لائے پیر واپس چلے جاتے۔

ابا جی نے اور ماموں نذر نے بڑی کوشش کی کہ میں بھی ان کی طرح اس بزرگ کا گرویدہ ہو جاؤں لیکن وہاں مشن میں کامیاب نہ ہو سکے۔ دراصل اس زمانے میں ہر ذہین طالب علم تھروڈ ایئر میں سوشلسٹ ہو جاتا تھا۔ کوئی کولی کمیونسٹ بھی بن جاتا اور کندھے پر تھیلا لٹکا کر مونے مونے سڑپ کے چہل پہن کر اور آنکھوں پر لاہیری فریم کی عینک

ہوئی تھی جیسے بھڑوں کا چھتہ ہو۔ یہ ایسا کر یہ اور تکلیف دہ منظر تھا کہ مفتی صاحب کسی کو اپنی بیمار ٹانگ دیکھنے نہیں دیتے تھے۔ کمرہ بند کر کے یا تو خود اس کی مرہم پٹی کرتے یا کسی معتمد سے کراتے۔ میرے والد نے کئی مرتبہ ان کے ماسورہ کو دیکھا تھا اور بحیثیت ایک ڈاکٹر کے جو کچھ بھی اس لیے تجویز کیا تھا، وہ سب اکارت ثابت ہوا تھا اور ٹانگ کی حالت روز بروز بدلتی جاتی رہتی تھی۔

مفتی صاحب ایک شدید اور جانکاہ تکلیف میں سے گزر رہے تھے اور ان کے چاہنے والے اس صورتحال سے اور بھی پریشان ہوتے تھے کہ جب مفتی صاحب سے بیماری کا حال پوچھا جاتا تو ہمیشہ ”الحمد للہ“ کہہ کر یہی فرماتے تھے کہ پہلے سے بہتر ہے۔ ہمیشہ ہشاش بشاش رہتے۔ باقاعدگی سے درس دیتے اور آنے والوں کے ساتھ حق میزبانی خندہ پیشانی کے ساتھ ادا کرتے۔ میرے باپ کا خیال تھا کہ ٹانگ فوراً کٹنی چاہیے کیونکہ ماسورہ کا ہر سارے جسم میں پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ حکیم محمد حسن قریشی اور ڈاکٹر جمیعت سنگھ، پروفیسر میڈیکل کالج لاہور کی بھی یہی رائے تھی۔ اس کے علاوہ اور بہت سے معالجین تھے جن کی یہی رائے تھی کہ ٹانگ فوراً کاٹ دینی چاہیے۔

چنانچہ معالجین کے اصرار پر مفتی صاحب ٹانگ کٹوانے پر رضامند ہو گئے۔ سرجری میں لے جا کر اور مفتی صاحب کو آپریشن ٹیبل پر لٹا کر جب ڈاکٹروں نے انہیں بے ہوش کرنے کے لیے ٹوپی چڑھانا چاہی اور نیکدہ کر کے بے سدھ کرنے کی تیاری کی تو مفتی صاحب نے فرمایا ”اس کی ضرورت نہیں، مجھے میرے حال پر چھوڑ کر اپنا کام شروع کیجئے۔“

اب ڈاکٹر، سرجن، آنکھیں اسٹنٹ حیران کھڑے ہیں اور مفتی صاحب اصرار کر رہے ہیں کہ داروئے بہشت دینے کی چنداں ضرورت نہیں، آپ اپنا کام جاری کریں۔

سب ڈاکٹر حضرت کے جاننے اور ماننے والے تھے جو نہیں جانتے تھے، ان پر مفتی صاحب کے روحانی ہمار جلال کا کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ بھی کچھ نہ بول سکے۔ چنانچہ مجبوراً بے ہوش کیے بغیر ان کا ٹانگ شروع کی۔ ڈاکٹر امیر الدین سرجن ران کاٹ رہے تھے۔ ان سٹنٹس اسٹ نبض ہاتھ میں لے کر خوفزدہ بیٹھے تھے اور چھوٹے ڈاکٹر اور طالب علم حیرت سے یہ انوکھی سرجری دیکھ رہے تھے۔

اس آپریشن میں تقریباً ایک گھنٹہ لگا اور مفتی صاحب جس ہشاش جس ہشت کے ساتھ آپریشن روم میں داخل ہوئے تھے، اس سے بہتر پرورفتی اور منور چہرہ لے کر سڑک پر باہر نکلے۔ ایک مرتبہ باتوں باتوں میں مفتی صاحب نے خود کہا کہ جب میری ٹانگ کاٹنی گئی تو ڈاکٹروں کو اندیشہ تھا کہ میں جانبر نہیں ہو سکوں گا۔ ڈاکٹر امیر الدین صاحب بھی گھبرائے ہوئے تھے اور ٹانگ کاٹ رہے تھے۔ ڈاکٹر ریاض قدر بھی خوفزدہ تھے اور ٹانگ لگا رہے تھے اور کرل ڈاکٹر فیاض صاحب نبض ہاتھ میں لیے حیران ہو رہے تھے کہ ابھی زندگی کے آثار باقی ہیں۔ وہ لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں بھی پریشان ہوں گا لیکن میرے لیے تو یہ یوم عید تھا۔

کوئی صاحب جوان کے آپریشن کے بعد بیمار پرسی کے لیے آئے تھے، ان سے کہا ”دیکھئے حضرت! انسان“

جو حالات آتے ہیں وہ قسم کے ہوتے ہیں۔ ایسے حالات جو طبیعت کے مطابق ہوں اور خوش کن ہوں۔ دوسرے وہ حالات جو طبیعت کے منافی ہوں اور ناگوار ہوں تو ان حالات میں عہدیت یہ ہے کہ یوں سمجھئے کہ حق تعالیٰ مجھے قرب عطا فرما رہا ہے۔ خوشگوار حالات پر تو شکر کروں گا اور ناگوار حالات پر صبر کروں گا۔“

یہ سب باتیں میرے ماموں اور میرے ابا جی نے میری بڑی آپا کو بتائی تھیں جو مفتی صاحب کی معتقد اور گردیدہ نص اور ان کے بارے میں ایک ایک بات سنجال کے رکھتی تھیں۔ ان کی کاپی میں مفتی صاحب کے بہت سے ملفوظات بھی درج تھے جنہیں وہ باقاعدگی کے ساتھ پڑھ کر یاد کیا کرتیں۔

مفتی صاحب کی ٹانگ کٹنے کے بعد مجھے اپنے دونوں بزرگوں کی معیت میں صرف ایک بار ان سے ملنا نصیب ہوا اور اس مرتبہ مجھ پر ان کے عزم و استقلال اور خدا پر کامل اعتقاد و اعتماد کا بڑا رعب طاری تھا۔ کچھ عجیب بات تھی کہ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، میرے اندر کوئی منفی خیال اور باہر کوئی گستاخ جملہ وجود میں نہ آ سکا۔

اب میں پروفیسر انگارہ جی کے گھر سے اپنے گھر کو جا رہا تھا اور راستے میں سڑکوں کی قینچی سے ادھار کی قینچی پر ہوتا ہوا حضرت مفتی محمد حسن کے نیلا گنبد میں پہنچ گیا تھا اور مجھے آنکھلا کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے ساتھ ساتھ مفتی صاحب کی زنجیر ٹانگ کٹنے کا معجزہ ایک ایک تفصیل کے ساتھ سامنے آ رہا تھا جس میں حضرت نے فکرو فارم لینے کے بجائے یا بے ہوش کے برعکس اپنے آپ کو پورے کا پورا اللہ کے حوالے کر دیا تھا اور پورے کے پورے ہوش و حواس کے ساتھ سرجنوں اور ڈاکٹروں سے اپنی زنجیر ٹانگ کٹوانی تھی۔ میں اس کو جب بھی ایک معجزہ قرار دیتا تھا، میرے ماموں ٹوک کر اسے بزرگان دین کی کرامت کہہ کر میری تصحیح کرتے!

ان دونوں واقعوں کا میں چشم دید گواہ تھا، کچھ بھی میری عقل تسلیم نہ کرتی تھی کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ میری تربیت کا اثر تھا۔ میرا مشاہدہ کچھ اور تھا اور میری تربیت اس سے مختلف انداز میں ہوئی تھی۔ میں اپنے مشاہدے پر غور کرنے کے بجائے اپنی تربیت کے ہنڈولے میں جھول رہا تھا۔ ہر ہی ذوال تربیت و تہذیب کی ہری ڈال پر نوٹوٹا ایک ہی بول بول رہا تھا۔ ہر جمونے پر ایک سے پر تول رہا تھا۔ اوپر نیچے ڈول رہا تھا۔ ”جگ جگ جی“ ”پیر زادہ ابراہیم حنیف کہا کرتے تھے“ ”بھیڑوں میں بھیڑ ملی رہ، آرام سے گزر ہو جائے گی، اپنا راستہ الگ سے طے کرو گے تو گھٹے کی بھیڑیں روند کے مار دیں گی۔“ ”بھیڑیے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔“

پھر اس کم عمری میں مجھ پر ایک اور حملہ ہوا۔ وطن سے دور، عزیز و اقارب سے پرے اور اپنوں سے بعید مجھ میں اس حملے کو برداشت کرنے کی تاب تو نہ تھی لیکن گیا اور اس یورش سے زندہ و سلامت برآمد ہو کر پھر اپنے کام کاج میں لگ گیا۔ سر الیکٹرینڈ رفلینک ہماری یونیورسٹی میں لیکچر دینے آئے تھے اور انہوں نے شعبہ سائنس میں تین بسیرت افروز لیکچر دے کر سب پر اپنی ذہانت کا سکہ جما دیا تھا۔ مزاج کے نرم، گفتگو کے دلچسپ، آواز کے سریلے، انداز کے شرمیلے اور کراہیں بکھیرنے کے مخیر تھے۔ گوان کا موضوع میرا سبیکٹ نہیں تھا پھر بھی ان کی باتوں میں کچھ ایسی موہنی تھی کہ میں ان کے تین لیکچروں میں حاضر ہوا اور ان پر اپنی عقیدت نچھاور کرنے کو بار بار جھڑکاتا رہا۔

در اصل وہ عمر کے آخری حصے میں روم اور روم کے گرجے اور روم کی مذہبی اور روحانی فضا سے لطف اندوز ہوئے آئے تھے اور جیسا کہ دستور ہے کہ کوئی اتنا بڑا آدمی شہر میں آئے اور اس شہر میں ایک دانش گاہ بھی ہو تو اس بڑے آدمی کی شہرت اور عزت علم کی بنا پر ہو تو طالب علم اور اساتذہ ایسے دودان کو اپنی یونیورسٹی ضرور کھینچ لاتے ہیں کہ علم کے بھنڈار سے کچھ دان دکھنا ہم کو بھی عطا ہو۔ چنانچہ ہم نے سر فلیمنگ کو بھی اپنی یونیورسٹی میں کھینچ لیا۔

سراٹلزینڈر فلیمنگ صرف ایک عام سائنس دان اور سائنسی علوم کے استاد ہی نہیں تھے بلکہ اپنے وقت کے ایک مہادودوان اور عالم باعمل تھے۔ انہوں نے پینسلین جیسی شے دریافت کر کے انسانیت پر بہت بڑا احسان کیا تو انہوں نے لاکھوں، کروڑوں، اربوں انسانوں کو موت کے منہ سے بچایا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بعد فوجی اور مفتوح فوجوں کے سارے زخمی ایک اسی دریافت کے سہارے زندہ تھے اور اسی کی آس پر صحت کامل کی امید لے وقت شفا کے منتظر تھے۔

مجھے چونکہ مشاہیر سے ملنے کا، ان کے قریب جانے کا، ان سے ہاتھ ملانے اور بات کرنے کا شوق شرار فو سے ہے، اس لیے میں پر دو کال کی پرواہ کیے بغیر دوسرے لیکچر کے آخر میں سر فلیمنگ کے قریب پہنچ گیا اور ان سے ایک خصوصی ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لیے تھوڑے سے وقت کی درخواست کی۔ انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے میری درخواست قبول تو کر لی لیکن ساتھ ہی یہ دریافت فرمایا کہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟

میں نے کہا ”سر میں نے آج تک کوئی نوبل انعام یافتہ شخص نہیں دیکھا۔ میری آرزو ہے کہ اسے قریب سے دیکھوں اور کم از کم آدھ گھنٹہ اس کی معیت میں گزاروں۔ مجھے یہ بہت ہی اچھا لگتا ہے۔“ سر۔۔۔۔۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور کہنے لگے ٹھیک ہے ٹھیک ہے کوئی بری بات نہیں۔ میں خود تمہاری طرف اسی بات کا خواہش مند ہوں لیکن میری بھی یہ آرزو پوری نہیں ہو سکی، بالکل تمہاری طرح!

میں نے کہا ”سر آپ تو خود نوبل انعام یافتہ ہیں، آپ کو کیا ضرورت ہے کسی اور انعام یافتہ سے ملنے یا اس کے قریب جانے کی۔ آپ تو خود مسند پر ہیں۔“

کہنے لگے ”ہوں تو میں نوبل انعام یافتہ لیکن مجھے اپنے ساتھ بیٹھے اور اپنے آپ کو جاننے کا کوئی موقع نہیں ملا۔ میری بھی یہ حسرت ایسے ہی چلی جا رہی ہے۔۔۔۔۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تم کل میرے ہوئے آ جانا۔ شام چار سے پانچ بجے تک فارغ ہوں، اس کے بعد مجھے تاریخی مقامات کی سیاحت کے لیے جانا ہے۔ اب بتاؤ تمہارے لیے یہ وقت مناسب ہے۔“

”کوئی سا وقت بھی مناسب ہے سر۔“ میں نے جج کر کہا ”اور شام چار سے پانچ بجے تک کا وقت تو آئیڈیل ہے۔“

میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

انہوں نے مجھے اپنے ہوئے کا نام اور پتہ دیا۔ تیسری منزل پر اپنے کمرے کا رخ سمجھایا اور پھر مجھ سے ہاتھ ملا کر اساتذہ کرام کے ساتھ لابی میں چلے گئے۔

جب میں واپس گھر پہنچا اور بوٹ اتار کر بستر پر کمر سیدھی کرنے کو جھکا تو بوٹ کے تسمے کھولتے ہوئے لے

ہاں ایک احساس ہوا کہ یہ میں نے کیا جھک ماری اور کس لیے اتنے بڑے آدمی کے ساتھ وقت طے کر لیا۔ میں اس سے کیا بات کروں گا۔ کیا پوچھوں گا اور کس طرح گفتگو آگے بڑھاؤں گا۔ اگر میرا اور اس کا سبب ایک ہوتا تو بھی کوئی بات تھی یا کم از کم مجھے ابتدائی سائنس کی الف بے معلوم ہوتی تو بھی کچھ دیر گفتگو ہو سکتی لیکن اس صورتحال میں کیا ہو سکتا ہے بھلا۔

فوری دیر ”ہاں جی! ہاں جی“ اور ”بہتر بہتر“ کہہ کر مجھے اجازت مانگنی پڑے گی اور میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے مجھے بارت مل جائے گی۔ لیکن میں بھی کیا کر سکتا تھا، مجھے مشاہیر سے ملنے کا شوق ہی اس قدر تھا کہ میں ایک مڈل سکول کی ایک امتحانی جذباتی لڑکی کے وجود میں ڈھل جاتا ہوں۔ نوبل پرائز کا نام سن کر تو میری سٹی گم ہو جاتی تھی۔ ”مڈل اسکول“ مجھے ذرا بھی اچھی نہیں لگتی تھی لیکن چونکہ اس کی مصنفہ کو نوبل پرائز ملا تھا۔ اس لیے میں مرعوب ہو کر ساری کتاب ہاں پر کمر کسٹر اہل پینے کے انداز میں ختم کر گیا تھا۔ ان بڑے لوگوں سے اس درجہ مرعوب ہونے کی بس ایک ہی وجہ تھی کہ میرے اندر خود کوئی ایسی خوبی نہ تھی جس کا سہارا لے کر میں مرعوبیت کے باوجود ساتھی کی گلی میں سے ہو کر باہر نکل

ہاں۔ اگر میں طلبے پر آڑا چوتلا بنا سکتا یا استاد اللہ بخش جیسا درخت بنا سکتا یا حضرت علامہ جیسا ”ساقی نامہ“ لکھ سکتا یا کہ میں کھڑی پر بیٹھ کر دوبرے تار کا کھدر بن سکتا یا محمد بخش مسلم جیسا خطبہ دے سکتا یا رفیق حسین جیسا افسانہ بنا سکتا یا چارلس کی طرح بدنامی کا ڈاکھول سکتا تو پھر میں بڑے آدمیوں سے کبھی بھی اتنا مرعوب نہ ہوتا لیکن میری ذات میں کوئی خوبی اور میرے اندر کوئی گمن نہ تھا۔

میں ٹھیک چالابے سر فلیمنگ کے ہوئے پہنچا تو وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں ہماری یونیورسٹی میں ابھی ایک اور لکچر دینا تھا جس کے نوٹس بنا کر انہوں نے میز پر رکھے ہوئے تھے۔ ان کی طرف اشارہ کر کے بولے ”یہ ذرا مشکل اور وقفہ موضوع ہے لیکن تمہارے شعبہ سائنس میں بڑے بلا کے پروفیسر موجود ہیں جو فوراً بات کی تہہ تک پہنچتے ہیں اور بڑے پیچیدہ سوال پوچھتے ہیں۔ مشکل صرف زبان کی ہوتی ہے جس سے کئی مرتبہ غلط بحث ہو جاتا ہے۔“

میں نے کہا ”سر ابلاغ کی راہ میں تو ایسی مشکلات ہوں گی لیکن گیمبرگچروں کی غلطی کا امکان کم ہوتا ہے کہ بات راہکاران طور پر آہستگی کے ساتھ ہوتی ہے اور تفہیم کے لیے وقت بھی کافی ہوتا ہے۔ البتہ سیاسی مینٹنوں میں جہاں ساتھ کے ساتھ ترجمے ہوتے ہیں وہاں غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ضرور ہوتا ہے۔“

پوچھتے اس کے کہ وہ میرے آنے کی غرض و غایت دریافت کرتے میں نے کہا ”سر فلیمنگ یہ ہوئے جس میں آپ کو پہنچا رہے ہیں، آپ کی شان کے شایان نہیں ہے۔ اگر آپ ہماری یونیورسٹی کو اطلاع کر دیتے تو ہم کسی بہتر جگہ آپ کی آہستہ کا بندوبست کر دیتے۔“

انہوں نے کمرے میں، اوپر سے سے نیچے ایک گول سی نگاہ دوڑائی اور پھر کہنے لگے ”نہیں! میرے حساب سے آپ اچھا خاصا ہوئے ہیں اور اس میں ضرورت کی ہر شے میسر ہے اور میں مرکزی مقام پر ہے جہاں سے میں ارد گرد کے مافوق فطرت کو بھی دیکھ آتا ہوں اور البتہ تھوڑا سا مہنگا ضرور ہے۔“

میں نے کہا ”سر! آپ جیسے بادشاہوں کو مہنگائی سے کیا غرض، آپ تو پینسلین کے موجد ہیں، اس کے کھوجی

اور انکشاف کرنے والے ہیں۔ آپ کو روپے پیسے کی کیا پروا؟

کہنے لگے "بات تو ٹھیک ہے۔ ہوتا تو ایسا ہی ہے لیکن میرے ساتھ دھوکا ہو گیا۔ جب دنیا کو میرے کارنامے کا علم ہوا اور مجھے نوبل پرائز کے لیے چن لیا گیا تو دنیا نے دوا دارو کے تجارتی ادارے میری طرف بھاگے۔ پہلے ایک امریکی ادارے نے رجوع کیا اور مجھے دس فیصد رائلٹی کی آفر دی۔ مجھے ان کی آفر پر دلی رنج ہوا کہ میں نے کی، لیبارٹری میں جان تو میں نے ماری اور یہ مجھے دس فیصد رائلٹی پر فرخا رہے ہیں۔ خود کچھ کیے کرائے بغیر فیصد آمدن کے مالک بن رہے ہیں اور اصل مالک کو اس کے جائز حق سے محروم کر رہے ہیں۔ میں نے انکار کر دیا۔"

میں نے دل ہی دل کے اندر تالی بجا کر کہا "آپ نے خوب کیا، ان ظالم تاجروں کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔" کہنے لگے "میں چند روز اڑا ہوا تو میرے وکیل نے کہا الیکٹریسیٹینز پر تالا لگا کر تو دیکھو کہ تمہاری دکان فیصد رائلٹی کی قدر بنے گی۔ میں نے کہا دیکھ لو..... چنانچہ ایک میڈیسن کمپنی کی معرفت اندازہ لگوا دیا گیا تو پتہ چلا کہ میری رائلٹی پر کتنے لاکھ پاؤنڈ ماہانہ بنے گی۔ سالانہ نہیں ماہانہ!"

میں نے خوش ہو کر پوچھا "کتنی تھی سر؟" کہنے لگے "کچھ بہت ہی زیادہ تھی۔ ہالینڈ اور بلجیم کے سالانہ بجٹ کو ملا کر تقریباً اس جیسی۔ میرے لیے تو ان کو سنبھال کر رکھنا بھی ناممکن تھا۔"

میں نے کہا "سر اس سے آپ کچھ رقمانی کام شروع کر دیتے۔ بچوں کے لیے سکول، عورتوں کے لیے کڑیاں، سلائی کے لیے دستکاری ادارے، بوڑھوں اور بے یار مددگار لوگوں کے لیے پانچ خانے۔ یہ بڑے ثواب کے کام ہیں۔" کہنے لگے "ٹھیک ہے، میں تو بڑے ثواب کے کام لیکن میں ان کی دیکھ بھال کیسے کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک فیصد رائلٹی پر انکشاف کر کے ایک فرم سے وعدہ کر لیا کہ "نسخہ" جس جہیں کو دوں گا اور پینسلین دنیا میں تہی بناؤں گا۔ ایک شرط ہے کہ معاہدہ نامہ میں تیار کروں گا اور ساری شقیں میری ہوں گی، وہ مان گیا۔"

"اس کو اور کیا چاہیے تھا سر!" میں نے کہا "اس نے تو ماننا ہی تھا۔"

کہنے لگے "رات میں اپنا ناپ رائٹر نکال کر نشیوں کی طرح بیٹھا اور بڑے غور اور اہتمام سے شرطیں لپکے کرنے لگا۔ شرطیں کچھ سخت تھیں اور ساری میرے حق میں تھیں۔ میں نے رک کر ان کا جائزہ لیا تو خود کو ایک آمرانہ حیثیت میں پایا۔ میں نے اپنے طور پر حساب لگا کر دیکھا تو ایک فیصد کے حساب سے بھی مجھے اتنی رقم مل رہی تھی کہ میری عمر بھی اس کا کچھ بگاڑ نہ سکتا تھا۔ اس نے بڑھ کر میرے گلے کا ہار ہوتے جانا تھا اور دیکھ کر مجھے ہلکا سا شروع کر دینا تھا۔ اس کے مقابلے میں میں صرف زندہ رہنا چاہتا تھا اور کچھ سیر و سیاحت اور کچھ مزید تحقیق کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ مائی ڈیر فیلو! میں نے آدھی رات کے وقت ایک معاہدہ لکھا کہ میری یہ دریافت میری ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ ایک عظیم ہے جو مجھے امانت کے طور پر ملا ہے۔ اس دریافت کا عطا کنندہ خدا ہے اور اس کی ملکیت پوری خدا کی ہے۔ میں اس دریافت اور اس انکشاف کو نیچے دیئے گئے فارمولے کے مطابق عام کرتا ہوں اور اس بات کی قانونی تصدیق

ہدایتی اور "ملکیتی" اجازت دیتا ہوں کہ دنیا کا کوئی ملک، کوئی شہر، کوئی انسان، معاشرہ جہاں بھی اسے بنائے، وہ اس کا انسانی اور قانونی حق ہوگا اور میرا اس پر کوئی اجارہ نہ ہوگا۔"

مجھے ان کے ماضی کے اس فیصلے کا اعلان اپنے حال میں سن کر دلی صدمہ ہوا۔ اتنی بڑی دولت جاریہ سے یوں محض طور پر کنارہ کش ہو جانا اتنے بڑے سائنس دان کو زیب نہیں دیتا تھا۔ آخر اسے اپنے عزیز واقارب، اپنی اولاد اور آئندہ نسلوں کے لیے بھی کچھ چھوڑ کر جانا چاہیے تھا۔ یہ اس شخص نے کیا کیا۔ اس سے تو میرے ملک کے ان بڑے، جاہل، بے علم، گنوار زمیندار بھی سنانے ہیں جو آخرت پر پکا ایمان رکھتے ہوئے بھی ساری عمر اپنی آل اولاد کے لیے اندونختہ جمع کرتے رہتے ہیں اور ان کو مال و دولت کے محفوظ حصار میں چھوڑ کر جاتے ہیں۔

میں تھوڑی دیر سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا ہوا تو سر فیلنگ نے ہنس کر کہا "اب تم ہی کہو کہ میرے جیسا نادار شخص اپنی دیر بے کا ہوٹل کیسے انورڈ کر سکتا ہے؟....." پھر انہوں نے چونک کر کہا "یہ بھی کوئی ایسا ہونٹ نہیں ہے۔ اس دنیا کی کئی آبادی کو تو رہنے کے لیے جمونیئرٹی تک میسر نہیں، ہم تو پھر اس خوبصورت محل نما عمارت میں آرام سے بیٹھے ہیں۔"

مجھے ابھی تک ان کی رائلٹی کے ضائع ہو جانے کا غم کھائے جا رہا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ دنیا کے ہزاروں دوا ساز ادارے جو پینسلین کے جہازوں کے جہاز تیار کر کے اربوں پاؤنڈ کما رہے تھے، کچھ تو حیا کریں اور ایک سادہ لوح انسان کو کچھ تومان دیں اور اس کی کچھ مالی امداد کریں جس نے اپنی دریافت کو عطیہ خداوندی سمجھ کر اسے انسانیت پر نچھاور کر دیا!

میں نے کہا "سر! آپ کو یقین ہے کہ پینسلین کی دریافت عطیہ خداوندی تھی اور اس میں آپ کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ آپ کی کوئی محنت نہ تھی۔ آپ کی کوئی ریسرچ نہیں تھی؟"

کہنے لگے "میں اسے دنیا تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ضرور تھا۔ ایک آلہ ضرور تھا لیکن میں اس کا موجد یا مخترع نہیں تھا۔ صرف اس کا انکشاف کرنے والا تھا اور یہ انکشاف بھی میری محنت کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ خداوند کا کرم اور اس کی عنایت تھی..... اصل میں جتنے بھی انکشافات اور دریافتیں ہوتی ہیں وہ خدا کے حکم سے اور خدا کے فضل سے ہوتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ ر کے اور تین چار سیکنڈ کے وقفے کے بعد بولے "معاف کرنا تم خدا پر ایمان رکھتے ہو یا نہیں؟" میں نے کہا "بالکل رکھتا ہوں سر اور پورے کا پورا رکھتا ہوں..... وہ تو دراصل ہے ہی ہمارا آپ یورپ والوں کو تو ہم نے ادھار دے رکھا تھا، سواب اس کی واپسی شروع ہو گئی ہے۔"

کہنے لگے "میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ تم سے بہت سارے نوجوان، خواہ وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے اپنے علم کے زور پر خدا سے منحرف ہو گئے ہیں۔ میرا اندازہ تھا کہ تم بھی انہیں میں سے ایک ہو لیکن تمہارے بیان نے میرا اندازہ غلط ثابت کر دیا ہے۔"

میں نے کہا "سر! علمی اور عقلی طور پر تو میں اپنے دہریے دوستوں کے ساتھ شامل ہوں لیکن جذباتی طور پر میں اب بھی خدا کا بندہ ہوں اور اس سے وابستہ ہوں۔"

ہنس کر کہنے لگے ”بس بس!! اس ذیل میں جذباتی وابستگی ہی کی ضرورت ہے، سو ہے۔ رہے علم و عقل تو ان کے نشانے بدلتے رہتے ہیں۔ ان کی کچھ ایسی فکر نہیں کرنی چاہیے۔“

میں نے کہا ”سرفیڈنگ جب میرے ایمان کا پھیل گیا ہے، کیا آپ اپنے بیان کی وضاحت فرمائیں گے کہ اصل میں جتنے بھی انکشافات اور جتنی بھی دریافتیں اور جتنی بھی ایجادیں ہوتی ہیں، وہ خدا کے حکم سے ہوتی ہیں؟“ کہنے لگے ”خدا عظیم مطلق ہے اور اس کو کائنات کے اندر اور کائنات سے باہر کی ہر شے کا علم ہے، وہ اپنی مرضی سے، اپنے حساب سے اور اپنے ارادے سے انسانوں پر علم منکشف کرتا رہتا ہے۔ علم اسی کا عطا کردہ ہوتا ہے، نام بند ہے ہو جاتا ہے۔“

میں نے کہا ”اس کا ثبوت؟“ فرمانے لگے ”اگر انسان اپنی کوشش، محنت، جدوجہد اور لگن کے ساتھ کسی نادر یا فٹ کو دریافت کرنے پر عمل جائے تو وہ اس وقت تک دریافت نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس دریافت کے ”اترنے“ کا حکم نہ ہو جائے۔“

ان کی بات سچیدہ تو نہیں تھی البتہ نئی تھی۔ اس لیے میں اس کو ٹھیک سے سمجھ نہ سکا، مسکرا کر بولے۔ ”خدا عظیم مطلق ہے اور اس کے پاس ہر شے کا علم ہے۔ وہ جب چاہتا ہے اور جب پسند کرتا ہے اور جب مناسب خیال کرتا ہے اس علم کو دنیا کے انسان کو عطا کر دیتا ہے۔ نہ پہلے نہ بعد میں، ٹھیک وقت مقررہ پر، اپنے حکم کی ساعت کے مطابق..... میں نے اس اصول کو لندن کے ایک مقامی سکول میں بچوں کی آسانی کے لیے یوں سمجھایا تھا کہ خدا کے آستانے پر ایک لمبی سلاخ کے ساتھ علم کی بے شمار پونلیاں لٹک رہی ہیں۔ وہ جب چاہتا ہے اور جب مناسب خیال فرماتا ہے، تقبضی سے ایک پونلی کا دھاگا کاٹ کر حکم دیتا ہے کہ ”سنجاولو! علم آ رہا ہے.....“ ہم سائنس دان جو دنیا کی ساری لیبارٹریوں میں عرصے سے جھولیوں پھیلا کر اس علم کی آرزو میں سرگرداں ہوتے ہیں، ان میں سے کسی ایک کی جھولی میں یہ پونلی گر جاتی ہے اور وہ خوش نصیب ترین انسان گردانا جاتا ہے۔“

میں نے کہا ”سر! پھر تو مزے ہیں۔ آدمی منہ اٹھا کر علم کی پونلی کے انتظار میں بیٹھا رہے اور جو نئی پونلی قریب آئے، اسے کاٹی مار کر لے بھاگے۔“

کہنے لگے ”اس سے چنگ تو لوٹے جاسکتے ہیں، علم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق کے لوگ آج تک چنگ ہی لوٹتے رہے، علم پر دسترس حاصل نہ کر سکے..... علم کا اتنا صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اپنی لیبارٹریوں کے اندر علم کی آرزو میں قفس بکلی میں تڑپتے رہتے ہیں۔ ایک وقت مقررہ پر ان کی خواہش پوری ہو جاتی ہے اور ان کے کسی ساتھی کو ”سر“ مل جاتا ہے۔ یہ عہد ان سب کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہے اور یہ مشترکہ ملکیت ان کی معرفت دنیا کے انسان میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ کام ہمارا ہوتا ہے حکم اس کا۔ محنت ہماری ہوتی ہے، آرزو وہاں سے چلتا ہے۔ کوشش ہم کرتے ہیں، مختاری اس کی ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ہم صرف محنت، کوشش اور جدوجہد کے زور پر کامیاب ہو جائیں۔ سہ مارے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا لیکن مارے رہنا پڑتا ہے کہ سہ مارے والے ہی کے پاس پیغام پہنچتا ہے، دریا کنارے بٹری بجانے والے کے پاس

نہیں۔ پونلی وہیں گرتی ہے جہاں جھولی پھیلی ہوئی ہو۔ یہ بات الگ کہ جھولی میں ایک ہی پونلی اترتی ہے اور وقت مختار کل کی طرف سے معین ہوتا ہے۔“

میں نے کہا ”سر! یہ پونلی گورے کی جھولی میں ہی کیوں گرتی ہے، کالے کی جھولی میں کیوں نہیں گرتی؟“ کہنے لگے ”اس کے نزدیک گورے اور کالے میں کوئی فرق نہیں، سب اس کی مخلوق ہیں۔ وہ جب علم کی پونلی کاٹ کر پیچہ روانہ کرتا ہے تو کالے کو بھی آواز دیتا ہے کہ جھولی پھیلاؤ علم آ رہا ہے۔ دامن کشادہ کرو، نئی بات سمجھوائی جا رہی ہے۔ اس پر کالا ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا ہے کہ دامن کدھر سے پھیلاؤں، میں نے تو آج قمیص ہی نہیں پہنی، حد درجہ گرمی تھی۔ پھر وہ پیراشوٹ پونلی اپنا راستہ تبدیل کر لیتی ہے اور ان ہزاروں، لاکھوں قفس کننا سائنس دانوں کے اوپر لہرائے لگتی ہے جو کئی سال سے اپنی آرزو کے چہرے اوپر اٹھائے اور اپنی عمل کی آنکھ پتیل پر جمائے بے چینی سے جھوم رہے تھے۔“

میں نے کہا ”آپ یہ کس طرح سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ عطا سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں انسانی عمل کی کوئی خرابی نہیں۔“

کہنے لگے ”کوشش، عمل اور جدوجہد سے کچھ نہیں ہوتا مگر کرتے رہنا چاہیے کہ یہی انسان کا کمال اور یہی اس کی خوبی ہے۔“

میں نے کہا ”یہ بات کہ علم اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور عظیم مطلق کے حکم سے عطا ہوتا ہے اور ایک مقررہ وقت پر ہماری کیا جاتا ہے۔ اس کی کوئی سائنسی توجیہ میرے ذہن میں نہیں آتی۔ انسان اپنی زندگی کی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اس کے علم میں تدریجی طور پر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ اپنے علم کی سیڑھیاں ایک ایک طے کر کے بلندیوں کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ اس میں ڈیٹ کس طرح سے مقرر کی جاسکتی ہے۔“

کہنے لگے ”بدن کی، ماحول کی اور روح کی ارتقائی منازل ایک ترتیب سے چلتی ہیں اور ان میں ذیل بندی سے ایک تسلسل سے ترقی ہوتی چلی جاتی ہے لیکن ذہن انسانی کسی ڈسپلن کا پابند نہیں ہوتا۔ خیال کے دانے کسی مالا میں پروئے نہیں ہوتے۔ فکر اور تشال میں صف بندی نہیں ہوتی۔ ذہن انسانی شاخ بہ شاخ ایک بندر کی طرح چھٹا نکلتا مارتا رہتا ہے۔ کوئی بات پہلے ذہن میں آ جاتی ہے، کوئی بعد میں۔ سوچ ارتقائی منازل طے کرنے کی پابند نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایجاد اور انحراف کی دنیا میں انسان نے بہت سی ایسی چیزیں کو تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی جو آج تک مکمل نہیں ہو سکیں اور جواب بھی انسانی دسترس سے باہر ہیں۔ بہت سی ایسی ہیں جن کی بابت اس نے سوچا بھی نہ تھا اور وہ گھڑی گھڑائی اس کے قدموں میں آن گریں۔ کچھ خواب میں متشخص ہوئیں، کچھ رو یا میں فارمولا بن کر سامنے مسکریں پر آ گئیں۔ کچھ کھلی آنکھوں کے سامنے رونما ہو کر اپنا عہد بتلا گئیں۔ انسان مل چلا سکتا ہے، زمین تیار کر سکتا ہے۔ پانی دے سکتا ہے۔ بوائی کر سکتا ہے لیکن کچھ کو چھوڑ کر اس میں سے بونا پیدا نہیں کر سکتا کیونکہ یہ علم، عظیم مطلق کے پاس ہے اور اگر اس نے چاہا اور پسند فرمایا تو یہ بونا بنا کر دے گا علم بھی انسان کو عطا کر دے گا مگر اپنی مرضی سے اپنی پسند سے اور اپنے منتخب وقت کے مطابق۔“

”میں تو ایک موٹی سی بات جانتا ہوں اور میرے مشاہدے میں لوٹ لوٹ کر یہی حقیقت نمایاں ہو رہی ہے کہ

علم انسان کے اندر سے نمودار نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ اوپر سے عطا ہوتا ہے..... انسان کی کتنی آرزو کی تھی کہ ہوا میں اڑے لیکن خدا کی بالکل مرضی نہ تھی کہ وہ اڑے، چنانچہ پتنگوں، ہزاروں انسان اس کوشش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور گوہرِ قصور ہاتھ نہ آیا اور پھر جب علم آتا رہا گیا اور ایک خاص وقت آنے پر ہوا پیا کی کا اصل اصول ذہن میں ڈالا گیا تو بات شیشہ ہو گئی اور انسان پہلی ہی فلاٹ میں سمندر پار کر گیا۔

میں نے کہا ”سرفلمنگ! یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ تجربے کر کر کے اور اپنی غلطیوں سے سبق سیکھ کر انساں بالآخر کامیابی کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ اور پھر.....“

”ضروری نہیں، ضروری نہیں۔“ انہوں نے بات کاٹ کر کہا ”انسان غلطیوں پر غلطیاں کیے جاتا ہے، سبق سیکھے جاتا ہے لیکن کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ پاتا۔ ارد گرد غلطیوں کے انبار لگ جاتے ہیں۔ ذہن و حیر غلطیاں جمع ہو جاتی ہیں لیکن کامیابی کی منظوری کہیں اور سے ملتی ہے۔“

پھر ڈراؤگ کر بولے ”ایک بیماری ہے، عام لوگ اس سے اتنے آگاہ نہیں ہیں لیکن ڈاکٹر، سائنس دان، ماہرین طب اس سے حدودِ جہدِ خائف ہیں اور اس کے علاج کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ دنیا کے ہر بڑے ملک کی لیبارٹری اور سائنس کے ہر بڑے معاملہ میں اس پر ریسرچ ہو رہی ہے۔ لاکھوں پاؤنڈ ہر مہینے اس ریسرچ پر لگ رہے ہیں اور ہزاروں ماہر اس پر ریسرچ کا ڈیٹا اکٹھا کر کے آپس میں نوٹس ملا رہے ہیں لیکن اس بیماری کا کوئی اور چور ہی نہیں ملتا۔“

”اور علیم مطلق کے پاس اس بیماری کا علاج ہے؟“ میں نے پوچھا۔

کہنے لگے ”بالکل ہے، بلا شک و شبہ ہے اور سو فیصد تیر بہدف ہے لیکن انسان کو اپنی کوشش اور جدوجہد سے اس کی الف بے بھی معلوم نہیں ہو سکی۔“

میں نے کہا ”سراکوسی ہے وہ ایسی موذی بیماری جس کا کوئی بھید ہی اب تک نہیں مل سکا۔“

کہنے لگے ”اس کو کینسر کہتے ہیں اور یہ بیماری بڑی تیزی کے ساتھ دنیا کے ہر خطے میں پھیل رہی ہے۔ دنیا بھر کے ماہرین طب اور بڑے بڑے سائنس دان دن رات اس کے علاج کی دریافت میں لگے ہیں اور ابھی تک خالی ہاتھ بیٹھے ہیں۔“

”اور ایک وقت آئے گا کہ اس موذی مرض کا علاج ایک پوٹلی میں بند جانے والا پیراشوٹ میں رکھا ہوا آئے گا اور اس وقت جو طلبہ کا قسمت والا ہوگا اسے حاصل کر لے گا۔“

آج دس نومبر ہے اور میں یہ سطور مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ پہلے بھی میں یہاں سے اپنے بچوں کو خط لکھتا رہا ہوں اور آج بھی میں یہ پیڑا ہی غرض سے لے کر آیا ہوں کہ یہاں بیٹھ کر اپنے بڑے بیٹے کو خط لکھوں گا جو امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہا ہے اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ میڈسن شہر میں مقیم ہے۔ میرا ارادہ تو اسی کو خط لکھنے کا تھا لیکن یہاں آ کر میرا رخ تبدیل ہو گیا ہے۔

مسجد نبویؐ کے کھلمن میں جو آج سے چند سال پہلے بالکل کھلتا تھا ہم نیلے آسمان تلے بیٹھ کر مغرب کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ اب اس کھلی جگہ پر دیوارِ ناکون کی چھ بڑی بڑی چھتریوں نے اڑان کے پر پھیلا کر اپنی ساری سفیدی نیچے منتقل کر دی ہے اور فرش پر بچے ہوئے سرخ کبودی قالین اور واضح ہو گئے ہیں۔ اچھے سنو ڈیو کے ماہر نوگرافر ایک سفید چھتری سے فلیمش اچال کر پورٹریٹ میں جو بولتا بولتا سا تھرڈیے ہیں ایسا ہی کچھ ان سفید چھتریوں نے کیا ہے۔ ان سے منعکس ہونے والی روشنی اس صحن خانہ میں شکستہ ہو گئی ہے۔ میں تو اس آواز کو ٹھیک سے نہیں سن سکتا البتہ سمجھنے والے کہتے ہیں کہ روشنی کا درود سلام اچھی زبان اور اسی لسان میں ہوتا ہے اور اس کے گمن کی یہی صورت ہے۔

آج سے چند برس پہلے جب شہاب مجھے اور بانو کو پکڑ کر یہاں لایا تھا تو مستعجب مسجد کے اندر کے سارے ستون براؤنش ریڈ تھے۔ اب یہ سارے سفید ہو گئے ہیں۔ وہ بھی بڑے موہنے والے یہ بھی کمال دکش ہیں۔ اندر اصحابِ صفہ کے چہرے کے پیچھے حضرت عباسؓ والے دو بڑے ستونوں کے ساتھ شہاب کے بیٹھنے کی مستقل جگہ مقرر تھی۔ وہ نماز سے بہت پہلے یہاں آ کر بیٹھ جاتا اور پھر اگر کسی ضروری کام سے اٹھتا تو عشاء تک اسی جگہ بیٹھا رہتا۔ میری اس کی دوستی ضرور تھی لیکن ہمارے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ سکون و سکینت کا ایک ٹھنڈا رخ تو داتا تھا اور میں بیچنی اور بے قرار نہ ہو۔ اصل میں وہ جانتا تھا اور میں نہیں جانتا تھا۔ جس کو پتہ ہوگا ڈی اس پلیٹ فارم سے اتنے بجے چلے گی اور انٹر کلاس کا ڈبہ یہاں آئے گا اور ڈبہ خالی ہو جانے کے بعد چھوٹی سیٹ کس جانب کی کھڑکی کے پاس ہوگی اس مسافر کو کوئی فکر نہیں ہوتی۔ وہ اٹھ اٹھ کر اور بھاگ بھاگ کر قلیوں سے، بابوؤں سے، مسافروں سے اور خانچے والوں سے پوچھا نہیں کرتا آرام سے اپنی ٹنگی پاؤں کے پاس رکھے ٹین کی بڑی چھت کی گولائی کو دیکھتا رہتا ہے۔ اپنی سوچ میں ڈوب رہا ہے۔ اُس سوچ میں جس کا سفر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کسی اور ہی جہت سے ہوتا ہے۔ شہاب بھی اپنی گھڑی گود میں رکھے ہر جگہ

کولی جاذبیت ان کو ان کے مقصد سے منحرف نہیں ہونے دیتی۔ بڑے بڑے سورے پہلوان اور شمشیر زن لنگوٹے کے سچے ہوتے ہیں اسی طرح بزرگ صوفی اور اللہ والے روحانیت کی منزلیں جلد طے کر لیتے ہیں اور بڑی پختگی کے ساتھ ان پر حکم رہتے ہیں۔ ہمارے کمزور اور کمتر درجے کے لامتناہی معاشرے نے ایک روز بیٹھ کر یہی سوچا کہ اپنے سے بہتر اس مخلوق کو کچھ اس انداز سے پامال کیا جائے کہ پھر رہتی دنیا تک ان کے فخر کا سراونچا نہ رہ سکے۔ چنانچہ ڈاکٹر اجمل نے کہا "میرا خیال ہے کہ کمزور بودے اور کرائے کے کھشتریوں نے اپنے پروپیگنڈے کے زور پر اسی مخلوق کو بدنام اور پراگندہ کرنا شروع کیا اور شاہی درباری جھنڈوں کے زور پر انہیں کچھ سے کچھ بنا دیا۔ آج ہندوستان اور پاکستان میں جس ہالکے بہ حالت میں یہ لوگ زندگی بسر کرتے ہیں ان سے چاروں بھنگیوں اور مردار خوروں کی حالت کہیں بہتر ہے۔

اس وقت مجھے وہ سہ پہر یاد آ رہی تھی جب میں نے شہاب کا ہنچہ کھینچ کر اُسے اٹھانے کی کوشش کی تھی کہ چلو اصحاب صفہ کے چوتھے پر تم بھی جا کر نفل ادا کرلو۔ میں وہاں بڑی مشکل سے جگہ بنا کر آیا ہوں اور ایک عرب صوفی کو اپنے پاکستانی صوفی ہونے کا یقین دلا کر آیا ہوں کہ ابھی میں اپنے بڑے بھائی کو لاتا ہوں۔ اس کے لیے یہ جگہ محفوظ رکھنا۔" اس نے کمال مہربانی سے ایک اٹلی اٹھا کر ہائی بھری ہے کہ ایک منٹ سے زیادہ نہ لگنا ورنہ میرا دم ختم اور میرا اختیار ختم! لیکن شہاب نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ جھڑالیا کہ اتنے بڑے مقام پر اور ایسی اونچی جگہ بیٹھ کر میں نفل نہیں ادا کر سکتا۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ بلکہ یہ بھی کسی کے کرم سے رعایت ملی ہوئی ہے کہ میں یہاں بیٹھا ہوں۔ تم جاؤ اور اس جگہ بیٹھ کر اور نفل ادا کرو اور زیادہ دعائیں مانگو۔"

مجھے اس کی بات پر غصہ بھی آیا اور کفرانِ نعمت پر افسوس بھی ہوا لیکن وہ ایسا ہی تھا۔ صبح بھی جب میں نے اُس کو بنا تھا کہ چلو حضور کے محراب میں لوگ نفل ادا کر رہے ہیں تم بھی میرے ساتھ چلو میں جگہ بنوادوں گا اور ایک دودھ کے لگا کر محراب خالی کرادوں گا لیکن وہ نہیں مانا اور شرمندہ سا ہو کر کہنے لگا "یار حضور کی محراب میں کھڑے ہو کر نفل پڑھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ وہاں تو حضرت ابو بکرؓ بھی تشریف لائے تھے میرا کیا منہ ہے جو اس جگہ کے قریب بھی جاؤں۔ میری نفل دیکھتے ہو یہ اس محراب میں کھڑے ہونے کا قائل ہے۔ تم جاؤ اور وہاں جا کر نفل پڑھو اور اس مسجد کی بہاریں جتنی بھی لوٹ سکتے ہو لوٹ لو۔ ایسا موقع بار بار ہاتھ نہیں آتا۔ ہر ہر مسئلے سے ہر کونے سے اور ہر صف سے جہاں جہاں موقع ملے اپنا حصہ پورا کرو اور جو حصہ تمہارا نہیں ہے وہ بھی ہتھیا لو۔ ایسا چانس ہر روز نہیں ملا کرتا۔

میں آ کر چپ چاپ اسی جگہ پر بیٹھ گیا جہاں میں اس وقت بیٹھا ہوں۔ میرے سامنے پرانے ستونوں والا وسیع و عریض دالان کھلا ہے اور ستونوں پر محرابوں کے اوپر گول سنہری دائروں میں دائیں سے بائیں حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت امام حسن علیہ السلام، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام لکھے ہیں۔ ان کے بعد اسی گھیر کے دائرے میں اللہ جل جلالہ کا تبرک نام اسی ہاتھ کی خطاطی میں لکھا ہے۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی ہے۔ آپ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی کریم اللہ وجہہ اور پھر حضرت امام حسین علیہ السلام کا اسم گرامی ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے بعد حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام کندہ ہے۔ شہاب نے

اطمینان سے بیٹھا رہتا اور جب وقت آتا تو اسی طمانیت کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا اور دھکا کھائے اور دھکا دینے لگتا۔ مطلوبہ دروازے میں داخل ہو جاتا۔ اصل میں اس کو گھڑی سنبالنے کا اور قدم قدم چلنے کا ہنر آ گیا تھا۔ وہ اپنی راہ پر چلتا تھا نہ بھگتا تھا نہ رکتا تھا نہ کہتا تھا نہ کھینچتا تھا۔ بس چلے جاتا تھا کسی دعوے اور فرمائش کے بغیر۔ رہبری اور رہنمائی کے بغیر۔ بار بار نقشہ کھول کر ڈائریکشن دیکھے بغیر۔ اصل میں اس کی ڈائریکشن کسی اور طرف سے آئی تھی۔ ہماری گہری دوستی کے باوصف ہمارے مزاج نہ مل سکے کہ میری ڈائریکشن ایک دوسرے محاذ سے وابستہ تھی۔ میں لوگوں سے منسلک تھا۔ انسانوں کے Approval کا خواہشمند تھا۔ عوام الناس سے اپنی کارکردگی کا داد و طلب تھا۔ شہاب کی بات لانی کہیں اور تھی۔ وہ لوگوں کا احترام کرتا تھا۔ ان سے محبت کرتا تھا۔ ان کے دکھ سکھ میں شرکت کرتا تھا لیکن ان کی رضامندی کا طلبگار نہیں تھا۔

اس وقت مجھے سامنے کے جزواں ستونوں کے ساتھ ٹیک لگائے اس کا وجود محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے کچھ بائبل بالکل اسی طرح جس طرح پہلے ہوتا تھا۔ میں نے اصحاب صفہ کے چوتھے پر دو نفل ادا کیے۔ خدامِ روضہ شریف جو پاکیزہ حرم سرا کے گردہ پر مشتمل تھا ان سے مصافحہ کیا۔ سب سے بڑی چیف خواجہ سرا کے ہاتھ کو بوسہ دیا کہ بڑے بڑے جید عالم اور فقیہ شہر جو سنہری حاشیوں والے سبے میں لبوس تھے لوگ دروازے میں داخل ہو کر اصحاب صفہ کے چوتھے پر پہنچے ہوئے اس قد آور خواجہ سرا کے ہاتھ کو بوسہ دیتے تھے۔ میں نے بھی حوصلہ کر کے یہی کیا اور انہوں نے بھی مہربانی فرما کر میری خواہش کے سامنے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

آج یہ چوتھہ ان سے بالکل خالی ہے صرف ایک صاحب باقی رہ گئے ہیں جو اس وقت سب سے چھوٹے تھے۔ میں ان کو مشکل سے پہچانتا ہوں اور میرے ذہن میں ان کی جوانی کے نقوش اسی طرح سے محفوظ ہیں جب میں نے ان کو ان کے گردہ میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس وقت یہ مجھ سے کوئی دو تین سال چھوٹے تھے۔ اس حساب سے اب وہ ٹھیک ستر برس کے ہوں گے۔ خواجہ سراؤں کا ہماری تاریخ میں اور تہذیب میں بڑا اونچا مقام ہے۔ یہ زندگی کے جس شعبے کی طرف بھی نکلے بہت اونچے مقام پر پہنچے۔ شجاعت، شرافت، بزرگی، تقدس اور عفت میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ محلات کے اندر پورے ہتھیاروں سے لیس حرم کی حفاظت کا کام انہی کے پر ہوتا۔ مشکل اور پیچیدہ جنگی مہموں میں جب لڑائی تاز و دوکے قتل جاتی تھی اور شاہی فوجیں پسپا ہونے لگتی تھیں تو مغل بادشاہ اور خاندان غلاماں کے حکمران اکثر کسی خواجہ سرا جرنیل کو کمک دے کر روانہ کرتے تھے اور وہ ہر محاذ پر خود بے جگر سے لڑ کر اور اپنے سپاہیوں کو حکمت اور چابکدستی سے لڑا کر ہاری ہوئی بازی جیت لیتا تھا۔

میں نے اپنے ملک کے کئی تاریخ دانوں بشمول ڈاکٹر اشتیاق قریشی کے خواجہ سراؤں کی طاقت اور تیور اور عام شجاعت کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کوئی خاطر خواجہ جواب نہ دے سکے۔ بلکہ انہوں نے میرے اس سوال کو تعجب اور تسخر کے انداز میں لپیٹ دیا۔ ڈاکٹر اجمل نے البتہ اس قدر بتایا کہ چونکہ یہ لوگ قدرتی طور پر جتنی تہمتی ہوتے ہیں اور Sublimation کی بنیاد پر زندگی بسر کرتے ہیں اس لیے ان میں انسانیت کی ارفع اور اعلیٰ صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ رجولیت سے عاری اور منگل ٹریک کارکن ہونے کی وجہ سے ان کی توجہ اپنے ہدف کے ساتھ استوار رہتی ہے اور کوئی محرک یا

اپنے لیے یہی جگہ مقرر کر رکھی ہے اور وہ نماز کے طے شدہ وقت سے بہت پہلے یہاں آ کر بیٹھ جاتا ہے اور عشاء تک یہیں بیٹھا رہتا ہے۔ اس دوران میں بازاروں میں جا کر گھوم پھر بھی آتا تھا۔ کھانا بھی کھا لیتا تھا۔ شام کی چائے پی کر تھوڑی دیر آرام بھی کر لیتا تھا اور جب مغرب کی نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوتا تھا تو وہ اسی جگہ اسی اطمینان اسی مسکراہٹ اور اسی اذن و اجازت کے ساتھ بیٹھا ہوتا جو اس نے مجھے مزے کرنے کے لیے دے رکھی ہوتی تھی۔

میں جب بھی مدینے شریف آیا اور جتنی مرتبہ مسجد نبویؐ میں حاضری دی اس کا معاوضہ میں نے اسی دن یا دو دن میں وصول کر لیا۔ میں نے واپس جا کر اپنے دوستوں، ہم وطنوں اور ہم عصروں کو وہ واقعات ضرور سنائے جس سے میرا روحانی اور ارفع مقام ان کی نگاہوں میں بلند ہوتا اور جنہیں سن کر ان کو فحسوس ہوتا تھا کہ کاش ان کے ساتھ بھی یہ معاملات گزر رہے ہوتے اور انہوں نے بھی ایسے بلند مقامات تک رسائی حاصل کی ہوتی۔

میرا حرمین شریفین کا سفر پاکستان سے لے کر واپسی تک معجزات و کرامات سے لبریز ہوتا۔ ویزے کا حصول اس میں شدید اڑچن۔ پاسپورٹ کا بغیر ویزے کے لوٹا دیا جانا اور میرا شکر نعمت کے ساتھ پاسپورٹ وصول کر لینا کہ حکم نہیں ہے۔ جب حاضری لگے گی اس وقت بلاوا آئے گا۔ پھر اچانک سعودی ویزا آن آفس سے فون موصول ہونا۔ میرا پاسپورٹ منگوایا جانا۔ معذرت کر کے اور اپنی کوتاہی کا اعتراف کر کے میرا ویزا الگنا اور میرا سفر پر روانہ ہونا۔ ریاض محمود شاہ حسین عقیل احمد عسکری اور الطاف کا اس فلائٹ سے رہ جانا اور مجھے بعد میں آنے والے کو سیٹ مل جانا۔

جدہ ایئر پورٹ پر سعید سے اچانک ملاقات ہونا۔ اس کا زبردستی اپنے گھر لے جانا۔ سامان رکھنا۔ کھانا کھانا اور پھر اسی طرح حالت اہرام میں سعید کا مجھے اپنی مرشدیز میں مکہ شریف لانا، عمرہ کروانا اور صبح فجر کی نماز کے بعد واپس جدوہا کر سلا دینا۔ میری روحانی برتری کا کتنا بڑا اکمال ہے۔

باب ملتزم پر دعائیں مانگتے ہوئے ایک عجیب طرح کا احساس ہونا کہ فلاں دعا تو قبول ہو جائے گی اور فلاں دعا جائے گی۔ اس مقام پر دوستوں، دشمنوں، عزیز رشتہ داروں اور قابل نفرت لوگوں کے لیے بھی خضوع و خشوع کے ساتھ دعا مانگنا۔ حطیم میں دو گنا نفل ادا کرنے کے بعد جب غلاف کعبہ پر دونوں ہتھیلیاں لگا کر اُسے بوسہ دینا اور اس پر اپنا چہرہ ملانا و دونوں ہتھیلیوں کا غلاف کے ساتھ چپک جانا۔ جیسے غلاف کعبہ مجھے تھوڑی دیر اور توقف کرنے پر مجبور کر رہا ہو۔

میرے بابا حاجی حضرت سائیں فضل شاہ صاحب نور والے کا بڑا سخت آرڈر تھا کہ جس خوش نصیب کو خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار نصیب ہو وہ ہرگز اپنے دوسرے بھائیوں سے اس کا تذکرہ کر کے تسلی میں مبتلا نہ ہو۔ خود تو اس اعلان سے اونچی کرسی لگا کر بیٹھ جائے گا لیکن سننے والے اپنے آپ کو کس قدر خوار و زبون اور پست و پستمانہ سمجھے پر مجبور ہوں گے کہ انہیں یہ زیارت نصیب نہ ہو سکی۔ سوچیں گے کہ چونکہ ان میں کوئی کمال نہیں، کوئی روحانی رفعت نہیں اس لیے وہ محروم رہے، محروم چلے آئے اور اسی طرح سے چلے جائیں گے۔

لیکن اپنے تقدس اور اپنی بزرگی کا اظہار دولت، طاقت، علمیت اور شجاعت سے بھی قوی تر ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بڑے سے بڑے مرتبے والا انسان بھی پھنس جاتا ہے اور جب ایک مرتبہ پھنس جاتا ہے تو پھر اس کی رہائی کی کوئی

مہرت باقی نہیں رہتی تا آنکہ اس پر کوئی خاص فضل ہو کوئی فیض اس کو پورے طور پر آزاد نہ کرادے۔ میری طبیعت شروع ہی بحث مناظرے پر مائل رہی ہے اور میں نے اپنی زندگی کے اوّل سال مسلم لیگ کے پرجوش رکن کی حیثیت سے مخالف پارٹیوں کے ساتھ بحث مباحثے میں گزارے ہیں۔ اس تربیت نے اور اسی سیاسی ماحول نے مجھے اپنا حق مانگنے اور اپنی آرزو پوری کرانے میں بڑا پختہ کر دیا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اپنا حق چھوڑ نہیں اور اپنے اصولوں پر سختی سے کاربند رہو۔

یہاں مسجد نبویؐ میں مغرب کی نماز کے وقت جب ہم ذرا لیٹ ہو گئے اور پہلی رکعت گزر گئی تو میں نے بھاگ کر ایک صف کے اندر سے گزرنے کی کوشش کی کہ سامنے والی صف میں جگہ کافی تھی۔ میری کوشش کو دو قوی بیکل کندھوں نے آہٹ میں جڑ کر مجھے آگے جانے سے محروم کر دیا۔ اگر میں ان کے ساتھ دائیں یا بائیں ایک کوشش کہیں بھی کرتا تو مجھے بڑا آسانی سے راستہ مل جاتا لیکن میں جیسے ہیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ واپس پلٹنا جوتا پہنا اور عورتوں والی سائیڈ پر اپنی بیوی کو لینے چلا گیا۔ چونکہ وہ بھی میرے ساتھ پہلی رکعت کھو چکی تھی اس لیے اس نے بھاگ کر عورتوں کی جوتیوں میں بی نیت باندھ لی وہاں ایک بڑی عمر کی عورت اور بھی کھڑی تھی۔ جواب بانو قدسیہ کو تسلیاں مار مار کر کہہ رہی تھی "ہے جہا جہا!! ہذا حرام.. ہذا حرام.. لیکن وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے اپنی نماز پڑھے جارہی تھی اور اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار دور دور تک چلتے جا رہے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ اس کا نام لے کر آواز بھی دی لیکن نماز میں کوئی جواب تھوڑی دیر کرتا ہے۔ وہ اسی پریم میں ڈوبی جوتیوں پر بیٹھی نماز پڑھتی رہی اور پچھلتی سی گئی۔

اپنے بھانویں میں نے کافی مسافت طے کر لی مگر لیکن منزل کا کوئی اور چھوڑ نہیں ملتا تھا۔ منزل تو خیر دور کی بات تھی یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ سفر شروع ہو کر کہاں تک پہنچ گیا ہے اور ابھی آگے کیا باقی رہ گیا ہے۔

ڈیرے کے لوگ بابا جی کی وجہ سے میری عزت تو بہت کرتے تھے لیکن مجھے اپنا سا بھی اور ہم سفر خیال نہیں کرتے تھے۔ ان کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ یہ اس درس گاہ کا باقاعدہ طالب علم نہیں ہے۔ نہ اس نے فارم داخلہ جمع کرایا ہے اور نہ ہی باقاعدگی سے فیس ادا کرتا ہے۔ کسی بھی رجسٹر میں اس کا اندراج نہیں اور کسی بھی کھاتے سے اس کے کوائف معلوم نہیں کیے جاسکتے۔ یہ بس ایک اتفاقی اور کثیر دول سنوڈنٹ ہے جو وقت آنے پر ایک عارضی طالب علم کی حیثیت سے امتحان دے گا اور پرائیوٹ بی۔ اے کرے گا۔ میں وہاں تھا ضرور لیکن وہاں کا نہیں تھا۔ میں بابا جی کو ایک استاد مانتا تھا ایک سکالر سمجھتا تھا وقت کا عظیم ترین دانشور گردانتا تھا لیکن انہیں اپنا گرو یا اپنا مرشد مانتے ہوئے میرے اندر رکاوٹیں پیدا ہو جاتی تھیں۔ جب کبھی میں اُن کے آگے تھا تو جوڑ کر اور سر جھکا کر انہیں اپنا مرشد سائیں ماننے کے لیے آگے بڑھا میرے اندر پرانے لڑک کی رنگ آلودہ بریکیں لگنے سے اتنا شورا اٹھا کہ میں خود گھبرا کر ایک طرف کو ہو گیا اور اپنی انا کو بلا روک ٹوک پہلو سے

گزر جانے کے لیے راستہ دے دیا۔

اصل میں گرو مندی موت ہوتا ہے۔ اس کی طرف رجوع کرنا موت کی وادی میں داخل ہونا ہے۔ جو کوئی بزرگ مرشد کی طرف جاتا ہے اپنی موت کی تلاش میں رواں ہوتا ہے۔ ایسی موت کی تلاش میں جس میں کچھ بچتا ہی نہیں سب پر بھسم ہو جاتا ہے۔ راکھ کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ ہونے کا کوئی نشان ہی باقی نہیں رہتا۔ دوسری موت میں تو انسان کا جسم ہمارا ہے۔ وجود فنا ہو جاتا ہے۔ بدن ختم ہو جاتا ہے لیکن شعور باقی رہتا ہے۔ جو آگے جاتا ہے ایک نئی دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ ایک اور زندگی کا "لمس" حاصل کرتا ہے مگر مرشد اختیار کرنے کی موت تو کبھی کبھار لے ڈالتی ہے اس میں شعور بھی باقی نہیں رہتا۔ سب کچھ فنا ہو جاتا ہے۔ بس لا فانی عنصر باقی رہ جاتا ہے!

بابا جی کے ڈیرے پر جانا موت سے کم نہ تھا۔ شہاب نے لکھا تھا "اب تو تم خوش خوش ہر روز ڈیرے پر جا کر مزے مزے کے کھانے کھا رہے ہو اور اصل مرغ کی طرح گردن پھلائے پھرتے ہو لیکن تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ اپنے دانتوں سے اپنی قبر کھود رہے ہو۔"

واقعی مرشد کا سب سے بڑا غم یہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کی انا کو مار کر بھسم کر دیتا ہے۔ آپ اس کو بچانے کی کوشش کرتے ہو۔ اس انا کے گرد آکسجن ٹیٹ اٹھاتے ہو۔ اسے بادام چھو ہارے کھلا کر موٹا کرتے ہو۔ بھنی پلا کر مقابلے میں لاتے ہو اور مرشد ظالم تم سے بھنگلیر ہوتے وقت شیواجی کا پتہ تمہارے وجود کے افضل خان میں اتار کر تمہیں ڈھیر کر دے گا۔ ختم کر دے گا۔ اپنے مرشد سائیں کے پاس جانے والا ہر بد نصیب اپنی خوار و پریشان اور درد مندانا کو صحت عطا کرانے کے لیے آتا ہے۔ اپنی زخمی فاختہ کو ہلدی چونہ لگوانے کے لیے پیر کے دروازے آتا ہے اور ہر طرف سے تو اس کی انا بھڑکا ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کا سارا وجود جھٹکی ہو چکا ہوتا ہے۔ ایک ایک زخم پر سوسو پچا ہے ہوتے ہیں اور طیب ایسا ظالم ملتا ہے کہ نبض دیکھتے دیکھتے تم کو تہاری بیماری کو تہارے وجود کو تہارے مدعا کو ہی خاک سیاہ کر دیتا ہے۔ یہ مرشد لوگ صرف کشتہ بنانے کے فن سے ہی آشنا ہوتے ہیں اور ان کو کچھ آتا ہی نہیں۔

میں اپنا کشتہ بنوانا نہیں چاہتا تھا اس لیے بابا جی سے دور رہا۔ چونکہ میں وہاں آنے والے سارے لوگوں سے زیادہ تعلیم یافتہ زیادہ ہنرمند زیادہ روشن خیال اور زیادہ صاحب فکر تھا اس لیے میں کیکر کی سوکھی ٹہنی پر بیٹھا کانے کو کی طرح گردن گھما گھما کے ان کھڑوں کو دیکھا کرتا تھا جو میرے سامنے ڈالے جاتے تھے۔ کئی کبوتر فاختائیں پودے پدے اور کھٹ بڑھتی پکڑے جا چکے تھے لیکن میں محفوظ تھا۔

مرشد کو مرشد ماننا اس کی بیعت کرنا اس کے ہاتھ میں ہاتھ دینا ایک اعتراف ہے۔ ایک اقرار ہے ایک مہمانے پر انگوٹھا لگانا ہے کہ میں نے اپنا آپ تمہارے حوالے کیا۔ اب میرے ساتھ جو چاہے کرو جس طرح سے چاہے رکھو۔ زندہ یا مردہ قلندر کے بھالو کی طرح یا مداری کے بندر کی طرح۔ میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ نچوڑے گئے تو ناچوں گا۔ دو گئے تو کھالوں گا۔ پہناؤ گئے تو پہن لوں گا۔ خود کچھ نہیں کروں گا۔ خود کچھ نہیں مانگوں گا۔ خود نہیں بولوں گا۔

میرے ہاتھیں گال پر آکھ کے صحن نیچے ایک بڑا سامتہ ہو گیا تھا۔ ٹی وی پروگراموں میں جب ڈیڑی کیسر وہن

دھماکا کرتا تو ساتھ ہی پکار کر کہتا "سرجی! اس سائیڈ سے نہ لیں۔ گال پر سوکھا سبوزہ چہرے سے بھی پہلے آ جاتا ہے۔ بہت برا لگتا ہے۔" کچھ عرصہ تو ٹار حسین رائٹ سائیڈ کا پروٹیکٹ لیتا رہا پھر اس نے کہا "اشفاق صاحب اس کا کچھ بندوبست کریں یوں بھی گہری جڑوں والا مسٹہ ٹھیک نہیں ہوتا۔"

طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک روز باؤں مجھے سرجن کے پاس لے کر گئی تو ڈاکٹر احسان نے مجھے سرجی میں لے جاتے ہوئے باؤں سے کہا "آپ آپ کی حد اس دروازے پر ختم ہو جاتی ہے۔ اشفاق صاحب کو پورے کا پورا میرے حوالے کرنا پڑے گا اور مجھ پر اعتبار کرنا ہوگا۔" باؤں کو گئی۔ سرجن مجھے لے کر اندر آ گیا۔ وہ دن میری زندگی کا خوفناک ترین دن تھا۔

میں آپریشن ٹیبل پر لیٹ چکا تھا اور میں نے اپنا جسم اپنا وجود اپنی جان اور اپنی انا سب کچھ سرجن کے حوالے کر دیا تھا۔ صرف حوالے ہی نہیں کر دیا تھا بلکہ خوش دلی سے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر احسان سے یہ شرط نہیں مانگی تھی کہ ڈاکٹر صاحب میں نے اپنا آپ آپ کے حوالے کیا۔ اپنا تن من دھن آپ کی سپرداری میں دیا لیکن میں اپنے شعور کو اپنے تصرف میں رکھوں گا اور آپریشن ٹیبل کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر اپنا آپریشن ہوتا دیکھوں گا کہ کس طرح سے مجھے پیش کرتے ہو کس آلے کے ذریعے بلڈ پریشر ریکارڈ کرتے ہو۔ کس نشتر سے میرے چہرے پر شگاف دیتے ہو۔ کیسے ہندو اور سولی نکالنے والے ہو اور پھر کس طرح سے نائکے لگاتے ہو۔ میں تمہارے سر پر موجود رہنا چاہتا ہوں۔ کوئی پتہ نہیں تم سے کوئی کوتاہی ہو جائے اور دنیا میرے قیمتی وجود سے محروم ہو جائے۔"

میں اپنے سرجن پر تو یہ شرط عائد نہ کر سکا لیکن بابا جی کو اپنا معالج مان کر بھی ان کے ساتھ اس بات پر ڈنکار ہا کہ میں اپنے سیلف کو کسی صورت میں بھی ان کے حوالے نہیں کروں گا اور خودی بیچے بغیر غریبی میں نام پیدا کروں گا۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا میں بڑی ہشیاری اور دانشمندی کے ساتھ بابا جی سے گریز کر رہا تھا۔ لیکن میرے پاس ان کو چھوڑنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ کوئی دلیل نہیں تھی جو میری اگلی پکڑ مجھے اس دروازے سے باہر نکال لاتی جہاں میں خود بڑے شوق سے داخل ہوا تھا۔ لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ میری اس سوچ کے ساتھ بابا جی کے رویے میں بھی لہاں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ انہوں نے میرے ساتھ علمی باتوں کی خوراک میں کمی کر دی تھی۔ ڈائلاگ بھی کمزور ہو گئے تھے۔ انہوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ میرے تفکیک کے ترکشوں کے آگے جن میں ایک ترکش میرا تھا اور بہت سے لوگوں کے فراہم کردہ تھے انہوں نے اپنی گفتگو کی اوٹ گرا دی تھی اور اپنا خاموش وجود میرے سامنے کر دیا تھا۔ اس میں نہ کوئی تعلیم تھی نہ تدبیر نہ ڈائلاگ نہ ملفوظات۔ بس خالی ایک وجود تھا جس میں کھڑکیاں ہی کھلی تھیں۔ درتپے وا تھے اور دروازوں کے کواڑ غائب تھے۔ وہ ایک تجریدی تصویر سی بن گئے تھے جس کے اندر نظر کھلے تھے۔ کھانا پک پک کر باہر آ رہا تھا۔ مسافر بھرا کرنے کے لیے اندر جا رہے تھے۔ صحن میں صفیں تھیں۔ کچھ لوگ نفل پڑھ رہے تھے کچھ دسترخوان بچھا کر کھانا کھا رہے تھے اور کچھ گھٹلیاں پڑھ رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ مرشد ایک بہت ہی سمجھدار عقلمند اور زیرک بابا ہوتا ہے۔ وہ تم کو دانش سے قائل نہیں کرتا

کیونکہ دانش کی ایک حد ہوتی ہے اور دانش تم کو دور تک نہیں لے جاسکتی۔ تمہارا سارا سامان اٹھا کر پہاڑ کے دامن تک لے جاسکتی ہے اس سے آگے کام نہیں دیتی۔ چوٹی تک پہنچنے کے لیے پہلے نٹو سے کام لینا پڑتا ہے پھر پیدل چلنا پڑتا ہے۔ یہ ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ پیدل چلنے کا راستہ بھی مسدود ہو جاتا ہے پھر کندھ چھینک کر اور کھلیں ٹھونک ٹھونک کر اوپر اٹھنا پڑتا ہے۔ ان بابوں کو ان مرشدوں کو اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل کہاں تک ساتھ دے گی اور کب تک ساتھ دے گی۔ اس لیے وہ آپ کو دانش سے قائل نہیں کرتے۔ پھر ان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دانش سے اور عقل کی باتوں سے تو تم کو بھی جاؤ گے کیونکہ اس میدان کے تم پرانے شہسوار ہو اور اس معاملے میں تو تمہاری کافی پرنکیش ہو چکی ہے۔ علم سے تو تم جاؤ ہو ہی جاؤ گے کہ اس گھسے پر تمہاری عقل صدیوں سے چکر کاٹ رہی ہے لیکن یہ قائل ہونا تمہارے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکے گا۔ تم عقلی طور پر معقول ہو جاؤ گے لیکن اصلی طور پر نہیں۔

میں باباجی کے ملفوظات سن سن کر عقلی طور پر بالکل چت ہو چکا تھا۔ میرے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ تھے جو عقیدت کے فرش پر نیم مردہ پڑے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کے اندر سے واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازیں اٹھنے لگیں اور پھر معدوم ہو جاتی تھیں۔ ان کے ذہنوں میں انقلاب آچکا تھا لیکن ان کے رویے وہی تھے جن کے سروں پر گولے والی ٹوپیاں سجا کر یہ لوگ ڈیرے کے اندر داخل ہوئے تھے اور اپنے رویوں کو انہوں نے پھینکے کھانے کے لیے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ایک روز جب باباجی وضو کرنے کی غرض سے مسجد کی چابی پر بیٹھے تھے میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے کہا: ”حضور! باطن کا سفر مرشد کی معیت کے بغیر بھی کیا جاسکتا ہے؟“

انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر خاموش ہو گئے۔ میں نے دوبارہ پھر یہی سوال کیا تو انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا: ”کیا جاسکتا ہے لیکن وہ صرف ایک ہی راستہ ہے۔“ پھر وہ تھوڑی دیر خاموش رہے اور میرے ریسوننگ سینٹر کے ٹیون ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر بولے ”وہ راستہ ہے عاجزی کا اور انکساری کا۔ حضرت آدم کی اُس سنت کا جب وہ شرمندگی کا سر جھکا اور عجز کے ہاتھ سینے پر باندھے اللہ کے حضور میں حاضر ہو کر بولے کہ مجھ سے بڑی بھول ہو گئی۔“ باباجی نے کہا: ”بس ایک یہی طریقہ ہے اور یہی رویہ ہے جسے اپنا کر مرشد کے بغیر باطن کا سفر کیا جاسکتا ہے۔ پھر آپ درختوں سے پرندوں سے دریاؤں سے پہاڑوں سے درس لے سکتے ہیں۔ پتھروں سے بادلوں سے ٹھوکروں سے گیان حاصل کر سکتے ہیں۔ ہزار ہا ساری دنیا آپ کو سبق دے سکتی ہے ساری کائنات آپ کو مرزا شناسا کر سکتی ہے۔“

ہمارے ارد گرد ڈیرے پر (میرے حساب سے) دو تین افراد ایسے تھے جو باطن کے سفر میں کب کے گمراہ ہوئے تھے۔ ان کو نہ تو منزل کی پروا تھی اور نہ ہی منزل کا کوئی علم تھا۔ وہ بس سفر میں دلچسپی رکھتے تھے اور خوش خوشی الٹی مسافت طے کیے جا رہے تھے۔ وہ دیوانے اور مستانے لوگ تھے۔ مجھے اپنی طرف ملتفت پاکر خوش ہوتے۔ ہاتھ لہرا کر میری توجہ کا جواب دیتے اور پھر آگے نکل جاتے۔ انہیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ وہاں باش لوگ یاد آ جاتے جو جنسی لذت حاصل کرنے کے لیے جنسی فعل میں مبتلا رہتے تھے۔ ان کے سامنے کسی تخلیق کی بچے کی یا اولاد کی منزل نہیں ہوتی تھی اس لیے

کے کبے جانے کا لپکا ہوتا ہے۔ جس طرح جو گنگ کرنے والوں کے سامنے بس جو گنگ کیے جانے کا نارگٹ ہوتا ہے اسی طرح اوباش لوگ بے دراوے مقصود دھنیے کے تار پر اپنی جان دھنکتے جاتے ہیں اور اسی کولڈت کی معراج گروا دیتے ہیں۔ یہ لوگ... یہ اوباش اور بد چلن لوگ جب خوش قسمتی سے بڑی بدل کر باطن کے سفر میں اتر جائیں تو اسی دیوانگی اور شوریدہ سری کے مویشی میں سب سے آگے نکل جاتے ہیں۔ اپنی ذات کو اور خوبی کے ساتھ دھنکتے ہیں!

اپنی منزل پر نگہ رکھنے والے اور پھر اپنی منزل کو پالنے والے لوگ عام طور پر درمیانے درجے کے انسان ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی لہک یا لپک جھپک نہیں ہوتی۔ بدن بھینک کر بھاگنے والے گھوڑے کی چپک نہیں ہوتی۔ صرف اپنے ہدف کو پالنے کی خواہش ہوتی۔ وہ جواہر گرم رکھنے کا بہانہ ہوتا ہے وہ ان میں مفقود ہوتا ہے۔ بھلا کوئی منزل کو کس طرح سے پاسکتا ہے اور وہ منزل ہی کیا ہوگی جو پانے والے کے تصرف میں آگئی۔

یہ وہ دن تھے جب میں نے ڈیرے پر بہت کچھ دیکھا۔ ایسی چیزیں جو اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھیں لیکن انہیں سارا مشاہدہ کرنے کے باوجود اور اتنا سارا کچھ دیکھنے کے باوصف میں نے کچھ سیکھا نہیں تھا۔ میرے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی جیسے دس دس پندرہ پندرہ سال یورپ میں گزارنے اور اپنے ہاتھ سے سارے کام کرنے کے بعد جب ہماری ذہنیں واپس وطن آتی ہیں تو تیرہ دن کے بعد اسی بیگماتی نظام کا شکار ہو جاتی ہیں جن میں تین گھریلو ملازم دو سرکاری کارکن دو دھوبی اور ایک سرنٹ کوئٹہ میں بٹھایا ہوا درزی ہر وقت بیگم صاحب کے اشارہ ابرو کے ساتھ چٹکیوں کی طرح بدھے ہوتے ہیں۔ بیگم صاحبہ یورپ کے اعلیٰ معاشرتی نظام اور مغرب کے خود کار سیاسی سسٹم اور نجی ملازموں سے پاک معاشرے کا ذکر بھی کی جاتی ہیں اور ان کو بڑا کر حکم بھی دیتی جاتی ہیں کہ کرائی واپس لے جاؤ۔ آیا کو بتاؤ کہ بچوں کو آج کو کھانا کھائیں نہیں دینے اور رانی کو کچھ جو کھائی ہو اس کی لاکڑیاں فرش پر پھیرے بچوں نے بھورے چورے گرا دیئے ہیں اور نظام واپس صاحب کے پاس چلا جائے آج ششے صاف نہیں کروانے۔ پھر وہ اپنی سیلیوں کو بتاتی ہیں کہ دلایت میں چاہے کوئی گورنر کی بیوی ہو اپنا کام اسے خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ انہیں کہیں بڑے بڑے گھرانوں میں ایک ”ہیلپ“ ضرور ہوتی ہے جو ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ آتی ہے اور بیگم صاحب کے آؤ کے تھڑے کام کرنے میں ان کی مدد کرتی ہے اور شام کو چالیس ڈالر لے کر چلی جاتی ہے۔

میں نے ڈیرے پر بہت کچھ دیکھا تھا۔ انسانی برتری کی بہت سی مثالیں قریب سے آگئی تھیں۔ باباجی کو خلوت خلوت میں دور سے اور قریب سے دیکھا تھا۔ میرے پاس بہت سے واقعات بہت سی کہانیاں بہت سے قصے جمع ہو گئے تھے لیکن جس تبدیلی کی غرض سے میں وہاں گیا وہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس تبدیلی کے کوئی آثار بھی نمودار نہیں ہوئے تھے۔ گفتگو کے معاملے میں البتہ میں قریب قریب لسان العصر ہو گیا تھا اور اٹھتے بیٹھتے ایسی باتیں کرنے لگا تھا جس سے ہمارے ارد گرد کے لوگ اس خوشگوار شک میں مبتلا ہو گئے تھے کہ میں تصوف کی بہت سی منازل طے کر گیا ہوں اور اب آخر کی تہن جا رہا ہوں رہ گئی ہیں۔ اپنے جاننے والوں اور ارد گرد کے لوگوں میں ایسی غلط فہمی کے عام ہونے سے طبیعت میں ایک غامضی کی بنیاد پڑ گئی تھی اور میں ریشم کے کپڑے کی طرح ایک انجانے سروے کوئے میں لپٹا جا رہا تھا۔ اس کے

ساتھ ساتھ کبھی کبھی طبیعت پر بہت بیماری بوجھ بھی پڑ جاتا تھا کہ یہ تو سب گفتگو ہے۔ قال ہی قال ہے اس میں عمل کا تو ہم بھی نہیں اور تم وہ ہونٹیں جس کا تم دعویٰ کرتے ہو اور تم ہر وقت وہ کہتے رہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔

ایک روز جب میرے ضمیر کا بوجھ زیادہ ہی بڑھ گیا تو میں نے بابا جی سے پوچھا "حضور! اس زندگی میں قتل کا بھی کوئی مقام ہے کہ یہ انسان کو پستی کی طرف لے جانے ہی کا ایک ذریعہ ہے۔" کہنے لگے "قال کا بڑا درجہ ہے کہ اس سیرجی کی بدولت اوپر کی منزلیں ملے ہوتی ہیں۔"

میں نے کہا "حضور میں تو قال کو ایک بے معنی اور لالہ یعنی شے سمجھتا ہوں کہ منافقت میں اتارنے کی ایک کھینچ ہے جو انسان کو تحت السرائے میں اتار دیتی ہے۔"

سنیدگی سے کہنے لگے "بیٹا! آپ کی بیوی آپ پر محض قال سے حلال ہوئی ہے۔ ورنہ آپ نے کوئی کموار چاکر نیزہ بازی دکھا کر یا ہزار بندوں کو کھانا کھلا کر تو اُسے نہیں بیٹا تھا۔ آپ نے سادہ سا لفظ بولا "ہاں جی قبول" اور ہماری بیٹی آپ کی بیوی بن گئی۔ قال کا بڑا مقام ہے لیکن کچھ لوگ اس سیرجی کے پہلے ڈنڈے پر ہی کھڑے رہتے ہیں۔ اوپر چڑھ کر نظارہ نہیں کر سکتے اور آخری پیغام آ جاتا ہے۔"

اب یہ ایک اور دھچکا تھا۔ ہم تو ساری عمر عمل کو ہی شرف انسانی کا تاج سمجھتے رہے تھے اور دنیا بھر کے دستاویزی علم میں اسی کا چرچا ملتا تھا۔ لیکن اب ایک اور بات ایک بہت ہی سچی اور مستحکم بات اس علم کا راستہ کاٹ کر گزر گئی تھی اور اس نے میرے ذہن پر گہری لکیر چھوڑ دی تھی۔

واقعی اس وقت ساری دنیا آزادی عمل کے لیے نہیں آزادی اظہار کے لیے تڑپ رہی تھی۔ اظہار عمل سے محرم ہے۔ عمل سے معتبر ہے۔ بولنے کی اور بولتے چلے جانے کی طلب اتم ہے۔ جس کو یہ لگنی اُس کو دنیا میں کسی اور شے کی حاجت نہ رہی۔ اصل میں گفتگو ایک ایسی چابی ہے جو سوسائٹی کے اندر داخل ہونے کا بند روڑہ کھولتی ہے۔ آپ صرف گفتگو کے ذریعے لوگوں سے متعارف ہوتے ہیں اسی کی بدولت اُن کے دوست بنتے اسی سے ان کا دل جیتنے میں اور اسی ہتھیار سے انہیں قتل کرتے ہیں۔ عمل سے اور اپنے کسی فعل سے آپ لوگوں کے دل نہیں جیت سکتے۔ محض عمل کے ذریعے آپ کسی معاشرے کا حصہ نہیں بن سکتے۔ صرف کارکردگی آپ کو کسی گروہ کا ممبر نہیں بنا سکتی۔ جب تک آپ پولیس کے ٹیکڑا اظہار نہیں کریں گے بیان نہیں دیں گے گفتگو نہیں کریں گے آپ اپنے گروہ سے پرے پرے اور دور دور ہیں گے۔ جو نبی آپ بولنا شروع کریں گے ایک گروہ انسانی فوراً آپ کے گرد جمع ہو جائے گا۔ اگر آپ اور پولیس گے بہتر پولیس گے

اور بے مکان پولیس گے تو آپ کے ارد گرد جمع ہونے والا چھوٹا سا انسانی گروہ پھیل کر سمندر بن جائے گا اور آپ دونوں کے اندر اندر قلعہ کشتروں بن جائیں گے۔ انسانی زندگی میں قال کا بڑا مقام ہے اور صاحبانِ قال صاحبانِ حال سے اور صاحبانِ عمل سے ہمیشہ بازی لے جاتے ہیں۔ اس کرہ ارض پر جتنے بڑے بڑے ادارے جس قدر وسیع دفتر اور جوگی خوبصورت عمارتیں نظر آئیں گی ان کا تعلق صرف قال سے اور گفتار سے ہوگا۔ دنیا بھر کے ملکوں کے اسمبلی ہال ان کی عداوتیں ان کے ہال ان کی عبادت گاہیں ان کے تھیمز سینما گھر فورم پھر یو این او کی عمارت 'سلامتی کونسل کے ہال اور فائر

اور ملک ملک پھیلے ہوئے ان کے ذیلی ادارے ہر مقام پر گفتگو کے مخصوص اور قال کے لیے مختص ہے۔

یہی وجہ ہے کہ لوگ فریڈم آف ایکسپریشن کے لیے لڑتے ہیں فریڈم آف پرفارمنس کے لیے کوئی جھگڑا نہیں کرتے۔ اپنے اظہار کے لیے اپنی گفتار کے لیے اپنے بیان کے لیے اپنے بھاشن کے لیے آزادی مانگتے ہیں لیکن اپنے عمل کے لیے اپنی کارکردگی کے لیے اپنے عمل کے لیے کوئی لائسنس نہیں مانگتے۔ حقیقت میں قول کا درجہ فعل سے بلند تر ہے بلکہ انسانی زندگی کا بلند ترین مقام قول ہی سے وابستہ ہے۔ اتھینز کے فورم سے لے کر آج کی یونیورسٹیوں تک۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے سات آٹھ لکھ بندہ قسم کے دھوتے سے لوگ ڈیرے پر آ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے "ہم بابا جی سا کہیں فضل شاہ صاحب کی زیارت کرنے آئے ہیں اور ان کی چوکی بھرنا چاہتے ہیں۔"

سب لوگ اپنی اپنی جگہ حیرت سے ان کا منہ کھٹکے لگے اور کسی نے اُن کی بات کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ انہیں لے پھر کہا "جناب ہم یہ سے آئے ہیں اور بابا جی کی چوکی بھرنا چاہتے ہیں۔ اگر حضور کو اطلاع ہو جائے تو ہمارا آنا بارہ ہو جائے۔" ڈاکٹر صاحب نے انہیں گھور کر دیکھا اور پھر اخبار پڑھنے لگے۔

ان لمبے ہاتھوں میں پراٹھنے کھینچوں اور پھینچوں کی چوکیوں کے اندر بندھے ہوئے سامان سے یہ ضرور پتہ چلتا تھا کہ ان میں آلات موسیقی لیے ہوئے ہیں لیکن ان کی شکلوں سے ہرگز یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ قوالوں کا طائفہ ہے اور سر شربت کے اسرار کا محرم ہے۔ میں نے ان سے اپنی نسی شرافت کا زبانی اظہار کرتے ہوئے کہا "بیٹھ جاؤ۔" تو وہ ہیں راستے ہی میں اکڑوں بیٹھ گئے اور میری طرف شکر گزار نظروں سے دیکھنے لگے۔

بیکری صاحب کو ان کی بچا کرگی پر ترس آیا تو انہوں نے تھڑے کے پاس پڑے ہوئے سرس کے تنے کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس پر بیٹھ جاؤ۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور ہم سب کو دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے ہوئے تنے پر بیٹھ گئے۔ پرتالی سال سے اسی جگہ اسی طرح سے پڑا تھا اور اس پر سے کئی بارشیں کئی دھوپیں کئی آندھیاں اور گند گوہر کے پتھر توڑے گزر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہمیں بکریاں اور ان کے بچے بندھتے تھے اور اکثر تندخو لوگ اس پر ایک پاؤں بٹا کر دوسرے سے ٹکرا بھی کر لیتے تھے۔

لوگ کے جائیں مدینے جائیں حیرتہ یا ترا کر آئیں تخت پر بیٹھیں ہوائی جہاز میں اڑیں۔ اسمبلی سے ہوائی ہائی کورٹ کی منصفی کر لیں گھر میں اتر کر مایہ ڈھولے گالیں رہتے ایک جیسے ہی ہیں۔ ڈیروں پر آنے والے طالبان حق اور باطن کے مسافر بھی ڈبکیاں ہی کھاتے رہتے ہیں اور قدم قدم پر ان کے گونڈے گتے رہتے ہیں۔ محبت اور عمارت کے معاملے میں ان کا رویہ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کرسی کے روز گورے پادریوں کے چہرے پر پیار اور برہم کے آثار اور لاڈ اور Love کے تزیینے۔

فوراً دریاں، مٹھیں، کھیل اور بڑے بچہ کر سنیڈیم تیار ہو گیا۔ باباجی کے لیے ان کا رتی کا گدا بچھ گیا۔ ہم سب ان کے ارد گرد نیم دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے اور ہمارے سامنے قوالوں نے بڑے ادب کے ساتھ دوزانو ہو کر اپنی گھڑیاں کھلتی شروع کر دی۔ ایک کھیس سے ایسا براؤن مٹم برآمد ہوا جس کے اندر چھ سات پتیاں تھیں۔ باقی سرسے باندے پر بلبلہ وجہ میں سوئے ہوئے بڑھے بابے کی طرح منہ سے پھونک چھوڑ دیتا تھا۔ ساری چابیاں تک تک ایسے زور سے بجتی تھیں کہ باجے سے صرف انہی کی آواز آتی تھی۔ پھونک پھرنے کے دھوکے میں بہت سے غیر مرئی سوراخ تھے اس لیے ان کا بچھا جیڑی سے چلانا پڑتا تھا۔ کچھ پردے ایک مرتبہ انگی سے دب کر خود اوپر نہیں اٹھتے تھے انہیں ہر بار اٹھانا پڑتا تھا۔

طلبوں کے کھیس میں سے صرف ایک طلبہ برآمد ہوا۔ بابا یاں... اُس کا پڑا موسوں کے تغیر و تبدل کی وجہ سے اسیلا ہو چکا تھا۔ جب طلبی نے اسے میٹ کیا تو اُس میں سے مگ کے بجائے جھانسیں کی صدا بلند ہوئی۔ اس نے کھیانی ملی کی طرح طلبی کی بدیاں نوچنا شروع کر دیں لیکن اُن میں کساوٹ پیدا نہ ہوئی۔

بیڈ قوال نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کر دست بستہ باباجی سے اجازت طلب کی اور اشارہ پانے پر الپ شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ چھوٹے قوال نے آنس بھری۔ پھر باجے والے نے ایک دو ہڑہ الاپا اور قوالی کا ٹیک آف شروع ہو گیا۔ باباجی کے مجموعہ کر اور سر ہلا کر انہیں داد دی اور وہ شہ پا کر اور بھی گرم ہو گئے۔

سیکرٹری صاحب نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر اور اُسے ہاتھوں کے کٹورے میں رکھ کر باباجی کے سامنے پیش کیا۔ جو شتر اس کے کہ باباجی اپنے اچھی طرح سے ہاتھوں کے تصرف میں کرتے بڑا قوال اُسے ایک کر سلام کرتا ہوا کھیلے ہاتھ اپنی صف میں بیٹھ گیا۔ پھر باباجی نے اپنی گودڑی سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر اپنی چنگی میں پکڑا اور بیڈ قوال اُسے چنگی سے کھینچا مار کر لے گیا جہاں جلال نے بھی حضور کی وساطت سے ایک روپیہ دیا۔ لیکن زیادہ تر باباجی ہی رقم لاتے اور روپے اڑاتے رہے۔ جیسوں کے نوٹوں کھدروں سے کچھ اٹھائیاں اُچھوٹاں برآمد ہوئیں وہ بھی آپ نے ان کے حوالے کر دیں۔ پھر اٹھ کر اندر گئے اور نوٹوں سے جیسوں بھر لائے۔ میں نے اور ڈاکٹر صاحب نے انہیں کچھ کہا تو نہیں بہت ایک دوسرے سے نکالیں ملا کر باباجی کے اس فعل پر خاموش تنقید ضرور کی۔ کئی مرتبہ حضور ایسی باتیں کر جاتے تھے جن پر ہمیں اپنے دل کی گہرائیوں سے پرسکوت تنقید کرنا پڑتی تھی اور بڑے ادب کے ساتھ بے صدا احتجاج کرنا ضروری ہو جاتا تھا۔

اس وقت قوال جو ”گا“ رہے تھے وہ بابا بلھے شادی ایک کافی تھی جس میں تین صوفیوں کا کلام ایک ساتھ چل رہا تھا۔ حضرت سلطان بابو کا، حضرت شاہ حسین کا اور حضرت میراں بھیکھ صاحب کا۔ سچ سچ کے کسی مصرعے میں ایک آدھ کھرا چھ الفاظ بابا بلھے شاد کے بھی آ جاتے تھے۔ میں جب بھی ان قوالوں کی آواز اُٹھتی یا کلام پر ناک بھوں چڑھاتا باباجی روپے کا پانچ کا یا دس کا نوٹ میری طرف بڑھا کر سر سے اثبات کا اشارہ کر کے فرماتے ”جاؤ اور جا کر انہیں دے کر آؤ“ میں طوعاً و کرہاً اپنی جگہ سے اٹھتا اور بیڈ قوال صاحب کی جھولی میں نوٹ پھینک کر واپس آ جاتا۔

طلبہ والا دوسرا طلبہ نہ ہونے کی وجہ سے اسی ایک بائیں کو دونوں ہاتھوں سے ”بجا“ رہا تھا اور ساتھ ساتھ بول

باباجی اندر سے برآمد ہوئے تو انہوں نے ان کی وضع قطع، شکل و صورت اور لطف و کرم کی لو سے پہچان کر دھڑلے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا، وہ سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ باندھ کر سر جھکا لیے۔

باباجی نے پکار کر کہا ”او بھئی خدا کے بند ذور والو ہاں کہاں بیٹھ گئے۔ یہ چار پائیاں بچھی ہیں بیٹھ پڑا ہے بچھی ہے اس پر بیٹھو۔ ڈیرے پر آ کر دور یاں نہیں کھیا کرتے ساتھ ساتھ ہا کر تے ہیں۔“

وہ اپنی اپنی گھڑی اٹھا کر سیدھی قطار میں ایک ساتھ آگے بڑھے اور باباجی کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے ان میں سے بڑی عمر کے آدمی نے جس نے سر پر منظر لپیٹا ہوا تھا اور کندھوں پر بڑے بڑے سوراخوں والی سواری لٹائی تھی بالکل ماری ہوئی تھی ہاتھ باندھ کر بولا ”حضور! ہم لہ سے آئے ہیں اور سرکار کی چوکی بھرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے علاقے کے مشہور قوال ہیں لیکن اب وہاں کوئی کام نہیں رہا۔ حضور سے دُعا کرانے آئے ہیں۔“

دوسرے نے کہا ”حضور ہمارے چھوٹے چھوٹے بال بچے ہیں...!“ وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کا گلا بند ہو گیا اور رگیں سی پھول گئیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اخبار سے نظریں اٹھا کر انہیں بھرپور انداز میں دیکھا اور ایک لفظ بولے بغیر کہا ”اوئے قوال! یہ میں قوال نہیں ہوتے دوسرے تمہاری شکلیں اور تمہارے وجود ایسے کھد اور ناقص ہیں کہ کم از کم تم قوال نہیں ہو سکتے۔“ جب وہ آرام و سکون کے ساتھ اپنی اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھ گئے تو بابا جلال سنگر کے سامان کی چنگیر لے کر نکلا گیا۔ قوالوں کے آگے کہا ”حضور کھانا تو ہم کھا کر آئے ہیں۔“

باباجی نے کہا ”تم تو جان کا رہو بھائی ڈیروں پر کھانا کھا کے نہیں آیا کرتے۔ آ کے کھایا کرتے ہیں۔ اب بکھو کچھ تو پکھنا پڑے گا نہیں تو ہماری ریت نوٹ جائے گی۔“

ان سب نے بسم اللہ! بسم اللہ! کہہ کر سامن کے کٹورے اپنے سامنے رکھ لیے اور درویشاں ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ گئے۔

صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ بھوکے ہیں۔ آج کے نہیں اُس دن کے جب انہوں نے سفر شروع کیا تھا۔ باباجی اُن کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے بھی اپنے خرگوش ایسے کان کھڑے کر کے ان کا اٹینا ادھر کو کھما دیا۔ وہ بتا رہے تھے کہ اصل میں ان کے باپ دادا قوال تھے اور اپنے زمانے میں افریقہ کے کئی ملکوں کے چکر لگائے تھے۔ جالندھر اور شام چوراسی میں ان کے دوھیال اور زخیال کی بکلی حویلیاں تھیں۔ ان کے ماما ہر ملو سے میلے میں دھر پکی راگداری کا مظاہرہ کیا کرتے تھے اور ہر سال سنے رنگ اور نئی سوچ سے کرتے تھے۔ اب ہم لہ میں ہوا پرائشیں پاتھنے کا کام کرتے ہیں اور ٹھیکیدار کے ہاتھوں رہن ہیں اور ہم میں سے یہ چھوٹا ”اونی ٹوپی والا“ یہ ختیل میں چلا ہے اور اس کی بیوی زنا نہ سکول میں بلاوی ہے۔ بس یہی ہم میں خوشحال ہے۔ باقی سب کی حالت آپ کے سامنے ہے۔ کھانا کھا چکنے کے بعد باباجی نے اُن سے کہا ”لو بھئی ابھی چوکی بھرو پھر سب کو اپنے اپنے کام پر جانا ہے۔“

حاضری کم ہو گئی تو تم لوگوں کو مڑا نہیں آئے گا۔“

بھی اٹھالیتا تھا۔ ہارمونیم والا زیادہ تر انہی سروں پر رہتا جن کی چھپیاں کام کرتی تھیں لیکن راگداری کے تقاضوں سے کبھی ہو کر اُسے تھوٹے پردوں پر بھی جانا پڑ جاتا تھا لیکن یہ ایسے تھوٹے پردے تھے جو گھٹنا بننے سے معذور تھے۔ وہ سارے سر پر تک ٹکا ٹکا بجا کر آگے نکل جاتے تھے اور بایاں بجانے والا ان سے پیچھے رہ جاتا تھا۔

جب سارے سامعین نے اور خاص طور پر ڈیرے کے سارے شاف نے لیہ سے آنے والے ان معصومی قوالوں کی کارکردگی پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ایک دوسرے سے نظریں ملا کر ناراض سے چہرے بنائے تو میں نے بابا جی کی طرف جھک کر کہا "سامع ہمارے مذہب میں جائز ہے؟"

بابا جی نے میری طرف غور سے دیکھا اور اپنا بھاری بھر کم ہاتھ میری کھائی پر رکھ کر بولے "ان لوگوں کے چھوٹے چھوٹے پال بچے ہیں اور یہ بڑی دور سے بڑی آس لے کر آئے ہیں۔ اگر تو اس قوالی سے ان کے اہل و عیال کا کچھ بھی جانے تو جائز ہے ورنہ ناجائز ہے۔"

بابا جی نے پال بچے کے ڈیرے پر ایک بڑا لاگری موجود ہوتا ہے۔ ہمارے بابا جی کے ڈیرے پر بھائی احمد علی صاحب بیٹہ

بھری تھے۔ میں نے ساڑھے بارہ برس ان کو کسی سے کوئی بات کرتے نہیں دیکھا۔ سلام کا جواب بڑی محبت اور متانت سے دیتے تھے لیکن پھر اپنے چولہے کے ساتھ مختلک ہو جاتے تھے۔ جس طرح جلتنگ بجانے والا اپنے ساز کی پیالیوں میں پانی بڑھاتا گھٹاتا رہتا ہے بھائی احمد علی چولہے میں لکڑیوں کو آگے پیچھے کرتے رہتے تھے۔ اس مودمت سے ان کے دیکھنے کے اندر کی آواز بھی تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ چھوٹے لاگری (جو ہر روز بدلتے رہتے تھے) ان کی آنکھ کے اشاروں کو سمجھتے تھے اور اس خاموشی کے ساتھ کام کرتے تھے جو خاموشی بھائی احمد علی صاحب تقسیم کرتے تھے۔

بابا جی نے بتایا کہ اگلے وقتوں میں لوگ گدائی کر کے اور اپنے علاقے کے گھروں پر جا کر صد اگ کر رسد اکٹھی کر کے لاتے تھے اور لنگر میں شامل کرتے تھے۔ ان میں ہر طرح کے لوگ ہوتے تھے۔ معزز سردار، تعلقہ افسر، کاری ملازم، مزدور، منشی، مقدی، مدرس، پیشہ ور۔ گدائی کرنے والے ان کے تکبر میں کمی آتی تھی اور وہ اہلیس کی جماعت سے نکل کر سجدہ کرنے والوں کے ہمیش میں شامل ہو جاتے تھے۔

اب بھی لوگ خواجہ اجیری کی درگاہ پر بڑی دھجک میں رسد ڈالنے کے لیے گھروں سے سووے لے کر آتے ہیں۔

ایک روز بیٹھے بیٹھے میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں گدائی کر کے کچھ رسد لے کر ڈیرے پر جاؤں گا اور لنگر میں شامل کروں گا تاکہ پرانی رسم کا اعادہ ہو۔ گھر کے پھانک سے باہر نکل کر جب میں نے ادھر ادھر دیکھا تو میرا حوصلہ نہ پڑا۔ میں اٹھا بڑا آدمی ایک معزز اور مشہور ادیب کس طرح کسی کے گھر کی Bell بجا کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں مانگنے آیا ہوں۔ میں چپ چاپ آ کر واپس اپنی کرسی پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا۔ لیکن چونکہ یہ خیال ذہن میں جاگزیں ہو چکا تھا اس لیے میں بڑھاپائی جگہ سے اٹھا اور بیوی کے پاس جا کر کہا "مجھے اللہ کے نام پر کچھ خیرات دوگی۔" وہ میری بات نہ سمجھی اور حیرانی سے بڑھاپہ سننے لگی۔ میں نے کہا مجھے اللہ کے نام پر کچھ آخیرات کر دو۔ اس نے تعجب سے پوچھا تو میں نے کہا بابا جی کے لنگر میں ڈالنا ہے۔ کہنے لگی ٹھہرے میں کوئی مضبوط سا شاپر تلاش کرتی ہوں۔ میں نے کہا شاپر نہیں میری جھولی میں ڈال دو۔

”دلنگر“

مجھے کھانے پکانے کی ترکیبوں سے بڑا لگاؤ ہے۔ اب پکانے میں تو کوئی ایسی دلچسپی نہیں رہی لیکن ترکیبوں کے ساتھ اب بھی بڑا شغف ہے۔ گھر میں کوئی رسالہ ہوا اگر بڑی کا یا اردو کا میں اس کے آخر میں کھانے پکانے کی ترکیبوں کو اب بھی پڑھتا ہوں۔ ٹی وی پر کھانے پکانے کے پروگرام چونکہ زیادہ وقت لے لیتے ہیں اس لیے میں اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔

میرے بابا جی سائیں فضل شاہ صاحب جب حیات تھے تو ان کے ڈیرے پر بڑا لنگر چلتا تھا۔ لوگ دور دور سے یہاں آ کر کھانا کھاتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے صاحب حیثیت لوگ بھی ہوتے تھے۔ چھابڑی فروش اور مزدور بھی اور سڑکوں کے خاکروب بھی۔

لنگر کا یا عوامی ضیافت کا کسی اور مذہب میں چلن نہیں ماسوائے سکھ مذہب کے۔ ہندوؤں میں عیسائیوں میں یہودیوں میں بودھوں میں لنگر کا ایسا رخ نہیں ہے جیسا مسلمان صوفیوں اور درویشوں کے یہاں ہے۔ ہمارے گھروں میں بھی اس کے اثرات موجود ہیں اور پرانی آبادیوں میں اب بھی یہ بیاں خاص دنوں یا تہواروں پر حلوہ لچیاں پوریاں اور کبیر وغیرہ پکا کر ارد گرد کے گھروں میں پہنچایا کرتی ہیں۔

لیکن لنگر کا اصل فلسفہ اور اس کی صحیح حقیقت بابوں کے پاس رہ کر ہی معلوم ہوتی ہے۔

صبح صبح ڈھیر ساری سبزیاں منڈی سے لا کر اور انہیں بڑی سی چار پائی پر پھیلا کر بابا جی ان کے پاس کھڑے ہو کر خوش کن لہجہ میں فرمایا کرتے تھے "واہ جی واہ۔ قربان جائیں۔ اس فیو کوڈ کھو اور کد پر نظر کرو ہر ادھیا دیکھو بغیر کد

کیونکہ ایسے ہی مانگا جاتا ہے۔ وہ پھر نہیں سمجھی۔ جب میں نے ضد کی تو وہ آٹے کا ایک بڑا "بول" بھرا لائی۔ میں نے اپنے کرتے کی جھولی اس کے آگے کر دی۔ اس نے آٹا میری جھولی میں ڈالتے ہوئے سر جھکا لیا اور آبدیدہ ہو گئی۔ پھر وہ مجھ سے نظریں ملانے بغیر واپس باور چچی خانے میں چلی گئی۔ وہاں سے دو بڑے بیگن اور ایک چھوٹا سا کدو لے کر آئی اور انہیں آٹے پر کھد دیا۔ ہم دونوں کے شرمندہ اور غمناک چہروں کو ہمارا چھوٹا بیٹا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا محبوب لیسن ڈراپ تھا اور وہ اس سے چپٹا ہوا کاغذ اتار رہا تھا جب اس نے باپ کو جھولی پھیلائے دیکھا تو اس نے اپنا لیسن ڈراپ میری جھولی میں ڈال دیا۔ ہم دونوں میاں بیوی کی ایک ساتھ جیج نکل گئی۔ جب کوئی گدائی کرتا ہے تو بھکاری اور داتا کے درمیان ایک نہ سنائی دینے والی چیخ ضرور ابھرتی ہے۔ بھکاری اپنی در یوزہ گری پر پشیمان ہوتا ہے اور داتا اپنی بے چینی اور ناشدنی پر شرمندہ ہوتا ہے۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا موٹر کار دروازہ کھول کر مجھے اس میں بٹھا دو۔ کار کی چابی سلاٹ میں لگا دو اور جب میں سیٹ پر بیٹھ جاؤں تو گاڑی کا دروازہ بند کر دو۔

میں کھلی جھولی میں آٹا ڈالے آہستہ آہستہ کار چلاتا ڈیرے پر پہنچ گیا۔ بابا جی کھڑے تھے مجھے جھولی دیکھ کر زور کا نعرہ لگایا۔ رحمتاں برکتاں والے آگے۔ نور والے آگے۔ منگتے آگے۔ منگتے آگے۔

میں نے سر جھکائے شرمندہ شرمندہ جھولی ان کے آگے کر دی۔ سراج تندور چچی نے آٹا لے لیا۔ بڑی بھائی احمد علی کے حوالے کر دی۔ میں نے کہا اس میں ایک لیسن ڈراپ بھی ہے۔ بھائی احمد علی نے کہا بسم اللہ اس کا تو انتظار تھا۔ انہوں نے لیسن ڈراپ کا پر اتار کر بھنڈارے کے کھد بد پکتے کڑا ہے میں ڈال دیا۔

بابا جی نے کہا "لنگر کے اندر بھنڈارے کے ساتھ ہزاروں لاکھوں آدی وابستہ ہوتے ہیں اور لنگر کی کڑی بڑی دور تک جاتی ہے۔ یہ جو آٹا شفاق صاحب لائے ہیں اس کے پیچھے ہزار سے زیادہ آدمیوں کی لائن لگی ہے۔ گندم بونے والے گندم اگانے والے نہر کا پانی سپائی کرنے والے لنگر نہر کا سارا عملہ۔ اگر نیوب دیل سے کھیت سیراب ہو تو نیوب دیل کے مستری کا رندے، فشی ڈیزل کی کمپنی ڈیزل برادر جہاز جہاز کا عملہ ڈیزل نکالنے والے صاف کرنے والے سپائی کرنے والے منڈی کے آدھتی مزدور پٹے دار آٹا پینے کی مل کے مزدور پلاسٹک کے تھیلے پلاسٹک کا کارخانہ کارخانے کے کارندے چولہے پر کام کرنے والے لکڑی لانے والے لکڑہارے جنگل رکھوں کے مالک، منگہ جنگلات، ایندھن ڈھونڈنے والے ٹرک ٹرک کے مالک، ڈرائیور، کلیئر..... پھر بھرس کر بولے یہ تو لاکھوں آدمیوں سے بھی بڑھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا حضور برتن بنانے والے۔ کچے برتن کچے برتن، تام چینی کے برتن، مٹی کے برتن پلاسٹک کے برتن، حضور لاکھ کے قریب تو ہمیں ہو گئے۔ فرمانے لگے دیکھو لنگر میں کیا برکت ہے کیا ایک جیتی ہے۔ وحدت میں کل ہے۔ کل میں وحدت ہے۔

لنگر کے باہر کھانے والا کھانا نہیں کھاتا اخبار سامنے رکھ کر خبریں زہر مار کرتا ہے۔ ہوٹل کے ریڈیو پر بیچنے والا میوزک سنتا ہے۔ احباب کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔ کھانے کے ساتھ جڑا ہوا نہیں ہوتا۔

الگ الگ رہنے والا الگ الگ سوچنے والا اپنی ذات سے بھی الگ ہو جاتا ہے اور دوسروں سے بھی دور ہو جاتا ہے۔

روم کے کافی ہاؤس میں ایک معزز شخص سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا آپ مشرق کے لوگوں کے ساتھ تو ہمیشہ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں جن کو عقل قبول نہیں کرتی لیکن کبھی کبھی مغربی دنیا میں بھی ایسے ہو جاتا ہے لیکن ہم اس کا ذکر نہیں کرتے کیونکہ عقل اس کو قبول نہیں کرتی۔

کہنے لگا میں ریس کورس میں اپنے آخری سولیرے بار کر جب باہر نکلا تو مجھے قریبی غسل خانے میں جانے کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی۔ وہاں گیا تو وہ سرکاری غسل خانہ تھا اور وہاں سولیرے (ٹھنٹی) کا سکہ ڈال کر دروازہ کھولا جا سکتا تھا۔ میری ساری جیبیں خالی تھیں اور میں غسل خانے کا دروازہ کھولنے سے معذور تھا۔

سڑک کنارے میں نے پارک میں بیچ پر بیٹھے ایک شخص سے آکر ٹھنٹی مانگی تو اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے بڑی احتیاط کے ساتھ ٹھنٹی نکالی اور میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں بھاگا بھاگا پھر غسل خانے میں آیا اور ابھی ٹھنٹی Slot میں ڈال کر دروازہ کھولانے والا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور اندر سے ایک شخص برآمد ہوا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کھلے دروازے کا پتہ تمام کر کھڑا ہو گیا کہ ایسے ہی اندر آ جائیے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اندر داخل ہو گیا۔

غسل خانے میں داخل ہونے کے بعد میں نے جلدی سے فراغت حاصل کی اور بھاگ کر پارک کی طرف گیا کہ اس شخص کو ٹھنٹی واپس کر دوں جو میں نے استعمال ہی نہ کی تھی۔ لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا اور جا چکا تھا۔

میں نے عادیانہ ٹھنٹی جاننے لگی لاشی مشین میں ڈال کر پینڈل گھمایا تو اس کے جواب میں دس روپے کا ایک سکہ خانے میں آگرا۔ میں نے دس روپے پھر مشین میں ڈال کر پینڈل گھمایا تو سو روپے میرے تصرف میں آ گئے۔ سو روپے کی خلیق رقم لے کر میں پھر اس کوڑی کی طرف بھاگا۔ وہاں سے سب سے کمزور اور نامقبول گھوڑے پر میں نے پورے سو روپے لگا دیے۔ کئی بھی مجھے منع کرتا رہا کہ وہاں روپے لگا لو سو بہت زیادہ ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں ہانے دو۔

جیرانی کی بات سے وہ نامقبول گھوڑا جھنڈی جیت گیا اور مجھے دس ہزار روپے مل گئے۔ وہ رقم لے کر میں گھر آ گیا۔ اگلے دن میں نے اخبار میں دیکھا کہ ایک ڈوبی ہوئی چینی کوزندہ کرنے کے لیے پھر شیئر فلوٹ کئے گئے ہیں۔ میں نے دو دس ہزار سارے کے سارے اس بیمار کمپنی میں لگا دیے۔ چھ مہینے تک ان حصوں کی شکل و صورت ویسی ہی رہی لیکن چھ مہینے کے بعد ان میں بڑھوتری کے آثار پیدا ہوئے اور میرے شیئرز دس لاکھ کے ہو گئے۔ وہاں سے میں نے باقاعدہ بزنس شروع کر دی اور چلتے چلتے میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں آپ سب لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اتنی ساری دولت ایسی شہرت کمانے کے بعد مجھے آج تک ایک ہی چیز کی حسرت رہی اور وہ اب تک پوری نہیں ہو سکی۔ میری آخری خواہش ہے....

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے آپ چاہتے ہیں کہ ایک مرتبہ اس آدی کو ڈھونڈ نکالوں جس نے مجھے غسل خانہ کھولنے کے لیے ٹھنٹی دی تھی۔"

اس نے کہا ”نہیں مجھے اس شخص سے ملنے کی آرزو ہے جس نے میرے لیے دروازہ کھولا تھا اور کہا تھا کہ اندر آ جائیے۔“

اصل میں جو آدمی آپ کے لیے کوئی دروازہ کھولتا ہے وہ آپ کا محسن ہوتا ہے اور جو دروازہ کھول کر کھڑا رہتا ہے وہ آپ کا دشمن ہوتا ہے اور اس نے آپ کو ایک نئی جگہ تلاش کر کے دی ہوتی ہے۔

اماں جعدارنی نے اندر آ کر میری بیوی سے کہا ”بی بی! کل پانچ آدمی آئے ہیں۔ چار تو جوان ہیں پر ایک عمر کا ہے۔“

میں اُس شیشے کے سامنے کھڑا ہائی باندھ رہا تھا اور مجھے دفتر کے تین چار ایسے کام یاد آ رہے تھے جن کا کیا کرنا تھا۔ آج ہی ضروری تھا۔ میں نے پوچھا ”ان کو کچھ دیا ہے؟“

اماں نے کہا ”لال دین ان سے پوچھ کر آیا ہے۔ نہ تو انہوں نے چائے پینی ہے نہ ہی شربت۔ وہ ڈیرے پر ورد کر کے اور لسی پی کر چلے تھے۔ اب وہ دوپہر کے وقت صرف روٹی کھائیں گے اور شام کے کھانے سے پہلے پہلے جائیں گے۔“

اماں جحدارانی کی اس تفصیلی انفرمیشن سے میں بہت خوش ہوا اور بانو کے پاس جا کر بولا ”بہتر یہی ہے کہ تم جلد سے نکال دیا جائے۔ یہ لکڑی ہاروں پر جگہ بھی رکھے گی اور تمہیں ان کی تفصیلات بھی بہم کرتی رہے گی۔ کار میگر لوگ ہوتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی واردات ضرور کرتے ہیں۔“

میری بیوی نے چڑ کر کہا ”میں اسے گھر پر نہیں رکھوں گی۔ یہ لالچی بیلی اُن سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور میں اسے شروع سے جانتی ہوں۔ آپ آرام سے دفتر جائیں اور یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں سب پر نگہ رکھوں گی اور ہر ایک سے منٹ لوں گی۔“

میں کوٹ انگلی پر لٹکا کر باہر نکالتا تو پانچوں لکڑہارے پاٹ میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور ایک دوسرے سے باتیں
کیے بناؤ پر آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر بڑا لکڑھارا اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور سلام کر کے بولا ”لوؤ جی ہم ٹھیک وقت پر پہنچ گئے ہیں۔ میرا نام ہے۔ یہ دو میرے بھتیجے ہیں۔ ایک میرا بھانجا ہے اور ایک میرے استاد کا بیٹا ہے۔ ہم انشاء اللہ شام تک ہوجائیں گے اور آپ کے آنے تک سارا کام ختم کر لیں گے۔“

میں نے کہا ”میں تو اس کام کو ٹھیک سے سمجھتا نہیں۔ جو آپ مناسب سمجھیں وہی کریں میں البتہ شام سے پہلے گھر پہنچ جاؤں گا۔“

اس وقت مجھ پر کھلا کہلی کیا ہوتی ہے اور اس پر کس کا حق ہوتا ہے۔
میں ان کی اس گور بانی سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ میں نے جذبات میں آکر اعلان کر دیا کہ شنبہ بھی آپ

کے۔ شائیں اور پھر بھی آپ کے اور ساتھ ہی یہ اشارہ فٹ والی گلی بھی آپ کی۔ وہ سارے کے سارے میرا یہ اعلان کر
حیرت میں آ گئے اور مسکرا کر ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔

باباوریام نے کاسو سے کہا "لے تو جلدی سے جا اور گلی اٹھانے کا بندوبست کر۔"
کاسو لے پاؤں پھاٹک سے باہر نکل گیا۔
پھر باباوریام نے راجن سے کہا "تو اوپر چڑھ کر دیکھ کوئی پیچھی پھیرا جھنگر بوٹ" آئندہ چھوٹے کسی آبلے پر

نہیں۔"

راجن اپنا کھلاڑا ساتھ لے کر اس قدر درخت پر ایسے چڑھ گیا جیسے ہم لفٹ کچڑ کر چوٹی منزل پر جائے
ہیں۔ اس نے درخت کی پھٹنگ پر کھڑے ہو کر سارے سبیل پر نظر دوڑائی اور بولا "کچھ نہیں ماما کوئی بھی نہیں۔"

وریام نے کہا "بسم اللہ کر کے شنبہ کو تک لگا اور ساتھ کے ٹہنوں کو بچا۔ ان کو الٹا کھلاڑا نہ لنگ جائے راجن لے
کہا تو ٹھکرائی نہ کر ماما آج کوئی پہلی بار تو درگاہ پر نہیں چڑھا جو سائیں بادشاہ کوست پھیت مار دوں گا۔"
میں نے کہا "آپ لوگوں کو اتنی اونچائی پر چڑھتے ہوئے کچھ حفاظتی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ اس طرح سے
ڈسٹینٹس ہونے کا خطرہ ہے۔"

وریام نے کہا "نہیں سرکار۔ صدق یقین ہو تو درخت لکڑ ہارے کی آپ حفاظت کرتا ہے۔ آج تک کسی راکو
نے لکڑ ہارے کو گرایا نہیں۔ کسی کی نیت بد ہو تو پھر دوسری بات ہے۔"

میں نے اندر سے کرسی منگوائی۔ دفتر فون کر دیا کہ آج نہیں آؤں گا۔ سامنے لان میں اڈا جما کر بیٹھ گیا اور بابا
سبیل کو کھتے دیکھنے لگا۔

درختوں اور انسانوں کا ہزاروں لاکھوں برس کا ساتھ ہے۔ شاید جب انسان کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا تھا تو درخت
بھی دوتا ہو کر انسان کے سامنے جھک گئے تھے۔

درخت کتنا دیکھ کر بہت سے لوگ ہمارے پھاٹک کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے عورتیں بھی
بچے بھی اور بوڑھے بھی۔ میں نے بشرے کو آواز دے کر پھاٹک بند کرنے کے لیے کہا تو وریام نے منع کر دیا کہ بعض غلو
نہنا مرضی کا مالک ہوتا ہے۔ گرتے وقت پہلو بدل لیتا ہے۔ بند پھاٹک پر گرے گا تو پھاٹک کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے
اس لیے اس کو کھلا ہی رکھیں۔

دو بڑے بڑے شنبہ کاٹ کر راجن نیچے اترا یا تو بابا نے کہا یہ آڑا ٹہنا تیرے سوا اور کسی سے نہ
کے گا۔ پیر رکھنے کی جگہ تک ہے اس کو کھسی مارے گا تو کئے گا نہیں تو گلی کے ساتھ ہی لگا رہے گا۔

کمالا لاگو کس کے اور دونوں ہاتھ کانوں سے لگا کر تنے پر چڑھ گیا اور راجن اُسے کر اس کر کے نیچے اترا

سب کچھ پہلے بے نے ہیزل بلاؤ کے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں دیکھا اور پھر ناخن نہ اڑنے کی وجہ سے زمین پر گر

بارخ سے ہم بخوبی واقف ہیں۔

اس بے کار رنگ بھورا اور جسم پر پیلے رنگ کی بڑی بڑی دھاریاں تھیں۔ بھاگتے ہوئے اُس کا سارا جھیرا سرسوں
کے ہائی پھولوں کا گٹھا دکھائی دیتا تھا جو کمیٹی کی گند گاڑی میں تیزی سے اوپر نیچے اچھل رہا ہو جسے کمیٹی کا ٹریکٹر اندھا دھند
بھاگنے لے جاتا ہو۔

جب ایک لمبے کتے کا گند اچھ بے کی کمر پر پہنچ گیا تو بلا تڑپ کر کچی دیوار پر کودا اور اپنے خوف کے جوش میں
منڈیر تک پہنچ گیا۔ اس کی بوتھی دیوار کے صحن اوپر آ گئی اور اس نے دیکھا کہ کھیتوں میں لالائیں جل پانی کر کے واپس
گھروں کو جا رہی ہیں۔ کوئوں کی ڈاریں اپنے گھوٹلوں کو آ رہی ہیں اور گوند اچھا اپنے ننگے پوتے کو کندھوں پر بٹھائے اس
کی دونوں کلائیاں اپنے کھر درے ہاتھوں میں پکڑے اس سے چھوٹی چھوٹی تالیاں بجواتا بھیروپن گاتا چلا جاتا ہے۔ یہ
سب کچھ پہلے بے نے ہیزل بلاؤ کے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں دیکھا اور پھر ناخن نہ اڑنے کی وجہ سے زمین پر گر

گیا۔ کتوں نے اُسے پھر دائرے میں بھگانا شروع کر دیا اور بے کاسا راجوہ بالکل باسی ہو گیا۔

جب آوارہ کتے گولڈن بلی کو مار کر لیے جاتے تھے تو اس کی دیکھ کا سونا آخری ڈیکس مار رہا تھا اور فتح مندرجہ جھولے کے مرلیضوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکراتے اور کمزوری کی وجہ سے اپنے پیچھے ایک دوسرے سے مارے اور ہچکولے کھاتے جا رہے تھے۔

کیا کوئی دنیا کی اس دوڑ میں لمبی چھلانگ مارے بغیر تیرتی ہوئی زقد بھرے بغیر ابد میں جھانک کر دیکھ سکتا ہے۔ ایک سیکنڈ کے ہزاروں حصے کی جھلک دیکھ سکتا ہے۔ ہیزل بلاؤ کی کلک کی طرح!

ایک روز یوں ہوا کہ ہم ڈیرا پاک میں آڑی ترچھی کھچی ہوئی کھانوں پر بیٹھے لیٹے اور نیم دراز تھے۔ نوہر شروع تھا اور بڑا ہی خوشگوار جانا پچھانا موسم تھا کہ اچانک پورب سے کالی گھٹا کا ایک پہاڑ آسمان کی طرف بڑھنے لگا۔ اس پہاڑ کے آگے آگے خوفزدہ پرندوں کی قطاریں تھیں جو تیزی سے اپنے اپنے ٹھکانوں کی جانب بڑھ رہی تھیں اور ان کے کالے کالی گھٹا کے درمیان فرق تیز رفتاری کے ساتھ مٹا جا رہا تھا۔ سیکرٹری صاحب نے کہا ”تیز بارش آ رہی ہے چار پائیاں اندر کر لیں۔“

ہم اٹھنے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا ”فکر کی بات نہیں ہے۔ موٹی دل دار گھٹا ہے گزر جائے گی۔ نہ گزرنے والی نہیں گر کر برس جائے گی۔ نہ برس سکی تو اوپر ہی اوپر اودے اودے بادل بن جائے گی۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔“ ہم خوش ہو گئے کہ اٹھنے سے اور کھانوں میں اٹھانے سے جان بچی۔ لیٹ کر نظارہ کرنے کا موقع ملا اور اتنا سارا مگر اودارنگ ایسی کثرت سے آتی دیر تک دیکھنے کا وقت ملا۔

پہلے تو مونے مونے بوندے ہمارے چہروں اور ماتھوں اور ہاتھوں پر پڑے۔ پھر لمبی لمبی دھاریں اترنے لگیں۔ ہم چار پائیاں اٹھا کر اندر کو بھاگے۔ ہمارے اندر تک پہنچتے پہنچتے سارے سر بھیگ گئے اور ہم میں سے طرح طرح کی خوشبوئیں آنے لگیں۔

بابا جی لنگر کی تھمی کے پاس کھڑے ہم کو اندر کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بابا جلال کو اونٹنی آواز دے کر باقی کی لائینیں جلائے کا حکم دیا کیونکہ سب کو یقین تھا کہ بجلی چلی جائے گی اور پھر ڈیرے کے ڈونگھے کمرے میں صرف چوکھیا دیئے کی روشنی رہ جائے گی۔

چوکھیا دیا ڈیرے پر مغرب کی اذان کے وقت جلا دیا جاتا تھا اور اس کی روشنی سے دیواروں پر چھوٹے آدمیوں کے سائے بھی بڑے ہو جاتے۔ دن کے وقت اس دینے کے کڑوے تیل کی خوشبو سارے کونوں میں پھیلی رہتی اور اس کمرے سے جو تکیہ گدا لٹاف یا رضائی باہر لائی جاتی اس کے اندر سروسوں کے تیل کی خوشبو جچی ہوتی جس سے صاف پتہ چل جاتا کہ یہ ڈونگھے کوٹھے سے آیا ہے۔

یہ دیا غائبانہ بنے کا تھا جو لوہے کے تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچے سوئے پر اس طرح سے فٹ تھا کہ دونوں اب ایک ہی دھات کے دکھائی دیتے تھے۔ تیل کا کک اور میل کا کوٹ دینے کی بیس سے لے کر اوپر تک چڑھا ہوا تھا جو چاروں بیسوں کی روشنی میں اور بھی چمکدار ہو جاتا تھا۔ مغرب کے وقت یہ دیا باقاعدگی سے جلا دیا جاتا اور بجلی کے بلب اس کے بعد روشن ہوتے۔ بلبوں کی روشنی کے باوصف یہ دیا صبح تک اسی طرح سے جلتا رہتا۔ رات کو اٹھنے والا کوئی نہ کوئی بالکا اس میں جلنے کے دو تین بڑے بڑے گھونٹ غٹ غٹ ڈال کر پھر اپنی جگہ جا کر سو جاتا۔ میں نے بابا جی سے اس دینے کی ضرورت نہ ہونے کے باوجود اس کے جلائے جانے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا ”ہمارے پیر سائیں خدا بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے ڈیرے پر اسی طرح کا دیا روشن کر کے رکھا کرتے تھے۔ ہم نے بھی ان کے تتبع میں ویسا ہی دیا بنا کر روشن کر لیا ہے۔“

میں نے کہا ”حضور! اُس زمانے میں تو خیر بجلی نہیں تھی اور گھاسلیٹ کے لیمپ بھی عام نہیں ہوئے تھے اُس وقت تو دیا ٹھیک تھا لیکن اب اُس کی کیا ضرورت ہے؟“ تو آپ نے فرمایا ”ہم اسے اپنے لگتوں کی چاہت میں روشن کرتے ہیں۔ فائدے نقصان کے لیے نہیں چونکہ حضرت خدا بخش صاحب کے ڈیرے پر ایسی روشنی تھی اس لیے وہ یہاں بھی ہوئی چاہیے کیونکہ یہ ڈیرا اور یہ روشنی انہی کے کمال کا الحاق اور انہی کی برکت کا تسلسل ہے۔ اس لیے یہاں وہی کچھ ہونا چاہیے جو وہاں ہوتا رہا ہے۔ ابھی ساری لائینیں پوری طرح روشن نہیں ہوئی تھیں کہ بجلی بجھ گئی اور سارا علاقہ تاریکی میں ادب گیا۔ دو تین لائینوں اور اندر پڑے چوکھیا دیئے کی روشنی میں اہم ایک دوسرے کے ہولے دیکھ سکتے تھے لیکن کسی کو پہچان نہیں سکتے تھے۔ ایسی موسلا دھار اور بھیا تک بارش میں نے اپنی زندگی میں کل تین مرتبہ دیکھی ہے اور اس کے گھبرا دینے اور دل دہلا دینے والے نقوش میرے دل پر اب بھی ویسی ہی گرفت رکھتے ہیں جیسے سیلاب کے نرنے میں آنے والے روز رکھتے تھے۔“

بجلی اور پہلو والی گلیوں سے پانی کے ریلے ڈیرا پار کر کے اندر داخل ہو رہے تھے اور سارے احاطے میں گھٹنے گھٹنے پانی کھڑا ہو گیا تھا۔ سامنے کچی سڑک کی طرف پانی کے ٹنگے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ بابا جلال اور سیکرٹری صاحب نے کمریاں جلدی جلدی کھول کر اندر چھوٹی کوٹھری میں کھڑی کردی تھیں پانی میں شرابو ہو جانے کی وجہ سے اور ڈر کے مارے اپنے قدم سے آدمی رہ گئی تھیں۔ آسمان سے پانی کی آبشاریں بجلیوں کی طرح ٹوٹی پڑتی تھیں اور اندر احاطے میں پانی کے بڑے بڑے لہریے چل رہے تھے۔ اتنے میں جھپاک سے ڈونگھے کوٹھے کا چوکھیا دیا بجھ گیا اور ہم سب کے دل بیٹھ گئے۔ بھائی علی محمد نے اپنی دھیمی بے خوف ملام اور سریلی آواز میں کہا ”پانی حضور کے کوٹھے میں داخل ہو رہا ہے۔“ ہم سب ادھر کو لپکے تو دیکھا کہ کوٹھے کے اندر پانی تیزی سے داخل ہو رہا ہے اور فرش پر رکھے ہوئے گھی آئے ”مگر“ شکر اور سوکھی اودے کے سارے کنستہ اس میں ڈوب چکے ہیں۔ پانی کی یہ باڑھ کوٹھے کے موٹھے میں سے آ رہی تھی جس نے کھلی دھار سے کوٹھے کا گھیر بہت بڑا کر دیا تھا۔ اس کے قریب ایک بنگلی میز می بے کچی شہتیر کی تھی جس نے چھت کی ایک طرف کا سارا اوج اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ اب یہ شہتیری ذرا سی دیر میں تورا کر گرنے والی تھی اور اس کے ساتھ آدھی چھت کے بیٹھ جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔

ہم نے اکلوتی لائین اور پراٹھا کر دیکھا تو شبیری کو اپنے مقام سے پھرے ہوئے اور پانی کے دھارے کو منہ کی سرنگ میں پوری طاقت سے گزرتے پایا۔ ہر طرف ایک شور مچا تھا اور ہم سب بے بس کھڑے تھے۔ جوں جوں ہماری بے بسی بڑھ رہی تھی ہماری آوازیں اور مشورے اونچے ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ اگر کہیں سے کوئی مضبوطی لکڑی مل جائے جسے عودا کھڑی کر کے ہم گرتی ہوئی شبیری کو ٹیک دے سکیں تو یہ مصیبت رفع ہو سکتی ہے۔ سیکرٹری صاحب کا خیال تھا کہ ”اگر کوٹھے میں داخل ہوتی آبشار کو کسی طرح سے روکا جاسکے تو شبیری اپنا وزن سنبھالنے میں کامیاب ہو جائے گی۔“

باباجی کہہ رہے تھے کہ اللہ عظیم مطلق ہے اس کو پتہ ہے کہ کب اور کس وقت بارش بھیجی ہے اور کتنی بھیجی ہے۔ کس کو دباؤ ڈالنا ہے کس کو دباؤ سے نکالنا ہے۔ اس لیے ہر وقت اس کی رحمت کے طلبگار رہو۔ مشکل کے وقت زیادہ رحمت کی امید رکھو۔ میرے لیے یہ بات سمجھنی بہت مشکل تھی کہ کسی مصیبت کے وقت رحمت کیسے آسکتی ہے۔ کیونکہ اگر مصیبت رحمت کی بارش ہونے لگے تو مصیبت مصیبت نہ رہے راحت بن جائے اور مصیبت چونکہ اسی طاقت کی طرف سے بھیجی جاتی ہے جس کے پاس رحمت کے خزانے ہوتے ہیں اس لیے وہ عذاب بھیج کر اس کے ساتھ علاج کیونکر بھیج سکتا ہے۔ برا مطلب کیوں بھیجے۔ اپنے پلین کو خود ہی کیوں ختم کرے۔ اپنے ہیکٹیج ذیل میں تبدیلی کیوں کرے۔ میرا ذہن چونکہ ایک ہر طرح کے علم سے مزین ہے جس میں ہیکٹیج ذیل و پلو می ڈائلاگ اصولوں پر سمجھوتہ کے واضح خطوط کچھ ہیں اس لیے برا ان سے الگ ہو کر سوچنا بہت ہی مشکل ہے جو چیزیں میری معلومات کے نمونے پر پوری نہیں اترتیں وہ میرے صاحب سے تمام کے تمام غلط اور بے معنی ہیں۔ وہ ہیں ہی نہیں۔ کبھی ہوتی ہی نہیں۔ وہی نہیں سکتیں۔

ایک روز یوں ہوا کہ ہم ڈیرے پر مختلف ٹکڑیوں میں بنے بیٹھے تھے اور اپنی اپنی دنیا میں محو تھے کہ ایک شخص روتا ہوا ڈھانچے میں مارتا رکشا سے اتر اور سیدھا آکر باباجی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی کھلی موٹی گڑی گردن میں لٹک رہی تھی اور اس کی آنکھیں روتے رہنے سے سوج کر باہر آگئی تھیں۔ پہلے تو وہ لمحہ بھر ہاتھ باندھ کر اسی طرح کھڑا رہا پھر اس نے اپنی گڑی اتار کر باباجی کے قدموں میں رکھ دی اور آخر میں ایک زور کی دھجھ مار کر سجدے میں گر گیا۔ اس کو سجدے میں پاؤں کھیکر کسی نے میری طرف کے درخت پر ایک زانے دار طمانچہ مارا۔ میں گڑ بڑا کر اپنی جگہ سے اٹھا اور سجدے میں گرے ہوئے پہلوان کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر پیچھے کو کھینچا لیکن مجھ سے اس کی بھاری دیہ اٹھائی نہ جاسکی۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا اور اپنا ماتھا زمین پر مار رہا تھا۔ خدا کے علاوہ کسی اور وجود کو سجدہ کرنے سے انسان کے سارے اعمال تباہ ہو جاتے ہیں اور وہ شرک میں مبتلا ہو کر کافر سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ میں نے اس سے پہلے کوئی شرک اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ پہلوان کو دیکھ کر مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی اور اندر ہی اندر میری ہاتھیں کھل گئیں کہ میں دینی اور اخلاقی اعتبار سے نہ صرف ایک اچھا مسلمان تھا بلکہ اس شخص سے بہتر انسان بھی تھا۔ وہ ایک کمزور بودا بے یقین اور بے دین شخص تھا جو اتنا محنتدار و مضبوط ہونے کے باوجود ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا اور جس نے ہم سب کے سامنے اپنے آپ کو اسلام کے دائرے سے خارج کر لیا تھا۔

باباجی نے آگے بڑھ کر اس شخص کو زمین سے اٹھایا اور اپنے ساتھ لگا کر پوچھا ”بخارا بھی اتر انہیں؟“ اس نے اڑھائی لمبی سر ہلاتے ہوئے اونچی آواز میں کہا ”پچھ مر رہا ہے سائیں جی کوئی کوئی سانس باقی رہ گیا ہے۔ میری واپسی تک وہ بھی نکل گیا ہو گیا۔“ اس نے تیزی کے ساتھ اپنی پیشانی کو پیٹا اور تڑپ کر باباجی کے قدموں سے لپٹ کر ان کے پاؤں چومنے لگا۔

میرے لیے یہ بڑی عبرت کا مقام تھا۔ ایک انسان ایک انسان کے پاؤں چوم رہا ہے اس کی خوشامد کر رہا ہے اور اس کے سامنے عاجز یاں کر رہا ہے۔ مجھے پہلوان کے بچے کی زندگی کے بجائے اس کی عاقبت کی فکر پڑ گئی جو اپنے اس تن

ہم نے اکلوتی لائین اور پراٹھا کر دیکھا تو شبیری کو اپنے مقام سے پھرے ہوئے اور پانی کے دھارے کو منہ کی سرنگ میں پوری طاقت سے گزرتے پایا۔ ہر طرف ایک شور مچا تھا اور ہم سب بے بس کھڑے تھے۔ جوں جوں ہماری بے بسی بڑھ رہی تھی ہماری آوازیں اور مشورے اونچے ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ اگر کہیں سے کوئی مضبوطی لکڑی مل جائے جسے عودا کھڑی کر کے ہم گرتی ہوئی شبیری کو ٹیک دے سکیں تو یہ مصیبت رفع ہو سکتی ہے۔ سیکرٹری صاحب کا خیال تھا کہ ”اگر کوٹھے میں داخل ہوتی آبشار کو کسی طرح سے روکا جاسکے تو شبیری اپنا وزن سنبھالنے میں کامیاب ہو جائے گی۔“

باباجی کہہ رہے تھے کہ اللہ عظیم مطلق ہے اس کو پتہ ہے کہ کب اور کس وقت بارش بھیجی ہے اور کتنی بھیجی ہے۔ کس کو دباؤ ڈالنا ہے کس کو دباؤ سے نکالنا ہے۔ اس لیے ہر وقت اس کی رحمت کے طلبگار رہو۔ مشکل کے وقت زیادہ رحمت کی امید رکھو۔ میرے لیے یہ بات سمجھنی بہت مشکل تھی کہ کسی مصیبت کے وقت رحمت کیسے آسکتی ہے۔ کیونکہ اگر مصیبت رحمت کی بارش ہونے لگے تو مصیبت مصیبت نہ رہے راحت بن جائے اور مصیبت چونکہ اسی طاقت کی طرف سے بھیجی جاتی ہے جس کے پاس رحمت کے خزانے ہوتے ہیں اس لیے وہ عذاب بھیج کر اس کے ساتھ علاج کیونکر بھیج سکتا ہے۔ برا مطلب کیوں بھیجے۔ اپنے پلین کو خود ہی کیوں ختم کرے۔ اپنے ہیکٹیج ذیل میں تبدیلی کیوں کرے۔ میرا ذہن چونکہ ایک ہر طرح کے علم سے مزین ہے جس میں ہیکٹیج ذیل و پلو می ڈائلاگ اصولوں پر سمجھوتہ کے واضح خطوط کچھ ہیں اس لیے برا ان سے الگ ہو کر سوچنا بہت ہی مشکل ہے جو چیزیں میری معلومات کے نمونے پر پوری نہیں اترتیں وہ میرے صاحب سے تمام کے تمام غلط اور بے معنی ہیں۔ وہ ہیں ہی نہیں۔ کبھی ہوتی ہی نہیں۔ وہی نہیں سکتیں۔

اتنے میں کسی نے زور سے نعرہ مارا ”نور والے! نور والے!!“ اور ہم سب خاموش ہو گئے۔ رضا صاحب نے بوچھاڑ سے اونچی آواز نکال کر کہا ”حضور ہمارا شبیر جو ہے اتنا لمبا ایسا مضبوط اس کی ٹیک دے دیتے ہیں۔“

سب نے مل کر ہپ ہپ ہرے کے انداز میں ”نور والے“ کا نعرہ لگایا۔ ہر ایک سمجھ گیا لیکن مجھے معلوم نہ ہوا کہ ایسے گھپ اندھیرے برقی بارش تار یک شہر چھپی ہوئی مخلوق اور سبھی ہوئی خدائی سے ہم کیسے شبیر مانگ کر لاسکتے ہیں اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایسے خطرناک موسم میں کوئی مست مانگ کوئی مست فکر اپنی زندگی کی پروا کیے بغیر ٹکڑا لی یا ٹھیلے شبیر لا کر ہمیں پہنچا سکتا ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ گرتی ہوئی چھت کو اس وقت کسی قسم کا سہارا دیا جاسکتا ہے۔ کراما نامی ضرور ہوتی رہی ہیں لیکن بڑھتے ہوئے سیلابوں کے آگے کراماتوں کی ڈانٹیں کبھی بھی نہیں باندھی جاسکتیں۔ کم از کم میرے مطالعے میں اور میری معلومات میں ایسی کرامتیں کہیں بھی نظر نہ آتی تھیں۔

ذریہ پاک پر ڈاکٹر صاحب کی جھگی کے پیچھے اور غسل خانوں کے سامنے جہاں بکریاں بندھتی تھیں ایک بہت ہی پرانا شبیر پڑا تھا جو تین چوتھائی سے زیادہ مٹی میں دبا ہوا تھا۔ اس شبیر کے ساتھ مونے مونے رسوں کے کئی بالے تھے جن کے ساتھ بکریوں کی رسیاں باندھی جاتی تھیں۔

جب ہم شبیر اٹھا کر ڈوبنے کو ٹھکے کی چھت پہنچانے جا رہے تھے تو باباجی نے فرمایا ”صاحبو! یاد رکھو کہ سب بالے

دوش کے ساتھ میرے سامنے دوزخ کا ایندھن بنا ہوا تھا۔

میرے سامنے بابا ابراہیم کی سفید ڈاڑھی والا کالا چہرہ گھوم گیا جسے میرے بزرگوں نے سات توں کی سیانی اتار کر سرسوں کے تیل میں جل کر کے اُس کے منہ پر کالا لکٹی تھی اور اس کے پیر تیل سے رنگے تھے۔ پھر اس کو گاموں کے کمر کی گدھی پر بٹھا کر سارے گاؤں کا چکر لگوا دیا تھا۔ ہم چھوٹے بچے ٹھین کھڑکاتے اس گدھی کے آگے آگے چل رہے تھے ہمارے بڑے امام مسجد صاحب کے ساتھ گدھی کے دونوں جانب لعنت اللہ! لعنت اللہ! کہتے جا رہے تھے۔ بابا ابراہیم خود مولوی صاحب نے اس کے گھر کے کچے چوترے پر ایسی حالت میں دیکھ لیا تھا جس سے اُس پر حد لازم ہو گئی تھی۔ بابا ابراہیم کا گھر کپتار تھا اور اس کے صحن خانہ کی دیوار بھی کچی تھی۔ عام آدمی تو گلی میں چلتے ہوئے اس کے گھر اندر نہیں جھانک سکتا تھا البتہ مولوی صاحب شہابو پٹیا اور کرتا رنگہ کھاتی کی نگہ نہ چاہتے ہوئے بھی بابا ابراہیم کے گھر میں چلی جاتی تھی۔ مولوی صاحب نے دیکھا کہ بابا ابراہیم اپنے ڈیڑھ سالہ پوتے جمال کو چھوٹے بیڑے پر سائے بٹھائے اس کے ننگن والے پاؤں چوم رہا ہے اور دونوں گھٹنے زمین پر اس طرح سے لگائے ہوئے ہیں جیسے وہ اس کو سجدہ کر رہا ہو۔ مولوی صاحب نے اس واقعہ کی خبر میرے والد اور ذیلدار صاحب کو کر دی۔ بابا ابراہیم کو بلا کر پوچھا گیا تو اس نے فخر یہ اس بات کا اقرار کر لیا کیونکہ اس کے بیٹے کے گھر جمال پورے نو برس بعد پیدا ہوا تھا۔ ہمارے گاؤں کی انجمن اسلامیہ نے بابا ابراہیم کا شرک دور کرنے کے لیے ایک فیصلہ کیا اور ہمارے ہاتھوں میں کنستراور ڈنڈے پکڑا دیے۔

جب میں آٹھویں میں پڑھتا تھا اور اپنے بڑے بھائی کے لیے اسپتھول کا چھلکا لے کر آ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اسپتھول والی گلی میں سو ڈھیوں کی حویلی کے چھوٹے دروازے کے ساتھ تھوڑا لاری کا بیٹا سیتھا اور کرم چند رائے نوٹس لے رہا تھا۔ پوتا بکرم یوں لگے کھڑے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ میں ان کو اس طرح چور سے بنے دیکھ کر رک گیا اور بڑی دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ جب میری ڈھٹائی کے آگے ان کی کارروائی بڑی دیر تک رکی رہی تو بکرم نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر دروازے کے اندر جھانکنے کے لیے کہا۔ نیلے رنگ کے دروازے کی چتا برار کا گھنگھری ہوئی تھی اور اندر پڑے کمرے کے پرانے قالین پر چڑے سے منڈھا بڑا سا موٹھا کھانا تھا اس موٹھے پر ہمارے خطوں کی مشہور کجری منڈلاں بیٹھی تھی۔ میں منڈلاں کجری کو اور اس کے نام کو اُس دن سے جانتا تھا جس دن وہ قلعے کو نوکی ٹانگوں میں گونے والا گھمکھرا اپن کرنا چکی تھی۔ اس روز ستر مسٹھ اسٹنٹ کشن ہمارے گاؤں آئے تھے اور انہوں نے ہی لوگوں کا دل خوش کرنے کے لیے اس ناچ کا حکم دیا تھا۔ یہ ناچ سارے ہندوستان میں منائی جانے والی اُن خوشیوں کا ایک حصہ تھا جو ہمارے شہنشاہ جارج پنجم کی سلور جوبلی کی خوشی میں منائی جا رہی تھیں۔

میں نے نیلے دروازے کی گھنٹھ نکلی مولوی میں سے دیکھا کہ منڈلاں کجری سرخ رنگ کا گونے والا ڈنڈا اوڑھے اپنے بالوں میں چڑیاں نکالے بیٹھی ہے اور اس نے جیتل کے تین بڑے بڑے کلپ اپنی کینٹی سے اوپر لگا رکھے ہیں۔ وہاں کا آدھا پتہ اپنی تھیلی پر رکھے اس پر آہستہ آہستہ کھانا لگا رہی ہے اور اس نے اپنی ناگنگ فرش پر آگے کو پھیلا رکھی ہے۔ ملائے کا خوشخوار تھا نیدار مقدر شاہ دونوں گھٹنے ٹیک کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہے اور اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر منڈلاں کی

مرکابی ایزی سے اور نو سے بڑی مضبوطی کے ساتھ رکھی ہے۔ منڈلاں پان لگاتے ہوئے مسکرا رہی ہے اور تھا نیدار مرگابی پڑے ہوئے دور رہا ہے۔ اس کی لنگی بندھی ہوئی ہے اور ان لنگیوں کی ڈرت میں اُس کا سارا بدن کانپ رہا ہے۔

بابا جی اُس فریادی پہلوان کے ساتھ اُس کے گھر چلے گئے اور میں بڑی دیر تک اکیلا بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور اس کے پیچھے وہ کون سا جذبہ ہے جو انسان کو اس طرح سے مجبور کر دیتا ہے کہ وہ پیر پکڑ لیتا ہے۔ سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ پائے بوس کرنے لگتا ہے لیکن یہ عقدہ مجھ پر کھل نہ سکا۔ ڈاکٹر صاحب سرخے چائے کا لبریز پیالے کر خود میرے پاس آئے اور بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن ان کی باتیں میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند پھاڑ کے جری سوچ کی محدود ترپ پر لینڈ نہ کر سکیں اور میں ہاں جی ہوں جی اچھا جی ہی کرتا رہا۔

ایک روز یوں ہوا کہ میں ڈیرے میں سڑک کی جانب چار پائی کھینچے دھوپ میں بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ دم اچھا تھا۔ وقت دافرتھا۔ اخبار کا چھاپہ بہتر تھا میں بڑے غور اور دلچسپی کے ساتھ خبروں کو اس طرح سے کرید رہا تھا جیسے گد کے ڈیر پر مرغی اپنے بچوں سے روزی پھر دلا کرتی ہے۔ اتنے میں بابا جی ہاتھ میں خالی لوٹا پکڑے ادھر آ گئے۔ برے قریب کھڑے ہو کر فرمایا "بیٹا اخبار اس قدر غور سے نہ پڑھا کر دے اخبار نہیں ہوتا" اکھوتے بھار ہوتا ہے۔ اس سے نظری کزور ہو جاتی ہے اور روح پر بھی جو بڑھ جاتا ہے۔"

میں نے شرمندگی ٹالتے ہوئے کہا "یہ جی بس ایسے ہی... کوئی خاص نہیں بابا جی... کبھی کبھی... کہیں سے مل جاتا ہے تو اس توجہ سے پڑھتا ہوں ورنہ مجھے تو وقت ہی نہیں ملتا... لائیے مجھے لوٹا دیجئے میں بھر لاتا ہوں۔"

فرمایا "دھوپ اچھی ہے چار پائی کھانے سر کھینچی ہے۔ سرخ چائے تیار ہو رہی ہے اور آپ کو چھٹی ہے ایسے اچھے حال کو لوٹے بھرنے میں شائع نہ کریں۔ ہم آپ سے ہر حال میں راضی ہیں۔"

آپ آگے نکلنے کی طرف چلے گئے اور میں اسی طرح کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ انہوں نے نکلنے کی ہتھی کیزی۔ تھوڑا سا پانی لوٹنے میں ڈالا۔ اس کو چھلکا اور پانی زمین پر انڈیل دیا۔ پھر انہوں نے ایک ہاتھ میں لوٹا پکڑے پکڑے کپڑا اور سارا لوٹا بھر کر نکلے سے ذرا دور تنور والی جگہ کے پاس چلے گئے اور وہاں چھوٹی سی چبوتری پر بیٹھ کر وضو فرمانے لگے۔

بابا جی وضو کرنے پر خصوصی توجہ دیتے تھے اور بڑی احتیاط اور بڑے اہتمام سے وضو کرتے تھے۔ یہ وضو ایسا نہیں

ہوتا جیسے ہم تھلا اور دیندار لوگ کیا کرتے ہیں کہ انھیں کی خلال صحیح ہو۔ ڈاڑھی کے اندر پانی چڑھایا جائے۔ کانوں کے

بچھنے کے ہاتھ اس طرح سے لوٹائے جائیں کہ ساری گردن پر پانی کا پوتا پھیر جائے۔ پھر پاؤں کی ایزی کہیں سے سوکھی نہ

لا جائے۔ ٹخنے کا جزیہ اوپر ہونے کی وجہ سے گیلا ہونے سے محروم نہ ہو جائے۔

آپ کا وضو کچھ مختلف سا تھا۔ ابتداً انتہا اور اس کے درمیان کے ارکان بالکل ہمارے جیسے تھے۔ پانی استعمال

کرنے اور اعضاء دھونے کی ڈرل وہی تھی لیکن وضو کے اندر اشباک کچھ ایسا تھا جیسے گہرے مراتبہ میں پلے گئے ہوں۔ وضو سے ہی انہوں نے حضوری کی ابتدا کر دی ہو۔ وہ وضو ایسا تھا جیسے غسل مردے کو غسل دیا کرتے ہیں۔ جن کی ساری توجہ اور ساری مرکزیت سامنے کی میت ہوتی ہے۔ بابا جی وضو کیا نہیں کرتے تھے۔ اپنے آپ سے باہر نکل کر سائیں لعل شاہ صاحب کو وضو کرایا کرتے تھے۔ ان کی میت کو غسل دیا کرتے تھے۔ انہیں صاف ستھرا کر کے سجا بنائے مکھٹ کھائے انہیں اپنی بیٹی اور عاجزی کی ساگر کی سے خوشبودار کر کے انہیں اٹھا کر لے جاتے تھے۔ جیسے انہیں اپنی سفارش کے لیے بڑی سرکار کے روبرو لے جا رہے ہوں۔

آدمی گندا ہو یا مندا۔ ناٹا ہو یا لمبا۔ موٹا ہو یا پتلا۔ وہی ہو یا بھی۔ اُس کو پر اتھنا کی ہر جگہ پر چڑھنے کے لیے سس کٹنا ہی پڑتا ہے۔ اس کے بغیر حاضری ممکن ہی نہیں۔ اور ایک مرتبہ جب حاضری ہو جائے تو کہتے ہیں کہ حضوری کا لہو بھی آ جاتا ہے۔ یہ رسم آج کی نہیں صدیوں پرانی ہے۔ اپنے وجود کو بنا سنوار کر ہار سنگھار کر عطر پھیل لگا کر اور اپنے ہاتھ سے پانی کے چھاپے لگا کر گلے میں ری ڈال کر عراب تلے لے جانا ہوتا ہے۔ جب وجود سر جھکا تا ہے تو رشی والا پکار کہتا ہے ”ہے داتا! بلیدان کی بھیک ہے۔ سس کٹانے کی آ گیا ہو۔ پر اتھنا پوری ہو جائے۔ ارداس ہے! ارداس ہے!“ ارداس ہے!!! لیکن وجود رکوع میں رہتا ہے اور وجود کے مالک کی کوک پکار پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ وہ اس طرح اپنے مینڈھے کی رشی پکڑے پکڑے بلبلاتا رہتا ہے اور سندھیا کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ اپنے اپنے وجود کی رسیاں پکڑے جوق در جوق عبادت کدوں سے نکلتے ہیں اور اپنے جانوروں کو کمال احتیاط سے بٹکاتے اپنے اپنے گھروں کو چے جاتے ہیں۔

میں نے دیکھا تو نہیں پر سنا ہے کہ کبھی کبھی کسی خوش قسمت کے مینڈھے کو رکوع کے اندر سس دینے کا اذن مل جاتا ہے اور اس کا مالک وہیں اس وقت اُسی قربان گاہ پر اپنے وجود کو خود غسل دے کر آگے پیش کر دیتا ہے اور اس کی ٹھکانی رشی نکال کر گول گول لپٹ کر اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے اور گھر کی طرف چلا جاتا ہے۔ ”مو تو قبل اتنو تو... مو تو قبل اتنو تو...“ لوگ پوچھتے ہیں ”آج بٹ صاحب کو مغرب کے وقت نہیں دیکھا۔“ مولوی صاحب کہتے ہیں ”عشاء کے وقت نظر مل لائیں گے تو پوچھیں گے۔ شاید کسی ٹینڈر کے سلسلے میں باہر چلے گئے ہوں۔“ لیکن عشاء کے وقت جب بٹ صاحب آئے ہیں تو بٹ صاحب وہ نہیں ہوتے ہمارے والے۔ وہ دوسرے والے ہو چکے ہوتے ہیں حالانکہ ان کی رہائش وہی ہوتی ہے بلکہ نمبر 36 ایم بلاک ڈینس ایسٹیشن... فیرو...!

وضو کرنے کے بعد بابا جی سیدھے لنگر چھتر تلے پہنچ گئے اور دھلے ہوئے پیالوں کے اندر سے پانی جھاڑ جھاڑ ان کے مینار بناتے گئے۔ اس روز خلیج گوشت کا پتیلا پک رہا تھا اور اس کے ساتھ گڑ کے چاول تیار ہو رہے تھے۔ بابا سراج نے آ کر تندور تپنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی بے نگی آواز میں سلطان باہو کے ایبات گار رہا تھا اور ساتھ ساتھ موٹی خادار جھاڑیوں کو لگوئے سے کاٹ رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی موٹی شاخ کھانڈی کے پھل تلے سے بھدک کر اس کے ہاتھ پکڑتی تو وہ خادار جھاڑی کو ایک گندی سی گالی دے کر کاٹنا چھوڑنے والی جگہ کو اپنے مونے اور بھدے ہونٹوں سے چوستا اور پھر رشتہ

رہنوی دیتا۔ دراصل میاں سراج چھن کی وجہ سے اپنا ماس نہیں چوستا تھا بلکہ اپنے وجود کو بوسہ دینے کے موقعے تلاش کرتا تھا۔ وہ بڑا مضبوط و تنومند لگتا ہوا کسرتی جوان تھا لیکن اُس کو اپنی دیہہ بڑی پیاری تھی۔ میں نے اخبار اچھی طرح سے تہہ کر کے اس کا ایک طمانچہ سا بنالیا تھا۔ بالکل ویسا طمانچہ جیسا نقلیں کرنے والے براٹھ لٹیف کی بیخ لائن پر اپنے ساتھی کو مارا کرتے ہیں۔ میرے کھڑے زانو پر اور چار پائی کے پٹے پائے پر جو کبھی بھی ہر کشتی تھی میں اس کا تسلی سے نشانہ لے کر اور پوری آنکھیں کھول کر تھکلیے ہاتھ سے زور کا اخباری طمانچہ مارتا تھا۔ ملاوٹا درہی کوئی کبھی بچ کر جاتی تھی۔ اگر کوئی بچ بھی جاتی تھی تو تھوڑی دیر بعد واپس زانو پر یا پائے پر پہنچ جاتی تھی۔

میں ایک کبھی کا نشانہ لے ہی رہا تھا کہ میرے سامنے ایک قد آدم سایہ آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا وہ بابا جی کھڑے تھے۔ آپ نے بڑی سنجیدگی سے مجھے مخاطب کر کے فرمایا ”یہ کھیاں آپ کے ذوق کشتن کے لیے بنائی گئی ہیں جو آپ انہیں اس بیدردی سے ہلاک کر رہے ہیں۔“

میں چوروں کی طرح ان کے سامنے کھڑا تھا اور کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ ان کی اس ترکیب ”ذوق کشتی“ نے مجھے بالکل ڈنٹا کر دیا تھا اور میرے پاس اپنی دفاع کے لیے صرف یہی فقرہ رہ گیا تھا کہ حضور ایہ جراثیم پھیلانے والی مخلوق ہے اور اس سے اللہ کے بندوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ان کا خاتمہ ضروری ہے۔ آپ نے محبت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ شفقت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور فرمایا ”کبھی انسان کی محسن ہے۔ بیٹا کرم فرما ہے اور چونکہ محسن کو مارنے کا کوئی دین دھرم بھی اجازت نہیں دیتا اس لیے کبھی کو مارنا بھی اپنے مہربان کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔“

میں نے آپ کے منہ سے گئی غنی اور مختلف باتیں سنی تھیں۔ کئی ایسے ارشادات سنے تھے جو ہمارے آزمودہ اور طے شدہ اصولوں کے منافی تھے۔ کئی ایسے اعلان سنے تھے جن سے ہماری زندگی کے چلن کا بطلان ہوتا تھا۔ کئی ایسے نظریے برداشت کیے تھے جن کا بلند پایہ کتابوں اور والاقی انسٹیٹیوٹ میں دوسری طرح کے اندراج تھے۔ ان کی کئی ایسی باتیں برداشت کر لی تھیں جن کے تسلیم کرنے کی امہات الکتاب میں سخت منافی تھی۔ لیکن یہ کبھی کے محسن ہونے کا نہ تو فلسفہ میری سمجھ میں نہ آیا اور نہ ہی میرا دل اس بات کو مانا کہ اسے مارا نہ جائے اور ختم نہ کیا جائے۔

بابا جی نے فرمایا ”کبھی تمہاری چوکیدار ہے جو ہر وقت خبردار پہرے دار بوکتی رہتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سرخ جھنڈی ہے اور یہ ہمیں صرف اتنا بتانے کے لیے آتی ہے کہ یہاں گندہ غلاظت ہے نا پاکی ہے کوڑا ہے اس جگہ کو فوراً صاف کر لو اور سارے کام چھوڑ کر یہاں کی صفائی کی طرف توجہ دو۔ لیکن تم انسان ہو غافل مخلوق ہو ابھی معلوم ہوا ہے ابھی بھول جاؤ گے۔ اس لیے میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ہلوں گی جب تک تم اس جگہ کو صاف اور پاک نہیں کر لو گے۔ میں بڑی دور سے آئی ہوں اور تم کو صرف اطلاع دینے کے لیے آئی ہوں۔“

میں صبح جب ڈیرا پاک پر آیا تھا تو لنگر چھتر کے نیچے کونے میں ایک خستہ پونڈے کا بڑا سا کھڑا تھا۔ میں نے بھائی علی احمد صاحب سے پوچھا کہ یہ گناکس کا ہے تو انہوں نے اپنی مخصوص سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا ”آپ کے انتظار میں ہوں“ میں نے کہا کہ آپ ہی کا ہے۔ آپ پر غار ہونے کے لیے بے قرار ہے۔ میں نے گئے کا وہ کھڑا اٹھا لیا اور

بکرے پسند کر کے ان کی قیمت دریافت کی تو ان کے انداز سے سے زیادہ نکلی۔ انہوں نے جو قیمت پیش کی وہ بکروال کو منظور نہ تھی۔ بڑی دیر تک سودا اور بیچے ہوتا رہا لیکن چرواہا مانا نہیں اپنی ضد پر اڑا رہا۔ کچھ لوگ جو وہاں موجود تھے انہوں نے بتایا کہ یہ ننگر کے لیے چائیس ذاتی استعمال کے لیے نہیں لیکن باباجی نے انہیں سختی سے منع کر دیا کہ ننگر کا بوجھ ڈال کر اس کو مجبور نہ کیا جائے کیونکہ اس دباؤ میں آ کر اگر بکروال مان گیا تو یہ ناحق ہوگا۔ لیکن وہ بکروال صاحب بھی ایسے ضدی تھے کہ انہوں نے کسی بات کی بھی پروا نہ کی اور اسی قیمت پر انکے رہے جو انہوں نے پہلے بتائی تھی۔ باباجی نے اپنی بھلی بھلی مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا ”اچھا بھئی آپ کی مرضی۔ مال آپ کا ہے۔ سودا آپ کا ہے۔ حکم آپ ہی کا چلے گا۔ ہم مجبور ہیں آپ کے حکم کے مطابق نہیں دے سکتے۔“

جب بکروال بکرے لے کر چلنے لگا تو آپ نے فرمایا ”بھائی آپ کا ہمارا سودا نہ بن سکا۔ یہ منظور نہ تھا لیکن یہ بکرے تو میرے کے مہمان ہیں انہیں ہم نے خود آواز دے کر بلایا ہے۔ انہیں تو ہم بغیر کھائے پیئے نہیں جانے دیں گے۔“

بکروال نے کہا ”مجھے دیر ہوتی ہے باباجی۔ میں زیادہ دیر نہیں سکتا۔“
فرمایا ”بس پانچ منٹ کی بات ہے اس کے بعد چلے جانا۔“ اتنے میں بکروال کے لیے ایک بڑی سی ٹرے میں گلابی چائے کا پیالا، دس بکٹ پھنیاں اور امتیاں لگ کر آگئیں۔ وہ مونڈھے پر ٹرے گود میں رکھ کر بیٹھ گیا اور اونچی آواز میں بولا ”لوڈ بھی بکرے! او! آپ کی وجہ سے ہم کو کیا کیا نعمتیں مل گئیں۔ اب آگے تمہاری قسمت۔“
حضور نے فرمایا ”ان کی قسمت بھی اچھی ہے بابا۔ ڈیرے پر جو آگئے ہیں۔ جو اس ڈیرے پر آتا ہے اچھی قسمت والا ہی ہوتا ہے۔“

اتنے میں بابا جلال سر پر برہم کا کٹھا اٹھائے اور اپنی بھولی میں دواڑ حائی میر پنے ڈالے آگیا۔ اُس کے پیچھے اعظم تھا جس نے بھاگ کر قریبی بیریری سے کلہاڑی کے ساتھ سبز بنڑ شاخیں کافی ہوتی تھیں۔
بکرے اور ان کا مالک بڑی دیر تک بیٹھے اپنی اپنی خوراک کھاتے رہے اور جب وہ چلنے لگے تو باباجی ان کو دروازے سے باہر سڑک کے دوسرے کنارے تک چھوڑنے لگے۔

ایک روز یوں ہوا کہ میں اپنے گلبرگ والے پرانے دفتر میں بیٹھا منسٹری کے ان خطوں کا جواب لکھ رہا تھا جو میرے خیال میں منسٹری کو نہیں بھجوانے چاہئیں تھے۔ ان خطوں کی زبان اور ان کے مضمون کا لب و لہجہ کچھ ایسا تھا جس کا میں مادی نہ تھا۔ عادی کیا مجھے ایسی عبارت سے کبھی واسطی نہ پڑا تھا۔ میں نے ایسے تحریری جملے کے اپنی زندگی میں کبھی سنے ہی نہ تھے۔ سامنے کے جملے کے بیسویں مرتبہ سے تھے اور انہیں خوش اسلوبی سے برداشت بھی کیا تھا لیکن تحریر کے اندر ایسی ہنک آمیز گفتگو سننا میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ ہنک آمیز تحریر پڑھتے ہوئے چونکہ ہنک کرنے والا سامنے موجود نہیں ہوتا اس لیے وہ فقرے پڑھتے ہوئے اپنی ہنک خود ہی کرنی پڑتی ہے۔ یعنی ظالم کا روپ بھی خود ہی اختیار کرنے کی مجبوری ہوتی

دھوپ میں آ کر اس چار پائی پر بیٹھ گیا۔ پونڈے کے چھلکے کو ہونٹوں میں پکڑ کر بھی کھینچو تو ٹوری بھر چھلکا بڑے مزے سے جڑ آتا ہے۔ میں مزے لے لے کر گنگنا چوستا رہا اور اس کے چھلکے اور پھوک چار پائی کے سامنے پھینکتا رہا۔

میں نے نیچے جھک کر چھلکے پھوک اور گنگنے کا کوڑا اٹھانا چاہا تو آپ نے ہاتھ آگے کر کے مجھے روک دیا۔ بابا جلال کو آواز دی۔ وہ بچکی کی طرح لپکا اور زمین پر اکڑوں بیٹھ کر کوڑا اپنی بھولی میں ڈالنے لگا۔

فرمایا ”جونہی یہ جگہ صاف ہو جائے گی اور کھیتوں کے طے کردہ معیار کے مطابق صاف ہو جائے گی تو وہ اس بکرے سے چلی جائیں گی۔ پھر وہ اسی صورت میں لوٹ کر یہاں آئیں گی اگر یہاں ایک دانے کے برابر بھی گندگی ہوئی۔“
مسکرا کر فرمایا ”جھنڈی والے کو ٹریلوے پھاٹک والے کو چوکیدار کو پنسال نوٹس کو ٹریٹک کے سنٹری کو مارنا نہیں چاہیے۔ اس کا شکر یہ ادا کرنا چاہیے وہ آپ کو خطرے سے آگاہ کرتا ہے اور خطرے کی نشاندہی کرتا ہے۔“

جب بابا جلال سارا کوڑا اٹھا کر اور اچھی طرح سے جھاڑو دے کر چلا گیا تو میں نے دیکھا کہ گھٹیاں ایک ایک کر کے وہاں سے وداع ہو رہی ہیں اور ان کے جانے میں کبھی نہ لوٹ کر آنے کی اڑان ہے۔

باباجی کی یہ بات میں نے عقلی طور پر تو مان لی لیکن جذباتی طور پر میں اسے تسلیم نہ کر سکا۔ حال ہی میں میرے چچا زاد نے فیصل آباد میں جراثیم کش دواؤں کی انجینیئرنگ کی تھی اور اس کو بلدیہ کی طرف سے ڈی ڈی سپلائی کرنے کا بہت بڑا آرڈر موصول ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ کبھی مار دواؤں کی ایک بہت بڑی انڈسٹری کل عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ لاکھوں ہزاروں خاندانوں کی زندگی اور ان کا مستقبل وابستہ ہے۔ کیا اس انڈسٹری کو ختم کر دیا جائے۔ پھر غریب ممالک کو اربوں ڈالر کی امداد جراثیم کش ادویات کے لیے دی جاتی ہے۔ اس سے کئی سرکاری نیم سرکاری اور نجی ادارے چلتے ہیں بلکہ چھوٹے ملکوں کی تو گورنمنٹیں بھی اس ایڈ کے سہارے چلتی ہیں تو کیا صرف ایک کبھی کی خاطر اتنی بڑی ایڈ کو بند کر دیا جائے۔ ان لوگوں کو صرف اپنے مقامی اور نا کارہ وسائل کے اندر محدود کر دیا جائے جو پستی سے ترقی کی طرف اہل ترقی سے ترقی پذیری کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن باباجی چونکہ رموز مملکت سے آشنا نہیں ہیں اور اقتصادی دباؤ کے عالمی اصولوں کو جانتے نہیں ہیں اس لیے آپ بیٹشی سائیڈ کے ایکٹ کو سمجھ نہیں سکتے۔

اس دن کے بعد سے میں نے آج تک کبھی کوئی کبھی نہیں ماری۔ جھاڑو دینا سکھ لیا ہے۔ ٹاکی بھی مار لیتا ہوں اور لمبی ٹیوب لگا کر فرش بھی دھو لیتا ہوں۔

ایک روز یوں ہوا کہ ڈیرا پاک کے سامنے سے ایک شخص کچھ بکرے ہنکاتا ہوا گزرا۔ باباجی اس وقت بادام روغن نکھار رہے تھے۔ بکروں کو جاتے دیکھ کر آپ نے کسی لڑکے کو بکروال کے پیچھے بھگایا اور اسے ڈیرے پر منگوایا۔ بکرے نہایت ہی خوبصورت اور اچھے پلے ہوئے تھے۔ سیاہ کسے ہوئے بدنوں پر دھوپ کی روشنی میں وہ بوسکی کے تھان دکھائی دیتے تھے۔ چار دو دے تھے اور تین کھیرے لیکن اپنے قد بت کے اعتبار سے کبھی جو گے جھکے نظر آتے تھے۔ باباجی نے

ہے۔ جب انسان ایک ہی وقت میں خود ہی ظالم، خود ہی مظلوم اور خود ہی مجبور بنا کھڑا ہو تو اس کی حمایت کو کوئی نہیں آتا۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی پراچین دور کی دھوپ جلی چٹان ہو جس کے اندر تین گہری دراڑیں پڑ کر نیچے تک اتر گئی ہوں۔ وہ چٹان ویسی کی ویسی کھڑی ہو اور دیکھنے والے بھی اس کو ایک چٹان ہی سمجھتے ہوں۔ ایک تہدید آمیز خط پڑے وقت ہر ہر ذلت آمیز فقرے کے ساتھ اپنی بے عزتی خود کرتے جانا مر جانے کا مقام ہے۔ اس خود سے انسان میں گہرے شگاف پڑ جاتے ہیں۔ ساری شخصیت جزائی ہو جاتی ہے اور رنجوں کے اندر سے سفید سفید مادہ ہر وقت رستار ہوتا ہے۔ کئی اور کو یہ مادہ نظر نہ آئے۔ بوند آئے۔ گھن نہ آئے دوسری بات ہے لیکن اپنے آپ کو یہ کوڑھ ہر وقت دکھائی دیتا رہتا ہے اور ستم کی بات یہ کہ اس کوڑھ پر ترس کھا کر کوئی خیرات بھی نہیں دیتا۔

میں تین چار مرتبہ خط پڑھ کر اپنی بے عزتی کر چکا تھا اور ابھی اپنے آپ کو اور کھڑکانے کا اہوا دکھا کر دہر چودھری میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ رشید چودھری کے بات کرنے کا اور بات نہ کرنے کا ایک اپنا ہی انداز ہے۔ جب وہ بولتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے خاموش ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اور جب وہ چپ بیٹھے ہوتے ہیں تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ گویا میں لیکن آپ ان کی بات سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ میں ان کی معیت میں بہت چوک رہتا ہوں اور ان کی بات پکڑنے کے لیے ہر لمحہ پناں بھار ہو کر گزارتا ہوں۔ وہ دو پہر میرے لیے بڑی ہی تکلیف دہ دوپہر تھی جب اپنی منٹری کے سیکرٹری کے نام میرے محبت نامے کا جواب مجھے سیکرٹری کے پی۔اے کی طرف سے مل رہا تھا۔ اس خط کی میں دوسری باتیں تو آپ کو بتا نہیں سکتا البتہ اس کا واحد شفیق، غلیظ اور شائستہ جملہ سنائے بغیر نہیں رہوں گا کہ

I am obliged to state categorically that the Secretary has no desire to develop a friendship with you. In view of this, I am sure you will agree that it is inconsistent with gentlemanly standards of conduct to inflict one's company where it is not wanted.

چودھری رشید صاحب کے پاس گیان کا اگر پورا ایک باب نہیں تو اس کے کچھ ورق ضرور موجود ہیں۔ دو جس دفتری کام کے لیے میرے پاس آئے تھے مجھے اس کا علم تھا کیونکہ وقت اور مقام ہمارے درمیان فون پر طے ہو چکا تھا۔ پھر ان کے ہاتھ میں وہ کاغذات بھی تھے جن کے بارے میں ہم کو گفتگو کرتی تھی۔ پھر میرے مہتمم جماعت کا انٹرکوم پر مجھے بتا دیا کہ ہم کو تیسری شق منظور نہیں ہے اس بات کی تین دلیل تھی کہ وہ پہلے سے طے شدہ کام کے لیے میرے پاس تشریف لا رہے ہیں۔

لیکن انہوں نے کرسی پر بیٹھ کر میرے چہرے کو غور سے دیکھا۔ پھر انہوں نے اپنی فائل میز پر رکھ دی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کی کنگھی بنا کر انہیں ایک دوسرے سے پیوست کیا۔ پھر شاید کچھ بولے یا شاید نہیں بولے۔ میری کچھ میں اس لیے نہیں آیا کہ گو میں اس خط کی وجہ سے ذہنی طور پر پناں بھار کھڑا تھا لیکن میں چودھری صاحب کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ پھر چودھری صاحب نے گلا صاف کر کے بہت اونچی آواز میں کہا ”آپ نے میری بات کی طرف توجہ نہیں

چودھری صاحب نے کہا ”یہ آپ سے کس نے کہا کہ وہ خودی ممکن میں۔ وہ تو سیدھے سادے اللہ کے پیارے ہیں۔“

میں نے کہا ”یہ اللہ کے پیارے کون ہیں۔“

چودھری صاحب نے کہا ”یہ اپنے آپ کو ”نور والے“ کہتے ہیں اور نور والے کہلاتے ہیں۔ حضور کا اسم گرامی حضرت فضل شاہ صاحب ہے اور یہ جالندھر شریف سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔“

جالندھر کے ہاتھ مجھے شریف کا لفظ سن کر بڑی حیرت ہوئی اور وہ بھی چودھری رشید صاحب کے منہ سے۔ میں نے ہلکی غرض سے کہا ”پھر کبھی دن رات ان کے ساتھ رہیں گے رشید صاحب۔ کسی اچھے سے کھلے دن۔ جس دن طبیعت امنگ پر ہوا دروازہ و جوان ہوا دروازہ کے گھوڑے کا رخ کسی شائنی ٹیکٹن کے سیل ساگر کی طرف ہو۔“

رشید صاحب نے کہا ”آج سے اچھا اور کون سا دن ہو سکتا ہے۔ آج جمعہ ہے۔ سردی شباب پر ہے۔ دھوپ ملتی ہوئی ہے اور ڈیرے پر جمعہ کی نماز ہوتی ہے۔ آج ہی چلتے ہیں۔“

مجھے جمعہ سے اور ڈیرے سے دونوں سے اجتناب تھا اور رشید صاحب یہ دونوں الفاظ ایک ہی فقرے میں بول گئے تھے۔ میں نے پوچھا ”یہ ڈیرا کیا بلا ہے؟ قلندروں اور مجندروں کا مسکن!“

رشید صاحب نے کہا ”وہاں کبھی کچھ ہے قلندر بھی مجندر بھی۔ سیکرٹری صاحب بھی ڈاکٹر صاحب بھی میاں صاحب بھی دیوان صاحب بھی۔ ڈیرا ایک پوری زندگی ہے ایک کل ہے۔ وہاں کبھی کچھ ہے۔ آپ انہیں تو سہی۔“

میں نے کہا ”دیکھئے چودھری صاحب باوجود اس کے کہ میں اس وقت غم خوردہ ہوں اور باوجود اس کے کہ مجھے کسی سہارے کی ضرورت ہے اور باوصف اس کے کہ آپ جیسا مخلص دوست مجھے ساتھ لے جا رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں وہاں جا نہیں سکتا۔“

”لیکن کیوں؟“ چودھری صاحب نے پوچھا۔

”اس لیے کہ ہم ان چیزوں پر اعتقاد نہیں رکھتے۔“ میں نے کہا ”ہمارا گھرانہ فراست اور فلسفے کا گھرانہ ہے اور

ہم پشتوں سے پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ معاصر الامرا کی دوسری جلد میں ہمارے بزرگوں کے نام بولتے ہیں اور ہم جب اس رنگ میں چلے ہوئے آج یہاں تک پہنچے ہیں۔ اب ہم خانقاہوں میں جا کر بیروں کے سامنے سر نہیں جھکا سکتے۔ ہماری خوداری کے منافی ہے۔ ہمارے وجود کی توہین ہے۔ ہم میں صاحب السیف بھی تھے اور صاحب القلم بھی۔ سردار بھی تھے اور رسالہ سردار بھی۔ ہم حکمران بھی رہے اور حکمرانوں کے صلاح کار بھی لیکن ہم کبھی کسی آستانے پر سر جوکے نہیں گئے۔ تبادلہ خیال کرنے ضرور گئے ہیں۔ کم از کم پچھلی دس پندرہ پشتوں سے ہم نے ایسا نہیں کیا۔“

چودھری رشید حیرت زدہ میرے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور میں کہہ رہا تھا ”میں تصوف کو اور صوفی ازم اسلام کے منافی سمجھتا ہوں۔ شرع نے جو ہم کو بتلادیا ہے سمجھا دیا ہے اس کے علاوہ باقی ہر شے بدعت ہے اور ہمارا گمراہ بدعت کے سخت خلاف ہے اور ہم صرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کے پابند ہیں۔ اسی میں ہماری فلاح اسی میں ہماری ترقی اور اسی میں ہمارا مستقبل پوشیدہ ہے۔ یہ تصوف اور گیان چودھری صاحب! ان لوگوں کو اختیار ہے جو زندگی سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جو گریز کا راستہ اختیار کرنے کو خدا کی عطا کردہ زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ جو زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی راہیں خود استوار نہیں کر سکتے۔ سن لیجیے چودھری صاحب! مجھے اپنا مستقبل اور بنانا ہے اور اپنی راتوں کو خود منور کرنا ہے۔ میں اقبال کا شاہین ہوں۔ رانی کھیت کی جاں بلب مرغی نہیں ہوں۔ میں امیں! میں گھوں گھوں گھوں..... جھا جھا جھا.....“

چودھری رشید نے بڑے سادہ دارن طریق پر کہا ”چلئے آج جمعہ تو وہیں پڑھ لیتے ہیں۔ کھانا کھا کر آجائیں گے۔“

میرا چودھری صاحب کے ساتھ ایک کام پھنسا ہوا تھا اس لیے میں مجبور ہو گیا۔ کمرے سے اٹھ کر کرائی ہوئی لکائی اور چودھری صاحب کو رہنمائی کے طور پر ساتھ بٹھا کر آگے نکل گئے۔

نمبر کنارے چلتے چلتے جب دھرم پورے کا پل آیا تو چودھری صاحب نے دائیں مڑنے کو کہا۔ دائیں مڑ کر میں نے سامنے نظر ڈالی تو ایک چھوٹا سا گروہ دھول بجاتا دھمال ڈالتا سبز چادر ہاتھوں میں تانے میاں میر صاحب کی درگا پر چڑھاوا چڑھانے جا رہا تھا۔ میں نے معنی خیز نظروں سے چودھری صاحب کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا زیادہ دور نہیں۔ بس سامنے ہی ہے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں وہ سامنا بھی آ گیا۔

میاں میر صاحب کے آستانے کو اندر کی طرف جانے والی سڑک کے سامنے ایک بڑا سا کالا بورڈ لگا تھا جس پر جلی الفاظ میں لکھا تھا ”نور والوں کا ڈیرہ۔“

یہ دو ڈھائی کنال کا مربع نما قطعہ زمین تھا جس کے ارد گرد پختہ اینٹوں کی چار دیواری تھی۔ سامنے سڑک کی جانب دیوار مشکل سے دو ڈھائی فٹ اونچی ہو گی لیکن پہلوؤں کی جانب چار دیواری قد ام اونچی تھی۔ اس چار دیواری کے اندر چھتر اور پھونس کی جھوپڑیاں تھیں جو بیشتر چار دیواری کی بیک پر بنی ہوئی تھیں۔ یہیں بائیں ہاتھ پر ڈوہنگا کوٹھا تھا جو زمین سے ڈھائی تین فٹ نیچے تھا اور جس کے اندر چھت پر کزیوں میں کندے ڈال کر ہاتھ سے کھینچنے کا پنکھا لگا یا گیا تھا۔

اس ڈوہنگے کوٹھے کے ساتھ ایک چھوٹا سا ڈھارا تھا جس میں چار پانچ بکریاں بندھی تھیں۔ اس ڈھارے کے ساتھ ایک کھلا پتھر تھا جس میں دو بڑے بڑے چولہے تھے اور کھانے پکانے کے برتن رکھے تھے یہ ڈیرے کا لنگر تھا جہاں دن رات آگ بھتیگی اور ہر وقت کچھ نہ کچھ پکنا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ سیکرٹری صاحب کی جھگی تھی۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا موٹا اور مضبوط چھتر کا کوٹھا تھا۔ لیکن یہ تفصیل تو مجھے بعد میں معلوم ہوئی جب میں نے باقاعدگی سے وہاں جانا شروع کیا۔ اس روز تو ہم ایک کھلے اور لمبے چبوترے پر جا کر بیٹھ گئے تھے جہاں دو تین چار پائیاں آڑی ترچھی پڑی تھیں اور ایک پھٹی پرانی دری اور موٹا سا پرانا قالین قبلے کی میزہ میں بچھے ہوئے تھے۔ کچھ آدمی چار پائیوں پر بیٹھے تھے اور کچھ قالین پر۔ ایک دو نفل بٹنے میں مشغول تھے۔

چودھری صاحب نے ایک ایک آدمی کے ساتھ باری باری دونوں ہاتھوں والا مصافحہ کیا اور پھر اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ ساتھ ساتھ میرا نام بھی بتاتے گئے اور میں بھی ان سے مصافحہ کرتا گیا۔ گرے سوٹ کے اندر میری سرخ ڈبیل اور بیل کے چمکدار بٹنوں والی واسٹ کو بھی حیرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے کہا ”ڈاکٹر صاحب آئے! ڈاکٹر صاحب آگئے۔“ اور سب اپنی اپنی جگہوں پر چوکس ہو گئے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اکیرے بدن کا ایک نوجوان سیاہ ڈاڑھی تیل سے چمکائے سنہرے فریم کا چشمہ اور اونچی دیواروں کی جناح کیپ نما ٹوپی سر پر لگائے خراماں خراماں ہماری جانب آرہا تھا۔ اس کے کپڑوں میں صرف کھف لگی سفید شلوار نمایاں تھی۔ باقی سب کچھ ایک چترالی کوٹ نے اپنی پلیٹ میں لے رکھا تھا جس کا رنگ گہرا براؤن تھا اور جو کہیں کہیں پہلی جھلک بھی دے رہا تھا۔ چودھری صاحب ڈاکٹر صاحب کی طرف لپٹا اور بڑی سیر دہی کے ساتھ ان سے ملے۔ جھک کر مصافحہ کیا اور پیچھے پلٹ کر قدرے اونچی آواز میں ان سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر صاحب نے لمحہ بھر ٹھٹک کر میری طرف دیکھا۔ ڈار کے۔ بیڑل بلاڈ کے ایک سینڈل کے ہزارویں حصے میں مجھے جانتا اور پھر بڑی خند دیکھنی تھی ان کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھا دیئے۔

یہ میری اور ڈاکٹر صاحب کی پہلی ملاقات تھی اور ہم نے اپنی پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کو پسند کر لیا تھا۔ ہم نے دو مختلف چار پائیوں پر آسنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے سے باتیں شروع کر دیں اور تھوڑی ہی مدت میں کئی موضوعات الاٹک گئے۔ ڈاکٹر صاحب کو بات کرنے کا بڑا اسلیقہ تھا۔ ان کا انداز بیاں مربوط اور ادائیگی تسلسل انگیز تھی۔ ہر بات دہی کی دہلی میں لپٹی ہوتی جس سے سننے والا نہ تو چوکنہ ہوتا اور نہ ہی اپنے آپ کو مضروب و دہل خیال کرتا۔ انہیں مزاح کی توجہ جذب کرنے کا بڑا ملکہ حاصل تھا جیسے کمرے کے پیچھے لمبے برآمدے میں کوئی جھانجھ بجا کر چل رہا ہو اور کمرے کے جالی والے روشندان سے جھنک جھنک کی قدم قدم آواز دم بدم آرہی ہو۔ ان کا چہرہ تانے کے لٹیچو کی طرح مضبوط اور ان کی آنکھیں بہت گہرے اتر جانے کی غماز تھیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن وہ ان کی اپنی تھی۔ حکم کے وقت گئی تھی کہ ”کسی کو اپنے قدم سے مرعوب نہیں کرنا۔ ہمیشہ مسکراتے رہنا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب سے میرے بارے میں میرے دفتر کے بارے میں اور اردو کے مستقبل کے بارے میں پوچھتے رہے اور میری وضاحت کے دوران ان ساری چیزوں کو اپنے ایک ایک فقرے کی نگور سے کم اہم بناتے گئے جو میرے نزدیک

بہت ہی اہم تھیں۔ میں اس چیز کا عادی نہیں تھا اس لیے میں نے ڈاکٹر صاحب کے ان جینکوں کو پہلی ہی ملاقات میں ہار کر لیا جنہیں لوگ عام طور پر پسند نہیں کیا کرتے۔ میں نے سوچا ان کے ساتھ خوب رہے گی اور چونچا چونچی میں لطف اکرے گا۔

میں اور ڈاکٹر صاحب مصروف گفتگو تھے کہ سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب بھی جلدی اٹھے اور فرمانے لگے "حضور آ گئے۔" میں نے مزید دیکھا وہاں "حضور" قسم کے کوئی بھی صاحب نہ تھے البتہ خوبصورت اور مسکراتا ہوا بابا کھڑا تھا جس نے سر پر چوگوشی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ گھنٹوں تک گرم فلائین کا لباس کرتے تھے۔ لال پٹی والا شرکا تہ بند بہت سی جیبوں والی ایک واسٹ اور گھٹے میں ایک نیم گرم صاف گہرے سرخ رنگ کا۔ موٹے موٹے پاؤں میں پرانی وضع کے چری سلپرز تھے۔ میں نے اس حضور کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس بابا کے زیادہ خوبصورت مرد میں نے اپنی زندگی میں اس وقت تک نہ دیکھا تھا۔ میں گل حمید صدر ایوب خان اور ولایتی کے کسی سے بڑا متاثر تھا لیکن یہ صورت تو کچھ اور ہی تھی۔ ایسا حسن مجھے کسی وجود پر کسی تصویر میں کبھی خواب میں بھی نظر نہ آیا تھا۔ میری سٹی گم ہو گئی۔ چودھری صاحب نے سر جھکا کر کہا "حضور یہ ہمارے اشفاق صاحب ہیں۔ اشفاق احمد صاحب۔" حضور نے ایک مکھم سانحہ لگایا "نور والے" اور پھر تالی بجا کر بولے "رحمتاں والے برکتاں والے۔ خدایا مہمان لوڈ جی یہ اشفاق صاحب بھی ہمارے جانی جان ہیں۔ نور والے۔"

میرے مصافحے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ ویسے ہی رہ گئے اور آپ نے میرا کندھا تھپتھا کر کہا "آتے جا رہا کریں۔ بزرگان دین سے میل جول رکھیں۔ رحمتوں والے برکتوں والے۔"

اتنے میں کسی نے پوچھا "حضور جمعہ کی اذان کہیں؟"

فرمایا "اشفاق صاحب کو کھانا کھلا دیا ہے؟"

میں نے عرض کیا "حضور کوئی جلدی نہیں جمعہ کے بعد کھالیں گے۔"

فرمایا "جمعہ کے ادب میں کہہ رہے ہو یا ابھی بھوک نہیں۔"

میں نے کہا "جناب کوئی خاص وجہ نہیں۔ بس بعد میں ہی سہی۔"

باباجی نے اشارہ دیا۔ رضا صاحب نے اذان دینی شروع کی اور ہم جہاں کھڑے تھے ویسے ہی کھڑے رہے۔ جمعہ ڈاکٹر صاحب نے پڑھایا اور جمعہ پڑھنے کے بعد ہم سب لنگری طرف روانہ ہو گئے۔ لنگر کے پاس پہنچ کر باباجی نے ڈاکٹر صاحب سے کہا "پت! آپ اندر چلیں بڑے کوٹھے میں مہمانوں کو بھی وہیں لے چلیں۔ سیکرٹری صاحب! اظہر صاحب حاجی صاحب۔ سب لوگ وہیں چلیں وہیں بیٹھیں۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے باباجی کے ڈومنگے کوٹھے کے اندر قدم رکھا۔ باہر سے مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا تھا کہ یہ کمرہ گہرا ہے اور اس کا فرش باہر کی سطح سے ڈھائی تین فٹ گہرا ہے اور اس کے اندر اترنے کے لیے دبلیز کے ساتھ ڈھلوانی بھر کا زینہ بنا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد وہ خود کمرے میں اترے۔ ان کے بعد

چودھری صاحب اور پھر آہستہ آہستہ سبھی لوگ اندر آ گئے۔

اندرا چھا خاصا اندر تھا اور دروازے سے کبھی ہوئی تار کے ساتھ بجلی کا ایک مدہم سا لائٹ روشن تھا جو مشکل سے چالیس کینڈل پاور کا ہوگا۔ کوٹھے کے اندر دروازے کے ساتھ ساتھ دو رنگ کسٹری ڈبے ڈولن بوریاں تھیلے اور ڈرم بڑے تھے جن کے اندر اجناس "گڑ" تیل "چار مرے" مٹھائیاں کھانے چھوہارے اور کھانے پکانے کے مسالے رکھے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ لگے ان تھیلوں بوروں کے ساتھ ساتھ بے شمار بستر پڑے تھے اور کونے میں تین چار کھائیاں کھڑی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے دروازے کے عین سامنے کمرے کے زیادہ منور حصے میں جہاں ایک پرانا مکبل اور اس کے ساتھ ایک کہنرتی بچھی ہوئی تھی ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا اور خود بھی ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ ایک سبز پوش بزرگ جن کا لمبا کرتہ اور جھاڑو دیتی دھوتی دونوں ہی گہرے سبز رنگ کے تھے پلاسٹک کا ایک تہہ شدہ دسترخوان لے کر آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سبز پوش بزرگ کا تعارف یہ کہہ کر کیا کہ "اس مخلوق کا نام بابا جلال ہے اور آپ اس ڈیرے کے ناسی اور ڈر کو کون میں سے ایک ہیں۔" میں نے چہرہ اٹھا کر بابا جلال کی طرف دیکھا تو نہ وہ مجھے ناسی نظر آئے اور نہ ہی شرک الہیہ ان کی حیثیت عرفی میں ان دو انگریزی الفاظ کے استعمال سے ان کی شکل بڑی مضحکہ خیز ہو گئی جہاں انہوں نے چھوٹے سے ٹیبلٹ جیسے چہرے پر بہت لمبی مہر دار ڈاڑھی لٹکا رکھی تھی اور حریری چوگوشی ٹوپی کے ساتھ پیپر کپ لگا کر ایک عام سا پھول ہاک رکھا تھا۔ جب دسترخوان بچھ گیا تو بڑی عمر کے ایک اور بزرگ پانی کا جگ اور شین لیس سٹیل کے گلاس لے کر آ گئے۔ بڑے مضبوط جتنے کے بزرگ تھے اور ڈیرے کے خادم کھائی نہیں دیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "مہر صاحب روٹی کھائی ہے؟" تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا "جی جناب کھائی ہے!"

"پھر اب کیا ارادہ ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"جس طرح جناب ارشاد فرمائیں۔" انہوں نے کہا۔

"تو پھر آپ چلیں۔" ڈاکٹر صاحب نے رکھائی ہے کہا "دیر ہو رہی ہے۔ لمبا فاصلہ ہے اور آپ کی سواری بھی قابلِ اعتماد نہیں۔"

"بہت بہتر جناب!" انہوں نے نیاز مندی سے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

اتنے میں بابا جلال ڈوگنوں پلٹنوں پچھوں اور روٹیوں کا تھال بھرے اندر آ گیا اور اپنا تھال دسترخوان پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک ایک کر کے پلٹیں مہمانوں کے آگے چنیں روٹیوں والا چوخاندہ مال نکال کر درمیان میں رکھا اور دونوں ڈوگنوں کے ڈھکنے کھول دیئے۔ شام گوشت پکا تھا اور گرم گرم شوربے سے بھاپیں اٹھ رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے میری پلیٹ میں آدھ آدھ پاؤ کی دو بوٹیاں دتی کی ایک لمبی سی تلی اور چونسے والی ہڈی کا ایک چمچا ڈال دیا۔ میں نے بہتر اشتهار چھایا۔ نہ نہ کی۔ تھالی آگے سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے اور کوئی سیر بھر ملے میری رکابی میں ڈال دیا۔

بادشاہوں نے بڑھے کو اس گھوڑے کی منہ لگی قیمت دینے کا وعدہ کیا۔ اپنی اپنی سلطنتوں کے پسندیدہ قطعے اس کے ہام کرنے کا یقین دلایا لیکن وہ بڑھا نہ مانا اور یہی کہتا رہا "بادشاہ سلامت! یہ گھوڑا نہیں ایک شخص ہے۔ میرے گھر کا رکن ہے۔ ایک فرد ہے۔ میں اس کس طرح سے بیچ سکتا ہوں۔ کیسے اپنے گھر کے ایک فرد کا سودا کر سکتا ہوں۔ مجھے جان کی دال دے کر معاف کیا جائے اور میری حفاظت فرمائی جائے۔"

بڑھا غریب تھا اور غریب کو ہر طرح کا لالچ ہوتا ہے اور ہر غریب اپنی زندگی جلد سے جلد بتانے کے لیے دن رات سیمیں بنایا کرتا ہے لیکن یہ بڑھا کچھ حق قسم کا بڑھا تھا۔ اس کو اپنی زندگی بتانے اور زندگی کی لیٹ نکالنے کا بالکل ذوق نہیں تھا۔ اس نے ہر مرتبہ گھوڑا بیچنے سے انکار کر دیا۔

ایک صبح جب وہ اٹھا تو اس نے دیکھا کہ سفید گھوڑا اپنے کونٹے میں نہیں ہے اور تھوڑی دور کے بعد اس کے سموں کے نشان بھی غائب ہیں۔ گاؤں کے لوگوں نے اسے اسٹھے ہو کر اس بوڑھے پر لعن طعن کی اور ایک زبان ہو کر کہا "کنکے جھڑوس ب فوش ہے جب تجھے اس گھوڑے کی منہ لگی رقم ملتی تھی۔ زمینیں مرے اور ہیرے جواہرات ملتے تھے تو نے انکار کر دیا۔ اب اچھا رہا ہے کہ گھوڑا بھی گیا اور ہاتھ بھی خالی رہے۔"

بوڑھے نے کہا "دیکھ لو۔"

لوگوں نے کہا "بدقسمت انسان ہیں پہلے ہی سے معلوم تھا کہ گھوڑا ایک نے ایک دن چوری ہو جائے گا اور تو اچھا مارہ جائے گا۔ آخر تیرے جیسا کنکلا جسے ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے میسر ہوتی ہے اس قدر قیمتی گھوڑے کی حفاظت کیونکر کر سکتا تھا۔ اچھا ہی ہوا تیری یہی سزا ہونی چاہیے تھی۔"

بوڑھے نے کہا "اتنی دور کیوں جاتے ہو اور ایسی اسی تحسین کیوں نکالتے ہو۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ گھوڑا اپنے تھان پر نہیں ہے۔ کونٹے کا دروازہ کھلا ہے اور گھوڑا انا موجود ہے۔ اتنی بات تو حقیقت سے تعلق رکھتی ہے باقی سب طردہ اور اندازے ہیں۔ اس میں بد قسمتی یا کم قسمتی کی کیا بات ہے۔ کیوں مجھے طعن سے دیتے ہو اور کیوں مجھے برا بھلا کہتے ہو اور یہ نتیجہ کدھر سے نکالتے ہو کہ یہ بد قسمتی کی بات ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ گھوڑا تھا۔ اب نہیں ہے۔"

لوگوں نے کہا "بد نصیب بڑھے ہم کوئی فلسفی یا عالم فاضل لوگ تو نہیں ہیں البتہ تجھ سے سیانے ہیں۔ امور رکھا ہو گی کی بات ہے جسے ایک بچہ بھی سمجھتا ہے کہ پہلے تیرے پاس ایک بیش بہا خزانہ تھا۔ اب نہیں رہا۔ اس سے زیادہ بد قسمتی کی بات اور کیا ہوگی۔"

بڑھے نے سر جھٹک کر کہا "آپ چاہے کچھ بھی کر لیں میں آپ لوگوں کے منہ نہیں لگوں گا لیکن اپنی بات میں بڑھی دھڑاؤں کا اور آخری دم تک اس پر قائم رہوں گا کہ کوٹھا خالی ہے اور گھوڑا اچلا گیا ہے۔ باقی اور میں کچھ نہیں جانتا کہ یہ فوش قسمتی ہے یا بد قسمتی ہے۔ نفع ہے یا نقصان ہے۔ بہتری ہے یا بر بادی ہے۔ گھوڑے کا چلے جانا کسی پوری بات کا ایک حصہ ہے پوری بات نہیں ہے یہ نہیں پوری بات کیا ہے اور اصل حقیقت کیا ہے۔"

لوگ ہنسے اور انہوں نے بوڑھے کا ٹھٹھا اڑایا کہ بڑھا پاگل ہو گیا ہے۔ سیانوں نے کہا کہ اتنے بڑے نقصان پر

آرام کرنے کی اجازت عنایت فرمائیں تو مجھ پر احسان ہوگا۔ انہوں نے بڑی خوشی سے اور خوشدلی سے اجازت دے دی اور میں کنستروں، ڈبوں، پوریوں اور اچار کے مرتبانوں کے درمیان ایک چار پائی پر لیٹ گیا۔

میرا اس وقت کا لیٹنا کچھ اس طرح کا تھا گویا میں غسل کے تختے پر لیٹا ہوا ہوں اور میرے گرد یہ کنستروں، ڈبوں، پوریوں اور اچار کے مرتبان گرم پانی سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں کا فور، عرق، گلاب اور نیم کے پتوں کا ابلا ہوا پانی شامل ہے اور ان سے ابلی مجھے غسل دیا جاتا ہے۔ ارد گرد کے لوگوں کی آوازیں میرے کانوں میں آ رہی ہیں لیکن وہ خود میرے قریب نہیں آ رہے۔ ان سب کو خصال کا انتظار ہے جو ابھی تک پہنچا نہیں ہے اور اس کے بیٹے نے آ کر بتایا ہے کہ اباجی کھانا کھا کر سو گئے ہیں اس لیے کوئی آدھ گھنٹے تک آئیں گے۔

جب میں سو کر اٹھا تو گہری شام ہو چکی تھی۔ ڈوبنے کوٹھے کے اندر میری چار پائی سے ڈرا اور چونکھیا دیا ہل رہا تھا اور باہر سے لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اٹھ بیٹھا اور چار پائی سے ٹانگیں نیچے اتار کر سو پنے لگا کہ آج یہ میرے ساتھ کیا ہوا!

میرا خیال ہے کہ خرکاروں کے کپ میں سپلائی کیا جانے والا لڑکا جب پہلی مرتبہ سو کر اٹھا ہوگا تو اس کے ذہن میں بھی ایسے ہی خیال آتے ہوں گے۔ میں نے نیلی کناری والے ٹانے کے تھوک جو سوتے میں کھلنے کے برابر ڈھیلہ ہو گیا تھا پھر کس کر باندھا اور باہر آ گیا۔

باہر ڈیرے پر روشنی ہو چکی تھی اور لوگ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بے شام کا کھانا کھا رہے تھے۔

ایک روز یوں ہوا کہ ابن انشا کراچی سے آیا اور مجھے ایک کہانی سنانے لگا۔ اُسے چین سے اور چین کے پراچین ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اُس نے کچھ چینی نظموں اور کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا تھا اور کچھ چھوٹے چھوٹے چینی ملفوظات کو نظم یا بھی تھا۔ اُس روز انشا جی کے اچانک کہانی شروع کر دینے کی کوئی خاص وجہ مجھے معلوم نہ ہو سکی۔ بس اسی قدر خیال رہا کہ انہوں نے تازہ تازہ کہیں سے پڑھی ہوگی اس لیے مجھے سنانے پر مجبور ہو گئے۔

بولے: چین کے ایک گاؤں میں ایک بڑھا چینی رہتا تھا جس کے پاس نہ کھانے کو پوری روٹی تھی اور نہ تو ڈھانچے کو پورا کپڑا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس عہد کے بادشاہ بھی اس سے رشک کرتے تھے اور اس کی خوش قسمتی کے تذکرے اپنے درباروں میں کیا کرتے تھے۔ اس بڑھے کے پاس ایک نہایت ہی خوبصورت سفید گھوڑا تھا جس کا عالی شان عہد کی ساری دنیا میں اور کہیں نہیں تھا۔ ایسا خوبصورت، صحت مند جو اس سال اور کچھ قدموں کا گھوڑا جب جنگل سے شام کے وقت گاؤں میں داخل ہوتا تو یوں محسوس ہوتا گویا بادل کا ایک بڑا سا سفید ٹکڑا آسمانوں سے اتر کر آبادی کے اندر چلا آنا ہے اور لوگوں کے درمیان رحمتیں بکھیرتا جا رہا ہے۔

کوئی بھی پاگل ہو سکتا ہے۔ یہ بیچارہ تو ایک مفلس اور قلاش بڑھا ہے۔ اس کا کوئی تصور نہیں! اور سیانوں کی بات بھی درست جو شخص اس بڑھاپے میں جنگل سے لکڑیاں چن چن کر لاتا ہو اور گھر گھر جا کر بیچتا ہو کہ رات کی روٹی کے لیے لکڑی والوں کے لیے مٹی بھرا نا آجائے اس کا اتنا بڑا فائدہ نہ ملے تو اسے پاگل ہی ہونا ہوا۔

اکیس دن بعد آدھی رات کے وقت بڑھے کا سفید گھوڑا واپس آ گیا۔ دراصل وہ چوری نہیں ہوا تھا، رات بھر جنگل کی طرف نکل گیا تھا اور دور کہیں نامعلوم وادیوں میں اتر گیا تھا۔ اکیس دن کی دشت نوردی کے بعد جب وہ گھر واپس آیا تو اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ بارہ جنگلی گھوڑوں کا ایک غول تھا جن کے حسن اور جوانی پر نگاہیں نہیں نکلتی تھیں۔

گاؤں کے لوگ پھر بڑھے کے دروازے پر جمع ہو کر کہنے لگے "بڑے میاں واقعی تم سچے تھے اور ہم گھوڑے کا چلے جانا بد قسمتی نہیں تھی بلکہ خوش قسمتی تھی۔ بہت بڑی خوش قسمتی۔ ایسے خوبصورت اور اعلیٰ درجے کے گھوڑے کسی شہنشاہ کے اصطبل میں بھی نہ ہوں گے۔ ہم لوگ تم سے اپنے کہے کی معافی مانگتے آئے ہیں اور آپ کو آپ کی خوش قسمتی پر مبارکباد دینے آئے ہیں۔"

بڑھے نے ہنس کر کہا "اب کی بار پھر آپ اپنے اختیار سے باہر نکلے جا رہے ہیں اور ایک مرتبہ پھر اپنی مفروضوں اور اندازوں میں گھر کر بات کر رہے ہیں اور حقیقت صرف اسی قدر ہے کہ گھوڑا چلا گیا تھا اب واپس آ گیا ہے اور جو واپس آیا ہے تو اپنے ساتھ بارہ گھوڑے اور لے آیا ہے۔ اس واقعہ پر ہم کوئی فیصلہ کیونکر دے سکتے ہیں کہ یہ اچھی بات ہے یا بری! خوش قسمتی ہے یا بد قسمتی۔ یہ تو بس ایک خبر ہے۔ ایک ٹوٹا ہے۔ اصل بات اور اصل کل پہنچ گیا ہے۔ پھر میں کس طرح سے کہوں کہ یہ خوش قسمتی ہے یا بد قسمتی۔"

لوگوں نے حیران ہو کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر کہا "جب تک مجھے پوری بات کا طرز ہو جائے سارا کل میرے سامنے نہ آ جائے میں کس طرح سے حکم لگاؤں کہ اچھا ہوا یا برا ہوا۔ میں اپنی کم علمی کی وجہ سے کلا فیصلہ نہیں دے سکتا۔ کوئی تجویز نہیں کر سکتا۔ کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔ میں اپنی بے فیصلگی کے اندر خوش ہوں مجھے ایسا ہی رہنے دیجیے۔"

اس مرتبہ لوگوں نے ڈر کے مارے بڑھے کے ساتھ کوئی بحث نہ کی کہ شاید پہلے کی طرح اب بھی وہ ٹھیک نہ ہو۔ انہوں نے اپنے اپنے سر جھٹکے اور اس کے دروازے سے چلے گئے۔

اس کنگلے بڑھے کا ایک نوجوان بیٹا تھا۔ بہت خوبصورت بڑا ہانکا۔ بڑا چھیلا۔ لڑکیاں اُسے چپ چاپ چپ کر دیکھ کر تھیں اور وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ بڑھے کو بھی یہ بیٹا بہت پیارا تھا۔ ایک تو بڑھاپے کی اولاد دوسرے اکلوتا بیٹا بڑھا اُسے نظر بھر کر دیکھتا بھی نہ تھا۔ اس لڑکے نے ان بارہ جنگلی گھوڑوں کو سدھانے کی شہنائی اور انہیں سواری بنانے کے لیے لگا میں رنے اور پسندے بنانے لگا۔ کھلے باڑے میں تین چار دن کی کوشش کے بعد نوجوان کی محنت پلے پڑنے لگی۔ وہ سفید گھوڑے سے پھدک کر چند قدموں تک جنگلی گھوڑوں پر بھی پیٹھ سواری کرنے لگا۔ ایک روز سب سے منہ زور جنگی اہل نے جوٹھے پر ہاتھ دھرے نہیں دیتا تھا اُس خود نوجوان کو ہوا میں اچھالا اور گدے کی طرح زمین پر پھینک دیا۔ اس کا

ران کی بڑی تین جگہ سے ٹوٹ گئی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔

گاؤں کے لوگ اس خود رو کی معذوری کی خبر سن کر بڑھے کے گھر پر آئے اور افسوس کرنے لگے کہ واقعی آپ ٹھیک کہتے تھے۔ ہم جن گھوڑوں کو ایک نعت غیر مترقبہ سمجھے تھے وہ ایک بہت بڑی زحمت ثابت ہوئی۔ کیا بیٹھے بٹھائے چاند سے گھر کو گھبرا گیا۔ اور وہ بھی اس عمر میں کہ تمہارا آخری پہرا ہے اور یہی تمہاری اکلوتی اولاد ہے۔ جب بڑھاپے کا سہارا ہی کمزور پڑ جائے تو بڑھاپا کس طرح سے بسر ہو۔ پہلے تو تم صرف غریب ہی تھے اب بے سہارا بھی ہو گئے ہو۔

بڑھے نے کہا "بھائیو! آپ پر تو نتیجہ نکالنے کا بھوت سوار ہے اور آپ ہر وقت حتمی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ انی دور نہ جایا کرو اور اتنی دور نہ جاؤ۔ صرف اس قدر کہو کہ لڑکے کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ بس! ہمیں کیا معلوم کہ یہ سہارا ہے یا سہارا نہیں ہے۔ پہلے مضبوط تھا اب معدوم ہے۔ پہلے تو قحطی اب تاسف ہے۔ یہ تو بس ایک خبر ہے۔ ایک ٹوٹا ہے۔ ایک ٹوٹا ہے۔ ایک ٹوٹا ہے اس سے آپ نے پورا کل کیسے تیار کر لیا۔ پوری کہانی کیونکر بنائی!"

پھر بڑھے نے کہا "آپ کا شاید کچھ اور خیال ہو لیکن میرا مشاہدہ اور میرا تجربہ یہ ہے کہ زندگی ہمیشہ ٹکڑوں میں اور ٹوٹوں میں ہوتی ہے اور فیصلہ کل کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ میرے سامنے کل موجود ہی نہیں پھر میں فیصلہ کیسے دوں اور حتمی بات کس طرح سے کروں۔"

اس واقعے کے چند ماہ بعد بڑھے کے ملک پر کسی قریبی بادشاہ نے حملہ کر دیا اور دونوں ملک جنگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ ملک میں جبری بھرتی کا تقاریر بن گیا اور شاہی کارندے گاؤں گاؤں قریہ قریہ جا کر سختندہ لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنے لگے۔ جب وہ بڑھے کے گاؤں پہنچے تو ہر قابل کار مرد کو میدان جنگ میں لے جانے کے لیے رتھوں میں ڈالنے لگے۔ ماسوائے گاؤں کے چند بوڑھوں اور سفید گھوڑے والے بوڑھے کے نوجوان بیٹے کے جس کی ران کی بڑی تین جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔

سارے گاؤں میں کہرام مچا ہوا تھا۔ بوڑھے باپ اور بوڑھی مائیں بین کر رہی تھیں۔ سارا گاؤں سختندہ مردوں سے خالی ہو چکا تھا اور بیویاں اور بہنیں دیواروں کے ساتھ لگ کر ڈھاڑیں مار رہی تھیں۔ روتے سکتے اور کراہتے ہوئے لوگ بڑھے کے دروازے پر پہنچے اور نوحہ کرتے ہوئے بولے "تو واقعی خوش نصیب ہے اور تیرے کرم سب سے اچھے ہیں۔ تیرا نوجوان بیٹا تیری آنکھوں کا نور اور بڑھاپے کا سہارا ہمیشہ کے لیے تیرے پاس رہا اور ہمارے سارے مرد جنگ کی بجلی میں جھونک دیئے گئے۔" پھر انہوں نے اونچے اونچے بین کرتے ہوئے یک زبان ہو کر کہا "یہ جنگ لمبی ہو گئی ہے اور ہمارے محاذ پر گھمسان کارن پڑا ہے۔ ہمارے لوگوں میں سے کوئی بھی واپس نہیں آئے گا اور تم اپنے بیٹے کے ساتھ آرام کی زندگی بسر کرو گے۔"

بوڑھے چڑ کر کہا "تم لوگوں سے بات کرنی فضول ہے۔ تم بات سے بات نکالنے کے عادی ہو گئے ہو اور آگے اُٹھ کے چلے جاتے ہو۔ خود ہی نتیجہ نکالنے ہو اور خود ہی فیصلہ صادر کرتے ہو اور آپ ہی حکم بن بیٹھے ہو۔ بات صرف اتنی ہے کہ تمہارے گھروں کے مرد جنگ پر بھیج دیئے گئے ہیں اور میرا بیٹا نہیں لے جایا گیا۔ اب کوئی کس طرح سے کہہ سکتا ہے

کہ یہ خوش قسمتی ہے یا بد قسمتی۔ اتنی چھوٹی سی خبر پر کوئی کس طرح سے فیصلہ دے سکتا ہے کیونکہ پوری حقیقت تو سوائے خدا کے اور کسی کو معلوم ہی نہیں۔“

یہ حکایت سنا کر انشا جی تھوڑی دیر تو خاموش رہے پھر اپنے مخصوص انداز میں میرا کندھا ہلا کر بولے ”میاں بابا سمجھے؟“

میں ابھی بدھا میں تھا تو مسکرا کر بولے ”اس بڑھے کی باتوں میں نہ آ جانا۔ ہر فیصلہ خود ہی کرنا اور ہر نتیجہ خود ہی نکالنا اور نہ شرف انسانی سے محروم ہو جاؤ گے۔ انسان کی عظمت اسی بات میں ہے کہ اُسے اصل حقیقت کا علم ہو یا نہ ہو وہ عقل فضل عطا کرنے میں ذرا بھی احتراز نہ کرے۔ اس بڑھے چینی کے چکر میں نہ پھنس جانا اور اپنے دعویٰ اور فیصلوں کا کلی الاعلان اظہار کرتے رہنا اور نہ دنیا تمہیں جاہل بے علم گاودی اور نالائق سمجھنے لگ جائے گی۔ ویسے تم میں یہ آثار شرم سے موجود ہیں اور تم نے ان کا مدا کرنے کی کوئی ترکیب نہیں ڈھونڈی۔“

ایک روز یوں ہوا کہ میں اپنے دفتر میں ہونے والی ایک میٹنگ کے درمیان کچھ گڑبڑا سا گیا اور میٹنگ کی فریکوئنسی سے نکل گیا۔ سارے صوبوں کے دو دو نمائندہ کالرمیز کے گرد جمع تھے اور بورڈ کے کسی آئندہ منصوبے پر ہوا درمندی کے ساتھ بحث کر رہے تھے۔ میں کچھ گھبرا سا گیا اور ان سے کچھ کہے سے بغیر موڑ لے کر دفتر سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر تو میں بے مقصد ادھر ادھر گھومتا رہا پھر اچانک میرے ذہن میں بابا جی کا خیال ایسے ابھرا جیسے کسی نے میرے دماغ کے اندر انگلی بڑھا کر گھنٹی بجائی ہو اور مجھے طلب فرمایا ہو۔

حضرت سائیں فضل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ چوہے کے پاس موٹر سے پریشیے ایلومونیم کے بڑے دیکھے میٹر کڑ چھلا رہے تھے اور نیچے جھک جھک کر آگ ملاحظہ فرما رہے تھے۔ میں چپتر کے ایک کونے میں اینٹوں کی برکی سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور حضور کو دیکھنے لگا۔

ذیرے کے سب لوگ بابا جی کو حضور کہہ کر پکارتے تھے اور اسی نام سے ان کا ذکر کرتے تھے۔ مجھے اس لفظ سے کچھ ایسی وابستگی تھی کہ میں انہیں کبھی بھی اس القاب سے یاد نہ کر سکا اور ہمیشہ رکا رکسا رہا۔ ایک مرتبہ میں نے ان کی خدمت میں عرض کی کہ اگر میں انہیں حضور کے بجائے صرف بابا جی کہہ کر بلایا کروں تو انہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔ میری درخواست سن کر بابا جی کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور انہوں نے لہک کر تالی بجاتے ہوئے کہا ”لوؤئی۔ بابا جی... جس لفظ کو سننے کے لیے ہماری طبیعت دیر کی خواہشمند تھی اس کا اذن اشفاق صاحب کو مل گیا ہے۔“ پھر آہستہ سے فرمانے لگے ”جب تک اوپر سے اجازت نہ ہو خطاب نیچے اتر ہی نہیں سکتا۔ آج سے ہم آپ ہی کے بابا جی نہیں کہیں گے۔“ بابا جی ہیں۔“

لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ جب مجھے ”بابا جی“ کہنے کی اجازت مل گئی تو میرا دل ”حضور“ کہنے کو تر پنے لگا اور میں اپنے ہی تقاضے کے پسندے کا شکار بن گیا۔

لنگر خانے کے چپتر کی برجی سے لگے لگے میں نے آہستہ سے کہا ”حضور“ اور میرے اندر سے نہیں نہیں کرتے لنگروں کا ایک اتنا بڑا غول نکلا کہ دنیا کے بڑے سے بڑے جنگل نے آج تک اتنی بڑی تعداد میں اتنا زیادہ شور مچانے والے طوطوں کا ایسا جھنڈ کبھی نہیں دیکھا۔ دراصل ڈیرہ پاک کے گرد چکر لگانے والے طوطوں کا یہ جھنڈ مجھے شرمندہ کر رہا تھا کہ جس لفظ کی ادائیگی سے تم آج تک بچتے رہے تھے خوش ہوتے رہے تھے اور اپنے رویے پر ناز کرتے رہے تھے وہ بت کس طرح سے خود بخود دمنہ کے بل گر کے سجدہ ریز ہو گیا ہے۔ ایک ایسے شخص کے سامنے جو بڑھا لکھا نہیں۔ صاحب جادو حتم نہیں۔ طاقتور نہیں۔ کسی فوجی سیاسی نظریاتی ثروتی، شرفانی سلسلے سے منسلک نہیں۔ کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتا بلکہ کچھ بھی نہیں۔ کچھ کوٹھے میں رہتا ہے۔ کچھ کھانے کھانا اور کھاتا ہے اور جس کے سامنے کوئی کچا نہیں پڑتا شرمندہ نہیں ہوتا۔ خوف نہیں کھاتا۔ پھر میں کیوں اس کے سامنے عاجزی کا اور ادب کا اور سپردگی کا اعلان کروں۔ میں جو ایک اکائی ہوں۔ ایک کل ہوں۔ ایک پورا فرد ایک پوری دنیا ہوں۔ میں کیوں اس کو اپنے سے بہتر اپنے سے اعلیٰ اپنے سے برتر جانوں۔ میں ایک صاحب حیثیت صاحب الرائے صاحب تعریف اور صاحب سرکار ہوں۔ میں کیوں وہ کچھ کروں جو ان پڑھ جاہل روایت پرست اور قدامت پسند لوگ کرتے ہیں۔

میں نے اپنے علم اور بد بے اور فضیلت اور خاندانی نیک نامی کی شمشیر جو ہر دار نیام سے نکالی اور اُسے فضا میں اوجھا ہاتھ کر کے لہرایا۔ ”ابھی اوکڑا کا اور اس کڑک سے ایک کڑک دار آواز نکلی ”حضور“ بابا جی نے سر اٹھا کر دیکھا اور کڑاچی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور جلدی جلدی تال بجا کر فرمانے لگے ”رحمتاں برکتاں والے شانناں والے۔ ذکر اذکار والے۔ ہمارے جانی جان آگے... آؤ بیٹھے بیٹھو۔ خوشیاں آگئیں روشنیاں پھیل گئیں۔“

میں کچھ کہے سے بغیر سر جھکائے اور کندھے سکڑے ایک قریبی موٹر سے پریشیے گیا اور معذرت کے ان جملوں کو ہاں ہاروں کی طرح بٹھانے لگا جن کے ذریعے میں بابا جی پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ پچھلے چند مہینے میں سرکاری مصروفیتوں کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکا اور میرا زیادہ وقت لاہور سے باہر گزرا۔ میرے سامنے چھوٹی سی گول میز رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا ”آپ ہر وقت یہیں ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس ہمارے ارد گرد اس ڈیرہ پاک پر... آپ فکر نہ کیا کریں اور طبیعت پر بوجھ نہ ڈالائیں اشفاق صاحب... آپ ہر وقت ہمارے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔“

میں کچھ کہنے لگا تو فرمانے لگے ”بیٹا زندگی میں کام ہی اتنے ہوتے ہیں کہ کوشش کے باوجود کھانا نہیں جاتا۔ اپنے پیاروں سے ملا نہیں جاتا لیکن کام کرنے بھی ضروری ہیں۔ ان کا بھی حکم ہے۔ ان کے بھی بڑے درجات ہیں ہر ہمارے پیارے ہمارے جانی جان ہمارے ساتھ ہی ہوتے ہیں ہمارے پاس ہی رہتے ہیں چاہے برس ہا برس تشریف نہ لائیں۔ میں اپنی جگہ شرمندہ ہوں اور معذرت کے لیے مناسب فقرے تلاش کر رہا ہوں اور آپ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی میری خفت دور کیے جاتے ہیں اور مجھ سے ایسے مل رہے ہیں جیسے کل شام ہی میں نے ان کی خدمت میں حاضری

دی ہو۔ میں نے کئی مرتبہ درخواست کی کہ مجھ پر کبھی تو نفرین کیجئے۔ کبھی تو بڑا بھلا کہیے۔ کبھی تو سرنش کیجئے کہ ہاں بھائی بڑے آدمی ہو گئے اب کیوں ہم سے ملنے لگے۔ یا ٹھیک ہے جہاں جہاں بھی رہو خوش رہو۔ تمہاری طرف سے ہٹشٹی ہوا آتی رہے اور ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ فقرانہ آئے صدا کر چلے۔ میں خوش رہو ہم دعا کر چلے۔“

آپ میری باتیں سن کر خوش ہوتے رہے اور چھوٹی چھوٹی تالیاں بجاتے رہے۔ اس روز کدو اور چنے کی دال پکی تھی۔ آپ نے ایک چھوٹی سی رکابی میں خصوصی طور پر خالص گھی کر کا یا اور اس میں کدو دال کڑھی سے ڈال کر میرے سامنے رکھ دی۔ خمیری روٹیاں تھیں۔ چینی کے پیالے میں تازہ بکھن تھا ساتھ پودینے کی چٹنی تھی۔ تازہ کئی ہوئی مولی کے ڈکرے تھے اور آدھ میں میٹھی میٹھی سرخ چائے تھی۔ بھجدرگم اور ملائی کہ تہہ میں لپٹی ہوئی۔

اتنے میں پانچ چھ آدمیوں کا ایک گروہ آ گیا۔ ان کے ساتھ ایک برقع پوش خاتون بھی تھی۔ وہ اپنے ساتھ لنگر کے لیے ایک چھوٹی سی چستکبری بکری لائے تھے۔ سب نے جھک جھک کر باری باری بابا جی کے قدم چھوئے۔ کھٹکی میں دس دس کے نوٹ چھپا کر پیش کیے۔ پھر دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ آپ نے نوٹ واسٹ میں ڈال لیے۔ آواز دے کر بابا جی کو بلایا اور اس گروہ کو بھجدرگم بکری کے بابا جلال کے حوالے کر دیا۔ بابا جلال سب کو ہانکتا ہوا بوڑھی کے نیچے لے گیا اور انہیں بے گئی بھیجی ہوئی چار پائیوں پر بے گئے انداز میں بٹھا دیا۔

بابا جی نے ان لوگوں کے لیے الگ الگ کٹوریوں میں کدو دال ڈال کر اور ساتھ ہی اور پرانی روٹیوں کا چھاپے میں ایک مینار لگا رکھانے کے لیے بھیج دیا۔ میں نے اپنے سامنے کے کھن والے کٹورے کو سرکاتے ہوئے کہا ”بابا جی پر بھی بھجوا دیجئے۔ میں تو کھا چکا۔“

فرمایا ”کوئی بات نہیں پڑا رہے دو۔“

میں نے کہا ”حضور! بابا جلال چٹنی اور مولی تو لے کر ہی نہیں گیا۔“

فرمایا ”کوئی بات نہیں۔ چٹنی مولی بغیر ہی ٹھیک ہے۔“

میں اپنی تجویز پر کچھ شرمندہ سا ہو کر دائیں بائیں دیکھنے لگا تو آپ نے چینی کی ایک پیالی میں آلو بخارے کی میٹھی چٹنی بھر کر اسے میرے سامنے رکھ کر فرمایا ”کھاؤ۔ جگر کے لیے مفید ہے۔“

اس سے پہلے بھی میں نے نوٹ کیا تھا کہ بابا جی مجھ کو اور مجھ جیسے اور ”معزز“ لوگوں کو تو کھانے کے لیے اچھی اور عمدہ چیزیں دیتے تھے لیکن عوام الناس کو اور کم حیثیت لوگوں کو بچا کھچا روکھا پھیکا کھانا برتا دیا کرتے تھے۔ وہ لوگ ایسے سیدھے تھے کہ معمولی قسم کے کھانے کو لے کر بھی ہم سے زیادہ خوش ہوتے اور روٹی رکابی دال اور گلاس ہر شے کو الگ الگ بوسہ دے کر پھر کھانا شروع کرتے۔

ہی میلہ میں ضرور آئیں اور گزشتہ سالوں کی طرح معذرت کر کے ہمیں ٹرخانے کی کوشش نہ کریں۔ یہ دعوت نامہ ہم دونوں کے لیے تھا اور پچھلے تین سال سے اس قسم کے دعوت نامے باقاعدگی سے آرہے تھے۔ کچھ ہماری سستی کچھ مصروفیات کچھ بدلتی اور کچھ زعم لائق تھا ہم ہر مرتبہ معافی مانگ کر معاملہ آگے بڑھا دیتے تھے۔ لیکن اس مرتبہ بانو نے اپنے متاع غرور کا لٹکے کچھ ایسی بیدردی کے ساتھ کھینچا کہ میں نے میلے پر جانے کا ارادہ پکا کر لیا۔ میں نے سوچا کہ دور افتادہ لوگوں کو چونکہ اپنے مشاہیر سے ملنے کا شوق زیادہ ہوتا ہے اس لیے ان کی آرزو پوری کرنے کے لیے ہمیں ہی جانا ہی چاہیے۔

میں کیرے میں قلم ڈالوا لایا اور اپنے ریکارڈ کے لیے چھ نئے کیسٹ بھی خرید لیے۔ بانو نے چار روزہ قیام کے لیے مناسب کپڑے تہہ کر کے بکس میں رکھ لیے اور پڑوس کی لڑکی سے درسی جغرافیہ کی کتاب منگوا کر اس سے ہی کے بارے میں ابتدائی معلومات بھی حاصل کر لیں۔ بانو قدسیہ کی دور دراز سفر پر جانے سے پہلے عالی کے برعکس جغرافیائی اور تاریخی معلومات پہلے حاصل کرتی ہیں۔ عالی سفر سے واپس آ جانے کے بعد انسائیکلو پیڈیہ کھجکال کر دیکھا کرتا ہے کہ وہ کدھ گیا تھا اور کہاں رہا تھا اور کیوں رہا تھا اور اس علاقے کی وجہ شہرت کیا ہے!

سفر سے دو روز پیشتر میں ڈیرے پر سلام کرنے گیا تو بابا جی غسل فرما کر دھوپ میں بیٹھے تھے اور اپنے ہاتھوں اور بازوؤں پر بادام روغن مل رہے تھے۔ میں سلام کر کے پانچٹی پر بیٹھ گیا تو فرمانے لگے ”آج کا دن بھی کیا نورانی دن ہے کہ بڑے بڑے نور والوں سے لمبی لمبی ملاقاتیں ہو گئیں۔ صبح ڈاکٹر غلام علی آئے تھے۔ دوپہر کے وقت حنیف رائے ان کے بعد میاں قادر بخش پھر خانہ غصہ علی اور اب آپ۔ سارا دن ہی روشن ہو گیا۔“ پھر انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ”نور رائے“ کی لاکار بلندی اور ذرا سے پیچھے ہٹ کر بولے ”کھلے ہو کر بیٹھو آرام کے ساتھ۔“

میں ذرا سا کھل کر آرام کے ساتھ ہو بیٹھا تو مسکرا کر بولے ”پوچھو کیا پوچھتے ہو؟“ میں نے کہا ”سرکار پر سوس میں کی جارہا ہوں! میلہ دیکھنے۔ اگر حضور کی طرف سے اجازت ہو تو چار دن کے لیے ہواؤں؟“

فرمایا ”ضرور! ضرور!! لیکن اکیلے نہ جانا بی بی کو بھی ساتھ لے جانا۔ اس کی سیر ہو جائے گی۔“

میں نے کہا ”وہ بھی جاری ہے سرکار کیونکہ میزبانوں نے اسے بھی خصوصی دعوت دی ہے۔“

فرمانے لگے ”سب کا علاقہ بھی نور نور علاقہ ہے۔ لوگ جانوروں سے محبت کرتے ہیں اور ان کو اپنی اولاد کی طرح پالتے ہیں۔ جو جانوروں سے محبت کرتا ہے اس کو انسانوں کے قریب ہو کر رہنے کا علم عطا ہو جاتا ہے خواہ وہ انسان کتنے ہی کڑوے اور کیسے ہی کھردرے کیوں نہ ہوں۔“

میں نے کہا ”حضور! اول تو چار دن حد سے حد پانچ دن بعد واپس آ کر پوری رپورٹ دوں گا اور اس عرصے میں دعا کا طلبگار رہوں گا۔“

فرمایا ”تم سب کے لیے دعا ہی دعا ہے۔ ہر وقت دعا ہر گھڑی دعا۔ ہر آن دعا اللہ آسانیاں عطا فرمائے۔“ میں سلام کر کے مصافحہ کر کے اور گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر چلنے لگا تو سیکرٹری صاحب بابا جی کی مخصوص کنگھی لے کر آگئے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور اپنے اپنے کام سے لگ گئے۔ جب میں غسل خانے کے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سبھی میلہ کے کارکنوں کی طرف سے ہمیں ایک بار پھر دعوت نامہ موصول ہوا کہ اب کیا

آگے سے گزر کر گیسٹ پر پہنچا تو بابا جی نے آواز دے کر مجھے واپس بلا لیا۔ میں انہی قدموں پر پلٹ کر سیدھی راہ جانے کے بجائے چوڑے ٹاپ کرفور آن کے سامنے پہنچ گیا۔

بابا جی نے فرمایا "اشفاق صاحب! سبھی کے لوگوں نے محبت کے جذبے سے مغلوب ہو کر آپ لوگوں کو اپنے پاس بلایا ہے۔ ان کی محبت کا جواب محبت سے دینا اور ان کو علم عطا کرنے نہ بیٹھ جانا۔ بڑھے لکھے لوگ بے علم لوگوں کو اپنے علم کا بوجھ اٹھوانا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ ایسے نہ کرنا بلکہ ان کو اپنی محبت کا میوہ عطا کرنا۔ انہیں انہیں اٹھوانے پر مجبور نہ کر دینا۔"

میں نے کہا "جیسے آپ فرماتے ہیں ویسے ہی ہوگا اور جس طرح سے آپ نے حکم دیا ہے اسی پر عمل ہوگا۔" لیکن اندر ہی اندر میں سوچ رہا تھا کہ محبت تو میرے پاس ہے ہی نہیں وہ میں انہیں کدھر سے لا دوں گا۔ چند قابلے علم کے البتہ میرے پاس موجود ہیں جن میں دسویں علم بھی ہے، ولایت بھی، قدیم بھی اور جدید بھی۔ ان کے چند نمونے میں نے اپنے بریف کیس میں پہلے ہی رکھ لیے ہیں۔ اس کے علاوہ میرے پاس اور کچھ نہیں۔ رہی محبت کی بات تو محبت تو میرے پاس اپنے گھر والوں کو دینے کے لیے نہیں میں سبھی کے لوگوں کو کدھر سے دے دوں گا!

ایک روز یوں ہوا کہ ساہیوال کا سردار سکندر خان اپنی پوری سبج دھج کے ساتھ ڈیرے پر پہنچ گیا اور بابا جی کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھ کر ملازموں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ساتھ اُس کے دونوں بھائی تھے۔ ایک کے ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا اور دوسرے کے ہاتھ پر ایک بھاری بھر کم باز بیضا تھا جس کی آنکھوں پر چڑے کی نوٹی چسپی تھی اور جوہر آواز کے ساتھ گردن گھما کر ادھر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا حالانکہ وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکتا تھا!

میں اور بابو معراج بابا جی کے پاس ملل کا ایک رومال پکڑ کر بیٹھے تھے جس کے دو کونے میرے ہاتھ میں تھے اور دو بابو معراج کے ہاتھ میں۔ بابا جی اُس رومال میں کچھ کاڑھا سا ڈال کر چھان رہے تھے جس کی کشافت کی وجہ سے اُسے لکڑی کی ایک چھتی سے ہلایا جا رہا تھا۔ چوہے سے کاڑھے کی کڑھی بھرنے والے بھی بابا جی تھے اور ملل کی پونی میں لکڑی پھیرنے والے بھی آپ ہی تھے۔ میرا خیال ہے کوئی جوارش تیار ہو رہی تھی یا کوئی رُب بن رہی تھی جسے اُس مرلیضہ کو دینا تھا جو ساتھ والی بکریوں کی کٹھڑی میں ٹوٹی چار پائی پر بیٹھی تھی۔

سردار سکندر خان نے اُسی طرح سینے پر ہاتھ باندھے باندھے سر جھکا کر کہا "حضور میرا دل صاف ہو گیا ہے اور سینہ کھل گیا ہے۔" پھر اس نے ذرا سا اور جھک کر کہا "میرے وجود پر رحمتوں برکتوں کی بارش ہونے لگی ہے۔" اس کے اٹیچی کیس والے گولے نے سر ہلا کر اس حقیقت کی تائید کی اور اٹیچی کیس زمین پر رکھ کر وہ بھی اپنے مالک کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے کے لیے ایسا کرنا مشکل تھا کیونکہ اس کے چڑے کے دستانے پر باز بیٹھا

تھوڑا کافی وزن تھا اور جو ڈیرے کی فضا میں داخل ہونے کے بعد گھبرا سا گیا تھا۔ سردار سکندر خان نے کہا "حضور ساری بدی چھوڑ دی۔ سارے گناہوں سے منہ موڑ لیا۔" بابا جی اسی طرح رومال کی جھولی میں لکڑی پھیر کر جوارش چھاننے رہے اور خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہے۔ سکندر خان نے کہا "حضور سائیں صاحب بدی سے برائی سے اور گناہ سے نفرت اسی درگاہ کا صدقہ اور اسی دربار کا عطیہ ہے۔ آپ کی ایک نگاہ نے مجھ کتے کیلئے کو پاک صاف کر کے نیکی اور ثواب کے اونچے تخت پر بٹھا دیا ہے اور بری ساری دنیا بدل دی ہے۔"

میں نے دیکھا سکندر خان کے اس اعلان کا بابا جی کی طبیعت پر کچھ بوجھ سا پڑ گیا تھا اور وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے روکنا چاہ رہے تھے لیکن ان کے ہاتھ میں چھتی تھی اور چھاننے پٹنے کا بہت سا کام باقی تھا ابھی وہ اپنے ہاتھ کو فارغ نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

سردار سکندر خان نے کہا "حضور بڑے گناہ کیے۔ بڑے عیب کئے، بڑی بربادیاں کیں لیکن اب رحمتوں کے دروازے کھل گئے۔ اب پاکی ہی پاکی ہے۔ صفائی ہی صفائی ہے۔ سارے گناہ چھوڑ دیے۔ سارے کوڑا پر ادھ۔ پاپ کھاس دفع کر دیئے۔ ساری بدی برائی چھوڑ دی سارے گناہ جھاڑ دیئے۔"

بابا جی نے ملل کی پونلی میں لکڑی چلائی چھوڑ کر سر اوپر اٹھایا اور بڑی محبت کے ساتھ کہا "سکندر خان! جہاں اتنا زور لگا کر بدی برائی چھوڑ دی ہے اب یہ نیکی بھی چھوڑ دو اور آزاد ہو جاؤ۔ اس نئے گھمنڈ سے تو وہ پرانے والا تکبر ہی اچھا تھا۔"

سردار سکندر خان بات سمجھے بغیر چھوٹا چھوٹا سر ہلا کر "جو حکم حضور! جو حکم سرکار!" کہتا گیا اور بڑی دیر تک کہتا گیا۔ بابو معراج نے شرارت سے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

ڈیروں پر بڑے بڑے احمق، غبی، بیوقوف، لکڑسے اور دھو تو قسم کے لوگ بھی آتے ہیں اور بڑے شاعر، چالاک، پھر تیلے، خرافات اور کائیاں لوگ بھی آتے ہیں۔ پاکیزگی کی ان محفلوں کے عین درمیان کمال کے خود غرض، مکاڑ، تھر تھرنے، موقع پرست اور خود خواہ بندے بھی جمع ہو جاتے ہیں اور بھونڈے بڑھو، لولے، کملے اور سیدھے لوگ بھی دیواروں اور دروازوں کے ساتھ جگمگاتے لگا لیتے ہیں جس طرح اس بھری پری دنیا میں ہر طرح کے لوگ ساتھ ساتھ آباد ہوتے ہیں اسی طرح سے ڈیروں پر بھی ہوتا ہے۔ ڈیرے اور درگاہیں اس بڑی بڑی دنیا کے چھوٹے نمونے ہوتے ہیں۔ اس وسیع و عریض خاکدان کے کئی ایچہ زار برسٹپ نشان، انگوٹھے، مانیکر فٹس، مانیکر و فلم!

جب چھاننے پٹنے کا کام ختم ہو گیا تو بابا جی نے ہم دونوں کو جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا "جاؤ۔ ادھر جا کر ڈاکٹر صاحب اور سیکرٹری صاحب کے پاس بیٹھو ادھر اور بھی جانی جان جمع ہیں۔"

ہم ادھر بڑے چوڑے پر آکر بیٹھ گئے جہاں ڈاکٹر صاحب اور سیکرٹری صاحب کے ساتھ دو اور جوان بیٹھے تھے جنہیں ہم نے اس لیے پہلے ڈیرے پر نہیں دیکھا تھا۔ اسنے میں رحیم یار خان کا میاں مٹھو بھی آ گیا۔ اس کے ہاتھ

میں کیٹوس کا ایک بڑا ساتھیلا تھا جس کے اندر کچھ ایسی اشیائے خوردنی کا پتہ چلتا تھا جو اپنی چکنائی کی وجہ سے چار دیواری سے باہر نکل پڑتی تھیں۔ میاں مثنوی نے ہم سب سے بڑی تپاک کے ساتھ ملایا اور پھر چوڑی مار کر منہ بند کر دیا۔

میں نیا نیا اس پلٹن میں بھرتی ہوا تھا اور ابھی کچا گروٹ تھا۔ میرے دل میں زندہ رہنے کی آرزو اور ترقی کرنے کی ہوس تھی اور میں ایک ایسے ماحول میں آوارہ ہوا تھا جہاں ان دیکھے خدا کی اندھی پرستش ہوتی تھی اور ہر کام کو مناجات اور سبھا جانا تھا لیکن میرے پاس میری عقل، میری دانش اور میرا تجربہ تھا اور میں ان کے مقابلے میں دنیا کی ہر شے کا بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ میری کیفیت ”نو گرفتار بھڑکتا ہے تہہ دام ابھی“ والی نہیں تھی بلکہ ایک ایسے عقلی انہیم اور دور اندیش رہنما کی سی تھی جو اپنی قوم کو یکایک اپنے معاشرتی گروہ کو زندگی کے ہر شعبے میں ترقی یافتہ دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں ان لوگوں کے بارے میں جاننے کا آرزو بند بھی تھا جو باطن کے مسافر تھے اور جنہوں نے اندر کی منزلیں طے کرنے میں کمال حاصل کیا تھا۔ نرالی وضع کے نرالے رہنے والے پتہ نہیں کوئی ہستی کے باشندے تھے کہ ان کی تاریخ ان کے جغرافیے اور ان کے اذکار میں بلا کی کشش تھی۔ میں نے بڑی دور اپنے وطن کی سرحدوں سے بہت پرے سات سمندر پار ولایت کے علاقوں میں بھی ان کی کہانیاں سنی تھیں اور لائق و دق سمندروں میں جدید ترین جہازوں پر سفر کرتے ہوئے تربیت یافتہ باوردی ملاحوں سے بھی ان کے قصے سنے تھے۔ میں اپنے وطن کے سنجیدہ اور ثقہ ادیبوں کے درمیان ایک ایسے جنمیل لے پالک بچے کی طرح پرورش پا رہا تھا جس کی نگہداشت کا ذمہ معاشرے نے ان کے سر ڈال دیا ہو اور وہ ایک نمک حرام اور ناخلف بچے کو اپنی محبت بھری آغوش میں پال رہے ہوں۔ میرے بزرگ رہنماؤں میں سے میرے استاد و صوفی تہسم میرے محسن و نظامی عابد، امتیازی تاج و ذوالفقار بخاری بطور خاص مجھ سے نالاں تھے کہ اس نے ولایت میں ایسی کامیاب زندگی بسر کرنے کے بعد واپس آ کر ایسی فرسودہ و قیانوس اور پشت الحال روشنی اختیار کر لی کہ بیروں، فقیروں اور بابوں کے ڈیروں کے چکر لگانے شروع کر دیئے اور ان کو بھی اتنا ہی مان دینا شروع کر دیا جتنا صاحبان عقل و دانش اور گیان و ودانوں کو دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بالکل نا آشنا تھے کہ میری کیفیت و صوبی کے کئے کی سی تھی اور میں اپنی تھو تھنی اگلے بچوں پر رکھ کر ہر آنے جانے والے کو دیکھ رہا تھا۔ نہ جھوٹا تھا نہ دم ملاتا تھا۔

حضرت سائیں صاحب بابا جی نور والے نے مجھے پڑھنے کے لیے ایک ذکر دیا تھا۔ اسے اٹھتے بیٹھتے پلٹے پھرتے وضو بے وضو گندے منہ پٹے پاک ناپاک ہر حالت میں اندر ہی اندر پڑھنا تھا اور مست رہنا تھا۔ یہ ورد ”یاودود“ کا ورد تھا اور اس کے ساتھ اندر و شہار کی کوئی پابندی نہیں تھی بس اندر ہی اندر اس ذکر کی لہروں میں پھیلتے جانا تھا اور اسی خوشبو میں اس طرح سے سمٹتے جانا تھا جو پھول کی جان اور نسیم سحری کے اعلان میں ہوتی ہے۔ نظر تو نہیں آتی البتہ اس کی موجودگی کا جاوہر زندہ وجود کو کیلتا رہتا ہے۔

آج میں بابا جی سے اس ذکر کی بات کرنے ہی آیا تھا کہ ایک مہینے کی وظیفہ گزاری کے بعد مجھے اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا اور میں وہیں کا وہیں تھا۔ نہ تو مجھے فضا میں سے پھول اترتے نظر آئے تھے۔ نہ میں آنے والے

واقعات کے آثار سے واقفیت حاصل کر سکا تھا۔ نہ میرے اندر کشف کی کوئی کیفیت پیدا ہوئی تھی اور نہ ہی مرے مالی حالات پہلے کے مقابلے میں بہتر ہوئے تھے۔ البتہ ایک بات ضرور ہوئی تھی کہ مجھے کسی کے بتانے پر اللہ کا یہ پیغام ضرور مل گیا تھا کہ خدا کہتا ہے ”تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا۔“ چنانچہ میں جب تھلپے کے عالم میں ذکر میں مشغول ہوتا تو مجھے صاف پتہ چل جاتا کہ اس وقت اللہ میاں فرشتوں کے ساتھ میرا ذکر کر رہا ہے اور میری بابت کچھ ضروری باتیں طے کر رہا ہے اور میرے ذکر کی وجہ سے عرش معلیٰ پر اس وقت میرا چرچا ہے۔ میں نیچے بیٹھا ”یاودود“، ”یاودود“، ”یاودود“ کے مقابلے میں اور بھی موٹا ہو گیا ہے۔ پہلے جھوٹ کم بولتا تھا اب تحریر میں اور تقریر میں دونوں میں اضافہ کر لیا ہے۔ اب بانو کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایسے ہی الجھ جاتا ہے حالانکہ وہ بڑی شریف اور کہنے کا رلی بی بی ہے۔ ”فرشتے سر جھکائے پر بند بجز وادب کی رنگین مورتوں کی طرح اس گفتگو میں شامل ہیں اور میری وجہ سے خوش ہیں کہ ضروری کا لمبا وقت عطا ہو رہا ہے۔ یہ سوچ کر میں اپنے ذکر کو اور بھی طویل کر دیتا تا کہ اللہ بھی میرا ذکر لمبا کرتا جائے جس طرح حضرت موسیٰ نے اللہ سے کام کرتے ہوئے اپنے مکالے کو بے ضرورت لمبا کھینچ دیا تھا اور اپنے عصا کی صفات بیان کرنا شروع کر دی تھیں ایسے ہی میں لمبے لمبے ورد کرتا!

میرے لیے یہ جس قدر جبرانی، فخر گھمنڈ اور فرحت کی بات تھی کہ میرا ذکر اوپر ہو رہا تھا اور اُسے لمبے سے لمبا کرتے جانا میرے اختیار میں تھا جس ایک ذہنی کی تانت تھی جو میرے اندر بج رہی تھی اور جس کا دوسرا سرا فوق السما کی اور ہی طرب کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ میں آج بابا جی سے اس ذکر کی بات کرنے ہی آیا تھا لیکن پہلے ان کے پاس بابو معراج دین جی تھا پھر اب سردار سکندر خان آ گیا تھا۔ کچھ عورتیں ان سے تعویذ لینے کے انتظار میں بیٹھی تھیں اور ابھی وہ اپنی جوارش بھی پورے طور پر تیار نہیں کر پائے تھے۔

میاں مثنوی حسب سابق ڈاکٹر صاحب کے ساتھ الجھا ہوا تھا اور مولانا روم کے درجات کا تذکرہ کر رہا تھا۔ بیکڑی صاحب بڑی دلچسپی سے ان دونوں کی باتیں سن رہے تھے اور لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ دونوں غلطی پر ہیں اور حقیقت کا اصل راز صرف ان کے پاس ہے۔

میاں مثنوی کہہ رہا تھا ”ڈاکٹر صاحب مجاہدات کے بغیر حجاب کو دور کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آگے بڑھ کر اوپر چڑھ کر پہلا دور لگا کر نہ کھینچنا پڑے گا پھر یہ پردہ اٹھے گا اور پھر ہی سٹیج نمودار ہوگی اور پھر ہی کھیل دکھائی دے گا اور ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے مجاہدے کرنا، روٹین اسٹ لوگوں کا کام ہے۔ کرتی بچوں کا فلسفہ ہے۔ اہل دل مشقت کے حوالے نہیں ہوتے۔“

میاں مثنوی بولا ”اور سب سے بڑا مجاہدان لوگوں میں گھل مل جاتا ہے جو خداوند تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں اس سے بڑا مجاہدہ اور کیا ہوگا کہ انسان صرف صالح دوستوں میں بیٹھے اور ڈاکٹر صاحب! صالح دوستوں کا دیکھنا اس نفس کا گناہ ہونا اور اس نفس کا گناہ کرنا ہے۔“

میں نے کہا ”میاں! میرا صلح دوستوں کے ساتھ دل نہیں لگتا۔ ان کی دوستی میں کوئی رس نہیں ہوتا۔ کوئی بارگاہ اور بد معاشی نہیں ہوتی۔ دلچسپی کی واردات نہیں ہوتی۔ میں ان کے ساتھ کیسے دل لگاؤں.... میرا ذکر تو آج کل اوپر ہوتا ہے لیکن میری اس سے دلچسپی نہیں رہی۔ نہیں رہی کیا۔ میری دلچسپی اُس سے ہوئی نہیں سکی۔ میں اپنا ذکر یہاں سننا چاہتا ہوں۔ یہاں کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے حلقے کے لوگوں میں اپنے حلقے سے ملحق حلقوں میں۔ اپنے دشمنوں میں۔ اپنے عزیز رشتہ داروں اور اپنے شریکے کے لوگوں میں۔ میں حلقہ ارباب ذوق میں اپنا ذکر سننا چاہتا ہوں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین میں اپنا ذکر چاہتا ہوں۔ کتابوں رسالوں تنقیدی مضمونوں میں اپنا نام دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ کالموں میں اپنی صورت کی چھاپ کا خواہشمند ہوں.... میں نے اوپر ذکر کروا کے کیا لیتا ہے!“

”اور اگر اللہ کے یہاں بھی تمہارا ذکر ہوتا رہے تو کوئی بری بات ہے؟“ میاں نے پوچھا۔
میں نے کہا ”دیکھ میاں مجھے اس پر اعتراض تو کوئی نہیں۔ بلکہ میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے لیکن درحقیقت میں اپنا ذکر یادہ ذکر یہاں چاہتا ہوں۔ میں اپنا حلقہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ میں اسی بد رو کے کنارے رہنا چاہتا ہوں جس میں سے ہر وقت بال صفا پوڑ کی بو آتی رہتی ہے۔ اسی گھر کے اندر جس کی نوخیز رواں ہے اور اس کے منہ پر پرانے دستروان کی لہر بندھی ہے۔ انہی لوگوں کے درمیان جوا چھاکھاتے اور مندا بولتے ہیں۔ جو نصیحت کے ڈکار مارتے ہیں اور تکبر کی ریاح میں لوتنے پوتنے رہتے ہیں۔ میں ان کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں حلقہ گنگا مندر کو چھ ماہکیاں کی رہائش ترک کر کے کسی پر بھار کا لونی میں جا کر آباؤ نہیں ہو سکتا۔ میں ایک رائٹر ہوں۔ میرا دل معاشرے کی غلطیوں کی نشاندہی کرنا اور معاشرے کی گندگیوں کا تجربہ کرنا ہے۔ میری نظر دور تک پہنچتی ہے اور ہر کونہ کھدے کا جائزہ لیتی ہے۔ باغ میں کوئی ہوا خوری کے لیے جا رہا ہے۔ کوئی پھول سوگھنے اور پھل کھانے کی غرض سے جاتا ہے۔ کسی کو حسن نگشتاں کھینچ کر اپنے اندر بلا لیتا ہے لیکن سورج جب بھی باغ میں داخل ہوتا ہے سیدھا گندگی کے ڈھیر پر پہنچ کر غلاظت سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیتا ہے۔ میں لطف اندوزی کا مارا ہوا ہوں اور لطف میں رہنا چاہتا ہوں۔“

رسوئی و حارے سے بابا جی کی آواز آئی اور سیکرٹری صاحب جوتی پہنے بغیر ننگے پاؤں ان کی طرف بھاگے۔
میاں مثنوی نے کہا ”اشفاق صاحب اس طرح سے بھاگنے والے لوگ انعام یافتہ ہوتے ہیں۔ صاحب اثمار۔ پھلوں سے لدے ہوئے اور یہ سب معیت کا اثر ہوتا ہے۔ گھٹے ملے ہونے کا۔ ایک ساتھ ہونے کا۔“
میں نے کہا ”میاں مجھے تیری بات سمجھ نہیں آئی تو جب بھی بات کرتا ہے پتیلیوں میں کرتا ہے اور تیری پتیلیاں اصل کی نشاندہی کرنے سے قاصر ہوتی ہیں۔“

میاں ہنس پڑا اور تالی بجا کر بولا ”رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع میں داخل ہونا عاجزوں مسکینوں اور لرزے والوں کے ساتھ ہو کر رہنا ہے۔ کیا تو نے دیکھا؟“ میاں تن کر بیٹھ گیا ”کہ پھل ندر درخت کے ڈالے کو لگتا ہے نہ اس کے مضبوط تنے کو۔ پھل جب بھی لگتا ہے لرزے والی شاخ کو لگتا ہے اور جہاں بھی لگتا ہے کانپتی ہوئی ڈالی کو لگتا ہے۔ جس قدر شاخ رکوع میں جانے والی ہوگی اسی قدر زیادہ پھل کی حامل ہوگی اور فائدہ درخت کو اس کا یہ کہ پھل کی وجہ سے

ابھی کہاڑے سے محفوظ رہتا ہے اور تنا بھی۔ درخت کی بھی عزت ہوتی ہے اور درخت کی وجہ سے سارا باغ بھی موت دار بن جاتا ہے۔“ پھر اُس نے ہنس کر کہا ”کہو کیا ارادہ ہے؟“ میں نے کہا ”میں اپنی ہی گلی میں رہوں گا۔ حلقہ دلی نہیں کروں گا۔“

میری نظروں کے سامنے میرا ایک دوست تھا۔ میرا بہت ہی پیارا اور دلی دوست قدرت اللہ شہاب جو میری طرف سے سامنے حلقہ بدلی کر چکا تھا اور پورے کا پورا اپنے پرانے محلے کا حلقہ گنگا مندر کو چھ ماہکیاں سے نکل کر ایک اور صورت اختیار کر اور خوش نگاہ علاقے میں منتقل ہو چکا تھا۔ ہمیشہ اعلیٰ سے اعلیٰ آکسفورڈ سٹریٹ کا سوٹ زیب تن کیے۔ ہمارے بچن والی سرخ ٹائی سوئے کی پن سے لگائے۔ جیب سے ٹکوتا رومال نکلو کے بچے کی طرح باہر کالے اور کڈ لیدر کے شوز کا پورا زور و قہر مل پر ڈالے وہ اپنی مر سیڈ پر اتنی تیز چلاتا تھا کہ کئی کئی فٹ وہ ہوا میں تیر جاتی تھی۔ لیکن اُس کے اندر اور سے بھی اگلے اندر دل کی آخری کونٹری میں مسلسل ایک تنگی چلتی رہتی تھی جس کی آواز سوائے اُس کے یا اُن ہستیوں کے اور کسی کو نہیں آتی تھی جو اس کا ذکر بڑی بارگاہ میں آرام سے بنا کرتی تھیں۔ وہ بڑا چالاک اور بہت ہی خود غرض انسان تھا۔ ہر وقت ایک چھری اور تسی لے کر اپنے نفس کے پشورے کو ساتھ ساتھ لیے پھرتا کہ جو نبی کوئی مناسب اوٹ نظر آئے اس کے پشورے کو ذبح کر کے امر کی قربان گاہ پر بھیجتا چڑھا دے۔ لیکن اس کی بجائے اُس کے پشورے کی داد دیتا ہوں جو ہر وقت اس کے ہر گھم پر سر جھکاے ”میری ہیڈ اے لیل لیمب“ کی طرح بڑی خوش دلی کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے ہزار ہوتا تھا۔

جب کبھی میں شہاب سے پوچھتا کہ اس دنیا اور اس کی آلاشوں میں پھنسے ہوئے انسان کو خدا کب یاد دہر سکتا ہے تو ہمیشہ ایک ہی جواب دیا کرتا کہ ”میاں! جس طرح ایک شبن سپرد قیدی کو جیل کے اندر رہتے کھاتے پیتے“ سوتے ہاتھ روتے بسوتے“ پانی پیتے“ گھاس اٹھاتے“ کان میں انگلی چلا کر ”خا“ کرتے۔ نظریں اوپر اٹھا کر ہوائی جہاز دیکھتے ہر بات ایک ہی دغدغہ لگا رہتا ہے: پچاسی پھنسے اور سوئی کے رتنے کا! اسی طرح واصل حق کو بھی ایک ہی دغدغہ لگا رہتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے شبن سپرد ہو جاتا ہے۔

ہم دونوں اپنی اپنی بیویوں کو بڑی گرمجوشی کے ساتھ ایک دوسرے سے باتیں کرتے چھوڑ کر کافی پینے نکلے تھے اور شہاب نے اپنی کار کا رخ سری کی طرف موڑ دیا تھا۔ چھوڑ پانی کے قریب اس نے مجھے پریشان ساد کچھ کراتا کہا کہ ”ایک ایک کپ کافی پینے کے بعد ابھی آ جاتے ہیں اور پھر کہیں ان دونوں کو ساتھ لے کر باہر کھانے کو چلتے ہیں۔ خوب مزار ہے“

دوسری کی ایک چھوٹی سی کونجی کے بے حد خوبصورت ڈرائنگ روم میں بڑے ہی قیمتی قالین پر مراقبے کے انداز میں بیٹھی تھی اور تہر کے آخری ہفتے کی سردی ایک پٹی ہوئی بھوی لومڑی کی طرح اس کی دلہیز سے لگی کھڑی تھی۔ ہماری آمد ہال نے اپنی پوری آنکھیں کھول کر ہمیں غور سے دیکھا اور پھر ”کافی شہاب؟“ ”پوچھ کر اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔ شہاب نے کہا ”میرا بہت ہی پیارا دوست ہے اشفاق! اس کے ساتھ میں نے پورے چار دن اور چار راتیں روم کے کوچہ و بازار میں

گھوم کر گزاریں اور پھر میں اپنے گناہ بخشوانے مکہ چلا گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کی مسکراہٹ اور چہرے کی جھلک سے ہلکا سا جھٹکا دے کر کہا ”بس اب رہنے دو“ اور اندر کافی بنانے چلی گئی۔

وہ کوئی اڑتیس چالیس برس کی ایک خوب رو اور خوش قامت خاتون تھی جو کسی دردناک رومانوی ناول کے برآمدے سے نکل کر ساتھ والے دروازے سے اگلے چیمبر میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ اس قدر پروقار پر اسرار اور پرجوش خاتون تھی کہ میں اس کے بارے میں شہاب سے کچھ بھی نہ پوچھ سکا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ کافی کے دوپ بنا کر لائی اور طشت قالین پر رکھتے ہوئے بولی ”میں نے ابھی آپ کے آنے سے کوئی پانچ منٹ پہلے اپنے حصے کی کافی پی لی ہے کیونکہ میرا خیال تھا کہ آپ وقت پر پہنچ جائیں گے لیکن آپ پہنچ نہیں سکے۔“

شہاب نے کہا ”آج کچھ میرا ارادہ نہیں تھا۔ پھر میری گاڑی کی بریکیں بھی کچھ لوظ تھیں اور موسم بھی کوئی بر فریڈی نہیں تھا۔ لیکن گھر سے باہر نکلے تو ارادہ بن گیا۔“

وہ پھر اسی طرح مراقبے کے انداز میں بیٹھ گئی اور شہاب حرم کعبہ کی تفصیلات بیان کرنے لگا۔ بالکل اسی سیدھے اور غیر موثر انداز میں جس طرح پہلی مرتبہ جیاعمرہ پر جانے والے لوگ بیان کرتے ہیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے شہاب کی باتیں سنتی رہی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ان باتوں سے مرعوب نہیں ہوئی اور اس بات کا انتظار کرتی رہی کہ وہ کوئی اور بات کرے اور وہ اپنی آنکھیں کھول کر توجہ سے اس کی بات سنے لیکن شہاب کو اس بات کے علاوہ اور کوئی بات آتی ہی نہیں تھی یا اس کے علاوہ کوئی اور بات کرنے کا حکم ہی نہیں تھا۔ یا اس موضوع کے علاوہ اور سارے موضوعات اس سے سلب کر لیے گئے تھے۔ ایسے ہی اناڑی آدمیوں کی طرح بول رہا تھا اور اتنا سا لگ رہا تھا۔

شہاب میں اور تو سب خوبیاں تھیں لیکن ایک بات بڑی گندی تھی کہ وہ موثر بہت تیز چلاتا تھا اور اس بات کو دھیان نہیں رکھتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی بیٹھا ہوا ہے۔ اترائی میں دھند کاٹ کر جب ہم لارنس کالج سے آگے نکلے تو پھر دھند نے ہمیں گھیر لیا۔ آگے سڑک نظر آنی بند ہو گئی تھی۔ سامنے کا پونے آٹھ کسڑک کا چکر کوئی سو اکلومٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ وہاں سے چکر کاٹ کر سڑک کافی نیچے پہنچ جاتی ہے اور پھر آگے کا سفر آسان اور سیدھا ہو جاتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہماری گاڑی ہوا میں اڑی اور کوئی تین چار سو فٹ تک اسی طرح سے ہوا میں بھرتی ہوئی ”دوچ“ کر کے سڑک پر گری اور آگے کا سیدھا اور آسان سفر شروع ہو گیا۔ شہاب نے مسکرا کر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا ”گھبرا گئے؟“

میں نے کہا ”ہاں!“

فہم کر بولا ”تم سمجھے ہو گے گاڑی ہوا میں اڑ رہی ہے؟“

میں نے کہا ”ہاں۔“

کہنے لگا ”میاں گھماڑ۔ گاڑیاں سڑکوں پر چلانے کے لیے بنائی جاتی ہیں ہوا میں اڑنے کے لیے نہیں۔ انا

نے لیے ہلی کا پڑھتے ہیں یا ہوائی جہاز۔“

میں نے کہا ”پہلے تو اسی طرح سے ہوتا تھا لیکن آج ایک انوکھا مشاہدہ کیا۔ تم کوئی جن وغیرہ تو نہیں ہو۔“

کہنے لگا ”پینڈو آدمیوں کے دماغ بھی کس قدر سادہ ہوتے ہیں جو انہونی باتوں کو قبول کر لیتے ہیں۔ میاں ایہ ہڑی ہے اور اپنے پیپوں پر چل رہی ہے۔ پوری سڑک چاروں پیپوں کی گرفت میں ہے اور چاروں ٹائر نئے ہیں۔“

جلدی ہی ہم واپس گھر پہنچ گئے۔ ہماری بیویاں ابھی تک اُسی کمرے میں بیٹھی اُسی گرجوٹی سے باتیں کر رہی تھیں۔

جب میاں مشنوی نے کہا ”میں اب حضور سے اجازت لے کر واپس جاتا ہوں۔“ تو میں نے جلدی سے کہا ”پہلے مجھے اجازت لے کر رخصت ہو لینے دو تم بعد میں چلے جانا۔“

میں باباجی کے پاس رسوائی ڈھارے میں پہنچا تو آپ اکیلے ہی تھے۔ میں نے کہا ”باباجی مجھے اجازت ہے؟“

بابا ”اس قدر جلدی؟“

میں نے عرض کیا ”حضور ایک ضروری کام ہے اور ہمیں حلقہ دار باب ذوق کی مینٹنگ میں جانا ہے۔ میری بیوی اس کی صدارت کر رہی ہے اور وہاں ادب پر ایک اہم مباحثہ ہو رہا ہے۔“

آپ نے غور سے میری طرف دیکھا اور انگلی اٹھا کر کہا ”نوٹ! مباحثہ ہمیشہ علمی کی وجہ سے ہوتا ہے اور وقت لپٹنے کے لیے کیا جاتا ہے۔“ پھر فرمایا ”جاؤ! اجازت ہے لیکن جلدی جلدی آتے رہا کرو یہاں سب کو انتظار ہوتا ہے۔“

میرے ساتھ ایک اور بھی عجیب حادثہ تصادم ہے کہ میں علمی طور پر انسانیت کی محبت میں شدت سے مبتلا ہوں اور انسانیت کے شرف کے لیے بہت کچھ لکھتا ہوں۔ اس کے دکھ درد کا برملا اظہار کرتا ہوں اور اس پر ہونے والے ظلم اور زیادتیوں کے خلاف احتجاج کرتا ہوں لیکن آدمی مجھے اچھے نہیں لگتے۔ میرے ارد گرد رہنے والے لوگ میرے دوست ہرے مسائے میرے عزیز میرے ہمعصر میں ان کو پسند نہیں کرتا اور ان پر کڑی نکتہ چینی کرتا رہتا ہوں۔ جو انسان میرا ہم خیال نہیں وہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ جو میرا ہم حال نہیں اس سے میں گفتگو کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہوتا۔ میں کیا کروں اور کس سے کہوں اور کون میری دیکھیری کرے کہ مجھے ”انسانیت“ ہے یعنی اس لفظ سے میرا مطلب ہے انسانیت کی اصل کیفیت (Abstraction) سے تو والہانہ عشق ہے لیکن اس کی زندہ اکائیوں کے آڑے وقت میں میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ان پر حجاب جابل اور ناخواندہ انسان تو مجھے انسان ہی نہیں لگتے اور میں میری ترقی کی طرح ان سے بات کرنے کی فضیلت اوقات خیال کرتا ہوں۔ اس پر بھی میں انسانیت سے ٹوٹ کر بیکار کرتا ہوں اور انسانیت کا جھنڈا لے کر چل رہا ہوں۔ اب میں اس تضاد سے نکل جانا چاہتا ہوں لیکن کوئی میری مدد نہیں کرتا۔ ادھر باہر نکلنے کے سارے راستے بند

پڑے ہیں اور میں انسانیت کی تجدید سے پیار کر کے لاغر ہو رہا ہوں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ مجھے سمجھائیں کہ اسلام جو اخوت، مساوات اور بھائی چارے کا دین ہے اور علم نافع پر اس قدر زور دیتا ہے وہ علم مجھے کیسے حاصل ہوا اور میں انسانیت سے کیونکر محبت کر سکوں اور اپنے علم کو کیونکر عمل میں ڈالوں کہ خود بھی اسلام کے قریب ہو جاؤں اور دوسروں کے لیے بھی موسمِ بقی روشن کر جاؤں؟ لہذا سب سے پہلے میں نے صوفی ازم کی طرف توجہ دی کہ ذریعوں پر دھیر کی معافی بردباری کا علم بڑے آسان طریقے سے سکھایا جاتا ہے لیکن عجیب سی بات ہے میں جس کو کھیل بچوں کا سمجھتا تھا کچھ ایسا ہی بھی نہ نکلا۔

صوفی لوگ کہتے ہیں کہ اگر صوفی ازم کا علم حاصل کرنا ہو تو صوفیوں سے میل ملاپ رکھنا چاہیے۔ کتابوں سے اور بات چیت سے اور لیکچروں سے یہ علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ محبت کرنے کے لیے ایک محبوب ہونا چاہیے۔ ایک محبت کرنے والا درکار ہے۔ کتاب کے ذریعہ آپ محبت کا سبق نہیں پڑھ سکتے کیونکہ اس کا تعلق دماغ سے نہیں دل سے ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی حساب اور اسکا کس گرامر اور زباندانی دماغ سے تعلق رکھنے والے علم ہیں۔ یہ کتاب کے ذریعہ یا سیمی اور پھر (Audio Visual) آلات کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں لیکن دل کی باتیں دل کے Apparatus پر ہی موصول کی جاسکتی ہیں۔ اگر ان کو جاننے کے لیے دماغ کا آلہ استعمال کیا جائے تو Short Circuit ہو جاتا ہے۔ پھر انسان کے اندر ایسا اندھیرا چھا جاتا ہے کہ بڑی سے بڑی روشنی بھی وہاں اجالا نہیں کر سکتی۔

میں صوفی ازم کا ایک چھوٹا سا اور معمولی سا مطالعہ ہوں۔ آپ کی طرح میں نے بھی اس مضمون پر کچھ کتابیں پڑھی ہیں اور اس کو دماغ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن ہمیشہ ناکام رہا ہوں۔ لیکن آپ کے مقابلے میں میں ذرا سارا بااثر خوش قسمت ہوں کہ مجھے چند صوفیوں کی محبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے اور ان کی توجہ سے اور ان کی محبت کی وجہ سے اس Frequency کو کس حد تک محسوس کرنے لگا ہوں۔ گویا محسوس کرنا اور یہ جاننا علم کی حد سے آگے نہیں جاسکا۔ کیا میں اس تجربے اور مشاہدے کو کبھی دل سے محسوس کر سکوں گا؟ کیا میں ان کیفیات کو صحیح پاسبکوں گا؟ کیا یہ محسوسات کبھی میری قسمت کا ایک حصہ بن سکیں گے؟ یہ ایسے سوال ہیں جو پہلے مجھے پریشان کرتے تھے۔ اب نہیں کرتے۔ میں وہ خوش قسمت کلر بلائیں ہوں جو کوئی رنگ نہ دیکھ سکے لیکن اس کا پورا ایمان ہو اور پختہ یقین ہو کہ واقعی اس دنیا میں رنگ بھی ہوتے ہیں۔ میں نہیں دیکھ سکتا تو کیا ہوا اور لوگ تو دیکھ رہے ہیں۔ اگر یہ کلر بلائیں نہیں دور ہو جائے تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ اگر نہ ہو سکے تو کوئی شکوہ نہیں، کوئی شکوہ نہیں، کسی پر کوئی زور نہیں۔

آپ کہیں گے یہ عجیب بات ہے۔ ہم کسی ایسے علم کو ماننے کے لیے تیار نہیں جو ہماری عقل میں نہ آ سکے۔ جس کو ہم نہ سمجھ سکیں۔ جس کو ہم محسوس نہ کر سکیں۔ میں کہوں گا آپ بچے ہیں۔ ایسے بچے جس کی عمر چھ سال سے زیادہ نہیں اور اس بات پر ضد کر رہا ہو کہ میں نہیں مانتا کہ Sexual Pleasure (شہوت) بھی کوئی چیز ہے۔ اگر ہے تو مجھے کتاب میں سے پڑھ کر سمجھائیے۔ ڈایا گرام بنا کر اس کی تفصیل بتائیے۔ سلائڈ دکھا کر اس کی لذت بتائیے۔ میں کہوں گا پیارے بچے جب تم چودہ سال کے ہو جاؤ گے تو میرے بتائے بغیر میرے سمجھائے بغیر کوئی کتاب پڑھے بغیر یہ بات تمہاری سمجھ میں

خود بخود آجائے گی لیکن اس دور کا ہر پڑھا لکھا اور اس نا تعلیم یافتہ انسان خاص طور پر مغرب کا آدمی اس بچے کی طرح ضد کر رہا ہے اور اپنے میں وہ Frequency پیدا کیے بغیر اس سگنل کو Receive کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس کے لیے اس کے پاس کوئی Antenna موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی دنیا کے لوگ خاص طور پر امریکہ کے لوگ ان یوگیوں، جادو گردوں، مادیوں اور بازی گردوں کا شکار ہو رہے ہیں جو روحانی کرتب دکھا کر سادہ لوگوں کو لوٹ رہے ہیں اور صاف دل لوگوں کو ٹھک رہے ہیں لیکن صاف دل لوگوں کا درجہ ہمیشہ بڑا ہوتا ہے۔ وہ وقت قریب ہے جب سادہ لوگ اور صاف دل لوگ جیت جائیں گے اور یوگی اور جادو گردان سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔

ایک بات یاد رکھنے کی ہے اور وہ بہت ہی اہم ہے کہ تصوف یا صوفی ازم اور روحانی طاقت یا Spiritulism دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ایک کا دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً جو آدمی کراتیں دکھائے، عقل کے خلاف Uncanny واقعات عمل میں لائے ضروری نہیں کہ وہ صوفی بھی ہو لیکن اس کے الٹ ہر پورے صوفی میں کراتیں دکھانے کی طاقت موجود ہوتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ کراتیں دکھائے یا نہ دکھائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تصوف یا صوفی ازم ہے کیا چیز اور اس کا انسان سے یا انسانی زندگی سے کیا تعلق ہے۔ مختصر طور پر یہ جان لیجئے کہ تصوف ایک علم ہے جس کا یہ کیا چیز اور اس کا انسان سے یا انسانی زندگی سے کیا تعلق ہے۔ مختصر طور پر یہ جان لیجئے کہ تصوف ایک علم ہے جس کا مہمور ہے کہ ان طاقتوں اور ہستیتوں کی حقیقت معلوم کی جائے جن پر ہمارے مذہب کی بنیاد قائم ہے اور جن کو دیکھے بغیر اور جن کا ثبوت دیے بغیر ہم پر فرض ہے کہ ہم ان کو مانیں۔ وہ طاقتیں اور ہستیاں ہیں اللہ فرشتے، الہامی کتابیں، رسول، قیامت کا دن اور حیات بعد الموت لیکن اگر اصل طریقے پر دیکھا جائے تو صوفی ازم کی بنیاد ایک ہی بات پر ہے کہ اللہ کیا ہے۔ کیا ہے۔ کس طرح کا ہے اور مخلوق سے اس کا کیا تعلق ہے۔ قرآن میں وہ اپنے ہاتھ آکھ، کان روح اور نفس کا ذکر کرتا ہے تو یہ سب کیا ہے۔ اس سے اللہ کا مطلب کیا ہے۔ کیا اس کے ہاتھ، کان، آنکھ اور روح و نفس ہماری طرح کے ہیں یا کسی اور طرح کے۔ اگر ہماری طرح کے ہیں تو پھر وہ ایک جسم رکھتے ہوئے ہر جگہ حاضر و ناظر کس طرح سے ہو سکتا ہے اور وہ غیر وہ۔

صوفی کے علم کی بات مجھے دیر سے سمجھ آئی جس طرح آپ کو دنیا کا علم سکھنے کے لیے سب سے پہلے لکھنا پڑھنا سیکھنا پڑتا ہے اور ایک پہلوان یا Athlete بننے کے لیے ورزش کرنی پڑتی ہے اسی طرح صوفی ازم کا علم حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے آپ کو اپنی زندگی ظاہری اور باطنی دونوں طرح پاکیزہ بنانی پڑتی ہے۔ ہر طرح کی گندگی سے خواہ وہ اندرونی ہو یا بیرونی دور ہٹنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد اپنے اخلاق اور اپنے کردار سے ہر طرح کا فیضان دور کرنا پڑتا ہے۔ کوئی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جتنی اخلاقی برائیاں ہیں وہ سب دور ہوں اور جتنی خوبیاں ہیں وہ سب پیدا ہو جائیں۔ اس کام کے لیے کچھ ریاضت اور کچھ مجاہدہ (Exercise, Drill, Struggle) کرنا پڑتا ہے۔ جب ان چیزوں میں جتنی اور کچھ ملنا پیدا ہو جاتا ہے تو پھر ہمیں انہی کی جھلکیاں ملنے لگتی ہیں یا گیان حاصل ہونے لگتا ہے۔

تصوف یا صوفی ازم اور دوسرے علموں میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اور علم تو پہلے حاصل کیے جاتے ہیں اور پھر علم حاصل کیا جاتا ہے۔ لیکن تصوف میں اس کے الٹ ہے۔ اس میں پہلے عمل کیا جاتا ہے اور پھر علم حاصل ہونے لگتا ہے۔

چنانچہ صوفی ازم میں پہلا حکم سننا ہے۔ پھر اس پر ایمان لانا ہے۔ اس کے بعد عمل کرنا ہے اور اس عمل کے دوران جاننا اور بخود وارد ہونے لگتا ہے۔ علم خود بخود حاصل ہونے لگتا ہے۔

لیکن یہ باتیں بہت لمبی ہیں۔ یہ تو ایک سمندر ہے۔ ایک عمر میں سمندر کے اوپر اوپر کی سیر نہیں ہو سکتی اس اندر کا کیا پتہ چل سکتا ہے بھلا۔

مشرق کے لوگ اور مشرق کے ملک بڑے خوش قسمت ہیں کہ رات کی تاریکی اور رات کے اندھیرے کے سب سے پہلے ان کو روشنی نصیب ہوتی ہے۔ سب سے پہلے مشرق میں اجالا ہوتا ہے۔ جب بھی روشنی کا حکم ہے تو سب سے پہلے مشرق روشن ہوتا ہے۔ مشرق اس لحاظ سے بھی خوش قسمت ہے کہ اس کے دامن میں سارے ظہیر ہوتے ہیں۔ انہی پیغمبروں نے ساری دنیا کو دین دھرم خدا اور اس کی کائنات کا تصور دیا ہے۔ پنجاب بھی مشرق کا ایک حصہ ہے اور چونکہ یہ علاقہ سپاٹ ہے میدان ہے چنیل ہے اس لیے اس پر روشنی آسانی سے اور خوبی سے پھیلتی ہے۔ اس روشنی نے پنجاب کو بڑے صوفی بڑے سنت سادہ بڑے بزرگ اور بڑے مرشد دیے ہیں۔ ان لوگوں کی تعلیم سے نہ صرف یہاں کے لوگوں کی روحانی اور ایمانی زندگی تروتازہ رہی ہے بلکہ ان کو دنیا اور دنیا کے کاروبار میں بھی بڑی بلند پایاں ملی ہیں۔

صوفی عالم فاضل فلسفی، منطقی نہیں۔ وہ مذہب اور دین کی باریکیوں اور خدا کے وجود اور اس کے ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں تعلیم نہیں دیتے۔ وہ اس کے ساتھ عشق کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں اور ساتھ ساتھ ترکیب بھی بتاتے ہیں۔ سب سے آسان ترکیب سادہ اور موٹی موٹی زبان میں انہوں نے اپنے علاقے کے لوگوں کو یہ بتائی ہے کہ تم مجھے کیسے بھی ہو جس حالت میں بھی ہو جتنے گندے بھی ہو اس کی پروا نہ کرو بس خدا کے ساتھ لگ جاؤ۔ اٹھتے بیٹھتے سونے جاگتے پہلو کے بل لیٹے ہوئے اس کے نام کا ذکر کرو اور اس کو اپنے ساتھ سمجھو۔ وہ تمہاری خرابیاں اور تمہارے گنہگارائیاں خود دور کرے گا اور تمہارے لیے خود ہی کوئی راہ مقرر کر دے گا۔ مولوی پنڈت پادری پریچر Pastor صوفی کے

الٹ تعلیم دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے پاک صاف بنو، نیک بنو، باخلاق بنو Be a Good Bobby بنو۔ شریف بنو اس کے بعد تم اس قابل ہو گے کہ تم خدا کے حضور میں جا سکو اور اس کے ساتھ ملاپ کر سکو۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ نیک اور شریف بننے کی کوشش میں انسان ساری زندگی گزار دیتا ہے لیکن اپنی مرضی اور پرچر کی کسوٹی Touch Stone کے مطابق کبھی بھی نیک نہیں بن سکتا۔ اس کے اپنے خالق سے دوری ہی رہتی ہے اور وہ اس راز کو جاننے کے لیے آگے نہیں بڑھ سکتا جس کے لیے اس کی روح بے قرار ہے۔ وہ اس کے درشتوں سے دور رہتا ہے جس کے لیے اس کا دل ہر وقت دھڑکا رہتا ہے۔

سیدھے سادے لوگوں نے اپنے صوفیوں سے پوچھا کہ ہم خدا کے پاس جا کر کہاں بیٹھیں۔ ہمیں تو اس کا ایڈریس بھی معلوم ہی نہیں۔ نہ ہی ہم اس کا ٹیلیفون نمبر جانتے ہیں کہ اس سے رابطہ حاصل کر سکیں تو صوفیوں نے بتایا کہ اتنا تک پہنچنے کے لیے تمہیں ایک گائیڈ کی ضرورت ہے اور رہنما کی حاجت ہے اور اس رہنما کو مرشد کہتے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کیا آپ بھی اتنے بڑے درجے پر اور اتنے بلند مرتبے پر مرشد ہی کے ذریعے پہنچے ہیں تو سب نے ایک زبان ہو کر کہا "ضرور بے شک یقیناً" بے شبہ اور سلطان باہو نے کہا

الف اللہ مجھے دی ہوئی مرشد من وچ لائی ہو
نئی اثبات دا پانی ملیا ہر رگے ہر جاکھی ہو
اندر ہوئی مشک مچایا جاں مہلن پر آئی ہو
جیوے مرشد کامل بابو جیوں ایہہ ہوئی لائی ہو

(اللہ کا نام اللہ کا اسم پہلی مرتبہ میرے دل میں میرے مرشد نے بویا۔ جس طرح باغبان چنے کی بوٹی زمین میں بوتا ہے پھر اس بوٹی کو کٹی اثبات کا پانی ملا کر اس کی ہر ہر رگ میں اور ہر پتے میں پہنچاتا ہے اور جب وہ بوٹی اس پانی سے پھلنے پھولنے پر آئی اور اس کے اندر ہزاروں پھول نکلتے تو میرے اندر خوشبو کا ایک طوفان مچ گیا۔ خدا بھلا کرے مرشد کا خدا سلامت رکھے اس کو جس نے میرے اندر یہ بوٹی کاشت کی۔)

پھر کہتے ہیں!

ایہ تن میرا چشماں ہووے میں مرشد دیکھ نہ رجاں ہو
لوں لوں دے مذہ لکھ لکھ چشماں اک کھولاں اک کجاں ہو
ایناں ڈھیاں دی جر نہ آوے فیر ہو رکتے دل بھجاں ہو
مرشد دا دیدار اے بابو مینوں لکھ کر ڈواں جھاں ہو

(اے کاش میرا یہ چشماں چشم آکھیں بن جائے اور ہر وقت ہر گھڑی میں اپنے مرشد کو دیکھتا رہوں۔ میرے ہر ہر کام کے نیچے ایک ایک آکھ ہو کبھی اس کو کھولوں کبھی اس کو بند کروں اور حیرت کا یہ سلسلہ چلتا ہی رہے۔ اگر اس قدر کہنے سے اور مسلسل دیکھنے سے بھی مجھ کو مرشد آئے، قرار نہ آئے، چہن نہ آئے تو پھر میں اور کس طرف بھاگوں لیکن نہیں لے اور کس طرف بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو اپنے مرشد کا دیدار لاکھوں اور کروڑوں جوں سے زیادہ ہے۔)

بابا بیٹھے شاہ کہتے ہیں!

آؤ عنایت قادری جی چاہے میرا
میں اڈیکاں کر رہی کدی آ کر پھیرا

(اے میرے مرشد اے شاہ عنایت میں کب سے آپ کے انتظار میں ہوں اور بالکل رہ گیا ہوں۔ کبھی مجھ پر لبر کر میری طرف بھی آؤ۔)

یا پھر!

میر میرا بند ادا سا ڈا مرشد تخت لہور
ایہوای تسی دی آکھو آپ گڈی آپ ڈور
میں دسناں آں تسی پکڑ لیا ڈھیلے شادا چور
میری بکل دے وچ چور

ہے۔ اس لیے آپ بیسویں صدی میں ہونے کے باوجود اور اس قدر پڑھے لکھے ہونے کے باوجود اس کی ہر بات پر غور سے دیکھو تو پتہ چلے گا کہ وہی ہے اور ذرا دیکھی وہی ہے۔ یعنی اوپر چڑھا ہوا بھی وہی ہے اور اوپر چڑھانے والا بھی وہی ہے۔ اگر تم مجھ پر مہربانی کرنا چاہتے ہو تو میرے چور کو پکڑ لاؤ۔ اس نے مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے۔

رہا ہے۔ وہ میرا مرشد شاہ عنایت ہے۔)

یا پھر!

عرش منور ملیاں بانگاں سنیاں تخت لہور

شاہ عنایت کنڈیاں پایاں لک چھپ کچ داؤدور

نی میری بکل دے وچ چور

(پیغام تو آسمانوں سے آتا ہے لیکن سالا ہور میں جاتا ہے۔ شاہ عنایت نے میرے مرشد نے میرے

ہاں گیر (Angular) کی طرح ڈوری ڈالی ہوئی ہے۔ میرے دل کو تڑپتی ہوئی پھلی کی طرح کھینچتا ہے لیکن

میں کیا کروں کدھر جاؤں۔ شاہ حسین بھی یہی کہتا ہے کہ جس گھری وچ ٹھاکرنا ہیں ادھ کا کر کو کرستی ہے۔)

یعنی جس بستی میں جس شہر میں کوئی مرشد نہیں ہادی نہیں وہ بستی کتوں اور مرغوں کی بستی ہے جو خواتین

رہتے ہیں خوا خواہ بانگیاں دیتے رہتے ہیں۔ اک شور مچا رہتا ہے۔ آوازوں کی Pollution سے بھر رہا ہے۔

آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ ایک آدمی پر اس قدر اعتبار کر لینا۔ اس کے حوالے اپنا سب کچھ کر دینا۔

ایمان لے آنا اس کے آگے دم نہ مارنا۔ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنا یہ کہاں تک جائز ہے۔ اس سے تو اپنی

خودی کی نفی ہو جاتی ہے لیکن پنجاب کا صوفی کہتا ہے کہ نال شرابیں رنگ مصلّا گرو آکھے تینوں۔ اگر تمہارا گرو

تم سے یہ کہے کہ اپنے مصلیٰ کو اپنے جائے نماز کو اور اپنی نماز پڑھنے والے جگہ کو شراب میں غسل دے دو۔ شراب

ایسا ہی کرو کیونکہ گرو تم سے بہتر جانتا ہے۔ گورو تمہارا بھلا چاہتا ہے۔ گورو تمہیں منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔

آپ کی آسانی کے لیے ایک اور مثال سے واضح کر دوں تاکہ آپ کو اچھی طرح سے سمجھ آ جائے۔

اہمیت کیا ہوتی ہے اور آپ میں سے سب لوگ گورو کو کس قدر اہم جانتے ہیں۔ جب آپ کا گورو آپ

Please fasten your seat belts تو فوراً اپنی بیٹیاں باندھ لیتے ہیں۔ اس وقت کوئی یہ سوال نہیں کر دیتا

ایسا کیوں کیا۔ یہ میری شخصیت کے خلاف ہے۔ میں نے ابھی کھانا کھایا ہے۔ میرا پیٹ پھولا ہوا ہے۔ یہ معتد

بہت نقصان دہ ہے۔ نہ ہی آپ میں سے کوئی پائلٹ کہیں میں جا کر اس سے بحث کرنے لگتا ہے کہ میں جی ٹی

گا۔ میں کوئی بکری ہوں کوئی جانور ہوں میں انسان ہوں۔ پھر آواز آتی ہے۔ Extinguish your

cigarettes۔ آپ فوراً اپنا سگریٹ بجھا لیتے ہیں حالانکہ آپ نے ابھی سلاگیا تھا۔ ابھی مزا آنے لگا تھا لیکن

آرڈر دے دیا کہ بجھا دو۔ آپ نے بجھا دیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ آپ جانتے ہیں کہ پائلٹ آپ سے بہتر علم

بلندی کا بھی اور بستی کا بھی۔ پرواز کا بھی اور گھومنے کا بھی چڑھنے کا بھی اور اترنے کا بھی۔ وہ جو کچھ کہتا ہے ہمارے

لیکن ایسے کبھی نہیں ہوتا۔ کیا آپ ایئر پورٹ پر جا کر کسی ایسے پائلٹ کے جہاز میں بیٹھنا پسند کریں گے جو یہ

نہ لگتا ہو کہ پر دو درجن کتابیں پڑھی ہیں اور میں نے اپنے کمرے میں ہر ہوائی جہاز کا ڈایا گرام لٹکا یا ہوا ہے لیکن

آج تک کسی جہاز کی شکل نہیں دیکھی۔ نہ ہی کبھی Cock pit میں بیٹھا ہوں۔ نہ ہی اس کو اڑایا ہے۔

اگر ہم روحانیت کی بات چھوڑ دیں اور صوفی ازم کی اونچی اور اعلیٰ حقیقت پر بھی بات چیت نہ کریں تو میں کہوں گا

دن کی بدولت معاشرتی اور سماجی طور پر لوگوں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ صوفی لوگ جو ہمارے گاؤں میں بستیاں

بنائی ہیں میں شہروں میں ہوتے اور جواب بھی ہیں یہ اپنے علاقے کی آبادی کے لیے Psychiatric کا کام

کرتے ہیں۔ ان کی کوئی فیس نہیں ہوتی۔ ان کے یہاں سائیکوالٹس کا کوئی کاؤنچ نہیں ہوتا۔ یہ کوئی Tranquilizer بھی

نہیں۔ یہ اپنے سلوک سے اپنے برتاؤ سے اپنی نرمی سے لوگوں کو ذہنی پریشانیوں اور دماغی بیماریوں سے دور رکھتے

ہوتے ہیں۔ پاکستان کے لوگ ذہنی طور پر اور دلی طور پر بڑے پرسکون اور فارغ البال ہیں۔ وہ غریب

ان کے پاس روپے پیسے اور تاج کی کمی ہے۔ ان کے یہاں بھوک ہے۔ بیماری ہے لیکن ان کے یہاں بے چینی نہیں

ہوتی۔ بے خبری نہیں خدا سے دوری نہیں۔ جن لوگوں سے آپ روز ملتے ہیں جو آپ کو پڑھانے آتے ہیں جو

بچہ پڑھ دیتے آتے ہیں یہ اصل لوگ نہیں ہیں۔ یہ Reading, Writing, Rioting لوگوں کا ایک گروہ ہے اور

وہ ساری بیماریاں جوڑی ہوتی ہیں جو مغربی دنیا میں عام پائی جاتی ہیں۔ اب ہمارے یہاں بھی دماغی امراض میں اضافہ

ہو رہا ہے۔ ہم بھی بے امن ہو گئے ہیں۔ ہمارے یہاں تعلیم یافتہ طبقہ بھی قہری آرز کا شکار ہو گیا ہے۔ ہمارا ٹریفک بھی

رکستار ہو گیا ہے۔ ہم بھی مادی تقاضوں کے پیچھے بھاگنے لگے ہیں۔ ہم نے بھی اپنی روح اور روح کی آسودگی اور

سکون کو بڑے سستے داموں فروخت کر دیا ہے۔

مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ سے بات کہاں سے شروع کروں۔ محسوس کرنے والی چیز کو حوصوں میں اور

میں نہیں جانا جاسکتا۔ شاعری پر تنقید یا اس کی خوبیاں اور حسن بیان کرنا بڑی احتقانہ بات ہے۔ شاعری یا تو دل کو لگ

دے یا نہیں لگتی۔ جو لگ جاتی ہے وہی شاعری ہے۔ آپ تمہید کے طور پر دیباچے کے طور پر Preface سمجھ کر ایک

پیشے کے لیے رکھ لیجئے کہ تصوف کے میدان میں اور صوفی ازم کی دنیا میں ایک رہنما کی ایک ہادی کی ایک مرشد کی

دلی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے بغیر آپ صوفی ازم کے صحافی اور کالم نگار تو بن سکتے ہیں لیکن اس علم سے یا اس

مقام سے خود لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ مجھے معلوم نہیں اس علم کو کون اور کیسے تلاش کرے گا؟ لیکن آپ کے ملک میں

کے شہر میں آپ کی بستی سے باہر آپ کے ارد گرد سے دور اس کا ذکر ضرور ہوگا۔ ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ اور پھر یہ

تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ہوتا ہی رہے گا۔ آنے والی باتیں اس دیباچے کی ایک کڑی ہوں گی۔ اس کا ایک سلسلہ ہوگا۔ میں اور آپ پھر قریب ہوں گے اور قریب ہی رہیں گے۔ انسان انسان سے اتنی جلدی جدا نہیں ہوتا اتنا دور نہیں ہوتا۔ ہماری روحیں تو ہمارے رب کا امر ہیں۔ اس کا حکم ہیں پھر ہم اس کے حکم سے پرے کیسے جاسکتے ہیں۔ روحانی طور پر ہم ساتھ ساتھ ہی رہیں گے۔ ہمیشہ ہمیشہ۔

ڈیروں پر ایک مدت گزارنے کے بعد میں ایک نتیجے پر پہنچا کہ مجھ میں کسی کو اپنا مرشد سمجھ لینے کی ہمت نہیں ہے۔ مغربی تعلیم نے مجھے خود مر 'خود اعتماد اور خود کار بنا دیا تھا۔ میرے لیے دوسرے کا مشورہ رائے اور سمجھاؤ نہ صرف دخل اندازی تھی بلکہ مکمل آزادی گنوا کے مترادف تھی۔ میں دنیاوی علوم میں تو استاد کی دست گیری برداشت کر سکتا تھا لیکن اقلیم قلب میں کسی رہنما ہادی یا گائیڈ کا متکلف نہ ہو سکتا تھا۔ میں نے اللہ کے علم کے لیے اپنی بات لائیں ایجاد کر رکھی تھی۔ اعلیٰ تعلیم نے مجھ سے ماننے کی صلاحیت چھین لی تھی۔ کچھ سال صوفی ازم کی کتابیں اور سائنسی دنیا کو تھک کر نے میں گمراہ گئے۔ میں دور استوں کا مسافر ہو گیا اور اپنی انا کو مست نما بنا کر علم نافع کی تلاش میں لگا رہا لیکن علم حاصل کرنے کا طریقہ غائب یہ نہ تھا۔

گر تمہاری ہڈیاں تمہارا خون تمہارا گودا بن جائے۔

بس تم باقی نہ رہو۔ گرورہ جائے۔ تم ہی گرو ہو کر رہ جاؤ۔

اصل میں روحانی دنیا کے اندر علم کی منتقلی نہیں ہوتی۔

علم دینے والے کی منتقلی ہوتی ہے۔

وہ سارے کا سارا آ موجود ہوتا ہے اور تم نہیں رہتے ہو۔ تم ختم ہو جاتے ہو۔

اس میں مرشد کا کچھ نقصان نہیں ہوتا۔

تمہارا فائدہ البتہ ہو جاتا ہے بلکہ سارے کا سارا تمہارا ہی فائدہ ہوتا ہے۔

یہ مرشد لوگ بڑے ڈانڈے لوگ ہوتے ہیں۔

ان کی شکلوں پر اور ان کی مسکراہٹوں پر نہ جانا۔

یہ میٹھے میٹھے لوگ بڑے ظالم اور بڑے سخت ہوتے ہیں۔

کوئی ان کے قریب آنے کی کوشش کرے تو یہ ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں ایسی ایسی شکلیں بناتے ہیں کہ لوگ

ان سے متنفر ہو کر دور ہو جاتے ہیں۔

اگر کسی حلقے میں یا کسی زاویے میں کوئی شخص کسی نئے آنے والے سے کہے کہ "بچ کے رہنا یہ پیر چالاک ہے اور

مکار ہے اور دغا باز ہے۔"

تو آنے والا پیر کا اعتبار نہیں کرے گا بلکہ اس شخص کا اعتبار کر لے گا حالانکہ اس نے اس شخص کو پیر برابر بھی نہیں

مانا ہوتا۔

اصل میں بات یہ ہے کہ جب کبھی کسی نے یہ کہا کہ یہاں غلط ہے۔

اس جگہ دال میں کچھ کا لاپے تو آپ نے فوراً سے تسلیم کر لیا۔ اس کے آگے سر جھکا دیا۔

جب کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ اچھا ہے۔ یہ خوب ہے۔ یہ نیکی ہے۔

تو تم رک جاتے ہو۔ خاموش ہو جاتے ہو۔ ماننے سے انکار کر دیتے ہو۔

برائی پر تم کو پورا یقین ہے۔ سو فیصد اعتماد ہے۔

شیطان پر اور ابلیس پر پورا یقین ہے۔ لیکن خدا پر نہیں۔

انگریزی میں ایک محاورہ ہے: Too good to be true

یعنی یہ اس قدر اچھی بات ہے کہ سچ ہو ہی نہیں سکتی۔

کبھی بھی نہیں ہوتا کہ کوئی کہے: Too bad to be true

بہت بری اور بہت خراب کبھی بھی بہت بری نہیں ہوتی۔ غلط نہیں ہوتی۔ ہمیشہ ٹھیک ہی ہوتی ہے۔

تم نے انسانیت پر اس قدر بے اعتباری شروع کر دی ہے۔

اس قدر بے اعتمادی کا اظہار کرو یا ہے کہ اب تم کو اس کی طرف سے کوئی اچھی خبر ٹھیک ہی نہیں لگتی۔

اگر کوئی آکر آپ سے یہ کہے کہ فلاں نے معراج انسانیت حاصل کر لی ہے اور جلوہ حقیقی سے روشناس ہو گیا

ہے۔

تو تم کبھی بھی یقین نہیں کرو گے۔ سنو گے اور کہو گے یہ سب افسانہ ہے۔ گپ ہے۔

ایسا کبھی ہوا ہی نہیں پھر اب کس طرح سے ہو سکتا ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص کو جلوہ حقیقی نظر آ جائے جب ہم کو کبھی نظر نہیں آیا۔ جس چیز کا تجربہ ابھی تک مجھے نہیں

ہوا وہ کبھی اور کو کس طرح سے ہو سکتا ہے۔

فٹھے کہتا ہے کہ خدا کوئی ہے نہیں (نعوذ باللہ) خدا کس طرح سے ہو سکتا ہے جب میں بندے کی صورت میں

ہوں موجود ہوں۔

اگر کوئی خدا ہوتا تو میں خود ہوتا اور میں چونکہ خدا نہیں ہوں اس لیے خدا بھی پیدا ہی نہیں ہوا۔

تم لوگوں کے بارے میں مثبت باتیں سوچ ہی نہیں سکتے۔

کتنی بھی کوشش کر لو تم لوگوں کے بارے میں شک میں ہی مبتلا رہو گے۔

اگر مارے باندھے یقین کرنے پر مجبور بھی ہو گئے تب بھی تمہارے دل کے کسی گوشے میں شک گزرتا ہی رہے

ا۔

اگر کوئی شخص آ کر تم سے کہے فلاں شخص فراڈ ہے۔ بے ایمان ہے تو تم فوراً تسلیم کر لو گے۔

بغیر کسی تحقیق کے بغیر تمہارے کے۔ سو فیصد مان لو گے کہ وہ شخص فراڈ ہے۔ لیکن اگر مہاتما بدھ بھی پہاڑ سے اتر کر آپ کے پاس آ جائے اور کہے میں بدھا ہو گیا ہوں۔ مجھے نزوان حاصل ہو گیا ہے۔ مجھ پر فضل ہو گیا ہے تو تم کبھی بھی تسلیم نہیں کرو گے۔

کی۔

کر و گے کیا..... کر ہی نہیں سکو گے۔ چاہے کتنا بھی زور لگاتے رہو۔

اصل میں انسان کا سارا اعتماد ابلیس پر ہے۔ وہ شیطان کو تسلیم کرتا ہے۔ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے۔ کہے دہریے

ہوتے ہیں۔

وہ ابلیس کو ضرور مانتے ہیں۔ ابلیس کے خلاف کبھی کوئی دلیل نہیں لاتے۔ لیکن ابلیس کو ماننے اور تسلیم کرنے والے کی عقدہ کشائی نہیں ہو سکتی۔ وہ چیلنا نہیں بن سکتا۔

اگر تم غلط کے خلاف اور ابلیس کے خلاف کوئی روک بنا سکتے ہو منفی رویے کے خلاف ایک قلعہ تعمیر کر سکتے ہو۔ تو پھر تم چیلنا بن سکتے ہو۔ پھر تم گرد پکڑ سکتے ہو۔ لیکن اگر تم نفی کے اختیار میں ہو نہ سننے والے ہو تو گرد تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔

گرد پکڑنے والے کو اگر راستے میں کوئی تانگے والا پان والا مزدور قتل حلوئی بھڑیا راہ کہہ دے کہ بھائی صاحب کہاں جا رہے ہو۔ وہ تو ایک فراڈ ہے۔ ایک غلط انسان ہے۔ جمونا پیر ہے تو پھر تم اس تک پہنچ ہی نہیں سکتے ہو۔

جس شخص کو گرد سے دلچسپی ہو۔ روحانی دلچسپی ہو وہی ہو۔ روحانی موضوعات سے لگنا ہو۔ روحانیت سے شغف ہو وہ گرد تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس میدان میں دلچسپی اور رغبت کوئی معنی نہیں رکھتے۔

یہاں تو صرف پیاس کی ضرورت ہے۔ شدید اور جان نکالنے والی پیاس۔

جب گرد کسی کو یہاں دیکھتا ہے تب ہی وہ اس کو پانی کا گلاس دیتا ہے۔

پانی سے دلچسپی رکھنے والے کو کوئی بھی گلاس بھر کر نہیں دیتا۔ پیاسے کو دیتا ہے۔

اوپر نگاہ سے کبھی کوئی فیصلہ نہیں ہوتا۔

برتاؤ بالکل بیرونی چیز ہے۔ اس سے آدمی کے اندر کا اندازہ نہیں ہوتا۔

برتاؤ اور سلوک سمندر کے اوپر کی لہریں ہیں۔ اندر کیا ہو کسی کو بھی نہیں معلوم۔

اوپر کی نگاہیں اوپر ہی رہ سکتی ہیں۔ لہریں ہی دیکھ سکتی ہیں۔

اصل میں ساری حیات ہی بے معنی ہیں۔

کبھی کسی چیز کو بصارت سے معلوم نہ کرنا۔ اپنی کسی حس سے نہ پرکھنا۔ کیونکہ ہر شے کا ایک اندر بھی ہوتا ہے۔

حتیٰ کہ پتھر کی مورتی کا بھی ایک اندر ہوتا ہے۔

اور ایک گرد و ایک آقا ایک مرشد تو پوری کائنات ہوتا ہے۔

اس کے قریب جاؤ تو اس کے باہر کی آنکھوں سے نہ دیکھو۔

اگر تم نے اس کو صرف دیکھ کر جاننے کی کوشش کی تو مارے جاؤ گے۔

تمہارا حال ابو جہل جیسا ہو جائے گا جس نے حضور کو صرف آنکھوں سے دیکھا اور دیکھنے سے ہی پرکھنے کی کوشش

اور محروم رہ گیا۔

اس بیچارے کو سمجھ ہی نہ آ سکا کہ وہ کتنی بڑی کائنات کے حضور میں بیٹھا ہے۔ ہر روز دیکھتا ہے اور یقین سے دور

ہوتا جاتا ہے۔

پھر..... کچھ لوگ ایسے ہیں جو کانوں کے ذریعے پرکھتے ہیں۔

سن کر اندازہ لگاتے ہیں۔

زبان خلق کو خدا کا تقارہ سمجھتے ہیں۔

کانوں سے تم کیسا سن لو گے۔ کیا سمجھ لو گے۔

یہ کوئی عام موسیقی تو ہے نہیں جو تم کانوں سے سن لو گے۔ یہ الخد بابہ ہے۔ الخد بابہ ان کانوں سے کس طرح سے

سنا جاسکتا ہے۔

کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتیں۔ اگر ان پر اعتبار کر بھی لے تو بھی دل نہیں مانتا۔ کسی بڑے نے

کرلیا تو سر تسلیم تو خم کر لیا مگر اندر سے بیزار دل رہے۔ یہ کیفیت میری میرے بابا جی کے ساتھ تھی۔ بابا جی نور والے کبھی کبھی

کوئی بات ایسی کر جاتے تھے جو اصولاً سر سے گزر جانی چاہیے مگر وہ شمشیر برہنہ لے کر سامنے کھڑی ہو جاتی تھی۔ میں بھی ایسا

ضد کی خرم ٹھوک کے مقابلے میں کھڑا ہو جاتا اور ”میں نے مانوں“ کے تقارے پر زور کا ڈنکا بجاتا۔ اس بات سے وہ بہت

خوش ہوتے کہ میں ایک کمزور جھگوڑے کی طرح ہاں کہتا کہ بات میرے سر سے گزر گئی۔

فرمانے لگے۔ وقت اور ماحول کیسا بھی طاقتور کیوں نہ ہو آدمی کے لیے خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ یقین

ادھر ادھر منڈلاتا رہتا ہے لیکن نیزہ گاڑ کر حتیٰ انداز میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ کہنے لگے جس طرح نیکی کے لیے ہر وقت خطرہ

موجود ہے برائی کے لیے بھی ہے۔ ہم نے کہا برائی کے لیے ضرور ہے مگر نیکی اٹل ہے۔ ٹرڈھ مستحکم ہے۔ حق کو خطرہ نہیں۔

آپ مسکراتے رہے اور ہم جھگڑا کرتے رہے۔

بولے بکرا پاک ہے طیب ہے۔ ٹرڈھ ہے۔ حق ہے۔ درخت کے ساتھ بندھا ہے اگر حلال ہو جائے تو نعمت

ہے اگر جھکا ہو جائے تو گڑ بڑ ہے۔ ہمارے کسی کام کا نہیں۔ وہی پاک عیب ٹرڈھ حق نجاست میں تبدیل ہو گیا۔

اس بات کو تقریباً پچیس برس کا عرصہ گزر گیا۔ حال ہی میں ہمارے دوست شہزاد احمد نے ایک کتاب لکھی ہے

شوماخر (مہد حاضر) فلسفیوں کو اردو اٹھارہویں صدی سے روشناس کرانے کے لیے چھپ چاپ اپنی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ شوماخر کو آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ اس اقتصادیات کے ماہر نے جب ایک چھوٹی سی کتاب Small & Beautiful لکھی تو اقتصادیات جیسے خشک مشنوں سے روح کی بانیڈیا کا سامان پیدا ہو گیا۔

اب شہزاد صاحب کی کتاب کے آخر میں کچھ کریمیر سے سامنے باہمی نوروالے کا ذرا پھر سے روشن ہو گیا۔ طیب پاک حلال کرا میرے سامنے آ گیا۔ آپ کے سامنے گو اس کتاب کی چند چیزیں میں نے ایک چپ پر لکھیں۔ یہ پھر اگراف دو تین مرتبہ پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں بھولے بسرے واقعات کے پرانے کا داخل ہوئے۔ آج سے پچھن برس پہلے کا واقعہ تھا۔ 48ء کے شروع میں میرے دل میں صفائی بننے کا شوق چھایا اور میں نے حاجی صاحب کی صدیق کی شاگردی اختیار کر لی۔ میرے استاد بڑے بڑے شیخوں سے بیسے اور بزرگ انسان تھے۔ ان کے ساتھ کام کرنے میں ڈنٹیں لگتے تھا کہ وہ ان کے پاس اپنی برتری کی جتنی نہیں تھی۔ رات کو بھروسہ کا تر جہ کرنا کہ جنوں کو دیے جانا چاہیے چیتے جانا اور نکلے نکلے کی باتیں کیے جانا۔ آدھی رات کا پانی جو ڈر خراباں خراباں پلٹے گھر آ کر سوجانا۔

جس طرح مفلس کی قابضیں ہر گھڑی درد کے پیوند لگتے جاتے ہیں اس طرح ہر گھڑی اور ہر گھڑ اور ہر آن ان کی اوجھڑ پڑھنے والے ہر شخص کی روح میں کچھ نہ کچھ بویا جاتا ہے۔ دوردراز سے ہر قسم کے آڑے ہونے سچ اس تک پہنچتے رہتے ہیں اور اس کے اندر کاشت کرتے رہتے ہیں۔ کچھ کچھ ڈراستے میں ہی رو جاتے ہیں اور کاشت کے مقام تک پہنچ نہیں پاتے اور کچھ روح میں یا ذہن میں گزرتو شرفا حاصل کرتے ہیں۔ اصل میں جو روح آزاد اور جو Freeborn نہیں ہوتا جو غلام اور قیدی ہوتا ہے اس میں کوئی سچ داخل ہو کر تو شرفا حاصل نہیں کر سکتا۔ جو ذہن اپنی لائقوں کا غلام اور جو روح اپنی خواہشوں کی قیدی ہوتی ہے وہ ایک بجز زمین کی طرح ہلکی ہے۔ اس میں خوشی اور خوشنودی اور سرور دازل کا پودا نہیں اُگتا۔ وہیں نہیں چڑھ سکتا۔ اللہ ہی قیدی وجود کے اندر آزادی کا پودا نہیں لگ سکتا اس لیے کہ قیدی وجود کو آزادی سے بڑی نفرت ہوتی ہے۔

میرا مقصد ادنیٰ نہیں ہوتا چاہیے کہ میں لذت کا مہمانی صحت زندگی اور دولت کے لیے مارا مارا پھروں جی کہ مجھے داخل علم یعنی اور غریبوں کی عواش میں بھی نہیں جانا چاہیے۔ اسی طرح مسلمانوں کو یہ اختیار کرتے ہوئے خود تکلیف دینا کا بھی علم غلطی وغیرہ کی طرف بھی رجوع نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے خود اللہ کی رضا تلاش کرنی چاہیے جس چاہیے جو اللہ میرے لیے منظور ہے کہ ہوا مجھے عطا کی ہے۔

میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ بابا لوگ کچھ ایسے بے دھیان اور بے تعلق نہیں تھے کہ ان کو دنیا کی چیزوں کا علم ہی نہ ہو اور یہی نہ چلتا ہو کہ ان کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے (بھڑکی ریلے یا ٹیلی فون کی گیس بجلی) کہ وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں اور ہواؤں اور خوشبوؤں اور نظریوں سے بھی بے نیاز نہیں ہوتے۔ آپ کا خیال ہوگا کہ وہ ہر وقت مولا سے لوگائے کیا ان جہان میں دو بے رہتے ہیں اور ان پر مراقبہ کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ لیکن آپ کے خیال کے مطابق نہیں ہے حقیقت میں یونہی ہے کہ وہ خدا کے اندر اس قدر گہرے اترے ہوئے ہیں کہ ان کو خدا کی باتوں کو ہر شے کا حقیقی علم ہوتا ہے۔ وہ ہر شے اور ہر شخص کے احوال سے واقف ہوتے ہیں اور غافل سے غفلت کی طرف کا سفر کرتے ہوئے ہیں۔ بابا لوگ دنیا کے بارے میں دنیا بھر کی باتیں کرتے رہتے ہیں اور ان کی باتوں میں خدا کا حوالہ تک نہیں ہوتا۔ ان کے مقابلے میں دنیا دار لوگ اپنی یا کسی کی باتوں میں خدا کا حوالہ ہی نہیں کرتے رہتے ہیں کہ اللہ کیا اللہ کیا شان ہے۔ کیا اس کی عفت ہے کیا اس کا کمال ہے کیا اس کی بڑائی اور کیا کبریاں ہیں۔ مذہب سے متعلق جتنی بھی فرسودہ اور چالوڑ کہیں ان کو یاد ہوتی ہیں وہ انہیں اپنی گفتگو میں استعمال کرتے رہتے ہیں اور ایک عام آدمی ان کی گفتگو سے کبھی نتیجہ نکالنا نہ جانتا ہے کہ مذہب میں ضرور کوئی خرابی ہے یا کوئی میزہ۔ اس میں کوئی چندا کھلا ہوا ہے جو نظر نہیں آتا۔

بابے جانتے ہیں کہ دنیا مادہ عرض ہوں جو کچھ بھی خدا نے بنایا ہے سب درست ہے سب ٹھیک ہے۔ کوئی شے باطل نہیں ہے۔ لیکن غرض مند لوگ دنیا میں اور دنیا کی آلائشوں و مصروفیتوں میں کیڑے لگاتے رہتے ہیں اور ہر وقت اپنی اور اپنی ذات کی ظاہر یا پوشیدہ و غریب و توصیف میں گھومتے رہتے ہیں۔ اصل میں جب تک خدا کے ساتھ کھڑے تعلق نہیں ہوگا اس کی بنائی ہوئی دنیا میں قدم قدم پر نقصانات ملتے رہیں گے۔ جو کچھ اس نے بنایا ہے ہم کو اس کی طرف کھینچتا رہے گا۔ اسی کی مصنوعات ہم کو اس کی قدس میں ہم کو پھینکتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی اس کی قدرتوں میں ہمیں اس کا پتہ نظر آتا ہے کبھی کبھی ان کی قدرتوں میں ہمیں اس کا جو نہیں ملتا۔ کبھی ہم کو ان میں خوش محسوس ہوتی ہے کبھی وہ خوشی رخ میں بدل جاتی ہے۔ اس کا کثرت میں چونکہ ہم حق سے ناواقف ہیں کچھ کچھ جنت نظر آتا ہے کچھ کچھ دوزخ یا جنت کی خوشی کے ساتھ نا یافتہ کارنگ رہتا ہے۔

باب اسیدے یوں چن چن پاس کی پاس جوں ہم بونے گلاب اور اناس کی پاس اصل میں جو کبھی بھی اپنی چاکرتا ہے اور اپنی ذات کی عبادت میں مصروف رہتا ہے وہ دنیا کی نہ ہونے کے بعد موت کی پرستش کرتا ہے اور نہ موت کی پرستش دوزخ ہے!

وہاں نیم کا ایک درخت تھا جو درخت ہونے کے ساتھ اپنے اللہ کی شان بیان کر رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی غریبی یہ تھی کہ وہ اپنی درختگی پر نازاں تھا اور ہر وقت جھومتا رہتا تھا۔ غصہ لکھ کر کہتا رہتا تھا۔ یہ درخت اپنے اللہ کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے اپنی جڑوں کو اندر ہی اندر پھیلا رہا تھا اور اپنے جڑوں کی گھمیری یا جھڑیاں تیار کر رہا تھا۔ اس کے پتے اور ٹانگیں ہوا میں اور درختی میں ایسا پیلا پھیل کر رہی ہوتیں کہ اس سے پہلے نہ کوئی درخت ایسا تھا اور نہ ہی شاید آج کے جمل کر ہمارے گرد و ارض پر ایسا کوئی درخت ہو سکے گا۔ اور یہ جو ہر مل اس وقت پتے نہیں کہاں سے آ کر اس کی شاخوں میں بیٹھ گیا

تھا۔ اسی حکم کے تحت آیا تھا جس حکم کے تحت اس درخت کی نمو ہوئی تھی اور اسی طرح اس بادل کے ٹکڑے کے نیچے اسی مقررہ شاخ پر اس کی نشست کا طے ہوا تھا اور وہ خوشی خوشی یہاں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی موجودگی ہی اللہ کی شان تھی اور اسی پرندے کا ہریل پن ہی اس کو اپنے ہونے کا اعزاز بخش رہا تھا۔

ہر قسم کے گناہ کی ابتدا اس مفروضے سے ہوتی ہے کہ میرا جھوٹا وجود وہ وجود جو صرف میری اپنا پرست خواہشوں کے اندر لپٹا ہے یہی میرا اصل ہے اور یہی میرا حقیقی وجود ہے۔ اسی کے لیے مجھے دنیا کی ہر شے حاصل کرنی ہے اور اس کو خوش کرنے کے لیے مجھے ہر وقت تک و دو کرنی ہے۔ اس خیال کے پیش نظر میں لذتوں، خواہشوں، عزتوں، طاقتوں اور محبتوں کو مجتمع کر رہا ہوں۔ میں اپنے اس بے حقیقت وجود کو ڈھانپنے کے لیے دنیا کی ہر شے اور ڈھننے میں لگا رہتا ہوں۔ جیسے مصر کی قدیم حنوط شدہ لاشوں پر پٹیاں لپیٹی ہوتی ہیں میں بھی اپنے ارد گرد پٹیاں لپیٹ کر اپنے مردہ جسم کو محفوظ کرتا رہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری بے حقیقی مجھے اسی طرح کی لپیٹا لیٹی سے حقیقت میں تبدیل کر دے گی۔ خدا کی تلاش میں صرف ایک ہستی ہی میری مدد کر سکتی ہے اور وہ خود خدا ہے۔

مگر تم اپنے خیالات سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنی توجہ ایک نقطے پر مرکوز کر کے مراقبے کے گہرے مرکز میں اس اتر جاؤ اور تصور کی روشنی میں نور کے ہالے میں خدا کی تلاش کرو پھر بھی تم خدا کو نہیں پاسکو گے۔ کوئی بھی جسمانی کوشش اور روحانی عمل تمہیں اس کے قریب نہیں لے جاسکے گا۔ یہ تو اسی وقت ہوگا جب خدا خود اپنا نام لے کر تمہاری روح کے مرکز میں پکارے گا اور خود تمہیں اپنا نام بتا کر تعارف کرائے گا۔ خدا کی دریافت دراصل خدا ہمیں دریافت کرے گا نام ہے۔ ہم کبھی بھی بہشت میں نہیں جاسکتے کیونکہ ہمیں پتہ ہی نہیں بہشت کہاں اور اسے کون سا راستہ جاتا ہے۔ وہ خود عرش بریں سے اتر کر ہماری رہنمائی کرتا ہے اور ہمیں سارے راستوں سے روشناس کراتا ہے۔ دراصل وہ جسے اپنے علم میں حصے دار بناتا ہے وہی اس کو جان سکتا ہے۔

میں جب کبھی خدا کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو اپنے آپ ہی کو خوش کرتا ہوں۔ یعنی اس کے دشمن کو خوش کرتا ہوں۔ میں نے خود غرضی کے اندر جنم لیا ہے اور میں اسی خود الفتی کے درمیان زندہ ہوں۔ وہ لوگ جو خدا کو بالکل نہیں جانتے اور جن کی زندگیاں اپنے غور کے گرد ہی گھومتی ہیں وہ جب بھی خدا کو تلاش کرنے کے لیے نکلے اپنی ذات اور اپنے آپ کو تلاش کر کے گھر لے آئے لیکن یہ بھی مشکل ہے کیونکہ میرا وقت اس ادھیڑ میں گزرتا ہے کہ جو کچھ میرے پاس ہے تمہارے پاس نہیں۔ جو میں ہوں وہ تم نہیں ہو۔ میں نے وہ کچھ حاصل کر لیا ہے جس کی تمہیں ہوا بھی نہیں تھی۔ اس لیے تم کرب میں ہو اور میں خوشی میں ہوں۔ میری تعریف ہوتی ہے اور تم سے نفرت کی جاتی ہے۔ میں زندہ ہوں تم مردہ ہو۔ میں کچھ ہوں جب کہ تم کچھ بھی نہیں ہو اور چونکہ تم کبھی بھی نہیں ہو اس لیے میں اور زیادہ ”ہوں“ اس طرح میں اپنی زندگی

اپنے اور تمہارے فرق کے درمیان ہنسی خوشی بسر کر رہا ہوں۔

جب ایک متکبر انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ میں ایک عاجز اور حقیر فقیر انسان ہوں اس وقت اس کی روح کا دم پائیں ہوتا ہے۔ ایسے انسان کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہوتی۔

اس دنیا میں کوئی مقام تمہاری کا اور Solitude کا نہیں ماسوائے اپنے اندر کے مقام کے اور اندرونی سکون صرف اس شخص کو ملتا ہے جو دوسرے لوگوں کے درمیان اپنی جگہ تلاش کرتا ہے اور دوسرے لوگوں سے ہم آہنگ ہو کر رہتا ہے۔ خدا نے ہم کو عقل، دانش، ذہانت، خوبصورتی اور تقویٰ صرف ہمارے استعمال کے لیے نہیں دیا۔ یہ ساری خدا کی کے لیے ہے۔ جب ایک عضو کو تقویت عطا کی جاتی ہے تو وہ صرف اس کے لیے ہی مخصوص نہیں ہوتی بلکہ اس سے سارا وجود مستفید ہوتا ہے۔

ولی اللہ اور خدا رسیدہ لوگ اپنی تقدیس اور بزرگی کو اس لیے پسند نہیں کرتے کہ ان کی بزرگی انہیں ارفع مقام عطا کرتی ہے اور ہم لوگوں سے برتر سطح پر رکھتی ہے بلکہ وہ اپنی تقدیس سے اس لیے محبت کرتے ہیں کہ یہ ان کو عام لوگوں کے قریب تر لاتی ہے اور ان کو عام لوگوں کی ماتحتی میں داخل کر دیتی ہے۔ ان کو اولیائی دی ہی اسی وجہ سے جاتی ہے کہ ہماری خدمت کریں اور ہمارے کام آئیں۔ اولیاء اللہ ڈاکٹروں اور نرسوں کی طرح ہوتے ہیں کہ بیماروں سے اچھے ہوتے ہیں اور بالکل اچھی صحت اور توانائی کے باعث اور عطائے صحت کے فن کی بدولت بیماروں کی خدمت کرتے ہیں۔ اولیاء کو اپنی اولیائی پر اس لیے خوشی ہوتی ہے کہ انہیں اولیائی کی عطائے ہر شخص کو Admire کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کو ایک ایسی عطائے ہو جاتی ہے جو ایک جرائم پیشہ خونی کے وجود میں اچھائی تلاش کر لیتی ہے۔ اس عمل سے وہ دوسروں کو پرکھنے کے لیے آزاد ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو Condemn نہیں کرتے۔ عاجزی سب سے بڑی نعمت ہے اور اسی کی بدولتی انسان آزادی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ جب تک آپ اپنے تصوراتی وجود کی پشت پناہی کرتے رہیں گے اس کا Defence ہے۔ رہیں گے آپ کو سکون قلب میر نہیں آسکے گی۔ جب تک آپ اپنے آپ کو بنجیدگی سے لیتے رہیں گے اور سوچتے رہیں گے کہ آپ کی نیکیاں اہم ہیں اور اس لیے اہم ہیں کہ وہ آپ کی نیکیاں ہیں اس وقت تک آپ اپنے تکبر اور اپنی عزت کے قیدی رہیں گے۔ اس مقام پر آپ دوسرے لوگوں کی خرابیاں، برائیاں اور ان کے پاپ ڈھونڈتے رہیں گے۔ خدا نے ہم کو خوبیاں اور خصوصی Talent اور نیکی کا اس لیے نہیں دیا کہ ہم اسے وقت بے وقت استعمال کر سکیں۔ جب کچھ اس لیے مرحمت فرمایا ہے کہ ہم اسے دوسرے لوگوں میں تقسیم کر سکیں۔ (میں اپنے پاؤں اس لیے نہیں دھوتا ہوں کہ میرے چہرے سے خوبصورت نظر آئیں)۔

عاجزی کے اندر ہی آزادی ہے بلکہ یہی سب سے بڑی آزادی ہے۔ جب تک آپ اپنے خیال وجود کی ماتحتی کرتے رہیں گے اور اس کو تقویت پہنچاتے رہیں گے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرتے رہیں گے آپ اطمینان قلب اور زندگی بسر نہیں کر سکیں گے۔

جب کسی شخص کو اس کی عاجزی اور Huminity اس کے وجود اس کے کام اس کی شہرت سے علیحدہ کرتی رہے

جاسکتی ہے جو مکمل اطمینان اور بے کارکردگی کے اندر سے جنم لیتی ہے۔ وہ نظر جو گہب اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک سیرانی Fulfillment جس کی حدیں Infinites تک پہنچتی ہیں۔

یوں تو ایسی تنہائی اور ایسی علیحدگی دنیا کے کسی بھی مقام کسی جگہ کسی بھی گوشے میں مل سکتی ہے لیکن بابوں نے اس کے کچھ اصول متعین کر رکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے کم از کم ایک کمرہ ایک کوٹھڑی یا ایک تہہ خانہ ہو جہاں کوئی بھی آپ کو تلاش نہ کر سکے کوئی بھی آپ کے پیچھے نہ آ سکے۔ آپ کو ڈسٹرب نہ کر سکے۔ آپ سے کسی قسم کا رابطہ نہ کر سکے۔ آپ اپنے ارد گرد لپٹے ہوئی دنیا کے سارے بکتر بند اور پٹیاں اور کسی ہوئی پٹیاں کھول کر آرام سے بیٹھ سکیں۔ لوگوں کی جانب سے اور لوگوں کی طرف کھلنے والی ساری نظریں سارے آوازیں سارے ذائقے مسدود ہو جائیں اور آپ صرف آپ ہو کر بیٹھ جائیں۔

جب آپ کو ایسی جگہ مل جائے تو اسے خوشی سے قبول کر لیں اور اس کے ساتھ محبت کرنا سیکھیں اور اگر اسے وقتی طور پر چھوڑنا بھی پڑے تو چھوڑ کر اور اپنا کام کر کے جلدی سے واپس اسی جگہ آ جائیں۔ کچھ بھی ہو اور کسی بھی راحت ملے کسی اور مقام کو اس جگہ پر ترجیح نہ دیں۔ بس یہی آپ کی غار رحمت اور غار سفر ہے۔

یہ تو ہوئی باہر کی تنہائی کا دعویٰ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کو اندر کی تنہائی اس وقت تک نصیب نہیں ہوگی جب تک آپ اپنے ساتھ کچھ عہد کر کے اس پر سختی سے عمل نہ کریں کہ ان تمام تعلقات اور رشتوں اور ناتوں کو اور ان تمام مظلوموں کو رگ نہ کر دیں کہ جو وقت اور Space زمان و مکاں کے اندر آپ نے پھیلا رکھے ہیں۔

جہاں تک ممکن ہو چکے اور خوش فکری اور خوش طبعی کی محفلوں سے گریز کریں۔ ایسی محفلوں سے اجتناب کریں جہاں لوگ ایک دوسرے کو ڈیل کرنے اور ان کی ٹانگ کھینچنے کے لیے جمع ہوتے ہیں جہاں لوگ دوسروں کا ٹھکانا اڑانے اور دوسروں کی تعصیب کرنے اور اوپر سے تالیاں بجانے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ دوستی کے جھوٹے دعوے اور با محنت کے کوڑے بھرم رکھنے کا عکس مہیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تحریروں سے ان کی کتابوں اور رسالوں سے گریز کریں۔ ہاں اگر آپ کو یہ یقین ہو کہ آپ اپنے مسلک پر سختی سے کار بند ہیں تو یہ دیکھنے کو کہ ان دنیا داروں کے درمیان کیا اور ہے ان کی تحریروں دیکھ لیں مگر صرف معلومات حاصل کرنے کے لیے۔ اخبارات فروع اور معلومات کا ذریعہ نہیں ہیں۔ یہ

عزت خانے اور شائے قلعے ہیں جو جی ہی صبح آپ کو کھٹکی پر کس لیتے ہیں اور پھر دن بھر آپ کو ڈرے مارتے ہیں۔ اسی طرح ریل گاڑی اور وی سے بھی اجتناب کریں۔ ان کے گانے اور ان کے اعضائے بدن کے کرب اور کسرت سے بھی پرہیز کریں اور جس بدنی دکھ میں یہ قفس کرتے ہیں اس سے عذر کریں۔ وہ بظاہر بڑا لذیذ نظر آتا ہے لیکن اندر کرب سے بھرا ہوا ہے۔ مگر ان کے سرگرمیٹ نہ ہیں۔ جو مشروبات یہ پیتے ہیں وہ نہ ہیں اور جن کھانوں کو یہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور تعریف کر کے کھاتے ہیں وہ بھی نہ کھاتیں۔ تمہارے باطن کا سفر کر جائے گا۔ ان کے رسالوں اور اخباروں میں چھپی ہوئی تصویریں دیکھ کر اپنی زندگیوں کو مشکل میں نہ ڈالیں۔ اپنی نظر صاف رکھیں کان بند رکھیں اور ذہن پاکیزہ رکھیں۔ اللہ کی پیدا کردہ رات شفاف ہوا میں سانس لیں۔ کام کریں محنت کریں لیکن اللہ کے آسان تلے ان لوگوں کی چھتوں تلے ان کے ہونٹوں

کی اس کو پتہ چل جائے گا کہ مکمل خوشی اور مکمل خورسندی اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب ہم اپنے آپ کو اور اپنے وجود کو فراموش کر دیتے ہیں۔ (نشر + بھنگ + چرس + پاؤڈر) جب ہم کو اپنے آپ کی اپنے وجود کی اپنی کارکردگی کی اپنی شہرت کی اور اپنے انا کی خبر نہیں رہتی تو ہم خالی خالی بانسری کی طرح صاف سترے اور تھوٹے ہو کر خدا سے وابستہ ہو سکتے ہیں۔ صرف اس کے لیے محض اس کی ذات کے لیے جو شخص غریب نہیں ہوگا پچا اور نادار نہیں اس کی روح غیر شعوری طور پر خدا کے بجائے اپنی شہرت کرنے اور اپنی مہما گمانے کی فکر میں لگی رہے گی۔ وہ شخص اس لیے نیک ہوگا کہ اپنی نیکی کو دیکھ کر خوش ہو سکے اور اس کے روشن کرتے ہوئے اس کی توصیف کر سکے۔

اکثر اوقات آپ نے یہ بھی تجربہ کیا ہوگا کہ بہت ہی نیک اور بے حد مقدس آدمی بڑے اڈب ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ گزارا کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کبھی کبھی ایسے لوگوں کو اجازت دے دیتا ہے کہ وہ اپنی تقدیس اور بزرگی حاصل کر سکیں بعد بھی اپنی کمزوریوں خامیوں اور اپنی شخصیت کے داغ دھبوں کو اسی طرح برقرار رکھ سکیں۔ ایسا کرنے سے ان کی بزرگی دوسروں پر ظاہر نہیں ہو پاتی اور کئی مرتبہ خود اپنے آپ پر بھی ظاہر نہیں ہوتی۔ اس واقعہ اور شخصیت اور ایسا روگی وجود رکھنے سے لوگ ان پر آواز سے کتے رہتے ہیں۔ ان کی برائیاں بیان کرتے ہیں اور ان پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ اس سے ان میں عاجزی رقت سلوک اور سجاوید پیدا ہوتا ہے اور اس عمل سے ان کے درجات بڑھتے رہتے ہیں۔ خدا کا شکر کریں کہ ابھی آپ بزرگی میں داخل نہیں ہوئے۔ یہ بڑا جوکھوں کا کام ہے لیکن سچی بات یہی ہے کہ اصل کام بزرگی اور تقدس ہی ہے باقی سب جھوٹ ہے۔ جو لوگ دوسروں کے ساتھ اپنا موازنہ ترک کر دیتے ہیں اور لوگوں کے ساتھ مسابقت سے اور مقابلے میں داخل نہیں ہوتے وہ بہت جلد اللہ والے ہو جاتے ہیں۔

صاحب بصیرت تنہائی کی زندگی اس لیے نہیں بسر کرتا کہ وہ لوگوں سے جدا ہونا چاہتا ہے یا ان کی بک بک سے پرے ہو کر سکون کے لحاظ گزارنا چاہتا ہے۔ وہ تو صحرائیں یا گھٹا میں یا پہاڑ کی غار میں رہ کر تنہائی کی زندگی اس لیے بسر کرتا ہے کہ اُسے لوگوں کو معلوم کرنے کا اور انہیں محسوس کرنے کا ڈھنگ عطا ہو جائے۔ وہ ان کی بہتر طور پر خدمت کر سکے اور ان کے انداز میں گہمداشت کر سکے لیکن یہ اس کی ثانوی خواہش ہوتی ہے۔ اصل خواہش تو یہی ہوتی ہے کہ وہ خدا کو پاس لے سکے ڈھونڈ سکے اور اس سے قریبی علاقہ پیدا کر سکے۔

تنہائی میں داخل ہونے کا ایک ہی رستہ ہے اور وہ بھوک اور پیاس پیدا کر کے اور روزے کی کیفیت سے روزہ ہو کر پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسا شخص ایک ایسی سمت میں بڑھ جاتا ہے جو افق کے اُس پار ہوتی ہے۔ اس مقام پر کوئی جہت ہائی نہیں رہتی جسے وہ اختیار کر سکے۔ وہ ایک ایسی ہستی میں اتر جاتا ہے جس کا مرکز تو ہر جگہ رہتا ہے اور ہر رقبے میں ہوتا ہے لیکن اس کا محیط Circumference کہیں بھی نہیں ہوتا۔ اس محیط بیکراں سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے سڑکی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ سکون اور سکوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسی اس کی گیرائی کا علم ہو سکتا ہے۔ اب اسی سکون اور سکوت میں پیچیدہ اور Activity کا علم شروع ہوتا ہے۔ یہی آپ کو پہلی بار اس حقیقت سے آشنائی ہوتی ہے کہ حرکت کے بغیر عمل کیسے وجود میں آ سکتا ہے اور سکوت میں عمل در عمل کی تیزی کیسے پیدا ہوتی ہے۔ وہ شدید محنت کیسے اختیار کی

اور ان کی محفلوں میں نہیں۔

جس طرح کئی شاعر نہیں اسی طرح بہت سے مذہبی لوگ مذہبی نہیں ہوتے۔ وہ ساری عمر کوشش بھی کرتے رہیں تو بھی اپنے دعوے کو نہیں پہنچ پاتے۔ ایسے لوگ اپنے ذہنوں اور بدنوں کو ابھار ابھار کر اور لٹکار لٹکار کر تھکا دیتے ہیں۔ دوسرے شاعروں کے اور دوسروں بزرگوں کے لہادے اوڑھ اوڑھ کر دکھاتے ہیں لیکن ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

اصل میں لوگ اپنے آپ کو جلد سے جلد بڑا ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ ایک ایسے مصدب شخص کی تلاش میں ہوتے ہیں جو ان کی شخصیت پر رکھ کر انہیں بڑا ثابت کیا جائے۔ یہ ضرورت ان کو اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ جلد سے جلد پاپور ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن تیزی اور تاولی سے نہ بڑے آ رشت پیدا ہوتے ہیں نہ بڑے بزرگ!

بڑے بزرگوں اور بڑے بابا لوگوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان میں عاجزی بھی ہوتی ہے اور Integrity بھی۔ اور یہ دونوں آہستہ ہوتی ہیں۔ ایک بزرگ اور ایک بھگت دوسروں سے اس وجہ سے مختلف ہوتا ہے کہ وہ Humble ہوتا ہے۔ عاجز ہوتا ہے اور عاجزی کی پہچان یہ ہے کہ انسان اس صورت میں نظر آئے جس صورت حال میں وہ خدا کے سامنے پیش ہوا ہو۔ جو شخص ہر وقت خدا کی حضوری میں پیش رہتے ہیں وہ اندر سے بہت سے عاجز ہوتے ہیں اور ایک بھگت کی نشانی یہ ہے کہ لوگوں کے انداز نشست و برخاست۔ ان کے رنگ رنگ کھانوں ان کے مکانات اور ان کی تفریح گاہوں اور ان کی تصویروں اور کیلنڈروں سے بالکل متاثر نہیں ہوتا۔ اس کے اندر یہ خواہش بھی پیدا نہیں ہوتی کہ میں اس طرح سے رہوں یا یہ سب کچھ میرے پاس بھی ہو۔ وہ تو ہر وقت ایسی چیزوں کی تلاش میں رہتا ہے ایسے مکانات اور محفلوں اور میناروں اور فرنیچر اور ڈیکوریشن اور سڑکیوں اور لفٹوں کی کھوج میں رہتا ہے جو اسے خدا سے اصل کر سکیں۔

نیکی کا تصور لوگوں کو اپیل نہیں کرتا۔ اصل میں وہ نیک ہو کر رہنا پسند نہیں کرتے۔ اچھے ہو کر زندگی گزارنا نہیں چاہتے۔ لیکن اگر ان کو یہ بتایا جائے کہ حضرت علامہ نیک عمل کو عملی ذہانت کی عادات اور ان کی خواہش تصور کرتے تھے تو آپ کے ان کہے ہوئے الفاظ پر البتہ کان دھریں گے۔ اصل میں وہ ہر اس شے کے خیال سے خوش ہوتے ہیں جو ان کو چالاک بنانے کا عہد کرے۔ ہمارے ذہن کوؤں کی طرح ہوتے ہیں وہ ہر چمکتی ہوئی شے کو اٹھا کر اپنے گھونسلوں میں لے آتے ہیں۔ ان کے گھونسلے ایسی تکلیف دہ اشیاء سے بھرتے جاتے ہیں اور وہاں آرام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے لیکن وہ اور چمکدار چیزیں جمع کرتے جاتے ہیں

لیکن..... ایک شاعر اپنی ذات کے اندر داخل ہوتا ہے محض اس واسطے کہ وہ کچھ تخلیق کر سکے اور ایک صوفی اس لیے خدا میں داخل ہوتا ہے کہ وہ بھی کسی روز تخلیق کیا جائے۔

میں ولایت سے لوٹ کر آیا تو دو خواہشیں تھیں۔ بہت زیادہ فیشن ایبل اپ ٹو ڈیٹ اور ماڈرن ہو کر رہنے کی خواہش اور روحانیت کے علم کو سمجھنے کی آرزو۔ فیشن ایبل ہونے کے لیے میں نے گالف کی سکیم اپنایا اور Irons کا ایک

سکینڈ ہینڈ ہاف سیٹ خرید لیا۔ روحانیت کے لیے حضرت سائیں بابا جی نوروالے کے ساتھ تعلق کا بندھ لیا۔ عجیب اتفاق سے کہ بابا جی کا ذرا گالف گراؤنڈ کے بالکل ساتھ تھا۔ ادھر سے نکلے ادھر چلے گئے۔ ادھر سے جی بھرا تو ادھر آ گئے۔ میرے لیے دونوں ہی کام مشکل تھے۔

ان دنوں بابا جی کے ایک ارشاد پر کہ ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں پر میرا جھگڑا چل رہا تھا۔ لاڈلا تھا۔ رعایت ملتی تھی۔ ارشاد میں طرح طرح کے کٹڑے نکالتا تھا۔ موجودہ Imperical علم کی مثالیں بیان کرتا تھا۔ بابا جی نے سمجھانے کی کوشش کی۔ کبھی جھڑکی نہیں دی۔ سرزنش نہیں کی۔ محفل سے نہیں نکالا۔ کوئی فتویٰ نہیں لگایا۔ ہنستے رہتے اور میری بیوہ کوئی سنتے رہتے۔ میں Cause of Effect کا بندھ تھا۔ دلیل کا پروردہ تھا۔ ان کی بات کیسے مان لیتا۔

ڈیرے پر بہت سی باتیں بے دلیل بھی ہوتی تھیں۔ ثبوت مانگو تو مہیا نہیں کیا جاتا تھا۔ اعداد و شمار کا کوئی رواج نہیں تھا۔ Sampling سے وہ لوگ ناواقف تھے۔ ہم لوگ مشاہدے کے منطق کے اور قیاس کے علمبردار تھے۔ پھر ہم بغیر جانے بوجھے بغیر تجربے کیسے کیسے مان لیتے کہ ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں۔ بڑی مشکل تھی۔ بڑے استعنائی دن تھے۔ روز روز آتے تھے اور گھبرا دیتے تھے اور الجھا لیتے تھے۔

ایسی ہی سردیوں کی ایک دوپہر میں ڈیرے سے اٹھ کر گالف گراؤنڈ چلا گیا۔ صبح کی دھوپ خوشگوار ٹھنڈی ہوا۔ سردیوں کا موسم چھٹی نہ ہونے کی وجہ سے بہت کم لوگ گراؤنڈ میں۔

میں نے ٹیم کھیلنے کے بجائے ایسے ہی گھومنا پسند کیا۔ سردیوں کے موسم میں ایسی خوشنما دھوپ اور خوشگوار موسم کم ملتا ہے۔ ایک ٹکڑی گالف کھیل رہی تھی۔ میں بھی ان تک پہنچ گیا۔ ایک سنہرے بالوں والا انگریز اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ Agent the hole کھیل رہا تھا۔

میں نے دیکھا کیڑی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے بدن کے ساتھ چھوٹا ہوا سا۔ پھر وہ گیند کے پاس پہنچ کر اس گورے کو مطلوبہ Stick دے کر پیچھے ہٹ جاتا۔ وہ شٹ کھیلتا اور اپنی گیند کی شوکر میں نگاہیں اوپر اٹھا کر دیکھتا اور مطلوبہ مقام کی طرف چل دیتا۔

ہم اس کی ٹیم سے لطف اندوز ہوتے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ گورا تھا پھر سنہرے بالوں والا تھا۔ پھر گیم ان کی طرف کر دیا تھی اس نے تو اچھا کھیلتا ہی تھا۔

جب گیند Green پر پہنچی تو Hole سے کوئی پندرہ فٹ دور تھی۔ پندرہ نہ سبکی بارہ فٹ دور ہوگی اس سے کم نہیں۔

کیڑی نے اسے پٹر نکال کر دیا۔ اس نے پٹر گرین پر رکھ کر اس پر اپنے بدن کا ذرا سا بوجھ ڈالا۔ پھر وہ ذرا نکلا۔ لیکن وہ گیند کی سیدھ میں نہیں تھا۔ پھر اس نے پٹر دو تین مرتبہ گرین پر بھجایا اور اپنا رخ سیدھا کیا پھر اس نے کم

میزاؤ سے سیدھے سبھاؤ بال کو شہوکا دیا اور وہ سیدھا چلتا ہوا جا کر ہول کے اندر اتر گیا۔ ہم سب نے تالیاں بجا کیں۔ اس نے ہاتھ اوپر اٹھا کر اور سر جھکا کر ہمارا شکریہ ادا کیا اور گھوم کر ہمارے سامنے سر جھکا کر اوپر اٹھایا۔ ہم نے دیکھا گورا

اکرام صاحب نے حیران ہو کر کہا ”مسٹر Osuald آپ بالکل نابینا ہیں پھر آپ گولف کس طرح سے کھیل سکتے ہیں؟“

گورے نے ہنس کر کہا یہ آپ کو امتحانہ بات لگے گی لیکن یہ ہے حقیقت You have to be blind to see۔

جب تک آپ کثیر القاصد ہیں اور آپ کی توجہ ارد گرد کی بے شمار چیزوں پر ہے آپ اپنے ٹارگٹ کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ جب آپ نے ارد گرد کی اشیاء سے منہ موڑ لیا تو آپ کی توجہ ایک مرکز پر مرکوز ہو گئی۔ یہ مرکز Blindness سے حاصل ہوتا ہے۔ بھیت رکھتا ہے جب باہر کے ہٹ دے بند۔

اسوالڈ کی گالف کی وجہ سے اس کو کھیلوں کا سامان فروخت کرنے والی ایک دکان میں نوکری مل گئی۔ دکان گھر سے دور تھی۔ اکیلا ایک میل کا سفر کر کے ٹرام کے ذریعے بڑے چوک میں پہنچ کر کرتا۔ سیدھے ہاتھ کو مرکز جب اسے ایک نیگری سے تازہ تازہ ڈبل روٹیوں کی خوشبو آنے لگی تو وہ سمجھتا کہ صبح مقام پر پہنچ گیا ہے۔ وہاں سے آگے پٹرول پمپ اور ڈیزل کی خوشبو آنے لگی۔ یہاں سے بائیں گھوم کر وہ اصل سڑک پر آ جاتا۔ پھر سڑک پر چلتے ہوئے وہ جب تیسرے پمپ پر بریکر پر پہنچتا تو دکان کے قریب ہوتا۔

بڑے سال ادھر کی بات ہے کچھ ایسا ہی موسم تھا۔ گرمیاں جاری تھیں اور سردیوں کی آمد آمد تھی لیکن ابھی سردیاں بہت دور تھیں جس طرح سے وہ دور تھیں اسی طرح سے گرمیاں بھی کافی دور ہو چکی تھیں۔ بہار کا موسم تھا۔ اور پھر حیدر آباد میں تو کسی قسم کا موسم ہو بہار ہی کا موسم ہوتا ہے خصوصاً شام کے وقت۔ ہم دونوں میاں بیوی حیدر آباد میں تھے اور یہ شام ہماری بالکل آواز تھی۔

میں نے بانو سے کہا بھٹ شاہ چلتے ہیں۔ سائیں کو سلام کرتے ہیں۔ سلام کر کے واپس آ جاتے ہیں۔ یہ توڑی دور تو ہے۔ ہم اپنے میزبان سے اس کی موٹر اور خوش الحان ڈرائیور لے کر بھٹ شاہ روانہ ہو گئے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مزار پر پہنچے تو وہاں لوگوں کا اڑدھام تھا اور رات کے دس بج چکے تھے۔ مزد کے سامنے کھلی چادر یواری میں شندے فرش پر بیٹھے پرانی وضع کے موسیقار شاہ کا کلام سنارہے تھے۔ بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔

بہت سے لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ سو رہے تھے۔ عورتیں اپنے بچوں کو ساتھ لپٹائے کچھ سو رہی تھیں کچھ سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ عجب گھر کا سا ماحول تھا۔ سب لوگ آگن میں موجود تھے اور چاند کی روشنی سب پر یکساں پڑ رہی تھی۔ ہم ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ شاہ کی وائی شروع ہوئی ایک خادم دھات کے بڑے سے گلاس میں تولہ ڈیزلہ تولہ دودھ ڈال کر لایا اور اس نے ہم کو ایک ایک گلاس دیا۔ بانو نے گلاس میں جھانک کر دیکھا دودھ تھا۔ پھر اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے ایک جانکار سیانے کی طرح کہا ”شاہ کی وائی شروع ہوتی ہے تو سب زائرین کو تھوڑا تھوڑا دودھ پلانے

ہیں۔ یہ برکت کی بات ہے۔ پی جاؤ۔ اس نے ایک ہی لمبا سا گھونٹ بھرا اور سارا دودھ پی گئی۔ میرے دودھ میں ایک چوٹا سا تکا تھا۔ اس نے مجھے بہت ستایا۔ جب وہ قابو میں نہ آیا تو میں تنکے سمیت دودھ پی گیا اور مجھے اس فتح مندی پر اپنی خوشی ہوئی۔

بانو نے کہا ”آپ یہاں بیٹھیں میں درگاہ کا چکر لگا کر آتی ہوں۔“

جو معاف کر سکتا ہے وہ اس بل کو توڑتا ہے جو اسے انسانوں سے اور مخلوق خدا سے ملاتا ہے اور لوگوں سے جوڑتا ہے۔ بہت ممکن ہے اس کی اپنی زندگی میں ایک ایسا وقت جائے کہ اسے لوگوں سے ملنے کی ضرورت پڑے تو وہ ان سے کیسے ملے گا۔ اس نے تو بل توڑ دیا ہوگا اور خود اپنے ہاتھوں سے توڑا ہوگا۔

برداشت کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب ہم اکثریت میں ہوتے ہیں اور جرات کا اس وقت جب ہم اقلیت میں ہیں۔

ایک نرس نے مجھے بتایا اس کا نام فرخندہ بڑی ذہین بڑی شفیق تھی کہ اکثر لوگ خواہ مخواہ زندگی کی راہ پر چلتے ہوئے موت سے خوفزدہ رہتے ہیں حالانکہ موت بھی زندگی کی طرح ایک قدرتی اور خوشگوار شے ہے۔ میری ساری زندگی ایسی ہی تھی۔ میری ساری زندگی آئی جو موت سے بے حد خوفزدہ تھی۔ اس نے اپنی بہن سے کچھ ایسی زیادتی کی تھی کہ اب اس کا راز مشکل تھا۔ جو لوگ عمر کے سفر پر جانے سے پہلے معافیاں مانگ لیتے ہیں اور خوش خوش روانہ ہو جاتے ہیں اسی طرح ان کے سفر پر جانے سے پہلے جنہوں نے رواں لگی کے کاغذات پر معافی کا ویزا لگو لیا ہوتا ہے ان کی آنکھوں میں ایک لب طرح کی چمک ہوتی ہے اور وہ عجیب خوشگوار اور خوبصورتی سے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

ہمارے بابے کہتے ہیں کہ بندے کا گناہ اللہ کے گناہ کے مقابلے میں بہت بڑا اور بہت سخت ہوتا ہے۔ اگر آپ کی انسان کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور اس کی ناخوشی کا موجب بنتے ہیں تو پھر جب بھی آپ کو ہوش آتا ہے اور آپ معافی مانگنے کے موڈ میں ہوتے ہیں تو اس آدمی کا کوئی سراغ ہی نہیں ملتا کہ کدھر سے آیا تھا اور کدھر گیا۔ لیکن اگر آپ خدا کا کوئی نمر کرتے ہیں کوئی اللہ کا گناہ آپ سے سرزد ہوتا ہے تو اللہ سے بڑی آسانی سے معافی مانگ لیتے ہیں کہ ہر وقت موجود خدا ہر جگہ موجود ہے۔

اس نے کہا مر رہے ہو۔ آخری وقت ہے معاف کر دو۔ کہا میں نے معاف کیا لیکن اگر میں صحت یاب ہو گیا اور ناکالیا پھر اس سے کہہ دینا کہ اپنا سنبھالا کر لے میں اسے چھوڑنے کا نہیں۔

اگر آپ کا سفر لمبا ہے اور آپ تیزی سے سفر کرنا چاہتے ہیں تو Travel light اپنے وجود سے ساری نفرتیں

ساری کدورتیں گلے شکوے ماضی کی کہانیاں، نامعافیاں اور انتقامی آرزوؤں کے بوجھ اتار کر چلیں۔ بڑا سزا آئے گا۔ آسانی سے کئے گا۔

آپ مجھ سے اکثر صوفی کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ صوفی کون ہوتا ہے۔ کیا ہوتا ہے اور اس کی تعریف کیا ہے۔ میں کہتا ہوں صوفی صوفی ہوتا ہے۔ اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی اس کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا کوئی مترادف نہیں کوئی ہم معنی لفظ نہیں۔ آپ صوفی بن سکتے ہیں۔ صوفی رہ سکتے ہیں۔ صوفی کو جان سکتے ہیں لیکن ذہن کے زور پر عقل کی زور پر کتاب پڑھ کر دشمنی میں دیکھ کر صوفی کی تفسیر نہیں کر سکتے۔ صوفی کو جاننے کے لیے صوفی بننا ضروری ہے۔ آپ اس کا ذائقہ چکھ سکتے ہیں لیکن اس ذائقے کو سمجھ نہیں سکتے۔

اگر آپ تصوف کا نوالہ نہیں توڑ سکتے تو اسے کچھ تو سکتے ہیں لیکن اس کے چکھنے سے پیاس اور بڑھے گی اور آپ رک نہیں سکیں گے۔

تصوف ایک انوکھا سحر ہے جو کسی دوسرے فرد سے آپ میں منتقل ہوتا ہے۔ یہ کتاب سے یا دشمنی دیکھ کر حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا ایک سلسلہ ہوتا ہے ایک لڑی ہوتی ہے اور یہ لڑی سے لڑی میں منتقل ہوتا جاتا ہے۔

”بابے اور ڈیرے“

جب میں بابا لوگوں کا ذکر کرتا ہوں تو آپ کے ذہن میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا قصور وار نہیں ہوں۔ آپ سمجھتے ہیں بابا ایک جٹا دھاری بڑی عمر کا آدمی ہوتا ہے جس نے فٹنوں تک لمبا جھنڈا پہن رکھا ہے۔ سر پر چوڑا ٹوپی ہے۔ گلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالائیں ہیں اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سر جھٹک کر اللہ ہو کے نعرے مارتا ہے اور ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو خوفناک نظروں سے دیکھتا ہے۔ ایسے بابے عام زندگی میں بھی ہوتے ہیں لیکن اس کا سلیئم اور اس انداز کے لوگ زیادہ تر فلوں، ڈراموں اور تحریری افسانوں میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ بابے نہیں ہوتے، میری طرح کے غرض مند لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے ایک مخصوص بہروپ بھرا ہوتا ہے۔

جو شخص: مرد یا عورت، جوان یا بوڑھا، بچہ یا ادھیڑ۔ کسی دوسرے کو آسانی عطا کرے اس کو ہم بابا کہتے ہیں۔ بابے وقتی بھی ہوتے ہیں لمحاتی بھی عارضی بھی اور مستقل بھی۔ کچھ ساری زندگی میں ایک مرتبہ کسی دوسرے کو آسانی سے ہم کنار کرتے ہیں کچھ عمر بھر لوگوں کی مشکلات آسانیوں میں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ کچھ کبھی کر دیتے ہیں کبھی نہیں۔ بابوں کی ذیل میں آتے ہیں۔ انسان کی مشکل کو آسانی میں تبدیل کرنے والا بابا کہلاتا ہے۔ خواہ وہ تھری پیس سوٹ پہناتا ہو جو گر جینز پہنتا ہو لمبا جھنڈا پہنے، گلے میں مالائیں ہوں یا تھم میں تسبیح ہو یا گھون مون موننا ہو یا سوکھا پتلا سینک سلائی ہو۔

بابا جی کو ہم پر ایک اعتراض تھا کہ ہم دنیا دار لوگ رہبانیت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور خائف ہوں کی طرح مخلوق خدا سے مل جل کر نہیں رہتے۔ ہم کو لوگوں سے ملتے ہوئے خوف آتا ہے اور ہم ان کو پرے پرے رکھ کر زندگی گزارتے ہیں۔ دفتروں میں بیٹھے ہوتے ہیں چھڑی ہوتے ہیں۔ اردلی ہوتے ہیں۔ گھروں میں بیویوں کو ملازموں کے حوالے کرتے ہیں۔ ان کی ساری خدمت ان سے کرواتے ہیں۔ وہ خود بھی الگ الگ رہنا پسند کرتی ہیں۔ ڈاکٹر کے پاس جانا بازار جانا اماں کے گھر جانا، گروسریاں لینے جانا وغیرہ وغیرہ۔ میں ان کی یہ بات سن کر بہت ہی حیران ہوا کیونکہ ساری کتابوں میں اور سارے لٹریچر میں اور ساری تاریخ میں یہی لکھا ہے کہ صوفی لوگ راہب ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں سے لاتعلقی ہو کر تسبیح پھیرتے ہیں۔ اللہ سے لوگتے ہیں بندے سے منہ پھیرتے ہیں۔ لیکن یہاں آ کر ایک اور ہی شکوہ کھلا کہ ہم دنیا دار لوگ راہب بنے تعلق بنے عمل اور بے..... بے ہوتے ہیں۔

فرمایا لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنا اور ان کی ضرورتیں پوری کرنا ہی عبادت ہے۔ وہ آپ کی محبت سے اور شفقت سے محروم رہیں گے تو معاشرے میں کال پڑ جائے گا اور آپ کی ضرورتیں بھی رک جائیں گی۔ صرف منہ سے بات کر کے لوگوں کی خدمت نہیں ہوتی اس میں عمل بھی ہونا چاہیے۔ ہمارے جتنے بھی ادیب اور شاعر تھے عملی زندگی بسر کرتے تھے۔ امام غزالی پڑھنا لکھنا چھوڑ کر صاحب مال ہوئے لوگوں سے ملے جلے۔ شیخ اکبر ابن عربی، فرید الدین عطار، رومی، ادھر ہندوستان میں داتا صاحب، عین الدین چشتی، حضرت بختیار کاکی یہ سب لوگ کام کرتے تھے۔ مخلوق خدا کے کام آتے تھے۔ ان کی بہتری کے لیے ان کے ہاتھ بٹاتے تھے۔ کیونکہ یہ حضور کی سنت تھی اور یہ سب لوگ اس سنت پر عمل کر کے ہی آگے بڑھ سکتے تھے۔

میں نے کہا ہم شاعر اور ادیب بنو، ان کی خدمت کرتے ہیں۔ انہی کے غم میں گھلتے ہیں۔ انہی کے گم گاتے ہیں۔ جتنے بھی ایڈیٹوریل لکھ جاتے ہیں، کالم رقم جوتے ہیں افسانے تحریر ہوتے ہیں شاعری ہوتی ہے، غزلیں، نظمیں، مرعے ترانے لکھ جاتے ہیں سب لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے ہوتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کرتے کہ فیض صاحب کسی طور سے روئیاں لگوا کر لارے ہیں، نور بنی بیوہ اور اس کے بچے بھوکے ہیں اور ان کا کام کرنے والا کوئی نہیں۔ قاتل شفا کی کسی کو پیٹھ پر لا کر ڈاکٹر صاحب کے یہاں نہیں لے جاتے۔ میں اور ممتاز مفتی کسی یتیم کی فیس جمع کرانے نہیں جاتے۔ ہم انسانوں کے لیے نہیں انسانیت کے لیے کام کرتے ہیں اور یہ افراد کے لیے کام کرنے سے بہت بہتر کام ہے۔ ہم سسٹم بدلتے ہیں بڑے کام کرتے ہیں آپ لوگوں کی طرح لٹکر نہیں کھلاتے پھرتے۔

فرمایا چھت پر چڑھنے کے دو طریقے ہیں ایک تو میزمری لگا کے زیہ بہ زیہ اور دوسرا پھٹا لگا کے ڈھلوان پر آگے بڑھ کے اوپر اٹھ اٹھ کے۔ میزمری والا تو یہ دیکھے گا کہ میں اتنے ڈنڈے چڑھ گیا اور اتنے باقی ہیں اور پھٹے والا دیکھے گا ابھی چھت دور ہے اور ابھی بہت سا کام باقی ہے۔ یہی حال دین کا ہے کچھ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ اللہ کی طرف بڑھنے میں

چڑھ گئے اس کا شکر ہے اور ہمیں بھی شاباش ہے کہ ہم نے اتنی کوشش کر لی۔ اب دو تین دن سے اور باقی ہیں ہیں گے۔ لیکن بچے لگا کر چڑھنے والا کہتا ہے کہ ابھی تک پتہ نہیں کہ کتنی منزل اور رہ گئی ہے۔ جب تک اوپر نہیں پہنچا جاتا یہی سمجھیں گے ابھی سفر جاری ہے۔

باباجی نے پوچھا "ایک تیز رفتار گھوڑا ایک سست رفتار گھوڑے سے دس گنا اونچا کیوں ہوتا ہے۔"
 "وہ اس لیے سرکار" چھوٹے صوفی نے کہا کہ "اس کی رفتار سست رہ گھوڑے سے دس گنا گہری ہوتی ہے۔"
 "شاباش! لیکن اگر وہ اپنی راہ سے بھٹک جائے تو پھر وہ دس گنا تیزی سے بدراہ پر بھی نکل جاتا ہے" باباجی نے کہا۔
 "ہاں جی یہ تو ہے سرکار۔"

"لیکن ایک بات نہ بھولنا چاہیے کہ جب اس تیز رفتار راہوار کو یہ معلوم ہو گیا کہ وہ غلط راستے پر آ گیا ہے تو پھر وہ دس گنا تیزی سے سرپٹ بھاگ کر صحیح منزل کی طرف بھی نکل جائے گا۔ یہی حال انسان کا ہے۔ جب ایک پاک دل انسان نادام ہوتا ہے اور اپنے کیے پر شرمندہ ہوتا ہے تو اپنی منزل اس تیزی سے دوبارہ حاصل کر لیتا ہے لیکن سست رو آدمی سے یوں نہیں ہوتا۔

"جو پاک کا ساتھ دیتا ہے وہ پاک ہو جاتا ہے۔"

میں نے مفتی سے پوچھا کہ یہ جو تم ہر وقت کسی نہ کسی صوفی کی بات کرتے رہتے ہو اور اس کا جام لے کر اس کا ذکر کرتے ہو تو تم کو اس سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ کہنے لگا اس سے مجھے ایک جسمانی Satisfaction ہوتی ہے گویا میرے وجود کے اندر ایک Tangible وزن در آیا ہے اور میں پہلے کے مقابلے میں اپنے آپ کو وزن دار سمجھنے لگا ہوں۔ میں نے کہا وہ کس قسم کا وزن ہوتا ہے.... کہنے لگا یوں لگتا ہے جیسے کچھ سونے کا ایک بڑا سا ڈالا ہو جو تکلیف کا باعث نہ ہو اور بدن کی بے وزنی دور کرتا ہو۔

قول کی حد تک نفس راضی رہتا ہے جب عمل کی حد شروع ہوتی ہے تو نفس بھاگتا ہے کیونکہ نفس خدمت کو قبول نہیں کرتا۔ (جب میں پہلے روز گیا تو پوچھا کیا کرتے ہو انسان نگار ہوں.....)

نفس انسانی وجود میں ایک کنٹرول کرنے والا پرزہ ہے۔ گراموفون گورنر چمکے کار گیولیراے سی کا ہیٹ کنٹرولر گاڑی کا سٹرنگ جہاز کا جائز و سکوپ انسانی وجود کے اندر نفس ایک ریگولیر سمجھ لیں جو موقع کی مناسبت سے وجود کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ اس قدر سیانا اور چالاک ہوتا ہے کہ اس کو کسی قسم کی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس یہ سمجھ لیں کہ آپ اپنا

مگر چوڑ کر کسی کے حوالے کر کے مری سوات گئے۔ اپنے ملازموں کے سپرد کر کے گئے تو اس کی نگہداشت کرنے والے مالک بن گئے اور آپ سے پوچھنے لگے آپ کون ہیں۔ مکان آپ کا ہے۔ وجود آپ کا۔ ذات آپ کی ہے۔ نفس اس کا مالک بن کر ٹانگ پر ٹانگ رکھا بیٹھا ہے اور آپ کی سٹر انگ کر رہا ہے۔

نفس کی مرغوب ترین غذا قول ہے۔ بات کرنا باتوں کے مینا تو تے بنانا، گفتگو کرنا، مضمون پڑھنا، مضمون لکھنا، کام چار کرنا، دردمندی کے قصے بیان کرنا یہ سب قول ہے۔ گفتگو ہے اس کا حال سے کوئی تعلق ہیں۔ ایسی گفتگو سے اور بیان سے نفس بہت راضی رہتا ہے۔ سیاستدانوں کے پیچھے مضمون نگاروں کے مضمون، دردمندوں کی دردمندی کی جانیں۔ اس سے سب کا نفس راضی ہوتا ہے، سننے والے کا بھی اور سنانے والے کا بھی۔

بابوں کے ڈیروں پر محبت کا بڑا ذکر ہوتا ہے۔ نظم میں بھی اور نثر میں بھی۔ حرف میں بھی اور عمل میں بھی۔ ایک دن میں نے پوچھا جناب یہ محبت ہوتی کیا ہے۔ باباجی نے فرمایا محبت دوسرے کے اندر چھپی ہوئی خوبی کا نقاب اتارنے کا نام ہے۔ جس شخص میں جو کوئی بھی خوبی ہے اس پر ایک جھلکا چڑھا ہوتا ہے۔ اس کی خوبی نظر نہیں آتی۔ اس جھلکے کو اتارنے کا نام محبت ہے۔ پردہ ہٹانے کا نام محبت ہے۔ سچ روشن کرنے کا نام محبت ہے۔ مائیکل انجیلو نے کہا پتھر کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ تو داسا ہوتا ہے۔ مجھے اس میں ایک تصویر نظر آتی ہے۔ میں غیر ضروری پتھر اتار کر کپڑے سے چمکتا ہوں اور نیچے سے مجسمہ یاد یوتا نکل آتا ہے اور لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ بابوں کو Worthynes کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ خوبی خالص تلاش کر لیتے ہیں۔ ایسی خوبی جس کا صاحب خوبی کو بھی علم نہیں ہوتا۔

بابے خرابی تلاش نہیں کرتے۔ کچھ عجیب سا علم ہوتا ہے۔ زندگی پر منطبق ہوتا ہے۔ کتاب میں نہیں ملتا۔

1933ء کے شروع کی بات ہے۔ میونخ کے ایک موسیقار نے آئرن سٹائن کو بلجیم اکیڈمی کی معرفت خط لکھا اور موسیقار اور فنکار جس طرح سے ہوتے ہیں اس خط میں اپنے غموں کا اور دکھوں کا اظہار کیا اور پوچھا کہ یہ دنیا کیا ہے اور میں کیا کروں اور کدھر جاؤں۔ تو آئرن سٹائن نے اس کو بڑے سبب سے جواب دیا کہ "میں وہی شخص آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں جس کے نام آپ نے بلجیم اکیڈمی کی معرفت مراسلہ ارسال فرمایا تھا۔ سنو بھائی اور میری مانو... کبھی اخبار نہ پڑھا کرو۔ بس کچھ دوست ایسے بنا لو جو تمہاری طرح سوچتے ہوں اور تمہارے ہم خیال ہوں۔ ہو سکے تو پرانے زمانے کے بڑے لوگوں کی تحریروں کا مطالعہ کرو کاٹھ ہے گونے ہے لینگ ہے.... پھر دوسرے ملکوں کی کلاسیکی تحریروں میں ان سے لطف اٹھاؤ اور جب فراغت ہو تو میونخ کے گرد و نواح کے قدرتی حسن سے دلفریب مناظر سے تسکین بھی حاصل کرو۔ ہر وقت اس بھلاوے میں رہو کہ تم زندہ ہو اور مرخ کی مخلوق کے درمیان رہتے ہو لیکن ان کے ساتھ کسی قسم کے گہرے جذبہ باقی اور قلبی تعلق سے پرہیز کرتے رہو۔ اور پھر بھائی کچھ جانوروں کے ساتھ دوستی ضرور لگانا اس مخلوق سے بڑا پیارا ملتا ہے۔ اتنا

کچھ کرنے سے تم ایک مرتبہ پھر ہشاش بشاش اور خوش باش ہو جاؤ گے پھر دنیا کو اور کوئی چیز تمہیں دق نہیں کر سکے گی۔
ہاں ایک بات اپنے ذہن میں رکھ لو اور پکی کر کے گانٹھ دے لو کہ دنیا میں ہر نفس اور شریف اور بھلا انسان ہیرو
اکیلا اور تنہا ہی ہوتا ہے۔ تنہائیوں ہوتا ہے کہ تلخگی میں بہتری اور بہتر اور شرافت کے ماحول سے لطف اندوز ہوتا
رہے۔ میں گہری اور فاقہ کے جذبات سے سرشار تمہیں سلام بھیجتا ہوں۔

آن سائن

آن سائن کے نیچے دیئے گئے بیان پر ستمبر 1937ء کی تاریخ درج ہے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس نے یہ نوٹ
کس کے لیے لکھا اور یہ بیان کہاں دیا۔ نہ ہی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کونسا تقاضا تھا جسے پورا کرنے کے لیے اس
نے یہ تحریر لکھی۔ آن سائن خط لکھنے اور خطوں کے جواب دینے کا بہت پابند تھا۔ کسی معمولی سے معمولی شخص کا خط معمول
ہونے پر وہ اسے جواب ضرور بھیجتا تھا خواہ وہ جواب چند سطروں پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو۔
ایک اندازے کے مطابق آن سائن نے اپنی یہ تحریر ”نرسن کی مجلس دینا“ کی درخواست پر لکھی تھی لیکن یہ
بات یقین سے نہیں کی جاسکتی۔ آن سائن لکھتا ہے کہ:

ہمارا یہ عہد سائنسی افہام و تفہیم اور سائنسی کلیات کی تشہیر اور پھران دریا فتوں کے تکنیکی طور پر صورت پذیر ہونے
اور عملی شکل میں فراہم کرنے کا ایک درخشندہ عہد ہے۔ اس وقت کون ہے جو سائنسی معرکوں پر خوش نہ ہو۔ ان پر فخر نہ کرتا ہو
اور ان کی قہیدہ گوئی میں مصروف نہ ہو لیکن ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ علم ہنرمندی کا دروازی اور سائنس اور تکنیک ہی وہ
ذرائع نہیں ہیں جو انسانیت کو خوشی خوشحالی و تقار اور شادمانی سے سرفراز کر سکیں۔ اس وقت ہمیں گروہ انسانی کو شرف انسانی
کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے ان بزرگوں کے ارشادات کو ہر حال میں سائنس دانوں اور معروضی حقائق کے ماہروں
سے بلند تر مقام پر رکھنا ہوگا جنہوں نے اخلاقی معیار اور انسانی اقدار کے اصول طے کیے ہیں۔ میرے حساب سے
انسانیت کے محسنوں مہاتما بدھ، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات
سائنس دانوں، موجدوں اور تکنیکی ماہروں سے کہیں زیادہ ہیں۔ اگر انسان کو اپنی عزت اپنی خوشیاں اپنی بقا اور اپنا شرف
عزیز ہے تو پھر اس کو پوری قوت اور جیداری کے ساتھ ان بزرگوں کے ارشادات گرامی کی حفاظت کرنا ہوگی اور ان کو ہر عہد
میں زندہ رکھنا پڑے گا۔ خوشی اور خوشرو سندی کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔

شہنشاہ شاہجہان نے ہاتھ سینے پر باندھ کر اور سر جھکا کر کہا ”یا حضرت میاں جیو آپ یہ اثر فیاں اپنے پاس
رکھیں اور انکار نہ کریں۔“

فرمایا ”مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ کم از کم فی الال ضرورت نہیں۔ جب بھی ان کی ضرورت ہوگی میں دارا کو تحریر
بھیج کر منگو لوں گا۔“

شاہجہان کی آنکھیں بھر آئیں اور اسی نے درد بھرے لہجے میں کہا ”شاہا! میں مفلس اور بے نوا شخص ہوں۔

میرے پاس سوائے دولت کے اور کچھ بھی نہیں۔ باقی ہر طرف سے میری جھولی خالی ہے۔ میں آپ کی خدمت میں صرف
پاشرفاں ہی پیش کر سکتا ہوں۔ چونکہ میرے پاس دینے کے لیے اور کچھ بھی نہیں اس لیے اگر آپ انہیں قبول نہیں فرمائیں
مے تو میں سمجھوں گا آپ نے مجھے قبول نہیں فرمایا۔ میری ذات کو رد کر دیا ہے۔ مجھے منسوخ فرما دیا ہے۔ اگر میرے پاس
دولت کے علاوہ اور کچھ ہوتا تو میں دل و جان سے حضور کو نذر پیش کرتا۔

بابا کون؟

ساہیوال کے شیخن پر گاڑی کے انتظار میں ہم نے بابا جی سے پوچھا: ”ہم ٹرین سے کیا سبق سیکھ سکتے ہیں۔“
فرمایا: ”ایک منٹ کی دیر ہو جانے سے تم سب کچھ ضائع کر دیتے ہو۔“ (سب کچھ ضائع ہو جاتا ہے)
مفتی نے کہا اور یہ جوتار برقی ہے۔ بابا صاحب گرٹ گرٹ کر رہے ہیں یہ کیا سکھاتا ہے۔
فرمایا: ”ہر لفظ کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔“

مسعود نے کہا ”اور ٹیلی فون؟“

فرمایا: ”جو کچھ یہاں بولو گے آگے وہی سنائی دے گا۔“

کسی سخت نشست والی کرسی یا سٹول پر بیٹھو اور اپنی کمر اور گردن سیدھی رکھو۔ نشست اس طرح کی ہو کہ سر کمر اور
چوڑا ایک سیدھ میں رہیں۔ لیکن اگر آپ کمر آسن میں بیٹھ سکیں تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں۔ مگر اس میں بھی ریزہ کی
ہڈی کو سیدھ میں رکھنا بیگ۔ اول اول کچھ مشکل پیش آئے گی مگر اس سے گھبرانا نہیں۔ نیچے کا دھڑ اس طرح سے ہو جیسے
پسیلوں کے بنجر نے سارا نیچے کا بدن لٹکا رکھا ہے۔ جی مشق ہو جائے گی تو پھر اس آسن میں خود ہی لطف آنے لگے گا اور یہ
نشست آسان ہو جائے گی۔ آپ گھنٹوں اس طرح بیٹھے رہیں گے اور ذرا بھی ٹکان نہ ہوگی۔
اس کے بعد پرانا یا م طریق پر سانس لیں اور اپنے آپ کو مشق کے لیے تیار کر لیں۔ پرانا یا م کے وقت کھلے
ہوئے گلابی رنگ کا تصور کریں اور اس کو اندر کھینچیں اور اسی طرح باہر نکالیں۔ یہ رنگ مشق ایک سے مشق سات تک کے
لیے ہے۔

کمرے میں تیز اور آنکھوں کو چند ہیانے والی روشنی نہ ہو لیکن مناسب روشنی ضرور ہو جس میں آپ رنگوں میں
تحصیل کر سکیں۔ بھرے پیٹ پر کوئی مشق نہ کی جائے۔ تھکے ہوئے ہوں یا نیند آ رہی ہو تو مشق کو کسی اگلے وقت پر اٹھا
رکھیں۔

سب سے ضروری چیز وقت کی مدامت ہو۔ دونوں وقت مقررہ اوقات میں مشق کریں۔ یعنی سات بجے صبح اور
سات بجے شام کو پھر انہی اوقات کو بھانے کی کوشش کریں۔ آگے پیچھے ہونے سے نقصان کا احتمال ہے۔

مشقوں کو باقاعدگی سے شروع کرنے سے پہلے ان کی طرف ذہنی سفر کرنا بہت ضروری ہے۔ پہلے اپنی کمری پر بیٹھ کر ارد گرد کی چیزوں کو غور سے دیکھیں اور ان کو پانچ منٹ کے اندر اندر اپنے ذہن میں بٹھالیں۔ پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگانا چاہیے۔ لیکن پورے سکون اور اطمینان کے ساتھ یہ سفر کرنا چاہیے۔ چیزوں کے نام دہرانے کی بھی ضرورت نہیں۔ خاموشی سے ان پر نگاہ ڈالنے جائیں۔ خود کلامی منع ہے۔

مشق نمبر 1

اس کے بعد آرام سے اٹھئے اور آہستگی سے باہر نکل جائیے۔ برآمدے میں یا دوسرے کمرے میں جائے اور اپنے ارد گرد توجہ کے ساتھ اور غور کے ساتھ دیکھتے جائیے۔ اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد واپس لوٹئے اور آ کر اپنی کمری پر بیٹھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیجئے ہو سکے تو کانوں کو بھی ڈاٹ لگا کر بند کیجئے۔ اس کے بعد پھر بھی کچھ گھر ذہنی طور پر۔ کمری سے اٹھئے بغیر۔ اسی طرح چیزوں کا جائزہ لیجئے۔ اسی طرح باہر نکلئے۔ اپنی منزل تک پہنچئے اور واپس آئیے۔ منزل تک جاتے جاتے ان سب چیزوں کو دیکھئے۔ جو آپ نے ملاحظہ کی تھیں۔ اس مشق میں سب چیزوں کو "دیکھتے" ہوئے آپ کے سامنے دھند یا دھبے یا خلا نہیں ہونا چاہیے۔

اس مشق کو بار بار کیجئے حتیٰ کہ آپ کو سارا سفر آنکھوں دیکھا معلوم ہونے لگے۔ جب یہ مشق خوب ہم پٹ ہو جائے تو آپ اس پر حاوی ہو جائیں تو اپنے سفر کو پھیلاتے جائیں۔ ذرا دور تک دوسرے کمروں میں جائیں۔ پھر گھر کے چاروں طرف۔ اس کے بعد باہر سڑک پر اور پھر سڑک کے آخری کونے تک۔ جب آپ باہر سڑک پر نکلیں تو صرف بڑی بڑی اشیاء کو دیکھیں جو ایک فٹ سے بڑی ہوں۔ باڑیں، باغ، درخت، بیچ، گھر دروازے وغیرہ لیکن گھڑکیوں کو گھٹنے کی کوشش نہ کریں۔ مقصد یہ ہے کہ آپ کا سراونچا ہو کر تھکنے نہ پائے۔ اس کے بعد آپ قریبی بس سٹاپ پر جائیں یا جانا شروع کر دیں اور واپس آ کر اس کی ذہنی تصویر کشی کریں۔ لیکن یہ سفر پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے بعد آپ آنکھیں اور کان کھول کر اس سفر کی تصویر کشی کی مشق کریں۔

جب آپ سفر میں چیزیں اخذ کر رہے ہوں تو ذہن سے دوسرے ہر طرح کے خیالات سختی سے نکال دیں اور اپنے کام پر دھیان رکھیں۔ اس میں کچھ مشکلیں پیش آئیں گی جن کی تفصیل یہ ہے:

- 1۔ راہ چلتے ہوئے کسی موٹر کار یا کوئی سیٹی یا آوازہ آپ کو متاثر کرے گا۔ تیز آواری سے متاثر نہ ہوں۔
- 2۔ ہر طرح کی گفتگو سے احتراز کریں۔ بے معنی اور لایا یعنی فقرے اور لفظ نہ بولیں نہ سوجھیں۔ اس سے آپ کو اپنی گفتگو کی مشاطگی میں مدد ملے گی اور آپ کی سوچ پہلے سے بہتر ہو جائے گی۔
- 3۔ پہلے پہل ذرا سی تھکن اور سردرد ہوگی۔ لیکن اس میں اعصابی تناؤ یا مشکل میں مبتلا نہ ہوں۔ بس سیدھے سبھاؤ۔ آرام سکون سے رہنے کی کوشش کریں۔ اس سے آپ کو اپنی خواہشوں اور اپنے نفس پر کنٹرول کرنے کا موقع ملے گا اور آپ کی بیٹری چارج ہونے لگے گی۔ اب ذرا اجتناب کی کوشش کریں:

یہ آپ کی پہلی منزل ہوتی۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے صراحی ذہن سے بڑا جھگڑا ہوگا لیکن ہمت نہ ہاریں آپ کو دو منٹ پورے کرنے ہیں اور ضرور کرنے ہیں۔ دوسری مشق اس وقت تک نہ کی جائے جب تک پہلی مشق کی خوب مشق نہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ البتہ ایک تھکی مشق کر سکتے ہیں جس کی تفصیل نیچے دی جا رہی ہے۔

مشق نمبر 1/A (تھکی مشق)

یہ مشق توجہ برصدا سے متعلق ہے۔ اس مشق کو پہلی مشق کے فوراً بعد کرنا چاہیے۔ یا پھر دوسرے وقت کرنا چاہیے۔

پہلی صبح کے وقت مشق نمبر ایک اور شام کو مشق 1 الف۔

ایک صدمہ لیجئے جس کا جسم سے کوئی تعلق نہ ہو۔ سب سے بہتر نام الرحیم ہے۔ اپنی گھڑی میں وقت نوٹ کر لیجئے اور الرحیم کا ذکر خفی شروع کر دیجئے۔ پوری توجہ ذکر خفی کے اندر پیدا ہونے والی "آواز" پر مرکوز کر دیجئے۔ اس وقت سوائے اس نام کے آپ کے لیے اور کچھ بھی موجود نہ ہونا چاہیے۔ نہ اندر نہ باہر۔

گھڑی میں دیکھئے کہ کب تک آپ اس ذکر پر جمے رہے اور خیال بھٹکا نہیں۔ اس وقت کو تین سے ضرب دیجئے۔ یہ وقت آپ کا مقصود ہوا پہلی مشق کی طرح ہے۔

اگر پہلے دن پورا ایک منٹ آپ کا صحیح توجہ کے ساتھ اسم کے ساتھ وابستہ رہا تو آپ نے کمال کیا۔ (اگر کچھ مشکل پیش آئے تو اس مشق میں آنکھیں بند بھی کی جاسکتی ہیں)۔

ان دونوں مشقوں کو دس منٹ تک کی پرسکون اور بے شورش توجہ سے وابستہ کرنا ہے۔ یہ ایک بڑی ابتدا ہے اور

بڑا کمال ہے۔ آپ اپنے آپ میں ایک عجیب فرق محسوس کرنے لگیں مگر لیکن ابھی تو کچھ مشقیں باقی ہیں جن کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ اونٹوں اور انسانوں کا ایک کارواں ایک لقمہ ودق صحرائی سے گزرا اور خوش قسمتی سے ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں اُسے پانی کے حصول کے لیے ایک گہرا سوراخ ملا جو صحرائے بچوں کے پانی سے دور تھا۔ انہوں نے اس سوراخ میں لمبے لمبے رسوں پر جس اور ڈول اتار کر دیکھے لیکن نہ ڈول واپس آئے نہ رسے۔ کچھ لوگوں نے اپنی جان کی قربانی دے کر کہا ہمیں بچے اتاریے ہم باکے اس سوراخ کی ٹوہ لگا کے آتے ہیں۔ آپ کے لیے پانی لائے ہیں اور ہمیں تو اپنی جان آپ پر قربان کرتے ہیں۔

جب پہلا آدمی اس زمینی درز کے اندر اترا تو دیر تک اس کا اتہ پتہ معلوم نہ ہوا۔ اوپر والوں نے رستہ ہلایا آوازیں دیں مگر کوئی جواب نہ ملا۔ رستہ اوپر کھینچا تو آخری سر اکھلا تھا اور سوراخ اس حلقے میں نہیں تھا۔ پھر حوصلہ کر کے دوسرا آدمی اترا۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پھر تیسرا چڑھا اور پانچواں اور جب چھٹا آدمی اس زمین دوز بحث میں اترنے لگا تو قافلے کے ایک سیانے نے اس کا راستہ روک کر کہا ”غضب و اب مجھے نیچے جانے دو اور اندر کی خبر لانے دو اس طرح تو ہمارے آدمی ایک ایک کر کے ضائع ہوتے رہیں گے۔“

قافلے والوں نے بادل خواستہ بابے کی کمر سے رستہ باندھا اور اسے مورے کے اندر سرکا تا شروع کر دیا۔ کوئی دو فرلانگ کی عمودی مسافت طے کرنے کے بعد جب سیانہ سطح آپ پر اترا تو اس کے کنارے ایک عظیم الجثہ غفریت کھڑا تھا۔ اس نے بابے کو دیکھ کر خوشی کا نعرہ لگایا اور کہا آ خر تم بھی آ گئے۔ اچھا کیا۔ میری آرزو پوری ہوئی۔“

سیانہ چپ چاپ دست بستہ کھڑا رہا۔ غفریت نے کہا ”میں تمہیں اسی صورت میں واپس جانے دوں گا اگر تم میرے سوال کا جواب دو گے اور میری تسلی کرو گے۔“

سیانے نے اثبات میں سر ہلایا اور اسی طرح کھڑا رہا۔ غفریت بولا ”اس کائنات میں سب سے افضل اور اعلیٰ مقام کونسا ہے جہاں زندگی بھر پور انداز میں بسر کی جا سکے۔“ سیانے نے سوچا اگر میں کسی خوبصورت و ظریف شہر کا نام لیتا ہوں جہاں دنیا بھر کے نورست کشاں کشاں جاتے ہیں تو یہ اپنے مسکن کے حوالے سے ناراض ہو جائے گا۔

اگر میں عرش بریں اور جنت اور بہشت کا ذکر کرتا ہوں تو ایک غفریت کا ڈھر ڈھر رہی ممکن نہیں رہا۔ سیانے نے سر جھکا کر کہا ”صاحب سوراخ! اس کائنات کا اعلیٰ ترین مقام وہ ہے جہاں آپ خوش رہیں سکھیں رہیں اور پرہیز رہیں چاہے وہ اس کرہ ارض کے اندر ایک بل ہی کیوں نہ ہو۔“

غفریت نے کہا ”دنیا میں تم سے بڑھ کر اور کوئی سیانہ نہیں جو بات کی کہ نہ کو پہنچ گیا ہے۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ تم کو بھی آزاد کرتا ہوں اور تمہارے ساتھیوں کی بھی خلاصی کرتا ہوں جن کو میں نے ابھی ابھی قید کیا ہے۔ جتنے چرس بو کے ڈول تم نے اندر اتارے میں سب پانی سے بھر کر تمہارے ساتھ کرتا ہوں اور ان کو اوپر پہنچانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ چنانچہ عطا ہمارے قافلے کا وہ سیانہ ہے جو ہمیں دیر دیر تک دور دور کی سیر کراتا ہے لیکن اس کا دل دھرتی کے اسی ٹھوڑے پر اکتا ہے جس کو پاکستان کہتے ہیں۔“

ایک فقیر رند شرب مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا مولوی بابا ہم کو شراب پلوا۔ شاہ صاحب نے ایک روپیہ اس کی نذر کیا اور فرمایا کہ جو چاہو سو کھاؤ پیو۔ تم کو اختیار ہے۔ وہ بولا ”ہم نے تو آپ کا بڑا نام سنا تھا لیکن آپ تو قید میں ہیں۔“

شاہ صاحب نے فرمایا ”صاحب من کیا آپ قید میں نہیں ہیں؟“ کہا ”نہیں! ہم تو رند شرب لوگ ہیں۔ کدھر کی قید اور کدھر کی پابندی۔ ہم آزاد ہیں اور آزادی کے پرستار ہیں۔“ آپ نے فرمایا کہ اگر کسی روش کے قیدی نہیں ہو تو آج غسل کرو۔ جب پہنو۔ عمامہ باندھ کر مسجد میں چلو اور نماز پڑھو۔ ورنہ جتنے تم رندی کی قید میں چلا ہو اسی طرح ہم شریعت عزائم کی قید میں پابند ہیں۔ تمہاری آزادی ایک خیال خام ہے۔“ یہ بات سن کر نہایت چپ ہوا اور شاہ صاحب کے قدم پکڑے کہ ”دراصل ہمارا خیال غلط تھا جو ہم آزادی کا دم بھرتے تھے۔“

انسان کو جس چیز میں کمال ہوتا ہے اس پر مرتب ہے۔ چنانچہ دھنڑ وید کو سانپ پکڑنے میں کمال تھا۔ اس کو سانپ نے کاٹا اور مر گیا۔ ارسطو کی بیماری میں مرا۔ افلاطون فالج میں۔ لکھنؤ حراسام میں اور جالینوس دستوں کے مرض میں حالانکہ انہی بیماریوں کے علاج میں کمال رکھتے تھے۔ اسی طرح جس کو جس کی محبت ہوتی ہے اسی کے خیال میں جان دیتا ہے۔ قارون مال کی محبت میں مرا۔ جنوں لیلیٰ کی محبت میں۔ اسی طرح طالب خدا کو خدا کی طلبی کی بیماری ہے وہ اسی میں فنا ہو جاتا ہے۔

گنگ بن کتا دیکھے، سیس بھاری جٹا دیکھے، جوگی کن پھندا دیکھے، چھار لائے تن میں منی ان بول دیکھے، سیوڑ اور پھول کرت کلول دیکھے، بن کھنڈے، بن میں بیر دیکھے، سور دیکھے، گنی اور کور دیکھے۔ مایا کے بھرپور دیکھے۔ پھول رہے دھن میں ادھو کے سکھی دیکھے۔ گنی اور کور دیکھے۔ مایا کے بھرپور دیکھے۔

ایک شخص بیمار پڑا۔ نزع کی نوبت پہنچ گئی۔ گھٹکھڑو بولنے لگا۔ شہر میں مرنے کی خبر دوڑ گئی۔ جس نے سنا فہم کیا۔ لیکن قدرت خدا کی لوٹ پوٹ کر فوج گیا۔ دوست یا رہبر کہا دینے آئے تو بولا "یہ تو مقام تعزیت ہے نہ کہ تہنیت۔ کیونکہ موت کا مزا بھی کچھ لیا اور مرنا بدستور رہا۔"

سیدوزیر علی کو تقریر و مباحثے کا بڑا شوق تھا۔ ہر ایک سے جھگڑنے لگتے۔ ایک روز آنکریہ بیان کرنے لگے کہ میں نے فلاں شخص کو گھٹکھڑو میں بہت معقول کیا۔ ہم نے کہا "صاحب وہ تو معقول ہوا لیکن یہ بتاؤ کہ تم کیا ہوئے؟" اس دن سے تو یہی کہہ آئندہ کسی سے بحث مباحثہ نہ کروں گا۔

کسی شخص نے کشائش رزق کا وظیفہ پوچھا۔ ارشاد ہوا کہ اگر وظائف پر روزی موقوف ہوتی تو دنیا میں ماویں سے زیادہ اور کوئی امیر نہ ہوتا لیکن وظیفہ تو اس معاملہ میں الٹا اثر کرتا ہے کیونکہ دنیا ایک میل چکیل ہے اور نام خدا صابن۔ ہر صابن سے میل کیونکر بڑھ سکتا ہے۔ تم نے کسی وظیفہ خواں کے گھر پر ہاتھی گھوڑے موٹر گاڑی دیکھی ہے۔ خدا کا نام تو صرف اس لیے ہے کہ اس کی برکت سے دنیا کی محبت دل سے دور ہو جائے۔ نہ اس لیے کہ آدمی دنیا میں زیادہ آلودہ ہو۔ پھر ان کو ایک وظیفہ ملا کر کہا گھر پر نہ حاکم خدا کے گھر میں دنیا طلبی کا کیا کام مسجد میں نہ پڑھنا۔

آدمی کب اور کس لیے "اپنوں" سے جدا ہوتا ہے اور کس لیے دوری اختیار کرتا ہے۔ اس کا خیال ہوتا ہے کہ میں الگ ہو کر اپنوں کی بہتر خدمت کر سکتا ہوں۔ خدمت کے تصور کو بہت احتیاط کے ساتھ شوک بجا کر دیکھنا چاہیے۔ میرے ساتھ بھی کچھ اسی طرح سے ہوا کہ میں نے سوچا میں لوگوں کی خدمت زانوئے سے بڑھ کر کر سکتا ہوں۔ ایک ماسٹر صاحب کی جیب میں ایک سنہری جیبی گھڑی تھی۔ وہ سکول سے آتے جاتے اس کی زنجیر کھینچ کر وقت دیکھا کرتے تھے۔

فیصل آباد کے گھنٹہ گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے اس گھڑی کے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ کاش میں بھی ایک آدمی کے بجائے بہت سارے لوگوں کی خدمت کر سکوں۔ ان کو وقت بتا سکوں۔ ان کی رہنمائی کر سکوں۔ اس نے ایک روز رورڈ کر فلوں دل سے دعا کی اور اگلے روز وہ گھڑی ماسٹر صاحب کی جیب سے نکل کر شاہ کے گھنٹہ گھر کے اوپر جا کر چپک گئی۔ اتنی اونچائی پر پہنچنے ہی اس کی حیثیت معدوم ہو گئی اور وہ ہستی سے نبتی میں چلی گئی ہونے سے نہ ہونے میں پہنچ گئی۔ میں نے سوچا تھا کہ میں زانوئے کی نسبت کوئی اور بہتر کام کر سکتا ہوں اور لوگوں کے کام آ سکتا ہوں لیکن میرا دل بھی گھڑی والا ہوا اور میں ہونے سے محروم ہو گیا۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ اکثر یونہی ہوتا ہے۔ وہ بڑا کام کرنے کی امید میں روزمرہ کے چھوٹے کام سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

لیکن پورے طور پر ایسے نہیں ہوا۔ ہم جب ایک دوسرے سے مل لیے۔ ایک دوسرے کو جان گئے تو ہم ایک دوسرے کی ذات کا حصہ بن گئے۔ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو کر بھی جدا نہیں ہوں گے۔ ایک دوسرے کی بھول کے اندر

ہر بھی ایک دوسرے کو بھولے نہیں۔ آپ کو لگتا ہے میں بھی ایسے یہ سوچا کرتا تھا۔ لیکن ایک روز چھ ماہ کی طوالت کے بعد جب شرمندگی کے ساتھ بابا جی سے ملنے گیا تو انہوں نے میرے زبان کھولنے سے پہلے فرمایا "جس وقت تم سڑک کنارے اپنے خیالوں میں مگن جا رہے ہو۔ گاڑی میں سفر کر رہے ہو جہاز کے اندر بیٹھے ہو تو اس وقت تم اپنے گردوں کو اپنے جگر اور اپنے قلب کو بالکل بھول چکے ہو۔ تم کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ اور اس جیسے سینکڑوں اعضاء موجود ہوتے ہیں لیکن ان کی ہر ایک کا احساس نہیں ہوتا۔ تمہارے لاشعور میں بھی نہیں ہوتا کہ تمہاری کمر کے اندر ریزہ کی لاش ہے جس نے وجود کا بوجھ لیا ہوا ہے۔ اس ساری فراموشی کے اندر اور اس ساری لائق اور ناشناسی کے اندر اور بے خیالی کے دائرے میں یہ سارے اعضاء بدن تمہارے جسم کا ایک حصہ بن کر موجود ہوتے ہیں۔ تم کہیں بھی رہو۔ کتنے بھی بھولے رہو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں جس قدر تم تمہاری یاد کے اندر ہیں اسی قدر تم فراموشی کے اندر بھی موجود ہیں۔"

ہم فرمایا غصہ فرد کرنے کا ایک آزمودہ علاج یہ ہے کہ مغضوب علیہ کو اپنے پاس سے جدا کر دیا جائے یا خود اس کے پاس سے جدا ہو جائے اور کسی کام میں لگ جائے۔

ہم فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے ساتھ خیر چاہتے ہیں تو ایسے اسباب غیب سے پیدا فرمادیتے ہیں جس سے اس کے امراض نفسانیہ مثلاً "حب جاہ" کا علاج ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس پر کوئی مرض مسلط ہو جاتا ہے یا کوئی عدد مسلط کر دیا جاتا ہے جو اس کو بدنامی کی ایذا پہنچاتا ہے۔ اس بدنامی سے وہ شخص رسوا ہوتا ہے۔ اول اول تو یہ نفس کو نہایت دکھوار گزرتا ہے مگر جب وہ صبر و رضا اختیار کر لیتا ہے تو پھر اس میں ایسی قوت قہل کی پیدا ہو جاتی ہے کہ بدنامی کو بڑے ثواب سے برداشت کرنے لگتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو قبول عام اور عزت نصیب فرماتے ہیں جس میں اس کو نا نہیں ہوتا۔ اب گویا جاہ عظیم میسر ہوتی ہے اور جاہ پسندی فنا ہو جاتی ہے۔

ہم فرمایا صوفی اور درویش مبراں لیے اختیار کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو اپنے ساتھ کر لیں کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص اپنا انتقام خود لے لیتا ہے تو حق تعالیٰ سارا معاملہ اس کے سپرد کر دیتے ہیں اور جو صبر کرتا ہے اس کی طرف سے حق تعالیٰ خود انتقام لیتے ہیں۔

ہم فرمایا کہ خوب سمجھ لو کہ اتفاق صرف اس وقت مطلوب و محمود ہے جب کہ دین کے لیے مفید ہو اور نا اتفاقی اسی صورت میں مذموم ہے جس دین کے لیے مضر ہو۔ اگر اتفاق دین کو مضر ہو اور نا اتفاقی دین کو مفید ہو تو اس وقت نا اتفاقی ہی مطلوب ہوگی۔

ہم فرمایا کہ شہرت سے دینی اور دنیوی دونوں طرح کا نقصان ہوتا ہے مگر یہ وہ شہرت ہے جو اختیار و طلب سے حاصل ہو۔ جو شہرت غیر اختیاری ہو وہ نعمت ہے!

ہم فرمایا کہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ نزع و فکر کی حالت میں نماز میں مشغول ہو جانے سے رنج بہت کم ہو جاتا ہے۔ جہاد اشاعت اسلام کے لیے مقرر نہیں ہوا بلکہ حکومت اسلام قائم کرنے کے لیے شروع ہوئی۔

☆ فرمایا ایسا کوئی کام نہ کرو جس سے دین کی سبکی ہو۔

☆ فرمایا کہ حزن سے جس قدر جلد مراتب سلوک کے طے ہو جاتے ہیں مجاہدہ سے اس قدر جلد طے نہیں ہوتے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔

☆ فرمایا معراج کی حقیقت ہے قرب حق اور قرب حق کسی خاص صورت کے ساتھ بندھا ہوا نہیں۔ اس میں صورت عروج کی ہوتی ہے جیسے ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا اور کبھی صورت نزول کی ہوتی ہے جیسے حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں ہوا۔

☆ فرمایا: قلندر اس شان کے بزرگ کو کہتے ہیں جو خدا سے کامل محبت رکھتا ہو۔ خدمت اور اطاعت میں ہماری مشقت اٹھاتا ہو اور کسی کی ملامت سے نہ ڈرتا ہو۔

☆ اسلام نہ ترک تعلقات کی تعلیم دیتا ہے نہ انہماک فی الدنیا کی اجازت دیتا ہے بلکہ تعلقات میں انحصار کی تعلیم دیتا ہے۔

☆ ایک مرتبہ حضرت مولانا قاسم نانوتوی نے حضرت حاجی صاحب سے عرض کیا کہ حضرت میں ملازمت چھوڑنا چاہتا ہوں۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا مولانا ابھی تو پوچھ ہی رہے ہو اور پوچھنا دلیل تردی کی ہے۔ اور نہ دلیل خامی کی ہے اور خامی میں نوکری چھوڑنا مناسب نہیں۔

میری سوچ میں یہ تبدیلی کچھ عرصہ پہلے اچانک آئی۔ میں بھی آپ کی طرح چھپے ہوئے لفظ کو بہت تو قیر کی لہر سے دیکھتا تھا اور یوٹیبلو یژن کو ادنیٰ کام سمجھتا تھا۔ پھر ایک تازہ ہوا کا جھونکا آیا۔

میرا بڑا بیٹا جو ایک مقامی کالج میں پروفیسر ہے اور دنت کی بدلتی ہوئی لہروں پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اس بات پر بہت ہی مغموم رہتا ہے کہ میں نے اب تک اس عہد کی سب سے بڑی ایجاد کمپیوٹر پر توجہ نہیں دی اور تو ششم سینے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں۔ اس نے کئی مرتبہ مجھ کو بڑے ہی شکفتہ اور دھیمے انداز میں کمپیوٹر کی عادات و اطوار سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے اور متعدد مرتبہ اپنے کمرے میں لے جا کر اس کی کارکردگی سمجھانے کی جرات بھی کی ہے لیکن مجھے اس کی الف بے تک سے شناسائی حاصل نہیں ہو سکی اور میں بالکل کورے کا کور رہا۔

ایک دن اُس نے ڈرتے ڈرتے بڑے ادب سے کہا کہ اب ایک سال اور تک جس شخص کو کمپیوٹر کا استعمال نہیں آئے گا وہ شخص جاہل اور ان پڑھ سمجھا جائے گا تو میرے دل میں واقعی خوف کی ایک لہریں دوڑ گئی۔ میں نے بڑی لاجنت سے اُس کے کمپیوٹر کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں سوچا کہ وہ سندس اور ڈگریاں جو ہم نے ٹھنڈی راتوں کو ایک ٹانگہ پر کھڑے ہو کر حاصل کی ہیں وہ آن واحد میں ختم ہو جائیں گی اور ہم کمپیوٹر نا آشنا لوگ ایک مرتبہ پھر ان پڑھ لوگوں کی فہرست میں شامل ہو جائیں گے۔ ہم تو خیر بہت ہی چھوٹے لوگ ہیں۔ ہمارے بڑے اور ہمارے علم دوست پر کھانا ٹھیکہ پیر اور سراط بھی سو فٹ ویز سے نا آشنا کی بنا پر بے علم ہو جائیں گے اور ہمارے دیکھتے دیکھتے لائبریریوں اور کتب

خانوں سے نکال دیئے جائیں گے۔ اس عبرتناک سین نے ہمیں کچھ اس طرح سے دھمکایا کہ ہم نے کمپیوٹر کے سبق لینے شروع کر دیئے۔ ابھی ہم نے اس کی چالوں اور چابیوں اور روشنیوں سے روشناس کی ابتدائی منزلیں ہی طے کی تھیں کہ کمپیوٹر نے ایک کام آن پڑا۔ ہمیں اپنے حال ہی میں رہنا نہ ہونے والے دوست محمد صدیق بے خوف کی جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ سے آگاہی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ یہ معلوم کرنا تھا کہ اس کے پاس نقد جمع پونجی کس قدر ہے اور اس نے بڑوں اور باغذوں میں کتنی رقم چھپا رکھی ہے۔

محمد صدیق بے خوف ایک بہت ہی نچا اور نڈر انسان ہے اور اس کو بچ بولنے کا جنون ہے۔ اس کے اسی جنون کی وجہ سے سارے دوست اس سے ڈرتے ہیں اور کئی کتراتے ہیں۔ ساتھ ہی اس کو اپنی درویشی اور فقیری پر بھی بڑا ناز ہے۔ انصاف سراط اور شمس تبریز کو اپنے ساتھیوں میں سے خیال کرتے ہیں اور ان کی کارکردگیوں کو اپنے شعروں میں استعمال کر کے سارا کرڈٹ خود لے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے یہی ضروری سمجھا کہ کمپیوٹر کے ذریعے ان کے باطن کا ECG کر کے اصل حقیقت معلوم کی جائے اور دودھ پانی الگ کر دیا جائے۔ لیکن جب اپنے صاحبزادے کی مدد سے ہم نے محمد صدیق کے بارے میں بخوف ہو کر چند مستند اندازے اُس میں فیڈ کرنے شروع کیے تو کمپیوٹر بڑی صحت اور صفائی کے ساتھ ان کو نکال گیا اور جب آخر میں ہم نے نتیجہ حاصل ضرب معلوم کرنا چاہا تو کمپیوٹر نے گھوٹے کی ڈھانکی پٹ چال چل کر ہمارے "کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نے جو کچھ داخل کیا ہے وہ درست ہے؟"

میں نے کہا "بالکل سونے پھل درست اور حق ہے۔"

پردہ ہمیں پر آیا "یا تم گدھے ہو یا جاسد ہو۔"

ہم نے ذرا غصے میں اپنے بیٹے کی طرف دیکھا تو اس نے نفث کے ساتھ سر جھکا لیا اور بولا "ابا یہ کمپیوٹر کا انداز ہے۔" میں نے کہا "میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی مشین پر اور ایسے ڈیٹے پر جو ہمیں گدھا اور جاسد سمجھے۔ اس سے کہو کہ ہم نامرانی آدمی ہیں اور ایسی زبان کے متحمل نہیں ہیں۔"

میرے بیٹے نے کھٹ کھٹ کر کے کلیدی تختے پر انگلیاں چلائیں اور میری بات کمپیوٹر تک پہنچادی۔ کمپیوٹر نے کہا ایک مرتبہ پھر نوش مندی کے ساتھ سارا ڈیٹا فیڈ کرو پھر بتاؤں گا کہ تم کون ہو۔ ہم نے دوبارہ محمد صدیق بخوف کے بارے میں سارا ڈیٹا فیڈ کیا تو کمپیوٹر نے کہا تمہیں یقین ہے کہ سب کچھ درست ہے۔ ہم نے کہا ہاں۔ بولا ایک مرتبہ پھر دیکھ لو۔ کیا پڑا ڈیٹا صاف کر دوں۔ Erase کر دوں۔ ہم نے کہا "ہاں۔" کہنے لگا "پھر سوچ لو۔" بلکہ تین مرتبہ سوچ کر بتاؤ۔ تم ذرا سے ہماگ قسم کے لوگ ہو۔ میں نے اپنے بیٹے کو جھڑک کر کہا اٹھاؤ اس لعنتی شے کو اور نکال باہر کرو میرے گھر سے۔ جو شے بڑوں کا ادب اور لحاظ کرنے سے قاصر ہو اور بزرگوں کو اس طرح سے جھڑکتی ہو اس کا کوئی مستقبل نہیں۔

میرے بیٹے نے ڈرتے ڈرتے کہا "ابا یہ سائنسی دور ہے اور اب ہمیں اس سے آگے ہی آگے جانا ہے۔ زمانہ بر لحظہ بدلتے رہنے کا نام ہے۔" میں نے کہا "ٹھیک ہے یہ زمانہ ہر لحظہ بدلنے کا نام ہے اور سائنسی دور کو آگے چل کر اور نت نیا ایجادات کرنی ہیں لیکن اتنا ہم تم کو یقین دلاتا ہوں کہ جب ہم اسد اللہ خان غالب کی ہزارویں برسی منار ہے ہوں گے

کہنے لگا "جس قدر فاصلہ ہوگا اسی قدر آسانی ہوگی۔ جس قدر دوری ہوگی اتنی ہی آگاہی ہوگی لیکن یہ آگاہی موت سے پہلے حاصل نہیں ہوگی۔"

موت کا لفظ سن کر میں خوفزدہ ہو گیا تو اس نے کہا "ذات کا پروان موت سے پہلے حاصل نہیں ہوگا۔ جب تک اپنے آپ کو مار نہ لو گے فنا نہیں کر لو گے یہ کیفیت مل نہ سکے گی۔ محمود علی! پرانے کو مارنا پڑے گا اور نئے کو جہنم دینا پڑے گا۔" پھر وہ ہنسا اور اپنی فہمی میں ایک بے معنی سی گالی دے کر بولا "پرانے اعتقاد پرانے وجود پرانی تعلیم پرانی یاری اور پرانی دشمنی کو ختم کرنا پڑے گا۔ ہے حوصلہ؟"

میں نے اُس کی بات کا جواب دیئے بغیر مڑ کر دیکھا سب لوگ مزے سے گنڈیریاں چوس رہے تھے اور نیچے ہونک پر کھیلوں کا ایک جم ٹیبلز جمع ہو گیا تھا۔

اس نے ہولے سے پھر کہا "محمود علی۔ کا محمود علی یہاں کیوں آتے ہو۔ کیا لینے آتے ہو۔ کس سے ملنے آتے ہو۔ کون ہے جو تمہاری یہاں مدد کر سکتا ہے۔ بھاگ جاؤ۔ سب کو چھوڑ کر بھاگ جاؤ۔ جاتے جاتے راستے میں اپنے آپ کو بلی چھوڑ جانا اگر وہ تمہارے پیچھے آنے لگے تو اور زور سے بھاگنا۔ اگر وہ بھی اور زور سے بھاگے تو اس کو دھکا دے کر اوپر سے ایک ڈنڈا مارنا۔"

میں نے ڈر سے ڈرتے کہا "باباجی آپ کون ہیں؟" تو اُس نے مجھ سے بھی زیادہ ڈر کر کہا "میں ایک مفروز ہوں اور تمہیں آزاد کرانے آیا ہوں۔ جلدی کرو اور میرے ساتھ بھاگ چلو۔ یہ جگہ بڑی خطرناک ہے اور اس میں بھگیاڑ رہتے ہیں۔ تم محمود علی سمجھو۔ وہاں تمہاری کھال بڑی نازک ہے۔"

میں نے بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے مانتا بھری نگاہوں سے مجھے چوکا کر کہا "تم بھاگ دو۔ میں تمہاری سمانشی کے لیے یہاں ٹھہرتا ہوں۔ جب تک تم دور نہیں نکل جاؤ گے میں یہیں کھڑا ہوں گا۔ یہ لوگ میرا ہونگی لگا نہیں سکیں گے۔"

میں نے کہا "باباجی میں حق اور سچ کی تلاش میں یہاں آیا ہوں اور جب تک مجھے اس دوارے سے کچھ مل نہیں پاتا میں یہ جگہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اس نے کہا "محمود علی حق نہ تو سیکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی سکھایا جاسکتا ہے۔ حق بولا بھی نہیں جاتا اور جو کچھ بولا جاتا ہے وہ حق نہیں ہوتا۔ بولی جانے والی بات سچ کی بابت ہو سکتی ہے سچ نہیں ہوتی۔ سچ میں اترا جاسکتا ہے سچ اوڑھنا نہیں پاتا۔ بولو کو نہیں میں اترو گے؟ تمہاری ماں کنوئیں میں آوازیں دیتی پھرے گی وے میرا محمود علی کدھر گیا؟ میرا محل کدھر لگا۔ ڈونہا ہے؟ ہے اتنی ہمت۔"

میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا تو ڈاکٹر صاحب نے اونچی آواز میں کہا "اس کو ایک چوٹی اسے کراؤ جاؤ اشفاق صاحب یہ ساری گنڈیریاں ختم ہو جائیں گی۔"

میں نے اس کو انھنی نکال کر دی تو وہ خوش ہو کر مجھے دعا کہیں دینے لگا "اللہ تجھے خوش رکھے آباور کئے حکم حاکم

اس وقت یہ یعنی شے کمپیوٹر موجود نہیں ہوگی البتہ یہ میں مانتا ہوں کہ سمانشی ترقی کی وجہ سے اس وقت ہر گھر میں ایسے ڈیو برش ضرور موجود ہوں گے جو اسٹی کوٹائی سے چلتے ہوں گے اور بغیر ہاتھ ہلائے آپ کے دانتوں کو صاف کر کے منہ سے باہر نکل کر واپس طالتچے میں پہنچ جاتے ہوں گے۔

سمانشی ترقی کے متعلق میرے دل میں اُسی روز الجھن پیدا ہوئی تھی لیکن اتنی بات میرے ذہن میں ضرور آگئی کہ اب وقت تفکر، تعقل، تدبر کا آ گیا ہے۔ اپنے رویوں کی چھان چھنک بہت اہم اور ضروری ہے اور سوچنا پڑے گا کہ علم کیا ہے۔ اس کی ترویج کو وسعت دینے اور سمت عطا کرنے کے لیے کیا کچھ اور کہاں تک کرنا ہوگا۔ علم غیر نافع کو علم نافع سے علیحدہ کرنے کے لیے کوئی ایجنسی ہوگی اور علم میں حقیقی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے کون سے ذرائع اختیار کرنا ہوں گے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے ہم ڈیرے کے ایک کونے میں آڑی ترچھی مچلیاں ڈالے گنڈیریاں چوس رہے تھے اور خوش گیوں میں خرافات ملا کر زبان و بیان کے چسکے لے رہے تھے کہ ہمارے سامنے ایک گھون مون سا آدمی آ کر کھڑا ہو گیا۔ کر بڑی ڈاڑھی آنکھوں میں سرخ رنگ کا سرمہ، نیلی زین کا ٹائٹ کرت اور پانچام۔ بیروں میں بغیر تسموں کے قلیت بون۔ چہرے پر ہوائیاں۔ خوفزدہ کرنے والی آنکھیں۔ ایک ہاتھ میں عشرہ دوسرے میں رنکلی ڈنڈا۔ ہونٹ سی شکل ہونٹوں پر ہمو جھڑکیاں کچھ گالیاں ساتھ ساتھ گانے کے بول۔ اگر وہ آدمی گھوڑا ہوتا تو ساری زندگی نہ سدھایا جاسکتا۔ ساری عمر پکر کا فتار ہوتا۔ گھسے پر لگا رہتا لیکن گاڑی میں جوتنے کے کام نہ آتا۔

اس نے ڈنڈے کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا اور میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اُس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب، سیکرٹری صاحب اور رضا صاحب اُسی طرح بیٹھے گنڈیریاں چوستے رہے۔ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اُس نیلی پوش کو دیکھا نہیں تھا اور اگر دیکھا تھا تو اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اگر وہ پہلے بھی ڈیرے پر آتا رہا تھا اور یہ لوگ اس سے واقف تھے تو انہوں نے جان بوجھ کر اس سے اغماض کیا تھا۔ کچھ عجیب سی بات تھی کہ اُس کے ہونے نہ ہونے کا ان لوگوں پر کوئی اثر پڑا تھا۔

جب میں ڈراؤ اور اسہا سہا اس کے پاس کھڑا تھا تو اس نے اپنے ڈنڈے کو میرے کندھے پر مار کر کہا "محمود علی اس طرح یہاں نے آیا کر۔"

میں نے کہا "میرا نام محمود علی نہیں اور میں اپنی مرضی سے یہاں نہیں آتا۔" اُس نے دوبرتہ اپنے ڈنڈے سے میرا کندھا ٹھکڑا اور ایک عجیب سی زبان میں گالی دے کر کہا "تیرا نام محمود علی ہی ہے اور تو مجھ سے اپنا نام چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

میں نے ایک مرتبہ پھر اپنی ذات اور اپنے نام کی حقیقت اس پر واضح کرنا چاہی لیکن اس نے رنکلی ڈنڈے کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

قائم۔ اونچے مرا ہے۔ جوڑیاں آباد۔ چنگ بھاگ سادے۔“

وہ دعائیں دیتا چلا گیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کے پاس آ کر پوچھا ”ڈاکٹر صاحب یہ کون تھا۔“
انہوں نے بے پروائی سے کہا ”ڈیروں پر ایسے لوگ آتے ہی رہتے ہیں ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دینی چاہیے۔“
میں نے پوچھا ”لیکن یہ تھا کون؟“

ڈاکٹر صاحب نے کہا ”سینٹ کے خالی قصبے اکٹھے کرتا ہے اور رڈی والوں کے پاس جا کر بیچ دیتا ہے۔ لالہ آدمی ہے بھیک بھی مانگتا ہے۔“

میں نے کہا ”لیکن وہ تو عجیب و غریب باتیں کر رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اور اس کی باتوں میں بڑی گہرائی تھی۔“
ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر کہا ”ڈیروں پر عجیب و غریب باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں لیکن ان پر زیادہ توجہ نہیں دینی چاہیے۔ اصل بات صرف گرد کے پاس ہوتی ہے اور اسی کے حاصل کرنے کا حق ہے۔ دوسری باتیں اصل بات سے اکھاڑنے کے لیے آتی ہیں اور کم و بیش سبھی لوگوں کو اکھاڑ کر لے جاتی ہیں آپ صرف اپنی گندیری پر وحیاں رکھیں۔“

اتنے میں بابا جی چوگوشیا ٹوپی پہنے اپنی مخصوص نفرتی مسکرائشیں بکھیرتے اُدھر آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں سرخاں چاشی والا ایک دسترخوان تھا جس پر رزق کے بارے میں فارسی کے دو شعر لکھے ہوئے تھے۔ آپ نے وہ دسترخوان میری طرف بڑھا کر کہا ”یہ تھفہ حال پر آپ کے لیے عطا ہوا ہے۔ یہ سے ہمارے ایک جانی جان آئے ہیں جو اپنے ہاتھ سے دسترخوان ٹھیکے کا کام کرتے ہیں۔ یہ ان کی محبت کا تحفہ ہے۔“

میں نے کہا ”حضور یہ تحفہ تو وہ آپ کے لیے لائے ہیں۔“
مسکرا کر فرمایا ”پیارو جان لو کہ مسائل کے آنے سے پہلے اس کا مقصد موجود ہوتا ہے۔ جلوت میں نہ ہو تو ظنون میں ہوتا ہے۔ اگر دونوں جگہ نظر نہ آئے تو مسائل کے پلے میں بندھا ہوتا ہے۔ کھول کر اُس کے ہاتھ میں دے دو۔ ہاندا بھیجے والا علیم مطلق ہے۔“

گھر سے چلے وقت بانو نے مجھ سے کہا تھا ”اگر آج آپ جلدی آجائیں تو مجھے اچھرے لے چلیں ایک دہز خوان لینا ہے کھلی روٹیاں سوکھ کر لکڑی ہو جاتی ہیں۔“

ابھی پچھلے جسے کی بات ہے کہ میں اخبار پڑھ پڑھا کر اور فربا جو کمرے سے کرسی پر بیٹھا تھا تو میں نے اچانک محسوس کیا کہ میں کس قدر مزے میں ہوں اور کس آسانی کے ساتھ یہ وقت گزار رہا ہوں۔ پھر میرے ذہن میں آسان آسان چیزوں کی پھواری پڑنے لگی اور میں مزید آسان چیزوں کے نقشے بنانے لگا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس دنیا میں کتنے چینی سب سے آسان شے ہے کہ اس کے لیے نہ تو کوئی محنت کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کچھ خاص ذہن رکھنا اور خصوصی طور پر صاحب دماغ ہونے کی احتیاج ہے۔ احمق سے احمق انسان بھی بڑی آسانی کے ساتھ کتنے چینی بن سکتا ہے

اور مشکل سے مشکل کام پر دل کھول کے تنقید کر سکتا ہے۔ پھر میں نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا تو محسوس کیا کہ ہمارے ملک میں تعمیری کام کرنے والوں کے مقابلے میں نقادوں اور نکتہ چینیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے حالانکہ اصل کام کسی شے کو بنانے یا کسی جگہ بونی چیز کو ٹھیک کرنے میں ہے۔ کسی ایک چیز کسی ایک شے کو لیکن ایسا ہونا نہیں لوگ ایک شے کو ٹھیک کرنے کے مقابلے میں ایک لاکھ چیزوں پر نکتہ چینی کرنے کو افضل گردانتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غلطی پکڑنا اور غلطی کی نشاندہی کرنا انسانی فطرت میں داخل ہے لیکن یہ بات بھی ہر حال میں یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسان غلطی بھی کرتا ہے اور ناکام بھی ہوتا ہے اور اپنی ترقی کے راستے پر رک بھی جاتا ہے لیکن اس ساری کائنات میں صرف خدا کی ذات وہ جستی ہے جو نہ تو کبھی غلطی کرتی ہے اور نہ ہی کبھی ناکام ہوتی ہے۔ جو لوگ ہر وقت دوسروں کی غلطیاں پکڑنے میں مصروف رہتے ہیں یا جو ہر وقت اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر افسوس کرتے رہتے ہیں وہ غور و خفا اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگ جاتے ہیں اور جب اُن سے خدا نہیں بنا جاتا کہ ایسا ممکن ہی نہیں تو پھر وہ شیطان بننے کی کوشش کرنے لگتے ہیں اور اس میں اپنا اور دوسروں کا نقصان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

میرے شریف میں ایک مرتبہ سندھ کے ایک زائر سے ملاقات ہوئی جنہوں نے اپنی عمر کے پچیس چھبیس سال غمناک و غامضانہ اور پناہ دار گنہ گاراں کے حرم کی میزبانیوں پر گزار دیئے تھے۔ ہم نے پوچھا سائیں آپ بڑے خوش قسمت ہیں جو اس دربار میں حاضری دیتے ہیں۔ ہمیں فرمائیں کہ آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟“ مسکرا کر کہنے لگا ”بابا ہم یہاں گرتے ہیں اور پھر اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر گرتے ہیں اور پھر اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غلطی کرتے ہیں اور معافی مانگتے ہیں۔ معافی مل جاتی ہے تو پھر بھول چوک ہو جاتی ہے۔ پھر توبہ بخاک کرتے ہیں پھر رحم ہو جاتا ہے۔“

ہم نے کہا ”سائیں! یہ عجیب کیفیت ہماری سمجھ سے باہر ہے!“
فرمایا ”بابا مومن کی شان یہی ہے کہ وہ گرتے تو پھر اٹھ کر کھڑا ہو جائے۔ لغزش کھائے تو پھر اپنی جگہ پر قائم ہو جائے۔ مومن وہ نہیں ہوتا کہ کبھی ٹھوکر ہی نہ کھائے۔ غلطی ہی نہ کرے۔ مومن وہ ہوتا ہے کہ ٹھوکر کھائے لیکن پھر اپنی جگہ پر مستعد ہو جائے۔“
ہم نے جب ان کو ایک مختلف مقام پر پایا تو ان سے دعا کی درخواست کی۔ انہوں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا ”اللہ سائیں مجھے ایسی طاقت عطا فرما کہ جن چیزوں کو میں تبدیل نہ کر سکوں ان کے لیے اپنی جان عذاب میں نہ ڈالوں اور جن کو میں تبدیل کر سکوں ان کے لیے مجھے جرأت عطا فرمائی جائے۔ ساتھ ہی مجھے وہ عقل بھی عطا فرمائی جائے جو ان دونوں حقیقتوں کے درمیان فرق کر سکے تاکہ میں بیکار اور بے یار و مددگار نہ بھٹکتا نہ پھروں!“

ڈاکٹر عبداللہ ڈینیل کا جنت میں داخلے کا فارمولا

ڈاکٹر صاحب بڑے دنوں کے بعد اچانک ایک روز میرے پر تشریف لائے اور کچی زمین پر چوڑی مار کر بیٹھ گئے اور بابا جی کی ٹانگیں دبائے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے جنت میں داخلے کا ایک فارمولا تیار کیا ہے اور اس پر

بزرگان دین کی منظوری چاہتے ہیں۔

فارمولا یہ ہے:

(1) باقاعدگی سے عبادت کی جائے۔ عبادت اللہ سے رابطہ قائم کرنے کا بلا واسطہ ذریعہ ہے اور اسے خدا کے ساتھ ہوتے لائن کا درجہ حاصل ہے۔

(2) خدا کے پیدا کردہ سارے جانداروں سے محبت (Cherish) کی جائے۔ آپ اتنے Harmless بن جائیں جیسے گیارہ ہوتی ہے جو پاؤں تلے پامال ہوتی رہتی ہے۔

(3) اپنے خیالات کو پاک صاف رکھیں اور اپنی گفتگو کو اس سے بھی زیادہ پاکیزہ بنا کر رکھیں۔ گالی، گند، گستاخ، مرد زبان میں نہ لائیں۔

(4) اپنی وضع قطع دینی بنا کر رکھیں۔ لباس جیسے خرام اور قیام میں خدا کے احکامات کے مطابق عمل کریں اور اس کے بتائے ہوئے Symbols (سمبل) استعمال کریں۔

(5) اپنے آپ کو روپے پیسے دولت ثروت کے معاملات سے دور رکھیں۔ زیادہ کمانے زیادہ خرچ کرنے اور زیادہ جمع کرنے سے احتراز کریں۔ اپنے وجود کے سنور میں وہ جمع جتھہ محفوظ کر کے رکھتے رہیں جو اگلے جہان میں کام آنے والا ہو۔

(6) بائبل کا مطالعہ ہر روز کریں اور باقاعدگی سے کریں۔

(7) گندی عادتیں چھوڑ دیں اور ایک قلم چھوڑ دیں۔ اس معاملے میں چاہے چنانچہ سے کام لیا جائے کسی دوست سے کوئی عمل کرائیں لیکن منفی عادتیں بالکل ترک کر دیں۔

(8) جسمانی طور پر چاق و چوبند رہیں۔ ہر روز نہائیں، دانت صاف کریں، اچھے کپڑے پہنیں۔ ناخن تراشیں، بال کنوائس، بن ٹخن کر رہیں۔ آپ کا بدن آپ کے خدا کی بارگاہ ہے۔ وہ شرگ کے پاس رہتے ہیں۔

ارشادات حضرت الحاج امداد اللہ شاہ صاحب مہاجر مکی

1- صوفی وہ ہے جو سوائے اللہ کے دنیا و خلق سے مشغول نہ ہو اور رد و قبول خلق کی پروا نہ رکھے اور مدح اور ذم اس کے نزدیک برابر ہو اور ملاحتی وہ ہے جو نیکی کو چھپا دے اور بدی کو ظاہر کرے۔

2- فقرا اختیار دی وہ ہے کہ واسطے رضائے حق کے ہو۔ یہ دو تہندی سے بدرجہا بہتر ہے۔ فقیر حقیقی وہ ہے جو اپنے نفس سے بھی محتاج ہو۔ یعنی مالک اپنے نفس کا بھی نہ رہے کیونکہ جس قدر فقیر کا ہاتھ ہر چیز سے خالی ہوگا اسی قدر اس کا دل ماسوائے اللہ سے خالی ہوگا۔

3- ہرگز ہرگز دنیا کے گرد نہ جاؤ اور دل کو اس کا گرویدہ نہ بناؤ۔ دنیا کی مثال مثل آدمی کے سایے کے ہے۔

از کوئی سایہ کی طرف متوجہ ہو تو وہ اس کے آگے آگے بھاگتا نظر آئے اور اگر سایہ کو پس پشت کرے تو وہ خود پیچھا نہ چھوڑے اور آدمی کے پیچھے پیچھے آئے۔ یہی حال دنیا کا ہے جو کوئی دنیا کو پس پشت ڈالتا ہے اس کو ترک کرتا ہے۔ دنیا اس کا پیچھا کرتی ہے اور جو کوئی طلب دنیا میں کوشش کرتا ہے اس سے کوسوں دور رہتی ہے۔

4- طالب راہ حق کو ضروری ہے کہ اولاً ماہیت و غایت و حقیقت تصوف کی معلوم کرے۔ بعد ازاں ان کے افقادات اور آداب ظاہری و باطنی کو سمجھے۔ خاص خاص اصطلاحات صوفیا کی جوانی کے کلمات میں پائی جاتی ہیں ان کو جاننے اس سلسلے میں آداب المریدین مصنفہ حضرت ضیاء الدین ابوالنجیب سہروردی بہت عمدہ ہے۔ اس کا مطالعہ کرے۔

5- کلمہ لا اللہ الا اللہ کے باقیا مراتب مردمان کے تین معنی ہیں۔ لا مطلوب، لا معبود، لا موجود الا اللہ اور یہ سب راجع سے اعلیٰ ہے۔

6- کفر مظہر ایمان ہے و برعکس اس کے اگر کفر مخلوق نہ ہوتا تو کوئی ایمان کو کیونکر جانتا۔

7- خوشبو لگاتے وقت سب نیتوں سے عمدہ نیت یہ ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل ہو۔

8- دعائے سلطان عادل مستجاب ہوتی ہے۔

9- دعا کا چار قسم ہیں۔ اول دعائے فرض۔ مثلاً بنی کو فرض ہوا کہ اپنی قوم کی..... مدد واسطے دعا کر۔ پس اس پر دعا کرنا فرض ہے۔ (2) دعائے واجب جیسے دعائے قنوت۔ (3) سوم دعائے سنت جیسے بعد تشہید امداد عمید ماثورہ۔ (4) دعائے عبادت جیسا کہ عارفین کرتے ہیں۔

چونکہ دعائیں متبادل ہیں اور تہذیب حق تعالیٰ کو محبوب ہے لہذا اللہ عام فح العبادۃ وارد ہوا ہے۔

10- رویت حق تعالیٰ کی اس عالم میں ممکن ہے۔ بصارت ظاہری سے یہ رویت ممکن نہیں۔ پس عارف نظر بصیرت سے دیکھتا ہے اگر یہ سمجھے کہ آنکھوں سے دیکھا ہے تو اس کی غلطی ہے۔

11- ایک دم میں وحدیت حاصل کرنے کے لیے خدمت کرنی چاہیے۔

12- بزرگوں کے حضور میں دل کی نگہداشت کرنی چاہیے بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ بزرگوں کے

عالات کی چھان بین میں رہتے ہیں یہ امر مذموم ہے۔

13- وظائف میں عدد و طاق عمدہ ہیں۔ نو ہوں یا گیارہ۔

14- تمام لطائف بالاائے عرش ہیں۔ تصور کرنا چاہیے کہ ان کے حقائق سے فیض ہوتا ہے۔

15- انسان کا ظاہر عہد ہے اور باطن حق۔

16- جو کچھ ایک نگاہ میں حاصل ہوتا ہے دیر پا نہیں ہوتا اور جو ریاضت سے رفتہ رفتہ حاصل ہوتا ہو قائم رہتا ہو۔

17- اصل ذوق و شوق محبت ہو کشف و کرامات ثمرات زایدہ ہیں۔ ہوتے ہوتے نہ ہوتے نہ ہوتے۔

18- تمام فنون میں پندار اور خود نمائی ہوتی ہے اور پندار حجاب ہے چونکہ علم میں زیادہ پندار ہو اس لیے اعلیٰ حجاب

لاکیر کیا گیا ہو۔ غیبت میں پندار ہو اور زنا میں عجز و انکسار۔ حضرت آدم اور ابلیس دونوں سے خطا ہوئی۔ آدم علیہ السلام بوجہ

عجز و انکسار کے مقبول ہوئے اور اٹلیس اپنے علم کے پندار اور حجاب سے مردود ہو گیا۔ فرمایا گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں باطنی اور جانی۔ آدم علیہ السلام کی خطا باطنی ہے اور اٹلیس کی جانی۔ زنا گناہ باطنی ہے اور غیبت جانی اس لیے یہ اشد ہو۔

19- اویسیہ وہ گروہ ہو کہ کسی بزرگ کی روح سے مستفیض ہوا ہو۔ بیعت عثمانی بھی اسی نوع سے ہو کر چند حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان کی غیبت میں بیعت لی۔

20- صورت نیکوں کی اختیار کرنی چاہیے۔ سیرت اللہ تعالیٰ درست کر دے گا کیونکہ وہ واجب و فیاض ہو۔

21- کوئی جگہ اولیاء اللہ سے خالی نہیں۔ جب اولیاء اللہ باقی نہ رہیں گے قیامت واقع ہوگی۔

22- صوفیہ نے اذکار اس لیے مقرر کیے ہیں کہ انسان صفات بشریہ سے نکل کر متعصب صفات اللہ ہو جائے۔ پس کوشش کرنی چاہیے۔

23- اشغال و ادکار کے لیے استعمال مغزیات و مرکبات ضرور رکھنا چاہیے۔ آسان نسخہ یہ ہے۔ شکر سدا کی

سیر و غن زرد ایک سیر۔ مرج سیاه و دولہ۔ سلف کر کے سب ایک جا کر لے۔ ایک دو تولی الصباح کھالیا کرے۔

24- عارف کو نعمائے دنیوی سے بھی ترقی ہوتی ہو کیونکہ نعمائے دنیوی عکس نعمائے اخروی ہیں۔

25- رزق جتنو سے حاصل نہیں ہوتا مگر کرنی چاہیے یہی معنی عبادت کے ہیں۔

26- جو خوشحال اور قائم باغیر ہو دراصل وجود نہیں ہو جیسے کاغذ پر جو حرف لکھے جاتے ہیں وہ کاغذ سے قائم ہیں دراصل بے بنیاد ہیں۔

27- ظاہر میں خلقت کے ساتھ رہنا چاہیے اور باطن میں حق کے ساتھ۔ اگر پانی کشتی کے اندر آوے فرنی ہو جاوے۔ اگر باہر ہے باعث نجات کشتی ہو۔

28- ایک قطرہ مٹی نکلنے سے تمام بدن نجس ہو جاتا ہو کیونکہ مٹی ہر ہر جزو اور اعصاب سے نکلتی ہے بنگال پیشاب کے کہ اس کے واسطے ایک مقام مقرر ہے۔

29- عذاب و ثواب اس جسم پر نہیں ہے بلکہ جسم مثالی پر کہ خواب میں نظر آتا ہی ہوگا۔ نیز روح اعظم جو انسان پر کہ ایک جلی حق ہے عذاب نہ ہوگا۔ وہ مثل آفتاب کے ہے اور روح حیوانی مانند چراغ کے۔

30- کچھ موجود نہیں ہے۔ سب فنا ہے۔ جس کے اول و آخر فنا ہے اس کی حالت متوسط کا کیا اعتبار۔

31- جب گیان حاصل ہو جاتا ہے تمام اعتراض جاتے رہتے ہیں۔

32- اس زمانے میں جہاں ذرا سا اثر ذکر کا قلب پر ہوتا ہے قبل اس کے پختہ ہونے کے دوسرے لطیفہ پر متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے فائدہ نہیں ہوتا۔

33- گدا سخاوت کا آئینہ ہے۔ جیسے چہرے کے حالات بدن آئینہ کے معلوم نہیں ہوتے ایسے ہی مفت کی

منفی ہو بدن گدا کے۔

34- پستی عجیب چیز ہے۔ زمین میں کہ پستی ہے کیسے کیسے پھول اگتے ہیں اور پہاڑوں میں اور پتھروں میں

بازر و رخت کے کچھ پیدا نہیں ہوتا اور پانی پستی میں ہوتا ہے اس سے کیا کیا فائدہ ہے ہیں۔

35- عورت مظہر مرد کی ہے اور مرد مظہر حق ہے۔ عورت آئینہ مرد ہے اور مرد آئینہ حق۔ پس عورت مظہر و آئینہ حق ہے اور اس میں جمال ایزدی ظاہر و نمایاں ہو ملا حظہ کرنا چاہیے۔

36- نیستی اور عدم ایک لذیذ چیز ہے ہر شخص اپنے عدم کا عاشق ہے۔ جب تعب ہوتا ہے سونا اختیار کرنا ہو اور نیک ایک قسم کا عدم ہے۔

37- اخلاق جلیہ زایل نہیں ہوتے البتہ درویشوں کی صحبت سے اس میں تہذیب آ جاتی ہے۔

38- فقیر کو چاہیے کہ نہ طمع کرے نہ منع کرے۔

39- لذت دیدار بہت دور ہو طالب کو لذت نام کافی ہے۔

40- جوانی میں خوف اور بیری میں رجا اور امید کو غالب ہونا چاہیے۔

41- مرض بھی رزق ہے اس کو نعمت خیال کرنا چاہیے۔

42- نیت شریعت و طریقت کی مثل وضو اور نماز کے ہے۔

43- اکثر لوگ ناشکری کی وجہ سے محروم رہتے ہیں۔ کہتے ہیں ہم ذکر و شغل کرتے ہیں اور کچھ حاصل نہیں ہوتا مالاکھ خدا کی لویں لگ جائیگا اس کی یاد میں مشغول ہونا بڑی نعمت ہے۔ اگر خداوند کریم خود جذب نہ فرماتا تو کوئی کیسے اس کی یاد تازہ کرتا۔ بندہ کو بندگی کرنی چاہیے۔ خداوندی خدا کے اختیار میں ہے۔

44- بدن بجا بد کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

45- عاشق کے رنج و راحت مرض و صحت دونوں یکساں ہیں۔ جو لطف و مزیار کے انعام و اکرام میں ہے وہی لطف چین اس کے قبر و ایذا میں ہے۔

46- خدا سے دعا مانگتے رہو کہ وہ ہم غریب کو اپنے اہل و امتحان سے محفوظ رکھے۔ رزق کا کھیل و ذمہ دار خدا ہے۔ ہم پر تمام مصائب ہمارے اعتقاد سے ہیں۔ اسماء اللہ میں سے ہم کو ایک رسم کی بھی معرفت حاصل نہیں۔

47- سبب کا مرکب ہونا توکل کے منافی نہیں ہے۔

48- جس طرح راحت و آرام نعمت ہے اسی طرح بلا بھی نعمت ہے۔ (ایک شخص کا ہاتھ خراب تھا۔ بہت کرب

میں تھا۔ دعا کروانے کے لیے آیا حاجی صاحب نے فرمایا: سب لوگ دعا کریں کہ اسے اللہ اگر چہ ہم کو معلوم ہے کہ یہ تکلیف بھی نعمت ہے لیکن ہم لوگ اپنے ضعف کی وجہ سے اس نعمت کے تحمل نہیں ہو سکتے اس نعمت کو مبدل بہ نعمت فرما دیجئے۔

49- عارف کامل کی یہی نشانی ہے کہ رنج کی بات سے اس کو رنج ہوتا ہے لیکن وہ اس سے راضی ہے۔ رنج اور

رطائیے باہم ہوتے ہیں جیسے کرلیوں میں مرچیں کہ بہت ڈالی جائیں تو سی سی ہوتا ہے۔ ناک اور آنکھوں سے پانی بہت بہتا ہے اور مزا بھی آتا ہے پس لذت اور کلفت دونوں جمع ہو سکتی ہیں۔

50- فرمایا کیا نماز روزہ ہی عبادت ہے۔ دوستوں کا جی خوش کرنا عبادت نہیں؟

51- اگر تم سے کوئی مناظرہ کرے تو تم کبھی مناظرہ نہ کرو۔ اس سے دل سیاہ ہوتا ہے۔

52- فرمایا کرتے تھے کہ ہم تو عاشقِ احسانی ہیں صفاتِ بحث کے ساتھ ہمیں محبت کہاں۔ (خدا کے ساتھ محبت)
اس کے احسان اور انعام کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔

53- خداوند تعالیٰ اپنے بندے سے بجز شکستگی و محنتی کے اور کچھ نہیں چاہتے۔ غرض ان کی بارگاہ میں بجز تقصیر و زاری کے کوئی کامیابی کا طریقہ نہیں۔

54- اکثر لوگ ناشکری کی وجہ سے محروم رہتے ہیں۔ کہتے ہیں ہم ذکر و شغل کرتے ہیں اور کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا حالانکہ خدا کی لومیں لگ جانا اور اس کی یاد میں مشغول ہونا ہی بڑی نعمت ہے۔

55- ملفوظاتِ مشائخ و مکتوبات کا مطالعہ مرد کو شیر بناتے ہیں اور نامرد کو مرد۔

56- اپنے اوقات کو ہر گھڑی و ہر دم ذکر و شغل میں مشغول رکھیں اور ہمیشہ خلوت کو محبوب جائیں اور اغیار کی محبت سے بھاگتے رہیں۔ اگر کثرتِ اشغال و اذکار سے کبھی طبیعت پر ملال گزرے تو کتبِ اخلاق و سلوک جیسے احیاءِ علوم و کیمائے سعادت و مثنوی مولانا روم و مکتوبات حضرت عبدالقادر گیلانی کا مطالعہ پیش نظر رکھیں۔

57- جب طالب محبوب ترقی کرتا ہے تو چونکہ پر تو جمال محبوب حقیقی ہر شے میں ظاہر ہے۔ دل طالب کا ہر جانب خصوصاً حسینانِ جہاں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور لذت لیتا ہے۔ ایسی حالت میں طہارت اور خلوت اپنے پر واجب جانے۔ ہر وقت با وضو رہے اور جس وقت وضو ٹوٹے فوراً کر لے۔ مخلوق سے دور رہے اور ناجائز کھانے سے پرہیز کرے۔

58- عشقِ مجازی حقیقت پر تو اس وقت تک ہے کہ معشوقِ مجازی سے وصال نہ ہو ورنہ نقصانِ عاشق ہے۔ یعنی طالب حق کو چاہیے کہ مجاز میں حقیقت کو دیکھے اگر مجاز کا غلبہ ہو تو اس کے دفع کی صورت یہ ہے کہ لٹنی و اثبات کے ذکر کے وقت معشوقِ مجازی کی صورت اپنے قلب میں تصور کرے اور کلہ لاکو اندرون دل سے تمام شدت و قوت سے کھینچ کر اور الگ

داہنے مونڈھے پر پہنچا کر اور سر کو پشت کی طرف کر کے تصور کرے کہ محبوبِ مجازی کی صورت اور اس کی محبت کو دل سے باہر نکال کر پس پشت ڈال دیا ہے اور سانس کو چھوڑ کر لفظ لا الہ الا اللہ قوت اور زور کے ساتھ دل پر مارے اور ملاحظہ کرے کہ انوار الہی اور محبت کو دل میں لایا ہوں۔ اسی کشاکش اور دمام کے ساتھ ذکر کرے اور چند روز عمل کرے۔ انشاء اللہ چند

عرصہ میں عشقِ مجازی عشقِ حقیقی بن جائے گا۔ خاطر جمع رکھیں۔ نیز پانچ سو بار ہر روز اللہ اللہ الصمد پڑھے اور بعد نماز عشاء ایک سو ایک بار یا عزیز اور اسی قدر یا ارحم الراحمین پڑھے۔

59- ہوس و خواہش باکرہ اور حسین نوعمر سخت مرض ہے اور مانعِ سلوک ہے۔ اس سے پناہ ڈھونڈنی چاہیے۔

اس کا علاج طعامِ لذیذ کا ترک (2) اور روزہ رکھنا ہو (3) اور ذکرِ اسم ذات کی کثرت ہو (4) بعد نماز صبح اور بعد نماز شام ایک سو بار لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم مع بسم اللہ کے مدام پڑھیں اور (5) پانچ سو بار اللہ الصمد بھی روزمرہ پڑھیں۔

60- تواضعِ نفاق کے ساتھ ممنوع ہے۔

☆ خدا

☆ مذہب

☆ روحانیت

☆ تصوف

☆ تصویرِ شیخ یا مرشد گرو

☆ فیروز

☆ فردا اور ارتقاء

☆ انسانی فطرت

☆ کامیابی کے گزرتی

☆ حقیقت اور سچ

☆ ملفوظاتِ ارشادات

خدا

خدا

ہر شخص کا خدا کے بارے میں ایک اپنا ہی تصور ہے۔ لیکن تصور خدا نہیں ہے۔ خدا تصور سے الگ ہے اور الگ الگ تصورات سے خدائے واحد کا کوئی تعلق نہیں۔ خدا کے بارے میں اس وقت علم ہوتا ہے جب انسان خدا کو وحدہ لاشریک سمجھنے لگے۔ لفظی طور پر نہیں روحانی اور نثری طور پر اس سے آشنا ہو جائے۔ خدا ایک کل ہے ایک وحدت ہے۔ لیکن پکٹیکل ذہن سے سمجھ میں نہیں آ سکتا کیونکہ میکینکل ذہن ایک اکائی کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ دوئی والا اور کثیر الافعال ذہن ایک خدا کو نہیں سمجھ سکتا۔ ایک پورا اور کل ذہن ہی اس کو واحد اور لاشریک سمجھ سکتا ہے۔

ایک کل ذہن ایک Whole mind بجائے خود آزادی اور فارغ البالی ہے۔ آدمی یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اس کے ذہن کا ایک بخرہ ہی سارا ذہن ہے جیسے کوئی یہ سمجھ لے کہ ڈنمارک ہی ساری دنیا ہے۔..... ایک حصے یا ایک بخرے کو کل سمجھ لینا ہی راہ کی سب سے بڑی اڑچن ہے۔ اس سے احتراز لازمی ہے۔ یاد بود اور memory انسان کو آزادی عطا نہیں کر سکتی۔ غلط رو اور بے راہ رو یا د انسان کو غلط راستے پر ڈال دیتی ہے۔ کچھ لوگوں کے ذہن یادداشتوں سے اٹے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ ان کے زور پر ہی خدا کی پوجا کرتے رہتے ہیں۔ وہ ان یادداشتوں کو ہی خدا سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ خدا ماضی کی یادوں کا حصہ نہیں ہے۔ خدا ایک کل ہے جو سارے زمانے پر ایک کل کی حیثیت میں ہی پھیلا ہوا ہے۔

(1)۔ لوگوں کے ساتھ مل کر رہنے میں بھی مزا ہے اور ساتھ ہی ان سے خوف بھی آتا ہے کہ وہ ہر دم ہمارے تحفظ کو دھمکاتے رہیں گے اور اُسے خوفزدہ کرتے رہیں گے۔

تم کو ان لوگوں کا مرہون منت ہونا چاہئے جو تمہارے امان کو یا جسے تم تسکین خاطر کہتے ہو اس کو دھمکاتے ہیں اور اس کے لیے خطرہ ہیں۔ یہ لوگ تم کو ایک بنیادی سبق سکھانے پر مامور ہیں۔ یاد رکھو کہ جو امان اور جو تحفظ خطرے میں گھرا ہوا ہو اور دھمکا یا جاسکے وہ امان نہیں ہوتا Security نہیں ہوتی۔

(2)۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو لوگوں میں صرف اچھائی ہی ڈھونڈنی چاہئے۔ یہ بھی اپنے آپ میں اور اپنی مصنوعی نیکی میں تفاخر پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اچھائی آسکتی ہے۔ دیکھی

جاسکتی ہے لیکن صرف برائی کا مطالعہ کر کے۔ کسی چیز سے آنکھیں چرانے والا اس کے مطالعے سے محروم رہ جاتا ہے۔

ذہن کا اور intellect کا سارا وجود اور اس کی اساس ”ناں“ پر قائم ہے۔ جب تک آپ میں نہ کچھ کی صلاحیت ہے اس وقت تک آپ intellect کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اسی وقت تک آپ دانشور ہیں۔ جوں جوں انسان دانشور ہوتا جاتا ہے اس کے لیے ”ہاں“ کہنا مشکل ہوتا جاتا ہے۔

اگر تم ”نہ“ کہہ رہے ہو تو ذہن کام میں مصروف ہے اور غل ہو رہا ہے۔

جب آپ نے ”ہاں“ کہہ دیا تو وجود بظہر گیا۔ عمل رک گیا۔ سکون شروع ہو گیا۔

ایمان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی..... نہ حق میں نہ خلاف۔

جن لوگوں نے خدا کو عقل سے اور دلیل سے ثابت کرنے کی کوشش کی (اور ولایت میں اس پر بڑا کام ہوا اور

اب بھی ہو رہا ہے)۔

اور جن لوگوں نے خدا کے وجود کو دلیل سے ثابت بھی کر دیا اور لوگ اس کو مان بھی گئے انہوں نے خدا کو دلیل

کے تابع کر دیا۔ دلیل کو خدا سے افضل کر دیا۔ دلیل خدا سے بڑی ہو گئی۔

لیکن جو خدا کو دلیل سے ثابت ہو گیا..... وہ دلیل سے رو بھی ہو سکتا ہے۔

چنانچہ اس دنیا میں جتنے بھی دہریے اور خدا کو نہ ماننے والے ہیں وہ خدا کو ماننے والے دلائل پسند لوگوں کی وجہ

سے ہیں۔

دینی لوگوں نے خدا کے بارے میں کبھی کوئی دلیل نہیں دی۔ انہوں نے خدا کو اوڑھا ہے خدا کو اختیار کیا ہے اپنا

ہے..... تم خدا کو دیکھ نہیں سکتے لیکن ان لوگوں کو دیکھ سکتے ہو جنہوں نے خدا کو اختیار کر رکھا ہے۔

جب کسی خدا رسیدہ شخص سے ملاقات ہوتی ہے تو آپ کی عقل اور آپ کی دانش آپ کو یہ نہیں بتلاتی کہ اس

آدی کو پکڑ لو۔ یہ شخص روحانی ہے خدائی ہے.....

خدا رسیدہ آدی کو دیکھ کر آپ کا دل کچھ اور طرح سے دھڑکنے شروع ہوتا ہے۔ آپ کا دماغ نہیں آپ کا دل

اس کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔

ذہن دلیل اور برہان یا تو ثابت کر سکتا ہے یا نا ثابت کر سکتا ہے اور جس وقت وہ کوئی چیز ثابت بھی کر رہا ہوتا ہے

اس وقت وہ ”چیز“ کے بجائے اپنے آپ کو ہی ثابت کر رہا ہوتا ہے۔ اپنی ہی گارہا ہوتا ہے۔

خدا کے وجود کو ثابت کرتے وقت اور لوگوں کو قائل کرتے وقت آپ خدا کو ثابت نہیں کر رہے ہوتے بلکہ اپنے

آپ کو اپنی عقل کو اپنی دانش کو ثابت کر رہے ہوتے ہیں۔

آپ خدا کو اجاگر نہیں کر رہے ہوتے آپ لوگوں کو معقول کر رہے ہوتے ہیں۔

آپ یہ بتا رہے ہوتے ہیں کہ دیکھو اس کو کہتے ہیں دانشمندی اور منطق آویزی۔

ان کی سب سے پسندیدہ خوراک Intellect ہے۔ Ego ذہن پر بڑا پھلتا پھول ہے۔ جب آپ ثبوت مہیا کر رہے ہوتے ہیں یا دلائل کاٹ رہے ہوتے ہیں۔

اس وقت خدا کا وجود یا خدا کا مائل سامنے نہیں ہوتا۔ صرف آپ ہی ہوتے ہیں۔ آپ ہی مرکز بنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ سب توجہ آپ کی ذات پر ہی مرکوز ہوتی ہے۔

آپ محسوس کر رہے ہوتے ہیں کہ آپ بتا سکتے ہیں آپ بیان کر سکتے ہیں۔ آپ ثبوت دے سکتے ہیں۔ دلیل دے سکتے ہیں۔ مثال بیان کر سکتے ہیں۔

اس وقت خدا کا سارا دار و مدار بھی آپ پر ہی ہوتا ہے۔

آپ چاہیں تو اس کو ثابت کر دیں نہ چاہیں تو اس کا بطلان کر دیں۔ اس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔

اس کائنات میں Intellect کے سامنے ہر شے کی حیثیت ثانوی ہے۔ نمر و Intellect ہی ہے۔

ایمان کہتا ہے کہ دانش اور برہان کی حیثیت بعد کی ہے۔ ”ہونے“ کا وجود افضل ہے۔ ساری چیزیں ہونے

سے تعلق رکھتی ہیں۔ Being اول ہے اور دانش ثانوی ہے۔ دانش اس کا ایک جزو ہے۔

لیکن Intellect ایک آمر ہے۔ ایک ڈکٹیٹر ہے جبکہ ایمان جمہور پسند ہے۔ ایمان آپ کے سارے وجود کو

مارے ”ہونے“ کو معنی عطا کرتا ہے۔ expression عطا کرتا ہے جبکہ دانش جو محض ایک جزو ہے اس کے مقابلے میں

اپنے آپ کو افضل اور اعلیٰ اور supreme سمجھتی ہے۔

آج صبح بھی نماز کا وقت ایسے ہی گزر گیا اور یہ کوئی نئی بات نہیں، میرے ساتھ اکثر ایسے ہوتا ہے۔ دیر سے آنکھ

کھلتی ہے اور میں ایسے ہی لیٹا رہتا ہوں۔

میں نے لینے لینے ہاتھ بڑھا کر کل کا اخبار اٹھالیا۔ نئی جلائی، اف تو بہ میرا وجود خوف سے کاٹنے لگا: دو بیٹوں نے

زمین کے کاغذات پر زبردستی انگوٹھے لگوا لیے۔ پھر باپ کو قتل کر کے اس کی لاش جو ہڑ میں پھینک دی۔

مفرد قاتلوں نے اسی گھرانے کے دو اور افراد قتل کر دیے۔

شہر میں ڈاکے، قتل اور چوریوں..... انہو ابرائے تاوان کے لیے تین سال بچہ اٹھالیا جو گھر والوں کی یاد میں روتا

رہتا فوت ہو گیا..... تیس گاڑیاں چوری ہو کر سرحد پار پہنچ گئیں۔

میرے ذہن پر تشویش کے کالے سیاہ بادل چھا گئے اور میرا ہر شے پر سے اعتماد اٹھ گیا۔ میں نے سوچا۔

کار کو چور سوچ لگو الوں گا۔ دروازوں اور کمر کیوں کے پیچھے لوہے کے جنگلے بنواؤں گا۔ گیٹ پر گارڈ رکھوں گا۔

یہ زمانہ اب رہنے کے قابل نہیں رہا۔ خود کشی حرام ہے لیکن ایسے وقت جائز ہونی چاہیے۔ وہ لوگ کس قدر خوش

فیب ہیں جو اس زمانے میں فوت ہو چکے ہیں۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرے پیٹ پر دم سے ایک گولہ گرا اور اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

میری ہی بچی کبر فرشتے سے کود کر میرے پیٹ پر آ گری تھی اور اب وہاں سے چل کر میرے سینے پر چھینک ماری کر کر تک لینے رہو گے، میرے دودھ کا وقت ہو گیا ہے اور تم کو کچھ فکر نہیں..... میرے سینے پر بیٹھ کر خرخر کرنے لگی۔ پھر آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلی گئی۔ میں دیر تک اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتا رہا.....

اسی طرح لینے لینے مجھے خیال آیا کہ اگر میں کبر (بلی) کی طرح ساری فکریں چھوڑ کر اپنے اللہ کی یاد میں کود جاؤں تو کیا مجھے وہ سب کچھ نہیں ملے گا جو اس بلی کو ملتا ہے..... خوراک، رہائش، توجہ، محبت، Care

اگر میرے جیسا سب کچھ ہمہ تن اپنی بلی پر اس قدر توجہ دیتا ہے تو کیا میرا خدا میرے لیے سب کچھ نہیں کرے گا۔ اس خیال سے سرشار میں نے باورچی خانے میں آ کر اس کے لیے دودھ نکالا اور وہ رکابی میں اسے پڑنے لگی۔ جب میرے دل میں یہ کوئی خوف پیدا ہوتا ہے تو میں اس کو کاغذ پر لکھ لیتا ہوں..... کئی مرتبہ پڑھتا ہوں۔ اگر آپ انسانوں کو پرکھنے کے فن سے آشنا ہونا چاہتے ہیں اور ان کی نفسیات سے واقف ہونا چاہتے ہیں میری تائی کے فارمولے پر عمل کریں۔

بابا جی اصل میں خدا ہے کیا؟
خدا نہ جانا جاتا ہے نہ جانا جاسکتا ہے۔ اس کے بارے میں تمہارا ہر خیال حقیقت کے خلاف ہے۔
تو پھر آپ ہر وقت خدا کی باتیں کیوں کرتے رہتے ہیں؟
پرندہ ہر وقت گاتا کیوں رہتا ہے؟ پرندہ اس لیے نہیں گاتا کہ اس کے پاس کوئی اعلان ہوتا ہے، کوئی خبر ہوتی ہے۔ کوئی دوپہر کا ضمیمہ ہوتا ہے۔ وہ اس لیے گاتا ہے کہ اس کے پاس ایک گیت ہوتا ہے۔

کوئی ایسا فارمولا بتائیے جس سے خدا کی محبت پیدا ہو۔
اپنے ہاتھ آپس میں رگڑو۔ شاباش، دونوں ہتھیلیاں..... کیا کوئی گرمی پیدا ہوئی۔
جی بہت (گالوں کو لگاتی ہے)
بس اسی طرح رگڑتے رگڑتے گرمی محبت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ کام میں لگنا ضروری ہے، پوچھتے رہنا نہیں۔

جو نہ دیکھا جاسکے نہ سمجھا جاسکے نہ تصور میں لایا جاسکے۔ اس کو ماننے والے صاحب ایمان لوگ سمجھ بھی جاتے ہیں۔ تصور میں بھی لے آتے ہیں اور دیکھ بھی لیتے ہیں۔ صبح اور سچی زندگی خدا پر ایمان رکھنے سے حاصل ہوتی ہے اور خدا پر ایمان رکھنا اسی کو جاننا اور اس کی جے جے کار کرنا ہے۔

روح تو ایک سوکھی پیاسی اسفنج کا ٹکڑا ہوتی ہے۔ خدا کا تعلق ہی اس کو سرشار اور شرابور کرتا ہے ورنہ یہ سوکھی پیاسی اسفنج ختم ہو جاتی ہے۔

اگر تم نیکی، پاکیزگی اور تقویٰ کے بغیر خدا کا نام لیتے ہو تو پھر خدا ایک نام ہی ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

اس ارضی دنیا کی ساری طاقتیں اور ساری خدائیاں نہ صرف خدا سے دور ہیں بلکہ خدا کے خلاف ہیں۔

بڑے سالوں کی بات ہے وہ میرے پاس آیا، کہنے لگا دعا کریں مجھے کام مل جائے۔ میں نے کہا، تم یقین سے کہتے ہو کہ تمہیں کام کی تلاش ہے؟
کہنے لگا، حد کرتے ہو۔ میں پچھلے دو سال سے بیزار ہوں، اگر مجھے کام کی تلاش نہ ہوگی تو اور کس کو ہوگی؟
میں نے کہا، اچھا اگر تمہیں کام مل جائے اور اس کا معاوضہ نہ ملے..... پھر؟
وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگا تو میں نے کہا، اگر تمہیں کام مل جائے اور کام کرنے کی تنخواہ نہ ملے..... پھر؟
گھبرا کر کہنے لگا، مجھے ایسا کام نہیں چاہیے جیسا کہ تم کہہ رہے ہو۔ مجھے نوکری والا کام چاہیے۔ ایسا کام جس کے دام میں میں نے کہا، اچھا اگر تم کو تنخواہ ملتی رہے اور کام نہ کرنا پڑے..... پھر؟ ایسا سودا اچھا نہیں رہے گا؟
کہنے لگا، سبحان اللہ، ایسا ہو جائے تو پھر اور کیا چاہیے۔
میں نے کہا، تو پھر تم کو کام کی تلاش نہیں، تنخواہ کی اور معاوضے کی تلاش ہے.....
چلو یہی سمجھ لو۔
میں نے کہا، پھر تنخواہ کا مینا بھی کیوں کہیں سے چھپر پھاڑ کے منل جائے۔ کوئی ورثہ، کوئی ترکہ، کوئی الغالی یا بٹہ، کوئی لاشری۔

کہنے لگا، یہ بھی ٹھیک ہے بلکہ بہت ہی ٹھیک ہے۔
اسی طرح ہم خدا کے ساتھ کرتے ہیں۔ بظاہر عبادت لیکن باطن کسی اور شے کی طلب گاری ہوتی ہے۔

میں اپنی ساری مشکلات خدا کے پاس لے جاؤں اور پتھر کا ٹٹا چھوڑ دوں۔ میری ماں کے پاس گاؤں سے ایک

انسان مخلوق ہے۔ ایسی مخلوق جو تخلیق Form کرتا ہے اور Transform کرتا رہتا ہے۔ خود کو تبدیل کر سکتا لیکن وہ..... اور اس جیسے دوسرے سارے انسان انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر اپنے آپ کو خالق اکبر کے حضور ضرور پیش کر سکتے ہیں اور اس سے طلب کر سکتے ہیں کہ اے خدا ہمارے Image کی حفاظت فرما۔ اس کی تعمیل فرما۔ perfect کر دے۔

ایک سینڈ کے لیے خدا کو پا جانا بڑے سے بڑے گناہ کو دھو دیتا ہے۔ بڑی سے بڑی بیماری کو دور کر دیتا ہے۔ مہینے کاٹ دیتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ خدا کو پانے کا لمحہ ہو۔ خدا کے بارے میں باتیں کرنے کا یا اس کے وجود کو جاننے کا یہ وعظ کرنے کا موقع نہ ہو..... کیا مچھلی کو شش کر کے یا در تلاش کر کے اور تحقیق کر کے پانی کو کھوتی ہے۔ کیا غوطہ مار کر ہواؤں کو تلاش کرتا ہے۔ نہیں! مچھلی تو ہوتی ہی پانی میں ہے۔ عقاب اڑتا ہی ہوا میں ہے۔ کیا ہم مطالعہ خدا کو تلاش کرتے ہیں..... بالکل نہیں۔ ہم تو ہوتے ہی خدا میں ہیں۔ کیا اس کا فضل ہم دعا کر کے حاصل کرتے ہیں؟ ہمیں ایسے ہی ملا ہوتا ہے مقامت۔

ہر چیز کا اصل اور ہر شے کا جوہر دراصل غیر مرئی ہوتا ہے۔ نہ نظر میں آنے والا ہوتا ہے۔ یہ دنیا جو نظر آتی ہے اور ہے یہ کسی موجود چیز سے وجود میں نہیں آتی ہے بلکہ غیر مرئی سے، نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ جب زمین میں ایک دانہ پڑتا ہے تو ایک Life force اس پر کام کرتی ہے اور قوت حیات ہمیشہ غیر مرئی ہوتی ہے اور یہی نظر نہ آنے والی لائف راج پر اپنا عمل کرتی ہے اور اس زمین پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور پودا نمودار ہوتا ہے۔ پتے، شگوفے، پھول اور پھل سامنے آتے ہیں۔ کوئی اس کو قدرت کہتا ہے، کوئی نیچر، کوئی قوت حیات لیکن اصل میں یہ خدا ہے۔ یہ طاقت، یہ قانون یہ اصول

انسان کے اندر خدا کی محبت، خدا ہی ہوتی ہے۔

ایک نقطہ اٹھا لو تو سطر (لائن) ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح خدا کو ختم کر دو تو سارے جاندار ختم ہو جاتے ہیں لیکن یہ ختم نہیں ہو سکتا کہ جاندار ختم کر لو تو.....

یہ کبھی خیال نہ کرنا کہ تمہاری اپنی دانش آگے بڑھ کر خدا کا احاطہ کر لے گی اور اس کی ذات متعین کر جائے گی۔ بلکہ جب خدام کوہر بانی خصائص سے بہرہ ور کرے گا تو کسی بیرونی روشنی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بیرونی روشنی کو یکسر ختم ہونا پڑے گا تا کہ خدا کا اپنا نور تمام و کامل نور تمہارے اندر منور ہو سکے۔

انسان مخلوق ہے۔ ایسی مخلوق جو تخلیق Form کرتا ہے اور Transform کرتا رہتا ہے۔ خود کو تبدیل کر سکتا لیکن وہ..... اور اس جیسے دوسرے سارے انسان انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر اپنے آپ کو خالق اکبر کے حضور ضرور پیش کر سکتے ہیں اور اس سے طلب کر سکتے ہیں کہ اے خدا ہمارے Image کی حفاظت فرما۔ اس کی تعمیل فرما۔ perfect کر دے۔

باقر شاہ کبل پوش سے پوچھا کہ تمہارے نزدیک کفر و اسلام میں کوئی فرق ہے؟ جواب دیا، کچھ بھی نہیں۔ شائیں سرکاری ہیں، اندھیرے میں اجالے کا سا حال ہے۔ پوچھا تم کس طریقے پر ہو؟
بولد کسی پر بھی نہیں۔ سردی میں دھوپ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گرمی میں چھاؤں، دن کو اجالا اچھا لگتا ہے۔ کوروشی۔

پھر باقر شاہ نے ہم سے پوچھا تم کس طریقے پر ہو؟

میں نے کہا، صاف ظاہر ہے کہ ہم لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ میں شریک ہیں لیکن باطن کا حال معلوم نہیں کر سکتے ہیں اور کیا ہیں۔ کوئی کہتا ہے باطن کے اندر خدا ہے۔ کوئی کہتا ہے ایک نفس اور ایک شیطان بھی اس میں گھسا ہوا ہے۔ اب وہی جانے، اگر اس میں خدا ہے تو ان سب کا گزرا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بھی خدا کے ساتھ رہیں۔ ہاں بطور خدمت گارڈ کے رہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

ایک وقت میں انسان خدا سے نا آشنا ہوتا ہے، پھر کسی لمحے پوری آشنائی حاصل کر سکتا ہے۔ اک کے ساتھ اک مک ہو جاتا ہے۔ کبھی تو اس کا علم ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ جب کوئی شخص پوری سرخوشی میں ہوتا ہے تو وہ اس کو چرلہ سے، دولت سے، جائیداد سے، ترقی سے منسوب کرتا ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے مگلاں ملول اور رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ چیزیں اور ترقیاں اور دولت اور ہونا انسان کو خوش نہیں رکھتا (جب وہ سوتا ہے یہ ساری چیزیں اس کے تصرف میں نہیں ہوتیں)

جس طرح باپ بچے کو ہوا میں اچھالتا ہے اور پھر پکڑ لیتا ہے، پھر اچھالتا ہے اور پھر پکڑتا ہے۔ ہوا میں پکڑنا ہے، سہتا ہے اور بازو میں واپس آنے پر یقین و آسائش سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یہی حال خدا سے آشنائی کا اور نا آشنائی کا ہے۔ بازوؤں میں آنے کا اور بازوؤں سے نکل جانے کا ہے۔

میں اس کو روم میں بھی ایسے ہی پاتا تھا۔ خالی کے اندر سامع نا آشنا ہوتا ہے اور سامع پر آشنائی کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ یہ خالی اور سامع، آشنائی اور نا آشنائی کبھی ہونا اور کبھی نہ ہونا دیکھا ہی خطرناک کھیل ہے۔ جیسا سرکس کا کرتب باز سب سے اونچی پیٹنگ پر ہلارے لے لے کر کیا کرتا ہے اور اپنی جان جو کھوں میں ڈالتا ہے۔

بڑی موسیقی وہ ہے جو موسیقار کی روح سے ہم آہنگ کر دے۔ اس کی آواز، اس کی لے یا اس کے نغمے

اس دنیا میں کہیں بھی خدا نہیں مل سکتا۔ وہ اپنے وجود اور اپنے تصور سے ماوراء ہے۔ اس کی حقیقت زمان و مکان میں نہیں۔ اس کے وجود کی نمائش نہیں کی جاسکتی۔ دکھایا، بتایا نہیں جاسکتا۔ اس کی حقیقت، اگر کوئی ہے تو وہ اس دنیا کی حقیقتوں سے مختلف ہے۔ کوئی بھی سائنس اب تک کی یا اس کے بعد آنے والی خدا کو سوچ نہیں سکتی۔ اس کو خیال میں نہیں آسکتی۔ Cognitive ذات بحث کا نہ تو احاطہ کر سکتی ہے، نہ اس کو بیان کر سکتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ علم کے اندر کوئی خدا نہیں ہے کہ علم اس کا تحمل ہی نہیں ہو سکتا۔

میں تم کو بڑی اہم، بڑی ضروری اور بے حد خفیہ بات بتانا چاہ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے، تم کو مصروف ہو۔ اپنی زندگی بنارہے ہو۔ اپنا مستقبل سنوار رہے ہو۔ اپنی خواہوں کی تعبیر ڈھونڈ رہے ہو۔ اپنی ذات کو جاننے کی کوشش میں مصروف ہو۔ لیکن میں ایک بہت ہی اہم بات کرنی چاہ رہا ہوں۔ یہ بات اہم نہ ہوتی تو میں تم کو زحمت ہی نہ دیتا۔ تم بات ہی نہ کرتا۔ بہت ممکن ہے کہ تم یہ بات خود بھی جانتے ہو۔ پہلے بھی سن رکھی ہو لیکن اب بھول گئے ہو۔ وقت گزر گیا ہے اور تم نے اسے فراموش کر دیا ہے یا تم نے اس کے بارے میں سوچا بھی ہو، پھر یہ خیال آیا ہو کہ ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ تو بہت ہی عجیب سی بات ہے۔..... انہونی..... جگوں و کھری۔

میں تم کو یہ بتانے آیا ہوں کہ جب تک تم اللہ سے نہیں پوچھو گے، بالکل سیدھے۔ بلا واسطہ طور پر اس وقت تک تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور وہ تم سے کیا چاہتا ہے۔ جب ایک دفعہ اس کو سوال ڈال کر بیٹھ گئے پھر دل کے اندر جھانک کر ان ارتعاشوں کو دیکھو جو سوال کا جواب لاتے ہیں۔ لیکن اس عرصے میں اگر کوئی جواب موصول نہ ہو اور تمہارے سوال کا جواب خاموشی ہو تو پھر خوش ہو جاؤ کہ یہی جواب ہے اور اسی جواب کے لیے تمہیں سرگرم عمل رکھا گیا ہے۔

تم یہ کس طرح سے کہہ سکتے ہو کہ فلاں گھٹیا ہے اور فلاں بڑھیا۔ اس کا درجہ بلند ہے اور اس کا کتر۔ یہ بات انسان کے طے کرنے کی نہیں ہے۔..... اگلے زمانے میں کوئی بادشاہ تھا، جس کے دربار میں اس کے موسیقاروں کا طائفہ اپنے سازوں کی ہم آہنگی کا کمال دکھاتا تھا۔ اسی بادشاہ کے پاس ایک بلبل بھی تھی جو سازوں کی آہنگ ختم ہونے کے درمیان اپنی سریلی آواز سے بادشاہ کا دل لبھاتی تھی۔ بادشاہ کو اس بلبل کی قدر تھی، خدا داد اور معصوم آواز ہر مند، دودان اور مشتاق موسیقاروں کے کمال فن سے ہمیشہ اچھی لگتی تھی۔

اس بادشاہوں کے بادشاہ اور شہنشاہوں کے شہنشاہ کے حضور میں فرشتوں کے ان گنت گروہ ہر وقت اس کی صفت و ثناء میں مصروف رہتے ہیں لیکن وہ شہنشاہ ان بے نرے، بے وقعت اور بے حقیقت فانی انسانوں کی حمد سننے کا زیادہ خواہشمند ہے۔ چنانچہ ہم کو اپنی کم کوشی، کم آہنگی اور کم وقتی کا گلہ نہیں کرنا بلکہ اس کے حضور میں اس کی حمد و ثناء کرتے ہی جانا ہے۔ اپنی قدرتی اور فطری آواز میں اور اس ادا کی پر سرور رہنا ہے۔

خدا سے ایسی محبت ہونی چاہیے جیسے بہن اور بھائی کی محبت ہوتی ہے یا ماں اور بچے کی محبت ہوتی ہے۔ ایسی محبت نہیں ہونی چاہیے جو عاشق و معشوق اور میاں بیوی کے درمیان ہوتی ہے۔ پہلی قسم کے لوگ اپنی محبت کا اظہار برملا کر سکتے ہیں۔ خلوت میں خلوت میں، گھر میں، سر راہ، محفل میں، تنہائی میں لیکن دوسری قسم کے محبت کرنے والے صرف خلوت میں اور تنہائی میں اپنی محبت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔

ہمیں ان لوگوں کی پیروی نہیں کرنی جو کہتے ہیں کہ ہم خدا سے اپنی محبت کا اظہار صرف مسجد میں یا مراقبے میں یا درگاہ میں یا گنبد کے اندر کر سکتے ہیں۔ ہمیں تو اپنی محبت کا اظہار ہر جگہ کرنا ہے اور ہر مقام پر کرنا ہے۔ ہر شخص سے کرنا ہے اور ہر موسم میں کرنا ہے۔ اس میں چھپنا چھپانا نہیں۔

ان کے لیے جگہ صاف ستھری بنا کر رکھنی چاہیے۔

(1) اللہ کو قرض حسد دیتے رہیں۔ یہاں آپ اس کے کام آئیں، اگلے جہان میں وہ آپ کے کام آئے گا۔
(2) اپنے کردہ گناہوں پر تاسف کا اظہار کرتے رہیں۔ ماضی میں کیے ہوئے گناہوں کو یاد کریں اور ان کو یاد دلا کر خاموشی کے ساتھ ان کی معافی مانگتے رہیں۔ (ایسے ہی لوگوں میں اعلان نہ کرتے پھریں کہ میں بڑا گنہگار ہوں) مسلسل مانگنے سے اور توبہ کرنے سے آپ کے ماضی کی گندی سلیٹ صاف ہوتی رہے گی۔ آئندہ کوئی گناہ نہ کریں۔ ہو جائے تو جلدی سے پھر معافی مانگ لیں اور توبہ کے لیے رکوع میں بیٹے جائیں۔

(3) جن لوگوں کے ساتھ زیادتی کی ہے، ان سے معافی مانگیں۔ خط لکھ کر یا ٹیلی فون پر ان سے معافی مانگنے کے بجائے گاڑی یا جہاز پر سوار ہو کر ان کے پاس جائیں اور بالمشافہ معافی مانگیں۔

(4) پرسکون اور مطمئن رہیں۔ کالے نہ بیڑیں۔ کبھی کو یا اپنے آپ کو فوراً بج کرنے نہ بیٹھ جائیں۔ خدا کے اپنے منصوبے اور اپنے پلین ہوتے ہیں۔ وہ عظیم مطلق ہے، وہ ہر بات کو بہتر سمجھتا ہے۔ سیدھی راہ پر رہیں، چاہے مسافت نہ بھی ملے ہو۔ جب اگلے جہان میں آپ کی آنکھ کھلے گی، وہی سیدھی راہ خدا کی قربت کا مقام ہوگی۔

یہ خدا کا خوف ہے جو نیکی اور حق کی تعلیم دیتا ہے۔ جو شخص خدا سے خوف کھاتا ہے، وہی مذہبی آدمی ہے اور وہی نیک انسان ہے۔

محبت کا اور خوف کا ایک ساتھ رہنا ناممکن بات ہے۔ خوف کس طرح سے حقیقی محبت پیدا کر سکتا ہے۔ ناممکن! نیکی اور پاکیزگی خوف کی فضا میں نہیں پل سکتیں۔ روحانیت اور محبت زبردستی ٹھونے نہیں جاسکتے۔ ان کو تو روشن کر کے لاگو کیا جاسکتا ہے۔ روحانیت اور محبت کے پھول بے خوفی کی زمین میں اگائے جاسکتے ہیں۔ خدا کا تصور بے خوفی کی بنیاد پر پیدا ہو سکتا ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ بے خوفی ہی احدیت ہے۔

خواب موت ہے اور حقیقت زندگی۔ خواب نیند ہے اور حقیقت بیداری۔ جاگنا اور اپنے آپ کو پہچاننا۔

جہاں کوئی تحقیق نہیں اور کوئی مناظرہ نہیں، جہاں کوئی مختلف نظریات اور زاویے نہیں جہاں الفاظ نہیں صرف ہے، مکمل خلا۔ وہیں سے ایک انسان دین میں داخل ہو سکتا ہے۔

زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب آپ اپنا سارا دماغ، ساری طاقت، ساری ترکیبیں اور ہر صلاحیتیں صرف کرچکے ہوتے ہیں اور پانسہ پھینک چکے ہیں۔ اس وقت سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور آپ کو کچھ کر سکتے۔

یہ درست ہے کہ ہر شے مظہر خدا ہے مگر یہ صحیح نہیں کہ ہر ایک شے خدا ہے۔ ہر چیز خدا کی قدرت کی جلوہ گاہ ہے۔ وہ ذات قدیر و خیر دنیا کی تمام اشیاء میں اپنا کام کرتی ہے مگر خود ان سب سے جدا اور بالا ہے۔

فہم انسانی حقائق، الہی کے ادراک سے کما حقہ قاصر ہے اور ذکی سے ذکی انسان اور رسا سے رسا دماغ بھی آفر کار یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہم نے جیسا تجھے جانتا چاہیے تھا نہیں جانا۔ ہم صفات باری تعالیٰ میں سے صرف ان محدود و چند صفات کو جان سکتے ہیں جن کا اثر ہم پر اور ہماری دنیا پر پڑتا ہے۔ اس کی ذات کی بابت تو ہم کبھی بھی کچھ نہیں جان سکتے۔ وہ پاک ہے اور اس کی شان جو کچھ لوگ کہتے ہیں، اس سے بہت ارفع ہے۔

جب ساری ہدایات اور ساری عبادات ناکام ہو جاتی ہیں تو اس وقت گہرے غار کے اوپر اندھیرے کی لانتا ہی سمندر میں انسان کے لیے اصل ہدایت ابھرتی ہے۔ یہ انسان کی خالق اکبر اور خداوند کریم و عظیم کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اس ہستی کی طرف رہنمائی جس کو ہم جانتے نہیں، پہچانتے نہیں ہیں اور نہ ہی اس کو آئینہ نظر میں آتا ہے۔

یقیناً انسان کو اللہ پر ایمان رکھنا چاہیے۔ اس ایمان سے اس کے بہت سے مشکل مسائل کا حل خود بخود مل جاتا ہے اور وہ قوی تر ہو جاتا ہے لیکن انسان کو اللہ پر یقین رکھنے کے ساتھ ساتھ انسان پر بھی یقین رکھنا چاہیے۔ اپنے آپ پر بھی ایمان رکھنا چاہیے کیونکہ اگر ہم انسان پر ایمان نہیں رکھیں گے تو خدا پر بھی ہمارا ایمان مضبوط نہیں ہوگا کہ انسان خدا کی بہترین تخلیق ہے۔ انسان کی کمزوریاں اور مجبوریاں بہت ہیں۔ اسی طرح اس کی برتریاں اور اعلیٰ ترینیاں بھی سب سے زیادہ ہیں۔ کیا اس نے انہم پھاڑ کر نہیں دکھا دیا۔ اگر وہ یہ سب کچھ کر سکتا ہے تو جہالت، تعصب اور پیکار کا قلع قمع کیوں نہیں کر سکتا۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے انسان نے انسان پر پورا بھروسہ کر لیا اور اس نے کہنا شروع کر دیا۔ ”انسان عظیم ہے۔“

دیکھو دعا کے قبول ہونے کی تین صورتیں ہیں۔ اول تو یہ کہ جو کچھ مانگا وہ عین اسی طرح مل جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی بلا یا کوئی مصیبت آنے والی تھی، وہ ٹل گئی اور تیسری صورت یہ کہ مانگی جانے والی شے کا ذخیرہ جمع کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ جس طرح بچوں کے لیے انعامی بانڈ یا ڈیفنس سرٹیفکیٹ لے کر رکھ دیتے ہیں کہ جب بڑے ہوں گے تو ان کے کام آئیں گے۔ خدا تعالیٰ بھی اسی طرح کرتے ہیں کہ سوالی کے لیے اچھی نعمت آخرت کے لیے محفوظ کر کے رکھ دیتے ہیں۔

دیکھو بیٹا! آپ اس پاک گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو جن و ملال کو نہیں جانتا۔ جو خوفزدہ نہیں ہوتا۔ جو مرنے اپنے اعزاز میں بجتی ہوئی تالی کی آواز سے ہی زندہ نہیں۔ جو آج کی تعریف اور آج کی شائخانی کے عوض آنے والی کل پا سودا نہیں کرتے۔

خدا کے بارے میں جاننا خدا کو جاننا نہیں ہے۔

لفظ "خدا" خدا نہیں ہے۔

خدا کے موجود ہونے کا کیا ثبوت ہے؟ اس ثبوت کو الفاظ میں کس طرح سے ڈھالا جاسکتا ہے۔ خدا کے معاملے میں ثبوت کی زبان بہت ہی کمزور ذریعہ ہے۔ خیالات، مکالمات، توجہات اور ثبوت خدا تک پہنچنے ہوئے شرماتے ہیں، گھبراتے ہیں، بھسم ہو جاتے ہیں۔ خیال میں اور دلیل میں اتنا ہی انا ہوتی ہے، خدا نہیں ہوتا اور خدا صرف اس جگہ ہوتا ہے جہاں انا نہیں ہوتی۔ پھر انا کے معیار سے خدا کو کس طرح سے جانچا جاسکتا ہے..... خدا پر بحث صرف ان حلقوں میں ہوتی ہے جہاں آنکھیں نہ ہوں، جہاں دل نہ ہوں۔ دل کے مشاہدات نہ ہوں۔ یہاں ایک بات لطف سے خالی نہیں کہ خدا پر بحث چاہے خدا کے خلاف ہو چاہے اس کے حق میں ہو، ایک ہی چیز ہے۔ یہ ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ خدا کو ماننے والے اس کے حق میں گفتگو ہی نہیں کرتے۔ اس کو ماننے چلے جاتے ہیں..... یاد رہے کہ جو کچھ موجود ہے وہ لامعلوم ہے اور تم جاہل ہو۔ روشنی لامعلوم ہے لیکن اندھا پن معلوم ہے، خدا لامعلوم ہے لیکن جہالت ذاتی معلوم ہے۔ مذہب ذات کے اندھے پن کو دور کرتا ہے۔

قدرت کے اور فطرت کے خلاف جانے کی کوشش نہ کرو۔ قدرت کے ساتھ مقابلہ بازی کرنا سب سے بڑی حماقت ہے۔ اسی قدرت کے اندر تو خدا ہے بلکہ بزرگان دین تو قدرت کاملہ سے خدا ہی مراد لیتے ہیں۔ انسان کی اخلاقی اور روحانی کمزوری اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ وہ قدرت کے ساتھ جھگڑا شروع کر دیتا ہے اور نیچر کے خلاف نبرہ ڈال رہا ہوتا ہے۔

انسان کہ مخلوق ہے اور جو تخلیق کو form بناتا اور transform کرتا رہتا ہے، خود کچھ نہیں بنا سکتا لیکن وہ خود اور اس جیسے دوسرے سارے انسان انفرادی طور پر یا مشترکہ طور پر اپنے آپ کو خالق اکبری حضور میں ضرور پیش کر سکتے ہیں اور وہ اس سے درخواست کر سکتے ہیں اور اس سے مانگ سکتے ہیں کہ ہمارے Image کی حفاظت فرما اور اس کی تکمیل فرما اور اس کو perfect کر دے۔

اے مولانا میری رفتار میں تیزی ذرا کم کر دے۔ مجھے غلط سے نجات دے۔ میں زندگی کے راستوں پر بہت

ی تیزی سے دوڑ رہا ہوں اور میرے قریب سے گزرنے والا میرا کوئی بھائی، کوئی انگ ساک مجھے نظر ہی نہیں آتا۔ میں زندگی میں روز بروز بہت سی اچھی چیزوں کو مٹ کر رہا ہوں۔ مجھے اس خیر و برکت کا علم ہی نہیں ہوتا جو میری طرف تیری جانب سے آرہی ہوتی ہے۔ میں زندگی میں بہت تیز بھاگ رہا ہوں۔ بہت غلط میں جا رہا ہوں۔ مجھے آہستہ کر دے، مجھے پرسکون کر دے۔ میں آرام کے ساتھ ان چیزوں کا نظارہ کرنا چاہتا ہوں جو میرے راستوں میں اترتی ہیں اور میرے ارد گرد جلوہ نما ہیں۔ مجھے کم کر دے اور اپنے آپ کو میرے لیے زیادہ کر دے۔ (میں تیرے کرم کا نظارہ تو کر سکوں)

یہ بھی نہ سمجھنا کہ آپ کی اپنی دانش اتنی بڑھ کر ایسے لپک سکے گی کہ وہ خدا کو جان لے یا پہچان لے۔ ایسا نہیں ہو سکے گا لیکن جب تم کو خدا خود اپنی ملکوتی (Heavenly) روشنی عطا کرے گا تو پھر کس قدرتی روشنی کی ضرورت نہیں رہے گی اور سب کچھ روشن ہوتا جائے گا۔ یہ قدرتی روشنی اور قدرتی چمک خدا کے سامنے بالکل بھج جانی چاہیے تاکہ خدا اپنی تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہو سکے۔

مفت

زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ زندگی ایک تحفہ ہے۔ تم اس کے حقدار نہیں تھے لیکن تم کو یہ مل گیا۔ زندگی تمہاری وراثت نہیں تھی اور تمہیں دے دی گئی۔ بالکل مفت۔ تم نے اس کے لیے کوئی کوشش نہیں کی، کوئی محنت نہیں کی۔ بس یہ تم کو ایسی ہی مل گئی کوشش جتنی بھی ہے، اس کا تعلق سراسر انا کے ساتھ ہے۔ کوشش ہمیشہ دکھا اور انا کو جنم دیتی ہے۔ ہر کوشش تمہارے خلاف ہوتی ہے۔ ہر کوشش تم کو مار مار کر انا کو مل گئی، بغیر کسی حق کے بنا کسی دعویٰ کے مل گئی تو پھر خوشیاں بھی مل سکتی ہیں۔ اگر اتنی بڑی زندگی تم کو بغیر مانگنے مل گئی، بغیر کسی حق کے بنا کسی دعویٰ کے مل گئی تو پھر خوشیاں بھی مل سکتی ہیں۔ آئندہ بھی مل سکتا ہے، ذات بھی مل سکتی ہے۔

زر

ہماری زندگی مسلسل عذاب میں گزر رہی ہے۔ اس لیے نہیں کہ ہمارے پاس دولت کم ہے، ہمیں روپے پیسے کی زیادہ ضرورت ہے اور اس دور میں دولت سب سے اہم شے ہے لیکن یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں ہماری زندگی اس لیے انجیرن ہو گئی ہے کہ Money کچھ اتنی اہم نہیں ہے۔ اگر زراں قدر اہم ہوتا جس قدر کہ ہم سمجھے بیٹھے ہیں تو ہماری زندگی کا ہر پہلو اور ہر زاویہ اس کے قبضے میں ہوتا مگر یہ نہیں ہے۔ طلوع سحر، پر واک ہوا، چاندنی رات، کوشش بغیر نیند، ذہن پر جھوٹا نڈا، اون کے گولے سے کھینکا بلوغت، آپ کی نواسی، بہو کی مسکراہٹ، پوتے کی گالوں پر لگی جھجھی، ایک بے ساختہ شعر، نصرت فتح علی کی خان..... یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جن کے ساتھ زر کا کوئی تعلق نہیں ہے اور ان جیسی لاکھوں ہی چیزیں ایسی ہیں جو مفاہمت ملتی ہیں اور لاکھوں کروڑوں خرچ کر کے بھی حاصل نہیں کی جاسکتیں۔

ذکر اذکار

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ تم کو سوائے اللہ کے ذکر کے اطمینان قلب نصیب ہی نہیں ہو سکتا۔ جب تک خدا کا ذکر نہیں کرو گے (جلی یا خفی) اس وقت تک اطمینان قلب کی دولت نصیب نہیں ہوگی۔

لوگ کہتے ہیں اور عام کہتے ہیں کہ خالی ذکر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کے ساتھ عمل کا ہونا ضروری ہے کیونکہ عمل کے بغیر کوئی راست قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔ ان کا خیال ہے کہ محض ہوا حق سے کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ ایک ہی بات کو بار بار دہرانے سے آپ کے مقصد کا حصول نہیں ہوتا۔

بزرگان دین کہتے ہیں کہ اگر املی کا نام لینے سے منہ میں پانی آ جاتا ہے تو خدا کا نام لینے سے وجود پر کوئی اثر بھی مرتب نہیں ہوگا۔

ایک نامی گرامی بادشاہ کی چیتھی بیٹی بیمار پڑی۔ اس عہد کے بڑے اطباء سے اور صادق حکیموں سے اس کا علاج کروایا لیکن مرض بگڑتا گیا۔ آخر میں وہاں کے سیانے کو بلا کر مریضہ کو دکھایا گیا۔ اس نے مریضہ کے سر ہانے بیٹھ کر لا الہ الا اللہ کا ورد شروع کر دیا۔

طیب اور حکیم اس کے اس فعل کو دیکھ کر کہہ کر کہہ کر محض الفاظ جسم پر کس طرح سے اثر انداز ہوں گے! تعجب!! اس صوفی نے چلا کر کہا "خاموش! تم سب لوگ گدھے ہو اور امتوں کی سی بات کرتے ہو۔ اس کا علاج ذکر ہی سے ہوگا۔"

اپنے لیے گدھے اور امتی کے الفاظ سن کر ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور ان کے جسموں کے اندر خون کا فشار بڑھ گیا اور انہوں نے صوفی کے خلاف کئے تان لیے۔ صوفی نے کہا "اگر گدھے کے لفظ نے تم کو چراغ پا کر دیا ہے اور تم سب کا بلڈ پریشر ایک دم ہائی ہو گیا ہے اور تم نے میرے خلاف کئے تان لیے ہیں اور تم ایک عمل میں داخل ہو گئے تو ذکر اللہ اس بیمار بچی کے وجود پر کوئی اثر نہیں کرے گا۔"

ان سب حکیموں نے اپنا سر تسلیم خم کر دیا۔ اگر عام زندگی میں دیکھا جائے اور دینی سطح پر اس حقیقت کا جائزہ لیا جائے تو یقین کی طرف قدم بڑھے گا۔

مذہب

محبت اور عدل

محبت سے غمی اور اداسی ضرور پیدا ہوگی۔ وہ محبت ہی نہیں جو اداس نہ کر دے۔

اگر چاہتے ہو کہ محبت ابدی ہو جائے اور پائیدار ہو جائے تو چھڑی محبت ایسا نہیں کر سکے گی۔ اس کو طاقت عطا کرنے کے لیے اس میں عبادت کو شامل کرنا پڑے گا۔

عبادت کے بغیر محبت اداس رہتی ہے اور محبت ہی عبادت کا رخ بتاتی ہے۔

محبت ایک ہونے کی آرزو کرتی ہے۔ اس کی طرف بڑھتی ہے۔ من تو شدم تو من شدی کا رنگ اپنا ہی ہے لیکن یہ اک مک ہونے کا وعدہ نہیں کرتی۔ اس آرزو کو مکمل کر کے نہیں دے سکتی خواہش پوری نہیں کرتی اور یہی اداسی کا سبب بن جاتا ہے۔

چند حیوانے والی روشنی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے۔ زیادہ شیرینی کڑوی ہو جاتی ہے۔

محبت دل پکڑ لیتی ہے اداس کو دیتی ہے۔

جنسی محبت میں بھی اک مک ہونے کی خواہش ہوتی ہے اور یہ محبت انسان کو دو میں بانٹ دیتی ہے sex کا لفظ sex لاطینی سے نکلا ہے جس کے معنی تقسیم کے ہیں۔ جنسی زندگی بسر کرنے والے بڑے دکھی ہوتے ہیں۔ ہر صبح تازہ برکت سے مقصود نظر۔

محبت تم کو وقتی تسکین اور وقتی خوشی دے سکتی ہے لیکن دائمی سکون نہیں دے سکتی۔

محبت تنہائی عطا کرتی ہے۔ چاندنی رات میں محبوبہ اور محبوب بیٹھے ہیں دونوں اپنی اپنی جگہ موجود ہیں اور الگ الگ ہیں۔ ان دونوں کے درمیان کوئی راستہ نہیں کوئی پل نہیں۔ ہر ایک دوسرے کو اپنی تنہائی کا احساس دلا رہا ہے۔

محبت ایک بڑا سبق ہے۔ ایک دائمی سبق کہ انسان اکیلا ہی آتا ہے اکیلا ہی رہتا ہے اور اکیلا ہی جاتا ہے۔ اس تنہائی کو نشے سے ڈور نہیں کیا جاسکتا۔ نہ درختوں پودوں کے نشے سے نہ فیکٹری میں بننے والے نشے سے نہ جسم کے اندر پیدا ہونے والے نشے سے۔

اس تنہائی کو چیر کر اندر اترتا ہے۔ اس میں گہرے اتر جاتا ہے۔ تہہ تک پہنچ جاتا ہے اور پھر اچانک تم پر یہ کھانا ہے کہ

یہ تہائی تہائی نہیں ہے یہ تو خدا کی موجودگی کا اظہار ہے۔ تم تنہا ہو چکے ہو اور اس لیے تہائی میں اتر گئے ہو کہ خدا بھی تنہا ہے۔

کرکار ڈکھتا ہے کہ زندگی ہمیشہ پیچھے کی کچھ میں آتی ہے لیکن اسے بسر آگے کو کرنا پڑتا ہے۔

مذہب

مذہب ایک ایسی چیز کا جلوہ (vision) ہے جو دور (beyond) اور پیچھے اور حاضر اشیاء کے درمیان موجود ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسی چکی اور جچی حقیقت ہوتا ہے جو اپنا آپ منوانے کے لیے قطار میں منتظر کھڑا ہوتا ہے۔ مذہب ایک Remote possibility ہے لیکن اس کے باوصف سامنے کی حقیقتوں میں سے ایک بھرپور حقیقت ہے۔ مذہب ہر گزرنے والی شے کو معنی عطا کرتا ہے اور ساتھ ہی apprehensive سے آنکھ بچا جاتا ہے۔ ایک ایسی شے جس کا حصول آخری کمال ہے لیکن کسی طرح سے بھی ہاتھ نہیں آتا۔ جو آخری آدرش ہے لیکن جس کی quest ناامیدی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ابھی ہم نے دنیا کو اسلام پیش کرنا شروع نہیں کیا۔ صرف شریعت کو متعارف کرایا ہے اور اسی کو پیش کیا ہے اور کسی حد تک زیادہ ہی پیش کر دیا ہے حالانکہ ہم کو اسلام کی زندگی پیش کرنی چاہئے تھی۔ ایسی زندگی جو اسلام کی روح سے بھرپور ہو۔ میرا مطلب ہے اپنی زندگی اس طرح سے پیش کرنی چاہئے تھی جسے غیر دیکھ کر آسانی سے سمجھ لیتے کہ پیغمبر خدا نے جو کچھ کہا اور جو کچھ کیا وہ حق تھا اور وہی اسلام تھا۔

اسلام کے تعارف میں شریعت کی وجہ سے کافی تاخیر ہو گئی۔ شریعت چونکہ اماموں کی توضیح تھی اس لیے وہ دین کو لے کر آگے نہ بڑھ سکی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ اگر شریعت نے ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھ کر اسلام کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو آج اسلام کا نقشہ اور بھی بدتر ہوتا۔

جب ہم کہتے ہیں کہ ذرا اس انسان پر اور انسانیت پر نظر ڈالو ہر جگہ تاریخی جہالت قتل و غارتگری اور جرائم کی نظر آئیں گے تو میں سوچتا ہوں کہ ابھی انسان کی تاریخ چار ہزار سال ہی تو پرانی ہے اسے تھوڑا سا وقت اور دویہ بہت اعلیٰ درجے کی مخلوق ثابت ہوگا۔ ابھی بڑا وقت پڑا ہے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا، وہ ذات جسم سے ماوراء ہے اس کی تجسیم نہیں کی جاسکتی۔ وہ کسی صورت میں کسی صورتی میں کسی صنم میں نہیں ڈھالی جاسکتی۔ اس کو بت نہ بناؤ، پتھر کی شکل نہ دو، بت پرستی نہ کرو۔ آپ نے بجا ارشاد فرمایا لیکن مسلمانوں نے کیا کیا۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ہم کو بت شکنی کا حکم ملا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بتوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ وہ یہ سمجھے کہ چونکہ ہم کو بتوں سے دور رہنے کا اور بت پرستی نہ کرنے کا حکم ملا ہے، اس لیے بتوں کا قلع قمع کرنا چاہیے۔ حضورؐ نے

بتوں سے، شے سے، اجسام سے دوری کا حکم دیا تھا اور مسلمان، یہ راز نہ سمجھ سکے اور انہوں نے بت شکنی کو اپنا شعار بنالیا۔ کچھ لوگوں نے بتوں کو اور پتھر کو اپنا خدا بنالیا اور ان کی پوجا شروع کر دی۔ کچھ نے ان کو توڑنا پھوڑنا شروع کر دیا۔ دونوں ہی پتھر سے وابستہ ہو گئے۔ دونوں ہی اپنے اپنے انداز میں پتھر سے واصل ہو گئے۔ دونوں یہی سمجھنے لگے کہ اس زندگی میں بھری اہم ہے۔ دونوں پتھر کے گردیدہ ہو گئے۔ ایک پتھر سے رشتہ جوڑ کر ایک پتھر توڑ کر..... سنو! سنو! چیز، شے، موضوع، منظر کو بھول جاؤ، صرف اپنے ساتھ رہو، کوئی شے، کوئی چیز نہ بناؤ۔ کچھ بھی ساخت نہ کرو، بنانے والا موجود ہے، وہ بارہا ہے۔ تم اس میں کوئی اضافہ نہیں کر سکو گے۔ اس کو Improve نہیں کر سکو گے اور کچھ نہ کرو، بس اپنی ذات کے اندر اتر جاؤ۔ اس کو دیکھو، اس کو سمجھو اور اس کا قرب حاصل کرو۔

فرمایا کہ شبیہ تیار نہ کرنا۔ صنم نہ بنانا۔ بت نہ بنانا کیونکہ اس کا بت بنایا ہی نہیں جاسکتا۔ وہ شکل و صورت سے مبرا ہے۔ اس لیے اس کا بت نہ بنانا، نہ ہی اس کی پوجا کرنا..... ہم نے یہ سمجھ لیا کہ بتوں کو توڑنا اور بت خانوں کو تباہ کرنا ہماری ذہنی ہے۔ چونکہ وہ شکل و صورت سے مبرا ہے۔ اس لیے جہاں بھی اس کی شکل و صورت بنائی گئی ہے۔ اس کو ڈھا دینا چاہیے، تباہ کر دینا چاہیے..... ذرا ان کی عقل ملاحظہ فرمائیں، فرمایا یہ تھا کہ ظاہر پرستی نہ کرنا، ظاہر کو نہ اپنانا، اپنے اندر اترنا، اپنے وجود کی تلاوت کرنا لیکن ہم نے بتوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ کچھ لوگ پتھر کو پوجتے ہیں، کچھ پتھر کو توڑتے ہیں۔ دونوں ہی پتھر سے وابستہ ہیں، دونوں ہی پتھر کے گردیدہ ہیں۔ دونوں ہی اس سے بندھے ہیں۔ سو رکھانے کی ممانعت ہے، ہم نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ دلدل میں سے نکالا تھا، سوئے ڈالیں مار مار کر مار دیا۔

اگر آدمی کو موت نہ آتی، اگر وہ ہمیشہ زندہ رہتا یعنی اس دنیا میں موت نہ ہوتی تو پھر شاید مذہب کا بھی کوئی وجود نہ ہوتا۔

میری کچھ بہت ساری مشکلات تھیں اور ان میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ جس طرح اپنی مشکلات کو دور کرنے کے لیے ہر کوئی متعلقہ علاج گاہ سے رجوع کرتا ہے۔ میں نے بھی صحافت سے عدالت سے علم سے رجوع کیا لیکن مجھے کوئی تشفی آمیز جواب یا خاطر خواہ علاج میسر نہ آ سکا۔

پھر میں ڈیرے پر چلا آیا۔

یہاں میں ایک "ان ڈور" مرلیض کے طور پر داخل کر لیا گیا اور میرے میٹ ہونے لگے۔

میں تھا تو ایک بہت ہی معمولی سا انسان اور عام سا بندہ لیکن میرے اندر رڈیر ساری پیچیدگیاں تھیں۔ مثلاً میں نیکی سے محبت کرتا تھا لیکن میرا عمل بدی پر مشتمل تھا۔

میں زندہ رہنا چاہتا تھا لیکن موت کی وادی کی طرف روانہ تھا۔

جب تک میں نابالغ تھا اور بے شعور تھا، میں نشوونما پا رہا تھا لیکن جونہی میں بالغ ہوا اور شعور کی منزل کو پہنچا میری نشوونما رک گئی۔

میں چیزوں کو چیزوں کی خاطر کرنا چاہتا تھا لیکن میں چیزوں کو اپنا آپ فروخت کرنے کے لیے سب کچھ کر رہا تھا۔

میں علم کو علم کے طور پر حاصل کرنے کا متبعی تھا لیکن میں علم کو دولت کمانے کے لیے حاصل کر رہا تھا۔

میں اچھا ہونا چاہتا تھا لیکن میں اچھا بن کر دکھا رہا تھا۔

میں زندگی کے راستے پر بڑی ہوش مندی کے ساتھ چل رہا تھا لیکن ہر بار راستے سے باہر نکل جاتا تھا۔

میں جیسا تھا اس سے لطف اندوز نہیں ہو رہا تھا، جیسا ہونا چاہیے تھا، اس کے لیے کلپ رہا تھا۔

میرے اندر بڑا اقتاد تھا اور اس اقتاد نے سارے وجود میں تیزابیت پیدا کر رکھی تھی۔ خوف اس بات کا تھا کہ میں نے میرے بارے میں جو توقعات قائم کر رکھی ہیں، میں اس ڈنڈے تک پہنچ بھی سکتا ہوں کہ نہیں۔

بانسی میزمری ہر وقت کا پتہ رہتی تھی۔ خوف بڑھتا رہتا تھا۔

مجھے یوں لگتا تھا کہ میں کسی بڑے کام کے لیے، کسی اعلیٰ مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔ اس لیے یہ چھوٹے

چھوٹے کام، یہ روزمرہ کی ذمہ داریاں، یہ دنیاوی تقاضے بڑے بڑے ٹیٹے والے کام ہیں۔

مجھے مرنے سے پہلے ایک بلند مقام ضرور حاصل کرنا ہے کیونکہ.....

میں، میں ہوں۔

میں اپنے دن کو اور اپنے وقت کو حصول کے فیتے سے ناپتا تھا۔

اگر تو کچھ حاصل ہو گیا پھر تو ٹھیک ہے ورنہ دیہاڑی ماری گئی!

میں زندگی بھر ایک سکرپٹ رائٹر سے آگے نہ بڑھ سکا۔

آج کی ناک لکھ دی۔ آج کا ایڈیٹوریل مکمل کر لیا۔ آج کا کالم تحریر کر لیا۔ آج کا روزنامہ رقم ہو گیا۔

شاباش! زندہ باد! سبحان اللہ! لیکن میرے اندر ایک عجیب سی خواہش پیدا ہو گئی ہے۔

میں حال کی ہر گھڑی سے اور موجود کے ہر لمحے کے خاتمے پر اور بہتر اور زیادہ ہونا چاہتا ہوں اور پھیلنا چاہتا ہوں

اور پھولنا چاہتا ہوں۔

میرے اندر کی خواہش کہتی ہے کچھ اور کرو، کچھ اور سیکھو، کچھ اور کہو، ایک اور بھاشن دو، ایک اور حکایت بیان کرو،

ایک اور کہانی کہو!

میری یہ خواہش میرے فن سے بھی بڑی ہے۔

میرے وجود سے بھی قوی ہے۔

میرے مذہب سے بھی دزنی ہے۔

حتیٰ کہ میری طاقت، میری راحت، میری خوشیوں سے بھی بڑی ہے۔
میں ایک تھیوری قائم کر کے فوت ہونا چاہتا ہوں کہ: لاشعور، لاشعور کیوں ہے؟
میں یہ تحقیق کرنا چاہتا ہوں کہ مسعود سعد سلمان کا ہندوی دیوان کہاں ہے؟
کیا یہ میرے اندر کی خواہش ہے یا میں اس خواہش کے اظہار سے توجہ کا طالب ہو رہا ہوں؟
میں ہر کام اعلیٰ معیار کا کرنا چاہتا ہوں۔

ایسا معیار جہاں کوئی دوسرا نہ پہنچ سکے۔ اس کام کو وہاں نہ سکے۔

ایسا کام جس پر کوئی انگلی نہ رکھ سکے۔ جس میں کوئی خامی نہ ہو۔

میں اپنی ہر غلطی سے ڈرتا ہوں اور ہر غلطی نکالنے والے کا دشمن ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر میرے کام میں کوئی غلطی ہے تو وہ اختیاری ہے۔

وہ میرے کام کا تسلسل ہے۔ میرے تسلسل کا ریڑھو ہے۔

لیکن جب مجھے زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ آ جاتا ہے اور

زندگی پر حاوی ہو جاتا ہوں تو زندگی اپنا رخ تبدیل کر لیتی ہے۔

وہ کامران کی بارہ درہی کے پاس بہنا شروع کر دیتی ہے۔

اور میں بڑھے دریا پر بیچارہ جاتا ہوں۔

میری اصل مشکل یہ ہے کہ میں زندگی کا تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس کات نکالنے کی کوشش میں مصروف ہوں

میں زندگی بسر کرنے کا طریقہ نہیں جانتا۔

(میں سیدھے سبب و زندگی بسر کرنے کے بجائے اس کات نکالنے میں مصروف ہوں۔)

میں کسی بھی اس چیز کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں جو مجھے نظر نہ آئے، میرے حواس میں نہ اترے، میرے لیے

راحت ترقی کا ایک بہت بڑا ”لیور“ ہے۔ میں گفتگو کو زندگی کی اساس گردانتا ہوں۔

لیکن فصاحت کبھی تو مترنم ہوتی ہے۔ کبھی طاقتور، کبھی دلولہ انگیز لیکن افسوس فصاحت ہمیشہ ہی ایک Over

statement ہوتی ہے۔ ہمیشہ ہی ایک Projection ہوتی ہے۔

بے ایمان لوگ الفاظ پر ایمان رکھتے ہیں، اپنی ترقی کے لیے الفاظ کو سہارا بناتے ہیں۔

وہ حقیقت کا ساتھ نہیں دیتے۔ حقیقت کو اپنی ٹیک نہیں بناتے۔ حقیقت کے قریب نہیں جاتے۔

معروضی سوچ بالکل جھوٹ ہے، میں اس کے خلاف ہو گیا ہوں۔

لیکن اب جب مجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ میں کسی دوسرے سے لائق نہیں ہوں تو کیا یہ جانکاری مجھے دانشمند بنا

گئی ہے؟ لائق بنا سکتی ہے؟

جو چیزیں میرے مالی حالات کے دائرے سے باہر کی ہیں، وہ باہر ہی رہتی ہیں۔ جب میں اور امیر ہو جاتا

ہوں۔ میرے مالی حالات مزید بہتر ہو جاتے ہیں تو پھر کچھ نئی چیزیں اس دائرے سے باہر آ موجود ہوتی ہیں۔ ان کی موجودگی بدستور رہتی ہے۔ میرا خلا آمدنی بڑھ جانے کے باوصف ویسا ہی رہتا ہے۔ آمدنی میں اضافہ ہاتھ میں نہ آنے والی کچھ اور اشیاء تخلیق کر دیتا ہے۔

فرمایا: خوشی اور شادمانی، مسرت اور فراوانی موجودہ صورتحال کو تسلیم کرنے کا نام ہے۔ حال سے لطف اندوز ہونے کی کیفیت ہے، اس کا مستقبل سے کوئی تعلق نہیں۔ مستقبل خوشی عطا کرنے سے قاصر ہے۔ مستقبل ایک معذور بہار ہے۔ اس پر ٹیک نہیں لگائی جاسکتی۔ خوشی اور شادمانی کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ اپنے مستقبل کو Consult کر کے یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ میں اس وقت کس قدر خوش ہوں، کس قدر مطمئن ہوں۔

میں کندھے پر ڈانگ رکھ کر حقیقتوں سے لڑتا رہتا ہوں۔ مجھے حقیقتوں کے ساتھ Deal کرنے کا طریقہ نہیں آتا۔ میرے اندر کا غنڈہ لوگوں سے اصول کے نام پر جگ ٹیکس وصول کرتا ہے۔ وہ بار بار ایک ہی فقرہ دہراتا ہے کہ ”میں اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔“ میرے اندر کے غنڈے کے پاس اپنے ہر عمل کے لیے ایک منطق ہوتی ہے، ایک وجہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ وجہ ہر مرتبہ Idealistic ہوتی ہے۔

میرے وجود کا ایک بڑا حصہ نسوانی انگ کا ہے۔ وہ ہمیشہ ”یہ حق ہے“ کے پردے کے پیچھے چھپ جاتا ہے اور مجھے سکون سا ہو جاتا ہے کہ میں کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ پھر میں یہ تسلیم ہی نہیں کرتا کہ ”نقصان پہنچانا“ میری خواہش ہے، میری آرزو ہے۔ میرا شعار بن چکا ہے۔

جب میں ٹی پائس جاتا ہوں تو گھر سے چلتے وقت پچھو کا روپ اختیار کر کے لھکتا ہوں۔ میرے اندر ضرور رانی کا مادہ بے ضروری کے ارادے سے پہلے پیدا ہو جاتا ہے۔

جب کبھی بانو بیمار پڑتی ہے تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ اس کی بیماری سے میرا بڑا حرج ہوتا ہے۔ وقت ضائع ہوتا ہے۔ گھر کی نگہداشت میں جسے پڑ جاتے ہیں۔ طے شدہ پروگرام تاخیر کا شکار ہو جاتے ہیں۔

پھر اس کی بیماری کی وجہ سے اس کے اندر خصوصی توجہ کی طلب پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ طلب کچھ دیر ہنگامی رہنے کے بعد مستقل بھی ہو سکتی ہے۔ میں نظم و ضبط کا بندہ ہوں، بیماری استراحت کو اپناتا کرتا ہوں۔ میرا جسم، میرا وجود اور میرے جذبات مجھ کو ودیعت ہوتے ہیں۔

میں اپنے جذبات کے سلسلے میں نہ تو خوفزدہ ہوں، نہ Insecure ہوں اور نہ ہی ان کے خلاف انتقامی کارروائی کرنا چاہتا ہوں۔

جس طرح مجھے میری آنکھوں کی ساخت، بالوں کا رنگ اور پاؤں کا سائز ودیعت ہوا ہے، اسی طرح سے جذبات ملے ہیں۔

میں اپنے جذبات کا ذمہ دار نہیں (ان کے فعل کا البتہ ہو سکتا ہوں)

میں اپنے جذبات کی ساخت اقلیدس کے قاعدے اور ارسطو کے فلسفے کے مطابق نہیں کر سکتا۔ پھر مجھ سے کہا

بات ہے کہ اپنے جذبات کی وجہ سے اپنے آپ پر نفرت نہ کر، وہ یہ قدرتی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔

کیا میں اپنے قابل نفرت جذبات کی بھی سرزنش نہ کروں؟

مجھ سے کہا جاتا ہے، ایسی باتوں پر پریشان نہیں ہوا کرتے لیکن میں پریشان ہوتا ہوں۔

کہتے ہیں انسان اپنے افعال کا ذمہ دار نہیں لیکن میں تو ہوں..... میں جو کچھ کرتا ہوں، اس لیے کرتا ہوں کہ میں کرنا چاہتا ہوں۔

بے غرض و غایت اور بے لوث کا تصور محال ہے۔ شاید ہم سب وہی کچھ کرتے ہیں جس کی ہم کو خواہش ہوتی ہے ہمارے وجود کے کسی حصے کو خواہش ہوتی ہے۔

سفاقت اور Generosity بھی ایک طرح کی خود غرضی ہے، ایک طرح کا لالچ ہے۔ خود غرضی نہ تو Inherent اچھی ہے نہ بری۔ دیکھنا پڑتا ہے کہ ہم کس طرح کے خود غرض ہیں..... اچھے یا برے..... یہ خود غرضی ہمیں صحت مند بنا دیتی ہے یا ہمیں مجروح کر رہی ہے۔

یوں تو کئی طرح کا جھوٹ میرے اندر سایا ہوا ہے لیکن ایک جھوٹ گفتگو کے دوران ”پھک“ کر کے میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔ میں حیران رہ جاتا ہوں۔

کبھی کبھی میں اس جھوٹ کو اس نشست کے اندر ہی صحیح کرنا چاہتا ہوں لیکن جب میں اسے صحیح کرتا ہوں تو سننے والے سمجھ جاتے ہیں، تاثر جاتے ہیں۔

کچھ جھوٹ میں اپنے ان افعال کے بارے میں بولتا ہوں جن کے متعلق مجھے یقین ہوتا ہے کہ میں انہیں Cover کر لوں گا۔

ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے میں ان کے بارے میں داستانیں ہیولائن لیتا ہوں۔ اگر تو وہ ہیولا کامیاب رہتا ہے اور مجھے تسلی ہو جاتی ہے کہ یہ جھوٹ نہیں تھا۔ اگر کامیاب نہیں رہتا اور مجھے بچ بولنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے تو پھر میں بچ مار لیتا ہوں لیکن اگر میں بچ نہیں بولتا تو پھر مجھے اپنی دروغ گوئی بھی بری نہیں لگتی۔ کام ٹھیک خاک چل جاتا ہے۔

مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ مجھ سے کیسے افعال سرزد ہوتے ہیں۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زبان سے، اپنے لہجے سے کیا کرتا ہوں۔ مجھے تو اپنے خیالات، احساسات اور جذبات دبا کے رکھنے ہیں۔ انہوں نے مجھے انگوٹھے تلے رکھا ہے۔

دراصل میں اندر سے باہر کی طرف منہ کر کے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ باہر سے اندر کی طرف نہیں۔ کچھ کرنے کی خواہش کرتا، کسی شے کی تمنا کرتا، ایک خواہش ہے، یہ ایک فقرہ نہیں ہے۔ جب میں ”تنبیہ“ کر لیتا ہوں کہ مجھے یہ کرنا ہے تو اپنی خواہش کو فقرے میں ترجمہ کرتا ہوں۔ پھر میں اس فقرے کی پیروی کرتا ہوں۔

میں اپنی خواہش کو اپنے وجود سے نکال کر ذہن کے طاقے میں رکھ لیتا ہوں۔ پھر میں سوچتا ہوں، مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس چاہیے کے ساتھ اور بہت سے ”چاہیے“ چٹ جاتے ہیں۔ جیسے زمین پر گرے ہوئے

شہوت کے ساتھ بے شمار چیزیں چست جاتی ہیں۔ اس وقت مجھ پر کیا کیفیت گزرتی ہے، اس کے لیے کوئی مناسب لفظ نہیں ملتا۔ میں ڈکشنری دیکھتا ہوں۔ لغات میں ڈھونڈتا ہوں مگر مجھے کوئی صحیح لفظ نہیں ملتا جو میری کیفیات کی ترجمانی کر سکے۔

اس وقت مجھے کوئی راستہ بھی نہیں دیتا کہ میں کیا کروں؟ لیکن جب مجھے پیاس لگتی ہے تو مجھے کبھی یہ پوچھنا نہیں پڑتا کہ میں کیا کروں۔ کبھی سوچنا نہیں پڑتا۔ غور کرنا نہیں پڑتا۔ نہ ہی میں ڈکشنری میں پیاس کے معنی تلاش کرتا ہوں۔ میں آرام سے اٹھتا ہوں، سلیپر پہن کر باورچی خانے میں جاتا ہوں اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی لیتا ہوں۔

اگر میرے اندر افسانہ لکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے یا کچھ بھی لکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور یہ خواہش تحریر میں نہیں ڈھلتی تو یہ خواہش جھوٹی ہوتی ہے، مصنوعی ہوتی ہے، جعلی ہوتی ہے۔ میں کچھ بھی لکھنا نہیں چاہتا (آپ نے فرمایا تھا جس ماضی کا حال شاہد نہ ہو، وہ ماضی جھوٹا ہے)۔

کہا جاتا ہے کہ انسان اس دنیا میں تنہا آتا ہے اور تنہا ہی جاتا ہے۔ کتنی بھی مجلسی زندگی گزار لے، اصل میں وہ تنہا ہی ہوتا ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تنہائی کے لمحات ہی حق اور سچ ہوتے ہیں۔ انسان اس وقت اصل (Real) ہوتا ہے، جب وہ اکیلا ہو۔ لفظ اللہ بھی میری سمجھ اس وقت آنے لگتا ہے جب میں تنہا ہوں۔ کانی ہاؤس کی بحث میں اس لفظ کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ میرا مشاہدہ ہے کہ مذہب ذہن لوگوں کی زندگی کا مضمون نہیں ہے کیونکہ میں صرف اس وقت باور (Believe) کرتا ہوں جب میں مکالمے سے باہر ہوتا ہوں۔ تنہائی میرے حساب سے ایک غلط لفظ ہے (ایک ام

بے سببی ہے) میرے لیے تو تنہائی اجتماع کے مترادف ہے۔ میں تنہائی کا ترجمہ ”مجموع“ کرتا ہوں۔ اس وقت میں اور قدرت ایک ہوتے ہیں۔ میں اور Being ایک ہوتے ہیں۔ میں تو تنہائی کا مطلب جوڑ ملے (?) سے لیتا ہوں۔ جیسے میرے بکھرے ہوئے جوڑ پھر سے جوڑ دیئے گئے ہوں۔ میرے ہند پھر سے مرتب کر دیئے گئے ہوں۔ مجھے جوڑ جاؤ کر ایسے بٹھا دیا گیا ہو کہ مجھے چھوٹی چیزیں واقعی چھوٹی نظر آئیں اور بڑی چیزیں بڑی!

یہ جتنے بھی پاکیزہ فراڈ ہیں، متبرک دھوکے بازیاں ہیں۔ یہ مذہب کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ ان فراڈوں نے مذہب کا سہارا پکڑ کر اپنی دکانداری چلائی ہے۔ اگر مذہب نہ ہوتا تو اس قسم کی مقدس دھوکے بازیاں نہ ہوتیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں مذہب مولویوں کی اختراع ہے لیکن جب میں یہ سنتا ہوں تو کہتا ہوں کہ پھر مولویوں کو مولوی کس چیز نے بنایا ہے؟

لوگوں کے دلوں میں پہلے مذہب کا تصور موجود ہوگا تو مولوی آگے بڑھے۔ انہوں نے اس تصور سے فائدہ اٹھا کر اس کی تشریح کی اور اسے جملہ حقوق بحق مولوی بنایا۔

پہلے پہلے جب انسان نے قدرت کے مظاہر کو اور ان کی طاقت و رویوں کو دیکھا تو حیران ہوا اور ڈرا اور قدرت کے مظاہر کے سامنے ماتھا ٹیک دیا۔ (ہواؤں، بجلیوں، طوفانوں کو بھانپ کر وقت مقررہ سے پہلے ہی رسومات وغیرہ شرو

کر دی۔ اصل میں ان مظاہر سے اس کی روشناس ہوگانہ سائنس کو تسلیم کرنے کی ابتداء تھی۔ پھر آہستہ آہستہ انسان اس خوف کے معنی تلاش کرتا کرتا طاقت و قسم کی توجہ میں داخل ہو گیا۔)

مذہب کو علم کی ایک قسم قرار دینا بھی ایک غلطی ہے۔ ایسے ہی جیسے مذہب کو ایک سیاسی ادارہ یا سیاسی رویہ کہہ کر ہارا جائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایمان کے ساتھ علم ضرور وابستہ ہوتا ہے لیکن اس علم کی وضع قطع مختلف ہوتی ہے اور وہ مذہب کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

چلیے مان لیں کہ مذہب کی ابتداء خوف سے ہوئی۔ جب ایک انڈیا بچے یا رومدگار انسان ویران زمین پر یکہ و خنداؤں دیا گیا اور قدرت کے مظاہر نے اس کو چاروں طرف سے گھیر کر ڈرانا شروع کر دیا۔ اس ڈر نے مذہب کی صورت اختیار کر لی۔ لوگ دیوتاؤں کے غضب کے آگے گڑگڑانے لگے۔ بہت حد تک یہ فلسفہ اور سوچ ٹھیک نظر آتی ہے لیکن خوف مذہبی یا دینی چیز نہیں ہے۔ خوف تو پلاتا ہے، ترپاتا ہے۔ سکتے میں ڈال دیتا ہے۔ مفلوج کر کے بٹھا دیتا ہے۔ خوف جب سکتے اور بے جانی کے ساتھ امیدیں اور انشاء اللہ میں ڈھلتا ہے تو پھر مذہب کی صورت اختیار کرتا ہے یعنی جب تک خوف مخالف جذبے، امید اور یقین کے ساتھ نہیں ہوتا اس وقت تک وہ مذہب کا روپ نہیں بنتا۔

خوف انسان میں اسی وقت مذہب کا رخ پیدا کرتا ہے جب انسان امید سے بھر جائے اور دعائیں اور حمد میں اتر جائے۔ (جب خوف انسان کے دل میں امید پیدا کر دے اور اس امید کے ساتھ دعا (Prayer) کا آغاز ہو جائے تو مذہب جنم لیتا ہے۔ خالی خوف سے مذہب نہیں بنتا!)

کچھ لوگ مذہب کے بارے میں گفتگو کرنا ہی پسند نہیں کرتے کہ یہ ماضی کی بات ہے اور قصہ پارینہ ہے۔ وہ اس لیے گفتگو نہیں کرتے کہ یہ تو ایک ذاتی معاملہ ہے اور ذاتی معاملے پر کیا بات کرنی۔ ایسے لوگ آزاد لوگ ہوتے ہیں لیکن ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مذہب صدیوں سے اسپریشن کی پھلواڑی کے طور پر کام دیتا رہا ہے۔ آرٹ کے لیے، ادب کے لیے، موسیقی کے لیے اور لوگ دیوانگی کی حد تک مذہب سے وابستہ رہے ہیں۔ اب بھی مذہب فرد اور معاشرے کی زندگی میں ایک مضبوط بنیاد کا کام دے سکتا ہے۔

ایک نسل پہلے کی بات ہے پڑھے لکھوں کی دنیا میں مذہب کی چھٹی ہو گئی تھی۔ جب میں کالج میں پڑھتا تھا اور ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی، اس وقت مذہب تقریباً ختم ہو چکا تھا لیکن مذہب پھر لوٹ چکا ہے اور واپس گھروں میں آ رہا ہے۔ یورپ کے نان فکشن ادب میں اب زیادہ کتابیں مذہب پر ہیں۔ اب مشہور فلمسٹار اور کھلاڑی شیخ ایکٹر مذہب کی طرف لوٹ رہے ہیں اور دنیا میں مذہب پر فلمیں بن رہی ہیں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت زمانے کی بڑی بھوک روٹی کی بھوک نہیں ہے بلکہ خدا کے کلام کو جاننے اور وحی کو سمجھنے کی بھوک ہے۔ ہماری نسل کو اس روحانی بھوک کو دور کرنے کے لیے مذہب کے پرانے اور سائنسی دور سے پہلے کے فارمولوں کو اپنانا ہے۔ اب ترقی اور پراگریس کے نام پر نئے معنی کو تلاش کرنا ہوگا اور روحانی پیاس دور کرنے کے لیے دور

جدید کے تقاضوں کو سمجھنا ہوگا۔ ہمیں مذہبی زبان اور مذہبی لہجے کو ایک نیا روپ دینا ہوگا۔ ایسا روپ جو سائنس اور دریافت کی روشنی میں مذہبی زبان کو نیا لہجہ سکھائے۔

مذہب اس وقت بنتا ہے جب باہر کا expression اندر کے تاثرات سے قوی تر ہو جائے اور زیادہ اہم ہو جائے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ مذہب اور جذبات انسانی جلد سے گہرے اترنے چاہئیں۔ جوں جوں یہ گہرے ہوں گے، مذہبی جذبات زیادہ ٹھسے ہوں گے۔

مذہب کیا ہے؟ مشکل سوال ہے۔ اگر لغت میں اس کی تعریف دیکھیں تو تسلی نہیں ہوتی۔ عالموں کی کتابوں سے معنی ڈھونڈیں جب تصنیف نہیں ہوتی۔ الہامی کتابوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انصاف پسندی اور شفقت اور کریمی اور خدا کی رستی کو مضبوطی سے تھامنے کا نام مذہب ہے یا پھر قیہوں اور یوگاؤں کی دیگر مہر، جھنجھکے والوں کے ساتھ جھکنا اور اپنے آپ کا پتہ نہ چلنے دینے کا نام مذہب ہے۔ یہاں Ritual کا کوئی ذکر نہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ مذہب ایک پختہ اور مکمل مذہب دیکھی لوگوں کو سکھی کرنے ہی کا نام نہیں بلکہ عیش پسند لوگوں کو دکھی کرنے کا بھی نام ہے۔ ایک پختہ مذہب کا ماننے والا شخص آزادی پر بھی ایمان رکھتا تھا اور اس کے ساتھ جھوک، ناداری، جہالت، بیزاری اور جنگ کا قلع قمع کرنے کی بابت بھی سوچتا تھا۔ اس کا test یہ بنتا ہے کہ وہ ان ساری چیزوں کا ناس مارنے میں کس حد تک عملی اقدام کرتا ہے۔

پختہ مذہب عزم و یقین کا ترجمان ہوتا ہے۔ یہ بزدلی اور میانہ روی سے ہاتھ نہیں آتا۔ پختہ مذہب زمانے کا مقابلہ کرنے کے لیے نوسلو دینے کی طرح سر کے بل پیدا ہوتا ہے اور عزم و یقین کی مضبوطی بھیج کر اپنے عہد کا اعلان کرتا ہے۔ مذہب کے لیے سب سے بڑا اندیشہ موقع پرستی کا اندیشہ ہے۔ میرا مطلب ہے جب مذہب کو کامیابی، خوشی اور آئندہ اور معاشرتی قبولیت کے لیے اپنا لیا جاتا ہے۔ جب مذہب کو اس لیے اختیار کیا جائے کہ اس سے کامیابی، ترقی، برتری اور شہرت حاصل کی جاسکتی ہے۔ جب آدمی یہ سوچنے لگے کہ مذہبی وضع اختیار کرنے سے گاہک پر، ملازم پر، آقا پر اور مالک پر اچھا اثر پڑے گا۔

یہ ایسے ہی ایک برائی ہے جیسے Honesty is the best policy ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ honesty اگر بری Policy بھی ہو پھر بھی Honesty کو اختیار کیے رکھنا چاہیے۔ مذہب سے چاہے فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے، اس کو اختیار کیے رکھنا بہت ضروری ہے۔

اصل میں مذہب نفع بخش، سلامت رو ہے یہ خوش افزائی اور عطا کردگی سے بڑھ کر چیز ہے۔ یہ کائنات پر اس کے مظاہر پر، اللہ کی نشانیوں پر، دوسرے انسانوں پر اور اپنے آپ پر توجہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ زندگی کے مجموعی view پر زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ موقع تاڑ دین اور فائدہ اٹھاؤ دین کہ مذہب کو اختیار کرنا ایسے ہی ہے جیسے صابن، ٹوتھ پیسٹ، شیمپو وغیرہ بکٹ کے مطابق اپنی زندگی کا رخ متعین کرنا اور ان کے مطابق اپنے آپ کو سنوارنا۔

وہ مذہب جو عقل اور دانش کے test پر پورا نہیں اترتا وہ جذباتیت، رسم پرستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اصل مذہب

پورے کا پورا گہرا اور پاتال میں ہوتا ہے اور ہر حال میں پختہ ہوتا ہے۔ مضبوط ہوتا ہے اور قابل اعتماد ہوتا ہے۔ اس نے جتنیوں کا سامنا کیا ہوتا ہے اور ہر چیلنج پر پورا اترتا ہے۔ اس نے انقیات، معاشیات، سیاسیات، ارضیات، حیاتیات اور طبیعات کو اپنے وسیع دامن میں جگہ دی ہوتی ہے اور وہ اس کے شامیانے تلے مذہب سے وابستہ پرورش پار ہے ہوتے ہیں۔ ہم مذہب کو ایک cult کے طور پر اختیار نہیں کر سکتے بلکہ اس کے بنیادی اصولوں اور تقاضوں کو پھر سے سوچ کر ان پر حکم لگا سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ انسان کیا ہے؟ کون ہے؟ اور اس ساری سکیم میں کیوں ہے۔ پھر..... ہم کس قدر آزاد ہیں، کیا خدا ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے!! کیا موت خاتمہ ہے اور اس کے بعد زندگی کا کوئی نشان نہیں..... ان سوالوں کا جواب نکالنا کوئی آسان کام نہیں لیکن ایک کوشش کر کے اس کی طرف رجوع ضرور کیا جاسکتا ہے اور اس رجوع سے ہمارے اندر کی استقامت میں اضافہ ممکن ہے۔

اس کائنات کی لامتناہی بڑائی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اس کے سامنے مخنی ہو گیا اور ہار مان گیا۔ ایک ماہر افلاک نے اپنی دور بین میں سے دیکھتے ہوئے کائنات پر ہاتھ رکھ کر اپنے چڑا سے کہا، اف خدا یا، تو بہ میری۔ جب میں اجرام فلکی کا معائنہ کرتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ ان کے سامنے ہماری کیا حیثیت ہے؟

چیز ایسی نے کہا، سر! جس دور بین سے آپ یہ اجرام فلکی دیکھ رہے ہیں، یہ حضرت انسان کی ایجاد ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان کے مقابلے میں دوسرے جانوروں کے پاس بھی دماغ ہے، وہ بھی اس سے کام لیتے ہیں لیکن اگر سینٹ اور سیریل دنیا کے کسی بھی جانور کو دے دیا جائے، وہ اس کو لے کر نہ تو دریائے راوی پر بل تعمیر کر سکے گا، نہ اس سے کائی سکر پیر بنا سکے گا۔ کوئی جانور کتنا بھی زور لگائے، اس سے نہ تو مسجد قرطبہ جیسی نظم نگاہی جاسکتی ہے اور نہ ہی چغنی جیسی تصویر بنائی جاسکتی ہے۔

آدمی کے بدن میں اتنا لوہا موجود ہوتا ہے کہ اس سے چار انچ لمبی کیل بن سکتی ہے۔ اتنا کاربن ہوتا ہے کہ اس سے بارہ سو مٹی پھسلیں بن سکتی ہیں۔ اتنا پانی ہوتا ہے کہ اس سے پانچ سیر کا گڑوا بھر سکتا ہے یعنی آدمی کا ربن، آکسیجن، ہائیڈروجن اور نیوٹرون کا مجموعہ ہوتا ہے اور ان کا تناسب طے ہوتا ہے لیکن جناب پھر دیکھ لیجئے کہ یہ چھٹا کی بھرلو ہے اور بارہ فٹسول والے کاربن کا کمال کہ پانچوں براعظموں پر جبوجیٹ چلاتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ سمندروں کے اندر سرنگوں میں سے گزر رہا ہے۔ یہی آدمی دوسرے کی آنکھوں کا ٹٹولے کر ایک اندھے کی آنکھ میں لگاتا ہے اور دیکھنے لگ جاتا ہے۔

مذہب کی بھی اپنی ہی ایک زبان ہوتی ہے جو صدیوں کے ریاض، تجربے، عمل اور سوچ کے بعد پیدا ہو جاتی ہے اور خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن کھیلوں کی یا ذاکسری کی تلمیحات کی طرح۔ اس کے علاوہ کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو صرف جاننے والوں کو اور سالکوں کو معلوم ہوتی ہیں۔ مذہبی اور روحانی اصطلاحات اس لیے بھی اچھی طرح سے گرفت میں نہیں آتیں کہ وہ Concepts سے تعلق رکھتی ہیں چیزوں سے نہیں۔ بہت زیادہ استعمال ہونے والی اصطلاحات بھی فہم کے اندر نہیں اترتیں۔ مثلاً دو نہایت ہی عام استعمال میں آنے والی اور روزمرہ کے استعمال کی چیزیں

ہیں۔ خدا اور روح مجردوں ہی بعید از قیاس رہتی ہیں۔ حالانکہ ہم قدم قدم پر ان کا ذکر کرتے ہیں۔

اصل میں شفقت، محبت، ترحم اور مہربانی کے جذبے کو بھی سوچ سمجھ کر استعمال کرنا چاہیے بلکہ بہت ہی سوچ کر وارد کرنا چاہیے۔ اس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک اپانچ لڑکی کو آپ تجھے تحائف، توجہ دیتے رہیں اور وہ اس کو محبت سمجھنے لگے اور جب آپ جانے لگیں تو وہ آپ کی جدائی برداشت نہ کر کے خودکشی کر کے مر جائے۔ اس جذبے کو ہمیشہ عقل اور فراست کی کسوٹی پر رکھ کر استعمال میں لانا چاہیے۔ اس طرح کی ایک اور مصیبت وہ ”محبت“ کا جذبہ ہے جو والدین بچوں کی اندھی محبت میں ان کو گمراہ کر دیتے ہیں۔ چور ڈاکو بنا دیتے ہیں اور ان کا برا انجام ہوتا ہے۔ مذہبی احساسات میں بھی ایسے ہی جو جذبہ تاثیرات دیکھنے میں ملتے ہیں۔ ایک جذبہ انسان کو اونچا پرلے جاتا ہے اور وہی اگر تفکر اور تدبر کے ساتھ دیکھا پرکھا نہ جائے تو انسان کو نفرت، کڑواہٹ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ خون خرابہ ہو کر لگتا ہے۔ مذہبی جنگیں ہونے لگتی ہیں۔ حالانکہ مذہب کا جنگ سے کوئی رشتہ ہے ہی نہیں۔ ہم اپنی زندگیوں سے محبت اور ترمیم کو کمال نہیں دیتے کہ ان سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور نہ ہی مذہب کو کمال دیتے ہیں، اس سے غلط کام اور غلط مطلب لیا جاسکتا ہے۔

یہ یوں لوگ ہیں جو نام کے مسلمان کو پسند نہیں کرتے۔ یہ غور طلب لوگ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مسلمان کو اچھا نہیں سے نصف دیکھنا چاہتے ہیں۔ عمل سے وابستہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کو بہتر انسان دیکھنا چاہتے ہیں بلکہ پہلے انسان دیکھنا چاہتے ہیں پھر مسلمان۔ ان کا خیال ہے کہ اچھا انسان بن کر ہی اچھا مسلمان بن سکتا ہے بلکہ اصل مسلمان وہ ہے جو اچھا انسان ہے..... لیکن نام کا مسلمان کہتا ہے کہ میں اچھا مسلمان تو نہیں ہوں لیکن میں مسلمان ہوں اور مسلمان کہلوانا پسند کرتا ہوں، صرف انسان نہیں۔

یہ توجہ طلب لوگ جو مسلمانوں میں عمل دیکھنے کے خواہش مند ہیں اور جو صرف باعمل مسلمان کو مسلمان گردانتے ہیں، وہ لوگ شرع اور شریعت کے پابند لوگوں کو بھی اچھا مسلمان نہیں سمجھتے اور ان کو بنیاد پرست، تنگ نظر، متعصب اور کوتاہ پسند مسلمان کہتے ہیں۔

کس قسم کے عمل کو عمل سمجھتے ہیں اور کس قسم کے عمل کو مسلمانوں میں رواں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ بیکور عمل کو بہتر عمل سمجھتے ہیں اور اکثر باہر سے اس کی مثال دیتے ہیں اور غیر مسلموں کے حسن سلوک اور حسن عمل کو عمل سمجھتے ہیں۔ مثلاً۔

(1) لوگوں سے خوش اخلاقی اور خوش بیانی سے پیش آنا۔

(2) برداشت اور رواداری کا مظاہرہ کرنا۔

(3) جھگڑے سے ہر حالت میں گریز کرنا۔

(4) جہاد اور جہانی خواہش کو کنٹرول میں رکھنا۔

(5) وسعت مال کے حصول کے ذرائع اختیار کر کے اپنی اور قوم کے لوگوں کی مالی حالت بہتر بنانا۔

(6) یورپ کے انداز زیست اختیار کر کے وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلام میں تبدیلی لانا۔

(7) دنیا کو زیادہ مضبوطی سے اختیار کرنا۔

لیکن ہمیں سوچنا پڑے گا کہ کیا ہم نام کے مسلمانوں کو اسی طرح سرزنش کرتے رہیں اور ان کو گھٹیا اور کمتر درجے کے مسلمان سمجھتے رہیں۔

لیکن..... بونسیا کے اور چھینیا کے نام کے مسلمان کہتے ہیں کہ ہم اعلیٰ درجے کے عملی مسلمان تو نہیں ہیں اور نہ ہی ان صفات اسلامی کے حامل ہیں جن کی آپ ہم سے توقع رکھتے ہیں لیکن ہم مسلمان ہیں اور پورے مسلمان ہیں اور امد کے انفرادی طرح سے شریک رہنا چاہتے ہیں جس طرح سے دوسرے مسلمان شریک ہیں۔

فلان صاحب نے کہا شراب بھی پیتا ہوں اور شام کو رنڈی کا بچرا بھی دیکھتا ہوں اور یہ شعار ہر گز اسلامی نہیں ہے۔ گناہ کا مرتکب ہوں لیکن جنت تو دو ہاتھ دور ہے۔ دو ہاتھ ماریں گے، جنت لے لیں گے۔

ذریعہ وارطانیں جو رکھا برسا کر محفل سے نکل گئیں۔ میں اس گروہ کو بڑے غور سے دیکھا کرتا تھا جو ڈیرے پر آکر اس قسم کی باتیں کرتے تھے۔ وہ غور طلب گروہ جو مسلمانوں سے اچھے، پاکیزہ، شرمیلی اور دینی عمل کا خواہاں تھا، وہ عام

مذہب اور پھر مذہب!

باوجود اس کے کرم نے مذہب کو بڑی شدت کے ساتھ رد کرنا شروع کر دیا ہے اور اس میں مسلسل کینزے نکالنے کی ذمہ داری اپنائی ہے لیکن صابن کی دھون کے ساتھ بچہ بھی چلی سے باہر نہیں پیچیدگ دینا چاہیے..... اگر ہم مذہب کی ضعیف الاعتقادی اور تنگ نظری اور بے منطقیت پر تنقید کرتے ہیں تو ہمیں مذہب کی خوبیوں کو بھی تو اجاگر کرنا چاہیے۔ (خاص طور پر اسلام کے مذہب کو) اس کے اندر بے پناہ خوبصورتیاں اور نزاکتیں جمع ہیں اور ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا۔

نام کا مسلمان

یہ ایک اہم سوال ہے اور اس کا عام استعمال ہوتا ہے۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام عمل کا نام ہے۔ قرآن عمل کی کتاب ہے، اس پر جزدان چڑھا کر اوپر رکھنے کا حکم نہیں۔ جو شخص احکام شریعت پر عمل نہیں کرتا، وہ سچا مسلمان نہیں، وہ نام کا مسلمان ہے۔

اب نام کا مسلمان ایک بھاری تعداد میں موجود ہے اور وہ عملی مسلمان نہ ہو سکنے کی وجہ سے اپنا مذہبی تشخص چھوڑنے کو تیار نہیں۔

وہ رشوت لیتا ہے، سود کھاتا ہے، دغلی زندگی بسر کرتا ہے لیکن مسلمان کہلاتا ہے اور مسلمان کہلانا چاہتا ہے اور مسلمان رہنا چاہتا ہے۔ اس کو ہم کیا کریں۔

بے شک وہ ایسا مسلمان ہے جنہیں دیکھ کر شرمائیں، ہنسیں، لیکن ہم اس کو ہندو نہیں کہہ سکتے۔ نہ ہی اسے چھوڑ سکتے ہیں۔

طور پر سیاستدانوں، بیوروکریٹس، فوجیوں، پروفیسروں اور صحافیوں وغیرہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ وہ بڑے دکھ کے ساتھ مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچتے تھے اور مسلمانوں کے بائبل ہونے کی آرزو میں گھلتے تھے مگر وہ بھی میری آپ کی طرح کے عام مسلمان ہی ہوتے تھے۔ اچھے اچھے، پڑھے لکھے، عمدہ عہدوں پر فائز، اونچے مالے طبقے سے وابستہ لیکن نام کے مسلمان۔

بڑے تعجب کی بات ہے اور مل بیٹھ کر سوچنے کا مقام ہے کہ سارا مغرب اعلیٰ درجے کے اچھے، بائبل، پڑھے لکھے مسلمانوں کے ساتھ تو گھل مل کر رہنے کا خواہشمند ہے لیکن وہ نام کے مسلمانوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان کے دُفیعہ کے پردہ گرام بنانا رہتا ہے۔ یہ نام کے مسلمان کون ہیں؟

سارے مذاہب کے بنیادی فلسفے کیوں بدل گئے؟

سارے مذاہب نیکی، بھلائی، شرافت انسان دوستی کی تعلیم دیتے ہیں لیکن ہم جب ان کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان مذاہب کے ماننے والے نیکی، بھلائی، شرافت اور انسان دوستی کا دامن چھوڑ کر قتل و غارت گری اور ایک دوسرے کی تباہی میں مشغول ہوتے ہیں۔ کیا وجہ ہے؟ ایسا کیوں ہے؟

(1) شاید ان مذاہب کی تفصیل اور جزئیات بیان کرتے وقت لوگوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔

(2) حضورِ مجنن کو رحمتِ العالمین کا رتبہ ملا ہے اور اوپر سے ملا ہے۔ ان کو دوسرے مذاہب کے لوگ اس خطاب کے مطابق نہیں سمجھتے۔ تفسیر کرنے والوں نے کچھ اور طرف کو پینڈل موڑ دیا۔

(3) لوگ مذاہب کی بنیادی تعلیمات جاننے کے باوصف ان کے خلاف ہو گئے۔ اچھا یوں کو برائیاں اور خوبیوں کو خرابیاں سمجھنے لگے۔ سائنس کی اختراعات نے بھی کافی نقصان پہنچائے لیکن لوگ ان کے خلاف نہیں ہوئے۔

Evil مذہب

بدی کا بھی اپنا ایک مقام ہے اور اونچا مقام ہے۔ اس دنیا میں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے لیے حد، رقابت، مقابلہ، انتقام، قتل، جنس اور ظلم کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ سب نہیں ہوں گے تو دنیا ترقی نہیں کرے گی۔ ان چیزوں کے ہونے سے دنیا بہت ترقی کرتی ہے۔ گویا انسان نیچے کھجوا جاتا ہے۔ اسفل السافلین کہلاتا ہے۔ اخلاقی اقدار پر پورا نہیں اترتا لیکن اس کی دنیا مندرجہ بالا Evil کے سہارے ہی اوپر کی منزل میں طے کرتی ہے۔

اگر Evil ایسی ہی اہم شے ہے تو پھر اس کا آسمانی صحیفوں میں گزربس اس قدر ذلت سے کیوں ہوتا..... پہلے تو اقدار کے بارے میں طے کریں۔

What religion is not

اگر ہم مذہب کے بارے میں یہ سمجھنے لگیں کہ یہ کچھ کرنے کی یا کر کے دکھانے کی چیز ہے تو پھر ہم پہلے ہی قدم بے

دلہل میں اور کھوپے میں چھتے نظر آتے ہیں کیونکہ زندگی میں کوئی عمل یا Activity ایسی نہیں ہے جسے خصوصی طور پر مذہبی عمل کہا جاسکے۔

مذہب اصل میں کیا ہے اور اس کی غایت کیا ہے، اسے ڈھونڈنے کے لیے ہمیں دوسری طرف سے چکر کاٹ کر آنا ہوگا کہ مذہب کیا نہیں ہے!

پہلے تو آپ یہ جان لیجئے اور مان لیجئے کہ مذہب کوئی فکر یا کوئی سوچ یا کوئی جانکاری نہیں ہے یعنی یہ نہ تو خیال کے زمرے میں آتا ہے اور نہ عمل کے دائرہ کار میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ سائنس بھی نہیں ہے۔ تاریخ بھی نہیں، داستان رزم بھی نہیں، نہ یہ فلسفہ ہے۔ حتیٰ کہ یہ دینیات بھی نہیں۔ میں مذہب کے نقطہ نظر سے تمام راز ہائے سربستہ کا علم رکھ سکتا ہوں۔ لیکن پھر بھی کچھ نہیں ہوں۔

اب یہ بھی مان لیجئے کہ مذہب کوئی اخلاقیات بھی نہیں۔ کردار بھی نہیں اور prudence تو خبر بالکل ہی نہیں۔ شاید اس کے قریب ترین اگر کوئی شے آسکتی ہے تو وہ اخلاقیات ہی ہے کیونکہ اس کے بغیر مذہب کا تصور ذرا مشکل سی بات ہے لیکن اگر وہ پیدا لوگوں سے پوچھئے تو وہ بھی نہیں گے کہ مذہب اخلاقیات سے ذرا آگے کی چیز ہے، یہ اس پر بڑھاوے کا نام ہے۔ پھر مذہب جذباتیت بھی نہیں۔ جذبات کا اگر مظاہرہ دیکھنا ہو تو وہ آپ کو فنون لطیفہ میں بدرجہ اتم ملے گا اور مذہب سے بڑھ کر ملے گا۔ کوئی مذہبی آدمی یہ بھی ماننے کو تیار نہیں ہوگا کہ اس کا مذہب فنون لطیفہ کا ایک مظہر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آرمٹ بھی اخلاقیات کی طرح مذہب کے قریب تر کی چیز ہے لیکن اکثر اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ مذہب اور آرٹ بالکل متضاد چیزیں ہیں کہ ایک دوسرے کے آنے سانسے آکھڑی ہوتی ہیں۔

اصل میں انسان پورے کا پورا انسان جانتا بھی ہے، سوال بھی کرتا ہے اور محسوس بھی کرتا ہے اور وہ یہ تینوں چیزیں (ایک ساتھ) کرتا ہے۔ ہم ہمیشہ اس کو ایک شے میں کہا ہوا دیکھتے ہیں جس سے وہ حال کی گھڑی میں برسہا برسہا بیکار ہوتا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا اس پر دوسری چیزیں بھی وارد ہو رہی ہوتی ہیں خواہ جیسے انداز میں ہی کیوں نہ ہوں۔ دھیمے اور واضح اور بین اور وحند لے ارادوں اور پیش قدمیوں کی بات کرتے ہوئے ہم شعور اور لاشعور کے دائروں میں اتر جاتے ہیں۔

تو کیا مذہب پر اچھین زمانوں اور لاشعور کی گہرائیوں سے بو کے ٹکالے اور پانی بھرنے کا نام ہے۔ ایسی کئی تھیوریاں بڑی بنا سچا کے پیش کی جاتی ہیں اور ان پر بڑی واہ واہ ہوتی ہے لیکن ان کو precise بنانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

مثلاً فریڈنڈ ہب کو ایک دھوکا اور Fraud کہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ڈونگ اسے زندگی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ حسن کا اور معافی کا منبع خیال کرتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ڈونگ بھی اسے ایک دھوکا ہی خیال کرتا لیکن دور سے ایک حقیقی دھوکا بھی سمجھتا ہے۔

کچھ بھی سہی، مذہب کو قدیم اور پراچین کے ساتھ ملحق کرنا زیادتی ہے۔ قدیم اور پراچین تو اہمات اور ترقی یافتہ

مذہب کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔

دیں اور ہر طرح کے آزادی اظہار عطا کرنے سے پابندی اٹھالیں تو۔۔۔۔۔

(9) اگر اسلامی ممالک اور ان کے کٹر حجت مولوی اپنی قدامت پسندی ترک کر کے اسلامی ملکوں میں ریڈیو، ٹی

وی، ویڈیو شاپ اور ویڈیو کیمرے کی اجازت دے دیں تو۔۔۔۔۔

(10) اگر مولوی حضرات سائنسی ایجادات کو اپنی ذات کے لیے استعمال کرنے میں بھی اجتہاد کا سہارا لیں اور

مالی جہاز اور بحری جہاز سے حج پر جانے میں پابندی عائد نہ کریں تو۔۔۔۔۔

(11) اگر اسلامی ممالک میں قریعہ اندازی، لائٹری، انعامی سیکس اور پرچی کھینچنے والے جوئے کی اجازت ہو

جائے اور اس میں اجتہاد سے کام لے لیا جائے تو اسلام بڑی سرعت سے ترقی کر سکتا ہے۔

(12) اگر اسلامی ممالک میں پورے کے پورے ولایتی قوانین عائد کر دیے جائیں اور عدالتوں سے اسلامی

قوانین کو نکال دیا جائے تو اسلامی ممالک عدل، انصاف اور جرم و سزا کے معاملے میں ولایتی ملکوں جیسے قابل تقلید معاشرے

بہا کر سکتے ہیں۔

(13) اگر مسلم ممالک کے مولوی اپنے دینی اداروں میں ولایت کے علوم کی تعلیم دینا بھی شروع کر دیں تو مولوی

کی نظر میں وسعت پیدا ہو جائے اور وہ واقعات علم کا عالمی تناظر میں دیکھنے کی عادی ہو جائیں۔ ان میں ویسی ہی وسعت نظر

اور وسعت قلب پیدا ہو جائے جیسی مغرب کے لوگوں میں ہے۔

(14) اگر تھوڑا سا اجتہاد کر کے ولایتی لباس اختیار کرنے کی اجازت مل جائے تو پھر ترقی خود چل کر اسلامی

ممالک کے دروازوں پر پہنچ جائے۔

(15) اگر اسلامی ملکوں میں طب کے پیشے اور قدیم طریق علاج کے بجائے ولایتی قسم کے علاج معالجے کا

سلسلہ شروع کر لیا جائے اور لوگوں کو ڈاکٹروں اور سرجنوں کے حوالے کر کے انسانوں کا علاج معالجہ شروع کیا جائے تو

اسلامی ممالک سے ہر قسم کی بیماری کا خاتمہ ہو جائے اور لوگ صحت حاصل کر کے لمبی عمر پا سکیں لیکن ولایتی دواؤں پر پابندی

ہونے کی وجہ سے اور مولوی کے ضدی رویے کی بنا پر سارے اسلامی ممالک بیماریوں کی آماجگاہ بن گئے ہیں۔

(16) اگر اسلامی ممالک میں تنگ نظر لوگوں کے پریگنڈے کا منہ توڑ جواب دے کر یہاں علم کی دولت عام کی

جائے اور سکولوں، کالجوں، مدرسوں کی تعمیر سے پابندی اٹھائی جاسکے تو آمد بہت جلد ترقی کر سکتی ہے۔

(17) تعلیم کے سلسلے میں اگر عورتوں کی تعلیم پر عائد پابندیاں اٹھائی جائیں اور لڑکیوں کو بھی کالجوں اور

یونیورسٹیوں میں داخلے کی اجازت مل جائے تو اسلامی ممالک دن دو گنی رات چو گنی ترقی کر سکتے ہیں۔

(18) اگر اسلامی ممالک میں مولوی اور ملا کی پروا کیے بغیر عورتوں کو بازاروں اور منڈیوں میں دکانداروں اور

کاشتکاروں کے طور پر آنے کی اجازت ہو جائے اور خواتین امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس میں اور صنعت و تجارت کے

میدان میں گھر چھوڑ کر بازار میں آجائیں تو ملکی معیشت میں ناقابل یقین اضافہ ہو جائے۔

(19) اگر سائنس کی تعلیم میں رکاوٹیں نہ کھڑی کی جائیں اور مسلمان ممالک کے نوجوانوں کو بھی ڈاکٹر، انجینئر،

اور ایک اور بات جو مذہب نہیں ہے، وہ روحانیت mysticism ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روحانیت

میں مذہب کا عمل ہی جاری ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہب روحانیت نہیں! عام اصطلاح میں روحانیت مذہب

ایک خصوصی شعور کا نام ہے جس سے کچھ گئے پنے لوگ ہی واقف ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو برگزیدہ ہوتے ہیں اور جو اس

کے لیے مخلص ہوتے ہیں لیکن وہ بھی مذہب سے بہت دور ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں بہت اعلیٰ درجے کے مذہبی لوگ

گزرے ہیں جو روحانی بزرگ نہیں تھے لیکن بہت ارفع درجے کے مذہبی لوگ تھے۔

یہ بات خواہ سو فیصدی درست ہو کہ ہر مذہب میں روحانیت کا ایک رخ موجود ہوتا ہے بلکہ روحانیت کی

مذہب کی نقیب ہوتی ہے۔ اس پر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہیں!

اجتہاد.....

ایک عام خیال کے مطابق اسلام کو اور اسلامی ریاست کو اجتہاد کی سخت ضرورت ہے۔ اگر اسلام میں اجتہاد

رستہ کھل جائے تو پھر یہ مذہب ایک حرکی قوت بن کر دوسرے سارے معاشروں سے آگے نکل کر ان کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

(1) اگر اسلام میں نوٹو کھینچوانے کی پابندی ختم ہو جائے اور مفتی فضل الرحمن، شاہ احمد نورانی، مولانا مسیح الحق،

مولانا..... اپنی تصویر اتارنے کی اور ٹیلی ویژن پر آنے کی اجازت دے دیں تو آمد فوری ترقی کر سکتی۔

(2) اگر عورتوں کو سینہ یا کندھے ڈھانپنے بغیر یا حجاب لیے بغیر بازاروں، منڈیوں، پلازوں وغیرہ میں خریداری

کی عام اجازت ہو جائے اور وہ آزادی کے ساتھ خرید و فروخت کر سکیں تو۔۔۔۔۔

(3) اگر خواتین کو موٹر گاڑی، ہوائی جہاز، سکوتر وغیرہ سرعام چلانے کی اجازت ہو جائے

(4) اگر مولوی لوگوں کو ٹیلی فون، کار، لاؤڈ سپیکر کے استعمال کی اجازت دے دیں اور اس کے ساتھ ساتھ

سائنس کے دوسرے آلات، جراحی کے انسٹرومنٹس، ولایتی ادویات اور انجکشن وغیرہ کی اجازت دے دیں اور ان چیزوں

کے استعمال میں اجتہاد سے کام لیں تو۔۔۔۔۔

(5) اگر کبھی خوش قسمتی سے کسی اسلامی ملک کی سربراہ عورت بن سکے یا اسلام میں اجتہاد کر کے اس کی اجازت

ہو جائے تو اس ملک کے ساتھ ساتھ وہ اسلامی ریاستیں بھی دنیا میں بلند مقام پر پہنچ جائیں جہاں ابھی تک کوئی خاتون سربراہ

مملکت نہیں بن سکی۔

(6) اگر امام کعبہ دوسرے ملکوں سے آئی ہوئی خواتین کے ساتھ فوٹو اتراؤ سکیں یا دوسرے ممالک جا کر وہاں کی

سربراہ اور مسلم خواتین کے ساتھ فوٹو اتراوانے پر کوئی اعتراض نہ کریں تو۔۔۔۔۔

(7) اگر اسلامی ممالک اپنے بینکوں کو سود لینے اور سود دینے کی اجازت دے دیں تو۔۔۔۔۔

(8) اگر اسلامی ممالک صرف دینی پرچوں اور مذہبی اخباروں کے علاوہ دوسرے عام اخبار چھپنے کی بھی اجازت

آپ نے دیکھا ہوگا لاہور میں مال روڈ، میکوڈ روڈ، برانڈر تھ روڈ، شاہ عالمی، اکبری منڈی اور شاہ عالم مارکیٹ
ایم کی بندر روڈ، جوڈیا بازار، نیئر روڈ، پلٹن مارکیٹ، پورٹ ٹرسٹ ان دوشہروں کے راہبوں، گوشہ نشینوں، بے عملوں اور
الہ دنیا لوگوں کی وجہ سے ہر وقت سنسان اور بے آباد رہتی ہیں۔ لوگ دنیا کمانے سے کتراتے ہیں اور ہر وقت عاقبت
کے لیے بے عملی کے جھروں میں بندر رہتے ہیں۔ اس لیے پاکستان کے سارے شہر سنسان اور ویران رہتے ہیں۔

اور توحید

توحید کے چار مراتب ہیں۔ ایک منفرد، دوسرا مغز کا مغز، تیسرا چھلکا اور چوتھا چھلکے کے اوپر کا چھلکا..... توحید کو ایک
بڑے سمجھ لو جس پر دو چھلکے ہوتے ہیں اور اندر ایک مغز اور مغز میں تیل۔ پس توحید کا اول مرتبہ ہے کہ آدمی اپنی زبان سے کہے لا
اللہ محمد دل اس سے غافل ہو یا منکر۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اس کلمے کے معنی کو دل سے سچ جانتا ہوں جیسے عام مسلمان اس کی
تائید کرتے ہیں۔ مرتبہ سوم یہ ہے کہ نور حق سے مشاہدہ ہو کہ یہ معنی مکمل جائیں (یہ مقام مقررین کا ہے) مقررین کون ہوتے
ہاؤہ جو اشیاء کو تو کثیر جائیں کہ دنیا ان سے بھری ہوئی ہے لیکن اس ساری کثرت کو اللہ کی طرف سے سمجھیں اور چوتھا مرتبہ یہ
ہے کہ دنیا کی کل اشیاء اور سب موجودات سے نظریں اٹھا کر ذات واحد اور یکتا کے اور کسی کو نہ دیکھے۔

مسلمانوں میں اتفاق کیسے ہو؟

اتفاق ہوتا ہے دوسروں کو آرام و سکون پہنچانے سے۔ اگر مسلمان اس کا خیال رکھیں کہ دوسروں کو نفع پہنچانا ہے
سب متفق ہو جائیں گے۔
اسلام کا ایک حسن یہ ہے کہ اس کو اپنی اشاعت کے لیے نہ زور کی ضرورت ہے نہ زور کی۔

برہ اور پابندی

ناپسندیدہ لباس وہ ہے جو اپنی ذات میں عزت اور گھمنڈ پیدا کرنے کے لیے پہنا جائے۔

اسلام کا علم

میں صوفی ازم کے بورڈ سے ٹیک آف نہ کر سکا کیونکہ نہ میں بابا تھا، نہ ہی سائنس دان۔ میں تسلیم و رضا کی رسی
تار مانتا جانتا ہی نہ تھا۔ پھر پاکستان میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ گھر گھر..... گلی گلی..... امید کی نئی کرن پھوٹی.....
اسلام کا علم مجھے اپنے بڑوں سے ملا ہے اور یہ اتنا مختصر ہے کہ بڑی آسانی کے ساتھ چند جملوں میں ادا ہو جاتا
ہے اور احکام کی صورت میں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ میں اسلام سے صرف اسی حد تک متعارف ہوں اور دعا کرتا رہتا
ہوں کہ جتنی بات کی مجھے آگہی عطا کر دی گئی ہے، اس کے مطابق رہنے کی توفیق عطا ہوتی رہے۔

کپیوٹر پروگرامر، سائنس دان، ہوا باز Pilot بننے کی اجازت مل جائے تو اسلامی ممالک دنیا کے دوسرے ملکوں کو بہت
چھوڑ جائیں۔

(20) دنیا کے تیزی سے بدلتے تقاضوں کے پیش نظر اگر مولویوں کے درس نظامی میں دور جدید کے علوم کے
تعارفی اسباق شامل کر دیئے جائیں اور مولویوں کو بنیادی سائنس کے اصولوں سے آگاہ کر دیا جائے تو وہ بہتر مولویوں
کرا حسن طریق پر اپنے معاشرے کی خدمت کر سکیں۔ عین اسی طرح اگر ایم بی بی ایس کے کورس میں میڈی بکری پالنے
کے طریق اور چونہ آم کی پیوند کاری کے اسلوب کے تعارفی اسباق بھی شامل کر دیئے جائیں تو ڈاکٹر لوگ احسن طریق پر
اپنے معاشرے کی خدمت کر سکیں۔ ایسے ہی اگر ایل ایل بی کے کورس میں نوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے کے طریق اور بکری
صاف کرنے کے ابتدائی فارمولے شامل نصاب کر دیئے جائیں تو وکیل حضرات احسن طریق پر اپنے معاشرے کی
خدمت کر سکیں۔

(21) اگر تنگ نظر مولوی اور بد شکل مصلح اجتہاد سے کام لے کر اپنے اپنے ملک کے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو
ریڈیو، ٹی وی اور فلم میں کام کرنے کی اجازت دے دیں تو کثیر زر مبادلہ خرچ کر کے غیر ملکی فنکاروں کو مسلم ملکوں میں بلائے
کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اپنے ہی ملک کے لڑکے، لڑکیاں، مرد، عورتیں مقامی فنکاروں کے طور پر بہترین کا مظاہرہ بھی کر
سکیں اور اپنے کلچر کی ترجمانی بھی کر سکیں۔

(22) اگر اسلامی ملکوں کے سربراہ تصویر کشی کو حرام نہ سمجھیں اور اجتہاد کر کے اپنی تصویریں، بکٹ سکوں اور کرنی
نوٹوں پر شائع کروا سکیں ان کا شمار آپ سے آپ ترقی یافتہ حکمرانوں اور سیاستدانوں میں ہونے لگ جائے۔

(23) اگر تنگ نظر مولوی اور بدہیت مصلح اجتہاد کے ذریعے مسلمان ممالک میں بھی بیاہ شادی کی غیر اسلامی
رسوں کے ادا کرنے کی اجازت دے دیں اور دوسرے آزاد معاشروں کی طرح مسلمان معاشروں کو بھی دل پشوری کرنے
کی چھٹی دے دیں تو مسلمانوں سے ساری ذہنی اور نفسیاتی بیماریاں خود بخود دور ہو جائیں۔

(24) اگر اسلامی ممالک میں جیمبر آف کامرس کھولنے کی اجازت ہو جائے تو سارے اسلامی ملک فروغ
تجارت میں دوسرے ملکوں کے شانہ بشانہ آکھڑے ہوں۔

(25) اگر علمائے کرام پارلیمانی نظام جمہوریت کو اجتہاد کے ذریعے دین کا درجہ دے کر سارے عالم اسلام پر
لاگو کر دیں (یا کرادیں) تو دنیا بھر میں اسلام میں ایک خوش آئند انقلاب آجائے اور چودہ سو سال سے ترقی کے بند راستے
خود بخود کھل جائیں۔

(26) اگر ملا لوگ مسلم امہ کو آخرت، جزا و سزا، ایمان و ایقان، اللہ کی رحمت پر بھروسہ، قسمت اور تقدیر پرستی جیسی
چیزوں میں ملوث کر کے ان کو راہب اور گوشہ نشین بنانے پر مجبور نہ کریں اور انہیں دنیا کمانے اور دنیا کے اندر جدوجہد کر کے
زندہ رہنے کا درس دیں اور انہیں کوٹھڑیوں، جھروں اور ڈیروں سے نکال کر باہر لائیں تو اسلامی ممالک عمل کی گرمی سے
بھڑ بھڑ جائیں اور مسلم ممالک اپنی کھوئی ہوئی میراث پھر سے حاصل کر لیں۔

مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام کا مطلب سلامتی ہے۔ جو شخص اسلام قبول کر لیتا ہے، وہ سلامتی میں داخل ہوتا ہے اور جو شخص سلامتی میں داخل ہو جاتا ہے، وہ سلامتی ہی عطا کرتا ہے۔ اس کے مخالف عمل نہیں کرتا۔ جس طرح ایک مصلح آدمی اپنے گرد و پیش کو عطربیز کر دیتا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان اپنے گرد و پیش کو خیر اور سلامتی سے لبریز کر دیتا ہے۔ ہر کسی وجہ سے مجھ سے اپنے ماحول کو اور اپنے گرد و پیش کو سلامتی اور خیر عطا نہیں ہو رہی تو مجھے رک کر سوچنا پڑے گا کہ میں اسلام کے اندر ٹھیک سے داخل بھی ہوں یا نہیں.....

میرے مسلمان ہونے کا ٹیسٹ اور میرے اسلام کی کسوٹی میرا گردش و پیش، میرے ارد گرد کے لوگ اور میرا معاشرہ ہے جس کے اندر میں موجود ہوں۔ اگر میرے ارد گرد کے لوگ سلامتی سے ہمتا رہیں اور شر اور فساد سے محفوظ رہیں۔ خیر کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آسانی سے اور آزادی سے سانس لے رہے ہیں۔ ہر طرح سے سوکھے ہیں تو تو اسلام کے اندر ہوں اور اس خوشبودار راہ میں پلٹا ہوا ہوں جو ارد گرد کی کثافت کو دور کر رہی ہے۔

اس بات کا جائزہ لینے اور اپنے گرد و پیش کے حوالے سے خود کو سمجھنے کے لیے مجھے علم کی ضرورت ہے اور یہ علم کسی تعلیم سے ملتا ہے جو مجھے آج تک مل چکی ہے اور جواب مجھے دی جا رہی ہے۔ میری آموزش یا میری استعداد علمی الفاظ کی اور بیان کی محتاج ہے۔ یہ میں تحریر سے بھی حاصل کرتا ہوں اور تقریر سے بھی۔ الفاظ مجھے شناخت دیتے ہیں، علم سے مشاغل عطا کرتے ہیں اور میرے معلوم میں اضافہ کرتے ہیں۔ میری معلومات بڑھاتے ہیں۔ معلوم اور معلومات میرے ذہن اور میری یادداشت کو معمور کرتے ہیں۔ میرے حافظ کے اندر کی پلاننگ کرتے ہیں۔ میری یاد بود کی فہرستیں مرتب کرتے ہیں..... لیکن اس گہرے، پائیدار اور حافظے کو معمور کرنے کا عمل میری روح یا میرے وجود یا میری کارکردگی پر اثر ضرور ہوتا ہے لیکن زندگی میں میری پیش قدمیوں پر کوئی دیر پا اثر نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ میری دگر سازی نہیں کرتا۔ میں اپنے حلقے میں مجتمع الفاظ یا واقعات کے زور پر یا دوسری کتابوں کی مدد سے ایک اور کتاب تو مرتب کر سکتا ہوں لیکن وہ کتاب میرا حال نہیں ہوگی۔ میں نے اسے اپنی ذات کی لیا بھڑی میں ذاتی تجربات سے گزر کر نہیں لکھا ہوگا۔ اس لیے اس کتاب سے علم نافع میں اضافہ نہیں ہوگا اور اس سے میرے گرد و پیش کو خیر نہیں پڑے گی۔ صرف کتب خانے میں اور لائبریری میں ایک اور کتاب کا اضافہ ہو جائے۔ میرے لیے ایک بار پھر مشکل پیدا ہوگئی۔

فرمانے والے فرماتے ہیں کہ صحیح علم اور نافع علم کو طالب علم کی ذات میں اتارنے اور اس علم کو مستعمل کی روزمرہ عملی زندگی کا حصہ بنانے کے لیے ایک با عمل استاد، ایک صاحب حال معلم اور ایک کرنی والے گرو کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کی غیر موجودگی میں کتاب، سے الفاظ سے یا بیان سے حاصل کیا ہوا علم زندگی پر وارد کیا جاسکے۔ آپ تیراکی کے فن پر ساڑھے چار سو صفحے کی کتاب دس مرتبہ پڑھ کر اسے اچھی طرح سے حفظ کر لیں لیکن جب آپ پانی میں اتریں گے تو تیرہ نہیں سکیں گے۔ اس کے برعکس جب ایک ماہر تیراک آپ کا راہبر بن کر آپ کا ہاتھ پکڑ کر پانی میں اتارے گا تو پہلے ہی سبقت میں پانی آپ کا وزن سہارنے لگے گا۔

آپ نے اکثر صاحبِ حال کی ٹرم سنی ہوگی لیکن مصروفیات کی وجہ سے اس پر کبھی غور نہیں کیا ہوگا۔ دراصل یہ

تعلیم رہ جاتی ہے۔ سودہ بڑے شوق سے آپ اسلامی ٹریننا لوجی میں ڈھال لیں۔

پھر جائز طور پر یہ بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ آپ باہر سے آنے والی تعلیم کے ان تخیلوں کا کیا تو ذکر کریں گے جو ہم آٹھ بجے والی ڈاک سے آ جاتی ہے اور رات کوئی دی پر گھر گھر بکھر جاتی ہے۔ اس میں حق اور باطل کی نشاندہی کرنے والے کو نئے شہرہ آفاق ذہن آپ کے پاس موجود ہیں جو صحیح انتقاد کی صلاحیت رکھتے ہیں اور منطقی اور عملی طور پر بغیر اسلامی تعلیم کا بطلان کر سکتے ہیں۔

اور پھر اگر آپ اس بات کا تجزیہ کر ہی لیں گے کہ ایک سرکاری حکم نامہ کے ذریعے تمام درس گاہوں اور دہلی گاہوں کو اسلامی رنگ میں رنگنے پر مجبور کر دیں گے تو ان شرارتی یا سادہ لوح گروہوں کا کیا سبب باب کریں گے جو یہاں کے مولے مار کر خرید کر ہر کتاب میں بیگل، بیٹے، فرایڈ اور مارکس کے نام پر پھرنے لگیں گے اور انارکھوسٹی کی تصویریں بلڈ سے کاٹ کر ہر آتے جاتے کو یہ بتانے لگیں گے کہ بھی کیا کریں، اسلامی سرکار کا یہی حکم ہے۔ ان میں گومفندوں کی تعداد زیادہ ہوگی لیکن کچھ معصوم لوگ بھی اس عمل میں شامل ہو جائیں گے اور آخر میں یہ کہ اپنی درس گاہوں میں ہم وہ استاد کہیں سے فراہم کریں گے جو اخلاقیات کا درس دیتے وقت صرف اپنی شخصیت کے سحر اور اپنے اخلاق و عمل کی تاثیر سے اسلامی تعلیم کو اپنے طالب علموں کی روح میں اتار دیں گے۔

لیکن ان ساری باتوں سے میرا مقصد خدا نخواستہ آپ کو بد دل کرنا یا پوس کرنا نہیں ہے۔ میں نے تو ان چھ مشکلات کا ذکر کیا ہے جو ابھی ہمارے قومی، اخلاقی اور قومی شعور کے بڑے گیٹ کو بند کیے کھڑی ہیں۔ اس کے آگے ابھی چھوٹے چھوٹے اور بھی کئی ابواب ہیں جن کو اور بھی بھاری پتھروں نے بند کر رکھا ہے۔ لیکن جہاں ارادہ نیک ہو اور نیت صاف ہو، وہاں بڑی سے بڑی مشکل بھی خود ہی راستہ دے دیتی ہے اور کوئی بھی ناکہ بند نہیں رہتا۔

لازم ہے کہ ہر حکومت، سیاست، دھنڈا، خوف، شہادت اور تحسین و تجوید سے بے نیاز ہو کر ایسا قدم اٹھائے اور پہلی مرتبہ ذہنوں کے ساتھ ساتھ روح و قلب کی آبیاری کا سامان بہم بھی کرے۔ اب زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے اور چھریوں اور کھانڈیوں سے آنے والے انقلاب زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے۔ اصل انقلاب تعقل، تدبیر اور تفکر سے آنے ہیں اور میرا ایمان ہے کہ تعقل اور تفکر کا ہیڈ کوارٹر قلب ہے، ذہن نہیں۔

وقتی کامیابی سے خوش نہ ہوں

روح کے ایک نئے تصور اور اس کی نئی تخلیق کے بغیر اور ایک نئے روحانی رویے کے بغیر ہم صدیوں تک ٹاک ٹوئیاں مارتے رہیں گے اور کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ اگر کچھ تعمیر ہی کرنا ہے تو پھر ایسی تعمیر کا ڈول کیوں نہ ڈالا جائے جو رہنے والی ہو، جو سالم ہو، مضبوط ہو۔

اپنی بنیادیں مضبوط اٹھائیں اور پھر جتنی چاہیں اس پر مندریں تعمیر کرتے جائیں۔ دنیا میں کوئی سوسائٹی، کوئی ادارہ، کوئی تہذیب روحانی قدروں کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ روحانی قدروں سے آپ اخلاقی قدریں مراد لے سکتے ہیں۔

وقتی کامیابی سے خوش نہ ہو جایا کریں۔ میں زور دے کر یہ بات پھر کہوں گا کہ وقتی کامیابی سے خوش نہ ہو جانا ایک قیمتی کمزور بنیادوں پر جتنی اونچی اور بوجھل عمارت آپ بنائیں گے، اسی قدر تیزی سے اور خوفناک انداز سے وہ گر کر

زندگی ہمیشہ اندر سے باہر کی طرف بڑھتی چاہیے۔ باہر سے اندر کی طرف نہیں۔ انسان اپنے ماحول کو زیادہ متاثر کرتا ہے، ماحول اس قدر نہیں۔ جس قدر ایک انسان اپنے ساتھیوں، ہم وطنوں اور پڑوسیوں سے محبت کرے گا، اسی قدر ان کے سیاسی اور معاشی ادارے انسانوں کے ساتھ یگانگت کریں گے اور اپنے جذبات کا اظہار کریں گے۔ اسی طریق پر ان کی دنیا اندر کی دنیا سے امتزاج رکھے گی۔

دیکھو اس وقت سیاست جس محنت اور کوشش سے انسان کو انسان سے جدا کر رہی ہے۔ جماعت کو جماعت سے الگ کر کے ایک دوسرے کا دشمن بنا رہی ہے۔ اسی قدر روحانیت کا احساس انسان کو انسان کے قریب لاتا ہے۔ اگر ہم اپنی روحانی زندگی، روحانی رویے اور روحانی خزانے پر اتنا ہی وقت اتنی توجہ اور اتنا سرمایہ لگائیں جتنا ہم سیاست پر لگاتے ہیں تو ہماری ساری مشکلات گھل کر بلکہ پکھل کر موم ہو جائیں۔ یہ اتنی بڑی، پہاڑ جتنی حقیقت ہے جس سے ہم سارے منہ موڑ کر اپنے ہیں اور اپنا نقصان کر رہے ہیں۔

جب تک کسی مملکت کو خیر سگالی، دانشمندی، روحانی دلیری اور انصاف کے ساتھ نہیں چلایا جائے گا، یہ کسی صورت میں چل ہی نہیں سکے گی۔ اس میں کاغذوں اور رجسٹریوں اور فرمانوں کے منظرے تو ہوں گے جنہیں قانون اور ضابطے کا نام دیا جاتا ہے لیکن صحیح حکومت نہیں ہوگی۔

لوگ عام طور پر بڑے سادہ لوح ہوتے ہیں۔ میں جو کہ سیاست کو بری طرح سے ریگدتا ہوں، اس کو ذلیل و خوار کرتا ہوں، نام دھرتا ہوں۔ یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ بد بخت ہماری ایک چوری بھی ہے، آخر حکمرانی کا کوئی تو طریقہ ہوگا۔ کسی نہ کسی کو تو ہم پر حکمران ہونا پڑے گا۔ کوئی نہ کوئی اصول تو وضع کرنا ہی پڑے گا۔

مذہب وجود کی اخلاقی ضرورت

میں ایک مذہبی آدمی ہوں۔ وہ اس لیے کہ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ مذہب میرے وجود کی ایک اخلاقی ضرورت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو دورے میں ملنے والی شے ہے۔ آموزش ہے، مزاج کی بات ہے۔ میں نے خود کئی مرتبہ آپ کو یہ سب کچھ کہہ کر تسلی دی ہے لیکن اس سے معاملہ سلجھا نہیں بلکہ اور الجھ گیا ہے۔ یہ مسئلہ کابل نہیں بنتا!

انسانیت بھی کوئی مجھ سے کم مذہبی نہیں ہے۔ جب میں ارد گرد دیکھتا ہوں تو کچھ زیادہ ہی نظر آتی ہے۔ مذہب ہماری تہذیبیں برداشت کرتا رہا ہے۔ ہر قسم کے انقلابات سے گزرتا رہا ہے۔ کلچر کی ساری کردوئوں سے زندہ سلامت نکل گیا ہے۔ مذہب پر بڑے بڑے وار ہوئے، بڑے کھانڈے چلے۔ کئی مرتبہ یہ درخت کٹا لیکن ہر مرتبہ اس کی شاخیں اور پتے اور کوئلیں پہلے کے مقابلے میں زیادہ نکلیں۔ یہ درخت سوکھا تو اس کی نشوونما کی یاد جو بات ہیں۔ یہ اس قدر تسلسل کے

ساتھ کیوں چلا جا رہا ہے۔

بزرگ کہتے ہیں کہ مذہب انسان کو خدا سے جوڑتا ہے۔ اس وجہ سے یہ قائم و دائم ہے کہ خدا کی ذات بھی قائم و دائم ہے اور پھر مذہب کوئی اندر کی چیز نہیں بالکل داخلی شے نہیں، تمام تر روحانی نہیں۔ یہ باہر کی شے بھی ہے، مسموم بھی ہو سکتا ہے۔ اپنے رسوم و رواج اور اپنے بیرونی مظاہر بھی رکھتا ہے۔

مذہب بڑی کامیابی کے ساتھ لوگوں پر حکمرانی بھی کرتا ہے۔ اس لیے ابتدا میں اسے حکومتی انداز میں بھی استعمال کیا گیا۔ اس سے حکومتوں کے کام بھی لیے گئے بلکہ کچھ تو کہتے ہیں کہ اسے ایجاد ہی اس غرض سے کیا گیا۔ مذہب سیاست نے خوب خوب استعمال کیا۔ تمام سیاستوں میں پاکیزہ فراڈ کی نشاندہی ملتی ہے۔ لوگوں نے اسے دھوکے بازی کا ذریعہ بھی بنایا۔

لیکن اس سے کیا ثابت ہوا؟ کیا نتیجہ نکلا؟

عورت اور اسلام

صفا مردہ کے درمیان سہمی کرتے ہوئے بڑے بڑے مرد، بادشاہ، سیاستدان، تاجر، عالم، فلسفی، بوڑھے، نوجوان بھاگتے ہیں اور اس عورت کی نقل میں بھاگتے ہیں جو پانی کی تلاش میں بھاگی تھی۔ ابد تک کے لیے رسم قائم کر دی گئی ہے۔ مرد منہ اٹھا کر خانہ کعبہ کی طرف دیکھتے ہیں اور بھاگتے ہیں۔ عورتیں چپ چاپ چلتی ہیں۔ انہیں بھاگنے کا حکم نہیں ہے۔ بی باجرہ کا مرتبہ بلند کرنے اور ان کے حوالے سے ساری عورتوں کا درجہ بلند کرنے کے لیے یہ رسم قائم کر دی گئی ہے۔

کابلی

ایک شخص کے خط کے جواب میں تہجد کے وقت میری آنکھ تو کھل جاتی ہے لیکن کابلی کی وجہ سے اٹھ نہیں سکتا۔ البتہ اذکار و اشغال جو آپ نے بتائے ہیں، ان کو بلا ناغہ کرتا ہوں۔ ان صاحب کو جواب میں لکھا کہ دفع کابلی کے لیے تو جس دم کریں اور اثر ذکر کے لیے کثرت ذکر جہر ضرب کے ساتھ کریں۔

جمہوریت اور منصور حلاج

اس نے کہا جمہوریت میں لوگ کچھ نہیں کہتے، معاف کر دیتے ہیں۔ پرانا زمانہ اچھا تھا لوگ پھانسی دے دیتے تھے۔ میرا بھی دل یہی چاہتا ہے لیکن مجھے معلوم ہے اس دور میں جمہوریت ہے، دین نہیں، جتنی نہیں۔ منصور کا قصہ سنو۔

سیدھا راستہ

دکھا ہم کو سیدھا راستہ، راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے اپنا کرم کیا نہ ان لوگوں کا.....

رہبانیت فی الاسلام

اگلے زمانے میں سادھو اور صوفی لوگ گیان دھیان کے لیے مخلوق سے بیگانہ ہو کر غاروں اور گھاؤں میں جا

صراط مستقیم کے لوگ سیدھی راہ پر چلتے ہوئے کاش میں ان کے نقوش پا پر چل سکتا۔ حضرت بلالؓ چلے جا رہے تھے۔ ان کی آرزو ہے، میں ان کا غلام ہوتا۔ ان کا بکس اور نوکری اور جوتے میرے ہاتھ میں ہوتے اور میں اس راہ پر چلتا۔ ان کے پودے چلے جا رہے ہیں۔ میں ان کے گھر کا مالی ہوتا۔ اندر سے مجھے حکم ملتا اور میں سودا سلف وغیرہ خرید کر لایا کرتا۔ میں آتا، جھڑکیاں کھاتا، چاہے ان کے دوسرے رشتہ دار مجھ پر سختی کرتے لیکن مجھے اس تعلق سے خوشی ہوتی کہ میں ان کا خادم ہوں۔ وہ حضورؐ سے مل کر آتے، میں ان کو دیکھ لیا کرتا۔ اتنی ہی میری حیثیت ہوتی۔

حق کا بوجھ

مسلمان نہ مانے اس کے وجود اور اس کی سانچگی پر اس کے دین اور اس کے علاقے کا بوجھ ہوتا ہے۔ اسی بوجھ کی وجہ سے وہ گناہ کرنے کے لیے اور بد معاشی اختیار کرنے کے لیے باہر کا رخ کرتا ہے اور باہر جا کر خوب کھل کھلتا ہے۔ اپنے گھر میں نہیں کھیل سکتا۔ اس لیے نہیں کہ وہاں قانون اور رائے عامہ کا شکنجہ سخت ہوتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ جس طرح کوئی نہیں، معبد میں، کلب میں عبادت کدے میں جا کر کھل نہیں کھیل سکتا۔ اسی طرح مسلمان کے لیے اپنے گھر میں کھل کھیلنا مشکل ہے۔ جس طرح کلب میں، ساحل سمندر پر، ہوٹل کے اکیلے کمرے میں بس ایک ہی خیال آتا ہے اسی طرح اسلام کی ملکوں اور ریاستوں میں بس ایک ہی خیال ذہن میں گھومتا ہے اور ایک ہی عمل رونما ہوتا ہے۔ عیشیں۔

سائنس اور سائنس

سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے مخالف ہونے کے بجائے اصل میں ایک دوسرے کا ضمیر اور مستند ہیں۔ دوسرے کے بغیر خام ہے اور دوسرا پہلے کے بغیر ناتمام ہے۔ مذہب اس وقت تک درست نہیں جب تک علم اس کی ترقی نہ کرے۔ علم اس وقت تک صحیح نہیں جب تک مذہب اس کی تصدیق نہ کرے۔ سائنس ذات باری کی نسبت اس کے کا بطلان ضرور کرے گی کیونکہ سائنس کا کام یہ ہے کہ وہ تمام واقعات عالم پر غور کر کے اس کے اسباب ظاہری کے لیے ان کو مرتب کرے۔ ان کی جماعت بندی کرے اور یہ دکھائے کہ کوئی واقعہ ہے۔ قاعدہ اور بے اصول نہیں ہے بلکہ کام کسی نہ کسی قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ بظاہر سائنس کی ترقی ظہور قدرت خداوندی کے منافی نظر آتی ہے مگر حقائق والوں کے عقیدے کے مطابق وہی ترقی مظہر شان کبریائی بن جاتی ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ فضا کے محیط میں سائنس اس طرح گردش کرتے ہیں۔ سائنس کہتی ہے سطح زمین پر مختلف قسم کے نباتات اور حیوانات یوں پیدا ہو گئے۔

بچہ سمجھ نہ ہو سکے تو اس گھر کو آگ لگا کر بھسم کر دو اور آنے والے کے لیے کھلا اور صاف قطعہ زمین پیدا کر لو تا کہ وہ وہاں ٹھہر سکے۔ رہ سکے، خیمہ لگا سکے۔

آدم اور حوا

جان من! میرے پیارے آدم اس وقت کیا ہوگا جب سورج ماند پڑ جائے گا اور اس کی روشنی ختم ہو جائے گی! میں نے دیکھا ہے یہ کبھی کبھی بالکل مدھم ہو کر پیلا پڑ جاتا ہے۔ اللہ ہم اس وقت کیا کریں گے! اگر یہ اپنی روزمرہ خدمت سرانجام نہ دے سکا، نہ اس نے روشنی دی نہ گرمی عطا کی، اس وقت کیا ہوگا۔ دیکھ لینا ایک دن اس نے تھک کر رہ جانا ہے اور ہمارے سامنے بچھ جانا ہے۔ ہائے جان! اس وقت کا اندازہ کرو جب سورج فوت ہو گیا اور ہم زندہ رہ گئے۔ اور یہ ننھے ننھے بے نشان سے ٹٹمٹاتے ستارے اور پیلا پیلا چاندان سے تو مرحوم سورج کی ذمہ داریاں نہیں سنبھال سکتی۔

انہوں نے تو اس کے ساتھ ہی ختم ہو جانا ہے، پھر ہم اندھی اندھیری راتوں میں کیسے زندہ رہیں گے، کیسے وقت گزاریں گے؟ حضرت آدم: بیوی جان! تم اس کے گرنے، مرنے، بجھنے کی فکری نہ کرو۔ مجھ پر اعتماد کرو اور یقین رکھو کہ میں اس کی جگہ ایک اور چمکتا دھندلا سورج لے آؤں گا۔

عقابوں کے پر ادھار مانگ کر ایک شعلہ جوالا کی طرح اونچے آسمانوں میں اڑا اڑا بھردوں گا اور پرانے سورج کی جگہ ایک نیا سورج فٹ کر دوں گا۔ تم فکری نہ کرو، گھبراؤ مت اور بالکل چمکتا نہ کرو۔ اوپر ہی اوپر آسمانوں کی دستوں میں تیز تیز روشنی کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے ستارے بھی ٹانگ دوں گا اور ان کی روشنی بھی بڑھا دوں گا۔

حوا: ہائے جان! تم کتنے پیارے کیسے ذہین اور کس قدر باہمت ہو، بہشت کی ہر شے سے اعلیٰ اور جنت کی ہر شے سے ارفع لیکن میں بھی کیسی بے وقوف ہوں اور کس چمکتا میں گھری رہتی ہوں۔ بھلا وہ جس نے تم کو بنایا ہے اور سورج اور چاند نہیں بنا سکتا۔

وہ جس کی صبحوں پر اور شاموں پر حکمرانی ہے اور جو وقت پر اور سہ سے کا راجہ ہے، پرانے ستاروں کی جگہ نئے ستارے ایسے بکھیر دے گا جیسے میں یہ دانے بکھیر رہی ہوں۔

آدم: (قدرے غصے میں) نہیں نہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ تم یہ کام مجھ پر چھوڑ دو، پھر خواجہ فسنول باتیں کیوں کیے جا رہی ہوں۔

بٹھتے تھے اور تارک الدنیا ہو جاتے تھے۔ اب سائنس نے آج کے تارک الدنیا کے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دی ہیں اس وقت ایجادات اور آسانشات کی وجہ سے ساری خدائی ہی تارک الدنیا ہو گئی ہے۔ ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں، ٹیکسٹائل محافطوں اور دربانوں میں گھرے دفتروں میں، اپنے اپنے ٹیلی ویژنوں کے سامنے ہم جمعی طور پر تارک الدنیا ہو گئے ہیں۔ یہ سائنس کے کمالات میں سے سب سے بڑا کمال ہے۔

موتو قبل انتموتو

جب بھی تم پر کوئی موڈ طاری ہو، غم کا موڈ، غصے کا موڈ، نفرت کا، شہوت کا، خوشی کا، جولوئی کا حتیٰ کہ نماز میں بھی کوئی موڈ طاری ہو تو ہمیشہ یاد رکھ کر یہ بھی گزر جائے گا۔ اپنے آپ کو سمجھا لو کہ یہ بھی گزر جائے گا۔ بس اس کو ایک عادت لو کہ یہ بھی جائے گا اور یہ بھی گزر جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ موڈ گزر جاتا ہے، چلا جاتا ہے اور تم صاف ستھرے رہ جاتے ہو، دھوئے دھائے۔ آہستہ آہستہ تم میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنے آپ کو موڈ سے دور کر لو۔ پھر تم میں اور موڈ میں فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے، دوئی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر تم ایک تماشا بن جاتے ہو اور موڈ کو ایک شاہد کے طور پر ایک گواہ، ایک بھی گواہ کے طور پر دیکھنے لگتے جاتے ہو۔

پھر تم پر خاموشی اترتی ہے۔ وہ خاموشی نہیں جو تم زبردستی اپنے آپ طاری کرتے ہو یا زور لگا کر چپ اعتبار کرتے ہو۔ یہ خاموشی اور طرح کی ہوتی ہے جو غیر معلوم سے آتی ہے۔ کسی نامعلوم مقام سے، عرش سے عرش عظیم سے ایک تھنہ بن کر۔

ایک بات یاد رکھو کہ جس قدر فاصلہ ہوگا اسی قدر آسانی ہوگی۔ اسی قدر آگاہی ہوگی۔ تم بحال ہوتے جاؤ گے۔ فرار پکڑتے جاؤ گے۔ مہا تماشہ بنتے جاؤ گے، بڑے نیچے بیٹھا ہوا بدھا۔

لیکن یہ گیان موت سے پہلے حاصل نہیں ہوگا۔ جب تک اپنے آپ کو مار نہیں لو گے، مرنے سے پہلے مار لکھا لو گے، یہ کیفیت نمل سکے گی۔ پرانے کو مارنا پڑے گا اور نئے کو جنم دینا ہوگا۔ اپنے پرانے فلسفے، پرانے اعتقاد، پرانے دھرم پرانے ایغو، پرانی اناسب کو ختم کرنا پڑے گا۔ چتا میں ڈال کر سواہ کرنا پڑے گا۔ اسی لیے بڑے بڑے آسمانوں اور درگاہوں پر ”جج“ لگا ہوتا ہے۔ آگ سلگ رہی ہوتی ہے۔ ایک چھوٹی سی چتا ہر وقت جھڑکتی رہتی ہے تاکہ آنے والا اس میں اپنے پرانے اعتقاد پرانا یقینا پرانا وجود، پرانی شہرت پرانا نام پھینک کر بھسم کر ڈالے اور پھر اسی نقیض سے ایک نیا جنم لے۔ ایک نیا نقیض پیدا کرے۔

یہ نیا جنم لینے والا وجود ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ آنے کو تیار ہوتا ہے۔ تڑپ رہا ہوتا ہے۔ کلپ رہا ہوتا ہے لیکن پرانے وجود میں اس کے آنے کی کوئی جگہ ہی نہیں ہوتی۔ سارا ٹھوس ٹھوس بھرا ہوتا ہے۔ مہمان تو دروازے پر ہوتا ہے لیکن میزبان سب کچھ بند کر کے اور کنڈیاں چٹختیاں چڑھا کر اندر بیٹھ رہتا ہے۔

اپنے آپ کو کشادہ کرو، اپنے آپ میں جگہ پیدا کرو، دروازے کھول دو، پھانک دو، زنجیریں توڑ دو اور اگر

اب سے پہلے آپ کو وہ ٹوٹی بند کرنا پڑے گی جو فرش پر پانی بہا رہی ہے۔ اسی طرح اپنے نت نئے جھگڑے کی ٹوٹی آپ خود ہیں۔“

”ایسی باتوں کو سمجھنے کے لیے کہاں سے روشنی حاصل کی جائے؟“

”یہ روشنی آپ کو بالکل سامنے ملے گی اور مقناقت ملے گی۔ اگر راستے میں یہ روشنی ماند پڑ جائے تو اپنا سفر ترک کرنا اگلے موڑ پر یہی روشنی پھر شروع ہو جاتی ہے وہاں بڑا زبردست بلب لگا ہے۔“

روحانیت

خودشفائی Self healing

لس۔ یاد

پرائی یاد ذہن میں نہیں ہوتی، وجہ یاد یادداشت میں ہوتی ہے۔ ڈال کا کنو لکھتا ہے میں ایک مرتبہ پھر اپنے پرانے گاؤں آیا جہاں میں سکول میں پڑھا کرتا تھا اور جدھر سے جاتے ہوئے ایک تنگ گلی میں پتھر کی کھر دری دیوار کے ساتھ ہاتھ گھساتا ہوا اس گلی سے نکلا کرتا تھا۔

اب کی بار میں نے پچیس تیس سال بعد اس دیوار پر اسی طرح سے ہاتھ پھیرا تو مجھے کچھ بھی محسوس نہ ہوا۔ واپس پلٹ کر میں نے کافی سارا جھک کر (جتنا میرا اس زمانے میں قد تھا) پھر اس دیوار پر ہاتھ پھیرا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جس طرح سوئی گراموفون ریکارڈ پر گزرتا ہے ہی گانا گانے لگتی ہے۔ مجھے پتھر کی دیوار سے اس زمانے کی بوسا آنے لگی۔ میری نیلی ٹوپی کتابوں سے بھرا چمڑے کا جزدان کا کندھے پر بوجھ۔ میرے سارے دوستوں کے نام ایک ایک کر کے۔ سارے استادوں کے چہرے۔ میرے دادا کی گرجدار آواز۔ اس کی ڈاڑھی سے سگار کی خوشبو۔ میری بہن کے جوڑے سے مولسری کے پھولوں کی خوشبو میری ماں کے لباس سے لہسن پیاز اور باسی فیل روٹیوں کی خوشبو۔

کا کنو کہتا ہے یاد کہاں سے آئی۔ کیا میرے دماغ میں تھی۔ کیا اعصاب میں تھی۔ یادداشتوں کی تھیلی میں تھی؟ میں کہتا ہوں نہیں نہیں..... وہ اس دیوار کے اندر تھی۔

آپ نے کئی بار لوگوں کو بزبرگوں کی قبروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ اس سے ہم پڑھے لکھے لوگوں کو بڑی چیز ہوتی ہے۔ ہم اس بیہودہ حرکت پر نفیر بھی کرتے ہیں بہت سے لوگ اس کو شرک سمجھتے ہیں۔ کچھ قبر پرستی کے طعنے دیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے کرتے سے ان کی خوشبو آتی تھی۔ وہ خالی خوشبو ہی نہیں ہوگی ان کی آواز اور ان کے لہجہ کا زیر و بم بھی ہوگا۔

خواہشات کم ہوں تو انسان میں کشف کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مادی دنیا سے بندھن انسان کو ظالم اور سخت گیر بنا دیتا ہے۔ عراق پر حملہ فاک لینڈ پر چھپ کر حملہ افغانستان پر امریکہ کی میزائل باری ان ممالک کی یادداشت کو کم کر دیتی ہے۔ خواہشات کچھ یاد کر نے نہیں دیتیں۔

میری پرانی کرسی پچیس برس پرانی اب بھی میرے ساتھ ہے۔ اس پر میں نے کالج کے زمانے میں پڑھائی کی۔ نوکری کے زمانے میں نوٹس لکھے۔ اس پر بیٹھ کر گیارہ کتابیں تحریر کیں۔ اس کی گلدی نور مجہ مرمت کی۔ چوبیس بیس

خودشفائی کے کام کو کل پر نہ ملتا۔ یہ آج ہی شروع کرو۔ بھوکے ہوتے ہو تو کھانے کی میز پر لپکتے ہو۔ اب روحانی بھوک لگی ہے تو کچن میں چلو وہاں سب کچھ موجود ہے اور تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ اگر یہ خوف ہو کہ وہاں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں ہوگا تو بھی وہاں پہنچو اور دیکھو۔ خوفزدہ ہی پہنچو۔ لرزاں اور ترساں ہی پہنچو۔ وہاں تم کو ایک نیا تجربہ ایک نیا احساس ہوگا اور یہ احساس ہی اس حقیقت کو صادر کرے گا کہ تمہارا وہاں انتظار تھا۔

اچھے دنوں کی امید

اچھے دن آنے لگے اور ضرور آئیں گے بشرطیکہ تم ان کے آنے کی امید چھوڑ دو۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ تمہاری بے چینی اور خردماں نصیبی کی وجہ امید ہے۔ وہ تمہیں بار بار تڑپاتی ہے۔ بار بار زلزلاتی ہے اور ہر وقت غم میں مبتلا رکھتی ہے۔

اصل میں امید تم میں دوئی (Self deception) کا خیال باطل پیدا کرتی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ ایک تو وجود ہے اور ایک کوئی اور دوسری چیز ہے جو اس وجود سے نکل کر اس سارے Self کو بچالے گی۔ بس یہی ایک دھوکا ہے کیونکہ زندگی ایک سے بنی ہوئی نہیں۔ مگر امید اس کو بنی ہوئی بنا کر پیش کرتی ہے..... تم ایسے کرو کہ امید کا خیال چھوڑ دو۔ جلد ہی تم محسوس کرنے لگو گے کہ باہر سے کسی شے کے آکر بچانے اور سہانٹا کرنے کی کوئی تک ہی نہیں۔ تمہارا ایکٹائی کا شعور ہی تمہاری نجات ہے۔

جھگڑے کا حل

”ہر شام اور ہر رات کوئی نہ کوئی نیا جھگڑا آ موجود ہوتا ہے اور ہماری پریشانیوں میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اس جھگڑے سے اور روز روز کے مسئلے سے کس طرح جان چھڑائی جائے؟“

”معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی ذات کا کوئی حل ڈھونڈنے کے بجائے جھگڑے کا حل تلاش کر رہے ہیں۔ مسئلے کے باہر جھگڑا پونچھ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا گند تو اندر پڑا ہوا ہے۔ کچن کے فرش پر آپ کتنی ہی ٹاکی ماریں وہیں سوکھے گا

مرتبہ ٹھکرائیں۔ یہ مجھے بہت عزیز ہے۔ میں اس پر بیٹھتا ہوں۔ اس کے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتا ہوں تو میرے سامنے کئی راستے روشن ہوتے ہیں..... اس پر ہاتھ پھیرنا کوئی شرک نہیں۔ کوئی ضعیف الاعتقادی کا مظہر نہیں..... کوئی رچول نہیں۔ یہ تعلق کی بات ہے۔ جیسے ایک شہر اور اپنے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ ایک راستہ اپنی کرسی کے بازوؤں کو سہلاتا ہے۔ ایک دعا مانگنے والا کسی مقدس اور متبرک شے کو چھوتا ہے۔

مجھے پتہ نہیں میں اسے کیوں ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہوں۔ کوئی ایسی رکھنے والی چیز بھی نہیں۔ دکھانے والی بھی نہیں۔ بتانے والی بھی نہیں لیکن یہ میرا ساتھ نہیں چھوڑتی میں تو اس کو چھوڑنا چاہتا ہوں لیکن یہ مجھے نہیں چھوڑتی۔

صبر و سکون

کسان مل جوتا ہے۔ کھاد ملاتا ہے مٹی نرم کرتا ہے بیج ڈالتا ہے پانی دیتا ہے اور پھر پودے کے انتظار میں کھڑا ہو جاتا ہے..... پھولوں کو پودوں سے زبردستی کھینچ کر نہیں نکالا جاسکتا۔ اس کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ خاموشی کے ساتھ اور جرأت کے ساتھ..... اور محبت کے ساتھ!!

اللہ کی محبت کا بیج بھی ایسے ہی بویا جاتا ہے اور پھر اسی طرح روحانی مراد کا بھی انتظار کیا جاتا ہے۔ خاموشی سے محبت سے جرأت سے! جو کوئی بھی اس میں بے چینی کا اور بے صبری کا مظاہرہ کرتا ہے وہ مراد حاصل نہیں کرتا۔ بے صبری بار آوری کے لیے مناسب کھاد نہیں ہے۔

ابدی پھولوں کے حصول کے لیے ابدی انتظار کی ضرورت ہے اور جو ابدی انتظار کا تہیہ کر لیتا ہے اس کے لیے فٹ سے بھی دروازہ کھل جایا کرتا ہے۔ ہمارے اندر اندر کی طاقت موجود ہے اور کافی مقدار میں موجود ہے لیکن ہم بے صبری کے ساتھ اس کو گنوا دیتے ہیں۔

گدلے جو ہڑ کے اندر اپنے پھکڑوں کو تیزی سے ہانکتے ہوئے گزارتا اور بھی گدلا ہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ آرام سے چلو گے تو سب گار بیٹھ جائے گی..... ہم پر لازم ہے کہ ہم محض شاہد بنیں۔ دیکھنے والے بنیں۔ ذہن خود بخود پاکیزہ ہو جائے گا۔ ہمیں ذہن کو پاکیزہ بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ ساری گڑباز ذہن کو پاکیزہ بنانے سے پیدا ہوتی ہے۔ آرام سے کنارے پر بیٹھ کر نظارہ کریں اور پھر دیکھیں کیا نظارہ ابھرتا ہے۔

آزادی

انسان تو ایک جنگلی گھوڑا ہے۔ تند فو تیز رفتار اور منزل مار۔ اس کو آزادی پسند ہے اور وہ سراٹھا کر دونوں پاؤں اٹھا کر ہنہا کر اپنی آزادی کا اعلان کرتا رہتا ہے آزادی سے محبت کرتا ہے۔

انسان بھی ایسا ہی ہے آزاد..... خود مختار لیکن آدمی گرفتار بھی ہو جاتا ہے۔ پکڑا بھی جاتا ہے۔ محبت میں، سختی میں، کوڑے کے نیچے تازیانے میں، ٹھٹھے

لغظوں سے۔

انسانی سپردگی کی متعدد وجوہات ہیں۔ خود سپردگی اپنی مرضی سے خواہگی۔ ظلم کے آگے سرگونی۔

بچپن میں مذہب کے لیے سپردگی کا درس دیا جاتا ہے۔

اس پر درس گاہوں میں سختی سے عمل کرایا ہے..... ان درس گاہوں میں استاد ایک دیوتا کے روپ میں سپردگی کا

خواہشمند ہوتا ہے۔ استاد کا ادب کرایا جاتا ہے۔

والدین کا اندھا ادب۔

اتھارٹی کا حکم منوایا جاتا ہے۔

جمہوریت میں آمریت کا سارنگ روپ ہی ہوتا ہے۔ لوگ اپنے حقوق ووٹ کے ہاتھ گروی رکھ دیتے ہیں۔

آزادی تقریر سے ہاتھ دھوتے ہیں۔ اپنی خوشیاں سیاسی لیڈروں کو عطا کرتے ہیں ان کے جلوں میں تاپتے ہیں ان کی گاڑیوں کے آگے بھٹکا ڈالتے ہیں۔

جمہوریت نواز لیڈروں کے گھر اور آمریوں کے گھر بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں۔

ان کا طرزِ نظم ایک سا ہوتا ہے۔ ان کے غیر ملکی دورے سربراہوں سے ملاقاتیں ایک سی ہوتی ہیں۔

ایک خاموش اعلان

زندگی کے ایک مقام پر پہنچ کر آپ کو عزیزوں، دوستوں اور رشتہ داروں کے سامنے ایک اعلان کرنا پڑتا ہے۔ ایک خاموش بیان دینا پڑتا ہے کہ جناب آئندہ سے میرے مزاج میں فوری اور اچانک تبدیلی سے آپ کو میرے بارے میں حیرت کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا دکھ اور ذرا سی تکلیف بھی ہوگی۔ میرے رویے پر آپ ناخوش بھی ہوں گے۔ لیکن میں آپ کو ناخوش کرنا یا آپ کو hurt کرنا نہیں چاہتا۔ میں صرف اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ اب میں ٹھیک گیا ہوں اور خود ذاتی اور self punishing سے نکل کر آزاد زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تو آپ میرے ساتھ مل سکتے ہیں اور اس تبدیلی پر ہم نہیں ہوتے تو بس اللہ مجھے بڑی خوشی ہوگی لیکن اگر یہ آپ کے لیے مشکل ہے تو پھر مجھے اجازت دیجئے کہ میں اکیلا اس سفر پر نکلوں..... زندگی کے روزمرہ معمولات میں تو ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں لیکن باطن کے سفر کے لیے میں نے ایک اور راستہ تلاش کر لیا ہے۔ مجھے پتہ نہیں یہ راستہ مجھے کہاں لے جائے گا لیکن اتنا پتہ ہے کہ یہی صحیح اور راست قدم ہے!

تشویش و اندیشہ کا علاج

زندگی میں تشویش اور پریشانی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ آپ اپنے آپ کو اس ثقافت کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیں جو دوسرا آپ سے رکھتا ہے۔ اس 'وجہ' کی بنا پر بڑے دردناک قسم کا خود (self splitting) کا

عمل شروع ہو جاتا ہے۔

آپ کے وجود کا ایک حصہ تو لوگوں کی توقعات کے مطابق رہنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے اور دوسرا سکون اور آرام سے زندگی گزارنے کی خواہش میں ڈوبا رہتا ہے۔ دوسروں کی توقعات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کہیں ”وہ دوسرا“ ہم کو چھوڑ نہ دے۔ ہم سے منہ نہ موڑ لے۔ اس لیے ہم اُس کو خوش رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ہمارا ساتھی رہے، دوست بنا رہے۔ جنسی مطابقت ختم نہ کر دے، جنسی ساتھی نہ رہے۔

اس کا آسان علاج یہ ہے کہ ”اپنے بن کر اور اپنے ہو کر رہو“۔ اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ لوگوں کی خواہش کے مطابق رہا جائے۔ غلامی سے نکل کر آزاد ہو جاؤ اپنی مرضی کرو جیسے پسند کرتے ہو ویسی زندگی بسر کرو۔ اپنے بن کر رہنے میں کوئی اندیشہ نہیں، کوئی تشویش نہیں، دوسرا نہیں مڑے ہی مڑے ہیں۔ اس قدر ترقی حالت میں رہنے سے کوئی بھی آپ کو چھوڑ کر نہیں جائے گا۔

اندھیرے کا سفر: عجیب حقیقت

جو شخص اپنی مشکلوں اور الجھنوں کے ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتے ہیں وہ اپنی ذات پر زیادہ توجہ دینے کے بجائے دوسروں کا زیادہ دھیان رکھتے ہیں۔ دوسروں کی بات زیادہ کرتے ہیں۔

خوشیوں کو کہاں تلاش کریں؟

اپنے کو حکم کرنے اور اپنی بات کرنے کا پختہ تہیہ کر لیں خوشیوں کی تلاش کا جنون ختم ہو جائے گا۔ خوشیاں قریب آ جائیں گی۔ باطن کے سفر میں کئی بار یہ پتہ نہیں چلتا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔

”مبارک ہو سلامتی ہو۔۔۔ اس سفر پر جانے کے لیے یہ معلوم ہی نہیں ہونا چاہئے کہ آپ کدھر جا رہے ہیں۔ اگر آپ نئی نئی سینئریوں اور نئے مناظروں کے بیان میں مشغول ہیں تو آپ کا سفر رکنا ہوا ہے۔۔۔ ایک راز کی بات سن لیجئے آپ کے کام آئے گی: جتنی مسافت آپ اندھیرے میں طے کریں گے اسی تیزی کے ساتھ روشنی کی طرف بڑھیں گے۔“

کیا تم آزاد ہونا چاہتے ہو جھلکے پھٹکے رہنا چاہتے ہو لیکن یہ کافی مشکل کام ہے۔ ہم کو ہماری پسند اور ناپسند بے رغبتی بنا رکھا ہے اور ہم مجبور ہوئے بیٹھے ہیں۔ ہماری زندگیوں میں طعام لباس آرائش اور تفریح۔۔۔ کے اندر چھوٹی چھوٹی ترجیحات نے ہم کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ جو شخص کھانے کے معاملے میں خصوصی ترجیحات کا حامل ہے وہ دوسرے معاملات میں بھی خصوصیات کا اسیر ہوگا۔ وہ ایک مخصوص قسم کی موسیقی کو پسند کر سکتا ہوگا۔ وہ ایک مخصوص قسم کے آرٹ سے ہی لطف اندوز ہو سکتا ہوگا۔ جب اپنی مرضی اپنی پسند اپنی خواہش کی شے کا سامنا ہوگا بے رغبتی خوش رہے گا ورنہ نوے فیصد دکھ میں اور تکلیف میں گزارے گا۔

جب چھوٹے چھوٹے معاملات میں ہمارا یہ حال ہے تو بڑے معاملات میں ہماری کیا حالت ہوتی ہوگی۔۔۔

میں اگر ہم چھوٹی چھوٹی خواہشات کی بے رغبتی قید سے نکل جائیں تو پھر بڑے معاملات خود ہی طے ہو جائیں گے اور ہم ایک سکون اور آزاد زندگی بسر کرنے پر قانع ہو جائیں گے۔

”اللا قللیا“

انسانی ذہن ایسے ان گنت سوال پوچھنے کی صلاحیت رکھتا ہے جن کے جواب نہ اس کو معلوم ہوتے ہیں نہ وہ دوسری عمر ان کے جواب دے سکتا ہے۔ اس (ذہن) کی کچھ عجیب سی ساخت ہے اور جیسا کہ یہ ہے یہ ایسی چیزوں کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے جن کو ہم اپنی حیات کے تجربے سے حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم خدا کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ ہم حق کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ایک مربوط شے ہے یا بہت سی چیزوں سے مل کر بنتی ہے۔ اگر ہم اس کی چیزوں سے مل کر بنتی ہے تو اس کی ہیئت ترکیبی کیا ہے؟ یا پھر سے جسم سے اور بدن سے الگ کوئی شے ہے! پھر ہم نباتات کے بارے میں سوال کرتے رہتے ہیں۔ پتہ نہیں چلتا کہ دنیا کی ابتدا وقت کے اندر ہوئی تھی یا یہ ابدی شے ہے۔ ہم بے بہت سے اور سوال اور بہت سے معلوماتی تقاضے اپنی جگہ دلچسپ بھی ہیں اور توجہ طلب بھی۔ ان کے پکار میں لطف بھی ہے لیکن ان کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔۔۔ کئی مرتبہ فلسفہ آگے بڑھ کر ان سوالوں کے جواب دینے کی کوشش بھی کرتا ہے لیکن (بقول کانٹ) جواب دیتے وقت بہت ہی کنفیوژ ہو جاتا ہے اور احقائد لائل دیئے لگتا ہے۔

ہمزاد

ہر شخص کے وجود میں اس کے وجود کی ایک نقل بھی ہوتی ہے جو جسمانی وجود کے مقابلے میں ہلکی روحانی اور لطیف ہوتی ہے۔ اس کو دوسرا جسم یا ڈبل بھی کہا جاتا ہے۔ اس کو ہمزاد کا نام بھی دیتے ہیں۔ یہ جسمانی وجود کے مقابلے میں زیادہ آزاد اور سربلحرکت ہوتی ہے اور جہاں چاہے آسانی کے ساتھ جاسکتی ہے۔ دعویٰ ہے کہ ہمزاد جسم کے اندر سے نکل کر باہر چلا جاتا ہے اور اس کرے میں اس گھر میں اور اس شہر میں اور ان اوقات اس ملک سے باہر نکل کر گھوم پھر کر پھر واپس آ جاتا ہے۔ جب تک ہمزاد باہر گھومتا ہے جسمانی وجود اپنی آزادی پر یا اپنی کرسی پر یا اپنے آسن پر موجود رہتا ہے۔

ہمزاد ایک روپیلی دھاگے کے ساتھ جسمانی وجود سے بندھا رہتا ہے اور یہ دھاگا جتنا چاہے اس قدر طویل ہوتا رہتا ہے۔ یہ دھاگا یا ربن یا گونا گونا ف کے نیچے بندھا ہوتا ہے اور یہی اس کے جڑنے کا مقام ہے۔ یہ ہلکے طور پر منور بھی ہوتا ہے جس کی اس کو روپیلی دھاگا کہتے ہیں۔ یہ ربن عام طور پر دو یا تین انچ چوڑا ہوتا ہے لیکن جوں جوں ہمزاد دور دورا جاتا ہے وہ ایک ہوتا جاتا ہے۔

ہمزاد خیال کی سی تیزی کے ساتھ جہاں چاہے پہنچ جاتا ہے۔ عام طور پر تیرتا ہوا پھرتا ہوا انفعی انداز میں سفر کرتا ہے۔ اس ربن کے ٹوٹنے کا کبھی بھی خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ صرف موت کے وقت ٹوٹتا ہے۔

یہ ”ڈبل“ جسمانی وجود کے اندر سے یوں نکلتا ہے جیسے کیلے کے چھلکے میں سے اس کی گلی نکلتی ہے یا دستانے میں سے ہاتھ نکلتا ہے۔ نکلنے سے پہلے جسم کے اندر ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ پھر سرخندی ہوا کا احساس ہوتا ہے۔ پھر سرنگ کے اندر داخل ہونے کی feeling ہوتی ہے۔

جب ہمزاد نکل جاتا ہے تو جسمانی وجود پر سکون اور بے حس ہو جاتا ہے اور اس وقت تک اسی طرح سے رہتا ہے جب تک یہ لطیف وجود واپس آ کر جسمانی وجود میں داخل نہ ہو جائے۔

پتہ نہیں یہ کس میٹرل کا بنا ہے لیکن یہ ایک برقی وجود ہے کیونکہ جسم سے جدا ہوتے وقت بجلی کا ایک جھکا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بہت سے ہمزاد ٹیلیفون کی تاروں میں داخل ہو کر بھی سفر کرتے ہیں۔

ہمزاد کو رہنما بھی ملتے ہیں۔ ابتدا میں کسی رہنما کے ذریعے ہی ہمزاد جسمانی وجود سے نکلتا ہے آگے چل کر وہ اُسے گائیڈ بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ بھی سفر کرتے ہیں۔ کچھ کا تو پتہ چل جاتا ہے کہ کون سی روحیں ہیں اور کچھ کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ہمزاد مسافر کے ساتھ یہ رہنما ہو۔۔۔۔۔ اسی طرح کچھ ”راہ روکے“ بھی ہوتے ہیں جو ہمزاد کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں اور اس کے سفر کو زحمتی بنائے رکھتے تک محدود رکھتے ہیں۔

کبھی کبھی ہمزاد اس وجہ سے بھی جسمانی وجود سے نکلتا ہے کہ زمین پر کسی کو اس کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک عورت خود کشی کر رہی تھی۔ ہمزاد نے جا کر اس کو بچایا اور اس کو تسلی دی۔ بعد میں اتفاقاً وہ عورت عام زندگی میں سلیم سے ملی تو اُس نے اس کو پہچان لیا۔ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھی ”سلیم میرا مرشد ہے۔“

آسٹریل سفر عام طور پر نیند کے اندر ہوتا ہے لیکن کئی ایک خوشگوار موڈ میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے یا لیٹے ہوئے اس ٹرانس (Trance) میں چلے جاتے ہیں اور سفر شروع کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔ اس سفر پر اچھی صحت والے بھی جاتے ہیں لیکن عام طور پر جذباتی طور پر گھبرائے ہوئے بیمار لوگ اور اچانک حادثے میں اترنے والے یہ سفر شروع کرتے ہیں۔

یہ سفر اپنی مرضی سے بھی اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی شق بہت مشکل کام ہے۔ کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں (کبھی کبھی وہ اپنے دوستوں کے گھر جا کر ان کی گھنٹی بجاتے ہیں لیکن خود نظر نہیں آتے)۔

آسٹریل پر وینکشن کا سب سے اچھا نمونہ یہ ہے کہ کمرے میں چھت کے پاس ایک پڑچھتی پر کچھ ہندو اور سوال لکھ کر ڈال دیے جاتے ہیں۔ آسٹریل مسافر انہیں ہسٹر پر لیٹے لیٹے پڑھ کر بتا دیتا ہے۔

جب کسی کا آپریشن ہو رہا ہو تو یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ آپریشن کروانے والا چھت کے پاس ہو کر سب کچھ دیکھتا رہتا ہے۔ اس کو وہ روپکلی تار بھی صاف نظر آتی ہے جو اس کے جسمانی وجود اور اس کے اپنے کوئی وجود کے ساتھ بندھی ہوتی ہے۔

جسم سے نکلنے وقت پہلو تو چند سی نظر آتی ہے پھر سب کچھ روشن براق ہو جاتا ہے۔ سلور ڈوری بھی روشن ہوتی ہے اور چمکتی ہے۔ ہمزاد اکثر ایسی آوازیں سنتے ہیں جیسے ریشم کا تھان پھاڑا جا رہا ہو۔

عام طور پر سر کی جانب سے یعنی گدی سے نکلتا ہے۔ کئی ایک کا ناف کے نیچے سے برآمد ہوتا ہے۔ چند گز لینے

یعنی افقی طور پر سفر کرنے کے بعد سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے اور عمودی سفر اختیار کر جاتا ہے۔ سفر کے دوران ہمزاد کے حواس خمسہ عام زندگی سے بہتر اور تیز ہو جاتے ہیں۔ سردیوں میں برف باری کے دوران نکلا ہوا ہمزاد اگر سفر کرتا ہو گرم علاقے میں پہنچ جائے تو اس کو گرمی کا پورا پورا احساس ہوتا اور وہ گرمی سے متعلق سارے پودے درخت پر پندے آبادی اور انسان دیکھتا ہے۔

ہمزاد اپنے انسانی وجود کو بہت آسانی سے دیکھ سکتا ہے بلکہ نکلنے کے بعد اُسے مزکر ضرور دیکھتا ہے۔ بہت حساس آدمی یا روحانی آدمی ہمزاد کو دیکھ بھی سکتے ہیں اور ان سے باتیں بھی کر لیتے ہیں لیکن ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ہمزاد ہیں۔

ہمزاد کو اپنا چہرہ آئینے میں نظر آ سکتا ہے۔ اس وجود کا وزن بھی ہوتا ہے اور یہ کشش ذہن کو بھی محسوس کرتا ہے۔ ایک آسٹریل لڑکا ایک شام گھومتا پھرتا اپنی محبوبہ کے گھر پہنچ گیا وہ بیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ یہ بھی بیڑھیوں پر جا بیٹھا اور اس کی کمر میں بازو داخل کر دیا۔ اگلے دن لڑکی نے بیوی واقف لڑکے کو سنایا اور حیرانی ظاہر کی کہ ایسے کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ ہمزاد چیزوں کو ہلا جاتا نہیں سکتا (لیکن ایک آدمی ایسا بھی ہے کہ چیزیں ہلائی گئیں)

ہمزاد سوچ بھی سکتا ہے اور دوسروں کی سوچ اس تک پہنچ بھی سکتی ہے۔ وہ آزاد ہوتا ہے اور آزادی کے فرار سے بچتا ہے اس کی واپس اپنے جسم میں آنے کی کوئی زبردست خواہش نہیں رہتی لیکن اُس کو آنا ہی پڑتا ہے مجبوراً!

قدس سرہ

زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ زندگی ایک تحفہ ہے۔ تم اس کے حقدار نہیں تھے نہ ہی تمہارا حق تھا۔۔۔۔۔ یہ تم کو دی گئی ہے تم نے اس کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ محنت نہیں کی۔ ہمت نہیں کی۔۔۔۔۔ ایک مرتبہ جب تم پر یہ بات مکمل گئی تو تم کو بڑی آسانیاں عطا ہو جائیں گی۔

اگر زندگی ایک تحفہ ہے تو پھر اس کے ساتھ جتنی بھی چیزیں ہیں سب کی سب تحفے ہیں۔۔۔۔۔ خوشی، محبت، آئندہ مراقبہ جو کچھ بھی خوب اور خوبصورت ہے ایک تحفہ ہے۔۔۔۔۔ ذات کی طرف سے ذات باری کی طرف سے!! کوشش جتنی بھی ہے جہاں کہیں بھی ہے اس کا انا کے ساتھ تعلق ہے۔ کوشش ہمیشہ دکھ کو اور الم کو ختم دیتی ہے۔ ہر کوشش تمہارے خلاف جاتی ہے۔

ہر کوشش نے تم کو مار کر ادھ موا کر دیا ہے۔ تم سے خود کشی کروادی ہے۔

خوش رہنے یا خوش ہونے یا خوشی پر کسی کا حق نہیں ہے۔۔۔۔۔ تم خوش ہو سکتے ہو خوش رہ سکتے ہو لیکن خوشی پر اپنا حق نہیں جتا سکتے۔۔۔۔۔ امریکن دستور بھی کیا احقانہ دستور ہے جس میں رقم ہے:

you have the basic fundamental right to preserve happiness.

اگر تم سمجھو گے کہ خوش رہنا اور خوشیوں کا حصول کرنا تمہارا حق ہے تو پھر تم خالی ہوتے جاؤ گے۔

اس دنیا میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کو تم کرنے کی کوشش کرو گے تو انہیں خود ہی ناکردہ کر بیٹھو گے۔ اگر ان کو نہیں کرو گے۔ اس کے لیے کوشش نہیں کرو گے تو کرو گے۔ تمہاری کوشش ہی تم کو Reverse Effect کی طرف لے جائے گی۔ مثلاً سونے کی کوشش کرو زور لگاؤ ساری توجہ سونے پر دو نہیں سو سکو گے..... جب تم اس کی کوشش چھوڑ کر ڈھیلے پڑ جاؤ گے فوراً سو جاؤ گے۔

حق منواتے رہو گے تو سطح پر رہو گے۔ اگر ذرا نیچے اترو گے ڈھیلے چھوڑ دو گے تو حق غائب ہو جائے گا اور ڈھیلے چھوڑ دو گے تو انعام عطا ہونے لگے گا۔

بس یہ بنیادی بات یاد رکھنا کہ تم زندگی کے حق دار نہیں تھے اور تم کو زندگی مل گئی۔ بالکل حق کے بغیر۔ کسی رائے کے بغیر۔ تم زندہ ہو زندگی سے بھرپور ہو گئے ہو۔

اگر اتنی بڑی زندگی کسی حق کے بغیر مل گئی کسی دعوے کے بغیر مل گئی تو پھر خوشیاں بھی مل سکتی ہیں۔

محبت بھی مل سکتی ہے۔

آند بھی مل سکتا ہے۔

ذات بھی مل سکتی ہے۔

لیکن یہ ایک قانون کے تحت ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ کوشش نہ کرو..... خوشی پکڑی نہیں جاسکتی۔ خوشی کو پکڑا جاسکتا۔ اس کو تریف لانے کی ترغیب دی جاسکتی ہے۔

زندگی دائروں میں گھومتی ہے۔ سیدھی لائن میں حرکت نہیں کرتی۔ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ سورج ایک اور بڑے سورج کے گرد گھومتا ہے۔ سارا نظام شمس گھومتا ہے پوری گلیکسی گھوم رہی ہے۔ ساری کائنات گھوم رہی ہے۔ دائروں کے اندر گول گول موسم گردش کرتے ہیں۔ بچپن جوانی بڑھاپا گردش کرتے ہیں۔ ساری زندگی مدور ہے۔ یہ سیدھی نہیں ہوتی تیر کی طرح نہیں ہے یہ زندگی ہے تیر تو انسان کی ایجاد ہے قدرت کی نہیں۔

تیر دو نقطوں کے درمیان سفر کرتا ہے اور نہایت کم فاصلے کا تلاشی ہے۔ تیر ہمیشہ تیزی میں ہوتا ہے۔ اس کو بڑی کاہلی پڑی ہوتی ہے۔ شتابی کا مارا ہوتا ہے۔ لیکن خدا کبھی بھی شتابی میں نہیں ہوتا۔ وہ بڑے صبر کے ساتھ ہر کام کرتا ہے۔ ہمیشہ آہلے آہلے انداز میں رہتا ہے۔ اس کو کوئی سفرد پیش نہیں کسی ہم کی تلاش میں نہیں۔ اس کو کہیں جانا نہیں اس لیے ہمیشہ یہیں ہوتا ہے اور ہر وقت موجود ہوتا ہے۔

تیر کو ایک ہدف کی تلاش ہوتی ہے ایک نشانے کی تڑپ ہوتی ہے اس لیے وہ قیام نہیں کر سکتا۔ خدا پھول کی خوشبو کی طرح ارد گرد موجود رہتا ہے۔ جیسے رات کی رانی رات بھر موجود رہتی ہے اُسے کہیں جانے یا بھاگنے کی تمنا نہیں ہوتی۔

خدا ایک بچہ بنانے میں پورے نو مہینے لگا تا ہے۔ اس کے یہاں efficiency ایکسپرٹوں کی ٹیم نہیں ہوتی۔ لاکھوں کروڑوں اربوں برسوں سے خداوند تعالیٰ بچہ بنانے کے لیے نو مہینے کی مدت ہی پسند فرماتا ہے۔ خدا نے اس ساری

دت میں کوئی ترقی نہیں کی۔ اگر کی ہوتی تو اس نے ایسے کل پرزے ضرور وضع کیے ہوتے جن کی مدد سے ایک بچہ نو مہینے کے بجائے نو مہینے میں بن جایا کرتا۔ اس کے یہاں اسمبلی لائن لگی ہوتی اور "ماس پروڈکشن" کا سلسلہ جاری ہوتا۔

لیکن خدا کریم ہے رحیم ہے۔ مہربان ہے وہ ایک بچہ پیدا کرنے میں بڑی محبت 'محنت' اور توجہ سے کام لیتا ہے۔ ایک پرندہ ایک گھونگا اک تیلی پیدا کرنے پر توجہ دیتا ہے حتیٰ کہ گھاس کا ایک ڈھنسل بنانے میں بھی توجہ اور محبت سے کام لیتا ہے۔

اگر تم خدا کے ساتھ رہنا چاہتے ہو یا اس کے حکم کے اندر جینا چاہتے ہو تو تیزی 'شتابی' اور تیز رفتاری کو اپنی زندگی سے نکال دو ورنہ تم خدا کو Surpass کر جاؤ گے۔ وہ تو یہیں کہیں ہوگا اور تم وہاں کہیں نکل جاؤ گے۔

لیکن تم بھی کیا کر و تمہاری تربیت ہی اس طرح سے ہوئی ہے کہ جلد از جلد کام کس طرح سے بنایا جائے۔ تیزی کے ساتھ کس طرح سے کام کیے جائیں۔ تیز رفتاری کیسے اختیار کی جائے۔

کچھ لوگ خوشی کی تلاش میں رہتے ہیں اور سکون اور آند کو ڈھونڈتے رہتے ہیں لیکن ان کو یہ نعت ساری عمر نہیں ملتی۔ ایک ایسے ہی شخص نے ایک روز ایک خوشیوں کو پالیا اور وہ آند کے راستے پر نکل گیا۔ ہم نے اُس سے اس کا راز پوچھا تو وہ کہنے لگا میں نے ساتھ برس تک خوشیوں کی تلاش کی اور ساری عمر ان کی کھوج میں لگا دی۔ لیکن کل رات میں نے بیدار کر لیا کہ میں خوشی کی تلاش نہیں کروں گا نہ ہی اس کی آرزو کروں گا۔ بس زندہ رہوں گا اور زندگی کے ساتھ وابستگی اختیار کروں گا جیسے جمو متے جو بڑے زلزلے میں ہوتا ہے کہ جدر جدر زلزلہ جھومتا ہے مڑا بھی ادھر ادھر گھومتا ہے۔ اب میں خوشی کے لیے پریشان نہیں ہوں۔ اب میں صرف زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس وقت سے خوش ہوں۔

جب آپ خوشی کی تلاش چھوڑ دیتے ہیں یا خوشی کا حصول ترک کر دیتے ہیں اسی لمحے آپ خوش ہو جاتے ہیں۔ جب آپ سکون حاصل کرنا بھول جاتے ہیں اسی وقت آپ پر سکون ہو جاتے ہیں..... بات یہ ہے کہ خوشی اور سکون آپ کے پاس پاس تھے۔ بالکل قریب۔ آپ کے ارد گرد لیکن آپ اپنے زور عمل میں بہت ڈور نکل گئے۔ بہت تیزی کے ساتھ بہت ڈور!!

جب تم کسی تحقیق یا تلاش میں ہوتے ہو اس وقت تم بند ہوتے ہو۔ بالکل بند۔ تلاش اور دریافت کا الجھاؤ تم کو فیر کر دیتا ہے۔ تم پر اپنے تھے کس دیتا ہے۔ جب تم میں کسی چیز کی خواہش پیدا ہوتی ہے یا کوئی خواہش پیدا ہوتی ہے تو تم رنج کے کیزے کی طرح اس خواہش کے تاروں میں لپٹ جاتے ہو۔ بندھ جاتے ہو اور اس مضبوطی سے بندھ جاتے ہو کہ فٹکی کی کوئی کرن اس کو بے کو چیر کر اندر داخل نہیں ہو سکتی۔

خوشی پکڑنے سے نہیں آتی۔ جال پھینک کر۔ کاٹنا لگا کر۔ پسندا لگا کر پکڑی نہیں جاتی۔ یہ تو بس جوں جوں انسان ڈھیلے ہوتا جاتا ہے آتی جاتی ہے اور اندر بے راکرتی جاتی ہے..... خوشی ایسے ہی آتی ہے جیسے نیند آتی ہے۔

سکون بھی ایسے ہی آتا ہے جس طرح آنکھوں میں نیند اترتی ہے۔ خوشی کے لیے اور سکون کے لیے کچھ کرنا نہیں ہے۔ تم نے تو خوشی اور سکون حاصل کرنے کے لیے عمل کر کر کے خود کو چبا کر لیا۔ تم نے تو اتنی کوشش کر لی کہ ناخوش اور بے

سکون ہو گئے۔

اگر ناخوش رہنا ہے تو خوب عمل کرو۔ دبا کے کرو اور کرتے رہو۔ اگر خوش رہنا ہے تو چیزوں کو اور وقت کو گزرنا

دو۔

”جانے دو“ زندگی کا راز ہے۔

”جانے دو“ قریب کا راز ہے۔

”جانے دو“ سب سے بڑا راز ہے۔

لیکن تم تو جانے دیتے ہی نہیں تم اتنے مصروف اس قدر الجھے ہوئے اور ایسے غرق رہتے ہو کہ خوشی کی کوئی کرن تمہارے اندر داخل ہی نہیں ہو سکتی۔ ایسے کارندے بن کر کام میں لگے رہتے ہو کہ خوشی کا جھوٹا تمہارا ہے وجود کے اندر اتنا ہی نہیں۔ تمہارا کیا ہے گا بھائی۔

دنیا میں ہزاروں لاکھوں انسان اپنے منجھائے مقصود کو پہنچ جاتے ہیں۔

وہ کامیاب زندگی بسر کرنا چاہتے تھے اور وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔

کامیاب تو ہو جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ناخوش اور غمگین بھی ہو جاتے ہیں۔

وہ امیر ہونا چاہتے تھے..... امیر ہو جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ناخوش اور غمگین بھی۔

جتنے جتنے آپ امیر ہوتے جائیں گے اسی قدر ناخوش ہوتے جائیں گے۔

عجیب بات ہے کہ امیر بن جانے اور امارت حاصل کر سکنے کے بعد امید ختم ہو جاتی ہے..... توقع کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

انہوں نے سوچا تھا کہ امیر ہو جائیں گے تو سارے دکھ دور ہو جائیں گے اور خوشیاں محض خانہ میں اتر آئیں گی

لیکن ایسا نہیں ہوا..... وہ امید جو پانچویں تھی وہ پوری نہ ہو سکی۔ خوش ہونا چاہتے تھے اس کا دور دور تک کوئی نشان نہ ملا

ناامید ہو گئے۔

غریب آدمی ہر وقت پر امید ہوتا ہے۔

امیر آدمی امید سے بہت دور ہوتا ہے..... سخت ناامید

اگر کوئی امیر آدمی ناامیدی کا شکار نہیں ہے تو سمجھ لو

وہ ابھی تک ٹھیک سے امیر نہیں ہوا..... کیونکہ

ناامیدی امارت کی نشانی ہے..... اصل امارت ناامیدی کے اہل سے وابستہ ہے۔

جو معاشرہ امیر ہو جاتا ہے وہ ناامیدی کے سمندر میں غرق ہونے لگتا ہے۔

ناامیدی..... خوف..... اندیشے..... نہ ہو سکنے کا مال۔

خوشی پر تمہارا کوئی حق نہیں بنتا۔ خوشی تمہاری ملکیت نہیں۔ تم اس کو پکڑ نہیں سکتے۔ گھیر نہیں سکتے۔

خوشی کو تو تم بہلا بھسلا کر بلا سکتے ہو۔

خوشی تو شریلی اور نوخیز عورت کی طرح ہوتی ہے۔ ایک لمبوتی کی طرح!

تم کو اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اسے Court کرنا پڑے گا۔

اسے یقین دلانا پڑے گا۔ آہستہ آہستہ منانا پڑے گا۔

پھر یہ گھونٹ اٹھائے گی۔ پھر تم سے بات کرے گی۔

تم جاتے ہی کسی عورت سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اٹھو اور میرے ساتھ بستر میں چلو۔

یہ تو بہت ہی واضح بہت ہی شرمناک۔ بڑی ہی فحش اور بے عزت کرنے والی بات ہے۔ اس کے لیے تو ممبر کی

ضرورت ہے۔

عورت سے بات کرنے کے لیے تو شاعری چاہئے لطف چاہئے۔

تمہارے ذہن میں دُور دُور تک دُشے کا اور دُشے بھوک کا خیال تک نہیں چاہئے۔

تب جا کر یہ کہو تری تمہارے من کی چھتری پر اترے گی۔

پھر یہ تمہارے سامنے اپنے پر کھول کر لیٹے گی۔

اپنا سب کچھ ظاہر کرے گی۔

زندگی کو بھی اپنے آپ پر سے گزرنے دو۔

اس کو دُور دُور دُستی سے نہ پکڑو۔

عمل سے اور کرنے سے سب معمولی چیزیں اور بے مصرف تمہاری برات ہوں گی۔

نہ کرنے سے اور منتظر رہنے سے۔ سب خوبصورت، سب مقدس۔ سب آسمانی نعمتیں تمہارا حصہ ہوں گی

تمہارے وجود کا حصہ ہوں گی۔

”ماں کی گود“

نا معلوم سکھایا نہیں جاسکتا نا معلوم سکھا جاسکتا ہے..... بلکہ سکھا بھی کہاں کیونکہ جب تم اسے سیکھتے ہو پھر بھی یہ

معلوم ہی رہتا ہے..... یہی اس کا سب سے بڑا حسن ہے یہی اس کی خوبی ہے کہ یہ معلوم نہیں ہوتا۔

خدا کبھی بھی علم نہیں بن سکتا..... جتنا اس کو جاننے کی کوشش کرو گے اسی قدر وہ پر اسرار ہوتا جائے گا..... اور جب

اپنے مرکز میں اتر کر اُسے پا لو گے تو پھر تم نہیں رہو گے وہ ہی وہ رہ جائے گا۔ علم پھر بھی حاصل نہ ہو سکے گا کیونکہ علم تو

بانٹنے والے کے بغیر حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ جب Knower ہی نہ رہا تو پھر علم کدھر رہا۔ لیکن کمال ہے اور بڑی حیرت کی

بات ہے کہ

ایک بڑے ہی تضاد کے انداز میں راز تم پر دیا جاتا ہے۔ پر اسراریت کھول دی جاتی ہے۔ تم اسے جان

جاتے ہو پہچان جاتے ہو کیونکہ تم خود mystery بنے ہوئے ہوتے ہو۔

اگر تم خدا کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہو تو میرے پاس فضول آئے ہو۔ میرے پاس ایسا کوئی علم نہیں۔

لیکن اگر تم خدا کو جاننا چاہتے ہو تو پھر ٹھیک ہے۔ پھر مناسب ہے۔ لیکن اس کے لیے مرنا اولین شرط ہے۔ مرنا۔

اور جان دینا اس سے کم اور کوئی قیمت ہی نہیں۔

اس سے بڑا خطرہ اور کوئی ہے ہی نہیں۔ خدا کو جاننا بڑے خطرے کا کام ہے۔

جب تک تم اپنا آپ گنواؤ گے نہیں تم کچھ بھی نہ پاسکو گے۔

اگر یہاں تم کچھ پانے کے لیے کچھ حاصل کرنے کے لیے آئے تو پھر ابھی سے لوٹ جاؤ کیونکہ یہاں پانے

والی کوئی شے نہیں ہے۔

البتہ گنواؤ کے بڑے مواقع موجود ہیں۔

اگر تم گنوانا نہیں چاہتے یا گنوانا نہیں جانتے تو پھر تم کو گرو سے کچھ بھی نہیں مل سکے گا۔

وہ تم کو بڑی آہستگی سے پرے دھکیل دے گا۔

ایسی آہستگی سے کہ تم کو یوں لگے جیسے تم نے اُس کو دھکیل دیا ہو اور خود اس سے علیحدہ ہو گئے ہو۔

اور تم نے خود اس میں ایسی چیزیں دیکھ لی ہیں جن کی وجہ سے علیحدہ ہو جانا ہی مناسب تھا۔ دراصل

گرو نے بڑی چالاکي سے خود ہی یہ بات تمہارے دھیان میں ڈال دی ہوتی ہے۔

یقین ایک مشکل سودا ہے۔

یقین کر لینے والے بڑے سوراوگ ہوتے ہیں۔

یقین تو بس ایک چھلانگ کا نام ہے۔ اندھیرے میں چھلانگ۔ اندھی چھلانگ۔

جس نے سوچ کر اور آغاز و انجام دیکھ کر زقند بھری اس نے کوئی حرکت ہی نہیں کی۔ گرو کے ساتھ یک قلبی اور

یک جانی اعتبار اور یقین کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے۔

یہ ایسا تعلق ہے جو محبت سے بھی قیمتی ہے۔

لیکن اس محبت کے لیے اندھا ہونا شرط ہے۔

کیونکہ جب ادھر کی آنکھیں بند ہوں گی تبھی دوسری آنکھیں کھلیں گی۔

لیکن دوسری آنکھیں خرد سے اور عمل سے اور فیصلے سے نہیں کھل سکتیں۔

دوسری بات یہ یاد رکھو کہ جب تم کچھ دریافت کر رہے ہو کچھ معلوم کرنا چاہ رہے ہو تو ضروری نہیں کہ تم کو مطلوبہ

علم یا مطلوبہ شے مل بھی جائے۔

کئی بڑے بڑے گیانی اور دودانی بڑے بڑے سوال کرتے ہیں ساری عمر پوچھتے ہی رہتے ہیں لیکن ان کو کچھ

بھی نہیں ملتا۔

وہ بس سوال کرنا اور حیرت میں رہنا اور معلوم کرنا ہی جانتے ہیں۔ خطرے میں اترنا نہیں جانتے۔

اور خطرے میں اترے بغیر صرف معلوم ہی کرتے رہنا اور سوال ہی پوچھتے جانا۔ آپ کو کچھ تک نہیں لے

مرشد آپ کو آپ کے سوال پوچھنے اور اپنے علم میں اضافہ کرنے کی وجہ سے قبول نہیں کرتا۔ نہ ہی وہ.....

آپ کا تجسس دور کرنے کے لیے آپ کو پکڑتا ہے۔

وہ تو بس آپ کو آپ کی تیاری اور آپ کی رضا مندی اور آپ کی پختہ خواہش کی وجہ سے قبول کرتا ہے۔

یاد رکھنا! بڑے دھیان کی بات ہے اس پر عمل کرنا۔ جب بھی کبھی زندگی میں کسی گرو کے قریب ہونا۔

اس کے بیان کے الفاظ نہ سننا..... بلکہ اُس کو سننا۔

اس کے وجود کو..... اس کے وجود کے ترنم کو۔ اس کی ذات کی مدھم لے کو پکڑنے کی کوشش کرنا۔

یہ مت سننا کہ وہ کہہ کیا رہا ہے اُس کے الفاظ کیا ہیں۔

گرو کیا ہے؟ خود اُس کے لفظ بھی یہ نہیں بتا سکتے۔

خاموشی بھی اس کی وضاحت نہیں کر سکتی..... کیونکہ

خاموشی بھی تو زندگی کا ایک حصہ ہے۔ پوری زندگی نہیں۔

لفظوں میں تو کچھ بھی بیان نہیں کیا جاسکتا۔

خاموشی میں البتہ کچھ حصہ اجاگر ہو سکتا ہے۔

گرو کو کرتے دیکھو باتیں کرتے دیکھو بیٹھے چلتے دیکھو پانی پیتے پانی انڈیلنے پانی گراتے منہ دھوتے چوگا ڈالتے

.....

گرو کے لیے داس بلکہ داسی بن جاؤ۔

چیلانے کے لیے مرید ہونے کے لیے نسوانی صفات پیدا کرنا ضروری ہے۔

عورت وصول کرتی ہے جمع کرتی ہے محفوظ کرتی ہے۔

گرو کو اختیار کرنے کے لیے..... گرو کو

کھا جاؤ۔ چبا جاؤ۔ اسے اپنے اندر اتار کر ہضم کرلو۔

نیل اور انجانے واقعات

ہر واقعہ اور ہر لمحہ انسان کی روح کے اندر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ جس طرح ہوائیں سوکھے پتوں کو اڑا کر ہزار ہا

کی دوری تک لے جاتی ہیں اور ان کو ایسی زمین کے حوالے کر دیتی ہیں جہاں وہ نشوونما پا کر تازہ و درخت بن جائیں۔

سب سے دور دور کے خیال اور انجانے واقعات انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان خیالات کو اور اس

قدر دور سے آنے والے روحانی (Waves) کو اپنا لیتے ہیں اور بہت سے ان کو بیکار کی شے سمجھ کر اپنا آپ بند کر لیتے ہیں۔ جس طرح سے پتھر لیے، گنگر لیے اور کلر شورز و Soil بیجوں کو اپنے اندر ترے نہیں دیتے۔

روحانی بیج صرف ان وجود میں نشوونما حاصل کر سکتے ہیں جو وجود آزاد ہوں اور میریت کے حصار میں داخل ہو چکے ہوں۔ آزادی اور خود مختاری کے بغیر ان بیجوں کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ ہر شخص جو اپنی خواہشات اور اپنے تلمذ و ذات کا اسیر ہے، ایک آزاد شخص نہیں ہے۔ جو آزادوں اور تلمذوں اور راجستوں کے سنگول اٹھائے پھرتا ہے وہ بھکاری ہے، بادشاہ نہیں ہے۔ آزاد نہیں قیدی ہے اور قیدی کے وجود کے لیے جب بھی تیار ہوتا ہے، قیدی کا لباس ہی ہوتا ہے۔ شاہی خلعت نہیں اور محکوم اور مجبور آدمی ارفع لذت (Higher Pleasure) کے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

خداوند قدوس اپنے جی و قیوم ہونے کی رفق ایک قیدی کے اندر نہیں اتارتا۔ قیدی اور محکوم کو چونکا آزاد ہونے کی طلب نہیں ہوتی، اس لیے وہ ایسی رفق کو پسند بھی نہیں کرتا..... میں نے اپنی زندگی کو اسیری کا عادی بنالیا ہے اور میں نے اشیاء سے محبت کا دم بھرنے کے اصل (حقی) محبت اور اس کے منبع سے کنارہ کشی کر لی ہے۔

اگر میں نے خدا کے فضل اور اس کے کرم کے بیجوں اور دلوں کو قبول کیا ہوتا تو اس وقت تک میرے وجود کے اندر ایک گھٹان کی ہی کیفیت ہوتی۔ میں ہر وقت ہر لمحہ ہر گھڑی بلکہ ہر سانس کے ساتھ اس پورٹیبل (Portable) گھٹان کے اندر گزارتا لیکن میں نے خدا کی طرف رخ ہی نہیں کیا۔ اس کی عنایت قبول ہی نہیں کیں۔

اللہ کے فضل کی صورت بھی عجیب ہے۔ وہ مجھے سخت گرمی میں بھگا کر، بھگا کر اور پسینہ پسینہ کر کے اپنا کرم کرتا ہے۔ سخت سردی میں نجد کر کے مجھ پر فضل کرتا ہے۔ مجھے کھانے کو دے کر بھی مہربانی کرتا ہے، بھوکا رکھ کر بھی عنایت کرتا ہے۔ بیماری میں مجھے خیف و زار بھی کرتا ہے اور بے زری میں مجھے پریشان بھی رکھتا ہے لیکن ان ساری چیزوں کو اپنا کر میں مسکرا کر اپنا چہرہ اوپر اٹھاتا ہوں تو وہ میری شہ رگ کے پاس اسی سانس کا ایک حصہ ہوتا ہے جو میں روشنی حاصل کرنے کے لیے اندر کھینچتا ہوں اور جو میں زندگی حاصل کرنے کے لیے باہر نکالتا ہوں۔ اس نے میرے سر پر ٹھنڈی دھریوں کا سایہ کر رکھا ہے۔ میری زندگی گہرے چھتار سے تلے گزر رہی ہے۔ اس نے کسی شخص کو دھریوں کو پانی دینے پر مامور کر رکھا ہے۔

رومانیت

بس تو پھر وہی بنیادی سوال رہ جاتا ہے کہ محبت کہاں سے آتی ہے؟ اس کا منبع کیا ہے؟ یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ارتقاء کی اتنی بڑی طاقت کہاں سے در آتی ہے؟ اس کا Origin کیا ہے۔ اس طرح grace کہاں سے آ جاتی ہے۔ محبت تو پھر بھی ایک شعوری چیز ہے لیکن grace نہیں ہے۔ یہ جو شعور سے باہر کی شے ہے جو انسان میں روحانی گرد و تھ کی ذمہ دار ہے، یہ کھر سے آتی ہے۔

گلاب گلاب گلاب

ایک روحانی آدمی ہمیشہ غلط سمجھا جاتا ہے۔ اگر اس کے بارے میں غلط فہمی نہ ہو تو وہ روحانی آدمی نہیں ہوتا۔ انسانیت کا رویہ زندگی کے بارے میں بالکل روحانی ہے۔ اس لیے ایک روحانی آدمی ہمیشہ ایک اجنبی انسان ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں دنیا کے لوگ جو کچھ بھی کہیں وہ ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔ دنیا والے اس کی تعریف بھی کریں تو وہ بھی جھوٹ ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی اعلان محض اس وقت سچ ہوتا ہے جب اعلان کرنے والا خود روحانی ہو۔

جب تک آپ سچے نہیں ہیں، آپ جو بھی کہیں گے، وہ جھوٹ ہوگا۔ خواہ بظاہر وہ سچ نظر آئے۔ خواہ آپ دو اور دو چار کہیں لیکن اگر آپ جھوٹے ہیں تو وہ چار جھوٹ ہوگا۔ ایک روحانی آدمی اتنا بڑا فنونما ہوتا ہے کہ اس کی وضاحت کے لیے کوئی زبان ہی نہیں ہوتی۔ اگر تم کہو کہ وہ اچھا آدمی ہے تو یہ بھی جھوٹ ہے کیونکہ وہ برا بھی ہوتا ہے۔ اصل میں ایک روحانی آدمی خدا کی صفات سے متصف ہوتا ہے۔ جس طرح خدا رحیم و کریم اور بیک وقت قہار و جبار ہے اسی طرح روحانی آدمی بیک وقت اچھا اور برا ہے۔ وہ سردی گرمی، دھوپ اور چھاؤں، خزاں اور بہار ہے اور بیک وقت ہے۔ اس لیے اس کے سمجھنے میں وقت ہوتی ہے۔

اصل میں روحانیت ایک انقلاب ہے، سکون نہیں ہے۔ روحانیت عقل و دانش اور بنیاد کا نام نہیں ہے، یہ مکمل تبدیل کا نام ہے۔ خدا کے بارے میں جاننا خدا کو جاننا نہیں ہے۔

لفظ خدا، خدا نہیں ہے۔ روحانیت ایک ذاتی کھوج کا عمل ہے۔ یہ سوسائٹی کے چلن کا نام نہیں ہے۔ اسی طرح زبان کا مسئلہ ہے۔ زبان آپ کو انسان اور انسانی سوسائٹی کا ایک جزو بناتی ہے لیکن جب آپ زبان سے عاری ہو جاتے ہیں تو آپ سوسائٹی سے اور تمدن سے اور گروہ کے انداز زیست سے باہر نکل جاتے ہیں۔ آپ درختوں، دریاؤں، کہساروں کا ایک حصہ بن جاتے ہیں..... قرآن عربی زبان کا نام نہیں ہے۔ قرآن دل کا اور اندر کا کلام ہے۔ عربی زبان کا حصہ نہیں ہے۔ یہ سکوت کا اور خاموشی کا ترجمان ہے۔ قرآن حق ہے اور اس کا حقیقت سے تعلق ہے، زبان سے نہیں، لفظ سے نہیں۔

روحانیت احساس کا ایک سمندر ہے۔ خامش مارتا ہوا سمندر جس میں تم ڈوب جاتے ہو لیکن ہستی اور زیست موجود رہتی ہے۔ یہ موت ہے اور ساتھ ہی رستا خیز ہے۔ جیسے تم تھے وہ تو مر گئے اور ایک نئے ہو کر جمائے گئے۔ روحانیت اندر کی تبدیلی، اندر کی کاپیا کلپ کا نام ہے۔ روحانیت نہ تو مسجد ہے نہ مندر۔ نہ ہی ترمین و آرائش ہے، نہ ہی گنبد اور معبد..... اندر اترتے جاؤ اور اندر اترتے جاؤ اور جوں جوں گہرے ہو جاؤ گے، دیکھو گے کہ وہاں انا براجمان ہے۔ پہلے سے موجود ہے۔ پھانک لگا کر کھڑی ہے۔ اس پھانک سے کسی طرح سے گزر جاؤ، تم روحانیت میں

داخل ہو گئے۔ اس دنیا میں اگر کوئی شے دھارک نہیں ہے تو وہ انا ہے اور انا کبھی بھی روحانی نہیں ہو سکتی۔ فرقتے اور مذہب اس کو مار نہیں سکتے، وہ تو انا اس کو اور تقویت دیتے ہیں۔

اصل اور صحیح عبادت خاموشی کا نام ہے۔ سکوت کا نام ہے اور خاموشی نہ تو مسلمان ہوتی ہے، نہ یہودی، نہ عیسائی۔ خاموشی دھرم ہوتی ہے، خاموشی میں فرقتے مرجاتے ہیں، مذہب ختم ہو جاتے ہیں۔ سوسائٹی لائیو ہو جاتی ہے۔ تہذیب اور تمدن برباد ہو جاتے ہیں..... اور تو اور خاموشی میں تم آپ ختم ہو جاتے ہو، معدوم ہو جاتے ہو۔ صرف خاموشی رہ جاتی ہے اور تم ختم ہو جاتے ہو۔

دین شاعری سے منطقی نہیں، فلسفہ نہیں۔ یہ آرٹ ہے اور آرٹ مباحثہ نہیں ہوتا۔ آرٹ کے پاس کوئی دلائل نہیں ہوتے۔ اس کو دلائل کی ضرورت بھی، آرٹ دلیل کے بغیر ہی آپ کو ہلا کے رکھ دیتا ہے۔ یہ بہت طاقتور چیز ہے۔ کمزور چیزوں کو دلیل کا سہارا دار کار ہوتا ہے۔ طاقتور چیزوں کو نہیں۔ سورج کو اپنے طلوع کے لیے کوئی دلیل نہیں دینی پڑتی۔ کوئی مباحثہ نہیں کرنا پڑتا۔ اگر دلیل کے ذریعے تم مان بھی لو تو بھی تم روحانی نہیں ہو سکتے۔ روحانیت تو محبت کی طرح ہے۔ تم اس میں گرفتار ہو سکتے ہو، گرفتار ہو جاتے ہو، اس کو ثابت نہیں کر سکتے۔

استاد کے پاس شاگرد ہوتے ہیں۔ استاد کے پاس چیلے نہیں ہوتے۔ استاد سکھاتا ہے، پڑھاتا ہے، بتاتا ہے۔ اس کے پاس سکھانے کو کچھ ہوتا ہے مگر مرشد کے پاس سکھانے والی کوئی چیز نہیں ہوتی کیونکہ روحانیت سکھائی نہیں جاسکتی۔ لاوتزے کہتا ہے، حق سکھایا نہیں جاسکتا۔ حق بولا بھی نہیں جاسکتا اور جو کچھ بولا جاتا ہے، وہ سچ نہیں ہوتا۔ بولی جانے والی چیز سچ کی بابت ہو سکتی ہے، سچ نہیں ہوتی۔ طالب علم بھی زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جب وہ کسی گرو کے پاس آتا ہے تو وہ خدا کو جانا چاہتا ہے، اسے پانا نہیں چاہتا۔ اس کے بارے میں علم حاصل کرنا چاہتا ہے، اسے حاصل کرنے کا خواہشمند نہیں ہے۔

ایک طالب علم باطن کا سفر اختیار کرنا نہیں چاہتا، علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ موچی بننا نہیں چاہتا، کنش سازی کے بارے میں علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔

طالب علم آگے کا خواہش مند نہیں ہوتا، علم کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اس لیے طالب علم ہمیشہ استادوں کے گرد جمع ہوتے اور چیلے گرووں کے گرد۔ چیلہ پوچھتا ہے، میں ہستی کیسے بن سکتا ہوں، وجود کس طرح بن سکتا ہوں۔ جوہر میں کس طرح اتر سکتا ہوں۔ طالب علم پوچھتا ہے، میں علم کس طرح اکٹھا کر سکتا ہوں، آج تک دنیا میں کوئی شاگرد چیلہ نہیں بن سکا جب تک اس نے طلب علم کی ہوس کو گرا نہیں دیا۔

پیر اور مرشد جنس بازار نہیں ہوتی۔ نہ ہی اس کے اشتہار چھپ سکتے ہیں۔ نہ وہ درسی گرائمر کے نوش شائع کر سکتا ہے۔ وہ تو بس ہوتا ہے۔ اس کا وجود اور اس کا جوہر ہی ایک ناقابل یقین چیز ہوتا ہے۔ مرشد ایک عجیب و غریب مخلوق ہوتا ہے۔ ایسی مخلوق جس کے اندر تضادات ایک دوسرے کے ساتھ کمریں جوڑ کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ دور خیال جمع ہوتی ہیں اور وہ ان کے راز سے واقف ہوتا ہے۔

روحانی آدمی کسی عقل کے دائرے میں نہیں آتے۔ وہ صرف دل کے اندر جگہ پاسکتے ہیں۔ کسی انجمن یا مجلس کا حصہ نہیں بن سکتے۔ چونکہ انجمنوں اور مجلسوں کا دل نہیں ہوتا۔ اس لیے گروہاں رہ نہیں سکتا۔

میری انگلی کی طوالت دیکھو۔ میں اس سے چاند کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ چاند دور ہے، عجیب ہے لیکن چاند میری انگلی نہیں ہے۔ چاند نامعلوم ہے، انگلی اس کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ یہ معلوم ہے۔ الفاظ بھی انگلی کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ نامعلوم کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں، خود نامعلوم نہیں ہوتے۔ خود سر نہیں ہوتے۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو جب تک بات سمجھ نہ لیں، اس وقت تک اس پر اعتبار نہیں کرتے۔ انہیں یقین ہی نہیں آتا کہ اس کائنات میں کوئی ایسی چیز بھی ہو سکتی ہے جسے سمجھنا نہ جاسکے۔ اب یہ ان کے ایگو کا کمال ہے۔ ان کی انا کا اعجاز ہے کہ ایسا سمجھتے ہیں۔ اصل میں یہ سب انا کے کھیل ہیں۔ ایک انا کہتی ہے کہ میں اس قدر ذہین اور صاحب فراست ہوں کہ سب کچھ جان سکتا ہوں اور اگر میں نہیں جانتا یا نہیں سمجھتا ہوں، وہ شے محض واہمہ ہے۔ دوسری ایگو کہتی ہے کہ جب میں ہی نہیں سمجھتا تو پھر اس شے کا وجود کس طرح ممکن ہے۔

لیکن جانکاری کے لیے اس شے سے تعلق پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ سیدھے اس سے پوچھنے کی ضرورت ہے۔ وہ خود بولے گی، خود بتائے گی کہ میں ہوں کہ نہیں لیکن اس کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ تقریروں کی، مکالموں کی، سیمیناروں کا تکلف نہیں ہوگا۔ اس کے لیے خاموشی اختیار کرنا ہوگی، مراقبے میں اترنا ہوگا۔ اس چیز کے قریب جانا ہوگا، اس سے تعلق پیدا کرنا ہوگا۔ اگر کوئی چیز آپ کی سمجھ میں نہیں آتی تو اس کے ساتھ جھگڑا نہ کریں۔ اس سے الجھیں نہیں۔ آپ اس کائنات میں عقل کل نہیں ہیں۔

زندگی کا راز نہ کسی سے ڈھونڈا جاسکا نہ کسی کو معلوم ہوا۔ نہ یہ حل ہو سکتی ہے، نہ ہی اس کا تجربہ کیا جاسکتا ہے۔ زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔ گزاری جاسکتی ہے اور پھر زندگی کوئی مسئلہ تو نہیں ہے کہ سلیٹی پٹل لے کر اس کا حل ڈھونڈنے لگ جائیں، زندگی تو زندگی ہے یہ بسر کی جاتی ہے۔

جانکاری کا آخری لمحہ جہالت کا لمبا وقفہ ہوتا ہے۔ جیل کی کالی رات اور پھر اس کالی رات سے صبح نمودار ہوتی ہے۔ اس سے روشنی کی کرن پھوٹی ہے اور یہ کرن علم ہوتا ہے، اصل علم۔ علم حضوری دانست، اس علم کو بدھا "سمودھی" کے نام سے پکارتا ہے۔ پاتا نگلی اس کو سادھی کا نام دیتا ہے۔

میں تم کو ایک پھول دکھاتا ہوں، ایسا پھول جو تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ تم پوچھتے ہو، اس کا نام کیا ہے؟ لیکن تم اس کا نام جاننے کے لیے اس قدر بے چین کیوں ہو، پھول دیکھو میں نے تمہیں پھول دکھایا ہے۔ اس کا نام کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ الف بے جیم وال۔ کوئی نام۔ لیکن تم مصرعواد بار بار پوچھتے ہو۔ فرض کر دو میں کہتا ہوں اس کا نام الف ہے۔ پھر تم خوش ہو جاتے ہو کہ مجھے معلوم ہو گیا۔ تم پھول پر الف کا لیبل لگا لیتے ہو۔ پھر اپنے بچے کو بتاتے ہو کہ دیکھو بیٹا اس پھول کا نام الف ہے۔ دوستوں کو بتاتے ہو، عزیزوں کو بتاتے ہو اور خوش ہوتے ہو کہ تم نے پھول کو جان لیا لیکن میرے بھائی تم نے پھول کو کہاں جانا، تم نے تو لیبل کو جانا ہے۔ الف کو جانا ہے، نام کو جانا ہے۔ لیکن نام سب کچھ نہیں بتاتے بلکہ کچھ بھی

نہیں بتاتے۔ نام اور لیبل جاننے والا شے کی ماہیت سے محروم رہ جاتا ہے، شے کو نہیں جان سکتا۔ لیبل نوازی بڑی خطرناک چیز ہے۔ یہ اچھا ہے، یہ برا ہے۔ یہ مرد خوبصورت ہے، یہ اس کی بیوی ہے۔ بیوی بدصورت ہے لیکن ٹھہرہ لیبل لگانے سے پہلے رکو۔ آخر اتنی جلدی بھی کیوں! کیا تم نے اچھوں کو برا اور بدوں کو اچھا ہوتے نہیں دیکھا۔ بدصورتوں کو حسین اور حسینوں کو بدصورت نہیں دیکھا۔ پھر ٹھہرہ اور لیبل نہ چپکاؤ۔ تشکیک زندہ ہے اور حقیقت مردہ ہے۔

اپنے آپ تک پہنچنے کے لیے کسی عمل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عمل راستہ مانگتا ہے۔ منزل کی نشاندہی چاہتا ہے اور اپنے آپ تک پہنچنے کے لیے کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

مذہب تحیر ہے، معصومیت ہے، علم نہیں ہے۔ انی پیغیروں نے اپنی معصومیت کے ذریعے لوگوں کی زندگیاں بدل دیں۔ معاشروں کی کایا کلپ کر دی۔ مکالمات اور مباحث سے جہالت کبھی بھی دور نہیں ہوتی، چھپ ضرور چاتی ہے۔ پیہر گھوم رہا ہے اور جس پر گھوم رہا ہے، وہ دھراساکن ہے۔ صامت ہے، پرسکون ہے اور جگہ پر Fix ہے۔

وجد

وجد میں Trance میں کوئی چیز ہوتی ہے جس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ وجد میں کیا ملتا ہے..... کچھ بھی نہیں! اس وقت تک وجد ممکن ہی نہیں جب تک کوئی شے جاننے کی رہ گئی ہو۔ وجد تو موجود Existence کے ساتھ ایک جان ہونے، الگ ہونے کی ایک صورت ہے۔ اس وقت حق حقیقت اور حقیقت کو پانے والے کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہتا۔

بھاگو نہیں

دنیا کے اندر رہنا اور دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھنا ہی ترک ہے۔ یہی سنیاس ہے۔ وہ تین بندوں والے لٹے دیکھے ہیں۔ ایک نے آنکھیں بند کر رکھی ہے کہ کوئی برائی نہ دیکھے۔ ایک نے کان بند کر رکھے ہیں کہ کوئی برائی نہ سنے۔ ایک نے منہ بند کر رکھا ہے کہ کوئی بری بات منہ سے نہ نکلے پائے..... بندوں تک تو یہ بات ٹھیک ہے لیکن انسانوں کے لیے موزوں نہیں۔ آزادی پانے کے لیے دنیا سے کنارہ کشی کرنا کوئی آزادی نہیں، کوئی کمال نہیں۔ تو بلکہ ایک بندھن ہے جس کا احساس نہیں ہو پاتا۔ دنیا سے بھاگو نہیں لیکن اپنے وجود کا احساس رکھو۔ اپنے من کو جانو، بھاگنے میں خطرہ ہے، جاننے میں عافیت بھی ہے اور آزادی بھی۔ جو بے خوفی جانکاری سے حاصل ہوتی ہے، وہی ہم کو آزادی عطا کرتی ہے۔

واردات قلبی

ذہانت سوچ سکتی ہے لیکن واردات میں سے نہیں گزر سکتی۔ تجربہ اور واردات ہمیشہ دل پر گزرتے ہیں۔ اعضائے ریہہ میں سے سب سے نہیں عضو پر۔ ذہانت واردات کے بغیر موت جیسی ہے بلکہ سچ پوچھو تو موت ہی ہے۔ مردہ

اور خوابیدہ الفاظ ذہن کے اندر گرتے پھرتے اور گونجتے ہیں۔ وہ ہم کو آزادی نہیں کر سکتے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہی ہماری زنجیریں اور پھنکڑیاں ہیں۔ واردات قلبی ہی آزادی ہیں اور وہی ہم کو آزادی عطا کر سکتی ہیں۔ اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ حق اور سچ کی تلاش میں مت نکلو بلکہ حق کی واردات کو تلاش کرو اور سچ کا تجربہ ڈھونڈو۔ زندگی کو کھو جو اوج حق کے اندر گہرے اترو۔ یاد رکھو کہ جو لوگ سچ کے اندر ڈوب جاتے ہیں اور انہیں اس ڈوبنے کا شعور ہوتا ہے، وہی لوگ ”ناچ“ کی پچاسی سے آزاد ہوتے ہیں۔ آزاد ہونا ہے تو ذہن کے بجائے دل کا سہارا پکڑو۔ یہی وہ ایک سہارا ہے جو آزادی کے رستوں پر لے جانے والا اور خوشیوں کے پھریرے اڑانے والا ہے۔

موت قبل انتہو

جو کچھ بھی آپ کے پاس ہے، اس کو ایک سوئی پر گھس کر ضرور دیکھا کرو۔ ایک پر کھ ضرور قائم رکھو کہ یہ سب کچھ اور آئندہ کے حصول کا سب کچھ کیا موت ان کو آپ سے جدا نہیں کر دے گی۔ یہ دولت، یہ جائیداد، یہ بینک بیلنس جواب آپ کی ملکیت ہیں، کیا ذرا سی موت ان کے درمیان حائل ہونے سے یہ ساری چیزیں آپ سے جدا نہیں ہو جائیں گی۔ یہ عزت، یہ شہرت، یہ ناموری، یہ سیاسی اقتدار، یہ طاقت..... یہ ساری چیزیں ایک موت کی ہلکی سی آمد سے آپ سے الگ نہیں ہو جائیں گی۔ اسی لیے صوفی کہا کرتے ہیں کہ ان ساری چیزوں کے سامنے پہلے ہی مر جاؤ۔ خود موت کو اختیار کر لو۔ یہ سب چلی جائے والی چیزیں ہیں اور جتنی اس کے کہ یہ آپ سے بے وفائی کریں، آپ خود ان سے منہ موڑ کر ان کو ٹھوٹھ کھا دو اور اس چیز کو اختیار کر لو جو لافانی ہے جو امر ہے، جو سادگی ہے۔

روحانی سورما

روحانی سورما کے پاس ایک قرواں ہوتی ہے۔ ایک فخر، ایک پیش قبض، ایک جدھر، وہ اس کے فن سے بھی واقف ہوتا ہے اور ک سے کم مدت میں قرواں نکال کر حملہ آور شے پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔

آب حیات

اللہ فرماتا ہے کہ میں نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ ان میں سے کچھ تو پیٹ کے بل ریگتے ہیں، کچھ دیباؤں پر چلتے ہیں اور کچھ چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ پانی وہ بنیادی ماحول اور بنیادی سہارا ہے جس سے ہم زندگی کی ابتداء میں متعارف ہوتے ہیں۔ پانی پاکیزگی ہے، پانی نرمی احساس ہے۔ جذبہ ہے، سر ہے ایک مجید ہے۔ بہت سے لوگ پانی کے قریب رہنا پسند کرتے ہیں، کسی ندی کنارے، دریا کنارے، سمندر کے قریب، پہاڑی نالوں کے درمیان۔ کہتے ہیں پانی ایک روح ہوتی ہے جو صاحب نظر لوگ آبشاروں میں جھرنوں میں، سمندر کی بھرتی ہوئی لہروں میں دیکھ لیتے ہیں۔ ان کے متعلق بڑی کہانیاں مشہور ہیں۔ ان سے ملنا آسان نہیں لیکن اگر دل میں شک نہ ہو اور انسان بے اعتباری نہ کرتا ہو تو پھر ان سے

ملاقات ضرور ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے تخیل کی بلکہ وسیع تخیل کی ضرورت ہے۔

روح اور بدن

میں سمجھتا ہوں کہ روح کا اور بدن کا کوئی میل نہیں لیکن ان کا ساتھ ازل سے چلا آ رہا ہے اور اب تک اسی طرح سے چلتا چلا جائے گا۔

جو بات روح کو پسند ہے، وہ بدن کو پسند نہیں۔ روح کو ریاضت پسند ہے۔ قناعت پسند ہے۔ شفقت اور شرافت پسند ہے۔

لیکن بدن کو راگ رنگ، دھینگا مشقی، قتل غارت گری، زنا اور بیپ، چوری یا ریا کاری پسند ہے۔ ان دونوں کو جوڑ کے رکھا ہے اور ان کو اسی طرح سے چلنا پڑتا ہے لیکن اک دوسرے سے کھینچ کھینچتے ہیں جیسے بھینس کے ساتھ گھوڑے کو "نرڑ" دیا جائے۔ وہ دونوں ایک ساتھ رہیں اور ایک ساتھ زندگی بسر کریں۔ لیکن روح اس وقت تک جسم سے پسند کا رابطہ نہیں کرتی جب تک جسم حسین نہ ہو، خوبصورت نہ ہو، صاف نہ ہو، بے داغ نہ ہو۔

جب آدمی مرتا ہے، بے جان ہوتا ہے۔ بے شکل اور بے ریخت ہو جاتا ہے۔ پھر اگر ناگہانی طور پر جب اچانک قتل ہوتا ہے، گولیوں کی باڑھ لگتی ہے تو روح اس کی بدبختی کو دیکھ کر اور اس کی بدصورتی اور بدشکلی سے نفور کر کے اس سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔

جسم کو مجروح ہونا چاہیے، کٹنا پھٹنا تباہ و برباد ہونا چاہیے۔ یہ بدن کا نقصان ہے لیکن ایسے نقصان پر روح کو تو اس کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اس کا ساتھ دینا چاہیے لیکن ایسے نہیں ہوتا، بدن تو بعد میں مرتا ہے (کئی اعشائے بدن دیر تک زندہ رہتے ہیں) روح پہلے ہی اس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔

یہ تو ہوئی موت کی بات۔ اب اگر بدن کسی اور خطا کسی اور کی یا کسی اور لغزش کی وجہ سے گندا ہو جائے تب بھی روح اس سے الگ ہو جاتی ہے۔ اس سے پرے پرے رہنا شروع کر دیتی ہے۔ جسمانی طور پر بدن بھلے درست ہو لیکن اگر اخلاقی طور پر اور معاشرتی طور پر طے شدہ قدروں سے نکل گیا، پھر روح نے اس کے ساتھ نہیں دیا۔ اس سے کنارہ کش ہو کر رہی۔

اسی لیے بزرگان دین کہتے ہیں بدن کو راستی پر لے آؤ۔ روح قریب آ جائے گی اور دوسری کا دم بھرنے لگے۔ اس کی دوسری کے سہارے اور اسی کی چاند گاڑی پکڑ کر آپ اونچی دنیاؤں کی سیر کرنے لگیں گے۔

ہر صورت کی کنہ غیر مرئی ہے۔ یہ دنیا جو ظاہر ہے، کسی ظاہر سے وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ ایک غیر مرئی طاقت سے وجود پذیر ہوئی ہے۔ جب ایک بیج زمین میں بویا جاتا ہے تو اس پر زندگی کی نموی اثر پذیر ہوتی ہے اور وہ قوت نمودار نہیں آتی۔ وہ غیر مرئی ہوتی ہے اور وہ نہ نظر آنے والی قوت اس بیج پر زمین کی تاریکی میں اس طرح سے اثر انداز ہوتی ہے

اس بیج سے کوئٹیں پھوٹتی ہیں۔ پودا بنتا ہے۔ برگ و بار لاتا ہے اور پھولوں سے لد جاتا ہے۔ یہ پتے، یہ غنچے، یہ پھل جو نظر آتے ہیں، ایک نہ نظر میں آنے والی قوت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ زراعت میں اسے قدرت کے نام سے پکارا جاتا ہے لیکن نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل میں یہ خدا ہی کا کرشمہ ہوتا ہے اور اسی کی کرتویہ ہوتی ہے۔ وہی خدا جو نظر نہیں آتا۔ جوازل سے اب تک ہے۔ جو ہے..... ہے اور ہوتا ہی رہے گا

بس یہی قدرت، یہی کرشمہ، یہی قانون آپ کے اندر بھی کام کر رہا ہے۔ اس کو آپ کی بزنس میں، آپ کے گھر میں، آپ کی زندگی میں، آپ کی اقتصادیات پر اپلائی کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ باہر کے سارے مظاہر اندر کے اسی قانون کے تابع ہوتے ہیں۔ اسی کا شمرہ ہوتے ہیں۔ جو کچھ آپ کے تجربے اور آپ کی کردنی سے گزرتا ہے، اسی قانون کی کشش کے تحت گزرتا ہے۔

سارا جھگڑا اس وقت پیدا ہوتا ہے اور اس دنیا میں سارے فساد کی جزا اسی مقام پر گڑی ہے جب ہم کسی شے کو کسی شخص سے طلب کرنے کے متمنی ہوتے ہیں اور عین اس وقت ہر شخص ہر اسان اور پریشان پھر رہا ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا اس سے اسی کی چیز لے لے گا۔ انسان کو اس دنیا میں بس ایک خوف ہوتا ہے کہ لوگ مجھ سے زیادہ لے لیں گے اور مجھے اس زندگی میں کم سے کم مل سکے گا.....

روحانی زندگی میں اور باطن کے سفر میں خود غرضی کا کوئی مقام نہیں۔ خدا کا قانون انصاف کا قانون ہے اور یہ خود غرضی کے لیے استعمال نہیں ہو سکتا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم کوئی کام نہ کریں۔ محنت سے اور مشقت سے کام نہ لیں بلکہ اس کے برعکس ہم کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ محنت اور توجہ سے کام کرنا چاہیے کیونکہ ہماری جھولی میں زیادہ کام پڑنے والا ہے لیکن یاد رہے کہ اس کام میں جدوجہد کا میاں بی کا کس نہیں ہوگا۔ یہ کوشش اور مشقت اور کشش کا درس نہیں ہوگا کہ اس میں خیالات کو گھیرنے کے پہنچے ہوں۔ ساتھی ساتھ ملانے کے جھگڑنے ہوں یا شہرت، عزت، دولت، مقبولیت حاصل کرنے کے۔

موت قبل انتہوتو

حضرت عیسیٰ زندہ اٹھالیے گئے۔ وہ وہاں نہیں تھے، اس قبر میں یا اس مرقد میں جس میں لوگ ان کو سمجھتے تھے کہ ہیں..... اصل میں ہم بھی اس وقت اپنے بدن میں موجود نہیں رہتے جب ہم ایک حقیقت کو یا ایک فرقہ کو جان جاتے ہیں۔ جب ہم پر سچائی وارد ہو جاتی ہے تو ہم بدن سے اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ ایک غلطی سے برآمد ہو جاتے ہیں۔ ایک مایا سے نکل آتے ہیں۔ اس وقت ہم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ وجود، یہ بدن ہمارے شعور کا ایک حصہ ہے اور یہی وہ شعور ہے جو ہمیں ہمارے بدن پر دسترس عطا کرتا ہے۔

جنگل سے سائیں ٹائیگر جو بہت ہی خونخوار تھے، پکڑ کر لے جا رہے تھے اور ان کا پکڑنا ناممکن تھا۔ ڈاکٹر نے بے ہوش کرنے والی سرنج ہندو میں بھر کر ان کی ران میں ماری۔ تھوڑی دیر بعد خونخوار ٹائیگر بے ہوش کر زمین

میں نے دیکھا ہے کہ باطن کے سفر کے لیے کوئی طے شدہ شیڈول نہیں ہے۔ ایک آدمی ایک قدم آگے جاتا ہے، تین قدم واپس آ جاتا ہے۔ ایک سیدھا منزل تک پہنچ جاتا ہے اور پھر فسق و فجور میں داخل ہو جاتا ہے۔ زور لگائے تو کل بھی جاتا ہے، کوشش نہ کرے تو پھنسا ہی رہ جاتا ہے۔

باطن کے سفر کے لیے کوئی خوش نصیب بہت بڑے صوفیاء کے فرمودات کو جان کر اور سمجھ کر اور ان کی پیچیدگیوں سے متعارف ہو کر اپنا کامیاب سفر شروع کر سکتا ہے۔

مذہب کی چھوٹی چھوٹی شرائط اور بنیادی ارکان اختیار کر کے چل سکتا ہے حتیٰ کہ مانع چیزوں کو اختیار کر کے بھنگ پی کے، مجراں کے بھی اس سفر پر روانہ ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے کسی لیبل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک طلب کی مضبوطی ہوتی ہے کہ خدا کو پانا ہے اور اس کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ بڑی بڑی ٹکریں مار کر اور اندھی گلیوں میں ہڈ گوڑے تروا کر بالآخر حلاشی اپنی منزل پر ضرور پہنچ جاتا ہے۔

خدا کے بارے میں باتیں کرنا، ڈائلاگ کرنا اور اس پر غور کرنا بالکل ممکن ہے اور بہت حد تک آسان بھی ہے لیکن یہ ساری گفتگو اور مکالمے اور بڑے بڑے Symposium خدا کو ہمارے تجربے میں نہیں اتار سکتے۔ یہ اس کا دیباچہ ہو سکتے ہیں لیکن اس سے واپرنا کی کتاب مرتب نہیں ہوتی۔

خدا کی عبادت، خدا کے بارے میں سوچ اور خدا کے بارے میں مجلس آرائی ہم کو خدا تک نہیں پہنچاتی۔ خدا تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے خاموشی، وحیان، مراقبہ۔ یہ فقہ ایک منٹ کے ہزار ویں حصے پر بھی محیط ہو سکتا ہے، ایک پلک جھپکنے پر بھی۔ اس کے لیے کوئی لمبی سدھیاں کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو نبی ذہن پر سکون ہوا خدا کا گیان مل گیا۔ اس میں روحانی لٹریچر پڑھنے سے ڈیڑھ گھنٹوں پر جانے سے، مرشدوں سے ملاقات کرنے سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔

جب تک خدا ایک سوچنے کی اور غور کرنے کی چیز رہے گی، اس کا درجہ نیا گرافا، تاج محل، کوٹم تھیوری اور ساقیات جیسا رہے گا۔ ان سب موضوعات پر ہم گھنٹوں، دنوں بلکہ سالہا سال تک باتیں کر سکتے ہیں اور کرتے چلے جاتے ہیں۔

اسی طرح خدا کے ساتھ ہے۔ جب تک ہم اس کی بابت باتیں کرتے ہیں، اس کے متعلق پڑھتے ہیں، مطالعہ کرتے ہیں، بڑا مزا آتا ہے اور بڑا سرور ملتا ہے لیکن خدا اس سرور سے لاکھوں میل دور ہوتا ہے۔ یہ ایک خیال اور ایک تصور ہی رہتا ہے۔ اصل سے ملاقات نہیں ہوتی۔ ایک تصویر سی نظر آتا ہے۔ خوبصورت، رنگدار تصویر۔

لیکن جب ہم خاموش ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور ہمارا دل ترشنا سے بھر جاتا ہے۔ پھر اس کے فضل کے برسنے کا موقع ہوتا ہے۔ پھر وجود کے آسمان پر اس کے بادل آتے ہیں اور عطا کی بارش ہوتی ہے۔ پھر یہ پتہ چلتا ہے کہ اصول اور ضابطے سے بڑھ کر اس کے فضل کا کمال ہے۔

ایسی کیفیات کہ جب ٹانگا لگ جائے تو وہ دن میں بار بار آتی ہیں۔ درجن بھر سے زیادہ مرتبہ۔ وجہ یہ کہ اندرونی سکون کو بار بار چارج کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ خدا کے فضل کا سوتا ہمارے اندر اترتا ہے اور

پر لٹ گئے۔ نوکر لوگ ان کو پرانے تختوں پر ڈال کر اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے۔ ڈاکٹر نے ان کے منہ کھول کر دانتوں کا معائنہ کیا۔ ان کے کلوں پر تھپڑ مارے۔ ان کے پونے کھول کر دیکھے۔ ان کی آنکھوں میں دوائی ڈالی۔ وہ جسم ہی جسم تھے اور ان کا شعور ختم ہو چکا تھا۔

جب ایک شخص برائی اور Evil کی وجہ جان جاتا ہے اور اس کی بد ذاتی سمجھ جاتا ہے کہ یہ انسان زندگی میں بار بار کیوں رونما ہوتی ہے تو پھر وہ روزمرہ زندگی کی مشکلوں اور مصیبتوں کو سمجھنے لگ جاتا ہے اور ان کا مقابلہ کرنے میں آمراں محسوس کرتا ہے۔ پھر اس کی زندگی میں آزادی، خوشی، مسرت، ہم آہنگی اور سکون پیدا ہونے لگتا ہے۔ پھر وہ اپنے مگر والوں، محلے والوں، اپنے شہر، اپنے ملک اور ساری دنیا کے لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے اور ان کی دھگیری کرنے کے لیے بڑے بھرپور انداز میں تیار ہو جاتا ہے۔ پھر اس کو احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ ہے یا خدا اس کے ساتھ ساتھ ہے اور ہم دونوں کو دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔ خدا سچ اس کی شرگ کے پاس تخت نشین ہو جاتا ہے۔

زندگی بسر کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی اصول، قانون اور ضابطے کے تحت بسر کی جائے اور دوسرے یہ کہ زندگی فضل اور کرم کے سہارے گزاری جائے۔ جو زندگی مادی، انسانی اور کوششی سہاروں کے بل بوتے پر گزاری جاتی ہے وہ مشکل، تکلیف دہ اور پر مشقت ہوتی ہے اور اس میں ایک طرح کی ناگواری کا بڑے تسلسل کے ساتھ چلن ہوتا ہے۔ ایسی زندگی تلوار کے بل بوتے پر اور تلوار کی دھار پر گزاری جاتی ہے۔ جنگ والی تلوار نہیں بلکہ روزمرہ کے واقعات اور حالات کی تلوار سے مقابلے کی تلوار کھینچ کر تیار، رتبہ حاصل کرنے کی تلوار اور آخر میں اس کا انجام ایک ہی ہوتا ہے کہ تلوار کے ساتھ زندگی بسر کرنے والا بالآخر تلوار ہی سے مارا جاتا ہے۔

لیکن کیا grace کے ساتھ زندگی گزاری جاسکتی ہے؟ خاص طور پر اس دور میں جس میں ہر شے اور ہر کام مقابلے کے ساتھ بندھا ہے اور اسی کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ مشکل کام ہے لیکن غور سے دیکھیں اور تاریخ کا مطالعہ کریں تو بے شمار اہل اللہ جن سے ماضی بھرا پڑا ہے اور بہت سے جو اس عہد میں ابھی گزرے ہیں اور جو ہمارے ارد گرد میں کہیں اب بھی موجود ہیں، یہ ہم جیسے ہی لوگ تھے اور ہماری طرح پریشان رہا کرتے تھے لیکن پھر ان پر اچانک اللہ کا فضل ہوا۔ ان کو روشنی ملی یا ذات حق کا بلا واسطہ مشاہدہ ہوا۔ حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، نبی کریم، مہاتما بدھ، ان شخصیتوں سے کروڑوں، اربوں انسانوں کو روشنی ملی اور زندگی میں آسانیاں نصیب ہوئیں۔ دونوں تک ان مقلدوں نے روشنی عطا کرنے والوں کے انعامات سے خوب خوب فائدے اٹھائے لیکن وہ اس شعور کے اندر زندہ نہ رہ سکے جو ان کے گوروں کا اعجاز تھا۔ جلد وہ زمانے کے الٹ پھیر میں پھر شامل ہو گئے اور پھر سے مادی زندگی میں الجھ گئے۔

ذہن انسانی آکس اور سستی کا مارا ہوا ہے۔ یہ اپنے آپ کو ڈپلین کرنا پسند نہیں کرتا۔ چالور میں بننے پر خوش رہتا ہے۔ اسی لیے دیکھا ہوگا کہ ایک افسر ہوتا ہے اور ہزاروں کلرک ہوتے ہیں۔ ایک انجینئر ہوتا ہے، ہزاروں مستری ہوتے ہیں۔ ایک آرکیٹیکٹ ہوتا ہے کروڑوں مزدور ہوتے ہیں۔ انسان اپنے آپ کو سوار نہیں چاہتا۔ محنت سے گھبراتا ہے۔ اس لیے Cliche میں زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہے۔ اصول پرستی اور اصول پسندی سے گھبراتا ہے۔

ہمارے اندر سے ہو کر باہر جاتا رہتا ہے تاکہ دوسروں کو بھی سیراب کرے۔ بغیر کسی کوشش کے، جدوجہد کے، بے فکر کی Effort کے۔

یہ کبھی نہیں سوچنا چاہیے کہ خدا ہمارے لیے ایک اعلیٰ درجے کا گھر بنادے گا۔ ایک بارہ کنال کی کوٹھی سجاوے تاکہ ہم سکون کے ساتھ اور مزے کے ساتھ اس میں رہیں اور موبچیں کریں۔ ایسا نہیں سوچنا چاہیے اور نہ ہی یہ مانگنا چاہیے۔ ہمیں بارہ کنال کی کوٹھی کے بجائے خدا کے اندر رہنا چاہیے۔ کوٹھی نہیں مانگنی چاہیے، خدا مانگنا چاہیے اور جس نے خدا مانگ لیا، پھر وہ سب کوٹھیوں والوں سے افضل ہو گیا۔

اگر ہمارا خدا نہ خدا کے علاوہ کہیں اور ہوگا تو پھر خطرہ ہر وقت موجود رہے گا۔ چور، ڈاکو کا خطرہ۔ آگیا کا خطرہ، سیلاب کا خطرہ، زلزلے کا خطرہ لیکن جب ہم نے خدا کو اپنا بنالیا، سب کچھ بنالیا پھر کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔

اصل میں خدا آپ کو صحت نہیں دے سکتا، دولت نہیں دے سکتا، عقل و دانش عطا نہیں کر سکتا۔ وہ خود ہی صحت، خود ہی دولت، خود ہی دانش اور خود ہی بے فکری اور خود ہی اطمینان ہے!

فوراً معاف کر دیں

جو باتیں سمجھ آگئی ہیں، ان پر عمل کرنا شروع کر دیں۔

جس شخص نے آپ کا کوئی قصور کیا ہو، اس کو فوراً معاف کر کے آزاد کر دیں۔ جب تک آپ اسے معاف نہیں کریں گے، وہ قصور میں جکڑا رہے گا اور آزادی سے دور رہے گا۔ یاد رکھئے جکڑے ہوئے شخص پر شیطان فوراً حملہ کرتا ہے۔

شکل میں چاند کی طرف جانے والا جب Base کی ہدایات پر عمل کرے گا تو وہ اوپر ہی اوپر چلا جائے گا۔ ہدایات پر عمل کرنے والا اور ماننے والا چاند تو کیا گردوں سے بھی آگے نکل کر سدرۃ المنتہی تک پہنچ جاتا ہے۔

اس بات کی فکر نہ کرنا کہ گویاں دوھیان کی بہت سی باتیں تم کو سمجھ نہیں آتیں، اس بات کی فکر ضرور کرنا کہ جو باتیں سمجھ آگئی ہیں، ان پر عمل نہیں ہوتا۔

زندگی کے فیصلے کرنے کے لیے دماغ سے ضرور کام لیں جو خدا نے آپ کو دیا ہے۔ اسی طرح دل کے فیصلوں پر بھی عمل کریں، وہ بھی آپ کو خدا نے ہی دیا ہے۔

جہاد و شاعت اسلام کے لیے نہیں، حکومت اسلام قائم رکھنے کے لیے دیا ہے۔

معرفت کے معنی ہیں کہ دنیا کی قدر و دل کے اندر نہ ہو، اس سے دل کو خالی رکھے اور بے ضرورت سامان جمع نہ کرے۔ اگر ساری زمین گناہوں سے بھر جائے تو توبہ سب کو مٹا دیتی ہے۔ ڈائنامائٹ ذرا سی ہوتی ہے لیکن بڑے پہاڑوں کو پھاڑ دیتی ہے۔

اگر سکون قلب کی طلب ہے تو ہر وقت اس کی فکر میں رہنا خود جمعیت کے معنی ہیں۔ جمعیت جیسی ممکن ہے کہ

جب اس کی تحصیل کے خیال سے خالی ہو۔

دن اور رات

رات کا پہلا پہر چوروں اور زانیوں کے لیے مختص ہوتا ہے۔ کلبوں کے لیے اور جوئے خانوں کے لیے لیکن آخری پہر خدا ہی ہوتا ہے۔ اس میں ایسی حرکات نہیں ہو پاتیں۔ یہ پہر بڑا برکت والا ہوتا ہے۔ تحقیق سے ثابت ہے کہ اس وقت انسانی کروموسومز الگ الگ ہوتے ہیں۔ ایکس الگ اور وائی الگ۔ اسی وقت صحت مند بکٹیریا جنم لیتا ہے۔ دہی کے بکٹیریا دہی جماتے ہیں۔ زخموں میں مندمل ہونے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

نیکی اور ذات

یہ مشکل ہے کہ انسان پہلے نیک بنے، اچھا بنے، صالح بنے، پھر ذات کی تلاش کرے اور اس سے ہم آہنگ ہو۔ اس کے معنی پائے۔ ذات کے قریب ہونے سے نیکی، فلاح اور اصلاح حاصل ہوتی ہے۔ نیک ہونے سے ذات کا قرب حاصل نہیں ہوتا۔ اسی لیے شرعی لوگ اچھا، نیک اور صالح ہونے کے باوجود ذات کا قرب حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ جنت کی بھرتی ہوتے ہیں، انسان نہیں ہو پاتے۔

روحانیت

روحانیت ایک ذاتی کھوج کا عمل ہے۔ یہ سوسائٹی کے چلن کا نام نہیں ہے۔ روحانیت احساس کا ایک سمندر ہے۔ فطریں مارتا ہوا سمندر جس میں تم ڈوب جاتے ہو لیکن ہستی اور زیست موجود رہتی ہے۔ یہ موت ہے اور ساتھ ہی رستاخیز بھی ہے۔ جیسے تم تھے وہ تو فوت ہو گئے اور ایک نئے جنم لیا۔

بڑائی اور برتری کی اپنی اپنی قسمیں ہیں۔ جب ہم بڑائی کی سوچتے ہیں تو کچھ حاصل کرنے کے حوالے سے سوچتے ہیں۔ جب انبیاء بڑائی کی سوچتے ہیں تو کچھ عطا کرنے کے حوالے سے سوچتے ہیں۔ جب میں بڑائی کے حصول کی کوشش کرتا ہوں تو نوکر چاکر، خدام ادب اور مال و دولت اور محل ماڑی کو حاصل کرنے کی طرف لپکتا ہوں۔ لیکن جب نبی بنے ہوئے کا اظہار کرتے ہیں تو فرماتے ہیں پیاری بیٹی تو نے نوکر چاکر غلام اور لونڈی لے کر کیا کرنا ہے۔ میں تمہیں ایک ایسا وظیفہ نہ بتا دوں جو تمہیں ہر مشکل پر آسانیاں عطا کرتا رہے!

گوئی نے کہا انسان کی روح بھی سورج کی طرح ہے۔ لگتا ہے کہ غروب ہو گیا لیکن غروب ہوتا نہیں۔

جس انسان روحانی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو میرے مشاہدے کے مطابق اسے ایک عجیب وارادات کا سامنا ہوتا ہے..... سطلی دنیا میں باطن کا سفر طے کرتے ہوئے جب انسان روحانی سر بلندیوں کی طرف بڑھتا ہے تو اس کے دماغی افعال میں نمایاں تبدیلیاں ہونے لگتی ہیں۔ اس کا جسم اور اس کی کارکردگی disturb ہو جاتی ہے اور اسے بہت سی adjustments کرنی پڑتی ہیں۔ میں نے بہت سے سالوں کو قریب سے دیکھا ہے اور ان کے حال کا مطالعہ کیا ہے۔ جن مرد اور عورتوں کو نئے روحانی تجربے کا شدید جھٹکا لگتا ہے تو ان میں Clairvoyance کے واقعات ان کی عقل اور اس کے شعور پر شدت سے وارداتیں کرتے ہیں۔ چونکہ وہ اچانک آتے ہیں اس لیے اپنے ساتھ ناخوشگوار پیغام بھی لاتے ہیں (پھول کھلتے ہیں، بھونڈی تصویریں نظر آتی ہیں مقدس مقامات آشکار ہوتے ہیں۔ جنسی گیت گائے جاتے ہیں)

طاقتور مجلس اپنی عادت کے اعتبار سے اس اچانک اٹھ جانے والے ڈھکنے پر پورا زور ڈال کر اسے بند کرتی ہیں اور اندر کی روشنائیاں جو باطن کے سفر کا نتیجہ ہوتی ہیں بند ڈھکنے کے اندر بھی چرغاں کرتی جاتی ہیں۔ اس سے ایک نہایت کربہ اور مشکوک قسم کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ اس قسم کے روحانی لوگوں پر اور ان کے گرتوتوں پر ہر طرح کی تنقید کرتے ہیں اور ان کا دل کھول کر ٹھنڈا کرتے ہیں..... لیکن اس قسم کی شک انگیز اور کربہ صورتحال سے جو میرا صبر اور استقامت کے ساتھ عہدہ برا ہوا جاسکتا ہے۔ مرشد ایسے ہی مشکل مقامات کے لیے ہوتا ہے۔ وہ اس افتاد کا بھید ہونے کے باعث سب سے زیادہ مدد کر سکتا ہے۔

خدا روح ہے۔ اس نے اپنی روح ہم میں پھونکی ہے۔ ہم کو اس روح کے راستے ہی تلاش کر سکتے اور اسی راہ چل کر اس سے مل سکتے ہیں۔ انسان خدا کو جسمانی اور ذہنی اور عقلی بنیاد پر تلاش نہیں کر سکتا۔ خدا میں اب رہا جاسکتا ہے، مستقبل میں نہیں۔

ایک عجیب بات ہے کہ مادی شعور رکھنے والا اور مادی ذہن رکھنے والا کبھی بھی خدا کی چیزوں سے محبت نہیں کرتا۔ خدا کی چیزیں اور خدا کی باتیں مادی ذہن کے لیے احمقانہ سی چیزیں ہیں، بیکار چیزیں ہیں۔ اس کو خدا کی چیزیں اچلی ٹھکانا کرتیں۔ ایسا شخص اگر نماز پڑھتا ہے یا جمعہ کے خطبے میں بھی جاتا ہے، دوسری مذہبی رسومات ادا کرتا ہے۔ پھر بھی یہ مادی باتیں اس کے اندر روحانی شعور پیدا ہونے کی ترغیب نہیں کرتیں۔

روحانی شعور موسیقی کے ذوق کی طرح پیدا ہوتا ہے۔ پہلے اس کے لیے خواہش ہو، طلب ہو۔ اس کے بعد میرے اور آرام سے بیٹھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اس کے بعد راگ کے بول سنے جائیں اور پھر خود کو مزید برداشت سے آشنا کرنے کے لیے ولہیت کے ساتھ رشتہ استوار کیا جائے۔

روحانی شعور زندگی ہے اور مادی شعور موت ایک ذاتی تجربے کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر انسان سچا ہو اور ایماندار ہو اور خدا کے ساتھ داخل ہوئے آرزو مند ہو تو وہ دست بستہ یہ عرض کر سکتا ہے کہ یا اللہ میں نے قرآن پڑھا ہے اور میں اس کو باقاعدگی سے اپنے مطالعے

میرے خیال میں روحانیت کے بارے میں ایک گہری، مدلل اور تحقیقی گفتگو بھی بڑی توجہ طلب ہو سکتی ہے اور ہم اس سے بہت سی نئی باتیں اور نئی حقیقتیں دریافت کر سکتے ہیں لیکن ایسا ابھی تک ہوا نہیں۔ میرا مطلب ہے پھر پورا انداز میں ایسے نہیں ہوں۔ اکا دکا کا جلیس اور بین الاقوامی سیمینار ضرور ہوئے ہیں لیکن اس کو وسیع و عریض پھیل ہوئی گفتگو پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔

میں رکھتا ہوں لیکن یہ قرآن خوانی جو مجھے بہت عزیز ہے، میرا تجربہ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ فرمایا گیا ہے۔ میرے تجربے سے نہیں گزرتا۔ میں یہ سب کچھ جانتا نہیں ہوں (مانتا ضرور ہوں) کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے اس تجربے سے اور اس مشاہدے سے گزار دیں اور "حصول" کے لیے اور وصول کے لیے میری منزل آسان فرمادیں۔ آپ یقین کریں کہ ایسا کرنے سے اور ایسی مخلصانہ دعا کرنے سے اتنا کچھ مل جاتا ہے کہ آپ اس پر حیران رہ جاتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ آپ کا انعام خدا کی طرف سے ملنا چاہیے، انسان کی طرف سے نہیں۔ اب تک تو یہ حقیقت آپ پر کھل چکی ہوگی کہ اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن صرف اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں جو بوجھا ہے اور جو ماضی میں گزر چکا ہے۔ پولیس نے جو چھاپہ مارا تھا، گجرات میں جو قتل ہوا تھا، بٹش نے جو فوج اتاری تھی، ہندو میں جو گزری تھی، صومالیہ میں جو امریکی مارا گیا تھا، منڈی کا بھاؤ جو گر تھا، حصص کی قیمت جو چڑھی تھی..... ان سب کا خالق ماضی سے ہے۔

میڈیا کے پاس اب تک وہ راز نہیں آیا کہ وہ پوشیدہ خبر دے سکے۔ اس واقعے پر حاوی ہو سکے جو ان پوشیدہ قوتوں کی وجہ سے رونما ہونے والا ہے جس کو "خبر" کا نام دیا جائے گا۔ اس وقت جو کچھ اخبار میں چھپتا ہے اور جو کچھ ریڈیو پر سنا جاتا ہے، وہ جو کھینچنے والے واقعے کی بازگشت ہوتی ہے۔ ان غیر مرئی قوتوں کے واقعات پیدا کرنے کی تفصیل ہوتی ہے جو خبر بنا کر آپ کو پیش کر دی جاتی ہے۔ میڈیا ان غیر مرئی قوتوں سے اور ان پوشیدہ طاقتوں سے واقف نہیں ہے۔

میرے حلقہ کے اور میرے اندازے کے مطابق ان سری طاقتوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دنیا میں امن کو بحال کر دیا جائے۔ اس متفق علیہ فیصلے پر دھنچکا بھی ہو چکے ہیں لیکن کسی انٹرنیشنل ایجنسی یا دنیا کے سب سے بڑے سی این این نے اس کی رپورٹ ابھی تک نہیں کی۔

غیر مرئی قوتوں کا یہ فیصلہ ان دھنچکے آٹار سے واضح ہونے لگا ہے کہ انسان پھر روحانیت کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ اکا دکا..... تنہا تنہا بہت ہی کم، بالکل مبہوم کھنکی کے اندر! لیکن میڈیا اس کی خبر دینے سے قاصر ہے۔ میڈیا ہرگز ایک حواس ذریعہ نہیں ہے۔ اس کی حیثیت تو لکھا تھا نے سے زیادہ نہیں۔ وقوعہ ہو جائے گا تو پرچہ کٹے گا، پرچہ چھپے گا ورنہ کچھ نہیں ہوگا۔

میں تھرڈ ورلڈ کی بات تو کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ ترقی یافتہ دنیا کی بابت یقین سے عرض کر سکتا ہوں کہ دنیا کے مائٹس دنیا کے فلسفہ حتیٰ کہ دنیائے ادب اکیسویں صدی میں روحانیت کی تلاش میں داخل ہو رہی ہے۔

میرے خیال میں روحانیت کے بارے میں ایک گہری، مدلل اور تحقیقی گفتگو بھی بڑی توجہ طلب ہو سکتی ہے اور ہم اس سے بہت سی نئی باتیں اور نئی حقیقتیں دریافت کر سکتے ہیں لیکن ایسا ابھی تک ہوا نہیں۔ میرا مطلب ہے پھر پورا انداز میں ایسے نہیں ہوں۔ اکا دکا کا جلیس اور بین الاقوامی سیمینار ضرور ہوئے ہیں لیکن اس کو وسیع و عریض پھیل ہوئی گفتگو پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔

خدا کا مطلب ہے کہ جو موجود ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ موجود کے اندر ہے بلکہ موجود اس کے اندر ہے، اس کی وجہ سے ہے۔ میں بھی اسی کے اندر ہوں، اس لیے میں اس کو نہ تلاش کر سکتا ہوں اور نہ ہی پکڑ سکتا ہوں۔ ہاں البتہ اس کے اندر گم ہوا جاسکتا ہے اور اس کے اندر گم ہونا اس کو پانا ہے۔ روحانیت کی دنیا میں ہر شخص کو اپنے سر پر سے ادھار لیے ہوئے علم کا گٹھا اتارنا پڑتا ہے اور ہولے ہو کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔

پاکیزگی اور روحانیت کا مطلب ہے اپنے آپ ہونا، اپنے آپ میں ہونا۔ عام طور پر انسان اپنے آپ سے باہر ہوتا ہے۔ ہمیشہ غیر ہوتا ہے۔ کبھی بھی آپ نہیں ہوتا۔ وہ ہر شخص کے ساتھ ہوتا ہے، مگر اپنے ساتھ نہیں ہوتا۔ دیکھئے، میں ایک غلام ہوں۔ باہر سے جو کچھ بھی آتا ہے۔ میں اس سے براہِ یختہ ہو جاتا ہوں۔ باہر سے آنے والی ہر شے میرے اندر کو تبدیل کر دیتی ہے اور مجھے تلاش کرتی ہے۔ اس لحاظ سے میں خود مختار نہیں ہوں، مجبور ہوں۔ اگر باہر کی چیزیں مجھ پر اثر انداز نہ ہوں۔ میں ویسے ہی رہوں جیسا کہ میں ہوں تو پھر مجھ لیجئے کہ مجھ پر علم کے اور آزادی کے دروازے کھلنے لگے ہیں۔ اصل میں خلا کے حصول سے آزادی کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہمیں خلا کا Void کا مشاہدہ بھی کرنا چاہیے اور مطالعہ بھی۔ اگر اندر خلا پیدا کر لیا ہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ باہر آسان ہو گیا، سادہ ہو گیا، اصل میں تہی شدگی اور باقاعدگی ہی منت ہوئے کی نشانی ہے۔

کوشش، بے چینی اور بے اطمینانی کا گھر ہے۔ کوشش کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی شے کی خواہش کی جاری ہے۔ کسی ایسی چیز کی طلب جو موجود نہیں ہے، جو حاضر نہیں ہے۔ اس صورتحال سے پیدا ہوتا ہے اور یاد رکھیے، ہمیشہ تاؤ ہی سے تاؤ پیدا ہوتا ہے۔ بے چینی سے سکون پیدا نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی بے چینی اپنے آپ کو سکون میں تبدیل کر سکتی ہے۔ کچھ نہ کرو، اپنے آپ پر زور نہ دو۔ ہر قسم کی کوشش ترک کر دو لیکن نگہ ہشیار رکھو۔ اچھی طرح سے واضح کرو۔ آہستہ آہستہ ایک ہما شعور پیدا ہونے لگے گا، رائے میں جو شعور پیدا ہوگا، وہ ہی اصل حقیقت سے روشناس کرائے گا۔ اس دنیا میں جو کچھ بھی حاصل کیا جاتا ہے، کوشش اور جدوجہد سے حاصل کیا جاتا ہے۔ کوشش ایک ذریعہ ہے اور انا اس کا مرکز ہے۔ ہر کوشش انا کو مضبوط سے مضبوط تر کرتی چلی جاتی ہے۔ حصول اور یافت سے جو خوشی ملتی ہے، وہ انا کو مضبوط کرنے سے حاصل ہوتی ہے لیکن یہ انا کبھی بھرتی نہیں ہے۔ اس کا بھانڈا ہمیشہ خالی رہتا ہے۔ اس لیے خوشی ہمیشہ دیکھی جاسکتی ہے، حاصل نہیں ہوتی۔

قلب کا تعلق نہ دوستوں سے رکھے نہ دشمنوں سے مگر حقوق سب کے ادا کرے۔

اور بہت دور لوگ بیٹھے ہیں اور بیلوں کی جوڑیاں کھڑی ہیں، ہر طرف سبزہ ہی سبزہ۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرا منتہائے مقصود لذت عیش، انبساط اور حصول زری نہیں ہونا چاہیے زندگی اور صحت ہی نہیں

جس طرح سائنس دان دنیا بھر میں اپنی سوچ پھیلاتے رہتے ہیں اور دنیا بھر کے لوگوں کو، سائنس دانوں سے اور سائنس دانوں سے مکالمہ کرتے رہتے ہیں ایسے ہی ایک ناختم ہونے والا ڈائلاگ روحانیت کے بارے میں بھی ہوتے رہنا چاہیے۔ روحانیت کے ضمن میں ایک عالمی سیمینار اس اکیلے پن کی حیثیت رکھے گا جو اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھاڑ نہیں پھوڑ سکے گا۔

محبت کے بارے میں اب یہ واضح حقیقت عیاں ہو چکی ہے کہ جتنی محبت آپ عطا کریں گے، اسی قدر اس کا خزانہ بڑھتا جائے گا۔ اسی طرح مجھے یقین ہے کہ روحانیت کے بارے میں جس قدر لمبا ڈائلاگ کیا جائے گا، اس کی تعمیل کناروں تک بھرتی جائے گی۔ آپ اپنے دوستوں، اپنے ساتھیوں، اپنے گھر والوں سے روحانیت کے بارے میں جتنے بھی سوال کریں گے، اسی قدر آپ کی معلومات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

اسی طرح جیسے سائنس دان اپنے اپنے ملکوں میں بیٹھے دنیا بھر کے دوسرے سائنس دانوں سے اپنی معلومات کا اشتراک کرتے ہیں اور اس سے ٹیکنالوجی کے علم کے وسعت عطا ہوتی ہے، اسی طرح روحانیت کی سائنس کے اشتراک سے اس علم میں پیش بہا اضافہ ہو سکتا ہے۔

دنیا بھر کی ”پاگلانہ کوششیں“ اور ”دیوانے طرارے“ آخر کو موت کے اندر جا کر مدغم ہو جاتے ہیں۔ یہ موت کیا ہے؟ موت اس بات کا اعلان ہے کہ بس۔ اس سیزمی پر آگے کوئی ڈنڈا نہیں۔ موت زندگی کی بھاگا دوڑی اور رش تک خاتمے کا نام ہے۔ یہ مستقبل کو ختم کرنے والی مہربانی ہے یعنی یہ مزید امکانات کو ہمیشہ کے لیے بند کر دینے کا نام ہے۔ تیز طرار، مشتعل اور مستعد ذہن انسان کو بڑی بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ جیسے راکٹ چلتا ہے۔ کچھ لمبی ہی تیزی انسان میں آ جاتی ہے۔ پھر موت اس کی مدد کرنے کے لیے آگے بڑھتی ہے اور اس تیز طرار، مستعد اور تیز رفتار کو شانت کر دیتی ہے۔

یہ تیزی یہ طراری چاہے دولت کے لیے ہو، چاہے مذہب کے لیے چاہے عیش و عشرت کے لیے چاہے تباہی اور دنیا چھوڑنے کے لیے۔ اصل میں ایک جیسی تیزی ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھو کہ جہاں تیزی ہے، تاؤ لاپن ہے، وہاں خواب ہے۔ خوابوں کے پیچھے ہمیشہ بھاگا جاتا ہے لیکن جہاں پر کوئی تیزی نہیں، کوئی تاؤ لاپن نہیں، وہاں حقیقت ہے، وہاں سچ ہے اور سچ بات تو یہ ہے کہ وہیں زندگی ہے، ایسی زندگی جس کو موت نہیں۔

ایک بات رکھیے کہ اس کو اچھی طرح سے پلے سے باندھ لیجئے کہ روحانیت کا اور سچ کا جواب کبھی بھی باہر سے نہیں ملتا۔ علم باہر کی چیز ہے ہی نہیں اور نہ ہی یہ انفرمیشن ہے۔ یہ آپ پر لا دیا نہیں جاسکتا۔ علم کو ہمیشہ اندر سے نکالنا پڑتا ہے۔ جس طرح ڈول ہمیشہ کنویں کے اندر ڈال کر پانی نکالنا پڑتا ہے لیکن اس میں بھی ایک شرط ہے کہ اندر جانے والا ڈول خالی ہو۔ اگر وہ بھرا ہوا ہوگا تو اس کے اندر پانی نہیں آسکے گا۔

ہونا چاہیے۔ آرام اور سکون ہی نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے اشیاء کی طلب بھی اتنی شدید نہیں ہونی چاہیے۔ خاص طور پر رنگ اور
واش جیسی اشیاء کی بھی طلب نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے ایسا استغراق بھی نہیں ہونا چاہیے جو ہماری مفلسی اور موت میں گمراہی
ہو۔ مجھے تو اس شعور کی ضرورت ہے کہ جو شے مجھے ملے میرے راستے میں آئے، مجھے اتنی سمجھ ہو کہ یہ میرے خدا کی عطا
کردہ ہے، اس کا تحفہ ہے۔ اس کا عطیہ ہے۔ اس طرح میں اس کی عطا کو اور کرمی کو بخشش سمجھ سکوں گا اور اپنے آپ کو ایک
حقیر تحفے کے طور پر پیش کر سکوں گا۔

روحانی سفر میں اور باطن کی مسافرت میں اول اول بہت کچھ سیکھنا پڑتا ہے، سمجھنا پڑتا ہے۔ کچھ ترکیبیں اور عمل
بھی جاننے پڑتے ہیں۔

انسان تحت القدرت ہے، مستقل نہیں ہے (یعنی خدا تعالیٰ کی قدرت کے ماتحت ہے، خود مستقبل نہیں کہ جو
چاہے ہو، جو چاہے نہ ہو) انسان کی ایک مستقل تجویز بھی ضرور ہوتی ہے جسے اس کا ذہن اخراج کر لیتا ہے مگر دیکھا گیا ہے
کہ ہر امر اس کی خواہش کے موافق نہیں ہوتا۔

سرا! آپ یہ بتائیں کہ سو دیکوں حرام ہے؟

بس یہ حکم ہے اور حکم کے لیے کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

لیکن ہم تو کسی بات کی دلیل مانے بغیر اس کی لاجک سمجھ بغیر اسے تسلیم نہیں کریں گے۔

فرمایا: اگر کسی مکان میں علوم جدید کے ماہر اور بڑے بڑے دانشور بیٹھے ہوں اور اونچی اونچی باتیں کر رہے
ہوں اور ایک انجینئر بھاگے بھاگے آئیں اور کہیں فوراً اٹھو بھاگو بھاگو، یہ مکان گرنے والا ہے تو سب اٹھ کر بھاگ
جائیں گے اور ایک شخص بھی دلیل یا Reason نہیں مانگے گا۔ اگر ڈاکٹر کوئی دوا تجویز کر دے، بلا حیل و حجت استمال
کرنا شروع کر دیں گے کہ یہ اس علم کا ماہر ہے لیکن دین کے عالموں کی بات ماننے میں سوسو طرح کے اعتراض کرتے
ہیں، بحثیں نکالتے ہیں۔

شاید: مولویوں کی بات کیسے مان لیں سر، ان میں تو آپس کا اختلاف ہی ختم نہیں ہوتا۔ اب کس کی مانیں، کس
کی نہ مانیں۔

ارشاد: اختلاف کہاں نہیں ہے اور کس میں نہیں ہے۔ وکیل حضرات ایک ہی واقعہ میں ایک دوسرے کے خلاف
ہوتے ہیں اور خوب خوب جھگڑا کرتے ہیں بلکہ ان کے جھگڑا کرنے کو اور اختلاف کرنے کو باقاعدہ کٹہرے بنا کر دیئے
جاتے ہیں۔ جھگڑا کرنے کے لیے پیش کشم کا فرنیچر لگا کر دیا جاتا ہے پکچریوں میں۔ پھر ڈاکٹروں میں اختلاف ہوتا ہے مگر
وہاں کوئی نہیں کہتا کہ ان میں تو اختلاف ہے، ہم کس کا علاج کریں، کس کا نہ کریں۔

جیل: یہ تو ہم نے کبھی سوچا ہی نہ تھا سر۔

شاید: لیکن اس کی وجہ کیا ہے سر؟

ارشاد: وجہ اس کی یہ ہے کہ جو بات کسی کو کرنی ہوتی ہے اور اس کی ضرورت سمجھی جاتی ہے، اس میں خلاف،
بخلاف کی پروا نہیں کی جاتی۔ دین کی چونکہ پروا نہیں اور اس کی قدر نہیں۔ اس لیے حیلے بہانے تلاش کیے جاتے ہیں۔
کھٹوم: شاید اس کی وجہ یہ ہو سر کہ جان زیادہ عزیز ہوتی ہے۔

ارشاد: شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے۔ بات یہ ہے کہ جان جیسی عزیز ہے، اگر ایمان بھی ایسا ہی
عزیز ہو تو علاج کی فکر کی جائے اور اس میں کسی قسم کی بہانے بازی نہ ہو۔

اگر آپ اندر سے نیک اور پاک صاف ہیں تو آپ کے سامنے ساری چیزیں ششے کی طرح واضح اور شفاف
ہوں گی۔ کسی مسئلے کے سمجھنے میں وقت نہیں آئے گی۔ تم ان سب کو بڑی وضاحت کے ساتھ جان جاؤ گے اور تم ان سب کو
سمجھ لو گے۔ ایک پاک صاف دل اندر کی طرف دیکھتا ہے اور بڑی گہرائی کے ساتھ دیکھتا ہے۔

خوشی کی تلاش، خوشی کے معنی۔ اگر آپ کو ایسی خوشی عطا کر دی جائے۔ (کمفرٹ اور خوشی) جتنی خوشی دوسروں
کے ساتھ شیئر کرو گے تم کو اس سے زیادہ ملتی جائے گی (مالع اپنے سطر ہموار کھتے ہیں۔)

ہر تخلیق اپنے نچرل ہونے کی دوبارہ آرزو کرتی ہے یعنی وہ اپنے تخلیق ہونے سے پہلے کے زمانے کی آرزو
کرتی ہے۔ Elements عناصر عدم سے تخلیق ہوئے اور لوٹ کر عدم میں ہی چلے جاتے ہیں۔

تکلیف اور تعب کا کچھ مقصد ہے۔ آفاقی مقصد!

تکلیف اور حزن کے بغیر روح کا بدن سے برآمد ہونا ناممکن ہے۔ جب روح کو بدن سے الگ کیا جائے گا
تکلیف ہوگی، ساری پیدائش تکلیف و عمل سے گزرتی ہے۔

ذہن انسانی اپنے جود کی وجہ سے اور اپنی آلکسی کی بدولت سوچنے سے نفور کرتا ہے۔ اس کی خواہش ہی نہیں
رہتی کہ سوچے یا غور کرے۔ یہ اپنے آپ کو منظم کرنے کا بھی خواہشمند نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کی آرزو ہوتی ہے کہ کوئی اس کی
تنظیم کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں بہت تھوڑی تعداد میں نصرم اور ناظم ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں کلرک اور خوشی
ہیں۔ ہزاروں ڈاکٹروں کے درمیان ایک صادق ڈاکٹر اور سینکڑوں وکیلوں اور سیاستدانوں کے درمیان ایک صاحب نظر
منظر ہوتا ہے۔ اصل میں ہیومن مائنڈ کسی بھی صورت میں ڈیپلن ہونا نہیں چاہتا۔ بس ایسے ہی آوارہ گردی کرتے رہنے کو

اور بے راہ روی کو پسند کرتا ہے۔ کم بہتی، کم صحتی اور کم دولتی ہماری راہ کے بڑے پتھر ہیں۔ ہم آگے بڑھتے ہیں اور پھر پیچھے لڑھک جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایک عجیب شاخسانہ ہوتا ہے۔ انسانی زندگی بھی عجیب ہے۔ اس میں کبھی کبھی کم بہتی اور کم صحتی اور کم دولتی ہماری راہ کے بڑے پتھر نہیں ہوتے بلکہ کبھی کبھی اچھی صحت، اعلیٰ ماحول اور دولت مندی ہماری ذوالجانی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی مشکل بن جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اچھی صحت اور دولت کی فراوانی اور دور تک پھیلی آسائش خدا کے بغیر بڑی اچھی زندگی گزارنے لگتی ہے اور یہ زندگی بڑی خوبی کے ساتھ گزرتی جاتی ہے تا آنکہ اس میں کوئی عجیب ساموہ نہیں آ جاتا۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ باطن کے راستے کے لیے انسان کو کتنا راستہ چننے۔ بہت اعلیٰ درجے کا فلسفیانہ تعلیم والا راستہ بھی چنا جاسکتا ہے اور سیدھا سادا ایک پریمی قسم کا راستہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ خدا کے بارے میں باتیں بھی ہو سکتی ہیں اور خدا کے بارے میں غور بھی کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے خدا ہمارے مشاہدے میں نہیں آتا۔

علمی پلندے ہوں۔ جو کچھ ہمارے لیے ہوگا روحانیت کے تحت پر آرام دہ صورت میں ہوگا اور اس آرام کی حالت میں ملے گا۔ وہ کچھ ایسا ہوگا کہ ہم کو تجربہ بات کے نئے راستوں سے گزارے گا اور وہ کچھ یوں زندہ بھی ہوگا، مستعد بھی اور چوکس ہو کر بھی ہمارے تجربے اور مشاہدے سے گزرتا جائے گا۔ آرام کرو، قناعت کرو۔ Relax کرو اور پھر دیکھو کہ یہ وہی غیر مرئی ہے جو مختلف مظاہر میں جلوہ گر ہو رہا ہے نظر آنے لگا ہے۔

جب زندگی کی اعلیٰ اور عمدہ چیزوں کے لیے ذہنی اور جسمانی کوشش ترک کر دی جاتی ہے تو تمام اچھی اچھی اور مرغوب اشیاء قدرتی طور پر اپنی اپنی آغوش کھول کر آپ کے وجود سے پلٹنا شروع کر دیتی ہے۔

ایک بات یاد رکھنا کہ مسئلہ سے مسئلہ کا علاج نہیں کیا جاسکتا یا ہونے سے یا حصول سے نہ ہونے کی کاٹ نہیں کی جاسکتی۔ صحت کی زد آگے بڑھا کر بیماری کی کاٹ نہیں کی جاسکتی۔ دولت سے یا روپے سے بہتات حاصل نہیں ہو سکتی۔ دوستوں سے یا شادی سے رفاقت حاصل نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ اللہ کے فضل سے اور اللہ کے خیال سے اور اللہ کی طرف رجوع کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ انسان بیمار ہو مرنے کے اوپر شبت کا پلٹر لگا لگا کر اور اپنے موکے بند کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور وہ بند نہیں ہوتے۔ یہ ظاہر کے انعام اور ظاہر کی چیزیں پھل پھول اور غنچے شگوفے ہیں جو غیر مرئی قوتِ نموسے وجود میں آتے ہیں۔ جب تک اس وقت کی طرف توجہ نہیں ہوگی، زبردستی کے پھل پھول غنچے، شگوفے کاغذ کے پھولوں کی طرح ہوں گے۔

زندگی کی طرف آپ دو طرح سے پیش قدمی کر سکتے ہیں۔ ایک تو آپ اصول کے اندر اور قانون کے اندر رہ کر اور دوسرے فضل کے اندر grace کا سہارا پکڑ کر۔

مادی زندگی کے زور پر زندگی گزارنے میں بڑا زور لگتا ہے اور بسا اوقات زندگی ناخوشگوار کی ساتھ گزرتی

1- اللہ کی عطا ہر حال میں اور ہر صورت میں علم اور حکمت سے ہوتی ہے۔ تنگ وہ کرتا ہے جو خود تنگ ہو۔ جس کی ذات میں یہ حقیقت رچ بس جائے کہ اللہ تعالیٰ امتیاز سے پاک ہے اور اس کی ہر بات میں علم و حکمت ہے، اس کا مخلوق سے جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔

2- ایک ہی معیار اخلاق سامنے ہو تو یکسوئی کی نعمت عطا ہوتی ہے۔ ہر ایک جگہ سے اخلاق کے نمونے اکٹھے کرتے پھرنا اور پھر ان کی ترتیب و تدوین میں لگے رہنے سے بے چینی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

3- مخلصین کا ساتھ وہی رکھ سکتا ہے جس کی اپنی کوئی مرضی نہ ہو۔ مخلصین وہ ہوتے ہیں جن پر شیطان کا اغوا ممکن نہیں یعنی جن کو شیطان بہکا نہیں سکتا۔ ان کا کوئی کام اپنی خواہش سے نہیں ہوتا جو بھی کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے لیے کرتے ہیں۔ لوگوں کی تعریف یا ان کی تنقید کی مخلصین کو پروا نہیں ہوتی۔

4- جب خیر پر خرچ نہ کیا جائے گا تو خیر پر ضرور ہوگا اور اس کا حاصل ہلاکت ہوگا۔ خیر پر خرچ کرنے کی پہچان یہ ہے کہ اس راہ میں خرچ کر کے نفس کو خوشی نہ ہو۔ خرچ کرتے وقت صرف اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی مطلوب ہو۔

5- امتیازات تلاش کرتے رہنا جماعت کے ساتھ رہنے میں اور جماعت کو ساتھ رکھنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس سے جماعت کا رخ پیدا نہیں ہوتا۔

امتیازات یہ ہیں کہ ہر وقت کو الٹی فیکشن اور حسب نسب اور اپنی خوبیاں واضح طور پر یا مبہم طریق سے اجاگر کرتے رہنا۔ جب یہ عمل ہوگا تو جماعت کے لوگ خوفزدہ ہو کر دور ہوتے جائیں گے۔ اگر کوئی اور شخص امتیاز عطا کرے تو اسے بسم اللہ کر کے قبول کر لینا چاہیے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امتیاز عطا فرماتے تھے تو وہ شخص باعزت ہو جاتا تھا جو شخص ہر وقت اپنے لیے امتیاز تلاش کرتا رہے، اس سے ملنے والا اپنے آپ کو بے عزت محسوس کرتا ہے۔

6- جسے معاف کیا جائے اسے آسانی عطا کرنا بھی بہت ضروری ہے۔

7- جو صرف عطا سے چٹ جائے اور معطلی کی معیت کو چھوڑ دے، فنا اس کا احاطہ کر لیتی ہے۔

معلوم ہوگا کہ اس کردار پر جتنے بھی عمل ہوتے ہیں، وہ سب ذکر کے اور اظہار کے اور گفتار کے مرہون منت ہیں۔

1- اخباروں میں جتنے بھی خطوط ایڈیٹر کے نام شائع ہوتے ہیں، وہ سب گفتگو پر، اظہار پر، الفاظ پر اور بیان پر

جنی ہوتے ہیں۔ گویا ان میں ذکر کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔

2- دیواروں پر پوسٹر، سڑک کنارے بورڈنگ، اخباروں کے کالم، لیڈروں کے بیان، مقررہ کی تقریریں، مولویوں کے وعظ وغیرہ یہ سب الفاظ ہی ہوتے ہیں اور ذکر اذکار کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ عمل ان کے مقابلے میں معمولی اور بے معنی ہوتا ہے کہ وہ گفتار کے منبع سے صورت پذیر ہوتا ہے۔

3- احتجاج الفاظ کے فریم ورک میں متعید ہوتا ہے۔

4- نعرے مارتے انقلابی الفاظ کے نعرے مارتے ہیں اور لفظوں میں اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں۔

5- خاموش walk کرنے والے اپنے احتجاجی بورڈ اٹھا کر ذکر کرتے چلتے ہیں۔

6- جو لوگ دھرتا دے کر بیٹھ جاتے ہیں، وہ بھی ذکر کرتے ہیں لیکن ان کا ذکر، ذکر خفی ہوتا ہے۔

7- مرن برت والوں کے پیچھے بھی ایک ذکر ہوتا ہے اور وہ ذکر خفی لکھی ہوتا ہے۔

8- اصل میں دیکھا جائے تو ذکر ہی عمل ہے اور ذکر ہی ارتکاب عمل ہے۔ جو عمل ذکر کے بغیر ہو اور جس کے پیچھے

اس کا اقرار اعلان نہ ہو، وہ عمل بے معنی، رائیگاں اور بدبختی پر مبنی ہوتا ہے۔

9- گفتار کی بڑی اہمیت ہے بلکہ گفتار ہی اہم ہے۔ الفاظ کے اندر ہی خیر اور شر کی قوتیں پنہاں ہوتی ہیں۔

الفاظ کو آپ جہاں بخش، لائف سیونگ گولیوں کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں اور الفاظ ہی کو آپ کلاشکوف کی گولیوں کے طور پر استعمال میں لا سکتے ہیں۔ گفتار میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اور گفتار کا Volume ذکر سے سیٹ کیا جاتا ہے۔

گوئیے کا عمل کتنا بھی ارفع کیوں نہ ہو، اس کے پیچھے چونکہ کسی دستور کا اعلان نہیں ہوتا، اس لیے وہ عمل محل نظر ہو جاتا ہے۔

ہر عمل بھی عمل نہیں ہوتا..... ہم اکثر ”رولنے“ کو ہی عمل سمجھ لیتے ہیں۔

لیکن جہاں مولا نہیں، وہاں رولا ہے۔ رولا عمل نہیں، رولا ذکر نہیں، رولا درد نہیں، رولا بس رولا ہی ہے۔ منڈی میں رولا ہے، بازار میں رولا ہے، مجمع میں رولا ہے۔ شاہ مارکیٹ میں رولا ہے، بی بی سی میں رولا ہے، ورلڈ فورم میں رولا ہے، ٹاک شو میں رولا ہے..... اور جہاں مولا نہیں وہاں رولا نہیں۔ بس رولا ہی رولا ہے۔

اس لیے بزرگان دین ذکر کی تلقین کرتے ہیں تاکہ انسان رولے سے ٹوٹ کر مولا سے لگ جائے۔

انسان اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہتا ہے لیکن مجبور ہے۔ معجزات کی دنیا میں سائنس کا آدی رہنے پر مجبور ہے۔

اس کو یقین آئی نہیں سکتا۔ (1) وہ کہتا ہے ایسے تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ انسان کے ذہن کی پیداوار ہے اور اس کے متحکیم کا ایک حصہ ہے۔ (2) دوسرے کچھ واقعہ گزرا اور دیکھنے والا چونکہ ناقص تھا۔ تربیت یافتہ نہیں تھا، اس لیے معجزہ نہیں سمجھا کیونکہ اس کے پاس وافر علم نہیں تھا۔ (3) لوگوں کے درمیان بات چلتی چلتی اور وقت گزرنے پر شکلیں بدلتی بدلتی حقیقت سے معجزے

روپ دھار گئی۔

موسیٰ ایک ماہر جغرافیہ دان تھے۔ ان کو پتہ تھا کہ جوار بھانا کے دوران سمندر کا پانی کب بالکل نیچے ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوم کو آسانی سے لے کر نکل گئے اور فرعون جغرافیہ نہ جاننے کی وجہ سے ڈوب گیا۔

یہ سچ نہیں ہے کہ مولوی نے ڈراڈرا کر لوگوں کو خوفزدہ کر کے گناہ کی طرف دھکیل دیا اور ان کے اندر جرم کا اور

تصور کا تصور پیدا کر دیا اور اس تصور سے خود فائدہ اٹھایا کہ ان کا لیڈر بن کر بیٹھ گیا۔ یہ بات نہیں، گناہ کا تصور انسان کے

اندر reflexine کی صورت میں ہے۔ انسان کے اندرونی توازن میں جب بے وزنی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب اس کے

اندر عزت نفس کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ خدا سے بیگانگی پیدا ہوتی ہے، علیحدگی پیدا ہوتی ہے تو وہ گناہ کا شکار ہو جاتا ہے۔

مولوی کے خوف دلائے بغیر اس کے جملے کے سبے بغیر۔۔۔۔۔۔ (گناہ) انسانی خمیر کے تانے بانے اور اسی کے تار و پود کا ایک

حصہ ہے۔ گناہ مذہب نے ایجاد نہیں کیا۔ یہ اس نے دریافت کیا ہے اور اس کے اثرات کا انسان کے وجود پر جس جس

طرح کا بوجھ پڑتا ہے۔ اس کا مطالعہ کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جس کے خلاف گناہ کیا ہے۔ اس کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ (اس

کا علاج جیسا کہ دنیا نے اعتراف میں ڈھونڈا ہے۔

ہر چیز ایک سی ہے اور ہر چیز مختلف ہے۔ تمام انسانوں میں انسانیت کا جزو Common ہے، پھر بھی ہر شخص

مختلف ہے۔ اسی طرح تمام مذاہب ایک سے ہو کر بھی جدا جدا ہیں۔

ایٹم کے اسی دور میں ہم انسان کے بارے میں بڑی وسعت نظری کے ساتھ سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم

دیکھ رہے ہیں کہ دنیا بھر میں انسانوں کے احساسات، جذبات، معاملات ایک جیسے ہیں اور ان کے مسائل، ان کے تقاضے،

ان کے خوف اور ان کی خواہش بھی ایک طرح کی ہیں۔ ان سب کی امیدیں بھی ایک جیسی ہیں۔ سب کے سب انسان ہیں

اور انسان کی وسیع برادری سے تعلق رکھتے ہیں لیکن آپ سے کبھی بھی کسی انسان کا تعارف یہ کہہ کر نہیں کرایا جاتا کہ ان سے

طبلے، یا ایک انسان ہیں بلکہ انہیں مصری، یونانی، اٹالوی، الہابی، امریکی اور انگلستانی کہہ کر بتایا جاتا ہے۔

قوالی کے اندر کوئی ساز طبلے کی جگہ نہیں لے سکتا اور ہارمونیم گھڑے کا خلا پر نہیں کر سکتا۔ اسی طرح خنجری،

ڈھولک اور کھرتالیں اپنے اپنے مقام پر پہنچتی ہیں لیکن ساری کی ساری ایک ہی دھن بجا رہی ہوتی ہیں۔ ایک ہی لے جاری

ہوتی ہے اور ایک ہی استاد کے آگے جھکی جا رہی ہوتی ہیں۔

یہ دنیا کیسے معرض وجود میں آئی کیونکہ بنی۔ کس ترتیب سے اس پر ساری چیزیں آتی گئی اور بنی گئیں۔ شاید پہلے

دن اور رات بنے، تاہم ہوا، پھر آسمان، زمین اور سمندر گھاس، سورج، چاند ستارے سمندروں کے اندر جھپٹی، پھر دوناتگوں،

چارناگوں والے زمینی جانور اور ان کے ساتھ پیٹ کے بل رہنے والے جانور اور آخر میں انسان۔

لیکن دنیا کے سارے جانوروں میں ساری مخلوق میں انسان ہی ایک ایسا جاندار کیوں ہے جو اپنے خون اور

پیشے کی کمائی سے اور اپنی دن رات کی محنت سے ایک وقت کی روٹی کھاتا ہے۔ دوسرے جانور ایسا نہیں کرتے، مزے سے

کھاتے پیتے ہیں، چرتے چلتے ہیں، کوئی فکر نہیں، فاقہ نہیں، طعنہ نہیں، الہا نہیں..... بزرگوں نے اس کے کئی جواب دیے

لیکن کوئی دل کو نہیں لگتا، تسلی نہیں کرتا۔

سچ کے لیے اور حق کے لیے انسان کی تلاش جاری ہے۔ انسان زمانہ قدیم سے سوال پوچھتا آیا ہے اور اب تک پوچھ رہا ہے۔ ایک نسل کی سائنس دوسری آنے والی نسل کا تو ہم بن جاتی ہے۔ دوسری پود کے لیے ارتقا بن جاتی ہے۔ انسان کی یہ تلاش بڑی بوجھل، تکلیف دہ اور تھکانے والی بن جاتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ بڑی پرشکوہ، شاعرانہ Glorious ہفت خواں بھی ہوتی ہے۔

تصوف

فوری علاج

- 1- اندھا جذبہ کیا ہوتا ہے، تیز طرار غصے میں بھرا ہوا؟
اندھا جذبہ ایک ایسی حدت ہوتی ہے جس میں روشنی نہیں ہوتی۔ اس حدت سے فائدہ اٹھانے کے لیے عقل کی چھوٹی سی موسم بنی جلا کر ضرور دیکھ لو۔
- 2- آپ نے کہا تھا کہ ہم مضطرب محسوسات کو ٹپ بھی دے سکتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے؟
جوتھے آپ کو خوفزدہ کر رہی ہے اگر آپ بہت دیر تک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے ہو جائیں تو تھوڑی دیر بعد وہ خود خوفزدہ ہو کر بھاگ جائے گی۔
- 3- اپنے تصورات اور خیالات کی پڑتال کس طرح سے کر سکتے ہیں کہ وہ ٹھیک بھی ہیں یا نہیں؟
دیکھیں کہ کیا آپ کے خیالات نے اور آپ کے فلسفے نے آپ میں کوئی تبدیلی پیدا کی۔ اگر نہیں کی تو اپنا فلسفہ تبدیل کر دیں۔
- 4- اصلی مضبوطی کس طرح سے حاصل ہوتی ہے اور کب حاصل ہوتی ہے؟
آپ اس وقت پورے طور پر مضبوط ہوتے ہیں جب آپ میں کوئی خفی تصور یا منفی جذبہ نہیں ہوتا۔
- 5- اپنے مسائل حل کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے؟
سری فلسفے میں ”خود صحت یا نگلی“ پر وقت کا تصرف نہیں ہوتا۔ صحت یا بلی فوری طور پر ہوتی ہے۔ جب بات سمجھ میں آگئی اسی وقت صحت ہوگئی۔

بیش بہانہ

خود بیداری اور خود نگہداری کے لیے آج آپ کو ایک لقمان حکیم جیسا نسخہ عطا کرتے ہیں۔ ذرا غور سے سننا اور پھر ضرور استعمال کرنا:
آج کے بعد سے لوگ آپ کے ساتھ جو بھی سلوک کریں یا آپ کے ساتھ جو بھی رویہ اختیار کریں یا آپ کے

بارے میں جو بھی کہیں ان کو ایسا کرنے دیں اور ان کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ ان کے رویے اور ان کی طبع میں نہ تو کوئی تبدیلی پیدا کریں اور نہ ہی کسی طرح سے ان پر اثر انداز ہوں..... نہ ہی ان کے کہنے اور کرنے پر ناخوشی کا اظہار کریں نہ ہی نفیریں کریں اور نہ ہی اس کا تذکرہ اور اس سے کریں اس موضوع پر زبان ہی نہ کھولیں۔

اب یہ سب کیا ہے اور ایسا کیوں کیا جائے؟ آزادی کے لیے شخصی آزادی کے لیے اور ذاتی خوشی کے لیے..... یہ ان کے عمل نہیں ہیں جو ہم کو مضطرب کرتے ہیں اور ہمیں وسوسوں میں گھیرتے ہیں بلکہ یہ ہماری اپنی غیر محفوظیت کا خوف ہوتا ہے۔ Insecurity کا اندیشہ ہوتا ہے اور اس بات کی طلب ہوتی ہے کہ وہ لوگ ہم کو حفاظت میں رکھیں اور سکون میں رکھیں اور جو کام ہم کر رہے ہیں اسے آرام سے کرنے دیں۔

تو جناب! ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ فرد خود میں تبدیلی پیدا کرے نہ کہ اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں میں تبدیلیاں پیدا کرتا پھرے اور ان کے دروازوں پر جا کر دیکھے مارتا پھرے۔

جب تم لوگوں کو اپنی من مانی کرنے دو (اور ایسا وہ ہر حال میں کریں گے) اور ان کی راہ کی رکاوٹ نہ بنو تو تمہارے اندر ایک حیرت انگیز تبدیلی رونما ہوگی۔ آپ پہلی مرتبہ دیکھیں گے کہ ان کے رویے پر آپ کا افسوس یا ان کے رویے پر آپ کی سرزنش ہی آپ کی بے چینی اور تردد کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ ان کو آپ کی بے چینی یا تردد سے کوئی واسطہ نہیں ہے وہ اس کی بنیاد نہیں ہیں۔

اس عمل کو بزرگان دین تلاوت وجود کے نام سے پکارتے ہیں اور اس کو وہ ارفع خود شناسی اور خود عملی کا نام دیتے ہیں۔

تلاوت وجود

”پچھلے دنوں تم نے کیا پڑھا؟“

”ایک دینی کتاب۔“

”اور تم نے بھی؟“

”ایک فلسفے کی کتاب۔“

”اور تم نے کیا پڑھا؟“

”میں نے اپنے آپ کو پڑھا۔ اپنے وجود کی تلاوت کی۔“

”شاباش! تم نے منزل کی طرف جانے کے لیے سیدھا قدم اٹھایا۔ اب اس تلاوت وجود کا سلسلہ ختم نہ کرنا۔“

گھونے

”اس دنیا میں سارے گھونے بھی کو کیوں گلتے ہیں؟“

اس لیے کہ آپ گھونسوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ ہم کو وہی کچھ نصیب ہوتا ہے جس دنیا میں ہم آباد

ہیں۔ بزرگان دین کہتے ہیں کہ جب تک آپ ذہنی نقل مکانی نہیں کریں گے یہ گھونے آپ کو اسی طرح گلتے رہیں گے۔

آپ کے اندر ایک کشش ہے اور وہ ایسی چیزوں کو آپ کی طرف کھینچتی ہے جس کی اس کو چاہت ہوتی ہے۔ مثل ہے مثل کو کھینچتی ہے..... یہ قدرت کا ایک اصول ہے۔ شیر شیروں کے ساتھ مل کر رہنا پسند کرتے ہیں اور گیدڑ گیدڑوں کے ساتھ۔ اگر آپ اپنے آپ کو تبدیل کر لیں گے تو آپ کی کشش دوسری قسم کی مطلوبات کو کھینچنے لگے گی اور تبدیلی کے لیے وہی میل ہے جس کا بار بار ذکر ہوا ہے کہ اس نیچر کو ڈھونڈو جو تمہاری اصل نیچر ہے۔ وہ نہیں جس کا آپ نے لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔

بد قسمتی کا خاتمہ

بہت سے لوگ ہر وقت مصیبت میں گھرے رہتے ہیں خاص طور پر لوگوں کے ساتھ ان کے معاملات بری طرح سے بھٹ جاتے ہیں۔ ہم کو کیا معائنہ کرنا چاہئے۔

آپ دیکھیں گے کہ آپ کے بہت سے مسائل غلط قسم کے لوگوں کے ساتھ رابطہ رکھنے کی وجہ سے ہیں۔ پھر آپ کو ایک اور تکلیف دہ حقیقت کا سامنا بھی کرنا ہوگا کہ آپ کے اندر کچھ غلط قسم کی چیز ہے جو غلط قسم کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اب یہ وہ سخت مقام ہے جہاں آپ کو ایمانداری کے ساتھ نشتر زنی کرنی ہے اور اپنی ذات کی روایت رکھ کر بغیر جھجھکے اپنی حقیقت کرنی ہے۔

جس بد قسمتی کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے پھر وہ بد قسمتی نہیں رہتی۔ وہ اپنا آپ دوہراتی نہیں۔ جب مسئلہ اچھی طرح سے سمجھ میں آ جاتا ہے تو اس کا موٹن ٹوٹ جاتا ہے حرکت بند ہو جاتی ہے اور جب حرکت بند ہو جائے تو مسئلہ Stop ہو جاتا ہے ختم ہو جاتا ہے۔ روحانی راستے کی سب سے بڑی منزل یہی ہے کہ اپنے آپ کو خود آزاری سے بچایا جائے۔ اب یہ راز معلوم ہو جاتا ہے اور اس پر عمل شروع ہو جاتا ہے تو آدمی بہت ہی افسوس کرتا ہے کہ کاش! یہ بات پہلے معلوم ہو جاتی اور جو نقصان ماضی میں اٹھائے تھے وہ نہ اٹھانا پڑتے۔

ہٹل

عام طور پر ایک شخص کے پاس اپنے عمل کی ایک لمبی فہرست ہوتی ہے۔ وہ بہت کچھ کرنے اور کر گزرنے کا خواہشمند ہوتا ہے لیکن اس ظالم کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کچھ نہ کرنا بھی عمل ہی کی ایک صورت ہے..... سڑی رمز کے طور پر کچھ نہ کرنا بھی سب سے بڑا تخلیقی عمل ہے۔

کیا آپ نے بھی اس پر غور کیا کہ جو شخص زور لگائے اور دھوس مارے بغیر اپنے دن میں داخل ہوتا ہے وہ کس خوش اسلوبی سے سارے کام سرانجام دیتا ہے۔ زور لگانے اور زور آزمائی کرنے سے بڑی اثر چنیں پیدا ہوتی ہیں اور ہر کام میں بڑی طاقت صرف ہوتی ہے..... ہم کو اس شعور اور ہوشمندی کی ضرورت ہے کہ جانیں کہ ہم جو کام زور لگا کر کرتے ہیں

وہ ہمارے لیے ایک اور زنجیر بن جاتا ہے۔
ناہل میں داخل ہو کر کام کرو۔

قانون قدرت: مکافات

سری رمز کے ایک اصول پر نگاہ ڈال کر دیکھئے کہ جو کچھ تم کسی اور کے لیے چاہتے ہو وہی تم اپنے لیے چاہئے ہو۔ یہ اصول ہر شخص پر ہر وقت اور ہر مقام پر لاگو ہے اور کوئی اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتا۔
فرض کیجئے راشدہ کو روحی سے کوئی تکلیف پہنچی اور اس کا دل دکھ سے بھر گیا تو اس نے رومی سے بدلہ لینے کے لیے اُسے بدعائنیں دیں اور اس کا برا چاہا تا کہ اس کے ذہن کو کچھ تو سکون پہنچے۔ اب جب راشدہ نے رومی کا برا چاہا اور اس کو بدعائنیں دیں تو پتہ چلا کہ راشدہ بد دعا کے اور برائی کے شعور ہاؤس میں رہائش پذیر ہے جہاں سے اس کو بد دعا کی کھلی سپلائی مل رہی ہے اور منت مل رہی ہے۔ اب جب بھی راشدہ بد دعا کے پیکٹ تیار کرتی ہے تو اس کے گھر میں بھی ایک فیکٹری کھل جاتی ہے جہاں سپلائی کے لیے مال تیار ہو رہا ہے۔ اب راشدہ اپنی ہی خواہش ہے اور اپنی ہی سزا ہے۔
اس سزا سے نکلنے کے لیے سری قانون کو اچھی طرح سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

مراقبہ

معمولی سوچ معاملات کا حل تلاش نہیں کر سکتی بلکہ معمولی سوچ ہی معاملات اور پیچیدگیاں پیدا کرنے والی ہوتی ہے۔ ایک کبوتر باز کبھی بھی کسی مٹی کو اپنے کبوتروں کی حفاظت پر مامور نہیں کرتا۔
ہر شخص میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ معمولی سوچ سے کنارہ کر کے گہری سوچ کو اپنائے اور اس میں مہارت حاصل کرے۔

اس کو اس طرح سے شروع کیا جاسکتا ہے کہ آپ خاموشی سے اپنے کمرے کے ایک گوشے میں اپنے ساتھ بیٹھیں۔ اپنے ذہن کے ساتھ کوئی ورزش نہ کریں۔ صرف اس کا مشاہدہ کریں کہ یہ کدھر کدھر جاتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ اپنے خیالات کو ابھرتے اور پھر ناپید ہوتے دیکھیں اور دیکھتے جائیں۔ اول اول یہ مشکل بھی ہوگا اور عجیب بھی لگے گا۔ لیکن اپنی کوشش ترک نہ کریں۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ آپ اپنے خیال کی پہلی رو کو پکڑ لیں گے۔ یہ معمولی رو نہیں ہوتی۔ یہ پرسکون ذہن ہوتا ہے جو آپ کے سارے الجھاؤ کو سلجھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

بصیرت کے اصول

دیکھیں کہ ناامیدی اور محروم سازی آپ کو آزادی اور فارغ البالی کی طرف لے جانے کی طاقت رکھتی ہے یا وہی کی طرف نہیں۔

دیکھیں کہ آپ بے معنی خدشات اور بے بنیاد مفروضوں کے بجائے طاقتور حقائق سے روشناس ہو سکتے ہیں۔
دیکھیں کہ کسی دوسرے آدمی کے لیے باہما حظہ اور Considerate ہونے کے لیے آپ اس کے معاملات میں دخل تو نہیں دے رہے۔

دیکھیں کہ آپ احمق اور غرض مند لوگوں کی خوشامد اور مدح سرائی سے متاثر تو نہیں ہو رہے۔
دیکھیں کہ ایک مختلف قسم کا انسان ہی دوسرے مختلف قسم کے لوگوں کو جان اور پہچان سکتا ہے۔
دیکھیں کہ دوسرے لوگوں نے اپنے آپ پر جو خول چڑھا رکھے ہیں کیا آپ ان کے اندر کے انسان کو پہچان رہے ہیں۔
دیکھیں کہ آپ نے یہ فن سیکھ لیا ہے کہ اپنے آپ کے ساتھ کس طرح سے خوش ہو کر رہا جاتا ہے۔

ہم کو التاء کس طرح سے حاصل ہو سکتا ہے؟
جب آپ کی ظاہر صورت اور اصل صورت میں مطابقت پیدا ہو جائے یعنی جیسے اندر ہیں ویسے ہی باہر ہو جائیں۔

مضامین

جب ہماری زندگی ”بے حقیقتی“ کی خوراک پر پرورش پائے گی تو ہمیشہ بھوکے رہے گی اور بالآخر اس گرسنگی کے انہوں موت کی آغوش میں چلی جائے گی۔
وہ موت جس کی راہ سے ہم زندگی میں داخل ہوتے ہیں کوئی حقیقت سے فرار نہیں۔ کوئی فرار کی راہ نہیں بلکہ فوٹل حقیقت کی طرف ایک واضح ”کوٹھ منٹ“ ہے۔ اس کی ابتدا۔

جب ہم زندگی کی (مادی) اشیاء کو اصل سمجھ کر انہیں اپنانے میں تگ و دو کرتے ہیں اور ان کے عشق میں مرتے ہیں تو ہم کو گہرے مطالعے کے بعد اور معروضی مشاہدے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یہ اشیاء تو بے معنی لائے یعنی اور بے حقیقت ہیں۔ ان میں متفرق ہونا نہ صرف صحت روحانی کے لیے مضر ہے بلکہ صحت جسمانی کے لیے بھی بے حد غیر مفید ہے۔ لیکن ان کو بے معنی اور بے حقیقت سمجھنے کے لیے ان اشیاء کو ذرا دور رکھ کر اور خود پرے کھڑے ہو کر ان کا مشاہدہ کرنا ضروری ہے اور یہ دور رکھنا اور پرے ہو کر مشاہدہ کرنا اس بات کا متقاضی ہے کہ ان اشیاء کو اپنی زندگی سے نکال کر دیکھا جائے۔ اگر مستقلاً نگاہ تو تھوڑے وقت کے لیے عارضی طور پر چند ایام کے لیے محض مطالعے اور مشاہدے کی خاطر صرف پڑنا ل کے لیے۔

ریگستانی درویش بتاتا ہے کہ اللہ کریم نے اپنی مہربانی سے دیرانے کو اس لیے تخلیق کیا کہ یہ دیرانہ خدا کے نزدیک محترم ہے کہ اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور اس کی کوئی اہمیت نہیں (زرنیز اور سرسبز زیتون کے مقابلے میں جس کے لیے جنگیں اور خونریزیاں ہوتی ہیں جن کو سونے کی چڑیا کہا جاتا ہے) خرابے اور ویران زمین انسان کے لیے تاراج نہیں

سے اس طرح سے بندھی ہوئی ہے کہ اس وقت تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا جب تک آپ کو ساری صورتحال اور پورے کاہل کا علم نہ ہو۔

فتویٰ دینا یا فیصلہ دینا اس لیے بھی مسخر ہے کہ آپ نے کوئی فیصلہ دیا، آپ سکر گئے، اندر بھی اور باہر بھی۔ آپ رک گئے، سناپ ہو گئے۔ آپ نے کہہ دیا کہ بس یہ آخری اور حتمی بات ہے، اس سے آگے کچھ نہیں۔

تصوف

”من چلے کا سودا“ ایک گیت

تم اپنی مسجد کو جاؤ

اور میں اپنی مسجد جاتا ہوں

پر ساتھ چلیں گے ہم دونوں

مغرب کا وقت ہے

اور ٹائم کم رہ گیا ہے

ہماری مسجد میں ہمارے باپ دادا نے بنائی تھیں اور ساتھ ساتھ بنائی تھیں

تم اپنی مسجد کو جاؤ

اور میں اپنی مسجد کو جاؤں گا

لیکن ہم ساتھ ساتھ جائیں گے، اکٹھے جائیں گے

ہم دونوں کا ایک خدا ہے

ایک رسول ہے، ایک قرآن ہے

اس لیے ہم اکٹھے چلیں گے

ساتھ ساتھ چلیں گے

درویشیہ پڑھتے چلیں گے

تمہاری مسجد کا مؤذن بڑا سریلا ہے

مجھے اپنے گھر بھی اس کی آواز سنائی دیتی ہے

لیکن ہمارے مؤذن کی اذان بھی دور دور تک پہنچتی ہے

اور جب یہ دونوں اذانیں مل جاتی ہیں تو

سارا شہر ایک میٹھی گونج میں ڈوب جاتا ہے

اس وقت یہی گونج ابھر رہی ہے

آؤ اپنی اپنی مسجد کو چلیں

جو ہمارے باپ دادا نے بنائی ہیں

لیکن ہم ساتھ ساتھ چلیں گے اور اکٹھے ہی جائیں گے

چلو جلدی کرو، جوتا پہنو، چھتری تھامو

اذان ہو رہی ہے

ہم دونوں اپنی اپنی مسجد کو ساتھ ساتھ جائیں گے

اور اس خدائے واحد کو جہہ کریں گے

جو میری مسجد کا خدا ہے

جو تری مسجد کا خدا ہے

جو ہم دونوں کا رب ہے

رب السموات والارض

چلو چلو جلدی کرو

نماز کا وقت ہو گیا ہے

تم اپنی مسجد کو جاؤ

میں اپنی مسجد کو جاؤں گا

لیکن ہم ساتھ ساتھ جائیں گے

اور ساتھ ساتھ آئیں گے

کہ ہمارا راستہ ایک ہے

طریق ایک ہے، سبیل ایک ہے

Cleaning House

ہم اپنے گھروں کی صفائی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ کھڑے ہو کر صفائی کراتے ہیں۔ کونے کھنڈرے کرید کرید کر صاف کر دیتے ہیں۔ الماریاں، ڈبے، درزیں، میزیں، سب کو جھاڑا تھرکا یا جاتا ہے۔

یعنی اسی طرح ہم کو اپنے وجود کی صفائی بھی کرنی چاہیے۔ اس کو کسی دوسرے سے صاف نہیں کرا جاسکتا۔ اسے

خود ہی جھاڑ دے کر صاف کیا جاتا ہے۔ اندر کئی ڈبے ایسے ہیں جو ہم نے کبھی کھولے ہی نہیں۔ کچھ گمان ہیں جن کو ویسے کا

ایسا بند کر رکھا ہے۔ ان بند ڈبوں اور گمانوں اور بدگمانیوں کے اندر عجیب طرح کی بدبو پیدا ہو گئی ہے۔ پھر کچھ بولے ہوئے

جملوں کے خالی لفافے اور شیشیاں ہیں۔ ان سے عجیب طرح کی ہمک آ رہی ہے۔ سینے کے بڑے صندوق میں کچھ نفرتیں

ہیں جن میں اب پہلے کے مقابلے میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کا صفایا کرنا یوں مشکل ہے کہ ان میں نڈیاں، جھینگڑ اور پوسیدہ ہو گئے ہیں۔ اگر یہاں آپ دوائی پسپ کریں گے تو وہ شخصیتیں بھی کیڑوں کوڑوں کے ساتھ مرجائیں گی جن کو آپ نے نفرت کے لیے پالا ہوا ہے۔ اس لیے بڑا صندوق اوندھا مار کر اسے زور زور سے تھپتھپانا پڑے گا اور حشرات کو اندر سے بھگانا پڑے گا۔ پھر اپنی یادوں کی جہیں لگا کر اندر کیڑا پھیر کر صفائی کرنی پڑے گی۔ چاہے کدورتیں ہوں، چاہے نفرتیں ہوں۔ اگر اندر کی صفائی ہوتی رہے تو سانس سے بدبو کے بھجکا ختم ہو جائیں گے۔ یہ جو دنیا میں اتنے ماوتھ وائٹز اور برتھ فریڈز بن رہے ہیں، ان کی ضرورت نہ رہے۔ اگر اپنے وجود کی صفائی ہوتی رہے تو پھر ان سینوں کی، گلوں کی، خوشبوؤں کی اور عطرؤں کی بالکل ضرورت نہ رہے۔

سب سے زیادہ بدبودل کے ارد گرد کے درازوں میں ہوتی ہے۔ ان درازوں میں ہم اپنے عقیدے کے پھول اور گلہ سے سجاتے ہیں اور ان کو بند کر کے رکھتے ہیں لیکن یہ سوکھنے، مرنے اور گلنے والے گلہ سے ایسی خوفناک بودیجے ہیں کہ اگر ان کو نکال کر انہیں صاف کر کے دھو کر نہ رکھا جائے تو اسی بدبو کے آگے کوئی ٹھہر نہیں سکتا۔

عقیدے کے پھول اور گلہ سے ماننے کی شبنم سے تروتازہ رہتے ہیں اور کرنے کی ہوا سے نشوونما پاتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو وہ بہت جلد گل سر کر سارے وجود کو بدبودار بنا دیتے ہیں۔

عقیدے کی امثال:

سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

اپنا عہد پورا کرو قیامت کے دن اس کی بابت پوچھا۔

جو بات کہو وہ پوری کرو۔

بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

لوگوں سے اچھی بات کرو۔

لوگوں کو معاف کرو اور درگزر کرو۔

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو۔

ریاضی

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ہماری باتوں اور ہمارے نظریات کو سمجھنے کے لیے اور ان انکشافات کو سمجھنے کے لیے ریاضی کے علم کا جاننا بہت ضروری ہے کیونکہ ریاضی کے ایک عملی مشاہدے کے بغیر طبعیات کی مبادیات کو سمجھنا ناممکن ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بالکل ٹھیک ہے اور اس وقت ہم جس کلچر میں زندگی گزار رہے ہیں اس میں اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کیونکہ ہماری ٹیکنالوجی، تہذیب کا سارا دار و مدار ریاضی کے اصولوں پر

بندھا ہے لیکن! (اور اس "لیکن" پر آپ کو آرام سے علیحدگی میں غور کرنا ہوگا) جب ہم سے صوفی، سالک، جوگی بڑی ماجزی سے یہ کہتے ہیں کہ باطن کے سفر اور اس سفر کی فرس کو جاننے کے لیے بھی اللہ کا ذکر کثرت سے کرنا پڑے گا اور صبح و شام اس کی تسبیح کے ریاضیاتی فارمولوں سے گزرنا پڑے گا تو بڑے بڑے سمجھدار اور منصف مزاج لوگ بھی رک سے جاتے ہیں۔

تصوف

تصوف کی تعلیم اس شخص کو آہستہ روپی پر مائل کر کے اُسے مواقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کا جائزہ لے اور اپنے آپ کو سمجھے اور جس چالاکی نے اُس پر قبضہ جمار کھا ہے اُس سے باہر نکل آئے۔ یہ باہر نکلتا ہی اس کو اپنے آپ سے ہٹا سکتا ہے ورنہ یہ اپنا آپ اُسے بھون کے رکھ دے گا۔

تصوف کے بارے میں لوگ اکثر دریافت کرتے ہیں۔ درد و ظیف اور مراقبے کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں لیکن معلومات کا حصول اصل نہیں ہے۔ جب خواہش گہری ہوگی اور وابستگی پنجہ گاڑ چکی ہوگی پھر کچھ کام کے آثار پیدا ہوں گے۔

فینس کے کھلاڑی کو کبھی دیکھا ہے۔ ان کو کھیلتے ہوئے کھاتے ہوئے بولتے ہوئے ہنستے ہوئے بیان دیتے ہوئے وہ ہر رنگ میں فینس کھاتے ہیں، فینس بولتے ہیں، فینس ہنستے ہیں اور فینس اوڑھتے ہیں۔ ان کے گھر کے لوگ ان کے بارے میں کبھی پریشان نہیں ہوتے کہ اسی وقت وہ کہاں ہوں گے۔ وہ ہر وقت کورٹ کے اندر باہر ارد گرد ہی ہوتے ہیں اور آپ ان سے کبھی بھی مل سکتے ہیں۔ یہ اُچی کھیل کی قیمت ہے جو وہ ادا کرتے ہیں اور زندگی بھر کرتے رہتے ہیں۔ یہی حال تصوف میں مراقبے کا ہے اور باطن کے سارے سفر کا ہے۔

کالج کے زمانے میں سینما کی کھڑکی کے سامنے قطار میں کھڑے ہو کر جب ہم تین چار دوست ٹکٹ خریدنے جاتے تھے تو اکثر ہم میں سے کسی نہ کسی کے بوٹ کے تھے اچانک ڈھیلے ہو جاتے تھے اور وہ قطار سے نکل کر ایک طرف ہو کر تھے باندھنے لگ جاتا تھا۔ دوسرے دوست اس کا ٹکٹ بھی خرید لیتے تھے اور یہ جتنا نہیں تھے کہ تم تجھوں ہو بے زہو! یا غریب گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ بس ایسے ہی عزت رہ جاتی تھی یا رکھ لی جاتی تھی۔

اسی طرح جب کوئی شخص اچانک غصے میں آجائے تو آپ کو یہی سوچنا چاہئے کہ اس شخص کے تھے اچانک کھل گئے ہیں اور اس کے اندر اس کے کھیسے میں جب میں کوئی کمی واقع ہو گئی ہے کہ وہ جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا ہے اور اس کی ساری توجہ اپنے آپ پر مرکوز ہو گئی ہے۔

محبت میں تو ٹکمری حاصل کرنے کے لیے اور انکساری کے ملک التجار بننے کے لیے آپ کو دوسروں کے ساتھ

ساری دنیا آپ کو سبق دے سکتی ہے۔ ساری کائنات آپ کو رموز سے آشنا کر سکتی ہے۔

برداشت کے ساتھ رہنا چاہئے۔

تصوف اور صوفی ازم علم کا یا آموزش کوئی سسٹم نہیں ہے۔ اس کے پاس کوئی کتابی نصاب نہیں ہے، تصوف پڑھا نہیں جاسکتا۔ اس کا کوئی کورس نہیں، کورس کے نوٹس نہیں۔ اس میں استاد بھی آپ کی مدد نہیں کر سکتے کیونکہ استاد تو ہمیشہ بیان کرتے ہیں۔ وضاحت کرتے ہیں لیکن وضاحت کبھی بھی تجربہ نہیں بن سکتی۔ درزیدگی نہیں بن سکتی۔ واپرتا نہیں ہو سکتی۔ وضاحت اور علم اور بیان چونکہ تجربہ نہیں بن سکتا۔ اس لیے تجربے کا بدل بن جاتا ہے اور لوگ بدل کو ہی تجربہ اور مشاہدہ اور واپرتا سمجھ کر اس میں ڈوب جاتے ہیں۔

جو لوگ جانتے نہیں ہیں وہ بہت لمبی گفتگو کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے سامنے تقابل کی کوئی چیز نہیں ہوتی جس سے موازنہ کر کے اپنی گفتگو روک سکیں۔ ان کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہوتا۔ چونکہ ہم کسی کے بارے میں جھمی جان سکتے ہیں جب وہ بولے، کوئی بات کرے۔ اس لیے ہر شخص کو سوسائٹی کے اندر داخل ہونے کے لیے بولنا پڑتا ہے۔ گفتگو اس کا گیٹ پاس ہے۔ گفتگو سوسائٹی کی جان ہے۔ اس کو ہر شخص حیران کرتی رہتی ہے، متوجہ کرتی رہتی ہے۔ وہ سارا وقت خیر میں گزارتا ہے اور دین سے شراہور ذہن کی بھی پہلی شناخت ہے۔ ہر وقت خیر میں رہنا، ہر لحظہ حیرت میں رہنا، ہر لحظہ حیرانی کے ساتھ بسر کرنا، آپ کو معصوم بناتا ہے۔ صوفی بناتا ہے، سائنس دان بناتا ہے۔

تصوف کبھی بھی ہستی اور زندگی اور زیست کے بارے میں نہیں سوچتا۔ وہ خود ہستی ہوتا ہے۔ خود زیست ہوتا ہے۔ یہ نہ تو علم ہے، نہ ہی عمل ہے۔ یہ تو بس ہستی ہی ہستی ہے، زیست ہی زیست ہے۔ صوفی لوگ بھاشن نہیں دیتے، یہ بس گاتے ہیں، لہراتے ہیں، جھومر ڈالتے ہیں، زندگی بھاشن نہیں، زندگی لہر ہے، موج ہے، دھارا ہے۔

صوفی کہتے ہیں منہ بند کر کے رکھو، صرف باہر کا منہ ہی نہیں بلکہ اندر کا منہ بھی بند کر کے رکھو، پھر تم کو ملے گا اور بہت کچھ ملے گا۔ جب تم مانگتے نہیں ہو تو تم کو ملتا ہے۔ جب مانگتے ہو تو نہیں ملتا۔ بظاہر یہ ایک تضاد نظر آتا ہے لیکن زندگی کی حقیقت یہی ہے۔

تصوف کو آج کل ایک تحقیر آمیز شے سمجھا جاتا ہے لیکن تصوف کا مطلب اندھیری گھما، دھوپ سا مگر، اگر بحور اور گلاب پاشی سے نہیں، نہ ہی اس کا تعلق حاضرات سے اور مجلس موکلات سے ہے۔ تصوف اور Occultism کے درمیان شدید فرق ہے۔

تصوف کی بنیاد تعلیم صرف اتنی ہے کہ حقیقت ایک ہے! اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے مختلف راستے اختیار کیے جاتے ہیں اور اس سچائی کا بلا واسطہ تجربہ حاصل کرنے کے لیے ذرائع ڈھونڈے جاتے ہیں۔ یہ جو حقیقت ہے اور ایک ہے

اگر نانوے آدمی آپ کی تعریف میں اور محبت میں مبتلا ہیں تو یہ مت سمجھنا کہ سو ادا آدمی بھی آپ کا واپرتا مداح ہے۔

اپنی ذرا سی تعریف سن کر دوستوں کو فون کرنا نہ شروع کر دیا کریں۔ لائیں، بہت ہی مصروف ہوتی ہیں کیونکہ بہت سے لوگ ایک دوسرے سے یہی کہہ رہے ہوتے ہیں کہ مجھے بہت ہی پسند کیا جا رہا ہے۔

میری تائی کہا کرتی تھی کہ تم لوگوں کے منہ بند نہیں کر سکتے وہ جو چاہیں گے کہیں گے۔ پھر لوگوں کے ذہنوں پر کسی کا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ صرف اپنے ذہن پر ہوتا ہے اور بیوقوف لوگ اپنے ذہن پر کنٹرول کرنے کے بجائے لوگوں کے ذہن پر طاقت آزمائی شروع کر دیتے ہیں۔ جب آپ کو یہ بات سمجھ آگئی تو پھر آپ کو لوگوں کی تنقید اور تبصرہ کبھی بھی تکلیف نہیں دے گا۔

توجہ کا اثر اس پر ہوتا ہے جو اپنے آپ کو محتاج اثر سمجھتا ہے اور اپنے کسی کمال کا دعویدار نہ ہو۔ اسی لیے عوام پر توجہ کا اثر ہوتا ہے خواص پر نہیں۔ خواص تو خود اس بات کے دعویدار ہیں کہ دوسرے ان کے محتاج ہیں پھر ان پر کسی طرح سے اثر ہو سکتا ہے۔

تصوف کبھی بھی ہستی اور زندگی اور زیست کے بارے میں نہیں سوچتا۔ وہ خود ہستی ہوتا ہے، خود زیست ہوتا ہے۔ یہ نہ تو علم ہے نہ ہی عمل ہے۔ یہ تو بس ہستی ہی ہستی ہے، زیست ہی زیست ہے۔ صوفی لوگ بھاشن نہیں دیتے، یہ بس گاتے ہیں، لہراتے ہیں، جھومر ڈالتے ہیں، زندگی بھاشن نہیں، زندگی لہر ہے، موج ہے، دھارا ہے۔

صوفی کہتے ہیں منہ بند کر کے رکھو، صرف باہر کا منہ ہی نہیں بلکہ اندر کا منہ بھی بند کر کے رکھو۔ پھر تم کو ملے گا اور بہت کچھ ملے گا۔ جب تم مانگتے نہیں ہو تو تم کو ملتا ہے۔ جب مانگتے ہو تو نہیں ملتا۔ بظاہر یہ ایک تضاد نظر آتا ہے لیکن زندگی کی حقیقت یہی ہے۔

باطن کے سفر کا صرف ایک راستہ ہے جو گرد کے بغیر بھی طے کیا جاسکتا ہے اور وہ ہے عاجزی اور انکساری کا رویہ، عجز کا وجود اور عجز کی روح اور عجز کا ہیولا۔ اس طرح کہ تم درختوں سے چشموں سے پہاڑوں سے گھاس سے پتھروں سے گیان حاصل کر سکتے ہو۔ بادلوں سے، ہواؤں سے درس لے سکتے ہو۔ اگر آپ عاجز ہیں اور انکساری کے اندر رہتے ہیں تو

اس "ایک" کو کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ God، خدا، کائنات اور ذہن یا خلاء یا پھر absolute۔

ہماری سائنس کے پیچ در پیچ راستوں اور طویل و طویل غلام گردشوں اور نیم روشن بھول بھلیوں کا کوئی بھی دروازہ اس absolute نہیں کھلتا لیکن اگر کوئی ان پر پیچ راستوں اور غلام گردشوں اور بھول بھلیوں سے واقف ہے تو وہ چھلانگ مار کر باہر آ سکتا ہے اور دوکران بھول بھلیوں سے برآمد ہو سکتا ہے اور اس absolute کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔

اصل خیر یہ نہیں بیٹا کہ کسی بھوکے کو دیکھ کر ایک روپے سے اس کی مدد کر دی بلکہ اصل خیر بھوکے کو اس وقت روپیہ دینا ہے جب تم کو بھی ویسی ہی بھوک لگی ہو اور تم کو بھی اس روپے کی ویسی ہی ضرورت ہو جیسی اس کو ہے۔

اچھا اور خیر ان فعلوں کے تابع نہیں ہے جو ہم کرتے ہیں بلکہ اس کا تعلق اندر سے ہے کہ ہم ہیں کیسے؟

ایک اور قابل غور بات جو میرے مشاہدے میں آئی ہے، وہ یہ ہے کہ سالک جب اونچے مقام پر پہنچ کر باطن کے سفر میں بہت آگے نکل جاتا ہے تو اس پر الہامی کیفیت کی عبارت کا درود ہونے لگتا ہے۔ اس پر بنے بنائے فقرے اور رازاترنے لگتے ہیں اور اس کا بیان چارواک عالم میں مشہور ہو جاتا ہے۔ یہ بڑا مشکل مقام ہوتا ہے۔ بھگون رنجش اور واصف صاحب کی مثالیں عین میرے سامنے کی ہیں۔ یہ لوگ ہر وقت لوگوں کی محفلیں سجا کر رکھتے ہیں اور ان کو اپنے روحانی اکھان عطا کرتے رہتے ہیں لیکن بابا جی نے ایک عجیب چالاکी اختیار کر رکھی تھی۔ اکھان بیان کر جاتے تھے اور اپنے گرد جمع نہیں لگاتے تھے۔ لوگ آتے تھے تو ان کو ڈاکٹر صاحب یا سیکرٹری صاحب کے حوالے کر کے خود پینے کی دال پکانے، چمچہ پھیرنے جیلے جاتے تھے۔

اس سلسلے میں بزرگوں کے بڑے قول ہیں۔

حضرت ابو القاسم عبدالکریم ابن ہوازن قشیری فرماتے ہیں کہ صوفی کی مثال برسام کی بیماری کی سی ہے کہ اس کے شروع میں ہڈیاں ہوتا ہے اور آخر میں سکوت! پس جب ممکن ہو جائے تو گونگا ہو جاتا ہے۔ پس صفوت کی دو تعریفیں ہیں۔ ایک وجد اور دوسرا نمود۔ نمود تو مبتدیوں کے واسطے ہے اور وجد منہجیوں کے واسطے اور وجد کی حالت میں وجد کا بیان مشکل ہوتا ہے۔ جب تک طالب علو ہمت میں ناقل ہے، لفظ اہل ہمت کے لیے کہو اس ہے۔ جب پہنچے پہنچ گئے، پھر بولنا کیسا! فرمایا جب موسیٰ علیہ السلام مبتدی تھے اور آپ کی تمام ہمت رویت تھی۔ اپنے ارادہ کو یوں بیان فرمایا، اے میرے پروردگار مجھے اپنا آپ دکھا۔ میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں تو یہ بیان موسیٰ علیہ السلام کا مقصود نہ پانے کی وجہ سے ہڈیاں تھا۔ رسول خداؐ ختمی تھے اور صاحب حوصلہ تھے۔ جب آپؐ کی شخصیت ہمت کے مقام پر پہنچی اور ہمت فنا ہوئی تو فرمایا..... بار خدا! میں تیری شاہ کا احاطہ نہیں کر سکتا اور یہ درجہ اور مقام عالی ہے۔

مخلوق خدا سے دور رہنا رہبانیت ہے۔ مخلوق کے اندر اللہ کے لیے رہا یہ پاک ہے اور دین ہے۔

(1) تاجر، کارخانہ دار، بزنس مین جو مخلوق اللہ سے متعارف نہیں ہیں بلکہ اپنے کام سے متعارف ہیں اور اس

کے سوا اور کسی کو نہیں جانتے، وہ سب راہب لوگ ہیں۔

(2) زمیندار، جاگیردار، وڈیرے، یہ سب راہب ہیں۔

(3) حکومت کے کارندے۔

(4) اہل علم۔

ہر مرید کے لیے ڈیرے پر جانا موت سے کم نہیں۔ مرشد تمہاری انا کو مار دے گا، جسم کر دے گا۔ تم اس کو بچانے کی کوشش کرو گے۔ اس کو چوگا دے کر، بادام چوہارے کھلا کر مونا کر دو گے، مقابلے میں لاؤ گے۔ وہ اسے مارے گا، ختم کر دے گا۔ ڈیرے پر جانے والا ہر شخص اپنی کمزور، پامال اور زخم خوردہ انا کو صحت دلوانے کے لیے آتا ہے۔ اپنی زخمی فاختہ کو بلدی چوئے لگوانے کے لیے پیر کے گھر آتا ہے اور سب طرف سے تو اس کی انجاء بروج ہو گئی، پامال ہو گئی۔ اب شاید تصوف میں اور بھگتی میں ہی اسلوک میں ہی ابھر آئے۔ شاید اسی طرح سے لوگ اسے جاننے لگیں، اس کی کا جگ جائے۔

لیکن مرشد لبہا جال پھینک کر تم کو اس لیے نہیں پکڑتا، وہ تمہیں اپنے قریب لاتا ہے اور پھر بڑھیل دیتا ہے۔ پھر قریب لاتا ہے اور مزید قریب لاتا ہے۔ اتنا قریب کہ وہ سیوا جی کی طرح تمہارے پہلو میں پنچہ گڑھ کر کم کو فضل خان کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا ہے اور اس بری طرح سے ختم کرتا ہے کہ تمہاری خودی اور تمہاری انا کا جگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جلا کر خاکستر بنا دیتا ہے۔ پھر اس سے کوئی نہال امید برآمد ہونے کی توقع نہیں رہتی۔

بابا جی نور والے

لاکھوں انسانوں میں کوئی ایک صاحب نظر بنتا ہے اور ہزاروں صاحبان نظر میں سے ایک گرو تیار ہوتا ہے۔ صاحب نظر بننے کے لیے تم کو اپنے لیے اپنے آپ پر کام کرنا پڑے گا لیکن گرو بننے کے لیے تم دوسروں کے راستے کی رکاوٹیں دور کرنی ہوں گی۔ اسی لیے جب گرو تمہارے راستے کی اوچھٹیں دور کرنی چاہتا ہے تو تم بہت سی مشکلیں اور اڑچٹیں خود اپنی راہ میں اور انھیں کر لیتے ہو۔

تھوڑی سی مشق کر کے تم چیزوں کی نوعیت کے بارے میں باتیں کر سکتے ہو۔ لوگوں کو قائل کر سکتے ہو۔ انہیں معقول کر سکتے ہو۔ تم ان کو خاموش کر سکتے ہو۔ انا کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہو۔ وجہ یہ ہے کہ لوگ اپنے ذہن میں رہتے ہیں، وہ اپنے خرد کے اندر گرفتار ہوتے ہیں۔ ایک گرو بڑا سمجھدار، سیانا، عقلمند اور دانشمند بابا ہوتا ہے لیکن وہ دانش کے ساتھ تم کو قائل نہیں کرتا کیونکہ دانش تمہیں آگے نہیں لے جاسکتی بلکہ کہیں بھی نہیں جاسکتی۔

مرشد اور پیر بڑی بڑی تحریکیں نہیں چلا سکتے۔ جماعتیں لے کر نہیں چل سکتے۔ وہ تو جب مشہور ہوتے ہیں اور لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگتے ہیں تو وہ چلے جاتے ہیں۔

کسی گرو کا قائل ہونا یا اس کا گرویدہ ہونا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ انا کی اور خودی کی موت ہے۔

صوفی لوگ تدریس پر اور تعلیم پر ایمان نہیں رکھتے۔ گرو لوگ تعلیم نہیں دیا کرتے۔ کیا نہیں کرتے۔ ان کا سارا وجود ہی تعلیم ہوتا ہے۔ وہ کھڑکیاں ہی کھول دیتے ہیں۔ در پیچے سے بن کر بیٹھ جاتے ہیں جیسے کوئی تجریدی تصویر ہو۔

ایک معلم مردہ شے ہے مردہ علم عطا کرتا ہے، استاد کی ساری توجہ تدریس پر ہوتی ہے، طالب علم پر نہیں۔ اس کے لیے تعلیم اور تعلم اہم ہوتے ہیں۔ لیکن ایک گرو کے لیے ایک مرشد کے لیے تدریس ایک کھلونے

سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ علم اگر نافع ہے تو درست ہے۔ اگر نافع نہیں تو غلط ہے۔ نقصان دہ ہے، خطرناک ہے۔ مرشد کے لیے انسان اہم ترین چیز ہے۔ ایک فرد، ایک بندہ، ایک آدمی..... ہجوم یا گروہ یا خلقت اہم نہیں۔ انسانیت اہم نہیں۔ بس تم اہم ہو۔ اپنی تمام تر شخصیت اور فردیت کے اندر لپٹے ہوئے، مرشد جو کچھ بھی کہتا ہے، ایک مرید کے لیے ہوتا ہے۔ ایک شخص کے لیے ہوتا ہے۔ اس کا فرمان ایک چٹھی کی طرح ہوتا ہے۔ ذاتی چٹھی کی طرح۔ پرائیویٹ لیٹر کی طرح..... اس خط کو اس چٹھی کو عمومی رنگ نہیں دیا جاسکتا۔ یہ سب کو پڑھائی نہیں جاسکتی۔ (فرد اہم ہے۔ اگر مسئلہ نہ ہوتا، اس کی والدہ کا اسقاط ہو گیا ہوتا)

ایک استاد ایک دانشور ایک مولوی آپ کو خدا کے بارے میں، مذہب کے بارے میں، حق اور سچ کے بارے میں طول و طویل باتیں بنا سکتا ہے۔ بڑے بڑے کتے سمجھا سکتا ہے مگر ایک گرو ایسا نہیں کرتا۔ وہ اپنا آپ کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیتا ہے اور تم اس کے اندر سے حق کا اور سچ کا تختہ اٹھا لیتے ہو۔

ایک گرو کو سمجھنے کے لیے تمہیں اسی کے قریب آنا پڑے گا، بہت زیادہ قریب، بے حد قریب۔ اس کے چرنوں کے اندر لیکن ایک استاد سے آپ جتنی دور رہنا چاہیں رہ سکتے ہیں۔ کوئی مشکل نہیں پڑتی، کوئی مسئلہ نہیں بنتا۔ اس میں قربت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آنے سے سامنے کی احتیاج نہیں ہوتی۔ استاد کے ساتھ آپ عمر بھر مرکب نہیں ہوتے۔

اصل میں بات یہ ہے کہ ایک ارتکاب ایک کمیونٹ بس آخری کنارہ ہے۔ اس سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ واپس ہو بھی کیسے سکتے ہو۔ ایک چالاک اور عیار ذہن دور دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی شمولیت اختیار نہیں کرتا۔ بمصر کی طرح زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اوپن یونیورسٹیاں بننے لگی ہیں اور خط و کتابت کے ذریعے علم عطا کرنے کے بہت سے ادارے قائم ہو گئے ہیں۔

صوفی دل کا اور قلب کا بندہ ہوتا ہے۔ محبت کا بندہ ہوتا ہے۔ اس کو یہ علم نہیں ہوتا کہ یہ کائنات کہاں سے آئی ہے۔ اس کی ابتداء کیسے ہوئی۔ اس کو بنانے والا کون ہے۔ اس کا انجام اور اختتام کیا ہوگا..... صوفی کو سوال کرنے نہیں آتے۔ وہ سوال پوچھتا بھی نہیں۔ وہ تو بس زندہ رہنے اور زندگی بسر کرنے کے لیے آتا ہے..... جو احمق لوگ ہوتے ہیں، وہ سوال پوچھا کرتے ہیں۔ بحث کرتے ہیں۔ مکالمے کرتے ہیں۔ صوفی تو بس زندہ رہنا شروع کر دیتا ہے.....

صوفی ازم کو مذہبی لوگ تباہ کر دیتے ہیں۔ نام نہاد مذہبی لوگ۔ حلاج کہتا ہے انا الحق۔ میں خدا ہوں..... تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ صرف وہی خدا ہے۔ اس کا کہنا ہے یہ شجر بھی خدا ہے، یہ پہاڑ۔

س: سر کیا دعا خواہش نہیں؟

ج: ہے تو کبھی لیکن اس کی Definition ذرا مختلف ہے کہ دعا ایک ایسی خواہش ہے جس کا رخ ہمیشہ آسمان کی

طرف ہوتا ہے۔

دعا کرو تو ایسے گڑبگڑا کر پکار کر کہو کہ سارا دار و مدار اور انھما را خدا پر ہی نظر آئے اور کام کرو تو اس طرح کہ ہر شے

کا انحصار تہی پر ہو۔

س: کیا دعائیں سنی بھی جاتی ہیں؟

ج: اس کا دار و مدار تمہارے ایمان پر ہے۔ جن دعاؤں کو کفر و ایمان کے ساتھ کیا جائے گا، وہ منہی ہی ہو کر اصرار ہی رہ جاتی ہیں جیسے بھنگی ہوئی آتش بازی چلتی ہے اور جو دعائیں یقین، محکم اور ایمان مکمل کے ساتھ کی جاتی ہیں، وہ سیدھی ساتویں آسمان تک پہنچ کر اپنے ہدف سے جا کراتی ہیں۔

حضور پیر ملتا کیسے ہے؟

اے بابا لوکا! اگر قسمت میں ہے تو پیر خود گھر آ جاتا ہے، کہیں جانا نہیں پڑتا۔ فرمایا فرمانے والوں نے کہ ایک مرد خدا کا آخری وقت قریب آیا تو کسی ہستی میں آئے اور دیکھا کہ ایک لڑکا موجود ہے۔ تانی کی پان کر رہا ہے۔ فقیر نے اپنی ٹوپی اتار کر اس کے سر پر رکھ دی اور کہا، مجھ کو سرکار نے طلب فرمایا ہے تو میرا کفن دفن کر دینا۔ اتنا کہہ کر چار دھان کر لیت گئے اور رخصت ہوئے۔ ان کے کفن دفن کے بعد وہ لڑکا سب سے الگ تھلگ قطع تعلق کر کے بیٹھ رہا۔ اس کے وارث رونے پینے لگے۔ اس نے کہا، سنو میرے بڑے بزرگ! نہ میں کہیں گیا، نہ کسی سے کچھ طلب کیا، نہ میں اس کو چہ باطن سے واقف تھا۔ خدا نے گھر بیٹھے اپنی نعمت عطا فرمائی۔ اب میں تمہارے کام کا نہیں رہا۔ نہ تم میرے مطلب کے ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ خدا حافظ۔

اچھا حضور اگر فقیری ایسی آسان ہے تو پھر مشقت و مجاہدہ کیوں کرواتے ہیں۔ اتنی محنت سے خاک میں کیوں رولتے ہیں۔ مانجھتے کیوں ہیں۔

بابا لوکا۔ ایک شخص کے پاس تیل کے دو پیسے تھے۔

بابا لوکا! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جناب باری میں عرض کیا کہ تیری بارگاہ میں میرا کون سا فضل پسند ہے تاکہ میں اسے زیادہ کروں اور بار بار کروں۔ حکم ہوا کہ یہ فضل ہم کو پسند آیا ہے کہ زمانہ طفلی میں جب تمہاری ماں تم کو مارا کرتی تھی تو تم مار کھا کر بھی اسی کی طرف دوڑتے تھے اور اسی کی جھولی میں گھستے تھے۔ پس طالب خدا کو بھی یہی لازم ہے کہ گو کسی بھی سختی ہو، کسی بھی ذلت و خواری پیش آئے۔ ہر حال میں خدا کی طرف متوجہ رہے اور اس کے فضل کا طلبگار رہے۔

نہ کوئی ساجد نہ سجدو، نہ عابد نہ سجود، نہ آدم نہ اٹلیں۔ صرف ایک ذات قدیم صفات رنگارنگ میں جلوہ گر ہے۔ نہ اس کی ابتداء نہ انتہا۔ نہ اس کو کسی نے دیکھا نہ سمجھا۔ نہ فہم و قیاس میں آئے۔ نہ وہم و گمان میں سائے۔ جیسا تھا ویسا ہی ہے اور جیسا ہے ویسا ہی رہے گا۔ نہ گھٹے نہ بڑھے، نہ اترے نہ چڑھے۔ وہ ایک ہے لیکن ایک بھی نہیں کیونکہ اس کو موجودات سے الگ سمجھنا نادانی اور حد رکھنا ہے۔ دنیا میں طرح طرح کے کاروبار اور رنگارنگ اشغال موجود ہیں۔ ایسے ہی خدا جوئی اور خدا شناسی بھی ایک دھند ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں۔

جب شاہ منصور کو سولی پر کھینچ دیا۔ جسم کو جلادیا۔ خاکستر کو دریا (دجلہ) میں بہا دیا تو دریا جوش میں آ گیا۔ لوگوں نے

کو خبر دی۔ امام صاحب دجلہ کے کنارے آئے اور کہا، منصور ہماری بات غور سے سن۔ ہم جانتے ہیں کہ تو طریقت میں سچا ہیں ہمارا قلم بھی اگر خلاف شرع چلا ہو تو شہ غارت کر دے نہ تجھ سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ اسی وقت دریا کا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔

سن بابا لوکا! فقیری ایک بات ہے کان میں کہنے کی۔ یا تو انسان ادھر تھا یا پھر ادھر ہو گیا۔ گویا کسی نے آگ میں مٹی مار دی۔ نہ اس کے لیے وقت و زمانہ درکار ہے نہ عبادت و تسبیح نہ درود و وظیفہ۔

اے بابا لوکا! فقیری کی نشان خاک ہونا ہے، رکھ ہونا ہے۔ جس طرح راگ خوشبو اور بدبودوں کو ڈھانپ رہا ہے۔ اسی طرح فقیر بھی لوگوں کے عیب، ثواب اور نیک و بد پر نظر نہیں کرتا۔

بابا لوکا! طالب کو طلب کی راہ میں دوسری سب کیفیتیں گرو ہیں۔ ان کی کچھ حقیقت نہیں۔ اگر طالب کو کچھ ملے نہ ہو اور اس راہ میں کھیت رہا ہو تو یہ ہزار مراد سے بہتر ہے کیونکہ راہ فانیں حاصل اور حصول کیا بابا لوکا! جو قدم اس

راہ میں اٹھا وہی نقد وقت ہے۔ اوجھائی بابا لوکا! انشا سرکاری یہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو نہ دیکھے جیسے آکھ سارے جہان کو دیکھتی ہے مگر اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی۔ اسی طرح ناک ہر شے کی خوشبو اور بدبود سونگھتی ہے سوائے اپنے پیٹ کی بدبو کے۔ ہاں اگر فضل خدا مال مال ہو اور کوئی مرد خدا اپنے وجود کی سیر کرادے تو سبحان اللہ۔ نور اللہ۔

سن بابا لوکا! جب تک کوئلہ دھپ نہیں جاتا، جھنڈا ہی رہتا ہے اور دھواں دے جاتا ہے مگر جب آگ اس کے اندر لگی سرایت کر جاتی ہے اور وہ آگ بن کر دھپنے لگتا ہے تو پھر نہ دھواں دیتا ہے نہ آواز۔ اسی واسطے فرماتے ہیں کہ ابتداء

نہاں نہ کرنا نیک ہے۔ درمیان میں خوشی اور سرور لیکن آخر میں برا ہے۔ اس میں دیکھنا ہی اچھا۔

عدم ہے یا کوئی کوئے صنم ہے
چلی جاتی ہے واں خلقت خدا کی

دیکھ بابا لوکا! انی پھرا پلٹن تیار ہو رہی ہے۔ پرانی سرکاری فوج کو پتہ بھی نہیں کہ ایک دن یہی پلٹن چکی بجاتے ہوگی جگہ چین لے گی۔ بڑھوں کی جگہ جوان وارث بننے ہیں۔ جوانوں کی جگہ بچوں کی بھرتی جاری ہے۔ ایک مرتا ہے اور اس کے منصب پر قائم ہوتا ہے۔ اگر آدمی غور کرے تو یہی پود عبرت کے لیے کافی ہے۔

سن بابا لوکا! شیخ بہاء الدین ذکر یا ملتانی بڑے مالدار تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے خیموں کے کیلے بھی سونے کے تھے۔ آپ کے ایک دوست نے پوچھا حضور آپ تو درویش ہیں، پھر یہ سونے کے کیلے زمین میں گاڑ کر رہے کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا الحمد للہ، یہ سونے کے کیلے مٹی میں ٹھونکے ہوئے ہیں دل میں نہیں۔ درگاہ است نہ بدل۔

لیکن آپ کے وصال کے بعد آپ کے فرزند حضرت مخدوم صدر الدین نے سارا مال و دولت راہ خدا میں دے کر تم کر دیا۔ جب کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے والد تو صاحب مال تھے، آپ نے یہ کیا کیا۔ آپ نے فرمایا، میرے والد سانپ کا منتر جانتے تھے، میں نہیں جانتا۔

ارشاد = کئی مرتبہ زندگی میں اور زندگی سے زیادہ ایمان کے اندر تضاد نظر آتا ہے۔ یاد رکھو ایمان ہے،

سائنس نہیں ہے۔ ایمان ایک موسم میں آگے بڑھتا ہے، دوسرے میں پورے کا پورا پیچھے چلا جاتا ہے۔ ایک وقت میں نمازیں پڑھتے ہو۔ عبادت کرتے ہو، پھر ڈھیلے ہو جاتے ہو۔ آرام طلبی اختیار کر لیتے ہو۔ جھگڑا کرنے لگتے ہو۔ مٹی ہو جاتے ہو۔ پھر دینے لگتے ہو، لینا ترک کر دیتے ہو۔ جس طرح ٹیکسٹ اور پازینڈونوں تاریں مل کر بجلی کا بلب روشن کرتی ہیں ایسے ہی ایمان ہے۔ اسی طاقت سے کے رخ موڑے جاتے ہیں۔ پہاڑ کاٹے جاتے ہیں۔ جب تم رکوع میں جاتے ہو اور سجان ربی یا اعلیٰ کہتے ہو اور خدا سے اس علم کی بھیک مانگتے ہو کہ مجھے ایمان کے اندر رہ کر حرکت نصیب ہو تو پھر تمہارے سارے تضاد حق بن جاتے ہیں اور ساری تجزیہیں تعمیری ہو جاتی ہیں۔

فرد

غم و اندوہ۔ اضطراب Anguish

غم و اندوہ ایک ذہنی ویڈیو کیسٹ کے علاوہ اور کچھ نہیں جو دیکھنے والا مریض بے خیالی میں اور بے احتیاطی میں لاکر بیٹھ جاتا ہے اور تڑپتا رہتا ہے۔ جہاں ذہنی ویڈیو نہیں وہاں اضطراب نہیں۔ اس کا تجربہ کر کے دیکھ لو۔ اگلی مرتبہ جب اضطراب اور بے چینی کا وقت آئے زور لگا کر اس ویڈیو کو آف کر دو اور اس film کو بند کر دو اس میں چاہے آپ کو ایک بجلی کی سیابی ہو آپ دیکھیں گے کہ وہ سیکنڈ پر سکون گزر گیا اور فلم کے بند ہوتے ہی سرت پھیل گئی۔ خوفناک فلم کے دے لوٹا بند کر دیں اور آپ ایک مختلف شخصیت بن جائیں گے۔

اچھائی اور خوبی

صحیح اچھائی اور خوبی کس طرح سے پیدا ہوتی ہے۔ اس پر غور کرنا ضروری ہے۔ اچھائی اور خوبی باہر سے اچھا اور خوب بننے سے نہیں ہوتی کہ سوسائٹی اس کی تصدیق کرے۔ سوسائٹی تو صرف باہری چیزوں کو پسند کرتی ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سوسائٹی اصلیت سے نہیں لفظوں سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن اصل خوبی ذہن کے صحیح استعمال سے حاصل ہوتی ہے اور وہ صحیح استعمال یہ ہے کہ اچھائی کے تصور کو اصل اچھائی نہ سمجھا جائے۔ جس شخص کے ذہن میں اچھے اچھے تصورات ٹھوس ٹھوس کر بھرے ہوں وہ اچھا انسان نہیں ہوتا اچھے خیالات کا گمان ہوتا ہے۔ جس طرح شہد سے بھری ہوئی بوتل کا گانچ بیٹھا نہیں ہوتا اسی طرح سے یہ شخص ہوتا ہے۔ اچھے خیالات کا حامل انسان اچھا نہیں ہوا کرتا کیونکہ انسان محض ایک خیالی نہیں ہے وہ تو ایک بھرپور کائی ہے ایک کل ہے اور خیالات اس کے کل کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں۔ صرف ایک بازو ہی پورا انسان نہیں ہے ایک پیہر ہی پوری تو نہیں ہے اچھائی کا ٹیسٹ یہ ہے کہ پورے کا پورا انسان اچھا ہو۔ سارے کا سارا۔

خوشی

کچھ لوگ اپنی خوشی اور شادمانی کا اظہار مصنوعی قسم کے شکر سے کرتے ہیں کہ اللہ کا بڑا فضل ہے۔ اچھا گھرانہ

ہے کھانے پینے کو ہزار نعمتیں ہیں۔ مستقل آمدنی ہے۔ روشن مستقبل ہے۔ میں بڑا خوش ہوں۔

ان سے پوچھو اس نعمت اور فضل نے تمہاری ذات کو کس قدر خوشی عطا کر رکھی ہے تو وہ لا جواب ہو جائیں گے جس خوشی کی بنیاد انسانی فوجات پر ہودہ خوشی نہیں ہوا کرتی۔

اگر یہ انسانی بنیاد کسی وجہ سے بیٹھ جائے تو ساری خوشی اور پرستار برباد ہو جاتی ہے۔ خوشی اور اصل خوشی کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی اور اصل خوشی کسی قسم کے حصول سے وابستہ نہیں ہوتی۔ سورج اور اس کی روشنی سورج کے حصول سے نہیں ہوتی۔ وہ تو بس ہوتا ہے اور ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔

”میں پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی راستہ ہے؟ اور کیا مجھے راستہ مل سکتا ہے؟“

”ضرور مل سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تلاش کرنے والے کے لیے راستہ موجود ہے۔ انسان اپنے ہندی غلام کے اندر روتا اور آنسو بہاتا رہتا ہے اور اس کے پہلو میں قید کوٹھڑی کا دروازہ ہوتا ہے۔ اس کو بس اٹھ کر ذرا سارے دروازے ہوتا ہے اور دروازہ کھل جاتا ہے اور وہ آزاد ہو جاتا ہے۔

مایوسی کا خاتمہ

”میں جس شے کا خواہشمند ہوں وہ جب مجھے نہیں ملتی تو میں بڑا مایوس اور دل شکستہ ہو جاتا ہوں۔ اس مایوسی کوئی علاج ہے؟“

”پہلے زندگی پر نظر کرو اور دیکھو کہ زندگی کس طرح عمل پیرا ہے۔ صرف اس کا مطالعہ کرنے سے تمہارا یہ دکھ دور ہو جائے گا کہ میری مطلوبہ شے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نہ ملنے سے کیا گزرتی ہے۔“

”ذرا سوچو کہ وہ چیزیں اور وہ صورتیں اور وہ لوگ جن پر تم بان چڑھتے تھے اور تمہارے لیے وہ بہت ہی قیمتی تھے اب وقت گزرنے پر وہ اس قدر کم قیمت کیوں ہو گئے؟ بے حقیقت کیوں ہو گئے؟ تمہاری نظروں سے کیوں گر گئے؟ تم دیکھو گے کہ ان سب چیزوں کی قدر تو صرف تمہارے ذہن میں تھی اصل میں یہ اس قدر قیمتی نہ تھے۔ اب تمہارا ذہن تبدیل ہو گیا اور یہ سب بھی ختم ہو گئے۔ اس طرح سے (تمہیں خیر یقین تو نہیں آئے گا لیکن یہ ہے حقیقت) تمہاری موجودہ خواہش ہے اس کی قدر تو قیمت بھی صرف تمہارے ذہن میں ہے۔

اپنے آپ کو دیکھنے اور اپنا مطالعہ کرنے اور خوشنمائی کے رویے میں تبدیلی پیدا کر لو تم زندگی کا مطالعہ کرنے میں تبدیل ہو جاؤ گے۔ زندگی کا مطالعہ یعنی تبدیلی سے کرو اور زندگی نئی ہو کر سامنے آئے گی۔ جب تم نئے ہوتو زندگی بھی نئی ہے دراصل تم ایک ہی ہو۔ جدا جدا نہیں ہو۔

”میں یہ مسئلہ کس طرح سے حل کروں؟“

”اس میں جانکاری پیدا کر کے۔“

”میں اپنے اندر جانکاری کیسے پیدا کروں؟“

”مسئلہ کا خوف دور کر کے۔“

”خوف کو کس طرح سے دور کیا جاسکتا ہے؟“

”اس کو اپنی طرف سے مصنوعی اور جھوٹی طاقت فراہم کرنا بند کر دو۔“

”میں اس کو مصنوعی اور جھوٹی قوت کیوں فراہم کرتا ہوں؟“

”وہ اس لیے کہ تم نے ابھی تک اپنی اصل قوت اور برتری کو جاننا ہی نہیں ہے اسے تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔“

”پھر تو مجھے خوشنمائی کی ضرورت ہے۔“

”بالکل ہے..... کیونکہ تم ہی جواب ہو اور تم ہی سوال بن کر سامنے بیٹھے ہو۔“

رکاوٹ اور اس کا توڑ

مایوسی کو اپنے وجود میں کوئی مقام نہیں دینا چاہئے۔ ہم یقیناً کامیاب ہو سکتے ہیں اور حالات پر فتح حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کی دیکھیں۔ یہ ہے کہ ہماری پوشیدہ قوت ہماری ظاہری کمزوری سے کہیں زیادہ ہے۔ صرف ہمیں اس کا احساس نہیں ہے۔ جلدی سے متاثر ہو جانا زندگی کی ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ ایک آزاد اور کھلا ذہن نہ اخباری سرخیوں سے متاثر ہوتا ہے اور نہ ہی ان سے مجروح ہوتا ہے۔ ایک ظالم اور خوفناک چہرہ منصوبے میں اچانک تبدیلی کوئی نقصان اور شہادت ہمسایہ اور دھمکی دینے والا معاشرہ یہ سب بند زنجیروں پر کارگر ہوتے ہیں۔

عمل میں رکنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان عوامی اعلان کے فریبوں اور واہموں کو حقیقت سمجھ لیتا ہے۔ سچ وہ ہے جو ”ہے“ نہ نہیں جو کر دڑوں عوام سوچتے ہیں کہ یہ سچ ہے..... الفاظ اور لیل اور سلوگن اڑ چیں ضرور نظر آتے ہیں لیکن وہ بہت ہی کمزور ہوتے ہیں۔ اپنی ذات سے لیبوں کو کھرچ کر پرے پھینکو پھر تم آزاد ہو۔

بنیادی اطلاع Basic information

ہر شخص اپنے پڑوسیوں سے اور اپنے ارد گرد سے مختلف ہو کر زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ وہ ان سے زیادہ دوستانہ زیادہ مقبول زیادہ خوبصورت اور زیادہ پرسکون ہونا چاہتا ہے۔ لیکن جوں جوں وہ ان خصوصیات کو حاصل کرنا چاہتا ہے اسی قدر وہ معمولی اور عام سا ہوتا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے پڑوسی بھی عین یہی باتیں سوچ رہے ہیں اور اس کوشش میں معروف رہتے ہیں۔ یہ دنیا فالتوں کی دنیا ہے جہاں ہر شخص بے خیالی میں یہی سمجھ جاتا ہے کہ وہ دوسرے سے مختلف ہی نہیں بلکہ اس سے بہتر بھی ہے۔

اگر تم کو واقعی مختلف ہونے کا خیال ہے اور منفرد ہونے کی آرزو ہے تو ہرگز وہ نہ کرو جو تمہارے پڑوسی کر رہے

نے لگے تو ان کو ترک کرنا باطن کے سفر کا پہلا قدم ہے۔ ان کے اظہار کا نہیں۔

قدر و قیمت

کسی شخص سے پوچھو کہ تم زندگی میں کس چیز کو اہمیت دیتے ہو اور کس شے کی قدر و قیمت رکھتے ہو۔ اس شخص کی یہی تم ہو جائے گی اور وہ کوئی صحیح جواب نہ دے پائے گا۔ بس اسی قدر کہے گا کہ ”میں ایک اعلیٰ اور عمدہ زندگی کا خواہشمند ہوں۔“ میں ہنگامہ خیز اور روح پرور دونوں کا متلاشی ہوں۔“ لیکن اس کا پتہ نہیں ہوگا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ ہر وہ چیز جو حقدار ہوگی ہنگامہ پرور ہوگی۔ اس کو اچھی لگے گی لیکن اس کا مطلب کچھ نہ ہوگا وجہ یہ ہے کہ اس نے جو اقدار سن کر اکٹھی کر رکھی ہوں گی وہ بے قیمت ہوں گی۔ جو کچھ اس نے اپنی یادداشت میں محفوظ کر رکھا ہوگا وہ بے معنی ہوگا۔ زندگی ایک تعمیر پذیر چیز ہے اور اس کا دھارا تیزی سے بہہ رہا ہے۔

جس شخص نے شہرت کا راست اختیار کر رکھا ہوگا وہ اس وقت بہت ہی مایوس ہوگا جب شہرت اس کی طرف رجوع نہ کرے یا پھر وہ بہت ہی نالاں ہوگا جب شہرت آ کر چلی جائے یا حسن آ کر واپس ہو جائے۔ جموٹی اقدار کے اندر جھانک کر دیکھنا اور ان کی تلاوت کرنا بڑا ہی دلچسپ کھیل ہے۔ جو ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے وہ ان کا گہرا مطالعہ جاری رکھے۔

خوشی اور راحت

ہر اس شے پر تنقید کرنا کس قدر آسان ہے جو آپ کے تصورات اور نظریات کے خلاف ہے اور اس کو سمجھنا اور اس پر غور کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ لفظ ”محبت“ کا ادا کرنا کس قدر آسان کام ہے اور اس کا اعلان کرنا کتنا سہل ہے لیکن یہ جاننا کتنا مشکل ہے کہ صرف لفظ ہی حقیقت نہیں صرف لفظ ہی خاصیت نہیں۔ صرف وہی کرو جو تمہیں کرنا چاہئے، وہ نہ کرو جو تمہاری خواہش ہے اور جس پر تمہارا جی راضی ہے۔ پہلے پہل اس میں دقت ہوگی اور بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن بعد میں ”جو تمہیں کرنا چاہئے“ تمہاری خواہش اور تمہاری مرضی بن جائے گا۔ بس یہی خوشی ہے اور یہی راحت کا سامان ہے۔

اگر آپ کو سچ اختیار کرنے کی خواہش ہے اور آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ سچ نے آپ میں کیا تبدیلی پیدا کی ہے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ آپ ایسے ”بھوندہ“ بن گئے ہیں جو کچھ بھی ثابت کرنے کا خواہشمند نہیں ہے۔

تبدیلی

”میں اپنے آپ کو کس طرح تبدیل کر سکتا ہوں؟“

ہیں۔ ہماری بے عزتی اور شکست کی ایک ہی وجہ ہوتی ہے کہ ہم ذہن کے اس خانے میں زندگی بسر کرتے ہیں جو دوسروں پر برتری حاصل کرنے کے لیے اکساتا ہے اور ہم کو کتری کے خوف سے ڈراتا رہتا ہے۔

جب ہمارا تعلق سیدھا ”حق“ سے اور ”سچ“ سے ہے تو پھر زندگی میں ہر شے سے ہم اپنے تعلق کے حوالے سے ملیں گے۔ اس حوالے میں دوسروں سے برتری کمتر ہونے کی تحقیق ہی نہیں کرنا پڑتی بس اپنے حوالے سے جڑے رہنے کی بات ہوتی ہے۔

خوشی اور آئندہ

خوشی ایک خیال یا ایک تصور نہیں ہے۔ ایک خیال کے سامنے ہمیشہ ایک دوسرا خیال ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ناخوش اور متضلل انسان ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف حرکت کرتا رہتا ہے۔ ایک تصور سے دوسرے تصور کی طرف بھاگتا رہتا ہے۔ خوشی صرف اسی وقت حاصل ہوگی جب وہ بھاگنا چھوڑ دے گا اور خیالوں کا پیچھا کرنا بند کر دے گا۔ جب وہ اس فلسفے کو ترک کر دے گا کہ خوشی کا تصور ہی خوشی ہے۔ ایک آدمی جو سردیوں میں دھوپ سینک کر مزلے رہا ہو وہ دھوپ کی حدت کا تجزیہ نہیں کیا کرتا۔ نگھا ہو کر بیٹھا کرتا ہے۔

خالی خولی

خالی خولی زندگی اور بیکار دن اور بیکار راتیں بہت بڑی نعمت ہیں۔ یہ تم کو کسی اہم پیغام کی عبارت سناری ہیں۔ اس عبارت کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ صرف تمہاری توجہ سے اس کا انعام مل سکے گا۔ بیکار زندگی کا احساس ایسے ہی ہے جیسے بدن کو سردی کا احساس ہونے لگے۔ تم فوراً گرم کپڑے پہننے کی طرف رجوع کرو گے اور اپنے آپ کو گرم کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاؤ گے۔ یہی حال بیکاری کے اور خلا کے احساس کا ہے۔ وہاں تو تم نے کپڑے پہن لیے تھے یہاں تمہیں نفسیاتی لباس تبدیل کرنے کی ضرورت ہے اور اپنی روح کو بچانے کی ضرورت کا احساس دلایا جا رہا ہے۔ روح کا تحفظ بدن کے تحفظ سے بھی ضروری ہے۔

ندامت کا احساس

کچھ لوگ ندامت کا احساس بڑے غر سے کرتے ہیں۔ یہ بھی ان کی انا کا ایک مظہر ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں توبہ جوانی میں بڑے گناہ کیے۔ اب بھی میں اپنے کړو کړو سے باز نہیں آتا۔ بظاہر تو وہ افسوس کرتے نظر آئیں گے لیکن اندر سے وہ غر کر رہے ہوں گے۔

جب انا کو سارے نیل چھڑوائے جاتے ہیں تو سب سے آخری نیل جو اس کے منہ میں رہ جاتا ہے وہ احساس ندامت کا ہوتا ہے۔ اس ندامت کے اظہار سے وہ لوگوں پر برتری کا زعب بناتا ہے۔ جب اپنی خفی حرکتوں کا احساس

”وہ ہو کر رہو جو تم ہو۔“

”میں آپ کی بات نہیں سمجھا؟“

”بس اسی طرح کے ہو کر رہو جس طرح کے تم بنے ہو کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ ہی نہیں۔ اپنے آپ کو مختلف بنا کر پیش کرنے سے آپ آزاد نہیں ہو سکیں گے بلکہ اور الجھ جائیں گے۔ جو بھیڑ بھیڑیے کا لبادہ اڑھ لیتی ہے وہ باہر سے کچھ بھی نظر آئے اصل میں بھیڑی رہتی ہے۔“

”لیکن یہ جان کر کہ جو میں ہوں وہ ہوں پھر میں اپنے آپ میں انقلاب کس طرح برپا کر سکتا ہوں؟“

”اس بات پر غور کر کے کہ میں کیا ہوں اور پھر ان اختلاف پر نظر ڈال کے جو ردول میں مختلف اوقات میں وقت کی سلج پر ادا کرتا ہوں۔ جب تم کو اس بات کا علم ہو جائے گا کہ تم کس منگے بھاؤ یہ بہرہ دے بدلتے ہو تو پھر یہ بہرہ دے آپ سے آپ ختم ہونے لگیں گے..... وہ سچ جو آپ کو ناگوار گزرتا ہے اس سچ کے ذریعے صحت ممکن ہے۔“

ظاہر کی تبدیلی سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ آپ اپنے باہری وجود کو تبدیل کر لیں۔ لباس بدل لیں۔ ڈاڑھی رکھ لیں۔ شہر چھوڑ کر کسی اور شہر میں سکونت اختیار کر لیں۔ ملک سے چلے جائیں..... لیکن آپ کے ساتھ وہی واقعات پیش آتے رہیں گے جو اب تک آتے رہے۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اندر کی تبدیلی نہیں ہوگی۔

ایک ہوائی جہاز کو جس کا انجن خراب ہو چکا ہو باہر سے پینٹ کر کے اور اس کا رنگ تبدیل کر کے آپ مائل پہ پرواز نہیں کر سکتے۔ روحانی اڑان کے لیے اندر کی تبدیلی اشد ضروری ہے۔

اگر آپ واقعی تبدیلی کے خواہاں ہیں اور اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ان باتوں پر توجہ دیجئے:

- 1- اس نقطہ نظر کا ہر وقت احتساب کیجئے جو آپ نے زندگی کے لیے اختیار کر رکھا ہے۔
- 2- معاشرہ ایک آدمی کو دو ہتھ بندھا کر مایاں اور بڑا کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ سوسائٹی کا اپنا نقطہ نظر ہے۔
- 3- سچائی انسان کو ہمیشہ اس روپ میں دیکھتی ہے جس میں وہ اپنے پرائیویٹ ذہن کے اندر بسرا کر رہا ہے۔
- 4- سچائی اس شخص کو ہمیشہ ایک خوفزدہ انسان کے روپ میں دیکھتی ہے جس کی شہرت اور دو ہتھ بندھائی اور مقبولیت اس کو اکلا پے اور دوسرے سے نہیں نکال سکتی۔

غصہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ہم کوئی چیز چھپا رہے ہیں اور کسی حقیقت کو نمایاں ہونے سے روک رہے ہیں..... میں بھر گیا اور میرے منہ سے جھاگ بننے لگا کیونکہ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ میرے ملنے کا راز کھلنے والا ہے..... لیکن ملنے کا ظاہر ہونا کوئی خرابی نہیں کہ اس سے خوف کو ختم دیا جائے بلکہ یہ تو ایک اعلیٰ درجے کا علاج ہے۔

صدے سے بچاؤ

جو خرابی لوگوں میں ہے اس سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اگر وہ خرابی آپ میں نہیں جو بیماری ان کو لگی ہوئی ہے وہ کبھی بھی آپ کو نہیں لگ سکتی۔ اگر وہ بیماری آپ میں پہلے سے موجود نہیں..... یہاں ایک سڑی قانون عمل حیرا ہے۔ جب تک آپ جارح کی سطح پر نہیں ہوں گے آپ کو کوئی بھی مجروح نہیں کر سکتا۔ جو بھی اس لیول پر آئیں گے آپ کو آسانی سے شٹ کیا جاسکے گا..... اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کو نیچے سے پتھر مارنے والے کبھی نہیں گرا سکتے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے۔

معصومیت

جب کوئی شخص آپ کو محکوم کرے۔ ضرب لگائے اور تحقیر کرے تو اس سے بڑی خاموشی کے ساتھ پوچھیں ”آپ کو یہ حق کس نے دیا کہ آپ میری کارشناسی کریں اور میرے بارے میں کوئی فتوے دیں۔ میرے بارے میں فتوے دیتے ہوئے آپ اپنے آپ کو مجھ سے برتر سمجھنے لگے ہیں۔ آپ کو اپنی اس برتری کا وہم کہاں سے ملا؟ کس نے بتایا کہ آپ برتر ہیں۔ اب آپ اپنے بارے میں بھی بتائیں کہ آپ کون ہیں۔ کیا آپ نے اپنے بارے میں بھی ایسا کوئی حکم صادر فرمایا؟“

ساری باتیں بڑے خنڈے دل و دماغ کے ساتھ اور بڑے پرسکون طریق پر کہیں۔ یہ ایک اچھا سٹارٹ ہے لیکن آپ کو اس سے بھی آگے جانا ہے۔ یہاں تک تو آپ نے اپنے آپ کو آزاد کر دیا اور یہ سمجھ لیا کہ ایک بیدار آدمی ایک خنڈے شخص سے بہتر ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ سارے خوابیدہ انسان ایسے ہی نا انصاف ہوتے ہیں وہ دوسروں میں عیب نکال کر خود کو سربلند کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے ذرا اپنا بھی اندازہ لگائیں کہ اگر آپ بھی نیند میں چل رہے ہوتے تو اس وقت کہاں ہوتے۔

جھوٹے الفاظ

الفاظ بڑے گمراہ کن ہوتے ہیں۔ ان کو سوچ سمجھ کر استعمال کرنا چاہئے۔ جو شخص مریضانہ طور پر دوسروں پر حکم چلانا چاہتا ہے دوسروں کو hurt کرنا چاہتا ہے اس کو لوگ بڑا دنگ آدمی اور بڑا ٹھکواں آفیسر کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ جو عورت اپنی تنہائی سے خوف کھاتی ہے اور اپنے آپ کے ساتھ رہنے سے ڈرتی ہے لوگ اس کو بڑی سوشل عورت کہہ کر پکارتے ہیں۔ اپنی ذات کے اندر گم رہنے والے آدمی کو ایک مضبوط ارادوں کا شخص تصور کیا جاتا ہے۔ اپنے آپ کو ذاتی فخر میں مبتلا رکھنے والی خواہش کو جرات اور استقامت کا نام دیا جاتا ہے..... لیکن یہ سب راستے کی ٹھوکریں ہیں۔ جو شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ جھوٹے الفاظ میری ترقی کی راہ میں حائل ہیں وہ آزادی کی نعمت سے ہنسنا رہنے لگتا ہے اور بہت آگے نکل جاتا ہے۔

نئی زندگی

اس وقت آپ کی جو زندگی ہے یا زندگی کا ڈھانچہ ہے اسے آپ کو مکمل طور پر توڑنا پڑے گا ختم کرنا پڑے گا کیونکہ ناکام ڈھانچہ توڑا ہی جاسکتا ہے اس کی مرمت نہیں ہو سکتی۔ لیکن جس روز آپ اس ڈھانچے کو توڑنے کی کوشش کریں گے آپ کے اندر سے احتجاج اور مدافعت کی ایک لہر برآمد ہوگی اور آپ کے رگ وریشہ میں جلوس نکالنے شروع کر دے گی۔ مخالف خیالات ہزار قسم کے بہروپ بھر کر سامنے آئیں گے کہ کیا کرتے ہو کیوں اس بنے بنائے ڈھانچے کو تباہ کرتے ہو۔ وہ تمہارے کانوں میں سرگوشی کریں گے کہ بھائی! تم پہلے ہی ٹھیک راستے پر ہو اب کوئی نیا اور غلط راستہ اختیار کر کے کیا کرو گے۔

لیکن ڈھانچہ توڑنے سے پہلے آپ کو علم ہونا چاہئے کہ اس قسم کے protests ضرور ہوں گے۔ اپنے علم اپنی سوچ اور اپنے ارادے کے زور پر ان بے ایمانوں کے نعروں کا سد باب کرو اور اپنی منزل کی طرف قدم بڑھاؤ۔

خوف اور نقصان

لوگ اکثر جو محسوس کرتے ہیں ہمیشہ اس سے الٹ بات کرتے ہیں۔ جو شخص لوگوں کو اپنے دن کی اہمیت بتا رہا ہوگا اس کا دن بڑا اچھوٹا اور تھوڑا گھرا ہوگا۔

بہت سے لوگوں کے پاس دین کا اور نفسیات کا بڑا علم ہوتا ہے لیکن ان کی زندگیاں بڑی خالی ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف باہر کا علم انسان کے اندر کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ظلم سے ظلم پیدا ہوتا ہے۔ پھر بھی ہر شخص دوسرے پر ظلم کرتا ہے۔ ظلم کے صحیح حصول کے لیے ان کو چھوڑنا ضروری ہے۔

خوف اور نقصان کے بارے میں اتنی بات سمجھ لیں کہ کسی شے کے یا شخص کے ضائع ہو جانے کے خوف کو اچھی طرح سے جانچیں۔ پھر اس پر علاج کا وہ عمل کریں جو آپ نے اب تک سیکھا ہے۔ جب نقصان ہوگا تو صرف نقصان ہوگا اس کے ساتھ خوف نہیں آئے گا۔

ذاتی تحقیق

جو شخص اپنی ذات کا کھوج لگانے کے لیے بہادری کے ساتھ اپنے اندر کو دگر گہرا کرتا ہے۔ اس کو بڑے بڑے خوفناک تجربات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ تکلیف دہ امر اس کے اندر مضمحل تصورات اور مضمحل اثرات پیدا ہونے کا ہے۔ یہ اثرات اس کو شدید جھٹکے بھی دیتے ہیں اور اسے قدم قدم پر مایوس بھی کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی میں پہلی بار دیکھتا ہے کہ کیسے کیسے اثرات نے اُسے پابند سلاسل کر رکھا تھا اور اس کا اُسے علم ہی نہیں تھا۔ یہ حیرانی اور پھر یہ مایوسی ہر اس خواص کا مقدر ہے جو اپنی تحقیق کے لیے اندر چھلانگ مارتا ہے اور تلاش میں مصروف ہوتا ہے۔

یہ بڑی اچھی خبر ہے۔ اس سے سفر طے ہونے کی نوید ملتی ہے۔ یہ ایک ایسی دوا ہے جو اپنے آپ کا سامنا کرتے وقت کی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔ یہ بیماریاں کیسی بھی خوفناک کیوں نہ ہوں اپنے علاج ہی کے لیے ابھرا بھر کر آگے آتی ہیں۔ یہ وہ کوتاہیاں ہوتی ہیں جو ہنر بننے کے لیے اپنے آپ کو آگے بڑھاتی ہیں..... جس طرح کسی نئے کھیل کو سیکھتے وقت بہت ہی بوجھل، بھدی اور ناقابل گرفت حرکات سرزد ہوتی ہیں جو آہستہ آہستہ پھرتی میں اور چابک دستی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

قدرتی اور نیچرل زندگی

آپ اپنی کارڈس چندر میل پہاڑ کے اوپر لے جاسکتے ہیں لیکن آپ کو یقین ہوتا ہے کہ چوٹی پر پہنچنے کے بعد پھر اترائی ہی اترائی ہے۔ یہ یقین اس لیے ہوتا ہے کہ آپ قدرت کے رازوں سے واقف ہیں اور پہاڑ کے خراج کو سمجھتے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ دنیا میں کوئی کار مسلسل اُپر ہی اُپر نہیں جاسکتی نہ ہی نیچے ہی نیچے جاسکتی ہے۔ یہ صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔

آپ کی زندگی میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ چینی فلسفی والے اس کو yin اور yang کے نام سے پکارتا ہے۔ ہم لوگوں سے اپنی زندگی میں یہی غلطی ہوتی ہے کہ ہم alternative کے راز کو پکڑتے نہیں ہیں۔ جو شخص آگے پیچھے جاتی لہر پر سوار نہیں ہوتا وہ ایک ایسی مقام پر ٹک کر رہ جاتا ہے (گلائیڈر جہازوں کے پائلٹ اس راز کو خوب سمجھتے ہیں) وہ یہی سمجھتا رہتا ہے کہ پہاڑ پر اُپر ہی اُپر چاٹنا زندگی سے نیچے آنا موت ہے۔ وہ زندگی بھر ایک نفسیاتی لڑائی لڑتا رہتا ہے اور ساری زندگی مشکلات میں گزار دیتا ہے۔

ایک سمجھدار انسانی زندگی کے سفر پر نکلتا ہے تو آسان راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ بلندی پر جانے کا پروگرام بنا کر نہیں نکلتا کہ نشیب میں اترنے کے خوف سے کا پتار ہے وہ تو بس سفر پر نکلتا ہے اور راستے سے جھکڑا نہیں کرتا۔ جو جھکڑا نہیں کرتا وہ منزل پر جلد پہنچ جاتا ہے۔

”علم ہم کو آزادی کس طرح عطا کر سکتا ہے؟ علم ہمارے اندر قدرتی بہاؤ کیسے پیدا کر سکتا ہے؟“

”محض دیکھنے سے اور مشاہدہ کرنے سے!“

”کیا دیکھیں؟ کیا مشاہدہ کریں؟“

”یہ دیکھیں کہ آپ اُس شخص کے غلام ہیں جس سے آپ خوفزدہ ہیں۔“

”اُس سے آزادی حاصل ہو سکتی ہے؟“

”بالکل! کوئی شخص جب جان جائے اور اس میں جانکاری پیدا ہو جائے تو پھر وہ غلام نہیں رہتا۔“

”جو شخص بھی اپنے غلطی پر ہونے کے تکلیف وہ احساس کا انکار کرتا ہے وہ کبھی بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ جو اس تکلیف وہ احساس کو تسلیم کر لیتا ہے وہ راستی میں داخل ہو جاتا ہے۔“

عام سوچ

یہ ایک خیال خام ہے کہ ایک عمومی اور چالو سوچ کے ساتھ تم اپنے مسائل کا حل کر سکتے ہو ایک عام خیال۔ ایک پیش یا افتادہ خیال اور ایک سیکنڈ ہینڈ سوچ کے ساتھ تم کسی بھی مسئلے کا حل تلاش نہیں کر سکتے کیونکہ ایک سیکنڈ سوچ ہی خود مسئلہ ہوتی ہے۔ ایک تھکی ہوئی سوچ اور ایک ٹھنڈی سوچ سے تم کوئی بات نہیں سکھ سکتے۔ جس طرح ایک برقانی ایک سوآپ کو گرم ملتان کے آموں کے بارے میں کوئی علم عطا نہیں کر سکتا اسی طرح چالو سوچ کچھ نیا اور کچھ اور نہیں بتا سکتی۔ سالہا سال تک ہم اپنے مسائل کی چار دیواری سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر نیا دن نئی دیواریں تعمیر کر کے اس چار دیواری کو اور بھی مضبوط بناتا ہے۔

مسائل کے لیے بالکل نئی سوچ کی ضرورت ہے۔ ایک عادی یادداشت اور ایک عادی ردیہ آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے سوچ کی مہارتی کے علاوہ کسی اور شے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نئی سوچ پیدا کرو اور اصل ڈھونڈ لو۔

سوچ اور مسئلہ

کسی مسئلے کے بارے میں سوچنا اور کسی مسئلے کا کھلی نظروں اور واضح سوچ کے ساتھ مطالعہ کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کسی مشکل کے بارے میں سوچتے رہنے سے وہ مشکل کبھی بھی حل نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ سوچ اور مشکل دونوں ایک ہی نفسیاتی سطح کی پیداوار ہیں۔ ایک محبوس خیال اور Conditional سوچ ہی اس مسئلے کی ماں ہے جس کے بطن سے یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ اسے حل کرنے کے لیے کسی اور سطح کی ضرورت ہے۔ ایک اونچی اور ارفع سطح کی ایہ اونچی اور ارفع سطح ایک کھلے ذہن میں پیدا ہوتی ہے اور کھلا ذہن وہ ہوتا ہے جو جملہ کرے اور نہ اس لیے مدافعت کرے۔

Self Esteem

عزت نفس و توقیر ذات

- 1- عزت نفس اور توقیر ذات وہی عطا کر سکتا ہے جو فرد محترم ہستی ہے۔ ایک باعزت انسان ہے۔
- 2- ہم نے اپنے آپ کو باعزت نہیں بنایا۔ ہم نے اپنے آپ کو کامیاب ضرور بنایا ہے۔ کامیاب سیاستدان کامیاب دانشور اور کامیاب وکیل صحافی وغیرہ وغیرہ۔
- 3- اپنی عزت نفس میں اضافہ کرنا آسان ہے۔ آپ اچھی چیزیں کریں اچھے فعل اپنائیں اچھے ارادے باندھیں اور ان کو یاد رکھیں کہ میں نے ایسے کیا تھا۔

ہم میں سے اکثر لوگ زندگی کو ریفریجریٹر بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم بالکل ایسے ہی رہنا چاہتے ہیں جیسے کہ ہم اپنے آپ کو فریش تر دنا زہ اور نو بہ نور رکھنے کے آرزو مند ہوتے ہیں کہ وقت گزرنے پر بھی ہماری شکل و صورت اور جوانی میں کمی نہ آنے پائے۔ ہم اپنے آپ کو ریفریجریٹر میں اس لیے رکھ کر چلتے ہیں کہ اندر سے چاہے ہم کتنے بھی رنے اور پامال کیوں نہ ہو جائیں لیکن باہر سے ہمارا دم خم اور چمک دمک قائم رہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ زمانے کے ریفریجریٹر اور اس کی چیرہ دستیائیں ہم کو نا آسودہ کر دیں اور ہماری تروتازگی نہ رہے۔ جس طرح فرج کے اندر ہر شے الگ الگ رکھے رکھی جاتی ہے اسی طرح ہم بھی چاہتے ہیں کہ ہم اپنے وقت کے ریفریجریٹر میں ایک دوسرے سے دُور ہو کر رہیں تاکہ ہمارے وجود میں پامالی کے آثار پیدا نہ ہوں۔

لیکن یہ درست نہیں ہے۔ زندگی ریفریجریٹر نہیں ہے زندگی ایک نوسٹری مانند ہے۔ زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے باہر کے دباؤ کو اور بوجھ کو آپ کو نوسٹری کے اندر دھکیلنا چاہئے تاکہ آپ زندگی کے تقاضے پورے کر کے اپنی بارگاہ پر ابھرائیں اور وہ سینک جس نے آپ کو توانائی بخشی ہے آپ کے قدموں تلے سے ختم ہو جائے۔

انسانی زندگی میں جب تک نیچے سے تھوڑی گرمی نہ ملے زندگی باسی ہو جاتی ہے۔ باسی شے کو قابل استعمال کرنے کے لیے اُسے سینک دیا جاتا ہے گرمی پہنچانی جاتی ہے اور اس کا باسی پن دور ہو جاتا ہے۔ جب اشیاء بالکل ٹھنڈ ہو جائیں اور استعمال کے قابل نہ رہیں تو ان کو سینک دے کر گرم کیا جاتا ہے اور استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ایسے ہی انسان ہے جب تک وہ اپنے آپ کو حالات کے نوسٹری میں ڈال کر گرم نہیں کرے گا وہ پھدک کر باہر نہیں آسکے گا۔ زندگی کی بھی تھوڑی سی گرمی ضرور ہے کہ آپ باسی نہیں رہے تروتازہ ہیں۔ اپنے آپ کو ریفریجریٹر میں سنبھال سنبھال کر نہ رہیں۔ زیادہ وقت گزرا تو آپ استعمال کے قابل نہیں رہیں گے۔

آپ اس گھر میں ایک مہمان کی طرح ہیں۔ زندگی نے آپ کو دعوت دے کر قہر بھج کر کچھ اچھا وقت گزارنے کے لیے بلایا ہے۔ آپ کو پتہ نہیں آپ اس گھر میں کتنی دیر رہیں گے۔ لیکن جتنی دیر بھی رہیں ایک اچھے مہذب اور شائستہ مہمان کی طرح رہیں۔ دھیرے سے چلیں، آہستگی سے چلیں تاکہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو۔ آپ کے گھر کے ساتھ کے گروں میں دوسرے مہمان بھی آکر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کا احترام بھی لازم ہے۔ جن کو یہ معلوم کرنا ہوگا کہ آپ بھی ان کی قیام پذیر ہیں وہ خود آکر معلوم کر لیں گے۔ آپ آگے بڑھ کر ان کی ناک میں دم نہ کیے جائیں۔ جو چیز جہاں سے اٹھائی ہے وہیں واپس رکھ دیں۔ اس علاقے کو ایک ڈھیر کی صورت میں تبدیل نہ کریں اس کی صفائی اور سترائی آپ کا ذمہ داری ہے۔

اگر آپ دیکھیں کہ کوئی چیز مرمت کی طلبگار ہے اس کی مرمت کروائیں۔ خواہ آپ کی ہو یا مشترکہ گروہ کی ہو۔ ان سے محبت سے دلجمعی سے مرمت کروائیں اور اس جگہ کو ایسے ہی چھوڑ کر جائیں جیسے آپ نے اس کو پایا تھا (ہمارے ہاں سمندر پہاڑ کھیت، جھیلیں میدان اور ریگستان)۔

اور ایک بات ضرور یاد رکھیں کہ زیادہ شکوہ و شکایت نہ کریں۔ زندگی کو احتجاجی نہ بنالیں ہر وقت مسٹر اور مسز

شکایت نہ بنے پھر۔ جب آپ کو کسی مخصوص بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو اس وقت زبان کھولیں لیکن ادب کے ساتھ محبت کے ساتھ اخلاص کے ساتھ..... زندگی آپ کے لیے جو چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی کرتی ہے اس کے لیے اس کا شکریہ ضرور ادا کریں۔ دیکھئے زندگی کسی اور کو بھی اس گھر میں بلا کر مہمان رکھ سکتی تھی مگر اس نے آپ کو اور صرف آپ کو بلا کر رکھا اور آپ کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ اپنے میزبان کو مایوس نہ کریں اس کو بھی خوشیوں سے مالا مال کریں۔

اس زندگی میں کئی مرتبہ دوزخ میں سے ہو کر گزرتا پڑتا ہے۔ لمبا چوڑا وحشت ناک 'دکھتا اور کھوتا' ہوا دوزخ تقریباً ہر شخص پر یہ وقت آ جاتا ہے۔ اس پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ لیکن اگر خدا نخواستہ کسی پر یہ مصیبت آ جائے کہ وہ دوزخ میں پہنچ جائے تو سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ وہاں داخل ہوتے ہی وہاں سے بھاگ جائے۔ مشرق ہو یا مغرب شمال ہو یا جنوب جہر بھی راستہ ملے سر پٹ دوزخ لگائے اور اس عذاب سے نکل جائے۔

لیکن میں نے تقریباً تمام لوگوں کی ایک عجیب عادت دیکھی ہے کہ جونہی وہ دوزخ میں داخل ہوتے ہیں وہ وہاں سے بھاگ نکلنے کے بجائے دوزخ کے نو ٹوکھینچنے لگتے ہیں۔ جیسے سیاح لوگ اپنی سیاحت کے دوران نئے نئے مناظر کے نو ٹو لیتے ہیں۔ اسی طرح دوزخ میں جانے والے اپنے اپنے کسرے نکال کر دوزخ کے "سنیپ شاٹ" لینے لگتے ہیں اور اس تکلیف دہ ماحول میں ریلیوں کی ریلیں ختم کر دیتے ہیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ وہ اس عبرت ناک جگہ سے بھاگیں وہاں گھوم پھر کر اس کی رنگین فوٹو گرافی شروع کر دیتے ہیں۔

پھر جب وہ واپس اپنی نامل زندگی میں آتے ہیں تو ان کے پاس دوزخ کی "وزٹ" کے اتنے زیادہ الم ہوتے ہیں کہ ان سے اٹھائے نہیں جاتے اور وہ انہیں ایک ٹرائی میں ڈال کر چلتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے گھر پر آنے والے مہمانوں کو بھی دوزخ کی یہ تصویریں دکھاتے ہیں اور کسی کے ہاں مہمان جا کر بھی اپنے المیوں کی ٹرائی ساتھ لے جاتے ہیں۔

تقریب چاہے کسی بودہ اپنی دوزخی زندگی کا الم لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور ترتیب سے بتانے لگتے ہیں کہ ان پر کیسا کیسا مشکل وقت آیا۔ زندگی نے ان پر کیسی کیسی زیادتیاں کیں۔ زمانے نے کس طرح سے بے رحمی کی۔ احباب اور رشتہ داروں نے کیسے کیسے مظالم ڈھائے۔

ہر وقت دولت کے بارے میں سوچتے رہنا: اپنی دولت کی کمی کے بارے میں دوسروں کی بروہتی ہوئی دولت کے بارے میں۔ لٹی ہوئی دولت کے بارے میں۔ لٹیروں کے بارے میں..... ایسی سوچ کی ساری لہریں ہم کو عقلی صلاحیتوں سے محروم کر دیتی ہیں اور ہماری روشن سوچ کے راستے میں اندھی چٹانیں کھڑی کر دیتی ہیں۔ دولت کے ذکر سے دولت کی گفتگو سے اور دولت سے مرعوب ہونے کے ضمن میں ہر شے سے احتیاب کرنا چاہئے۔

زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ زندگی ایک تحفہ ہے..... تم اس کے حقدار نہیں تھے اور نہ ہی یہ تمہاری وراثت تھی لیکن یہ تم کو دے دی گئی۔ عطا کر دی گئی..... تم نے زندگی حاصل کرنے کے لیے نہ تو کوئی کوشش کی نہ جدوجہد کی۔ نہ سفارش کی نہ رشوت دی لیکن یہ تم کو مل گئی۔ بے قیمت اور مفت..... کوشش جتنی بھی ہے اس کا اتنا سے تعلق ہے۔ کوشش ہمیشہ دکھ اور الم کو جنم دیتی ہے۔ ہر کوشش تمہارے خلاف جاتی ہے۔ ہر کوشش نے تم کو مار مار کر ادھوا کر دیا ہے۔ یہ تم سے

خود بھی کروا رہی ہے..... اگر اتنی بڑی ایسی خوبصورت زندگی بغیر کوشش کے مل گئی کسی دعوے کے بغیر مل گئی تو پھر خوشیاں بھی مل سکتی ہیں۔ محبت بھی مل سکتی ہے۔ آئندہ بھی مل سکتا ہے۔ ذات بھی مل سکتی ہے۔

ہماری زندگی مسلسل عذاب میں گزر رہی ہے۔ اس لیے نہیں کہ روپیہ پیسہ ہماری اہم ضرورت ہے بلکہ ہماری زندگی اس لیے اجرن ہو گئی ہے کہ روپیہ پیسہ اس قدر خاص اہم نہیں ہے۔ اگر دولت اور روپیہ پیسہ اس قدر اہم ہوتا تو ہماری زندگی کا ہر پہلو اس کے قبضے میں ہوتا۔ ہر زاویہ اس کے تصرف میں ہوتا لیکن یوں نہیں ہے۔ طلوع سحر چاندنی رات 'میشی نیند' افضل پر جموتا نڈا 'اون کے گولے سے کھیتا بلوگڑا' بیٹے کی گالوں پر لگی چٹھی 'بیٹی کے کانوں میں پیتل بالیاں۔

خوف کا علاقہ

لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے "پجارڈ" اور کلاشکوف کو چہرہ کرانے کی رسم۔ امارت کا اظہار جس سے اپنے ہم وطنوں کو ڈرایا جاتا ہے۔ اس خوفزدہ اور سبھی ہوئی قوم کے اندر جب کوئی باہر کا حملہ آور داخل ہوتا ہے تو خوفزدہ قوم بالکل قدموں پر گر جاتی ہے کیونکہ حملہ آوروں کے پاس مقامی سرداروں کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہتھیار اور زیادہ بہتر پوزیشن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیرونی حملہ آوروں کا بھی پنجاب میں مقابلہ نہیں کیا گیا اور ان کو ہاتھ باندھ کر اور ہار ڈال کر آگے رخصت کر دیا گیا۔

اب بھی اگر روس افغانستان کے بجائے ہمارے یہاں آ جاتا تو ہم ہاتھ باندھ کر ماتھا ٹیک کر سب کچھ اس کے حوالے کر دیتے۔

پاکستان کے لوگوں کو گھر کے لوگ ہی ڈرا کر اور دھمکا کر رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کسی حملہ آور کو یہاں مشکل نہیں پڑ سکتی۔

میں نے اپنے آپ کو بڑے مہنگے بھاؤ خریدا ہے ڈاکٹر صاحب مجھے ذرا سنبھال کر اور ذرا سوچ کر ہاتھ لگانا۔ میری اس ذات کے پیچھے میری پوری زندگی صرف ہو گئی ہے۔ میں نے مسلسل محنت کی ہے لگاتار جدوجہد کی۔ چوبیس گھنٹے کام کیا ہے تب جا کر میں نے پینتھ برس کی عمر میں اپنے آپ کو پورے طور پر خریدا ہے بلا شرکت غیرے۔ میرے پاس میری ذات کا بیع نامہ موجود ہے۔ یہ ذات کسی اور کو منتقل نہیں ہو سکتی۔ یہ میری ہے اور میری رہے گی۔ میرے بیٹے ہر وقت اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ میری ذات کا مختار نامہ حاصل کر لیں اور مجھے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کریں لیکن میں ایسا ہونے نہیں دیتا۔ میں کبھی بھی ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میری اولاد نیک اور سعادت مند ہے لیکن میں اپنی ملکیت کو کسی بھی صورت میں ان کے حوالے نہیں کر سکتا۔ یہ میں نے بڑی محنت سے بنائی ہے۔ میں خود کو زہ و خود کو زہ گرد و خود کو زہ ہوں اور اس وقت میں شخصیات کی منڈی میں اپنی ساکھ کی دکان پر بیٹھا ہوں۔ یہ سب میری محنت اور جان ماری کی وجہ سے ہے کہ زور دراز کے لوگ 'غیر ملکی تاجر' دوسرے صوبوں کے بیوپاری اور حکمران شخصیتیں میری دکان پر آتی ہیں اور مجھ سے میرا سودا کرتی ہیں کہ وہاں سوائے میری ذات کے اور کوئی سودا ہی نہیں کوئی سامان ہی نہیں۔ وہاں صرف میری ذات کی منڈی

چلتی ہے اور یہ منڈی جناب ایسے ہی نہیں بن گئی۔ اس کے لیے میں نے بڑی محنت کی ہے۔ بڑا زور لگایا ہے بڑا پسینہ بہا ہے۔ یہ خود دکھاس نہیں ہے۔ آسمانوں سے اترنے والی شبنم نہیں ہے اس پر بڑے سال لگے ہیں بڑے ریت جکے ہوئے ہیں۔ بڑے پسینے ٹپکے ہیں۔

..... لیکن جو شخص اپنی شخصیت کا مالک ہوتا ہے جس کی ذات اس کی ملکیت ہوتی ہے وہ اپنی ذات اپنے ساتھ لے جاتا ہے اسی لیے تو لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص اپنے پیچھے خلا چھوڑ گیا یعنی وہ اپنی ذات اپنے ساتھ لے گیا۔ ایسا شخص اس بات کا خواہشمند بھی نہیں ہوتا کہ اس کا چھوڑا ہوا خلا پُر ہو جائے۔ اس نے محنت کر کے اپنی ذات کو بنایا تھا۔ دوسرے بھی محنت کر کے اپنی ذات بنائیں۔ کوشش کریں جدوجہد کریں۔ اپنی ذات کو طاقتور بنائیں اور پھر جاتے ہوئے اپنی ذات کو ساتھ لے جائیں۔ وہ بھی ایک خلا چھوڑ جائیں۔ جن لوگوں نے اپنی ذات کو اپنی پراپرٹی نہیں سمجھا وہ اُسے نہیں چھوڑ جاتے ہیں۔ اپنی زندگی میں بھی اُن کی ذات ان کے مصروف کی نہیں ہوتی بعد میں بھی اُن کے کسی کام نہیں آتی۔ کیا وجہ؟ وجہ یہ کہ انہوں نے اپنی ذات محنت کوشش اور جدوجہد کے حاصل نہیں کی ہوتی بلکہ یہ ایک عطا کی صورت میں ایک گفٹ کی صورت میں انہیں ملی ہوئی ہے اور عطا کا بنیادی فریم ورک یہ ہے کہ اس سے معطلی کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔

جرات (Courage)

جرات بھی دوسری شفقت اور رحمت کی طرح انسانی معراج کا ایک زینہ ہے۔ آج تک کوئی بھی جرات اور بہادری کے بغیر ترقی کی منازل طے نہیں کر سکا۔

جرات اُس تین منزلہ مکان گیت اور facade کا نام ہے جس کے اندر انسان بستا ہے۔ انسانی وجود کے مکان کے تین حصے ہیں: (1) ایک جسمانی حصہ (2) ایک ذہنی حصہ اور (3) ایک روحانی حصہ۔ ان تینوں حصوں یا منزلوں کا ہونا ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسان کی زندگی کا آگے بڑھنا اور اس کا نشوونما پانا ناممکن ہے۔

جرات آپ سے تقاضا کرتی ہے کہ آپ اپنے اور دوسروں کے حقوق کے لیے کھڑے ہو جائیں اور ان حصوں کو منوانے کے لیے سینہ پر ہو جائیں۔

جرات آپ کو مجبور کرتی ہے کہ آپ اپنے آپ کو اپنے معاشرے کو اور اپنے ملک کو تعمیر کرنے کے لیے سختی اور شقاوت کے بجائے محبت اور شفقت سے کام لیں۔ تھکلیک کے بجائے ایمان اور اوسان کے اندر زندہ رہیں۔ باپوی کے مقابلے میں امید کے سہارے۔ مشکلات کے نیچے دہنے کے بجائے ان پر حاوی ہو کر خود اعتمادی کی جرات پیدا کریں۔ غلطیاں تسلیم کرنے کی جرات اور اپنے آپ کو perfect نہ پا کر رونے بسورنے سے احتراز۔

یہ ہیں صحیح جرات کے مظاہر۔ باوجود اس کے کہ آپ اپنے اندر ایک جزیرہ ہیں لیکن یہ جزیرہ انسانوں کی دنیا میں آباد ہے اور انسانوں کے درمیان زندہ ہے۔

کوئی شخص جو خوشی اور مسرت کے حصول کے لیے ہر گھڑی کوشاں ہو اور جو ہر وقت اس خیال میں ڈوبا رہے کہ میں کس طرح سے حاصل کی جائے خوشی سے دُور رہتا ہے۔ اس کی خوشی کے حصول میں یہی فکر پیچیدہ کہ خوشی کیسے حاصل کی جائے۔ یہی دوسرا ہر دم حائل رہتا ہے۔

خوشی کوئی خالی خالی تصور نہیں ہے۔ کوئی آئیڈیا نہیں ہے۔ آئیڈیا ہمیشہ دوسرے آئیڈیا کے مقابلے میں کھڑا رہتا ہے۔ یادہ جیت رہا ہوتا ہے یا اس کے سامنے ہار رہا ہوتا ہے۔ انسان ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اور خوشی صرف اسی صورت میں محکم خانہ میں اترتی ہے جب وہ شخص خیالوں کا اور آئیڈیوں کا تعاقب کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ جب اُس کے ذہن سے یہ بات نکل جائے کہ خوشی اور خوشی کا ذکر ایک ہی بات نہیں ہے۔ تو وہ شخص سردیوں میں لال دھب کے مزے لے رہا ہوتا ہے۔ سورج کا تجزیہ کیے بغیر یوں کیا کرتا ہے۔

راج کا دن کمال کا دن ہے

ایمان اور یقین کیا بات ہے۔ ہر شخص کو آج کے اندر داخل ہونے کی دعوت ہے۔ ہم سب حال کے اندر بیٹھے رہنے لے رہے ہیں۔ نہ ماضی کی یاد ہے نہ مستقبل کا خوف۔ آج کے اندر رہنا اور آج میں داخل ہونا صاحب حال ہونا ماضی مستقبل کو چھوڑ کر عطا کردہ حال میں رہنا۔ کچھ لوگ مستقبل کے بارے میں فکر کر کر کے اپنے حال کو تباہ کر لیتے ہیں۔ کچھ ماضی کو یاد کر کے حال سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ پھر چند سال اسی حال کو یاد کرنے لگ جاتے ہیں۔

آج پھول کھلے ہیں اور بڑے کمال اور بڑے رنگ کے کھلے ہیں۔ ان کا نظارہ کریں، آپ کے نظارے کے لیے کھلائے گئے ہیں۔

آج پرندے چہچہا رہے ہیں۔ آپ کے لیے گیت گارہے ہیں۔ آپ کو ان کی آواز سنائی ہی نہیں دیتی کہ آپ سڑے شور کو سننے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔

آج بہت سے لوگ مدد کے لیے پکار رہے ہیں، ان کی مدد نہ کریں، ان کی بات ہی نہ سنیں۔ کیا آپ کو پتہ ہے آج کا دن وہی دن ہے جس کا آپ کل خواب دیکھ رہے تھے۔ لو جناب آگیا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ اچھی بات کریں۔

(یاد رہے یہ میں اپنی نظم کہنا دینا نہیں بھی آپ عرض کر چکا ہوں کہ حال میں رہنے والا ہی اس عمل سے گزر سکتا ہے۔)

اگر میں تمہارا دوست ہوں اور تم میرے دوست ہو تو یہ ہمارے لیے بڑا اعزاز ہے کہ ہم نے دنیا کے بڑے

بڑے مشہور، لائق، فائق، اعلیٰ درجے کے لوگوں کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو پسند کیا! کیا پاکیزہ رشتہ باندھا، واودا۔

دوستی کا رشتہ عمر بھر چلتا ہے۔ جوان ہوئے تو شادی ہوگئی۔ بہن بھائی، گھر حلقہ شہر چھوٹ گیا۔ بوڑھے ہوئے تو اولاد چھوڑ گئی لیکن دوستی میں یہ تبدیلی نہیں آتی۔ (شاید اس وجہ سے کہ دوستی ایک ہی age bracket میں ہوتی ہے۔)

دوستی کا رشتہ بے لوث ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ روحانی ہوتا ہے اور رشتوں میں تو کچھ جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنا پڑتا ہے، کچھ پیٹ کی ضرورتوں کو مگر یہاں صرف روح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا تقاضا ہوتا ہے۔ روحیں ایک دوسری کے ساتھ ہم آغوش ہو جاتی ہیں اور جسمانی یا بدنی تقاضا ایک بھی نہیں ہوتا۔

والدین بچپن کے وقت ملتے ہیں۔ بیوی یا شوہر جوانی کی عمر میں ملتے ہیں۔ بچے شادی کے بعد کی عمر میں نصیب ہوتے ہیں۔ بہن بھائی لڑکپن میں دستیاب ہوتے ہیں لیکن دوستی کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔ آپ آٹھ کے ہوں یا اسی کے۔ نو کے ہوں یا نوے کے۔ سولہ کے ہوں یا ساٹھ کے، آپ دوست بن سکتے ہیں، دوستی کر سکتے ہیں۔

دیکھو مجھے نظر تو نہیں آتا لیکن میرا ایمان ہے کہ اس کمرے میں ریڈیو کی لہریں بھری پڑی ہیں۔ ٹی وی کی لہریں ناچ رہی ہیں اور میں ریڈیو پر یا ٹی وی پر اپنی پسند کا سنگٹل پکڑ سکتا ہوں۔ اسی طرح سے میرا ایمان ہے کہ یہاں خدا کی آواز اور خدا کے احکام موجود ہیں اور میں اپنی ذات کے ریڈیو پر ان سنگٹلوں کو پکڑ سکتا ہوں لیکن اس کے لیے مجھے اپنی ذات کو ٹیون کرنا پڑے گا اور ایمان کیا ہے؟ خدا کے خوابوں کو اپنے خواب میں دیکھنا۔

ایمان کیا ہے؟ ایک اختیار ہے choice ہے، کوئی مباحثہ یا مکالمہ نہیں۔ یہ ایک فیصلہ ہے، مباحثہ نہیں ہے۔ یہ ایک Commitment ہے کوئی زبردستی نہیں ہے۔ یہ تمہارے دل کے خزانوں کو بھرتا ہے اور تمہاری ذات کو مالا مال کرتا رہتا ہے۔

خداشات + بے یقینی

1868ء میں دنیا کے تمام اخباروں نے بھر کے ایڈیٹوریل لکھے کہ یہ جو ”ٹیلی فون“ کی پر لطف اور مسکون خبر اڑی ہے، یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ کسی طرح سے ممکن ہو سکتا ہے کہ آدمی گھر بیٹھے بٹھائے کسی دوسرے سے بات کر لے۔ خاص طور پر اس وقت جب دوسرا دو تین میل کی دوری پر موجود ہے۔ یہ سب چالاکی ہے اور Trick ہے اور قارئین کرام کو محتاط رہنا چاہیے کہ وہ ٹیلی فون لگوانے کے لیے نو سربازوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں جو ان کے پیاروں سے بات کرانے کا بہانہ کر کے ان سے رقم ایٹھ کر لے جائیں گے اور بات ساری زندگی نہیں ہو سکے گی کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں اور دنیا میں ایسا آلہ بن ہی نہیں سکتا۔

جب wright برادرز نے کامیابی کے ساتھ اپنا جہاز اڑا لیا اور پانچ برس تک بار بار اڑا کر دکھاتے رہے تو ہر دقیق پرچے نے ان کا احوال اور اس پرواز کی تفصیلات شائع کرنے سے انکار کر دیا کہ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا اور یہ سائنسی طور پر ممکن نہیں۔ اصل میں بات یہ تھی کہ ماہر سائنس دان نے ریاضیاتی عمل سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ہوا سے بھاری مشینیں

بھی بھی صورت میں ہوا میں پروا نہیں کر سکتیں۔

اشارہ ہویں صدی کے معروف فرانسیسی سائنسدان موسیو نے اعلان کیا کہ شہاب ثاقب کوئی شے نہیں ہیں اور کسی بھی صورت میں موجود نہیں۔ اس نے کہا آسمانوں سے پتھروں کا گرنا ایک انہونی اور ناممکن سی بات ہے کیونکہ آسمانوں میں کوئی چٹانیں نہیں ہیں جن سے پتھر ٹوٹ ٹوٹ کر گر سکیں۔

1914ء سے پہلے فرانسیسی فوج کے جرنیلوں نے طویل مطالعے کے بعد یہ قول فیصل دیا کہ ہوائی جہاز دشمن کی ہڈیوں کا مطالعہ تو کر سکتے ہیں لیکن اس سے ماوراء کسی کام کے نہیں۔ انہیں کسی فوجی کام کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکے گا۔ جب پیرس کی اکیڈمی اور سائنس میں پہلی مرتبہ گراموفون کا تواجرا کر سنایا گیا تو اکیڈمی کے ڈائریکٹر نے ریکارڈ بجانے والے کا گلہ پکڑ کر گھونٹ دیا کہ تم مکاری کے ساتھ آواز نکال رہے ہو اور پتہ نہیں چلنے دیتے ہو۔ جیسے جیسے اس کا گلا ملتا گیا اور اس کی آنکھیں باہر ابلتی رہیں، ریکارڈ کا گانا اور اونچا ہو کر مزے سے چلتا رہا۔

فروری 1918ء میں نے کہا ہے کہ اگر ہم فکر مند نہیں ہوں گے تو بھوکے مریں گے اور دارالامان میں جا کر زندگی بسر کریں گے اور اگر ہم فکر کرتے رہیں گے تو پاگل خانے میں جا کر فوت ہوں گے۔

زندگی ان دنوں اپنی قدر مشکل ہوگئی ہے کہ ہمیں ڈھنگ سے فکر کرنا بھی نہیں آتا۔

1۔ ہم بھاری حملہ آور کی فکر کرتے رہیں گے اور اپنے پڑوسی کی کار کے نیچے آ کر دب کے مر جائیں گے۔

2۔ ہم ریڈیو یا ٹیلی فون کی آواز کی فکر کرتے مر جائیں گے اور تمباکو کے زہر کوٹھن سے فوت ہو جائیں گے۔

3۔ ہم ہوائی جہاز کے کریش سے خوفزدہ رہیں گے اور سڑھی سے گر کر فوت ہو جائیں گے۔

4۔ ہم ایک سرساز کے نہ ہونے کی شکایت کرتے رہیں گے اور ڈاک کے ڈبے میں چشمی ڈالنے کے لیے گیراج سے موٹر نکال لیں گے۔

تو عرض یہ ہے کہ ہم فکر مند کی کفن سے بھی نا آشنا ہو گئے ہیں اور ہم صحیح فکر کرنا بھول گئے ہیں۔ فکر کرنا ایک اچھی بات ہے اور اس سے بہت سے کام سنور جاتے ہیں۔ بچے پل جاتے ہیں، گھر چلتے ہیں، دفتر کا نظام قائم ہوتا ہے۔ بزرگوں کی نگہداشت ہوتی ہے۔ فکر مندی ایک صحت مندانہ اقدام ہے۔ یہ کام کرنے میں Motivate کرتی ہے۔

سب سے ضروری فکر اپنی روح کی ہونی چاہیے اور سب سے اہم فیصلہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنا ابد کہاں گزار رہے ہیں اور کیا گزار رہے ہیں۔ یہ سوچنا ہے کہ اگر ہم کو ساری دنیا کی دولت مل جائے اور روح میں گھانا پڑ جائے تو پھر یہ کیا سوا ہے!

بھلا انسان ضرورت سے زیادہ Worry کیوں کرتا ہے اور اس کے کیا نقصانات ہوتے ہیں تو عرض یہ ہے کہ:

1۔ فکر مندی اور اندیشہ ناکی اس وقت شروع ہوتی ہے جب انسان اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ وہ سمجھتے

ہیں کہ اب ہر شے کا بوجھ ہمارے کندھوں پر ہے اور ہم ہر فعل کے ذمہ دار ہیں۔ جب بھی انسان خدا کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتا ہے، وہ چبا ہوا جاتا ہے۔

2- ضرورت سے زیادہ عمل و ہریت کا نتیجہ ہے اور خدا سے دوری کی وجہ سے ہوئی ہے۔ جیسے کوئی خدا کی خدمت میں ایک مرتبہ ایک صاحب بہت ہی پریشان تھے اور گھبراتے پھرتے تھے تو ان کی بیوی نے پوچھا ”کیا بات ہے“
نوحہ بانہ اللہ تعالیٰ نصیب دشمنان فوت تو نہیں ہو گئے؟“

3- اس Worry کے وجود میں آنے کی وجہ ایک چھوٹا سا لفظ ”اگر“ ہوتی ہے۔ اگر یہ ہو گیا، اگر وہ ہو گیا، اگر میں مر گیا، اگر وہ نہ آیا، اگر وہ آ گیا وغیرہ وغیرہ۔

رومیوں نے یونانیوں کو لکھا کہ اگر تم تمہارے علاقے میں آ گئے تو تم تمہارے علاقے کو جلا کر خاکستر کر دیں گے اور سطح زمین سے ملا دیں گے۔ یونانیوں نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے لیکن..... اگر!“
ہمارے ڈاک خانے میں میر صاحب پوسٹ ماسٹر تھے جو ان اندیشوں اور فکر مند یوں کی ڈائری لکھتے رہتے تھے جن سے وہ خوفزدہ رہتے تھے۔ سال بعد جب وہ اپنی ڈائری دیکھتے تو ان ہزار ہا فکر و اندیشوں میں سے ایک آدھ ہی صورت پذیر ہوا کرتا۔

اس نے کہا، جب بادل اٹھ گھمڈ کر آئیں اور تیز ہوائیں چلیں تو میں سوتا ہوں اور جی بھر کے سوتا ہوں۔ مجھے اپنے یہاں ملازمت دے دیجئے۔ زمیندار نے تجس کے طور پر اسے نوکری دے دی اور ایک روز جب تیز ہوائیں چلیں اور ساون کی گھٹائیں آئیں تو زمیندار کو اپنا ملازم نظر نہ آیا۔ اس نے دیکھا، باڑے کا بھانگ بند ہے اور اس کا ارل لگا ہے۔ بھوسے پر ترپال ڈال کر اس کے کنارے پتھروں سے دبائے ہوئے ہیں۔ مرغیوں کی ٹوٹی ہوئی چھت پر پرانا دروازہ ڈالا ہوا ہے اور ملازم اپنی کٹھڑی میں گھوک سو رہا ہے۔ اس نے کہا، واہ بھئی شاہاش سنت پوری کر دی اور اونٹ کا زانو احتیاط سے باندھ دیا۔

تائی پیدا ہوئے کہا، میں جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ چار بچوں کا بوجھ نہ کام نہ کار۔ میں نے دو روپے کے کاغذ پر اٹھ سے شراکت نامہ کر لیا کہ کام میں کرتی جاؤں گی، مگر میری جگہ تو کرتے جانا۔ اس نے رضامندی کر لی۔ جب سے اب تک ہمارا شراکت کا کاروبار بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔

رات کو سونے سے پہلے میں ضروریہ دعا کرتا ہوں ”یا اللہ دن میں نے پورا زور لگا کر تیری مرضی کے مطابق گزار دیا۔ اب میں سونے لگا ہوں۔ رات کی شفقت تو سنبھال لے۔“

جب ہم ایسا کچھ کرتے ہیں کہ ہمارا اندر بتاتا ہے کہ یہ گناہ ہے تو ہم اپنی عزت نفس سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ پھر اپنے ساتھ زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ (رشتہ، بددیانتی، حرص وغیرہ) پھر ہم ندامت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ خمیر ہر وقت ملامت کرتا ہے۔ بے خواب راتیں بستر ہوتی ہیں۔

اب ہم یا تو اس کو بھول جائیں یا ان کو دماغ سے نکال دیں لیکن دونوں ہی کام مشکل ہو جاتے ہیں۔

اس کے برعکس ایک فعل ندامت پشیمانی اور توبہ ہے۔ جب ہم اپنے خدا کے سامنے توبہ کرتے ہیں تو نہ صرف ہماری توبہ قبول ہو جاتی ہے بلکہ ہم بھی قبول ہو جاتے ہیں۔ پھر زندگی آسان ہو جاتی ہے۔

موسیٰ: عظمندی کا تقاضا تو یہی ہے کہ انسان خدا کے تصور کو شعوری طور پر ٹھیک طرح سے سمجھ لے ایسا نہ ہوا تو پھر کوئی اور شے خدا بن کر اپنی پوجا کروانے لگے گی۔

زندگی میں کبھی ہمدردی کے طلبکار نہ ہونا، خوش رہنا، کلیلیں بھرتا اور تم کو محبت ملے گی..... ہمدردی کے طالب کو کبھی بھی نہیں محبت نہیں ملتی۔ ہمدردی تمہارے خزانے کو کبھی بھی نہیں بھر سکتی۔

رواں دواں رو کے برخلاف جانے کا نام ہے۔ ہماری ہر قسم کی Conditionling کے خلاف جانے کا نام۔ ہم کیسے کھاتے ہیں، ہم کیسے کرتے ہیں، کیسے بولتے ہیں اور کیا سوچتے ہیں؟

انسان کیا ہے۔ دیکھنے کو تو دوسرے جانوروں جیسا ایک جانور ہے لیکن اس کو ذہن اور شعور کی دولت عطا ہوئی ہے اور اس دولت نے اسے جانوروں سے الگ کر دیا ہے۔

اب اس کو بچ، حق، جمال اور خوب کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کا شعور ان کو Face کرتا ہے اور اپنا ہے۔ وہ اخلاق کا اور اخلاقی اصولوں کا پابند ہو جاتا ہے اور جب تک انسان ان چیزوں کا پابند ہے، وہ انسان ہے۔ جب ان سے باہر نکل جاتا ہے تو پھر حیوان ہے۔

مجھے یاد ہے جب میں لندن میں تھا اور وہاں Soccer کے دیوانہ وار مقابلے ہوتے تھے تو ایک جادو قدم کھلاڑی نارمن تھا جس کے آگے نہ بال رکھتا تھا نہ کوئی کھلاڑی ٹھہرتا تھا۔

وہ جب بھی کھیلتا اس کا والد ضرور آ کر تماشاخیوں میں بیٹھتا اور اپنے بیٹے کا کھیل دیکھتا اور بیٹا بھی اپنے باپ کو اپنا کھیل دکھانے کے لیے سر دھڑکی بازی لگا دیتا اور پھر یوں ہوا کہ اس کا باپ فوت ہو گیا اور نارمن بچہ گیا۔ اس کے کھیل میں وہ قوت اور تیزی نہ رہی۔

ایک روز اس نے کہا، کوچ باوجود اس کے کہ میرا باپ اس دنیا میں نہیں ہے، میں اس کے لیے کھیل کھیلتا چاہتا ہوں۔ کوچ نے کہا، بہت خوب ہم اس کی خصوص کر سی خالی رکھیں گے۔ بس پھر اس روز جو کھیل نارمن کھیلا، اس کی مثال سو کر کی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ پانچ ہزار تماشاخیوں کی تالیوں کی گونج میں کھیل کا میدان لرزتا رہا، گونج رہا، پکارتا رہا، ہنستا رہا۔

گیم جیت کر جب نارمن ڈرینگ روم میں گیا تو اس نے کوچ کو بتایا کہ آج کا کھیل میں نے اپنے باپ کے لیے کھیلا۔ جب تک وہ زندہ رہا، اس نے عمر بھر ایک مرتبہ بھی میرے کھیل کو مس نہیں کیا، باقاعدگی سے آتا رہا اور میرا کھیل ملاحظہ کرتا رہا لیکن اس نے عمر بھر مجھے ایک مرتبہ بھی کھیلتے ہوئے نہیں دیکھا کیونکہ میرا والد اندھا تھا۔ آج مجھے یقین ہے کہ جب وہ اس دنیا میں نہیں ہے، اس نے میرا کھیل ضرور دیکھا ہوگا۔

میرا خیال ہے، ہم زندگی کی سٹیج پر جو پر فارمنس دیتے ہیں، اللہ اسے فرنٹ رو میں بیٹھ کر ملاحظہ فرماتا ہے۔ جب ہم سے کوئی کمال سرزد ہوتا ہے تو وہ فرماتا ہے، یہ ہے میرا بندہ جس پر شیطان کا انگوٹھا نہیں۔

ایک بات یاد رکھو کہ امیر ہونا کوئی گناہ نہیں ہے۔ بالکل نہیں، ہرگز نہیں، البتہ کشادہ دل اور فیاض نہ ہونا گناہ ضرور ہے۔

فرد اور ارتقاء

زیرک اور سرلیج الانتقال ذہن

ایک زیرک اور چابک ذہن خود گرا اور ناتحرک نہیں ہوتا۔ میرا مطلب ہے کہ متوجہ بہ نفس خود نہیں ہوتا۔ ایسا ذہن کسی نئی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے یہ سوچنے نہیں بیٹھ جاتا کہ پیش نظر احوال مفید ہیں یا مضر۔ وہ متفکر خیالات میں گھر گھر گھومنے نہیں لگتا بلکہ عمل میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایک مایوس و پریشان و درد مند انسان سے ملتے وقت وہ عقلمندی سے اور زیرکی سے کام لیتا ہے اور اس غم میں اور اس کرب میں ڈوب کر مفلوج نہیں ہو جاتا۔ اسے اگر ایک کرسی کی ضرورت ہے تو وہ ضرورت کے مطابق ایک کرسی خرید لیتا ہے جس کی قیمت کا وہ آسانی کے ساتھ متحمل ہے، وہ کوئی اعلیٰ درجے کی نمائشی کرسی کے حصول میں مبتلا نہیں ہوتا اور اس کے نہ حاصل کرنے پر ملول نہیں ہوتا۔ جب اسے کسی نئے چیلنج کا سامنا ہوتا ہے تو وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس میں داخل ہوتا ہے اور اس کے محل وقوع کا جائزہ لیتا ہے اور پھر باہر نکل آتا ہے۔ صحیح سلامت پرسکون، زخمی یا مہسوز ہو کر باہر نہیں نکلتا، زخمی اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ چیلنج سے خوفزدہ نہیں تھا۔ اس کو آزما کے دیکھ لیں سو فیصد درست ہوگا کیونکہ خود آزمائی سے بہتر اور کوئی آزما نہیں۔ جس نے خود انور ٹول کھا کر دیکھ لیا وہ کسی سے نہیں پوچھے گا کہ اس کا مزہ کیسا تھا یا اس کی خوشبو کس قسم کی تھی۔

اچھے دن آئیں گے

کچھ لوگ اچھے دنوں کے انتظار میں ساری زندگی گزار دیتے ہیں لیکن ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ وقت کے ایک غلط حصے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ اپنے زمانہ حال کو چھوڑ کر کسی اور وقت سے لگ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن خوشی اور آئندہ کا وقت سے کوئی تعلق نہیں۔ روح کی دنیا میں کوئی گھنٹہ گھر نہیں ہے۔ غلات سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آگے بڑھ کر لینے اور مانگنے میں ہی سارا راز پوشیدہ ہے۔ حق اور سچ کو ایک ذریعہ بنا کر کوئی معمولی شے حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی عظیم مصور چغتائی سے یہ توقع کرنے لگے کہ وہ اس کا دروازہ پینٹ کر دے گا، ایسے نہیں ہے۔ حق اور سچ کو ایک بڑا ذریعہ مان کر سارے معاملات کی جاگرتی کا سامان بہم کرو۔ اس کو ساری زندگی پر پھیلا دو تاکہ اندر کے چھوٹے چھوٹے سبب خود ہی معدوم ہو جائیں۔

ہشیار اور تیار

ہر دم حاضر اور ہشیار ہو اور اپنے آپ پر نگہ رکھو۔ آپ پر جو گزرتی ہے اس پر نگہ رکھو اور دیکھو کہ آپ کہاں تھے اور آپ کو کہاں ہونا چاہئے تھا جس وقت یہ بات گزری۔ سوسائٹی کی باتوں اس کی شاہیوں اور نکتہ چینیوں پر گزری نظر رکھو۔ ذرا دیکھو کہ ایک نئے کھیل میں کود پڑنے کی دعوت پر تم نے کس گرجوٹی سے عمل کیا اور پھر کیا نتیجہ بھگتا..... گھر پر رہو اور اپنے ساتھ رہو!

دلچسپ لو

کبھی تم نے انہماک اور دلچسپی کا مطالعہ کیا۔ بڑی توجہ طلب چیز ہے یہ دلچسپ بھی۔ آپ کو سرفرے دلچسپی ہو تو کیا کیا پروگرام بناتے ہیں اور پھر کیسے کیسے عمل کرتے ہیں۔ نئی کار خریدنا ہو تو اپنا آپ بچ کر اسے خرید کے رہتے ہیں..... اسی طرح روحانیت اور سڑی رمز میں بھی دلچسپی لیں اور جی بھر کے لیں۔ اس کو پھلنے پھولنے کا موقع دیں۔ یہ خوب پھلے پھولے گا۔ اس سے صحت مندانہ خوشیوں کا نزول ہوگا۔ لیکن فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

Spinoza کو ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں ایک اونچے مرتبے کی آفر کی گئی۔ اس نے انکار کر دیا کہ ذاتی مطالعہ ذاتی انہماک پبلک توجہ سے زیادہ قیمتی ہے۔ شہرت اور ناموری سے تلاوت وجود زیادہ ضروری ہے۔

Spinoza جیسے لوگ ہی صحیح معنوں میں آزاد اور پرہاش ہوتے ہیں۔ ذات کا سرفری ذاتی خوشیوں کا پیغامبر ہے۔

حق اور سچ کے علم کو زندہ علم بنالو۔ اس کو اپنی ذات پر وارو کرو۔

مستعد محرک اور انکجنت کا غور سے مطالعہ کرو۔

بے خوف رہو۔

اپنی نیچر کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو۔

کبھی کبھی تبدیلی کا رخ بھی اختیار کرو۔

تعریف کرنے والوں کی غلامی ہرگز اختیار نہ کرو۔

کبھی نہ سمجھو کہ سارے جواب تمہارے پاس پہلے ہی سے موجود ہیں۔

تکلیف دہ حقائق کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرو۔

اپنے آپ سے کبھی بھی جدا نہ رہو۔

دیکھو! جب تک دیکھنے کے اندر ڈوب نہ جاؤ۔

بے عملی کے مستعد فعل کا راز تلاش کرو۔

ایک فرد ہی فردیت کو فروغ دے سکتا ہے۔

خود نگہداری ہی دوسروں کی مدد کر سکتی ہے۔

تمہارا مستقبل اس قدر آزاد ہے جس قدر تم خود آزاد ہو۔

خود فریبی

جب تک آپ خود فریبی میں مبتلا نہیں ہیں کوئی بھی آپ کو فریب نہیں دے سکتا۔ اگر آپ کو ایک شیر کا سامنا ہو جائے تو کیا آپ اس کے ساتھ کنا مٹا کر کھیلنے لگ جائیں گے؟

انسانوں کے گروہ مشینی اخلاقیات کے پابند ہوتے ہیں۔ وہ میکا کی طور پر ان پر عمل کرتے ہیں اور متوقع نفع کی

صورت میں ایک رات میں بدل جاتے ہیں۔

بیرونی حالات کی تبدیلی انسان کی اندرونی اور روحانی خوشی کا باعث نہیں بن سکتی۔ اگر ایک بونے کو پہاڑ پر بھی

کھڑا کر دیا جائے تو بھی وہ بونا ہی رہتا ہے۔

اس شخص سے زیادہ ناقابل برداشت انا پرست اور کوئی نہیں ہوتا جو ایک امیر بن جائے اور قدرت اس کی مدد

کرتی رہے۔

اگر کسی شخص کے ساتھ آپ کے تعلقات اس کی کج روی کی وجہ سے ہیں یا اس کی ذہنی ناہمواری کی بدولت ہیں

تو پھر تعلقات خطرے میں ہیں۔

جب کوئی احمق شخص آپ کے کسی رائے کا طلبگار ہوتا ہے تو اس کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ آپ اس کو وہی رائے

دیں جو اس کے ذہن میں ہے۔

خواہش

خواہش کا راستہ رکنے سے کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ خود ستائی اور خود پندیرائی کی

کیفیت سمجھ میں آ جانے کے بعد اضطراب نہیں رہتا۔

اگلی بار جب آپ کی دنیا مسمار ہونے لگے تو چپ چاپ ایک طرف ہو کر کھڑے ہو جائیں اور اس کو گرتے

ہوئے اور ڈھچتے ہوئے دیکھیں۔ کسی شور و غل یا داوہیلے کی ضرورت نہیں۔ بس ایک ناظر کی طرح اس کا مطالعہ کریں..... اس

کو تیزی سے گرنے دیں تباہ ہونے دیں پھر دوسرے روز اور بھی تیزی سے گرے گی۔ اسے روکنے کی کوشش نہ کریں اور

جب یہ بالکل مسمار ہو جائے اور سارا عمل ترک جائے تو پھر اس پر ایک پھل لکھ کر لگا دیں "ملہ برائے فروخت" اگلے روز تعمیر

کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

ایک عام سوال

”اگر ہم میں جوش و خروش نہ رہے اور ہم دنیاوی ترقیوں پر تالی نہ بجا سکیں اور خوشی کا اظہار نہ کر سکیں تو کیا ہم میں لافعلی کی کیفیت نہیں پیدا ہو جائے گی۔ کیا ہم ڈل نہیں ہو جائیں گے؟“

یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر مبتدی کرتا ہے اور اگر اس کی طرف سے ایسا سوال نہ آئے تو شک سا پڑنے لگ جاتا ہے کہ وہ بات سمجھ بھی رہا ہے یا نہیں..... لیکن اگر ان سے یہ پوچھا جائے کہ کیا انہوں نے دریا کا دوسرا کنارہ دیکھا ہے یا کیا انہوں نے اس مفروضے سے علیحدہ ہو کر بھی کچھ تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے تو ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔

جب تم نے زندگی کا دوسرا کنارہ دیکھا ہی نہیں تو پھر تم اس کو ڈل اور بے روح کیوں کہہ رہے ہو۔ بے دیکھی چیز کو تم کس طرح سے واضح کر سکتے ہو اور کیسے اس کی تفصیلات بیان کر سکتے ہو۔ مفروضوں کو حقیقت کے ساتھ نہ ملاؤ بھائی اور دوسرے کنارے کا خوف تم کو اس لیے ہے کہ تم زندگی کی جھوٹی قدروں کو چھوڑتے ہوئے گھبراتے ہو۔ اصل میں مبتدی لوگ اپنی الجھنوں اور مشقتوں کو چھوڑتے ہوئے گھبراتے ہیں اور اس خوف کے مارے ایسی باتیں پوچھتے ہیں۔

حکیمانہ نکتہ

یہ ایک افلاکی اور سماوی قانون ہے کہ جس قسم کا رویہ انسان کا اپنی ذات سے ہوگا اسی طرح کا دوسرے لوگوں سے ہوگا۔ مطلب یہ کہ جیسے ایک شخص ترشی سے یا محبت سے اپنی ذات سے پیش آتا ہوگا اسی طرح دوسروں سے پیش آنے پر مجبور ہوگا۔ انسان کے اندر کا عمل دوئی کا شکار نہیں ہوتا وہ ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے اور یہ ایک سائل ایک سارہ یہ رکھتا ہے اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ اپنے لیے ذرا اچھا سا میوزک بجاؤ اور مزالو تو دوسرے بھی اس سے لطف لیں گے اور تمہارے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ اس طرح سے جھومنے لگیں گے۔

اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لیے جو کچھ اب تک حاصل کیا ہے اسے دوسروں کے درمیان تقسیم کرو۔ ان کو بھی سر بلندی اور رخصت عطا کرو۔ ایک پائلٹ جس قدر اونچا ہوا میں اڑے گا اس کی سواریاں بھی اتنی ہی اونچی پرواز کریں گی..... میرا مطلب یہ نہیں کہ تم ماسٹر بن کر بیٹھ جاؤ یا لوگوں کو نصیحتیں کرنا شروع کر دو۔ میرا مطلب ہے کہ علم سے جس قدر لطف تم نے حاصل کیا ہے اسے لوگوں تک بھی پہنچاؤ۔ جتنی روشنی تم نے حاصل کی ہے اس کی کرنیں دوسروں کو بھی دو۔ روشنی اسی آسانی سے عطا کرو جیسے سورج کرتا ہے۔

آج ایک نیا درس لو: سب سے پہلے تو ہر اس احساس کو جانو پچھاؤ اور بکھانو جو آپ کے اندر دباؤ ہے چھینی اور تباہ پیدا کرتا ہے۔ اس کو اچھی طرح سے ملاحظہ فرماؤ اور دیکھو کہ اس کی چال کس کس طرف کو ہے۔

پھر اس ظالم کی طاقت رفتار اور دباؤ کا مطالعہ کرو کہ اس میں واقعی کس قدر شدت اور اس نے آپ کے سارے وجود کو کیسے کیسے پلٹ میں لے رکھا ہے۔

اب ایک حکیمانہ نکتہ یاد رکھو اور اس طاقت کو جس نے سارے وجود کو پلٹ میں لے رکھا ہے غور سے دیکھو یہ ذہنی طاقت ہی ہے اور بہت زور کی طاقت ہے۔ اب اس طاقت سے ویسے ہی فائدہ اٹھاؤ جیسے پھرے ہوئے دریا ڈل پر بند باندھ کر ڈیم بناتے ہیں اور بجلی حاصل کرتے ہیں۔

انسان ذہنی اور سوگی اس لیے ہوتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے اصل سے علیحدہ کر لیا ہوتا ہے۔ اپنے دکھوں اور غموں کا سامنا کرنے اور ان کو سمجھنے کے بجائے ان سے فرار کے نئے نئے وضع کر رکھے ہوتے ہیں مثلاً اپنی تکلیف دہ صورتحال کی ذمہ داری لوگوں پر دشمنوں پر اور حالات پر ڈال رکھی ہوتی ہے..... اپنے آپ پر بوجھ ڈالنے اور اپنی ذات پر اہم دہ کرنے سے انکار کر رکھا ہوتا ہے۔ محض خیالی اور تصوراتی خوشی میں مبتلا ہوتا ہے۔ کچھ بے معنی اور لافعلی قسم کے جبر پکڑے ہوتے ہیں۔ کچھ بے مقصد ملفوظات جمع کر لیے ہوتے ہیں۔ اصل حقیقت کے بجائے عادت سے چٹ کر چھپکلی کی زندگی اختیار کر لی ہوتی ہے۔

دیکھو کہ اور سوگ کا علاج کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آفت کا اور کرب کا سانسنی طور پر جائزہ لیا جائے اور ان لوگوں کی معنوی تشفی اور دردمندی کا ساتھ چھوڑ دیا جائے جو اپنے فائدے کی خاطر آپ کے گرد جمع ہو جاتے ہیں..... اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ آپ ہی اپنے ڈاکٹر ہیں۔ ایک غمگین اور غمناک صورت حال سے نہ تو نفرت کی جائے نہ ہی اس سے لڑائی کی جائے۔ سوگی ہونے اور بیمار رہنے کی لذت سے کنارہ کشی کی جائے۔ اپنا پورا ذہن اور پورا وجود مسئلے پر لگایا جائے۔ روحانیت اور برتری رمز کو جاننے اور پہچاننے کی کوشش کی جائے۔

لوگوں کے متسر اور استہزائے نیچے کا ایک ہی علاج ہے کہ اپنے آپ کو خوب سمجھا جائے کہ آپ کون ہیں اور کیا ہیں۔

یا تو آپ اپنے خیالات صحیح انداز میں استعمال کر سکتے ہیں یا پھر ان کو غلط طریق پر استعمال میں لا کر پورے کے پورے بھٹک سکتے ہیں۔

اپنی جھوٹی شخصیت کی شناخت کرتے رہیں نہ کہ اس کو بولنے دیں اور نہ ہی اس کو آپ کا نمائندہ بن کر کوئی عمل کرنے دیں۔

کام کی باتیں

(1)۔ اپنے اوپر کے دماغ کی بات نہ ماننا کہ یہ اچھا ہے یا یہ برا ہے۔ اندر تر کر اور غور کر کے دیکھنا وہاں اصل

جواب ہوگا۔

(2)۔ سچائی کو اس لیے حاصل کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے کہ سچائی سچ ہوتی ہے۔

(3)۔ اندر بالکل اندر ٹھیک صحیح اور روایہ پیدا ہونا چاہئے۔ پھر آپ کو باہر کی کوئی پروا نہیں رہے گی۔

(4)۔ اگر تم لوگوں کے مزاج اور ان کے افعال کا تجزیہ کرنے کے خواہشمند ہو تو پہلے اپنا تجزیہ کر کے اپنے وجود

کی تلاوت کرو۔

خود تبدیلی

(5)۔ اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلے ناسازگار حالات کا مطالعہ کرو یا اپنی اس عادت کا پوسٹ مارٹم کرو جسے تم بہت ہی ضروری خیال کرتے ہو۔ پوسٹ مارٹم کے بعد فیصلہ کر دو کہ آیا اس عادت کا رہنا ہی ہی ضروری ہے یا کیا وہ ایسی ہی اہم ہے۔

اپنی تلاش

میں کس طرح سے اپنے آپ کو تلاش کر سکتا ہوں اور کس طرح سے جان سکتا ہوں کہ میں کون ہوں۔

اپنی زندگی پر لٹکائے ہوئے مصنوعی چوکنوں اور رنگین تصویروں کے اندر سے باہر نکل آؤ اور پھر اس چوڑے غور سے دیکھو جو اس رنگ دار ڈربے سے باہر نکلا ہے۔ اس طرح تم پہلی بار اپنی زندگی کو قریب سے دیکھ سکو گے۔

مائیکل انجیلو وینی کن گرے کی چھت پیٹ کر رہا تھا تو ایک سایہ بار بار اس کو تنگ کرتا تھا اور اس کے نقوش کی راہ میں حائل ہوتا تھا۔ مائیکل انجیلو جھلا اٹھا اور بڑبڑانے لگا۔ لیکن جب اس نے غور کیا تو وہ سایہ اسی کے وجود کا سایہ تھا جو اس کے اور تصویر کے درمیان حائل تھا۔ اس نے جی کو ایک کنورے میں اس انداز سے رکھا کہ وہ ایک Scoop سا بن جائے اور اس کی روشنی سیدھی تصویر پر پڑے۔ پھر اس نے تصویر کشی کا عمل سکون سے شروع کر دیا کیونکہ اس کا اپنا سایہ راہ میں حائل نہیں رہا تھا۔

ایک بات ہمیشہ یاد رکھو اور اس کو سونے کے حروف میں لکھ کر اپنے سامنے لٹکا لو کہ تم ان لوگوں کے غلام ہو جن کی تم تصدیق کے اور موافقت کے اور Approval کے خواہاں ہو۔ تم جلد ہی محسوس کر لو گے کہ تمہاری جنگ لوگوں کے خلاف نہیں ہے بلکہ اپنے ذہن کی کج روی کے مابین ہے۔ ذہن کو درست کر لو پھر سب ٹھیک ہے۔

کرب اور بلا

جب غم اور کرب شدت سے تجاوز کر جائے اس وقت تم ایک خوش قسمت ترین فرد ہوتے ہو۔ اپنی اس خوش قسمتی کے لمحے کو ہاتھ سے نہ جانے دو اس ڈکھ کو ہلے گلے کے یا موج میلے کے حوالے کر کے اس پر مٹی نہ ڈالو۔ ڈکھ کے ساتھ چھٹ کر رہو اس سے بھاگو مت!

وجہ یہ ہے کہ تم ڈکھ سے اس لیے بھاگ نہیں سکتے کہ تمہارا اور کوئی وجود نہیں جو ڈکھ سے علیحدہ ہو۔ تم خود ہی دکھ ہو۔ خود ہی سارے کے سارے کرب ہو۔ تم کرب سے اس لیے علیحدہ نہیں ہو سکتے کہ تم اور کرب ایک ہی شے ہو۔ جس طرح تم اپنے بدن کو چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتے ہو کسی دوسرے ملک میں نہیں جا سکتے ہو اسی طرح سے ڈکھ ہے!

جب ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ڈکھ سے الگ ہو کر بھاگ جانا ناممکن ہے اس وقت آپ کے اندر ایک نئی تبدیلی کا امکان شروع ہوتا ہے۔ اس وقت روشنی ملتی ہے اور ایک نئی زندگی عطا ہوتی ہے۔

خود تبدیلی (Self Information) میں اور خود بہبودی (Self improvement) میں بڑا فرق ہے۔ ہر شخص خود بہبودی کا خواہاں ہے لیکن صرف بہادر اور جری انسان ہی خود تبدیلی اور دگر سازی کا تحمل ہو سکتا ہے۔

آدی کون بھران افعال کا مطالعہ کرنا چاہئے اور کرتے رہنا چاہئے جو اس کی قدرتی اور جبلتی فطرت کے مطابق ہیں اور جو اس کی فطرت کے مطابق نہیں ہیں۔ اس طرح اس کو اپنے خیالات پر بھی نظر رکھنی چاہئے کہ کون سے صحیح ہیں اور کون سے مصنوعی۔ یہ ہشیاری اور خود نگہداری اور دن بھر کی چوکی اس کو بنیادی انسان یعنی اپنے اندر کے انسان سے متعارف کرادے گی۔ جس طرح غلط سڑک پر جاتے ہوئے ایک مسافر کو اس کا احساس ہوتا ہے وہ ہینڈل گھما کر موٹر کو صحیح سڑک پر ڈال لیتا ہے اور مزے سے سیٹی بجاتا ہوا منزل کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہے۔

اونچی منطق

کم از کم آپ لوگوں کو سوسائٹی کی چالو منطق کے مقابلے میں اونچی منطق اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً چالو سوسائٹی ایک اقتصادی مسئلے کے لیے ایک اقتصادی حل ڈھونڈ کر آپ کے سامنے پیش کرتی ہے لیکن یہ دونوں چیزیں یعنی مسئلہ اور اس کا حل انسانی کج روی کا ایک حصہ ہے۔ اس سے کبھی بھی خیر برآمد نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک بیمار آدمی کا علاج کرنے کے لیے ایک اور بیمار آدمی کو لے آیا جائے۔

یاد رکھو! یہ ایک ذاتی اور پرائیویٹ کام ہے۔ اس میں دوسروں کی پروا نہیں کی جاتی کہ وہ کیا کہتے ہیں یا کیا کرتے ہیں۔ ہمیشہ اپنی سوچ کا درجہ اونچا رکھو پھر تم محسوس کر دو گے کہ تم واقعی سوچ رہے ہو۔

آپ یقین کریں کہ زندگی کی تسلی کو سلھانے کا اور حیات کے معنی کو حل کرنے کا ایک حتمی اور قابل اعتبار طریقہ موجود ہے۔ ایک شخص جس کی ذاتی الجھن کا کوئی حل نہیں جس کی مشکل ختم ہونے میں ہی نہیں آتی وہ ہمت کر کے اور بہادری کے ساتھ اس مشکل کی طرف رخ کر سکتا ہے جس کی پیچیدگی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ دیکھے گا کہ ماہرین اور مصلحین بھی اتنے ہی شکوک چھپا رہے ہیں جس قدر وہ خود چھپا رہا ہے۔ یادہ پھر دیکھے گا کہ اس کی ذہنی ورزش میں خیالی لہریں ایک دوسرے کے ساتھ جھکڑا کر رہی ہیں۔ وہ ڈک کر ضرور محسوس کرے گا کہ باطل اور بیہودہ سب باطل ہی ہے۔ یہ اس کا بوجھ کم کر دے گا اور اس کو روشنی نظر آنے لگے گی۔

عقل اور جذبہ

انسانی زندگی میں عقل بھی ہے اور جذبہ بھی۔ دونوں کو تدریس کی ضرورت ہے۔ جاننے کے لیے عقل کی بھی ضرورت ہے اور جذبہ کی بھی۔ دونوں کی ساتھ ساتھ تربیت ہونی چاہئے۔ جس طرح ہل کے دو تیل ہوتے ہیں کہ ساتھ

تمغے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک آدمی تھا جو اپنے آپ کو تبدیل کرنے کا خواہشمند تھا۔ وہ اپنی ذات میں تبدیلی پیدا کر کے کچھ سے کچھ بن جاتا چاہتا تھا۔ سوچ سوچ کر وہ ایک تمغہ ساز کے پاس گیا اور وہاں جا کر اس نے ایک خوبصورت تمغہ بنوایا جس پر لکھا تھا ”ہیرو“۔ اس نے وہ تمغہ اپنے سینے پر سجایا اور باہر بازار میں نکل آیا۔ لوگ اس کے گرد جمع ہو کر تالیاں بجانے لگے اور ہیرو ہیرو کے نعرے مارنے لگے۔ کچھ دیر تو یہ کیفیت رہی لیکن پھر اس کا دل اس تمغے سے بھر گیا اور تالیاں بجانے والوں کی تعداد بھی روز بروز کم ہونے لگی۔ اس کا دل بچھ گیا۔ وہ پھر تمغہ ساز کے پاس گیا اور اس سے ایک خوبصورت اور رنگدار تمغہ بنوایا جس پر لکھا تھا ”دانشور“۔

دانشور کا تمغہ سجا کر جب وہ مارکیٹ میں گیا تو ایک جھوم اس کے گرد جمع ہو گیا اور دُور دُور سے ”دانشور دانشور“ کی صدائیں آنے لگیں۔ لیکن یہ کھیل بھی چند ہفتے سے زیادہ نہ چل سکا۔

اب کی بار اس نے ایک نئی ترکیب سوچی اور تمغہ ساز سے کانسٹی کا ایک نمبر نوں تمغہ بنوا کر اس پر لکھوایا ”لیڈر“۔ لیڈر کا تمغہ دیکھتے ہی ارد گرد کے گاؤں میں بھی اطلاع پہنچ گئی اور لوگ بھگتڑا ڈالتے ہوئے لیڈر کے گرد جمع ہونے لگے۔ لیکن یہ میلہ بھی چند روزہ تھا جو ایک دن ٹوٹ گیا۔

ایک دن اچانک اُس شخص کو خیال آیا کہ میں میڈل لگانے کے باوصف کسی وقت بھی اپنے سے مختلف نہیں ہوا۔ میڈل کسی کے خوف، قابو، انتشار کو بدل نہیں سکتے۔ مجھے کوئی ایسا نسخہ تلاش کرنا چاہئے جس سے میں سچے تبدیل ہو جاؤں۔

توجہ

اگر آپ کو راہ چلتے ہوئے کوئی اداس، پریشان اور ملول چہرہ نظر آئے تو اس کے بارے میں گہرائی سے سوچنا۔ ایک ذہن اور بیدار انسان کو اس اندوہ کے ساتھ ہزاروں آنکڑے وابستہ نظر آئیں گے۔ اس کو پتہ چل جائے گا کہ غم اور اندوہ کیا نہیں ہوا کرتا۔ اس کے ساتھ بشارت منی نشانات ہوتے ہیں اور یہ غم نے اس کے ساتھ ساتھ چل رہے ہوتے ہیں۔ صاحب نظر کو پتہ چل جاتا ہے کہ وہ ملول و پریشان شخص دراصل ترش روش اور انتہائی رقیوں کا میزبان ہوتا ہے۔ وہ اپنے منہ پر مستقبل کے لیے لوگوں کی مدد اور لوگوں کی توجہ کا سائل ہوتا ہے اور جب اس کے کاسے گدائی میں کچھ نہیں پڑتا تو ملول اور غم زدہ ہو جاتا ہے۔

فراریت

اکثر لوگ اپنے آپ کو اس لیے تبدیل نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی حقیقتوں کو جانچتے وقت بے عزتی محسوس کرتے

ہیں۔ ایک کمزور انسان کو یا نامکمل انسان کو جب اس کی حقیقتوں سے روشناس کرایا جاتا ہے تو وہ جھلاتا ہے اور لڑائی کرنے لگتا ہے۔ حقیقتوں سے روشناسی کو اپنا علاج نہیں سمجھتا۔

دکھ اور تکلیف کی بنیادی مصنوعی بنیاد ہے۔ آپ کو صرف اُس وقت تکلیف ہوتی ہے جب آپ کے مصنوعی اور آبدیل سیلف پر اصلی سیلف کے حقائق روشنی ڈالتے ہیں۔ اگر آپ کی کوئی جھوٹی تصویر نہیں ہے تو کوئی تکلیف نہیں ہے۔ یہ ایک سیدھا سا اصول کہ فراریت سے گریز کیا جائے۔

نفسیاتی خلجان

جب آپ اپنے آپ کو کسی نفسیاتی الجھن میں پائیں تو فوراً خود کو بتائیں کہ میرے اندر ضرور کوئی ایسی بات تھی جس سے یہ خلجان پیدا ہوا۔ کیا یہ اضطراب سے جلد بازی کیا یہ اندیشہ کی (Insecurity) ہے۔ ناامنی ہے۔ کیا بے خیالی ہے؟ اگر ہے تو پھر یہ ساری تبدیلی کی جاسکتی ہیں۔ روشن دماغی سے خود بصیرتی سے اور یہ کوئی مشکل کام نہیں۔

حصہ داری

وہیے غور سے دیکھا جائے تو حصہ داری میں بھی دینے کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ جب آپ حصہ داری کرتے ہیں بھائی داری کرتے ہیں تو اس میں بھی دینے کا عمل موجود ہوتا ہے۔ یعنی جو ہمارا حصہ ہوتا ہے اس میں سے دوسرے ساتھی کو دیا جاتا ہے جسے وہ حصہ قائم کرتا ہے۔ اس سے اس عمل کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس سے حصہ دار حصہ داری کی تقویت حاصل کرتا ہے۔

جب ہم حصہ داری سے اور شہر نگ سے اپنی قوت اور اپنی محبت اور اپنے تشکر کو مضبوطی عطا کرتے ہیں تو گویا ہم زمین اور آسمان کے درمیان ایک گہرا تعلق ایک گہرا رشتہ قائم کرتے ہیں۔

انسان بھی عجیب ہے۔ اس کی حصہ داری اپنی جس کے لوگوں سے ہوتی ہے۔ وہ دوسری مخلوق سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس Sharing میں ایک اور طرح کی شیرنگ ہوتی ہے۔ ہم آسمان سے چاند سے سورج سے ستاروں سے ہواؤں سے بادلوں سے بھی رشتہ رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے بھی وابستہ ہیں۔

ہر شے حصہ داری میں مصروف ہے۔ زندگی ساری شیرنگ کے ساتھ وابستہ ہے۔ تنہا بھی ایک دوسرے کا حصہ دار ہے۔ سانس کا آنا جانا ایک دوسرے سے بندھا ہے۔ میری سانس آسمانوں تک پہنچتی ہے۔ آسمان سے اترنے والی ہوا میری سانس بنتی ہے۔

عجیب بات ہے کہ ایک دوسرے سے سانس بدلی کرنے والے ہم ایک دوسرے سے اس قدر پور کیوں ہیں۔

دل دکھانا۔ رنجیدہ کرنا

جس شخص کا یہ ایمان ہے کہ دوسرے لوگ اس کی ذاتی اور شخص خواہشوں کا احترام کریں اور ان کو اسی طرح سے پسند کریں جس طرح وہ پسند کرتا ہے تو اس شخص کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں سوائے اس کے تصور کے اور سوائے اس کی پسند کے اور کسی کو نظر کرنے کا کوئی حق نہیں..... یہ ایک سیدھی سی اور موٹی سی انانیت ہے جو ایک اندھے کو بھی نظر آتی ہے..... لیکن اس کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس خود پسندی اور خود خواہی کی وجہ سے خود ذاتی کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے اور وہ شخص اپنے آپ کو سزا نہیں دینے لگتا ہے۔

دل دکھانے اور دوسروں کو رنجیدہ کرنے کی خرابی کی وضاحت بڑی آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے۔ سیدھا سادا اصول ہے کہ:

1- ہم ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتے ہیں اور رنجیدہ کرتے ہیں صرف اس وجہ سے کہ ہم خوفزدہ ہیں۔

2- ہماری خوفزدگی کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں۔

3- ”ہم کون ہیں“ کا علم ہم کو اس وجہ سے حاصل نہیں ہوتا کہ ہم نے کبھی تحقیق ہی نہیں کی کہ ہم کون ہیں۔

تنہائی۔ اداسی۔ اکلا پا

سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ تنہائی اور اکلا پا کس مقام پر اور کس موقع پر ہوتے ہیں۔ کہاں ہوتے ہیں۔

اداسی اور تنہائی انسان کے ذہن کے اُس حصے میں بسیرا کرتی ہے جس کو اس بات کا یقین ہوتا ہے اور جس کے بارے میں اس نے نہایت ہی غلط اعلان کیا ہوتا ہے کہ میرا ایک سیلف ہے ایک وجود ہے ایک ذات ہے جو ساری کائنات سے الگ ہے اور ساری کائنات سے ہٹ کر ہے..... حقیقت یہ ہے کہ وہ شخص کسی ایسے علیحدہ وجود کا مالک ہرگز نہیں ہوتا۔ وہ اس کائنات کے رنگ و رنگ نظام اور اس کی بولمونیوں کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ یہ کوئی گہرے فلسفے کی بات نہیں ہے۔ سیدھی سی حقیقت ہے اس پر غور کریں اور غور کیا کریں اور کرتے رہا کریں آپ کو آسانیاں عطا ہونے لگیں گی۔

حسایت

جب کسی شخص کا دل ٹوٹ جائے یا کوئی اس کا دل توڑ دے تو اس شخص کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ سے

سوال کرے کہ ”میں لوگوں کا اسیر کیوں ہوں اور میں اپنے آپ کو آزاد کیوں نہیں کرتا؟“

طنز کا خوف دُور کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کا تجزیہ کیا جائے کہ میں اصل میں کون ہوں اور میری

حقیقت کیا ہے۔

آپ یا تو اپنے خیال کو ٹھیک انداز میں استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس پر آپ کو پورا قابو ہے یا پھر آپ کا خیال آپ کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر کے آپ کے سارے مل نکال دے گا۔

ایک کام ضرور کریں کہ اپنی مصنوعی شخصیت اور اپنی جھوٹی فردیت کو آپ کی نمائندہ بن کر بولنے کی اجازت اٹھ لیں۔

جب کوئی روحانی عقدہ نہ کھل رہا ہو اور بات سمجھ میں نہ آ رہی ہو تو یہی مقام خوشی کا اور آسانی کا ہوتا ہے کہ ہم صحیح دروازے کی تلاش میں ہیں جس کو آسانی کے ساتھ کھولا جاسکے۔

فرد اور ارتقاء

مہیا آتمنا کی اور مہا پرشی کو کسی مقام سے ڈھونڈھ کر حاصل نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کو اپنے اندر پیدا کر کے پروان چڑھایا جاتا ہے۔ انسان بننے کے لیے یہ جاننا بہت ہی ضروری ہے کہ ناجانور ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ تم انسان ہو۔

جس طرح مچھلی پکڑنے والے اپنے کانٹے کو طمعہ لگا کر مچھلی پکڑتے ہیں، اسی طرح ذہنی غلامی میں گرفتار کرنے والے اپنی کندھی کو حفاظت، ضمانت اور کفالت کا طمعہ لگاتے ہیں۔ کفالت کے نام پر تقریباً سارے لوگ اپنی آزادی کو فروخت کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ انسان پکڑنے کا یہ ایک پرانا دھندہ ہے اور جو ذرا سا بھی غافل ہوتا ہے، وہ اس کڑکی میں فوراً پھنس جاتا ہے۔

کفالت اور حفاظت کا لالچ انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ کفالت کی ضرورت سے زیادہ طلب روح کا قید خانہ بن جاتی ہے اور روح اس کے اندر پھڑپھڑانے لگتی ہے۔ کفالت کی آرزو طرح طرح کے دوسروں اور واہموں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ خوف اپنے سارے راستے اوجھری کھول دیتا ہے۔ اس خوف سے بہت سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سیاسی زور، مذہبی پیشوا، معاشرتی کارندے، یہ سب آپ کے خوفوں سے فائدہ اٹھانے والے ہیں۔ یہ آپ کو خوف سے برآمد ہوتے دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ جب تک آپ خوف میں مبتلا ہیں، یہ لوگ آپ کے حاکم ہیں۔ آپ کے مالک ہیں، آپ ان کے بردے ہیں۔

یہ صرف خوف ہی کا کمال ہے کہ لوگ خوفزدگی میں well اور معروف کی طرح دوڑتے ہیں اور اسی کے ساتھ جا کر تکیہ لگاتے ہیں، خواہ وہ well بالکل غلط، بے بنیاد اور حقیقت سے دور ہو۔

شیخ صاحب کہا کرتے ہیں کہ میں اکثر جاودانی اور لافانی پر غور کیا کرتا ہوں۔ میں کہتا ہوں جاودانی پر غور نہ کیا کریں، فنا پر غور کیا کریں۔ موت کے ساتھ رشتہ استوار کریں، پھر آپ کو فنا اور لافنا کا مطلب معلوم ہوگا..... چونکہ ہم موت سے خوفزدہ ہیں، اس لیے ہم لافانی اور لافنا کا ذکر شروع کر دیتے ہیں۔

لیکن میں کہتا ہوں دوستو! موت میں کوئی خوف نہیں، موت سے کوئی خوف ہیں، خوف میں موت ہے اور خوف سے ہی موت ہے۔ موت تو ایک ان جانی، نہ پہچانی، نہ سمجھ میں آنے والی شے ہے، پھر اس سے خوف کیسا؟ ہمیشہ موت کی تحقیق کرو اور موت کا مراقبہ کرو۔ اس کا انجام آخر میں آپ کو لافانییت سے ہمکنار کر دے گا۔

میں نے ندی کنارے لڑکیوں کو پانی بھرتے دیکھا اور میں دیر تک کھڑا ان کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ پانی بھرنے کے لیے جھکنا پڑتا ہے اور رکوع میں جائے بغیر پانی نہیں بھرا جاسکتا۔ ہر شخص کو رکوع میں جانے کا فن اچھی طرح سے آنا چاہیے تاکہ وہ زندگی کی ندی سے پانی بھر سکے اور خوب سیر ہو سکے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ انسان جھکنے کا اور غم کھانے کا آرت آہستہ آہستہ بھول رہا ہے اور اس کی زبردست طاقتورانا اس کو یہ کام نہیں کرنے دیتی۔ کبھی وجہ ہے کہ ساری دعائیں اور ساری عبادت اکارت جاری ہے اور انسان اکھڑا کھڑا سا ہو گیا ہے۔

اصل میں زندگی ایک کشش اور جدوجہد بن کر رہ گئی ہے اور اس میں وہ محاسن، وہ شہنشاہ اور شہنشاہی باقی نہیں رہی جو حسن اور توازن اور ہارمنی کی جان تھی۔ اس وقت زندگی سے چھلکنے اور رکوع کرنے کا پراسرار راز رخصت ہو چکا ہے اور اس کی جگہ محض جدوجہد باقی رہ گئی ہے۔ ایک کشش اور مسلسل تنگ و تاز۔

لیکن ایک بات یاد رہے کہ یہ جھکنے اور رکوع میں جانے کا آرت بلا ارادہ ہو ورنہ یہ بھی تصنع اور ریا کاری بن جائے گا اور یہ جھکنا بھی اتنا ہی ایک شان کہلانے لگے گا۔

اس زندگی میں ایک آزاد اور بے فکر اور منکر دماغ سے بڑھ کر اور کوئی بڑی نعمت نہیں۔ اس کے ذریعے حقیقی علم تلاش کیا جاسکتا ہے اور اس کی بدولت حقیقی علم سے آشنائی حاصل کی جاسکتی ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ دنیا میں ایسا کوئی دماغ ہوتا ہی نہیں جو آزاد، بے فکر اور منکر المزمج ہو۔ آئن سٹائن سے کسی نے پوچھا کہ وہ کونسا بنیادی اصول ہے جس کے بغیر سائنسی تحقیقات ہوئی نہیں سکتیں اور جس کو اپنائے بنا سائنس دان تحقیق کی دنیا میں داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ آئن سٹائن نے بلاتامل جواب دیا "انا اور تکبر سے آزادی"

میں تم سے بار بار کہتا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ آزادی نہ مانگو، آزادی طلب نہ کرو۔ آزادی کی تلاش مت کرو، محبت کی تلاش کرو، محبت کو ڈھونڈو۔ وجہ صرف یہ ہے کہ آزادی کو ڈھونڈنے والے اور آزادی کے تذکرے کرنے والے اکثر ان کے چکروں میں پھنس جاتے ہیں اور تکبر کے غلام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انا پسند لوگ دنیا کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ موت سے ڈرتے ہیں۔ زندگی کو لافانی کرنے کی کوشش میں مبتلا ہوتے ہیں۔

خود پسندی کی اس سے بڑی اور کوئی حماقت نہیں ہو سکتی کہ وہ خود کو آزاد کرانے کے پروگرام بناتی ہے اور آزادی

کے انداز میں سوچتی ہے۔

انانیت ایک ایسا جذبہ ہے، ایک ایسی لگن ہے کہ یہ سب کچھ چھوڑ دینے سے خوف نہیں کھاتی۔ زندگی چھوڑنے سے نہیں ڈرتی۔ دولت تقسیم کرنے سے نہیں ڈرتی۔ مذہب دین و دھرم سب کو تھک سکتی ہے۔ بڑے بڑے معرکے مار سکتی ہیں لیکن اگر خوفزدہ ہے تو محض محبت سے، محبت کے قریب آنے سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اگر زندگی محال نظر آنے لگے اور عرصہ حیات تنگ ہو جائے تو اپنا زانو یہ لگا دہتدیل کرنے کی سوچو، زندگی بدلنے کا پروگرام نہ بناؤ۔

میری ایک بات توجہ سے سننا۔ کبھی کسی کو قائل کرنے کی کوشش نہ کرنا، دلائل نہ دینا، تو جہات نہ پیش کرنا۔ اس طرح سے تم صرف اپنی طاقت کو ضائع کرو گے اور پریشان رہو گے۔ البتہ ایک دلیل ایسی ضرور ہے جس سے تم ہر ایک کو قائل کر سکتے ہو اور وہ دلیل ہے تمہارا وجود۔ اگر تم نے اپنے آپ کو تبدیل کر لیا اور اپنی کاپیا کھپ کر لی پھر تم ایک بہت ہی طاقتور دلیل بن گئے لیکن اگر تم میں تبدیلی پیدا نہ ہوئی اور تمہاری کاپیا کھپ نہ ہوئی تو پھر چاہے تم کتنی دلیل بازی کرو، کتنی ہی منطقیں نکالو کوئی بھی تم کو نہیں مانے گا۔ فلسفہ اور منطق اور دلیل بازی کسی کو قائل نہیں کر سکتی۔ ماسوائے تمہاری ذات کے۔ تم کسی کو قائل نہ کر سکو گے اور اس کی کوشش بھی نہ کرنا۔ وجہ یہ ہے کہ اگر تم کسی کو قائل نہ کر سکتے تو پھر تم پر اور تمہاری راج پر اور مزاج پر اس کا شدید رد عمل ہوگا اور تم پریشان رہنا شروع کر دو گے۔

اس دنیا میں ایک بڑی عظیم یا ایک جینس بننا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ سیدھا سادہ ہے کہ نہیں کہنا سیکھ لو۔ ہر بات کو NO کہو، ایک نکتہ چیں بن جاؤ۔ کبھی ہاں نہ کہو، "ہی" نہ کہو۔ حق نہ کہو، تم خود بخود ایک دانشور بن جاؤ گے۔

محبت ذہن سے ممکن نہیں ہو سکتی۔ ذہن سے تو جنسی فعل ہو سکتا ہے۔ ذہن سے تو عمل کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔ جنسی فعل ایک عمل ہے، محبت کوئی فعل نہیں، کوئی کارکردگی نہیں، کوئی عمل نہیں۔ یہ تو ہونے کی ایک حالت ہے۔ Being کی ایک سٹیٹ ہے۔ جب آپ کوئی شخص دیکھتے ہیں اور کسی فیصلے کے بغیر کسی تنقید اور تبصرے کے بغیر کہ وہ اچھا ہے یا برا، خوبصورت ہے یا بدصورت، گنہگار ہے یا نیک۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہیں تو ایک نئی چنگاری پیدا ہوتی ہے۔ جب صفات سے نظر ہٹ کر ذات پر مرکوز ہوتی ہے تو ایک عجیب قسم کی برقی رو پیدا ہوتی ہے اور یہ روحیت کی اساس بن جاتی ہے۔ جب آپ ایک پھول دیکھتے ہیں، بغیر کسی تنقید اور تبصرے کے کسی فیصلے کے تو وہ پھول اپنا دل کھول کر آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ آپ سے اپنے دلی راز بیان کرنے لگتا ہے لیکن جب آپ اس ہفتی کی نظر ڈالتے ہیں، اس کا مسر، ناقداور نکتہ چین بڑے ذہین لوگ ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ذہن میں ملامت اور رذائل بڑی آسانی سے آ جاتی ہے۔ دنیا میں سب سے آسان بات اس کا اظہار ہے کہ فلاں شے غلط ہے اور فلاں فعل نامیک ہے۔ نہ کہنا اور نہ ماننا اس کائنات کا آسان ترین کام ہے۔ ہاں کہنا بہت ہی مشکل اور بے حد محال فعل ہے۔ کبھی اپنے ذہن کی طرف توجہ کر کے دیکھیں کہ یہ ایک دن میں یا گھڑی میں یا ایک گھنٹے میں کتنی مرتبہ نہیں کہتا ہے۔ اگر اس کو ہاں

14- بڑوں سے اگر کسی بات کو بار بار سننے کا موقع ہو تو ہر مرتبہ اس یقین سے سنو کہ اس میں نیا سبق بھی ہوگا اور سابقہ کا اعادہ بھی ہوگا۔
امام مالک نے فرمایا، امت مرحومہ کے آخری دور کی کبھی اصلاح نہ ہو سکے گی تا وقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی۔

اب نیکی بھی ترک کرو

جو فرد اپنی زندگی کا کسی دوسرے کے ساتھ تقابل کرتا ہے اور اس جیسی زندگی بسر کرنے کا خواہشمند ہے، سمجھو کہ وہ اپنی زندگی بسر کرنے سے محروم ہو چکا ہے۔ زندگی تو اندر کا ایک مظہر ہے۔ اس کو اپنا آپ بھلا کر کس طرح سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ کس طرح دریافت کیا جاسکتا ہے۔ جب ایک شخص اپنی زندگی کا کسی اور ساتھ تقابل کرتا ہے تو رشک میں حسد میں غصے میں اور جارحیت اور پر خاش گری میں مبتلا ہوتا ہے لیکن یہ زندگی نہیں ہے یہ تو ایک زندہ موت ہے اور کوئی عجب نہیں کہ اس وقت یہ ساری دنیا ایسی ہی زندہ لاشوں سے آباد ہے اور آباد چلی آ رہی ہے۔ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ جو دنیا خواہش اور ہوس کی بنیادوں پر آباد ہو، وہ کبھی بھی بے قابو اور ناجائز نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی شخص اس دنیا کی حرص میں مبتلا یا اگلی دنیا کے لالچ میں مالا مارا پھرتا ہے، وہ دوسروں کو ایذا پہنچانے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جہاں بھی خواہش اور غرض و غایت ہے، وہاں قہر اور جبر موجود ہے۔ خواہش بذات خود قہر ہے۔ سائنس نے انسان کے دلوں کو خواہش سے اور لوبھ سے بھر دیا ہے۔ اب غارت گری اور ظلم لازمی ہے۔ اس سے مفر ممکن نہیں۔ تا آنکہ مذہب آگے بڑھ کر لوگوں کے دلوں سے خواہش اور حرص و ہوا کا خدا نکال دے اور اس کی جگہ اللہ کو بٹا دے!

لیکن یہ خواہش، یہ لالچ اور لوبھ کیوں پیدا ہوتا ہے؟ یہ آتا کہاں سے ہے؟ لوبھ احساس کمتری کا نتیجہ ہے۔ ہر شخص اپنے اندر کمزور، لاچار اور کمتر محسوس کرتا ہے۔ اپنے آپ کو خالی اور تھوٹھا سمجھتا ہے۔ اس کو زندگی ملی ہی نہیں۔ اب وہ ہستی زندگی کی تلاش میں اور اپنا منہ بھرنے کے لیے لوبھ اور لالچ کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور اپنی زندگی کو بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اگر کسی کو اپنے اندر کے خلا کا احساس ہو جائے اور اپنے لوبھ اور لالچ کی سمجھ آ جائے کہ یہ سب اندر کے خلا کو بھرنے کے لیے کیا جا رہا ہے اور میں خواہش کی تکمیل سے اس کو بھر نہیں سکتا تو یہ احساس اور یہ مشاہدہ اس کو دھرم کے اندر داخل کر دے گا۔ مذہب شناس بنا دے گا۔ اپنے اندر کے خلا سے اجتناب کرنا دھوکا ہے اور اپنے اندر کے خلا کو سمجھ جانا مذہب ہے، گیان ہے، روحانیت ہے۔

اب کچھ باتیں سچ بچائی اور راستی کے بارے میں ہو جائیں:

حق اور حقیقت کی واپرتا اور وزریدگی اور شے ہے اور اس کی تفسیر و تشریح بالکل ایک الگ بات ہے۔ دونوں کا

بھی کہنا پڑے، کسی سخت دلی اور تنگ نظری کے ساتھ کہتا ہے۔ ذہن ہمیشہ نہیں کے ساتھ بہت خوش رہتا ہے۔ جب بھی آپ کسی کو No کہتے ہیں، اس کا بطلان کرتے ہیں تو آپ کو بڑی خوشی سے بڑی طاقت کا احساس ہوتا ہے۔ No کہنے سے نفس اور انا مضبوط ہوتے ہیں۔ Yes کہنے سے انا جھکتی ہے، ملیامیٹ ہوتی ہے۔ No کہنے سے آپ مضبوط اور طاقتور ہوتے ہیں۔ پکنے پتھر کی چٹان بن جاتے ہیں۔ ایک سنگسار تو دوا جس میں نہ کوئی دروازہ ہوتا ہے، نہ کھڑکی، نہ دروازہ۔ اپنی جگہ اٹل پڑا ہوتا ہے۔ ہر ایک کو شوکر عطا کرنے والا لیکن ایسی چٹان اور ایسے بند پتھر سے محبت، شفقت، رحمت، دعا و عبادت اور مراقبہ کی ساری خوبیاں ایک قلم موقوف ہو جاتی ہیں۔ نہ نہ کہنے والا شخص کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ کوئی دستک اس کے دروازے نہیں کھول سکتی۔ کوئی ہوا نہیں، جھکڑ اور طوفان اس کے در پیچے دھڑ دھڑ نہیں سکتا۔

اس کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ جو کوئی بھی تنقید کرتا ہے، فیصلہ دیتا ہے۔ وہ درست نہیں ہو سکتا۔ خدا (اور ہر مرد) روپ دشمنی کا ہوتا ہے۔ فیصلے کے اندر ناقد موجود ہوتا ہے۔ محبت کرنے والا اور شفقت کرنے والا نہیں۔ قول فعل میں اور فتوے میں منطقی ہوتی ہے، محبت نہیں۔

1- جو اپنی غرض کے لیے تمہارے ساتھ دوستی رکھے، اس کی دوستی سے ہٹ جاؤ۔

2- من مانی کبھی نہ کرو۔

3- جس کو اپنی زبان سے ایک بار اچھا کہہ دو، پھر اسے کبھی برا نہ کہو۔

4- اپنے ساتھیوں کو کبھی بھی اپنے علم سے خوفزدہ نہ کرو۔

5- کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہ دو۔

6- جو امین نہ ہو اس کو کبھی قاعدہ نہ بناؤ۔

7- جس بات سے تم کو فائدہ پہنچ چکا ہو، وہی دوسروں کو بتاؤ (کتابی بات نہ کرو) اتنا کھاؤ جس سے پیٹ میں

ہوا پیدا نہ ہو۔ اتنا سوؤ جس سے جسمانی اور ذہنی تازگی برقرار رہے۔ اتنا بولو کہ سامعین اس کو سنبھال سکیں اور گرانے نہ لگیں۔ کم علموں کے پاس اس قدر مضبوطی جس قدر وہ آپ کے ساتھ سنجیدہ رہ سکتے ہوں۔

8- مشکل مقام پر اپنے ساتھیوں سے آگے رہو۔ جب انعام تقسیم ہونے لگے تو ان سے پیچھے رہو۔

9- اصول پسندی راستہ ہے، مقصود نہیں۔ اصول بنانے والے سے محبت رکھو۔

10- دوست کے دوست کو دوست بناؤ۔

11- لوگوں کو ان کی امانتیں واپس کر دو اور کراؤ۔

12- بہتر جاننے والے کے سامنے بولنا ان کی اجازت سے ہو اور اپنے علم کی تصدیق کے لیے ہو۔

13- جس کو قابل تعظیم مانتے ہو، اس کی صفات کو اپنی ذات میں داخل ہونے دو۔ اس طرح کہ اس کے لیے

سب دروازے کھلے رہیں۔

کریں تو پھر کوئی مختلف کام کرنا شروع کر دیں۔ پریشان ہو کر کوئی پلاننگ شروع نہ کر دیجئے۔ کوئی سکیم نہ بنائیے۔ کوئی جواب تلاش نہ کیجئے۔ کہیں اور بھاگ کر نہ چلے جائیے۔ وہیں رُک جائیے جہاں آپ رُکے ہوئے ہیں۔ پرسکون ہو جائیے۔ انتظار کیجئے۔ لیکن فعلاً نا طور پر انتظار کیجئے۔ یہاں زمین پر اپنی زندگی کے بارے میں غور فرمائیے..... کوئی معلوماتی کتاب پڑھنا شروع کر دیجئے..... دوسروں کے ساتھ گفت و شنید کیجئے..... اپنے دماغ اور ذہن کی حرکتوں اور اس کے تقاضوں کا مطالعہ کیجئے۔

آپ کو خود ہی جواب مل جائے گا لیکن یہ وہ جواب نہیں ہوگا جس کی آپ کو توقع ہوگی۔ یہ آپ کی توقع سے مختلف ہوگا۔ آپ کو تو اپنا جواب ”ہاں“ یا ”ناں“ میں چاہئے ہوگا لیکن یہ ان دونوں سے مختلف ہوگا کیونکہ یہ متوقع جواب سے ماوراء ہوگا۔ یہ ”الجواب“ ہوگا۔ لاشعوری خواہشوں کا متوقع جواب نہیں ہوگا۔

وہیں ٹھہرنا اور وہیں رُکے رہو۔ یہ ٹھہرنا ہی تبدیلی پیدا کرے گا۔ آپ کی پوزیشن دیوار پر بیٹھے ہوئے انسان کی سی ہو جائے گی جو دیوار کے دونوں طرف دیکھ سکتا ہے۔ پھر آپ وہ نہیں رہیں گے جو یہ سوچتے ہیں کہ پتہ نہیں دیوار کے اُس طرف کیا ہے پھر آپ دیکھیں گے۔ خود دیکھیں گے۔ جانیں گے اور سکون سے بیٹھے ہوں گے۔ آپ اپنی اندرونی طاقت سے بلا واسطہ طور پر تعلق پیدا کر سکتے ہیں اور کسی کی مدد کے بغیر اس سے گفت و شنید کر سکتے ہیں۔

سنوارنا

ایک دُکھی اور سولی آوی جب سوچتا ہے کہ اس کو دُکھوں سے اور مصیبتوں سے نجات حاصل کرنی چاہئے اور آئندہ میں رہنا چاہئے تو وہ ایک بنیادی غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے یعنی وہ ایسی چیزوں کی فہرست تیار کرنے لگ جاتا ہے جن سے اس کو بچنا چاہئے۔ اس فہرست کی تیاری میں وہ سب سے اہم چیز لکھنی بھول جاتا ہے کہ سب سے پہلے اُس کو اپنے آپ سے بچنا چاہئے مثلاً وہ پروگرام بناتا ہے کہ مجھے ان لوگوں سے تکلیف پہنچنی ہے مجھے ان لوگوں کو چھوڑ دینا چاہئے اور ان کے بجائے کچھ دوسرے دوستوں کو اختیار کرنا چاہئے۔ لیکن وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ وہ نئے دوستوں کے پاس بھی اپنا پرانا آپ اور اپنے پرانے خیال لے کر جائے گا۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ جو شخص ذہنی ٹھوکریں کھاتا ہے وہ قدم کی ٹھوکر ضرور کھاتا ہے۔

ہر روز کا ایک وظیفہ یاد رکھیے کہ مجھے اپنے آپ کو درست کرنا ہے اور اپنا آپ سنوارنا ہے۔

موتو قبل اتمتو!

ایسے مر جاؤ کہ وہ زندہ ہو جائے جو تمہاری اصل ہے۔ جو تمہارا جوہر ہے۔ انا کو مار دو کہ تمہارے اندر حق کا پودا پروان چڑھ سکے۔ اس کو جگمگ سکے۔ اس کی نشوونما ہو سکے۔ ماضی کے لیے مر جاؤ کہ مستقبل کی طرف رجوع کر سکو۔ معلوم

آپس میں کوئی تعلق نہیں کیونکہ جب تم جگ کی تشریح اور تفسیر کرتے ہو۔ اس وقت تم جگ سے باہر کھڑے ہوتے ہو۔ جب تم سے گزر رہا ہوتا ہے تم پر اور ہوتا ہے، وارد ہو رہا ہوتا ہے۔ تم اس کے اندر ہوتے ہو۔ اس لیے جو لوگ حق کے اندر ہوتے ہیں، جن پر جگ وارد ہوتا ہے، وہ اس کی تفسیر کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ جو شخص آپ کو حق اور جگ کی تعریف بیان کر سکتا ہے اور اس کی باریکیاں سمجھ سکتا ہے، وہ وہ شخص ہے جس نے جگ کا کبھی تجربہ ہی نہیں کیا۔

تو پھر جگ ہے کیا؟

کیا جگ ایک عقیدہ، ایک مسلک، ایک سلسلہ، ایک انجمن، ایک صحیفہ ایک شاستر ہے؟ نہیں۔ بالکل نہیں۔

عقیدہ ہمیشہ ماضی ہوتا ہے اور جگ ماضی نہیں ہے۔

سچائی ایک مسلک بھی نہیں کیونکہ سچائی کی طرف کوئی راستہ ہی نہیں جاتا۔ ایک معلوم راستہ نامعلوم کی طرف جا بھی کیسے سکتا ہے۔

سچائی کوئی مذہبی سلسلہ بھی نہیں۔ یہ تو ایک واپس ہوتا ہے جو وقت سے آزاد اور فارغ البال ہے۔ یہ بہت ہی منفرد چیز ہے، بالکل واحد، اکیلی۔

سچائی کوئی صحیفہ بھی نہیں۔ صحیفے نازل ہونے والی شے ہیں۔ وہ مخصوص قوموں اور گروہوں کے لیے مختص ہیں لیکن جگ کسی خاص قوم یا خاص گروہ کے لیے نہیں۔

سچائی نہ تو لفظ ہے، نہ ہی موت ہے، لفظ مٹ جاتے ہیں، موت ڈوب جاتی ہے لیکن سچائی قائم رہتی ہے۔ تو پھر یہ ہے کیا؟

سچائی تم کو کیوں، کیسے، کس لیے، کہاں اور کیوں کی زبان میں نہیں ملے گی۔ سچائی تو بس ہے اور ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں سوچنا یا غور نہیں کیا جاسکتا۔ اس کو گزرا جاسکتا ہے۔ وارد کیا جاسکتا ہے۔ محبت کے اندر، موسیقی کے اندر، فطری مناظر کے اندر جب ذات گر جاتی ہے۔ صورت معدوم ہو جاتی ہے اور صرف فطرت باقی رہ جاتی ہے۔ اس وقت سچائی کا ذوق کا اور حق کا اور رُوح کا ظہور ہوتا ہے۔

خود فرد ایک نا حقیقت ہے لیکن نافرد حقیقت ہے۔ میں نا حقیقت ہوں لیکن خدا حقیقت ہے۔

کسی نے آئن سٹائن سے پوچھا کہ سائنسی تحقیق میں کوئی چیز بنیادی درجہ رکھتی ہے؟ آئن سٹائن نے کہا ”انانکی نفی“..... یہ بات ہے بھی حقیقت۔ انانیت اور خود نگاہی ہی جہل ہے جو دماغ میں سے اور انا سے بھرا ہوگا اس میں سچائی کے مہمان کے لیے ذرا سی جگہ بھی نہ نکل سکے گی۔

صبر اور تحمل

ہماری اندرونی سنی مسلسل کے لیے صبر ایک نیکی ہے ایک virtue ہے۔ جب آپ کو یہ نہ پتہ چلے کہ اب کیا

اور علم کو ساتھ لے کر مر جاؤ تاکہ لا معلوم کا گیان حاصل ہو سکے۔ فرد کو ساتھ لے کر فوت ہو جاؤ تاکہ تمہارا دل زندہ ہو سکے۔ پھر سے دھڑکے کے قابل ہو جاؤ۔ تمہارا پھر اس سے تعارف ہو سکے۔ اپنے قریبی بلکہ قریب ترین دوست سے جس کو تم نے ازل سے بھلا رکھا تھا اور فراموش کر دیا تھا۔

دل..... اور..... دماغ

اس کائنات میں دل بہت ہی خطرناک چیز ہے۔ خطرناک اس لیے کہ یہ اکیلا رہتا ہے، اکیلا سوچتا ہے اور اکیلے ہی عمل کرتا ہے اور اکلاپے میں بڑا خوف، بڑا وہم، مسلسل ڈر ہوتا ہے۔ دماغ ہمیشہ عقلمندی کی اور حفاظت کی باتیں سوچتا ہے۔ اپنے آپ کو Cover کرنے کی اور محفوظ رہنے کی ترکیبیں وضع کرتا ہے۔ دماغ گروہ میں چلتا ہے اور اپنے ارد گرد آدمیوں کا جہوم رکھتا ہے۔ اسی جلوس سے اس کو تقویت ملتی ہے، سہارا ملتا ہے۔ سیاسی لیڈر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے رکھتا ہے۔

لیکن فقیر ہمیشہ اکیلا رہتا ہے۔ دل کے فیصلے کے مطابق خوفناک مقاموں میں، دل اور دماغ دونوں ہی سوچنے والے اعضاء ہیں۔ دونوں ہی پروگرام وضع کرتے ہیں۔ دماغ جب بھی سوچتا ہے اپنی لیڈری، اپنی برتری اپنی نمود کے بارے میں سوچتا ہے۔ اپنی ذات کو مرکز بنا کر سوچتا ہے۔ دل جب بھی سوچتا ہے محبوب کا گھر دکھاتا ہے، دل سے سوچنے والا مار یا تھریا ہوتا ہے یا فشی ہسپتال کا خالق یا ایڈمی..... اس کی پہچان یہ ہے کہ یہ ہمیشہ اکیلا ہوتا ہے اور اکیلا ہی چلتا ہے۔ جو کوئی دل کی طرف مائل ہوا، وہ گرا، گرفتار ہوا، پکڑا گیا۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں فلاں فلاں کی محبت میں گرفتار ہو گیا..... گروہ میں بڑا مزاج ہے۔ یہ آپ کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ آپ کے ارد گرد لوگوں کا جہوم جمع کر کے رکھتا ہے۔ جب آپ فوت ہو جاتے ہیں تو گروہ آپ کو چھوڑ دیتا ہے۔ گروہ میں نئے لوگ آ کر شامل ہوتے رہتے ہیں اور پرانے چھوڑتے جاتے ہیں۔ گروہ کے لوگوں کو خوشی ہوتی ہے کہ وہ حرکت میں ہیں، عمل میں ہیں لیکن جہوم کہیں جان نہیں رہا ہوتا، کسی طرف کو بڑھتا نہیں۔ اس کی کوئی سمت نہیں ہوتی، یہ پابندِ تغیر فیصل کی طرح ایک ہی جگہ پر جھومتا رہتا ہے اور گروہ کے شامل لوگوں کو احساس ہوتا ہے کہ وہ حرکت کر رہے ہیں۔

دماغ ہمیشہ اور اور اور کا طلبگار ہے۔ حل من مزید پکارتا رہتا ہے۔ یہ اس حقیقت کو بالکل نہیں جانتا کہ تمہارے پاس پہلے سے کیا ہے اور تمہارے قبضے میں کیا کچھ ہے۔ یہ تو بس اور اور اور مزید مزید کا شکار ہے..... تم چاہے فقیر ہو، یہ اور مانگے گا، شہنشاہ ہو یہ اور مانگے گا۔ ایک دولت مند شخص ہمیشہ غریب رہتا ہے کیونکہ وہ اور کا طلبگار رہتا ہے۔

انسانی فطرت

دوسروں کی مہر تصدیق

کبھی تم نے اپنے گلے کے پھندے کو دیکھا ہے۔ سانس گھٹی ہوئی، آنکھیں باہر نکلی ہوئیں۔ یہ دوسروں سے تصدیق کا پھندا ہے۔ تم دوسروں کے سامنے خوش کامیاب، مکمل اور پر باش رہنا چاہتے ہو ان کو خوب تر ہو کر دکھانا چاہتے ہو۔ اس پھانسی کو اتار پھینکو۔ اس طفرے کو دفع کرو۔ اس کی بدولت تم ایک جھوٹی خواہش میں مبتلا ہو۔ اس جھوٹی خواہش سے تم تقویت حاصل کرتے ہو لیکن یہی خواہش تمہاری ساری توڑ پیوڑ کی بنیاد ہے۔ آج ایک فیصلہ کر لو کہ تمہیں کیا چاہئے۔ اپنی زندگی یا دوسروں کی مہر تصدیق!!

تم پر کس کا تعریف ہے۔ ایک جابر شخص کا! جس سے تم ہر وقت خوفزدہ رہتے ہو کہ ایک دن تم کو چھوڑ دے گا۔ تم پر کس کا قبضہ ہے۔ ایک اعصابی تیزی کا۔ ایک جان لیوا خواہش کا کہ دوسرے کو منائے رکھو اسے بھائے رکھو۔ دفع کرو۔ سب کا قبضہ چھڑوا دو اپنی ذات کا خود قبضہ لے لو۔

دیکھو! ساری زندگی ایک چیز بالکل برداشت نہ کرنا۔ یہ ہرگز برداشت نہ کرنا کہ تمہاری زندگی اس طرح کی رہے جیسی کہ اب ہے۔ اس کو ایسا رہنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اٹھو اور اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ شاباش!

رائے عامہ

ایک مرتبہ کسی شخص کو چند آراء درکار تھیں اور وہ مارکیٹ میں انہیں خریدنے کے لیے جا پہنچا۔ جہاں طرح طرح کی رائیں فروخت ہو رہی تھیں۔ مارکیٹ نہ صرف مختلف راؤں سے بھری ہوئی تھی بلکہ وہ سستی بھی تھیں اور ارزاں بھی۔ اس نے اپنی پسند کی ڈھیر ساری رائیں خریدیں اور خوشی خوشی گھر واپس آ گیا..... اب تو اس کے مزے ہو گئے۔ شام کے وقت وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ملتا اور اپنی نئی آراء ان کے ساتھ بھڑاتا۔ بڑی پر لطف محفل رہتی لیکن آخر وقت میں ان کے درمیان جھگڑا ضرور ہوتا اور معاملہ ہاتھ پائی تک پہنچ جاتا۔ کچھ زد و کوب بھی ہوتی۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ وہ آپس میں ناراض نہ ہوتے اور دوسری شام پھر اکٹھے بیٹھ کر آراء لڑانے لگتے۔ دراصل ان کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے اور جھگڑنے میں مزا آنے لگا تھا اور یہ ان کی زندگی کا حاصل بن گیا تھا۔

ایک روز اس شخص کو اس روز کی دانت کلک سے نفرت ہو گئی اور وہ یہ مسئلہ سلجھانے کے لیے ایک بابا کے پاس پہنچا۔ بابا نے کہا ”سن بچہ! ہر خریدی ہوئی اور مستعار لی ہوئی رائے کے علی الرغم ایک اور رائے بھی ہوتی ہے۔ لوگ ان آراء کو حقیقت سمجھ کر سینے سے لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان کی حفاظت اور بقاء کے لیے جان لڑانا شروع کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن میں تمہیں ایک بھید کی بات بتاتا ہوں کہ ایک ”واحد رائے“ کو پکڑ لو۔ اس کے اُلٹ اور کوئی رائے نہیں ہے۔ اس ”واحد کلام“ کو کچھ لوگ خدا کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔

شعور اور آزادی

اس دنیا میں ہر شخص کچھ میکا کی اصولوں کے تحت جنم لیتا ہے مثلاً مفتی روئے سارے کے سارے میکا کی ہوتے ہیں۔ جب ایک آدمی دوسرے آدمی پر ظلم کرتا ہے تو مظلوم اس سے بدلہ لیتا ہے اور اسی طرح کرتا ہے۔ دونوں ہی اپنی پیش قدمی میں میکا کی انداز اختیار کرتے ہیں۔ دونوں کو سزا ملتی ہے کہ دونوں ہی جہل میں مبتلا ہوتے ہیں۔ موجودہ انسانیت کا یہی روئے ہے اور اس کی مثالیں جا بجا پھیلی ہوئی ہیں۔

شعور سے ہم اصل بات کی طرف اور اصل معاملے کی طرف رجوع کر سکتے ہیں کیونکہ میکا کی عمل نہیں ہوتا۔ ان چند باتوں پر توجہ رکھئے اور سوچتے رہئے:

تمہاری سوچ تمہاری زندگی متعین کرتی ہے۔

آپ کی اصل نیچر آپ کے مستقبل کو جنم دیتی ہے۔

تمہارا رویہ تمہارے تجربات کو متوجہ کرتا ہے۔

اور تمہارے ارادے تمہاری منزل کا پتہ دیتے ہیں۔

تمہاری سوچ، تمہاری طبیعت، تمہارا رویہ اور تمہارا ارادہ شعوری ہونا چاہئے میکا کی نہیں۔

غلط فہمی کا ازالہ

یاد رکھئے کوئی دوست کوئی اجنبی کوئی راگبیر آپ کو ذہنی یا جذباتی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کسی میں اتنی طاقت ہی نہیں کہ وہ آپ کو نقصان پہنچا سکے۔ پھر ہوتا کیا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ تم غلط قسم کے رد عمل سے خود کو مجروح کر لیتے ہو اور شدید زخمی ہو کر بیٹھ جاتے ہو۔ کسی بے عزتی کی وجہ سے ناساز ہو جاتے ہو۔ اب آپ کی بے عزتی کیوں ہوتی ہے۔ بے عزتی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ تمہارے وجود کا ایک حصہ لوگوں سے ادب اور لحاظ ملاحظے کا متحمل ہوتا ہے۔ اب یہ تمنا کیوں ہوتی ہے۔ یہ اس لیے ہوتی ہے کہ آپ اپنی نام نہاد عزت کی توثیق چاہتے ہیں اور ہر کسی سے چاہتے ہیں۔ اس توثیق کی کیا ضرورت ہے اس توثیق کی یوں ضرورت پڑتی ہے کہ آپ ابھی تک یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا ایک اور وجود بھی ہے اور وہ الگ ہے۔ اور اس کا آپ کی ساری اکائی اور سارے وجود اور پورے Whole سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔۔۔ اس دردناک عذاب کی وجہ؟ وجہ

یہی کہ آپ سوچتے نہیں۔ اپنے آپ کو پورا وقت نہیں دیتے۔ اپنی توجہ سے باہر پھرتے رہتے ہیں۔ سوچئے اور ذرا اپنے آپ کو وقت دیجئے۔

کثیر المقاصد

اگر آپ کو لندن جانا ہے اور لندن آپ کی منزل ہے تو پھر آپ پیرس کو فراموش کر دیں۔ اگر آپ اپنے اندر کوئی نئی جگہ کوئی نیا وجود تلاش کرنا چاہتے ہیں تو پھر وہ سب کچھ بھلا دیں جس کا اس تلاش سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک نظر اٹھائیں اور فیصلہ کریں کہ آپ کو کہاں پہنچنا ہے۔ بہت ممکن ہے آپ کو ذہنی تبدیلی کی ضرورت زیادہ محسوس ہو اور اس کے لیے آپ جسمانی تبدیلی ترک کر دیں۔ ممکن ہے آپ ان تمام لوگوں کے مشورے پس پشت ڈال دیں جن کے کچھ مقصد آپ سے وابستہ ہیں۔ بہت ممکن ہے آپ کو اس اصول سے بھی انحراف کرنا پڑے کہ عافیت مجلسی میل جول میں پوشیدہ ہے۔۔۔۔۔ بس اپنے آپ تک پہنچنے کے لیے ایک سیدھا راستہ اختیار کریں۔

آج آپ نے اپنی خوراک پر دھیان دیا

جی ہاں دیا اور بڑی اچھی صاف ستھری اور صحت مند خوراک کھائی

کہا آپ نے اپنے کپڑوں کی طرف توجہ دی؟

جی جی ہاں! کپڑے عین موسم کے مطابق اور رواج کے مطابق پہنے

کیا آپ نے ان خیالات پر توجہ دی جو آپ کے ذہن میں آئے؟

نہیں جی ہاں! خیالات پر تو ہم نے کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ خیال آتے رہے اور جاتے رہے۔

ایک عام آدمی اپنی خوراک پر توجہ دیتا ہے۔ کپڑوں پر دیتا ہے۔ میکا پر دیتا ہے لیکن اپنے خیالات کے بارے

میں کبھی نہیں سوچتا۔ نہ ہی ان پر کوئی توجہ دیتا ہے اور یہ خیالات ہی ہیں جو اچھے کپڑے پہننے اور اچھا کھانا کھانے کے باوصف ہم

کو بے چین رکھتے ہیں۔ ہم کو بے قرار رکھتے ہیں۔ ہمیں کشمکش کرتے ہیں۔ انہی کے مطابق ہم اپنا رویہ طے کرتے ہیں۔

خیالات کا تجزیہ اور ان کا انتخاب ہی آپ کی اندرونی اور بیرونی دنیا طے کرتا ہے اور خیالات ہی آپ کو

استقامت عطا کرتے ہیں۔

زیادہ صفائی کے ساتھ سوچنا توجہ کے ساتھ ایک تازہ بصیرت کو پکڑنا اور اپنے اندر سے خود اذیتی کے سارے

سلسلے دفع کر دینا ہی سب سے بڑا عمل ہے اور روزمرہ زندگی میں یہی عمل قدم قدم پر کام دیتا ہے اور منزل کی طرف لے

جاتا ہے۔

گورو نے کہا ”دوسروں پر حکم جتنا اور دوسروں پر رعب رکھنا سب سے بڑی بیماری ہے۔“

”لیکن گورو جی! اس دنیا کو چلانے کے لیے مضبوط اور ٹکڑے لیڈروں کی ضرورت ہے۔“

”اور پرے اچھا اور ٹکڑا بننے کی آرزو ختم کر دو اور اپنے آپ سے لیبل اتار دو۔“

ہونے لگتا ہے تو اپنے آپ کو معاف کرنے کا عمل سمجھ میں آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ جب ماضی کو بھلا دینے کا اور ختم کرنے کا عمل شروع ہوتا ہے اور ”حال“ میں زندگی بسر کرنے کی آگہی عطا ہوتی ہے تو پھر یہ روشنی نمودار ہوتی ہے۔ ”حال“ ایک طویل زمانہ ہے اس کا کوئی ماضی نہیں جب ماضی نہیں تو کوئی پشیمانی بھی نہیں۔

آزادی اور آزادی کے اصول

- 1- آزاد رہنے کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ آپ کو دوسروں کے سامنے وضاحت کرنے کی ضرورت محسوس نہ رہے۔
- 2- کوئی شخص اپنی زندگی کو مجروح کرنے کا حق طلب نہیں کر سکتا اور ساتھ ہی اس سے الٹ حق کا طلبگار نہیں ہو سکتا کہ میں نے اپنی زندگی تباہ کر لی ہے اب تم اس کو ٹھیک کر کے دو۔
- 3- ساری علم دوسرے تمام علوم سے مختلف ہے۔ اس کی تربیت مختلف طور پر ہوتی ہے۔ جونہی آپ نے تسلیم کر لیا کہ آپ غلطی پر ہیں آپ راستی کے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔
- 4- پورے ذوق اور تندہی کے ساتھ حقیقت کو تلاش کرنے کے لیے ویسی زندگی بسر کرنے کی خواہش بھی لازمی ہے جس کا آپ نے علم حاصل کر لیا ہے۔ ایک نے نواز اس لیے اچھانے نواز نہیں ہے کہ اُس نے کتنی دیر تک بانسری بجائی بلکہ یہ ہے کہ اس نے کسی بانسری بجائی۔

رہنما اصول

- 1- درد کا طلبگار شخص سینکڑوں غلطیوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک درس سے دوسرے درس کی طرف بڑھتا ہے اور ایک چیز کو چھوڑ کر دوسرا چیر پکڑتا ہے۔
- 2- کامیابی کا دار و مدار جرأت پر ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس نے سچ کی تلاش میں تن آسانی کو ترک کیا یا نہیں۔ جذباتیت سے منہ موڑ لیا یا نہیں۔
- 3- کسی تعلیم کو اس لیے تو اختیار نہیں کر لیا کہ اس میں حفاظت کا اور Security کا سامان بہم ہے۔
- 4- راستی اور ناراستی کو سمجھنے کے لیے اپنی عقل استعمال کی یا نہیں۔

دوسروں کا رویہ

جس شخص کے ذہن میں یہ خیال ہی نہیں اٹھتا کہ دوسروں کو کس طرح اس کے ساتھ پیش آنا چاہئے اور اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے اس نے زندگی کا راز معلوم کر لیا۔

”چاہئے“ کے اندر ایسا تقاضا موجود ہوتا ہے جو متقاضی کو اور اس کے تقاضے کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے اس کو مسمار کر دیتا ہے۔ اصل میں تقاضا ہی متقاضی کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ متقاضی وہ شخص ہوتا ہے جو اب تک یہ سمجھ رہا ہوتا ہے

انسانی فطرت کی وضاحت کرتے جائیں اور اس کا تجزیہ کرتے جائیں آپ کے سامنے ساری صورت حال واضح ہو کر آ جائے گی۔ جس قدر کسی شخص نے اپنے اندر کم تبدیلی پیدا کی ہوگی اس قدر وہ دوسروں سے تبدیلی کا خواہاں ہوگا اور اس قدر وہ دوسروں کو تبدیل کرنے پر زور دے گا۔

”پھر اس زندگی میں عمل کا کیا مقام ہوگا؟“

عمل کا مقصد صرف ایک ہی ہے کہ اپنے اندر کی غلط فہمیوں کو ایک ایک کر کے پکڑا جائے اور ان کا ازالہ کیا جائے۔ علم بغیر عمل کے ایسے ہی ہے کہ بڑی محنت کے ساتھ ایک خط لکھا جائے اور اُسے پوسٹ کرنے کے لیے ڈاک خانے کی طرف چلا نہ جائے۔

جو شخص اس تصور کا حامل ہے کہ لوگ اس کے ذاتی خیالات اور اس کی ذاتی خواہشوں کی تصدیق کریں اور ان پر عمل کریں تو وہ ایک ایسا شخص ہوگا جس کا یقین ہوگا کہ سوائے اس کے اور کسی کا ذہن ہے ہی نہیں اور صرف اسی کے ذہن کو زندہ رہنے کا حق ہے..... لیکن احتیاط کرنا خود نگری کا یہ عمل ہی خود شکستگی کا باعث بنتا ہے اور اس سے خود آزادی کا عمل پیدا ہوتا ہے۔

اس دنیا کے جھگڑے لڑائیاں اور دردمندیاں کوئی بھی نہیں۔ اس کی چند جہیں ہیں کہ:

ہم ایک دوسرے کو اس لیے آزار پہنچاتے ہیں کہ ہم خوفزدہ ہیں۔

ہم اس لیے خوفزدہ ہوتے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ ہم کون ہیں۔

ہمیں اس لیے پتہ نہیں چلتا کہ ہم کون ہیں کہ ہم نے کبھی اس کی تحقیق ہی نہیں کی۔

لوگوں کی ناراضگی

افریقہ کے جنگلوں میں ایک مہم جو کسی تلاش میں جا رہا تھا۔ اس کو وحشیوں نے گھیر کر ختم کرنا چاہا تو اس نے وحشی قبیلے کو چند چھوٹے چھوٹے ختے اور بیکاری چیزیں دے کر انہیں رام کر لیا اور آگے نکل گیا۔ آگے پھر وہ پکڑا گیا۔ یہاں بھی اُس نے قلم چا تو اور سگریٹ لائٹر وغیرہ دے کر انہیں رام کر لیا اور آگے بڑھ گیا..... یہی حال باطن کے سفر کا ہے۔ اس میں بھی کچھ چھوٹی موٹی چیزیں دے کر اور کچھ چھوڑ کر آگے کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے۔

مجمیع میں سے ایک شخص نے اٹھ کر کہا میں اپنے باطن کے سفر کے لیے ایک چیز چھوڑتا ہوں اور وہ ہے لوگوں کو ہر حال میں خوش رکھنے کی آرزو..... آج کے بعد سے میری یہ آرزو نہیں رہے گی۔ اب تک میں ہر شخص کو خوش کرنے کی تمنا کا ایک قیدی تھا۔ اب میں اس قید سے آزاد ہوتا ہوں اور فارغ البال اور خوش باش انسان کی زندگی بسر کرتا ہوں۔

معافی

انسانوں کے بنائے ہوئے اصولوں اور نظریوں سے معافی حاصل نہ کرو اور نہ کسی سے معافی چاہو۔ اس ضمن میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ پہلے خود اپنے آپ کو معاف کرو۔ جب شعور بیدار ہوتا ہے اور میکا کی فعل اور رد عمل ختم

عادت کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ یہ عادت کو توڑ بھی سکتا ہے اور آپ کو گڑھے سے نکال بھی سکتا ہے۔

طعن اغیار

مجھے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ لوگ اپنے طعنوں کی بوچھاڑ مجھ پر کر رہے ہیں۔ مجھ پر تنقید کر رہے ہیں۔ مجھ پر ہر وقت نکتہ چینی ہوتی رہتی ہے۔ گویا میں ایک نارگٹ ہوں۔ ایک ہدف ہوں جس پر ہر کوئی تیر چلا رہا ہے۔

نارگٹ بننے کے خیال سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ تیر بننا چھوڑ دیں۔ نارگٹ اور ایرو۔ ہدف اور تیر ہمیشہ ساتھ ساتھ ہوتے ہیں اور یہ دونوں ہی آپ کے اندر موجود رہتے ہیں ہر وقت اور ہر گھڑی۔ جوئی آپ تیر چلانا چاہتے ہیں یا کوئی تیر چلاتے ہیں تو اپنے اندر ایک نارگٹ فٹ کر کے چلاتے ہیں۔ تیر اندازی کے کھیل میں یہ دونوں ہی ضروری سامان کی حیثیت رکھتے ہیں۔۔۔۔۔ جب آپ کسی پر اپنے غصے کا تیر چلاتے ہیں تو اس کے جوابی تیر کے لیے فوراً ایک ہدف بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اب یہاں ایمانداری کے ساتھ سوچنے کی ضرورت ہے۔ ایک بے ایمان اور بے انصاف شخص یہی سوچے گا کہ وہ صرف ہدف ہی ہدف ہے تیر نہیں ہے۔ لیکن جب اس کو آسانی عطا ہوگی تو وہ بڑی ایمانداری سے کہے گا کہ میں ہر ایک کا نشانہ بنی نہیں ہر ایک کے لیے تیر بھی ہوں۔

”یہ جو ہر وقت ذہنی سحر کے اندر رہتے ہو اور خیالی دنیا کو ہی اصل سمجھتے ہو تو اس کا مقابلہ حقیقت کی دنیا سے بھی کیا کرو۔“

”وہ کیسے؟“

”وہ ایسے کہ پابندی کے ساتھ اپنے آپ سے باہر نکل کر دیکھو اور اپنے دن بھر کے معاملات پر نشی بن کر نظر کرو۔ جب آپ ایک دیانتدار نشی بن کر معاملات کا جائزہ لیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ دوسروں سے برتر ہو کر زندگی گزارنے کے خواہشمند ہیں۔ آپ اپنی مرضی اور پروگرام کے اندر ذرا سا خلل بھی برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ آپ اپنے بارے میں کس قدر کم جانتے ہیں اور آپ نے اپنے ارد گرد کتنے خوابوں کو پلیٹ رکھا ہے۔“

شناخت اور تشخص

آج ذرا اپنی شناخت تو کروائیں۔ بتائیں تو کہ آپ کون ہیں اور کس طرح کے ہیں؟ اپنا تشخص اُس اعتقاد کا نام ہے کہ فلاں شے نے مجھے یہ شناخت عطا کر رکھی ہے: مثلاً دولت، حسن، جوانی، اقتدار، طاقت،۔۔۔۔۔ مقبولیت۔ آپ ان میں سے کسی کے ساتھ وابستہ ہو کر اپنی شناخت کرتے ہیں اور کرواتے ہیں۔

مثلاً آپ کہتے ہیں کہ میں نے اس معرکے میں کامیابی حاصل کر لی اس لیے میں ایک کامیاب انسان ہوں اور مجھے میری شناخت ہے۔۔۔۔۔ لیکن یہ ایک بہت بھاری غلطی ہے کیونکہ آپ نے محض ایک تصور کو ایک خیال کو اپنا وجود اور اپنی شناخت بنا لیا ہے۔ اب اس ایک غلطی سے اور بہت سی غلطیاں پیدا ہوتی ہیں اور یہ سلسلہ آگے ہی آگے پھیلتا جاتا ہے۔

عام طور پر انسان اپنی شناخت اپنی باہر کی مصروفیت اور باہر کے تعلقات سے کراتا ہے کسی شے کے پیچھے بھاگتے

کہ اس کی اپنی علیحدہ ایک دنیا ہے علیحدہ ایک شخصیت ہے جس کی دوسروں کو عزت کرنی چاہئے اور اُسے تسلیم کرنا چاہئے۔ اپنی حقیقت سے انحراف کرنے اور اپنے وہم اور خیال باطل کو کچ مان لینے ہی سے ساری تباہی پیدا ہوتی ہے۔ اس سے نصر اور گرج پیدا ہوتی ہے اور جب دوسری قسم کے لوگ ملتے ہیں تو ایک دھماکا پیدا ہوتا ہے۔ اس زمین پر ہر سینکڑ کے اندر کروڑوں اس قسم کے انسان ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اخبار میں ٹکراؤ کی سرخیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتے ہیں اور اخبار والے ڈھونڈ ڈھونڈ کر شائع کرتے ہیں۔ تقاضے سے انحراف اور ”چاہئے“ سے آزادی حاصل کرنے کے بعد آپ میں بے پناہ روحانی قوت پیدا ہونے لگ جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو آپ کی Tension اور آپ کا تناؤ ختم ہوتا ہے۔ پھر جب اپنی خیالی شخصیت کی جگہ حقیقی شخصیت آ موجود ہوتی ہے تو کشش اور جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک تکلیف دہ سفر کے بعد واپس اپنے گھر پہنچ گئے ہیں اور پرسکون ہو گئے ہیں۔

تحقیر اور افتادگی مدد کرتی ہے

اپنے اندر کی کشش کو ختم کرنے کا ایک فیصلہ کرو پھر اس فیصلے کے نتائج پر کوئی تبصرہ کرو نہ تجزیہ۔۔۔۔۔ آپ حیران ہوں گے کہ کچ کی طرف رجوع کرنے سے آپ کے اندر بے پناہ قسم کی بے یقینی پیدا ہوگی۔ اصل میں ہم اپنی آزادی سے خوفزدہ ہونے پر مصر رہتے ہیں۔ یہ خوف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ہم اپنے نام اور اپنی شان کے مجروح ہونے کی تاب نہیں رکھتے۔ لیکن نام اور شان کے معدوم ہونے سے ہی آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ نام اور شان انسانی زندگی کی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں ہیں۔ تحقیر کو یا ”اوئے اوئے“ کو آپ ایسے سمجھیں جیسے کوئی تاریخی ایکٹرا اپنے کاسٹیم کے بغیر سٹیج پر آ جائے اور سیٹیاں بجے لگیں۔ لمحہ بھر کے لیے اس ایکٹر کو بڑی خفت ہوگی لیکن جلد ہی اس کو اس شخص کا خیال آ جائے گا جو اس کا سٹیم کے اندر تھا پھر وہ آسان ہو جائے گا اور پرسکون ہو جائے گا۔

اصل میں مکمل خفت اور مکمل شرمندگی اور پوری پوری افتادگی ہی وہم و سواس اور fantasy کے تصور کو ختم کرتی ہے۔ اس کے بعد آزادی ہی آزادی ہے۔

عادت

کسی عادت کو ختم کرنے کے لیے ہمارے خیالات اس کو اور مضبوط کر دیتے ہیں کیونکہ خیال خود ایک عادت ہے۔ میکا کی خیال کسی بھی عادت کا خاتمہ نہیں کر سکتا، کیونکہ خیال خیال کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکتا۔ ایک گڑھے میں گر اہوا انسان اپنے آپ کو استعمال کر کے اور خود کو بروئے کار لا کر گھڑے میں سے نہیں نکل سکتا۔ اس کو مارو اور لے گڑھا یا گڑھے سے الگ کسی چیز کا سہارا لینا ہوگا۔ اب یہ کون سی طاقت ہے جو اس کو گھڑے سے نکالے۔ یہ خاموشی ہے۔ وہ خاموشی جو دو خیالوں کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ آرام سے اپنے ذہن کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ دو خیالوں کے درمیان واقعی ایک چھوٹا سا وقفہ ہے۔ اب یہ وقفہ اور یہ خاموشی میکا کی نہیں ہے کیونکہ یہ خیال نہیں ہے اور جب خیال نہیں ہے تو

بے چینی پیدا ہوتی ہے۔

یہاں پہنچ کر انسان کو غور کرنا چاہئے۔ اصل میں یہ مسئلہ ہی غلط ہے اور اس پر غلط انداز میں ہی سوچا جا رہا ہے۔

ان کو شہرت کی مقبولیت کی اور پیسے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی صحیح انسانی اور Real person ہونے کی ہے۔ ہم سے یہ

پتہ نہیں کی جاتی کہ ہم جوان رہیں، خوبصورت رہیں، توجہ کا مرکز رہیں..... ہم سے یہ امید البتہ کی جاتی ہے اور ہم کو اس

کی دعوت ضرور دی جاتی ہے کہ ہم اپنی ذات اپنی طبیعت اور اپنی نیچر کے مطابق ایک ہم آہنگی کے اندر بہتے چلے

جائیں اور تالیاں بجاتے جائیں۔

اور کسی چیز میں گرفتار رہنے کو اپنے اعزاز کی وجہ سمجھتا ہے اور وہ اس دھوکے میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ اپنی اس Activity کی وجہ سے معتبر ہے۔

نقلی

ایک بات کہی کر کے یاد رکھیں کہ جب آپ کسی اور شخص کی نقلی کرتے ہیں کسی اور طرح کا بنا اور ڈھلتا چاچہ ہیں کسی اور کے عادات اور اطوار اختیار کرنا چاہتے ہیں تو پھر لازماً آپ اس شخص کے مسائل اور اس کی بے چینی بھی اختیار کر لیں گے کیونکہ اس سے فرار ممکن نہیں۔

نکتہ چینی

میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ کسی کی تھوڑی سی نکتہ چینی بھی آپ کو اپنی بے عزتی محسوس ہوتی ہے۔ آپ جل بھن گئے ہیں اور بس کھولنے لگتے ہیں کہ میرے نام اور میرے کام پر ایسی نکتہ چینی! اگر آپ ایک غبارے پر پاؤں رکھ دیں تو کیا ہوتا ہے۔ ایک زور کا دھکا ہوتا ہے اور بیلون پھٹ جاتا ہے۔ یہی حال خالی خالی اور تھوڑے انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اصل میں وہ اپنے تھوڑے پن کی مدافعت کر رہے ہوتے ہیں اور ہر وقت اُسی کو بچانے میں مصروف ہوتے ہیں۔

جب آپ کسی شخص کو کوئی اچھا سا جملہ استعمال کرتے سنیں گے تو آپ اس فقرے کی حقیقت میں اترے بغیر اُسے فوراً ہی استعمال کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور لوگوں کو اسی طرح متاثر کریں گے جس طرح آپ اس شخص سے متاثر ہوئے تھے۔ لیکن اس سے خیر نہیں پڑے گی اور یہ فقرہ فقرہ ہی رہے گا۔ حقیقی زندگی کی طرف رجوع کرنے کے لیے سب سے پہلے نقلی اور نقلی کی بود و باش کا گہرا مطالعہ کر کے اس احساس کو جنم دینا ہوگا کہ میں نقلی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔

خود شناسی

خود شناسی کے لیے اپنے وجود کے دروازے پر دستک دو اور بڑے زور سے دو۔ اس میں شرمندہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تم پر نہ نکتہ چینی ہوگی اور نہ ہی دروازہ کھولنے سے انکار کیا جائے گا۔ جو شخص نیک نیتی سے اور سچائی سے دروازے پر دستک دیتا ہے اس کے لیے دروازہ ضرور کھلتا ہے۔ اس وقت تک دستک دیئے جاؤ جب تک دروازہ کھل نہیں جاتا۔ پتہ ہے ہم دروازے پر اپنے ہی دروازے پر دستک دینے سے کیوں گھبراتے ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی ذات کے لیے دوسروں کو نفاست دہنا کر رکھا ہوتا ہے۔ کسی شخص کو کسی بڑے کو کسی انجمن کو کسی تحریک کو..... انسان کو اپنے آپ کو آزاد کہتا ہے اور آزاد سمجھتا ہے لیکن اُس نے اپنی ذات اور اپنے آپ کی نمائندگی کا فریضہ ترک کر رکھا ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو ہی اپنا نمائندہ بنا کر اپنا بیان دیتا ہے۔ وہ خود بھی بیان دے سکتا ہے اور کبھی کبھی دیتا بھی ہے لیکن انسان بہ یک وقت دو جہتوں پر کھڑا نہیں ہو سکتا اور یہ راز اپنی ذات کی خود نمائندگی کرنے والے کو اچھی طرح سے معلوم ہے۔

آپ نے ابھی کہا کہ اندر کی اور باہر کی دنیا دونیں ہوتی ہے یہ ایک ہی دنیا کیا ہے؟

آج ذرا دیر بیٹھ کر اور اپنے آپ پر توجہ دے کر یہ تو معلوم کریں کہ آپ کے اپنے ساتھ کیسے تعلقات ہیں۔ آپ اپنے آپ سے لڑائی تو نہیں کیے بیٹھے۔ آپ نے خود سے بول چال تو بند نہیں کر دی۔ اندر کوئی جھگڑا تو نہیں ہو رہا۔ کوئی گھبراہٹ تو نہیں۔ اب ذرا باہر کی دنیا دیکھیں اس کا معائنہ فرمائیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ لوگوں کے ساتھ آپ کے تعلقات عین عین اسی طرح کے ہیں جس طرح آپ کے اپنے ساتھ ہیں۔

دیکھئے ایک بھیڑیا بھیڑیا ہی ہوتا ہے اندر رہے یا باہر اس کا کوٹ پہنا دینے سے وہ لیلا نہیں بن جاتا۔ اب ایک خوشی کا پیغام سنئے اور وہ یہ کہ جو بھی آپ خود نگری سے اپنے اندر کا مطالعہ کر کے اُسے ٹھیک کر لیتے ہیں آپ کے باہر کے سارے معاملات خود بخود ٹھیک ہو جاتے ہیں اور ساری دنیا خوشگوار موزوں میں داخل ہو جاتی ہے۔

خلا

آپ کو ہر شخص یہ شکایت کرتا ہوا ملے گا کہ زندگی میں کچھ کمی سی ہے۔ کچھ خلا سا ہے لیکن کوئی بھی نہیں بتا سکے گا کہ وہ کیا ہے..... میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ کمی کیا ہے۔ وہ ہے ایکسانی کا فقدان۔ Want of Oneness..... اصل میں اندر ایکسانی کا فقدان نہیں ہے کیونکہ ہم ہیں ہی ایکنا۔ ہیں ہی Oneness..... لیکن اس ایکسانی کا بظاہر فقدان ہمیں

انسان کو ازل سے ”زندگی کا مسئلہ“ درپیش ہے۔ اس کے بڑے اور سیانے یقین دلاتے ہیں اگر وہ یہ مسئلہ حل کرنا چاہے تو کر سکتا ہے اور اس پر غور کر کے اور محبت کر کے اس کا حل تلاش کر سکتا ہے۔ لیکن ایسا انداز کی بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کا کوئی حل ملتا نہیں اور جب حل نہیں ملتا تو بیزاری بڑھتی ہے اور جب بیزاری بڑھتی ہے تو اس سے مزید تباہ پیدا ہوتا ہے

ہم آہنگی

احساس اور Realization نہ ہونے کی وجہ سے نظر آتا ہے۔ اس وقت دنیا بھر کے لوگ دیوانوں کی طرح کشتی کے ساتھ ساتھ دریا کے کنارے پر بھاگ رہے ہیں اور کشتی میں سوار نہیں ہوتے.... کشتی میں سوار ہونے کا راز ہی Oneness کا راز ہے۔

شخصیت کا ٹکراؤ

ہم نے اکثر سنا ہے اور دیکھا بھی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ شخصیتوں کا ٹکراؤ کیوں ہوتا ہے۔ اصل میں یہ وہ بھی ہوئے شخصوں کے درمیان کا قصہ ہے جو اپنے دلائل باطل ہو جانے کے خوف سے انہیں جتوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بحث میں وہ جیتنا اس لیے چاہتے ہیں تاکہ اپنی جو تصویر انہوں نے اپنے ذہن میں بنا رکھی ہے اس کو تقویت پہنچا جا سکے۔ لیکن خیالوں کو اور ساریوں کو کوئی بھی تقویت نہیں پہنچا سکتا اس لیے وہ سارا جھگڑا اور بحث مناجتہ اکارت جاتا ہے.... ایک آزاد انسان کبھی بھی ایسے ٹکراؤ کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ الجھتا ہی نہیں اور کسی سے لڑتا ہی نہیں کیونکہ اسے کوئی بات پایہ ثبوت کو پہنچانی ہی نہیں ہوتی۔ یہ اس کی ذمہ داری ہی نہیں ہوتی وہ اپنے خود ساختہ فوٹو گرافوں سے بہت اونچا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص غصے سے اس پر چڑھائی بھی کرتا ہے تو بھی وہ خاموش رہتا ہے۔ اس کو کچھ ہوتا ہی نہیں۔

لیکن اس کو کچھ کیوں نہیں ہوتا؟

غصہ صرف اس وقت حملہ کرتا ہے اور اس وقت تکلیف دیتا ہے جب یہ انسان کی جھوٹی شخصیت اور جھوٹے وجود کو ٹرانک کرتا ہے۔ ایک آزاد انسان کا جھوٹا سیلف ہوتا ہی نہیں۔

ایک غلط فہمی

آپ کو کئی مرتبہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک خاص شخص آپ پر بڑی توجہ دیتا ہے۔ آپ سے بڑا پیار کرتا ہے آپ کے بغیر رہ نہیں سکتا.... لیکن جیسا کہ بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے ایک روز آپ پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ اس نے تو کبھی بھی آپ کی پروا نہیں کی۔ کبھی بھی آپ پر توجہ نہیں دی۔ وہ تو اب تک آپ کو اپنی ذاتی غرض کے لیے استعمال کرتا رہا ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتا رہا ہے۔ اس احساس سے آپ کا خوبصورت اور سہانا سپنا ٹوٹ جاتا ہے۔ اس وقت آپ کو شدید غصہ آتا ہے ساتھ ہی ندامت بھی ہوتی ہے کہ میں اب تک اُلوی بنا رہا.... لیکن اب ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ فوراً اس جذباتی گڑھے سے نکلیں اور اپنے ٹوٹے ہوئے خواب کی کڑیاں ایک ایک کر کے ملاحظہ کریں۔ یہ ساری کی ساری کڑیاں سونے کی ہیں۔ ان کو ملاحظہ کیجئے اور جان جائیے کہ آپ اب تک سو رہے تھے۔ اگر آپ سو نہ رہے ہوتے تو نہ یہ خواب آتا اور نہ ہی سہانا سپنا اس طرح سے ٹوٹتا۔ اب آپ جاگ گئے ہیں اور خواب کی حقیقت سمجھ گئے ہیں۔ اب مہربانی کر کے جاگتے ہی رہے اور آئندہ کسی ایسے خواب کی توقع نہ کیجئے۔ کیسی اچھی بات ہے کہ آپ جاگ گئے ہیں اور آپ نے خواب کی دنیا میں جانا چھوڑ دیا ہے۔

کامیابی کے گزرتی

ترقی Progress

آپ اس قدر سمجھ پائیں گے جس قدر سمجھنے کی آپ میں خواہش ہے اس سے زیادہ نہیں۔ اگر آپ میں ترقی کی رفتار کم ہے تو اپنی آرزو کا جائزہ لیں۔ روحانی درجات میں بڑھوتری کی بس ایک ہی پڑتال ہے جب سالک کسی تحریک کسی واپرتا اور کسی القاسے بے نیاز ہو جائے۔

اصل میں انسان تضاد کی پڑیا ہے۔ اس کے اندر رسہ کشی کا عمل جاری ہے۔ انسان کا ایک حصہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کا گرد ہو، صاحب ہو، اتھارٹی ہو جو اس کو مخصوص کام کرنے کے حکم صادر کرے۔ اس کے لیے راہ متعین کرے اور اس کو آزاد روی سے اور شہرے مہارشی سے روکے۔ دوسری طرف اس کا ذہن جلی طور پر اسے کسی کا محکوم ہونے سے منع کرتا ہے اور اس کو بغاوت پر اکساتا ہے۔ جو لوگ اپنی ذات پر سری رمز وارد کرتے ہیں وہ اس الجھن سے نکل کر صاف ستھرے ہو جاتے ہیں اور سونے سو گئے رہتے ہیں۔

کامیابی کے گزرتی

کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک کامیاب انسان نے مسکرا کر کہا کہ تارکی ٹھنڈی ہوا کو چلنے سے نہیں روک سکتی نہ ہی بداندیش سوسائٹی ایک مخلص روح کے عمل میں رکاوٹ ڈال سکتی ہے۔ آدی کتنا بھی زور لگائے کوئی شخص اپنے عمل بد کو چھوڑ نہیں سکتا۔ لیکن اگر اس میں بصیرت پیدا ہو جائے اور وہ اس عمل کے تجزیے پر آتر آئے اور اس کو اچھی طرح سے سمجھ جائے تو پھر وہ عمل بد خود اس کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ ایک بڑی کتاب یا ایک عمدہ لکچر ایسی شخص کو متاثر کر سکتا ہے جو روحانی طور پر کھیت کی طرح تیار ہو۔ روحانی اصولوں اور سائنسی دریافتوں میں پوری پوری مطابقت ہے۔ اس مطابقت کے بغیر دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر کزور ہوں گے۔

جس طرح شہر کی روشنیاں دور تک پھیلے کھمبوں سے وابستہ ہوتی ہیں عین اسی طرح انسان بھی ایک ہی بجلی گھر سے وابستہ ہوتے ہیں اور ان کی طاقت کے حصول کا ذریعہ بھی ایک ہی ہوتا ہے۔

عمل کو اپنے شعور سے اور ”سمجھ میں آ جانے والی بات“ سے علیحدہ نہ کریں۔ پھر تمہارا راستہ راستی کا راستہ ہوگا۔

روحانی کامیابی

روحانی کامیابی کے لیے سب سے پہلے جھوٹی خوشی کو قربان کر دیں اور مصنوعی مسرت کا راستہ بند کر دیں۔ فرض کیجئے آپ کے پاس کچھ معلومات ہیں جن کی کسی دوسرے شخص کو ضرورت ہے۔ ان معلومات کو ضرورت مند سے چھپا کر رکھنے اور اس سے روک کر رکھنے میں آپ کو اپنے پاؤں پر غلے ہونے کا احساس ہوگا اور آپ کو اپنی بڑائی کا احساس ہوگا اور اس احساس سے آپ کو خوشی ملے گی۔ لیکن یاد رکھئے یہ نقصان دہ خوشی ہوگی۔ اس خوشی سے اور اس کے نقصان دہ اثرات سے بچنے کے لیے آپ وہ معلومات اس شخص کو عطا کر دیں اور اپنی انا کی قربانی دے دیں اس سے آپ کی کامیابی کا راستہ ہموار ہو جائے گا اور ترقی کا راستہ کھل جائے گا۔

تو پھر اصلی خوشی کیا ہے؟

اصلی خوشی وہ ہے جو تمہاری طبیعت اور نیچر اور تمہارا اصل پیدا نشی وجود حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جس میں کسی قسم کا تقاضہ ہو، خوشی نہ ہو، برتری نہ ہو اور دکھلاوانہ ہو اور مصنوعی خوشی کا اظہار نہ ہو۔ موجودہ خوشیاں اور ان کا اختیار اور ان کا اظہار آپ نے سوسائٹی سے سیکھا ہے۔

اصل خوشی کیسے اختیار کی جائے؟

جب آپ مصنوعی خوشی چھوڑ دیں گے تو اصل اپنے آپ لپک کر آپ کی گود میں آ جائے گی۔ وہ بڑی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ جب آپ طوائف کے ڈیرے کو چھوڑ دیں گے انتظار کرنے والی بیوی لپک کر آپ کے وجود سے چٹ جائے گی۔

سیدھا راستہ

ایک بوڑھا آدمی ایک اندھی سڑک پر ٹھوکریں کھاتا جا رہا تھا۔ جب اُس کے گھٹنے زخمی ہو گئے تو اس نے ایک راہ چلے فقیر سے پوچھا ”بابا! میں اس راہ پر کس طرح سے چلوں کہ مزید ٹھوکریں نہ کھاؤں؟“

فقیر نے اُسے غور سے دیکھ کر پوچھا ”بابا! لوکا! یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟“

اس نے کہا ”پتہ نہیں کیا ہے لیکن میں اسے پکڑے رکھنے پر مجبور ہوں۔“

فقیر نے کہا ”بابا! لوکا! یہ ناسمجھ ہے۔ اس کی روشنی تمہیں بتائے گی کہ راستہ کیا ہے اور کیسے چلنا ہے۔“

”لیکن اس کی تو کوئی روشنی ہی نہیں!“ اس آدمی نے کہا۔

فقیر نے کہا ”جب تک تم اس کا ہٹن نہیں دباؤ گے یہ روشن نہیں ہوگی۔ اس کا ہٹن تم کو خود دبانے ہوگا۔“

”لیکن میں خود کیسے دباؤں؟“

”اندھیری راہ سے محبت کرنا چھوڑ کر ٹھوکریں کھانے کی لذت ترک کر کے جوں جوں تم اس خواہش کو ترک کرتے جاؤ گے تمہارا راستہ روشن ہوتا جائے گا۔“

سادہ روی

اپنی زندگی کو سادہ بنانے ہی سے آپ آزادی حاصل کر سکتے ہیں اور آزاد ہو سکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوگا تو ارد گرد کے لوگ آپ پر جال بھینک کر آپ کو قید کیے رکھیں گے۔ جن لوگوں نے ابھی تک اپنے مسائل ہی حل نہیں کیے ان کے ساتھ رابطہ رکھنے سے کیا فائدہ!

ذرا ایک مشکل اور تکلیف دہ مسئلے کو سامنے رکھ کر اُس کا مطالعہ کیجئے مثلاً یہ سوچئے کہ دوسرے لوگوں کے خیالات آپ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ دوسروں کی بولی یا طعنہ آپ کو عذاب میں ڈال سکتا ہے۔ اب یہ ایک غلط خیال ہے۔ دوسروں کا خیال آپ کو نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ دوسروں کے خیال کے بارے میں آپ کا اپنا خیال آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اپنے آپ کو درست کرنا ہی پوری درستی ہے۔ دوسروں کی بولی اور طعنہ بھلے نقصان دہ ہو لیکن آپ کی ذہنی صحت ہی اس طعنے کو مائی سین عطا کر سکتی ہے۔ ایک لومڑی خطرناک ہو سکتی ہے لیکن ایک شیر کے لیے نہیں!

فرق صاف ظاہر ہے

میکانگی مذہب اور اس کے میکانگی لوازمات آسانی بھی عطا کرتے ہیں اور حفاظت سے رکھنے کا وعدہ بھی کرتے ہیں لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ اندر بے چینی بڑھتی جاتی ہے۔ رسومات، بدعات، اجتماعات اور تقریری جیسے زندگی کے ہندی خانے کی موٹی موٹی سلاخیں ہیں۔ ان کے اندر بہرام کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی برف کے اوپر زندگی بسر کر کے سوچے کہ کافی اچھا موسم ہے اور حیات افزا گرمی ہے کیونکہ موسمی چھان بین والوں نے کل ہی بتایا تھا کہ آج موسم خوشگوار رہے گا اور فضا میں زندگی بخش حدت موجود ہوگی۔

چند باتوں میں فرق کرنا ہمیشہ یاد رکھئے!

1- میکانگی پیش قدمی میں اور شعوری پیش قدمی میں

2- ڈرامے میں اور زندگی میں

3- زبردستی میں اور بے اختیاری میں

4- یادداشت میں اور جدید میں

5- اعصابیت میں اور سکون میں

6- بے کاری میں اور کارآمد میں

”اگر آپ کا ذہن دکھ اور درد سے ٹریچڈی اور کرب سے بھر جائے تو کیا اپنے پڑوسی کو تبدیل کر دینا چاہئے؟“

”نہیں سر! اپنے ذہن کو تبدیل کرنا چاہئے۔“

”اگر تمہارے جذبات میں ہیجان پیدا ہو جائے اور گھبراہٹ چاروں طرف سے گھیر لے تو مشکل سسٹم تبدیل

کرنا چاہئے؟“

”نوسر! جذبات کو تبدیل کرنا چاہئے۔“

”لیکن کیوں؟“

”اس لیے کہ صحیح مقام پر تبدیلی لانی چاہئے۔“

”شاباش!..... ایک بیمار آدمی کو اس کی بیماری سے بالکل افادہ نہیں ہوگا اگر وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کو تبدیل

کرنا شروع کر دے اس کو اپنی بیماری کی طرف توجہ دینا ہوگی..... اپنے دکھ اور اپنی مصیبتوں کے لیے دوسروں کو الزام دینا ایک ایسی عادت ہے جو ہمارے اندر بری طرح پختہ ہو چکی ہے۔ اس عادت کا قلع قمع کرنا چاہئے۔ صرف اپنے وجود پر کام کرنے سے آپ کا اندر تبدیل ہو سکتا ہے۔

نیاستق

ہر ناخوشگوار واقعہ میں ایک سبق تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ سبق موجود ہوتا ہے۔ ہر واقعہ سبق عطا کرنے کے لیے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جب تک آپ کو سبق دلانا مقصود نہ ہو آپ کو کسی واقعہ سے گزارش نہیں جاتا۔

جب ایک سبق سیکھ لیا جاتا ہے تو وہ راستے سے الگ ہو جاتا ہے۔ پھر ناخوشگوار کیفیت باقی نہیں رہتی۔ پھر انسان اگلے صفحے پر پہنچ جاتا ہے۔

سبق سیکھنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ اس سے انکار نہ کیا جائے۔ انکار بڑا چالاک ہے وہ سوسو بھیس بدل کر سامنے آتا ہے۔ کچھ ظاہر ابھیس کچھ پوشیدہ۔

ایک جھوٹی صورت حال کی مدافعت انکار کا ایک روپ ہے۔ اپنا قصور دوسروں کے سر تھوپنا بھی انکار ہی کی ایک صورت ہے۔

جو لوگ اپنی ذات پر ذرا سی تکتہ چینی سے منہ نہ سجالتے ہیں وہ اپنے قیمتی سبق کو رد کر دیتے ہیں۔ اس کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

قصد اور آہنگ

آپ کو اپنی زندگی ایک ارادے ایک آہنگ اور ایک مقصد کے ساتھ گزارنی چاہئے۔ ایسے ہی بے مقصد نہیں۔ مثلاً آپ ایک قصد کرتے ہیں کہ بے ضرورت نہیں بولیں گے یا اضطرابی طور پر گفتگو نہیں کریں گے لیکن جب آپ ٹی

ہاؤس جاتے ہیں اور بے تحاشا بحث مباحثہ کرتے ہیں تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ میرا مقصد تو ٹوٹ گیا۔ بس یہ احساس ہی سوتا ہے اس کو سنبھال کر رکھو..... لیکن اگر آپ نے کوئی قصد ہی نہ کیا ہو کوئی ارادہ ہی نہ باندھا ہو تو پھر ٹوٹنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔

اپنے ارادے کو ناکام یا کامیاب بنانا آپ کا کام نہیں۔ یہ آپ کی ذہنی نہیں یہ اتنا اہم نہیں البتہ اپنے عمل پر شعور کی نگہ رکھنا آپ کی ذمہ داری ہے..... زندگی میں آپ کا مقصد جیتنا نہیں ہے بلکہ یاد رکھنا ہے اور یہ یاد رکھنا ہی سب سے بڑی جیت ہے۔

ایک تائی کاراز

اس دنیا میں بہت سے لوگ دکھوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور دکھوں کو چھوڑنا گوارا بھی نہیں کرتے کیونکہ دکھوں سے الگ ہو کر وہ لوگوں کی نگہ کا مرکز نہیں رہیں گے۔ کچھ لوگ مشکل سے نکلنے کے لیے دوسروں کی مدد کے طلبکار ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس مدد کو دستکارتے جاتے ہیں کیونکہ ان کی خودی یہ گوارا نہیں کرتی کہ کوئی ان کی مدد کرے.....

یہ تکیف وہ تضادات دوہرے پن کی وجہ سے عمل میں آتے ہیں جس نے انسان کو چیر کے رکھا ہوتا ہے۔ اس کے اندر دو طاقتیں کام کر رہی ہوتی ہیں ایک لحد ایک اثر پذیر ہوتی ہے دوسرے لمحے دوسری! ان متضاد طاقتوں کا عمل فوراً ختم ہو جاتا ہے اگر متعلقہ شخص ایک سنا بیڑ کو دوسری سائیڈ کے خلاف استعمال کرنے کے لیے اختیار نہ کرے..... مثلاً جب وہ خوشامد کو ناپسند کرتا ہے اور منہ کی تعریف کو برداشت کرتا ہے اور جب اس پر یہ وقت آئے کہ کوئی اس کی خوشامد کرے یا منہ پر اس کی تعریف کرے تو وہ اس پر توجہ نہیں دیتا اور اس کو خاطر میں نہیں لاتا تو وہ دوئی سے نکل جاتا ہے اور ایک اکائی بن جاتا ہے۔ دوئی سے اوپر کا درجہ کائی کا ہے۔ بس یہ اکائی ہی اس کا مقصد ہونی چاہئے۔

ترقی کا زینہ

لو جناب! آج ہم کو ترقی کا راز بتا ہی دیتے ہیں اور وہ راستہ بتا ہی دیتے ہیں جسے اختیار کر کے آپ مہینوں کی منزلیں دنوں میں طے کر سکتے ہیں۔

یہ بڑا ہی آسان اور طاقتور طریقہ ہے۔ اس سے کوئی بھی اپنی منزل تک منٹوں میں پہنچ جاتا ہے۔ سنئے..... جب آپ کو پتہ چل جائے کہ آپ کچھ صحیح اور راست اور اچھا کر رہے ہیں تو اس کو پوری طاقت توجہ اور تیزی سے کرنا شروع کر دیں۔

آج اگر آپ کے سامنے کوئی مشکل یا اڑجن ہے یا کوئی مسئلہ ہے تو پوری کوشش اور توجہ کے ساتھ اس کو نبھنے کی کوشش کریں۔ اس کے ساتھ جھگڑا نہ شروع کر دیں۔

آرام سے دیکھیں کہ آپ کے ذہنی عمل نے خود اس مسئلے کو کس قدر چھیدہ بنا دیا ہے اور اس میں کتنا اضافہ کر دیا ہے۔ اس مشق کے بعد اگلے روز بھی یہ مشق کریں۔ لیکن کل کے مقابلے میں زیادہ توجہ دے کر زیادہ زور لگا کر۔ خدا نے آپ کو بے پناہ قوت دی ہے اس قوت کی ایک چھوٹی سی دھارا استعمال کریں اور پھر دیکھیں کہ یہ دھارا کس طرح سے ایک ڈیم کی قوت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اپنے لیے ایک میدان چن لیں۔ کسی اچھی کتاب کا بغور مطالعہ یا اپنے خالص اور طہراؤ ذہن کا استعمال۔ اس کو آہستہ آہستہ بڑھاتے جائیں۔

چند اصول

- 1- جس چیز کو آپ سمجھنا چاہیں اس کے سمجھنے کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔
- 2- ایک آزاد روح اور بے فکر وقت کو اپنانے میں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا۔
- 3- اپنی غلطی کو تسلیم کرنے اور اپنی غلطی کا ازالہ کرنے سے کوئی بھی آپ کو روک نہیں سکتا۔
- 4- ایک پرسکون اعتماد میں داخل ہونے کے لیے کوئی بھی آپ کی راہ روکنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

روحانی جدوجہد

اور باتوں کے متعلق تو میں کچھ عرض نہیں کر سکتا البتہ روحانی دیدھ کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس عمارت میں کوئی منفی پیش قدمی نہیں ہوتی۔ نہ ہی کوئی منفی روئے ہوتا ہے۔ مثلاً اس جدوجہد میں دوسروں کی توجہ اپنے پر مرکوز کرانے یا دوسروں سے برتر ہونے کی سعی کرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔ اس قسم کے ارادے ساری بازی مکمل طور پر ہار دینے کے ارادے ہوتے ہیں۔ یہ میڈل روحانی وجود پر تک ہی نہیں سکتے۔ روحانی وجود میں الگ سے کوئی اور وجود نہیں ہوتا جو لوگوں کی توجہ بٹورتا پھرے اور خیالی دشمنوں سے برتری کے دعوے کرتا رہے۔

روحانی سپاہی کا صرف ایک ہی محاذ ہوتا ہے اور وہ اس کی اپنی ذات کے اندر حملہ آوری کی سرشت کا محاذ ہوتا ہے۔ اس کی سرکوبی روحانی سپاہی کا کام ہے۔ دراصل اُسے اپنے آپ کا بدترین دشمن ہونے سے روکنے کا کام سونپا ہوا ہوتا ہے۔

نفسیاتی صحت

- 1- ایک شخص کی نفسیاتی صحت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کن اقدار میں رہ رہا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ کن اقدار کا تذکرہ کر رہا ہے۔
- 2- ایک پابہ جولان شخص جو زنجیروں میں جکڑا ہوتا ہے دوسروں کو بھی زنجیریں پہنانا چاہتا ہے۔ ایک آزاد

انسان دوسروں کو بھی آزاد دیکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔

3- خواب کے اندر زندگی بسر کرنے والا یہ کبھی نہیں سوچتا کہ وہ خواب میں ہے اور یہی اس کی بے چینیوں اور خرابیوں کا باعث ہوتا ہے۔

4- سچ کے اندر زندگی بسر کرنے والا کبھی بھی سچ کی مدافعت نہیں کرتا۔ جو شخص سچ کے اندر نہیں ہوتا اس کو سچ کی مدافعت کرنے کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔

5- جب کسی مشکل کے وقت اور غلجائ کے وقت اس کا کوئی حل نہ سوچے تو بالکل خاموش ہو جائیں اور ساکت ہو جائیں۔ جواب خود بخود اتر کر سامنے آجائے گا۔ ایک پرسکون ذہن پر ہی حل لینا کر سکتا ہے۔

6- اگلی مرتبہ جب آپ کو کسی شکست کا سامنا ہو تو چپ چاپ کھڑے ہو جائیں اور شکست کو پورے طور پر تسلیم کر کے شکست خوردہ ہو جائیں..... پھر دیکھیں کیا ظہور پذیر ہوتا ہے۔

PATH IN THE VALLY

اگر تم کو معلوم ہو گیا ہے کہ یہ زندگی ایک سفر ہے۔ باہر کا سفر۔ اندر کا سفر۔ روح کا سفر۔ باطن کا سفر۔ آگے کا سفر تو پھر تم کو یہ طے کر کے چلنا ہوگا کہ سفر کرنا ہے تو بوجھ اٹھا کر نہیں چلنا۔ ہلکے ہلکے۔ سہلے سہلے۔ لطف اٹھاتے چلنا ہے۔

ان سب لوگوں کے بتائے ہوئے بوجھ پھینک کر چلنا ہے جو سفر کے تجربہ کار ہیں اور اکثر بتایا کرتے ہیں کہ وہاں جا رہے ہو تو یہ لے چلو۔ اس علاقے کا سفر درپیش ہے تو اس شے کو ساتھ لے جانا نہیں بھولنا۔ چھوڑاؤ ان کو۔ کوئی بات نہ مانو اور زیادہ بوجھ نہ اٹھاؤ۔

ان نکتہ چینیوں کی گفتگو سے بھی اجتناب کرو جنہوں نے ساری زندگی خود کچھ بھی نہیں کیا لیکن ہر شے پر بڑی اچھی چمکی تلی تنقید کرتے رہے ہیں۔ ان کو بھی رستہ کرنے دو ان کی بات بھی نہ سنو۔

ان لوگوں کی رائے بھی نہ لینا جو بڑے بڑے پروگرام تو بناتے رہے ہیں لیکن ساری زندگی کچھ کر کے نہیں دکھایا۔

ایسا کرو کہ ریتی پھیرو دیے چھوڑ دو۔ نشلی بھوک ترک کر دو۔ بھاری بوجھ اتار پھینکو۔ متضاد خیالیاں ترک کر دو اور بیکار خوف چھوڑ دو۔ جن کو تم نے اپنے دل کی تہوں میں اور دماغ کے نہاں خانوں میں چھپا رکھا ہے۔ وہاں سے نکال کر یہاں ڈال دو۔ سامنے فرش پر اور پھر سفر شروع کرو۔ یقین کے ساتھ۔ خوشی کے ساتھ۔ ہاؤ ہونا لہ و فریاد کے بغیر اور پھر دیکھو کس تیز رفتاری کے ساتھ سفر کی منازل طے ہوتی ہیں۔

دولت، پیسہ، خوش لباسی، شہرت، عزت، نیک نامی، محبت، عیش پسندی یہ سب ”مقصد“ کا نعم البدل نہیں ہیں.....

جب آپ کو اپنا مقصد معلوم ہو جاتا ہے تو پھر یہ بات آپ پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ آپ کا یہاں آنے کا مقصد کیا ہے اور اس برزخ میں آپ کس حد تک کامیاب جا رہے ہیں۔

”مقصد“ آپ کے اندر بصیرت پیدا کرتا ہے۔ ”مقصد“ آپ کو صفائی اور شفافی سے روشناس کراتا ہے۔

”مقصد“ کی موجودگی میں آپ کو ہر قسم کی سہانہ اور دنیا کی سپورٹ مل جاتی ہے۔ اس کی بدولت آپ کو کل کائنات کی دعائیں نیک تمنائیں مقامت مل جاتی ہیں۔

انسانی روح ارد گرد کے گرد و غبار سے اس قدر آٹ گئی ہے کہ اب اس کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ یہ وہ بد قسمت میزبان ہے جو اپنے بی شمار مہمانوں میں گھر چکا ہے اور اب اس کی شناخت مشکل ہو گئی ہے۔ میں بھی ایک ایسا ہی میزبان ہوں۔ مجھ میں اب اپنی شناخت بھی باقی نہیں رہی۔ مجھ پر گرد و غبار کا اور دھول کا ایسا لبادہ چڑھ گیا ہے کہ مجھے اپنا آپ بھی اصل شکل میں یاد نہیں رہا۔ جو کچھ میں ہوں وہ ہوں لیکن جو کچھ میں نے اپنے اعضائے شعور سے جمع کر لیا ہے وہ سب گرد و غبار ہے۔

ہم نے ایک بابے سے پوچھا کہ بابائی زندگی کیا ہے اور موت کیا؟ اس کا راز مجھ میں نہیں آتا۔ انہوں نے مسکرا کر کہا ”بھائی! یہ سوال کسی اور سے جا کر پوچھو۔ ہم تو اس وقت ایسے مقام پر ہیں جہاں زندگی ہے نہ موت!!“

ہم سرگرد کا حسن دیکھنے کے لیے گئے تھے۔ اس کے لیے بڑا لمبا سفر کیا لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو تین دن اور تین رات تک سیاست اور حالات حاضرہ پر بحث کرتے رہے اور ہم میں سے کسی نے بھی چڑھتے سورج تیرتے بادل اور چمکتی ہوئی روشنی کو نہ دیکھا۔

ہر شخص خوفزدہ ہے۔ لڑاں ہے ترساں ہے۔ اندرونی طور پر اور بیرونی طور پر سبھی ڈرے ہوئے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے جاگتے ہر وقت خوف ہم پر مسلط رہتا ہے اور ہم اس کے چنگل سے رہائی نہیں پاسکتے۔ ہمیں محبت کے اندر خوف محسوس ہوتا ہے۔ نفرت میں خوف ہوتا ہے۔ کامیابی میں خوف۔ گناہ میں خوف۔ لطف میں خوف۔ خوف کی کئی قسمیں ہیں لیکن اس کی بڑا ایک ہی ہے۔ موت کا خوف! ڈراں بات کا لگا رہتا ہے کہ ہم ہوں گے نہیں۔ ہم مٹ جائیں گے۔ ہمارا ہونا ختم ہو جائے گا۔ ساری عمر یہی دیوگلا پکڑ کے رکھتا ہے۔ لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ موت کا خوف بڑا ہی بے بنیاد ہے کیونکہ یہ ایک نامعلوم کا خوف ہے۔ ہم نے نہ موت کو دیکھا ہے نہ اس میں سے گزرے ہیں نہ یہ ہمارا حال رہی ہے نہ ہی اس سے تعارف ہوا ہے لیکن اس کا خوف طاری ہے۔ لیکن جب ہم موت کے خوف کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد موت نہیں ہوتی بلکہ اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ ہم جو زندگی کو جان گئے ہیں پہچان گئے ہیں یہ آگئی ہم نے چھن جائے گی۔ جان کاری کے چھن جانے کا خوف، موت کا خوف ہے۔ اصل میں ہم نے اپنے آپ کو جانکاری سے موسوم کر لیا ہے اور یہ نسبت ہی ہمارا وجود بن گئی ہے۔ یہی ہماری زیست ٹھہری ہے۔ میرا جسم، میرا مال، میری عزت، میرے تعلقات، میری ثقافت، میرا ادب اور میرے خیالات میری شاعری میرے تصورات یہ سب میرے وجود کے سانس ہیں۔ ایک آتا ہے

ایک جاتا ہے۔ باری باری یہی کارنفس چل رہا ہے۔ اب خوف یہ ہے کہ موت ان پر چھاپے مارے گی اور ان کو چھین کر چپت ہوگی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں اس خوف کو دور کرنے کے لیے جمع کی جاتی ہیں۔ عزت، شہرت، دولت اور نیک نامی..... اور حیرانی یہ ہے کہ یہی ساری چیزیں خوف کا باعث بن جاتی ہیں۔ بے خوفی کی منزل تک جانے کا محتاط راستہ اختیار کیا جاتا ہے اور بالآخر یہ ہم خوف کی منزل پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ اگر انسان اس حقیقت کا سامنا کر لے اور اس کو اچھی طرح سے سمجھ لے کہ میں وہ نہیں ہوں جواب تک اپنے آپ کو بھٹتا رہا ہوں اور یہ جو چیزیں میں نے اپنی ذات کے گرد جمع کی ہیں ان کا اجتماع میں نہیں بننا تو یقین کیجئے خوف اُسی وقت دور ہو جائے گا۔ جو نئی آپ پر یہ حقیقت کھلے گی اور آپ بیدار ہو جائیں گے تو آپ کے سامنے اصل ”وجود“ ہوگا اور مجتمع چیزیں ہوں گی اور دونوں الگ الگ موجود ہوں گے۔

ایک ”خیر“ ہوگا اور دوسرا ”غیر“ ہوگا۔ ان دونوں کا امتزاج خوف پیدا کرتا ہے اور ان دونوں کا الگ ہو جانا بے خوفی! ذرا کی تلاش کے لیے ہمیں کچھ کرنا نہیں ہے۔ بس دیکھنا ہے اور سارا عمل ترک کر دینا ہے۔ جب ذہن پرسکون ہو جائے اور معائنہ کرنے لگے۔ اس وقت راستہ کھل جاتا ہے۔ اصل میں پرسکون اور شانت ذہن ہی راستہ ہوتا ہے۔ دین کے اندر پورے کے پورے داخل ہونے کا مطلب ہے لفظوں کو چھوڑ کر بے لفظی میں اترنا بلکہ آنکھیں بند کر کے اس میں چھلانگ لگا جانا۔

راستے

اس تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں کیونکہ اپنے تک پہنچنے کے لیے کسی راستے کی ضرورت نہیں۔ راستے تو دوسروں تک پہنچنے کے لیے ہوتے ہیں۔ مسافت طے کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ یہاں کوئی مسافت ہی نہیں۔ وہ تو شرگ سے بھی نزدیک ہے۔ میری شاہدِ رگ سے اس لیے کہیں جانا نہیں ہوتا۔ بس اُس کو یاد کرنا ہوتا ہے یا دیکھنا ہوتا ہے اور کچھ کرنا ہی نہیں اس کو جانا نہیں ہے۔ اس کو پانا ہے۔ اپنے آپ کو پانا ہے۔ ”میں کون ہوں“ بس یہ جاننا ہے۔ کوئی عمل کوئی کارکردگی کوئی فعالیت ہم کو ”خود“ تک نہیں لے جاسکتی کیونکہ ہر عمل ہمیں اندر سے بجائے باہر کی طرف لے جاتا ہے۔

کوئی عمل ہم کو موجودگی کی طرف نہیں لے جاسکتا۔ جہاں عمل ختم ہوتا ہے وہیں وجود موجود ہوتا ہے۔

کوئی راستہ ہم کو وہاں نہیں لے جاسکتا کیونکہ وہ وہاں نہیں وہ تو یہاں ہے۔

جذباتی طور پر ہر شخص بے چین ہے اور جذباتی طور پر ہی ہر شخص پرسکون اور خاموش ہو سکتا ہے۔ کون اور صریح ترکیب سے اور کسی مشق سے حاصل نہیں ہوتا۔ جذباتی اطوار کی تالیف کا نام ہی سکون ہے۔

جہاں کوئی اندیشہ داخل، شور اور بے چینی نہیں۔ جہاں کوئی مناظرہ نہیں۔ جہاں کوئی جھگڑے والی بات نہیں۔ کوئی الفاظ نہیں۔ بس خلد ہے۔ (چیزوں کا مکمل فقدان ہے) وہیں زندہ رہنا ہے وہیں دھرم ہے۔

مذہب وہ ہے جو انسان کو حقیقت میں سر بلند کر دے باقی سارے مذہب لایعنی ہیں۔ یاد رکھو کہ نفس کبھی بھی نفس کو بھلانے سے نہیں بنتا۔ اس کی نہر نیچے ہی نیچے رواں دواں رہتی ہے۔ نفس کو اس وقت قابو کیا جاسکتا ہے جب اس کو یاد رکھا جائے اور اس کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کیا جائے۔ نفس کو بھلا کر یا نفس کو ملیا میٹ کر کے روحانیت کا راستہ نہیں ملتا بلکہ نفس کو سرنڈر کر کے اور نفس کو صحیح صورت منوا کر ملتا ہے۔ خدا خود فراموشی سے نہیں ملتا بلکہ ذات کو تابع کرنے سے ملتا ہے۔ انسان کا وجود مٹی کا دیا ہے۔ اس میں مٹی بھی ہے اور روشنی بھی۔ اگر توجہ صرف مٹی پر رہے گی تو زندگی بیکار ہو جائے گی۔ لازم ہے کہ روشنی پر بھی توجہ رہے۔ جو مٹی روشنی کی طرف توجہ ہوگی سب کچھ عیاں ہو جائے گا۔

کسی بھی چیز کی بہتات نفس پرستی ہے شہوت پرستی ہے لیکن میانہ داری اور میانہ روی پر ہی ہر گاری ہے پارسائی ہے۔ بہتات ہلاکت ہے بربادی ہے۔ میانہ روی زندگی ہے۔ عیش پرستی اور بیوست دونوں ہی زندگی کو تباہ کر دیتے ہیں کیونکہ بہتات جہالت ہے۔ انا پرستی ہے۔ موت ہے۔

دیکھو اذہن کے ساتھ کچھ نہ کرو۔ اس کو اکیلا چھوڑ دو اور اس کا نظارہ کرو۔ اس کی زد کو ایسے ہی دیکھو جیسے دریا کنارے بیٹھ کر اس کی لہریں دیکھتے ہو۔ ذہن کی زد سے لاتعلقی ہو کر اور بے اثر اس کو دیکھو۔ دیکھتے رہو اور ہشیار رہو۔ اس کے دیکھنے اور نظارہ کرنے سے خیال آہستہ آہستہ خلد میں تحلیل ہو جائے گا اور ذہن پرسکون ہو جائے گا۔۔۔۔۔ رضا اور رضامندی ہی آرزوی عطا کرتی ہے۔ جو شخص راضی ہی نہیں وہ کس طرح سے آزاد ہو سکتا ہے۔ اور پھر..... اپنے آپ کو ڈھیلے چھوڑنے کا نام ہی محبت ہے۔ محبت میں موت قبول کرنا ہی روحانی زندگی بسر کرنا ہے۔ جو قطرہ آگے بڑھ کر دریائے ہم آغوش ہو جاتا ہے وہی ابدی زندگی پاتا ہے جو راستے میں رہ جاتا ہے ٹک جاتا ہے وہ مر جاتا ہے۔

زندگی کے اندر موت نہیں اور جو مردہ ہیں وہ کبھی بھی زندہ نہ تھے۔ جو لوگ زندگی کی فہم نہیں رکھتے وہ موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتے ہیں۔ ہدائش زندگی کی ابتدا نہیں ہے۔ نہ ہی موت زندگی کا خاتمہ ہے۔ زندگی موت سے پہلے بھی موجود تھی اور موت کے بعد بھی ہوگی۔

کچھ لوگ دنیا سے اور دنیا کے کاموں کے اتنے بھرے ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر ترس آتا ہے۔ ان کے اندر کوئی خلد کوئی کونہ خالی ہی نہیں ہوتا۔ جو شخص اس قدر بھرا ہوا ہوتا یا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو وہ آزاد کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ جس کے اندر ذرا سی جگہ بھی موجود نہ ہو اس کے اندر خدا کہاں سے آ سکتا ہے اور کیسے سا سکتا ہے۔ دیکھو آرزوی کے لیے اندر جگہ چاہنے باہر نہیں۔ میں تو اکثر یہ بھی کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو خدا سے بھی نہ بھرو۔ بس خالی جگہ چھوڑ دو۔ وہ خود بخود سا جائے گا تمہیں کوشش نہیں کرنا پڑے گی..... جب بارش ہوتی ہے تو خالی گڑھے باران رحمت سے خود بخود بھر جاتے ہیں اور موٹے موٹے اونچے نیچے ویسے کے ویسے سوکھے ہی رہ جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو خالی رکھو کیونکہ خالی جھولی ہی بھری جاتی ہے۔

ذہن بیرونی خیالات کے باریک ذروں کا ایک مجموعہ ہے۔ ان ذروں کو ہی ہٹانا مقصود ہے۔ جب یہ ذرے ہٹا دیے جاتے ہیں تو بے داغ شعور باقی رہ جاتا ہے اور یہ وہی بے داغ شعور ہے خیالات اور نظریات سے آزاد جس کی

حق اور سچ ایک دھماکے کے ساتھ واضح ہوتا ہے۔ ہولے ہولے اور دھیرے دھیرے نہیں۔ یہ زور لگا کر پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو بس واضح ہوتا ہے۔ اترتا ہے۔ خلد ہی اس کا جواب ہے الفاظ نہیں۔ بے جواب ہونا ہی جواب ہے۔ انسان جو جانتا نہ ہو اور وہ اس کو جاننے لگے۔ جس کی آگہی نہ ہو وہ آگاہ لگے۔ یہ روح کی تباہی کا باعث ہے..... مناظرے سے جہالت ختم نہیں ہوتی۔ یہ چھپ جاتی ہے۔ درپردہ ہو جاتی ہے۔ علم کو واضح کرنے کے لیے اس کا شعور حاصل کرنے کے لیے جہالت کو عین برہنہ صورت میں دیکھنا لازمی ہے..... پس ضروری ہے کہ اپنے آپ کو مناظرے اور الفاظ کی چادر میں نہ لپیٹا جائے..... دیکھو یہ کتنا سستا سودا ہے کہ حقیقت کو جاننے کے لیے خود کو صرف خواب سے نکالنا ہے اور کچھ نہیں!!

پہیہ گھوم رہا ہے اور حرکت میں ہے اور جس پردہ گھوم رہا ہے وہ دھراسا کن ہے ساکت سے بے حرکت ہے۔ ہر فعالیت کے پیچھے ایک بے عملی ہے۔ جس طرح ہستی کے پیچھے خلد ہے۔

ایک ذہن جواب کی تلاش میں اصل جواب دھند اور دھوئیں میں کھو جاتا ہے۔ اگر فہم اور خود خاموش رہے تو تجربہ بول اٹھتا ہے۔ اگر خیال چپ رہے تو تیز بیدار ہو جاتی ہے۔ خود صرف پوچھ سکتی ہے سوال کر سکتی ہے لیکن اس کے پاس جواب نہیں ہوتا۔ جواب صرف خلد سے آتا ہے۔ نیت سے ملتا ہے..... صحیح علم کی پیاس اپنی ذات کو جانے بغیر نہیں بجھتی۔

ذہنی اور سائنسی علم اصل علم نہیں ہے۔ یہ سچ کو جاننا نہیں ہے۔ سچ کی افادیت کو جاننے کا نام ہے۔ حقیقت تو صرف بلا واسطہ ادراک سے ملتی ہے۔ اسی طرح ذات کا علم ہے جو بلا واسطہ طور پر حاصل ہوتا ہے۔ شعور کسی جہت کے بغیر خدا میں مرکوز ہوتا ہے اور انسان کی آخری پیاس ہمیشہ خدا ہی کی حضوری میں بجھتی ہے۔

مکمل خاموشی ہی دراصل عبادت ہے۔ عبادت کسی عمل کے کرنے کا نام نہیں کسی کارکردگی کو نپٹانے کی بات نہیں۔ جب ذہن کسی عمل میں نہیں ہوتا اس وقت عبادت میں ہوتا ہے۔ عبادت دراصل کوئی عمل نہیں ایک کیفیت کا نام ہے۔

حصول کے لیے انسان میں جرأت ہونی چاہئے:

اپنے آپ کو حوالے کر دینے کی جرأت

اپنے آپ کو ملیا میٹ کر دینے کی جرأت

ایک خلد بن جانے کی جرأت.....

جو شخص اپنے آپ کو مکمل طور پر ملیا میٹ کرنے کا تہیہ کر لیتا ہے وہی کچھ حاصل کرتا ہے جو مرنے کے لیے تیار ہے وہی زندگی کا سزاوار ہے۔

ساری تلاش چھوڑ دو اور خاموش ہو جاؤ۔ ذہن کو چپ کر دو اور پھر سنو! آنکھوں کو مصروف نہ رکھو اور پھر دیکھو۔ انسان نے کئی قسم کی شرابیں تیار کی ہیں لیکن سب سے خطرناک شراب وہ ہے جو بوتلوں میں بند نہیں ہوتی۔

سخاوت۔ داد و دہش۔ دینا دینا دینا

امیر آدمی کبھی سخی نہیں ہو سکتا۔ یہ اس کی مجبوری ہے۔ غریب شخص ہمیشہ سخی ہوگا، دیا لو ہوگا، امیر سے یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ امیر ہوتا ہے، اس کے پاس بہت کچھ جمع ہوتا ہے۔

اگر آپ جو کچھ بھی آپ کے پاس ہے، اس میں سے حصہ بنا سکیں تو آپ ایک دم سے نامعلوم اور عدم کی دنیا کے دی آئی پی ہو جاتے ہیں۔ وہاں آپ کا ایک مقام مقرر ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں چاہے آپ فقیر ہوں، گداگر ہوں، بے نوا ہوں، وہاں آپ کے سر پر تاج شاہانہ رکھ دیا جاتا ہے۔

جونہی آپ حصہ بنانے لگتے ہیں، آپ بڑے ہونے لگتے ہیں، جوان ہونے لگتے ہیں۔ جو شخص اپنی چیزوں میں حصہ نہیں بنا سکتا، وہ ابھی تک بچہ ہی ہے۔ وہ جوان نہیں ہوا، آگے نہیں بڑھا۔ جو چیز آپ کسی کو دے نہیں سکتے، اس نے ابھی تک آپ کو پکڑا ہوا ہے، جکڑا ہوا ہے۔ وہ آپ سے بڑی طاقتور ہے، آپ پر حاوی ہے۔ وہ آپ سے ارفع ہے، اعلیٰ ہے، برتر ہے، آپ کی محبت سے زیادہ بڑی ہے۔ آپ کی شفقت سے زیادہ ہے۔ آپ پر مکمل طور پر حاوی ہے اور یاد رکھئے حصہ بنانے کے لیے آپ کو زیادہ چیزوں کی یا ان کے انبار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سخی ہونے کے لیے دنیا ضروری ہے، چاہے وہ دنیا ایک تنکا توڑ کے دینا ہو۔ اس لیے گننے سرمائے کی یا دولت کی یا بڑی جائیداد کی احتیاج نہیں ہوتی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مسکراہٹ بھی ایک صدقہ جاریہ ہے۔ اس کو گاہے بگاہے جاری کرتے رہا کرو۔ یہ بھی ایک خیرات ہی ہے۔ کوئی غنیمتیں ہوں تو اس کو گانا سنا دو، کسی کے سامنے تھپتھپانا چاہی تو ایسے بندہ اور گیت ہو کہ یہ کچھ بھی Share نہیں کر سکتے۔

اگر تمہارے پاس اور کچھ نہیں ہے تو اپنے وجود کو اپنے آپ کو ہی Share کر لو۔ یہ چیز تو کم از کم ہر ایک کے پاس ہوتی ہے۔ یہ تو کہیں سے جا کر نہیں لانی پڑتی۔ اسی میں حصہ بنا لو۔ اپنا ہاتھ لبا کرو، آگے بڑھاؤ۔ دل کو محبت سے بھر دو اور ہاتھ ملاؤ۔ یہ مت سوچو کہ وہ اعلیٰ ہے، ناشناسا ہے، جونہی تم اس سے حصہ بناتے ہو، اس سے ہاتھ ملاتے ہو، وہ اعلیٰ نہیں رہتا۔ ایک خنسی آدمی خوفزدہ آدمی ہوتا ہے۔ وہ ڈر کے مارے کبھی بھی آگے نہیں بڑھتا۔ اس کو اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر ہاتھ ملا لیا۔ اپنے آپ کو Share کر لیا تو پھر تعلقات بڑھ جائیں گے اور تعلقات بڑھنے سے کچھ دینا پڑ جائے گا اور دینے میں میری موت پوشیدہ ہے، اس لیے یونہی اچھا ہے۔

سوکھا کنواں

یہ کبھی نہ سوچنا کہ سخی ہونے کے لیے تم کو دولت کی اور چیزوں کی اور ثروت کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ

اور پوچھ گچھ ہوگی یا ہماری موجودہ زندگی بالکل فراموش کر دی جائے گی؟

لیکن انسان میں سوال بنانے اور سوال پیدا کرنے کی صلاحیت جواب دینے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ یہی وہ شے ہے جو اب تک علم و دانش کی راہ کا گناہی رہی ہے اور اب تک ہے..... انسان ابھی تک اپنے علم کی پیاس بجھا نہیں سکا اور آئندہ شاید کبھی بجھا نہیں سکے گا۔ یہ متحدی مرض اس کی جان کے ساتھ اسی طرح سے لگا رہے گا۔

اصل میں جب تک انسان یہ نہیں جان لیتا کہ اس کے سارے سوالوں کے جواب اس کے اپنے اندر گہرے اور بہت ہی گہرے موجود ہیں اور بڑے واضح انداز میں موجود ہیں۔

سینکڑوں ہزاروں سالوں سے انسان کی ابتدا کا مسئلہ انسان کے لیے ایک معما بنا ہوا ہے اور ہر صاحب فکر اور ہر دانشور نے اس کا جواب اپنے انداز میں دیا ہے اور اس پر سختی سے قائم رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے اپنی اپنی تھیوریوں کے گلے اسارے ہیں اور کچھ نے پرانی منزلوں پر اپنی غارتیں اٹھائی ہیں لیکن مسئلہ ویسے کا ویسا موجود ہے۔

چنانچہ فلسفے کے دو بنیادی سوال ہیں: انسان کی فطرت The nature of man اور دوسرا: کائنات کی ہیئت اور اس کی نیچر۔

- 1- کیا یہ کرۂ ارض خدا کی مرضی سے اور اس کے حکم سے وجود میں آئی..... یا
- 2- ارتقا کی تدریجی منزلوں میں طے ہو کر اپنے موجود مقام پر پہنچی ہے۔ اس میں اتنا متنوع کیوں ہے۔ یہ کیوں سے میسر مل سے بنی ہے۔
- 3- یا اچانک ایک پٹانے سے پیدا ہو گئی۔
- 4- انسان اس کائنات میں "مخلوق" ہے یا ایسے ہی لایعنی مخلوق ہے یا پھر اس کائنات میں اس کا کوئی اہم قسم کا سلطانی اور بادشاہی کام ہے۔

Thales نے کہا یہ کائنات پانی سے معرض وجود میں آئی ہے۔
Anaximander نے کہا کہ یہ کائنات ایک زندہ man ہے جس نے سارے ظلال کو بھر رکھا ہے۔
Atomists نے کہا ہم سے پہلے کے فلسفی بھی ٹھیک تھے لیکن اصل میں اس کائنات کے اندر جو حرکت اور تنوع ہے وہ چھوٹے چھوٹے یونٹوں کی وجہ سے ہے اور ان یونٹوں کا انحصار ایٹموں پر ہے۔

ہر ایٹم کے اندر ایک حرکت ہے اور حرکت کے اتحاد اور یونٹی کی بنا پر ان کا وجود قائم ہے۔
ایٹم خود کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔ یہ ازی طور پر موجود ہیں اور بہت ہی چھوٹے ہیں ان کے اتحاد سے زندگی ہے اور ان کی علیحدگی اور ٹوٹ پھوٹ سے موت ہے۔

Pyrrho نے کہا یہ ساری سوچیں اور سارے دلائل تصنیع اوقات ہیں۔ کائنات کی تشریح کرنا اور اس کی ساخت پر غور کرنا اپنا وقت ضائع کرنا ہے۔ اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چل سکتا۔

خفی کی حد تک قابل گرفت نہیں ہوتا۔

غور و خفی کیا ہے؟ جب نگاہ نفس کے تابع ہوگی تو دوسروں میں اچھائی نظر نہیں آئے گی۔ یہ غور و خفی ہے۔

غور و جلی کیا ہے؟ اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمان کو جان لینے کے بعد سمانی کی جائے تو یہ غور و جلی ہے۔

معانی! نہ نہ! ہرگز نہیں۔ اگر غور و جلی کو معاف کیا جائے تو یہ مسلمین اور مجرمین کو مساوی قرار دینے کے مترادف

ہوگا۔ (ہمارے ملک کے جملہ مسائل اسی کے سہارے قائم ہیں)

اصلاح کی صورت: اصلاح کی صورت یہ ہے کہ بات کرتے وقت یہ دیکھا جائے کہ جو بات کی جارہی ہے،

بات کرنے والے کا عمل اس کا شاہد ہے؟ اگر عمل شاہد ہے تو بات کی جائے ورنہ نہیں کیونکہ بے مقصد بات منع ہے اور کسی کو

نقصان پہنچانے کے لیے تو بولنے کا حکم ہی نہیں۔ یہ ہے قول سدید اور صالح عمل کی راہ۔

جب تک اللہ کے نزدیک پسندیدہ معیار ہمارے نزدیک پسندیدہ نہیں ہوتا اس وقت تک علم حقیقی سے فائدہ اٹھانا

ممکن نہیں۔

کامیابی

یوں تو انسان میلاد آدم سے لے کر اب تک بہت سی گئی اور کئی ان گنی صدیوں میں سے بچر و خوبی گزرتا رہا ہے

لیکن اب جب اس کے ادراک اور آگہی میں بہت سے نئے موڑ اور متعدد انوکھے زاویے پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ آنے والی

ہر صدی کے دہانے پر رک کر سوچنے لگا ہے کہ اس کے نام ٹیبل میں کیسی وضع اختیار کر کے داخلہ لوں۔

گزشتہ صدیوں کی تاریخ اپنی تمام تجزیات کے ساتھ آپ کے سامنے ہیں۔ اس فاصلے کو حضرت انسان نے

کس انداز سے طے کیا ہے اور پہلی صدی سے لے کر اب تک کہاں تک پہنچا ہے اس سے بھی آپ بخوبی واقف ہیں۔ ترقی

کے بے شمار آثار کچھ قریب سے جے اور کچھ منتشر حالات میں ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ ہم اپنی کارکردگی پر خوش بھی

ہیں اور حضرت انسان کی کامیابی اور اس کے کارہائے نمایاں پر فخر بھی کرتے ہیں لیکن کچھ سوچنے والے (جن میں مغرب

کے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے) ایک سو سو صدی کے دروازے پر آتی پاتی مارے، سر جھکائے اس سوچ میں متفرق بیٹھے

ہیں کہ حضرت انسان نے اب تک جتنی بھی ترقی کی ہے، اس کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے۔ اس نے اب تک جتنے بھی

کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں، وہ سب خارج سے متعلق ہیں اور اس کی شخصی اور ذاتی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں

رکھتے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان ویسا ہی ظالم، بے انصاف، مکار، خود غرض، منافق اور فریبی ہے جیسا کہ پتھر اور دھات کے

زمانے میں تھا۔ وہ ابھی تک اپنے اندر خوئیں بچے نکالے، طبع کی زبان لٹکائے اور حرص کے دانت تیز کیے۔ کائی سکر پیر کی

اٹھائیسویں منزل پر بیٹھا ہے جیسے وہ اپنی غار یا اپنے درخت کی کھوہ کے سامنے بیٹھا کرتا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب اس

کے گھر کے سامنے ایک بوٹنگ جہاز کھڑا ہے۔ اس کی چھت پر سنٹرل ایئر کنڈیشننگ کے آلات لگے ہیں۔ نگاہوں کے

سامنے سیلائٹ کی تصویریں آرہی ہیں۔ دور دراز پیغام بھجوانے کو ٹیکس مشینیں چل رہی ہیں۔ خون کی سپلائی بہتر طور پر

معالطے اس کے برعکس ہے۔ اگر تم دولت مند ہونا چاہتے ہو تو خفی ہو جاؤ اور دنیا شروع کر دو۔ سوکھا کنواں اس لیے سوکھ جاتا

ہے کہ وہ لوگوں کو پانی نہیں دیتا۔ جب وہ پانی نہیں دیتا تو اس کے اندر پھوٹنے والے سوتے سوکھ جاتے ہیں کہ یہ پانی آگے

تو دیتا نہیں، اس کو پانی کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ اس کے اندر سوکھا پڑ جاتا ہے اور کنواں اندھا اور گندا ہو جاتا ہے۔ لوگو

کو بلاؤ، ان کو دو۔ ان کو اپنی ذات کا کنواں پیش کرو کہ تم میں سے ڈول بھر بھر کر لے جائیں اور تمہیں پینا شروع کر دیں۔

پانی کہاں مر رہا ہے؟

1- اس ملک میں ہر نظام Mistrust پر قائم ہے۔ چنانچہ بیشتر قوت، وقت اور سرمایہ trustworthy ہونے

کا ثبوت فراہم کرنے پر صرف ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی کو قابل اعتماد مان لیا جائے۔ جب تک وہ ناقابل اعتماد ثابت نہ ہو

جائے۔ اس طرح سے برائی کی بہت ساری جڑیں کٹ جائیں گی۔

2- لائق احترام قیادت کا فقدان ہے۔ لائق احترام قیادت ہر سطح پر ضروری ہے۔ مخلص ہی قیادت کا حق ادا کر

سکتے ہیں کہ مدح و فرحت سے ان کا رخ متاثر نہیں ہوتا۔

3- لوگ اپنے آپ کو باعزت اور قیادت کا اہل ثابت کرنے کے لیے وسعت مال کو مقصود بنا رہے ہیں۔ مال

کے پیانے سے عزت کی پیمائش ختم ہو جائے اور ہر پیشے کو اس طرح واضح کیا جائے کہ لوگ اس کی قدر و منزلت کو جان

لیں اور اس کے حاملین سے سوڈ رہیں۔ یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ ”غور“ قابل تعزیر جرم ہو۔

4- جب تک ہم پورے پورے اسلام میں داخل ہونے کی جرأت نہیں رکھتے، اسلام کی باتوں کا ٹکرا اچھا نہیں

ہوگا۔ اس سے تعدادی نمایاں ہوگا۔ یہ قانون بنایا جائے کہ کوئی کس کو ایذا نہ دے۔

5- لباس کا معیار پاکیزگی اور آسودگی ہو۔ خوراک کی افادیت ملحوظ ہو، ذائقہ مقصود نہ ہو۔ رہائش سہری ہو اور

ساقیوں کو مرعوب نہ کرے۔

6- لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف آنے کے لیے قوت فیصلہ درکار ہوتی ہے جو یہاں ممنوع رہی ہے۔ ذرائع

ابلاغ قومی تشخص ابھارنے کا کام کریں اور ماہر نفسیات لوگوں کو خیر اور غیر کے مابین امتیاز کرنے کی تعلیم دیں۔

7- ترقی کی باگ دوڑ بھی خواہوں کے ہاتھ میں نہیں رہی۔

سائنسی ترقی کی ذمہ داری ملکی اور مخلص سائنس دانوں اور علم والوں پر ہو۔ وہ اپنے کام سے آگے بڑھیں۔ قومی

ضروریات کا تعین کیا جائے۔ اپنے ذرائع اور وسائل کو اچھی طرح سے جانچا جائے اور انہی ذرائع سے مقاصد کے حصول کی

کسی ہو۔

غور و قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے

غور و خفی بھی ہوتا ہے اور جلی بھی ہوتا ہے۔

برقرار رکھنے کے لیے باقی پاس ہو چکا ہے۔ پرانے پھوسڑے دار پتیس دل کی جگہ ایک نیا اور صحت مند اور چاق و چوبند براق دل فٹ کر دیا گیا ہے لیکن اندر بدستور تاریک ہے بلکہ پہلے کے مقابلے میں اور بھی تاریک ہو گیا ہے۔

چنانچہ اس وقت کہہ ارض کے دانشمند جن میں اٹھانوے فیصد لوگ مغرب کے ہیں، اس آس پر دھیرج باندھ کر بیٹھے ہیں کہ اکیسویں صدی میں داخل ہونے سے پہلے ان لوگوں سے اسرار کے صیغے حاصل کیے جائیں جن کے پاس نبیوں کا علم ہے اور جو بنی نوع انسان کی پریشان نظری کا دار دیتا سکتے ہیں، جنہیں انسان کو اندر سے بدلنے کا مگر معلوم ہے اور جو باطن کے سفر کی رہنمائی کا سر جانتے ہیں۔

اس وقت دنیا کے سب پسماندہ ملک جن میں جرمنی، فرانس، سیکنڈے نیویا، ہالینڈ اور امریکہ پیش پیش ہیں، اکیسویں صدی کے گریٹ پرائی اپنی جھولیاں پھیلانے ان داتاؤں کے منتظر کھڑے ہیں جن کے پاس زندگی کا مکمل ضابطہ حیات موجود ہے اور مکمل ضابطہ حیات کے حامل آئیں بائیں شاخیں بھٹیں جھانک رہے ہیں کہ ان کے پاس سوائے اعلان کے اور اطلاع کے اور کچھ بھی نہیں۔ مغرب کے ضرورت مند ممالک پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ دینی ترقی میں ہم نے تمہاری مدد کی ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہم آپ کی دھیری کرتے رہے ہیں۔ روپے پیسے اور مالی مدد کے سلسلے میں ہم نے کبھی گریز نہیں کیا۔ اب روحانی اقدار جاننے اور باطن کو سمجھنے کی ضرورت لاحق ہو گئی ہے تو آپ ہم سے آنکھیں جما رہے ہیں۔ ہم سے بے نیاز ہو کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ لائق کا اظہار فرما رہے ہیں!

لیکن حقی اور سچی بات کہ جسے مغرب نہیں جانتا، یہ ہے کہ ہمارے پاس انبیاء کے عطا کردہ علوم میں سے کچھ بھی باقی نہیں۔ بس ایک دعویٰ ہے جس کا ہم اعلان بھی کرتے ہیں اور جس پر اصرار بھی کرتے ہیں کہ انسان کے جملہ روحانی اور مصنوعی عوارض کا علاج صرف ہمارے پاس ہے۔ ہم کسی کو نہ کھد رے سے فلاں نسل انسانی کا نسخہ ڈھونڈ کر فراہم بھی کر سکتے ہیں لیکن اس پر وقت صرف کرنا اور انسان کو اس کے اندر کے بگاڑ سے نکالنا اور اسے انسانیت کی معراج سے روشناس کرانا اس وقت ہمارا منصب نہیں۔ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو کر صرف وہی کچھ کرنے کے آروز مند ہیں جو اب تک مغرب نے کیا ہے کیونکہ اس کے علاوہ ہمارا کوئی اور مطمح نظر ہی نہیں۔ ہم اسی سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کو اپنانا چاہتے ہیں جو اب تک یورپ کا طرہ امتیاز رہی ہے کیونکہ ہمارے پاس اپنا کوئی طرہ ہی نہیں۔ ہم اب تک کی خارجی ترقی میں کوئی ترمیم بھی نہیں کر سکتے کہ ہم ترمیم کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے اور مغرب پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ جس انسان کی خاطر ہم نے ایٹم کا بگڑ چڑھا، وہ ابھی تک ویسا ہی بیٹھا ہے۔ نگاہ بھولا خوفزدہ اور مایوس۔ جس انسان کے لیے ہم نے ستاروں پر کمندیں ڈالی تھیں، وہ انسان ابھی تک ویسے ہی زمانوں کی بھول میں زلزل رہا ہے۔ ہمیں اجازت دو کہ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہی آپ کے انبیاء کی عطا کردہ لیبارٹریوں میں کام کر سکیں اور ان کے نظریات پر اپنے عمل کا ڈول ڈال سکیں لیکن ہم ان احمقوں کو کس طرح بتائیں کہ ایک لمبا عرصہ ہوا ہم ان لیبارٹریوں کو بند کر چکے، ان کے دروازوں کو مقفل کر چکے۔ اب ان کے دروازوں پر چالے تھے ہیں اور اندر سب کچھ گرد آلود ہے۔ ان آسب زدہ لیبارٹریوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا۔ تم اگر چاہو تو از خود انہیں کھول سکتے ہو۔ کھول کر ان میں تجربات شروع کر سکتے ہو۔ کامیاب ہونے لگو تو ہمیں اطلاع بھجو

سکتے ہو۔ اطلاع مل گئی تو ہم اپنے بڑوں اور پرکھوں کی لیبارٹریوں کے قریب بھی آجائیں گے۔ قریب آگئے تو کھڑکیوں کے اندر جھانک کر دیکھ بھی سکیں گے۔ دیکھ لیا تو ہمیں اپنی آنکھوں پر اعتبار بھی آجائے گا۔ اندر آنا ہوا تو ہم اندر بھی جائیں گے لیکن ابھی نہیں۔ اس وقت نہیں۔ اس حال میں نہیں۔ مستقبل میں جب بائیسویں صدی کا پھانک کھلے گا اور ہمیں ایک اور چانس ملے گا۔ فی الحال تو ہم آپ کے پیچھے پیچھے رہیں گے اور اسی لکیر کو پیٹتے رہیں گے جسے پیٹ کر آپ اپنا رستہ تبدیل کر چکے ہوں گے اور تین سو ساٹھ ڈگری پر آپ نے ایک نئی ٹرن لے لی ہوگی۔ گو ہمارے پاس ہمارے انبیاء کا علم تھا اور دافر مقدار میں تھا مگر ہم کبھی Giving end پر نہیں رہے۔ Receiving End پر رہے۔ اس لیے یہی ہمارا مقدر بن گیا اور اس کے ساتھ ہم نے سمجھو تہ کر لیا۔

ترقی

موجودہ مقصود کی طرف سلامتی سے بڑھتے رہنے کا نام ترقی ہے۔ (ٹیکنالوجی ترقی کے حصول کے لیے ہر زمانے میں اوزار کا درجہ رکھتی ہے) مقصود کا تعین کرنا اس کا حق ہے جو لوگوں کی بھلائی کو اپنی خوشی پر قربان نہ کر دے۔ لوگوں کا ڈر رکھنا بھی حق ہو سکتا ہے مگر اللہ کا ڈر رکھنا سب سے بڑا حق ہے۔ مقصود کا تعین ہو جائے اور تعین کرنے والا جو کام کسی کو سپرد کر دے تو پھر اسے خدائی ڈیوٹی سمجھ کر ادا کیا جانا چاہیے۔ کسی کو مقصد کے تعین کرنے والے سے تقدیم نہیں کرنا چاہیے۔ Technology جو موجود ہو، پہلے اس کو متحرک کرنا چاہیے۔ پھر یہ روشن ہوتا جائے گا کس جگہ کیا درکار ہے۔ جو جو درکار ہوگا، وہ ایسے آئے گا جیسے پہلے کبھی نہیں آیا۔

انسان کے اندر کی آگ اسی طرح سے بھڑک رہی ہے بلکہ ساری ایجادات، ساری طاقت اور ساری تحقیق نے اس جلتی پر اور تیل ڈال دیا ہے۔ پوری انسانیت تباہی کے گڑھے پر کھڑی ہے اور ہر وقت خوف سے قہر قہر کانپ رہی ہے لیکن خود فحاشی کا یہ جذبہ کسی وجہ کے بغیر نہیں ہے۔ انسان کی باہر کی دریافت اور باہر کی اختراعات اور معلومات نے انسان کو سکون تو نہیں دیا البتہ گھبرا سا دیا ہے اور یہ وہ گھبراہٹ ہی ہے جس نے اس کے اندر خود کشی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ جب انسان کا دل خوشی سے خالی ہو، روح بے لطف ہو اور جاتے وقت ہاتھ بھی خالی ہو تو پھر زندگی میں اس کا حصول اور ان سائنسی دریافتوں سے کیا ملے گا؟

اگر انسان زندگی بھر اپنے اندر سے اور اپنے مرکز سے بے نیاز رہے اور اپنی مشکلات کا حل باہر سے تلاش کرتا رہے اور اپنا سکون باہر کی چیزوں میں ڈھونڈتا رہے تو وہ یقیناً ایک بے مراد شخص ہوگا۔ اگر انسان اپنے اندر کی تقویت کے مقابلے میں باہر کی چیزوں اور باہر کے سہاروں میں امان ڈھونڈتا رہے تو اس کا انجام ایک نکل مرلیض اور ایک ہارے ہوئے جواہر کا سا ہوگا۔

ترقی کی بنیاد محبت پر استوار ہوتی ہے۔ محبت دونوں طرف سے جب ہی ہو سکتی ہے کہ تساوی ہو اور ہماری تساوی

یا تو اس طرح ہو سکتی ہے کہ سب امیر ہو جائیں اور یا اس طرح سے ہو سکتی ہے کہ سب غریب ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ سب کا امیر بننا تو اختیاری نہیں، ہاں غریب بننا اختیاری ہے۔ پس باہم محبت کی صورت یہی ہے کہ سب غریب بن کر رہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ اپنے احوال جمع جتھہ کو پھینک کر محتاج بن جائیں بلکہ غریب بننے سے مراد عادات و معاشرت میں غریب بن جانا ہے۔ اسی کو دوسرے لفظ میں کہا جاسکتا ہے کہ سادہ زندگی میں ہی محبت ہو سکتی ہے اور سادہ زندگی ہی محبت کی اساس ہے۔ جب معاشرے میں محبت باہم ہوگی تو معاشرہ ترقی کی طرف گامزن ہوگا۔ کوئی کوئی نخلستان قائم ہونے سے سارا علاقہ سرسبز نہیں کہلا سکتا۔

دولت

جب تک آپ دولت کی کہ نہ کوئیں سمجھیں گے، یہ بات آپ کے دھیان میں نہیں آئے گی کہ دولت ہے کیا؟ دولت ہمارے عہد کا دھرم اور ہمارے دور کی فقہ ہے۔ دولت سے چیزیں رونما ہوتی ہیں۔ اس سے عمل کی چکی چلتی ہے۔ علم کی شمع روشن ہوتی ہے۔ زندگی کا سارا دار و مدار اس پر ہے۔ آپ کتنا بھی کہیں کہ مادہ پرستی گھٹیا رویہ ہے۔ ڈالر مہاراج اس کا فوراً بطلان کر دے گا۔

علم الاقتصاد دولت کا حاکم اعلیٰ نہیں ہے کہ اسے حکم دے کہ آئندہ سے میری مرضی کے مطابق اور میری منصوبہ بندی کے مطابق چلا کرو۔ دولت ہنس پڑے گی اور کہے گی، اے اقتصادیات کے علم تو ہندسوں کے زور پر اعداد و شمار کا سامنا بجا کر درندوں کو کرتب دکھانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ تم بس ایک علم کی حد تک رہو، میرے منہ لگنے کی کوشش نہ کرو۔

کہنے لگا یہ جو ماہرین اقتصادیات، بروکر، فینکر، اکاؤنٹینٹ، سی اے، ایم بی اے ہوتے ہیں، یہ دولت کے عبادت گاہ کے چکاری ہوتے ہیں۔ ان کا روپ پادریوں کا سا ہوتا ہے۔ یہ دولت کی شان میں بھجن گاتے اور قصیدے پڑھتے ہیں اور اس کی شان سے لوگوں کو موعوب کرتے ہیں لیکن ان کا دولت پر کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ یہ جو دولت ہے نایہ دنیا کی روح ہے۔ دنیا ایک جسم ہے اور دولت اس کے اندر جان ہے۔ اس کی وجہ سے دنیا میں حرکت اور کائنات میں ارتعاش ہے۔ دولت پر تحکم جتانے کی کوشش نہ کرو۔ اس کی پوجا میں مصروف ہو جاؤ، اس کی عبادت کرو، اس کے گن گاؤ۔

جتنے بھی بھگت، اولیاء اللہ، شہید، سور سے اس دنیا کو اعلیٰ اقدار عطا کرنے کے لیے دولت ان کو اور ان کی یادوں کو سہارا دیتی ہے، ان کے لیے برسیاں کرتی ہے۔ دن مناتی ہے، بگر کرتی ہے، یدھ کرتی ہے۔ دولت نہ ہو تو ان بزرگوں کے مزاروں کی تزئین و آرائش نہ ہو سکے۔ ان کے مرقدوں کے گرد گلستان نہ بن سکیں۔ ان تک پہنچنے والے راستے کشادہ نہ ہو سکیں۔ اس کے ذریعے قدیم ہیروں کی سلامی اتاری جاسکتی ہے اور انہیں نئے سرے سے زندہ کیا جاسکتا ہے۔

قائد اعظم سے ملنے اور ان کی تصویر کو ہر روز اور ہر وقت دیکھنے کا واحد سہارا کرنی ٹوٹ ہیں۔ ڈالروں پر بھی امریکی مشاہیر کی تصویریں ان کی یاد دلاتی رہتی ہیں۔ پانچ ڈالر پر بھی اگر ابراہم لنکن کی تصویر نہ ہو تو لوگ اسے بھول بھال جائیں اور اس کی شکل و صورت ان کے ذہن سے محو ہو جائے۔ ڈالر پر لکھا ہوتا ہے کہ ہم ذات خداوندی پر ایمان رکھتے

ہیں۔ یہ پرانے مسیحی مذہب کا تقاضا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی عین اس سیدھ میں ہر ڈالر پر لکھتا ہوتا ہے "NOVUS ORDO SECLORUM" یعنی نئے سیکولر نظام کے تحت۔

میں چاہے ایک معروف وکیل بننے کا خواب دیکھوں یا ایف سکسٹین کا پائلٹ بننے کا یا ایک اعلیٰ درجے کا جدید قسم کا سکول چلانے کا تو ہر حال میں ان خوابوں کو انسانی دنیا سے وقت لینے کے لیے مجھے پیسے کی ضرورت ہوگی۔ اصل میں دولت ہی ٹائم ہے۔ یہی ٹائم کی کہانی کی اصل ہیرو ہے۔ انسانی ذہن گھوم پھر کر، کھود کھود کر اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر تصوراتی خواب بچتا ہے اور پھر ان خوابوں کو انسان کے وقت کی زمین میں بوتلا ہے تو ان خوابوں کو وقت انسانی کی سرزمین میں بونے کے لیے پیسہ ہی اس کا واحد سہارا اور ذریعہ بنتا ہے۔

اب روپیہ غلاقت بھی ہے، یہ اجابت بھی ہے۔ جس طرح انسانی بدن میں غذا کی گردش بتدریج متعلقہ خانوں میں ہوتی رہے، اس وقت تک تو صحت کا سلسلہ قائم ہے لیکن اگر یہ گردش رک جائے، قبض کی صورت اختیار کر لے تو پھر جان کے کلا لے پڑ جاتے ہیں۔

س: قبض کیوں ہوتی ہے؟

ج: جب دولت پر دولت ٹھونکی جائے۔ نکاس کے راستے بند کر دیے جائیں تو جان لیوا قبض ہو جاتی ہے۔ دولت کو جمع کرتے جائیں تو بدبودار روڑی بن جاتی ہے۔ اسی اورڑی کو نکھیر دیں تو اعلیٰ درجے کی کھاد بن جاتی ہے۔ اسی طرح دولت بکھرنی رہے تو اچھا ہے لیکن دولت میں اور شٹ میں ایک ہی قدر مشترک ہے کہ دونوں خوشحالی کے ضامن ہوتے ہیں۔ ایک معاشرے میں اور ایک کھیت میں!

دولت کوئی چیز نہیں ہے، کوئی شے نہیں ہے۔ یہ ایک عمل ہے۔ یوں سمجھو یہ زندگی کی عبارت میں ایک فعل کے طور پر ایک تحریک کے طور پر کام کرتی ہے۔ دولت ایک اسم نہیں ہے، یہ فعل ہے۔

حقیقت اور سچ

ایک حقیقت اور اس کا اختیار

جب ایک حقیقت کو سمجھ کر ذہن میں اتار لیا اور جذب کر لیا تو پھر روزمرہ کے کاموں میں ضرور کوئی ایسا مقام تلاش کریں جہاں اس حقیقت کو روز آرمایا جاسکے۔ جب حقیقت تجربے سے ملتی ہے تو جانکاری کا دھماکہ ہوتا ہے۔ ایک حقیقت پر توجہ فرمائیں: ایک آدمی دوسرے شخص پر جتنا بھی بوجھ ڈالتا ہے اور اس کو دباتا ہے (جان بوجھ کر یا بے خیالی میں) وہ اسی بوجھ سے خود کو بھی اتنا ہی پیڑ رہا ہوتا ہے اسی قدر دبا رہا ہوتا ہے۔ ایک روز مجھے ایک دکاندار پر بڑا ہی غصہ آیا۔ میں کیا پوچھ رہا تھا اور وہ کیا جواب دے رہا تھا۔ جو میں نے مانگا تھا وہ اس کے برعکس کچھ اور ہی نکال رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کے ایک چائنا سرید کروں۔ اچانک مجھے اس ”حقیقت“ کا خیال آ گیا کہ جتنا زور اس پر صرف کروں گا اسی قدر زور مجھے بھی دھکیلے گا مجھے بھی Push back کرے گا۔ میں نے چائنا مارنے کا خیال چھوڑ دیا اور سیٹی بجاتا ہوا دکان سے نکل آیا۔ اب میں ایک آزاد انسان تھا۔

مشکل پڑنے پر آپ اکیلے ہی اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں۔ آپ کے پاس سارا اخلاقی سامان پہلے ہی سے موجود ہے۔ یہ آپ کو کامیابی عطا کر سکتا ہے۔ دنیا آپ کو کتنی شدت سے کیوں نہ دبائے آپ اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ جب آپ کسی وجہ سے نالاں ہوں ناراض ہوں up set ہوں تو ایک لمحہ رک کر آرام سے بیٹھ جائیے اور سوچئے کہ اس صورت حال پر میں اپنی ذاتی عقل کس طرح سے استعمال کر سکتا ہوں اور خود اس کا کیا صل ڈھونڈ سکتا ہوں۔ پھر جو بھی ترکیب آپ کے ذہن میں آئے گی بالکل ٹھیک ہوگی۔۔۔۔۔ میکا کی عمل سے گریز کریں!

اداسی اور اکلانا انسان کے ذہن کے اندر رہتا ہے۔ خاص طور پر ذہن کے اس حصے میں جس کو یہ وہم ہے کہ وہ دنیا سے الگ تھلک ایک اکائی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ عالمی کائنات کا ایک حصہ ہے ایک جزو ہے۔ اس کائنات کے راگ کا ایک سر ہے۔ جب یہ بات آپ کو سمجھ آگئی تو اکلاپے کا ڈکھ دور ہو جائے گا۔

بہت سے لوگ زندگی کی حقیقتوں سے آشنائی حاصل کرنے میں کیوں ناکام رہتے ہیں اس لیے کہ وہ اصل آدمی سے بات کرنے اور اس کی بات سننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ آپ ایک کامیاب انسان سے بات کرتے ہیں یا ایک مصروف ماں سے گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب لیبل ہیں ”کامیاب انسان“۔ ”مصروف ماں“۔ ”خوبصورت محبوبہ“

لیبلوں میں سننے اور سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور وہ حقیقتوں سے آشنائی حاصل نہیں کر سکتے۔

سلوک کا رستہ اختیار کرنے سے کیا ملتا ہے۔ اس کا انعام کیا ہے؟
اس کا انعام یہ ہے کہ آپ کے وجود میں دوئی نہ رہے اور آپ ایک اکائی ہو جائیں۔

باطن کے سفر کا رستہ کس طرح سے مل سکتا ہے؟

اتانکی مقابلے بازی ترک کرنے سے! جب آپ دوسرے لوگوں کی اتان کے ساتھ اپنی اتانیں بھڑائیں گے تو آپ کو باطن کے سفر کا راستہ نظر آنے لگے گا۔

خود شناسی کے عمل میں مصروف رہنے سے زیادہ بڑی اور کوئی دریافت نہیں۔ اس عمل سے آپ کو ہر روز ایک نیا بہرہ مل سکتا ہے۔

خود آزادی ایک فنل نامم مصروفیت ہے۔ اس کو آپ گھر پر بھی کر سکتے ہیں اور دفتر کے اوقات میں۔ جب راستے میں اندھیرا زیادہ ہو تو آپ کو اور زیادہ روشنی کی ضرورت ہے۔ ایک کے بجائے دو تارچ جلا کر دیکھ لیں۔

عام نفسیات کا علم آپ کو یہ سکھاتا ہے کہ مطابقت کس طرح سے کی جائے اور مفاہمت کیسے ڈھونڈی جائے۔ یہ آپ کو خود شناسی کا علم عطا نہیں کرتا۔ یہ مناظر تبدیل کرنے کی رائے دیتا ہے اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے کا گز نہیں سکھاتا۔

اگر آپ اپنی زندگی میں تبدیلی کے خواہاں ہیں تو آپ کو زندگی سے بیزار ہونا ضروری ہے۔ ایک حال مست اور خوابیدہ انسان اپنے میں تبدیلی کا آرزو مند نہیں ہو سکتا۔

جب بیزاری کا پارہ چڑھا ہوا ہو تو آرام سے کرسی پر بیٹھ جائیں۔ کچھ نہ کریں اپنی بیزاری دُور کرنے کے لیے کوئی ترکیب نہ لڑائیں۔ بس اس کا مطالعہ کریں اور پرسکون روح اور پرسکون ذہن کے ساتھ بیزاری کا ویڈیو کیسٹ ملاحظہ کریں۔

ان باتوں سے کبھی خوف نہ کرو کہ:

تم اصل میں کون ہو اور کیا ہو!

ماضی کی یاد میں جتنا نہ ہونا اور مستقبل سے خائف نہ ہونا

اگر آج کوئی قہر نہیں یا کوئی بیجان نہیں کوئی ہلاکت نہیں۔

غلطی کرنے، غلطی کھانے اور غلط ہونے سے!

اگر کسی کی توجہ نہ مل سکے۔

اپنے منہ پر روئے سے بھی خوف نہ کھانا

مگر کراٹھنے سے بھی خوف نہ کرنا

اور اس کا تو بالکل ہی خوف نہ کرنا کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔

خود شناسی، خود فریبی اور خود ستائی دونوں کا علاج ہے۔ اس تھرمائیٹر کو ہر وقت لگا کر دیکھتے رہیں بڑا فائدہ ہوگا۔

لوگوں کو بچانے سے پہلے اپنے آپ کو ضرور بچا کر رکھو اور اپنی حفاظت کرو۔
کسی شے کے گم ہو جانے پر اتنا دوا دینا نہیں کرنا چاہئے جو چیز گم ہو سکتی ہے وہ مل بھی سکتی ہے۔

سچ اور حقیقت

(1) ”ہم کو یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم سچ کے اندر داخل ہو گئے یا ہم صرف سچ کا تذکرہ کر رہے ہیں؟“
”آپ سچ کے اندر اس وقت سانس لینا شروع کرتے ہیں جب سچ کے تذکرے اور سچ کی وادی میں سیر و سیاحت کرنے کے درمیان کوئی فرق محسوس نہیں کرتے۔“

(2) ”ہم برائی کی پیروی کیوں کرتے ہیں جب ہم کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ برائی ایک خطرناک شے ہے؟“

”وجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر کچھ حصے ایسے بھی موجود ہیں جو برے کو اچھا سمجھتے ہیں۔“

(3) ”خود نگری کا عمل اس قدر تکلیف دہ اور بیزار کن کیوں ہے؟“
”عام طور پر تو ہم یہی کہیں گے کہ سچائی کا سامنا کرنا بڑا تکلیف دہ عمل ہے اور اس کی کڑواہٹ برداشت نہیں کی جاسکتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سچ کے خلاف مدافعت اور اس کے ساتھ لڑائی ہم کو اذیت پہنچاتی ہے اور بیزار کرتی ہے۔“
(4) ”ہم اپنی آزادی کی راہ میں کس طرح سے حائل ہیں؟“

”جس قدر تیزی سے اور سرعت سے ایک آدمی اپنی غلط بات کی مدافعت کرے گا اور اس کا پالن کرے گا اسی قدر سستی سے اور کاہلی سے وہ اس پہاڑی پر چڑھ سکے گا جو اس کو آزادی کی نعمت سے ہمکنار کرے گی۔“

اگر آپ اپنے دکھ اور کرب کے اندر جھانک کر دیکھیں اور اس کا گہرا مطالعہ کریں تو آپ کو اس کے اندر کئی غلط قسم کی پیش قدمیاں نظر آئیں گی۔ دکھ ایک شخص کو توجہ کا مرکز بنا دیتا ہے وہ خود بھی اس توجہ کا طالب ہو جاتا ہے۔ وہ شخص اجتماعی شیج کا ایک کامیاب کردار بن جاتا ہے اور ہر وقت ڈرامے میں مصروف رہتا ہے۔ دکھ اور ابتلا بڑی خطرناک چیز ہے۔ یہ انسان میں انانیت کوٹ کوٹ کر بھر دیتی ہے۔۔۔۔۔ جب بصیرت بڑھتی ہے اور نگہداری کا عمل وجود میں آتا ہے تو دکھی اور سوگی اس ڈرامے کو ترک کرنے لگتا ہے۔ بیماری کے مقام پر صحت کا سیلاب پھیلنے لگتا ہے۔

حقیقت اور پرچھائیں

اس نے کہا مجھ پر اچھائی کا اور نیکی کا اور بھلا کا غلبہ طاری تھا اور میں بھلے افعال میں بیماری کی حد تک مبتلا تھا۔ پھر مجھے صحت ہو گئی اور میں صحت مندوں میں سے ہو گیا۔ میں نے پوچھا یہ کیسے ممکن ہوا تو اس نے بتایا کہ میں بڑا اخیر تھا اور سخاوت میں مشہور تھا۔ لوگ میری سخاوت کے پرستار تھے۔ اچانک ایک روز میں نے محسوس کیا کہ اس سخاوت کے عوض تو میں ان سے انعام کی توقع رکھتا ہوں اور ان کی داد کا متلاشی ہوں۔ میں نے سوچا کہ میں تو ایک غلط راستے پر چل

رہا ہوں اور میں اپنی ایک اور ہی تصویر کا پھٹا اٹھائے پھرتا ہوں اور لوگ اس تصویر کی داد دے چلے جاتے ہیں۔ مجھے بڑا افسوس ہوا کہ میرے بجائے میری تصویر کی اور میرے امیج کی پوجا ہو رہی ہے۔ میں نے وہ پھٹا اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور اپنے وجود سے پہلی مرتبہ ملاقات کی۔ پھر مجھے ان دونوں میں فرق معلوم ہوا اور میرا دل خوشی سے اور لذت سے اور آئندہ سے بھر گیا۔

ناممکنات

آدمی کی مشکلات اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب وہ ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش کرتا ہے اور وہ ہم کو حقیقت سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے۔

وہ زندگی کی کامیابیوں پر پھولا نہیں سماتا اور ہر ایک کو ٹھونگے مارتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ کامیابی کے ساتھ ناکامی بھی وابستہ ہے۔ زندگی بڑی عجیب شے ہے یہ لیتی بھی ہے اور دیتی بھی ہے۔ سمندروں کو دریا بھی دیتی ہے اور سمندر دل سے بادل بھی لیتی ہے۔

انسان دوسروں کے ساتھ بھائے باہمی کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنی زندگی کے ساتھ قدم ملا کر چلنے سے قاصر ہے۔ دوسروں کے ساتھ مل کر چلنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ساتھ مل کر چلا جائے۔ آدمی کو یہ وہم ہے کہ وہ اندر کی دنیا اور باہر کی دنیا کو الگ الگ لے کر سفر کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ ناممکن! دنیا تو ایک ہی ہے۔

وہ حقیقت کو توڑ مڑ کر اپنی منفعت کے مطابق کرنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ ناممکن! حقیقت تو بڑی مردوی نہیں جاسکتی نہ ہی ڈھالی جاسکتی ہے۔ البتہ خود کو اس کے مطابق ڈھالا جاسکتا ہے اور یہی زندگی کا راز ہے۔

سچ

سچ ایک آدمی کے لیے بڑا ہی سخت بڑا ہی ظالم اور بہت ہی سنگدل مخالف ہے۔ وہ ہمیشہ ہی نقصان پہنچاتا ہے۔۔۔۔۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ شخص سچ کو اپنی عطا کردہ صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ سچ کو اس کے اصل روپ میں نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کرے اور سچ کو اس کے حال پر رہنے دے وہ جس شکل میں بھی نمودار ہوتا ہے وہی اس کی اصل صورت ہے۔

ایک شخص دوسرے انسان کو صرف ایک ہی شے عطا کر سکتا ہے اور وہ ہے اس کی بالغ نظری کی سطح یا کم نظری کی سطح۔ بس یہی ساری کہانی ہے اور یہی سارا قصہ ہے۔ چنانچہ سری رمز کی دنیا میں سچی وہ ہے جو اپنی بالغ نظری میں اضافہ کر کے اپنی سطح بلند کرے۔

اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ اپنے آپ کو سچا ثابت نہ کیا جائے۔ سچائی کو اپنا آپ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی جس طرح عقاب کو اپنا آپ ثابت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ وہ عقاب ہے۔

پارٹی بازی

جو شخص کسی ایک سائیڈ کو اختیار کرتا ہے وہ سچ سے آشنا نہیں ہو سکتا کیونکہ سچائی انسان کی بنائی ہوئی پارٹیوں سے ماورا ہے۔ جہاں پر سائیڈ A ہوگی وہاں پر سائیڈ B ضرور ہوگی۔ یہ دونوں ٹکرا کر بحران پیدا کریں گی۔

لوگ کہتے ہیں کہ جب تک سائیڈ اختیار نہیں کریں گے اس وقت تک کشمکش کیسے ہوگی جدوجہد کس طرح ہو سکے گی۔ زندگی کا قافلہ کیسے رواں ہوگا؟ یہ ایک ازلی احمقانہ سوال ہے۔ جو عام طور پر ذہنوں میں پیدا ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ”خدا“ ”سچائی“ اور ”حقیقت“ کو کچھ تسلیم کرنے کی احتیاج نہیں ہے۔ ”حقیقت جانتی ہے“..... اور پھر ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ اس دنیا کو سائیڈ میں لینے سے اب تک کیا ملا؟

سائیڈ کو اور پارٹی کو چھوڑنا بڑے دل گروے کا کام ہے۔ کوئی شخص ہی اس طرح سے کر سکا ہے کہ اپنے آپ سے لپٹل اتار کر زندگی بسر کرنا شروع کر دے۔ لپٹل آپ کو تحفظ اور طمانیت کا احساس فراہم کرتے ہیں۔ ان کا اتارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مخالف سائیڈوں سے نبرد آزمائی بڑا خوب کام ہے لیکن اس کا سچ سے کوئی تعلق نہیں سچ ہمیشہ مخالفت سے اوپر ہوتا ہے۔

رہنمائی

حوصلہ کر کے اور کوشش کر کے ان راہوں کو اپنائیں۔

1- سری رمز کے قوانین کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔

2- مانگے کے خیال سے خود کو بچائیں۔

3- دل ٹوٹنے کی حالت میں سبق ضرور سیکھیں۔

4- شادمانی کے فریب نظر تصور پر گہری نظر رکھیں۔

5- دوسرے لوگوں کے اثر سے آزاد رہیں۔

6- خود اذیتی کی وجہ ڈھونڈیں اور اس کا خاتمہ کریں۔

7- بے حقیقت منزلوں کا کھوج لگائیں اور ان کی راہ چھوڑ دیں۔

8- اپنے آپ میں تبدیلی کے لیے خوش باشی کی قوت کام میں لائیں۔

علم اور بصیرت

نری رمز اور تصوف کا علم پورے کا پورا منطقی علم ہے مثلاً اگر آپ وہ شخص نہیں ہیں جو آپ سمجھتے ہیں کہ آپ ہیں پھر وہ مسائل بھی آپ کے نہیں ہیں جو اس شخص کے ہیں۔ آپ وہ آدمی نہیں ہیں جو آپ اپنے آپ کو سمجھ رہے ہیں لامحالہ

وہ پھر وہ مسئلہ بھی آپ کے نہ ہوئے جو آپ اپنائے پھرتے ہیں۔

یاد رکھئے کہ علم ایک ضروری شے ہے اور اس کو ضروری حاصل کرنا ہے لیکن یہ ادراک نہیں ہے۔ ہم لعل و جواہر پر سینکڑوں ہزاروں کتابیں پڑھ کر انہیں اپنے ذہن میں محفوظ کر سکتے ہیں لیکن یہ لعل و جواہر کا ادراک نہیں ہے۔ علم ہم پر اس وقت بصیرت بن کر وارد ہوتا ہے جب ہم حقائق کو اپنے پر عمل کرنے کی اجازت دیتے ہیں اور وہ ہمارے رویے میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔

”ہماری قسمت میں یہی کچھ کیوں لکھا ہے یہ بدل نہیں سکتا؟“

”آپ کو جو ملتا ہے آپ کی طبیعت کے مطابق ملتا ہے۔ جس طرح کے آپ آج ہیں اسی طرح کا کل آپ کو مل جائے گا۔ اگر آپ یہ سب کچھ جو مل رہا ہے پسند نہیں ہے تو اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کر لیں۔ آسان سی بات ہے۔“

واعظوں کے پاس بڑے بڑے جواب ہوتے ہیں لیکن اب میں ان کو اہمیت نہیں دیتا بالکل ٹھیک کرتے ہو۔ جس طرح ہوٹل کے مالک عام طور پر دوسری جگہوں پر کھانا پسند کرتے ہیں اسی طرح اگر واعظوں کو بھی اپنے کہے پر ادرا اپنے سوتے پر عمل کرنا پڑ جائے تو ان کی زندگیاں اجیرن ہو جائیں۔

ایک قیمتی سبق یہ یاد رکھو کہ جب آپ ہر شخص کے اور ہر شے کے رحم و کرم پر ہیں اور آپ لڑائی نہیں کرتے، جھگڑا نہیں کرتے تو آپ فتح یاب ہیں۔

اصل حقیقت

ذات کی حقیقت اور اس کی کہ نہ جاننے کے لیے ایک اور نقطہ نظر سے جانچنے کی ضرورت ہے۔ کبھی آپ نے دیکھا اور محسوس کیا کہ آپ ایک وجود رکھنے کے باوصف اس وجود میں بہت سے آدمی ہیں۔ یعنی ایک صورت حال میں آپ ایک طرح کے شخص ہوتے ہیں اور دوسری صورت حال میں بالکل دوسری طرح کے..... اگر کسی شخص پر اپنی طبیعت اور فضیلت کا رعب جمانا ہو تو آپ کچھ اور ہیں اور جب اپنے افراد خانہ سے معاملہ کرتے ہیں تو بالکل ہی ایک دوسری شخصیت کے حامل ہیں۔

جب آپ اپنے اندر کے کرداروں کو اپنے وجود کی سٹیج پر آتے جاتے اور سوانگ بھرتے دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور ان میں یکسانی پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں تو پھر سٹیج پر ایک سناٹا چھا جاتا ہے اور اصل شخصیت ایک بادشاہ کی طرح آ کر تخت پر متمکن ہو جاتی ہے۔

سچ اور سچائی

ایک روز ایسے ہوا کہ ہمارے درمیان سچائی پر بحث ہونے لگی۔

غیرہ میں ہوا کرتی ہے) بلکہ تعریف تو Effort-less ہوتی ہے۔ جب یہ ہم کو قدرتی طور پر ملے جب ہم کسی کے لیے کچھ کر رہے ہوں اپنے لیے کچھ کیا ہو کوئی کارنامہ کر کے دکھایا ہو۔

ہم سب کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے اور ہمیں موقع یہ موقع ایک دوسرے کی تعریف کرتے رہنا چاہئے۔ محبت اور دوستی کی عمر میں ضرورت ہوتی ہے (رینارڈ بوڑھے جو مسجد جانا شروع کر دیتے ہیں)

If you think that praise is due to him.

Now is the time to slip it to him

For he can not read his tombstone

When he is dead.

ہمارے یہاں ایک مسئلہ محبت اور اتفاق باہمی ہے کہ مسلمان اس نعمت سے محروم ہیں اور ان میں بیکہتی مفقود ہے: چنانچہ مولوی صاحب نے جواب بھجوا دیا کہ:

”محبت دونوں طرف سے جب ہی ہوتی ہے کہ تساوی ہو اور مسلمانوں میں تساوی اسی طرح سے ہو سکتی ہے کہ سب امیر ہو جائیں۔ یا اس طرح ہو سکتی ہے کہ سب غریب ہو جائیں۔ اب ظاہر ہے کہ سب کا امیر بننا تو اختیاری نہیں البتہ غریب بننا اختیاری ہے۔ بس باہم محبت کی صورت یہی ہے کہ سب غریب بن کر رہیں اور آپس میں گہرا اتفاق رکھیں۔ اس غریبی سے یہ مراد نہیں کہ اپنے مال و دولت کو اٹھا کر پھینک دیں اور محتاج ہو کر بیٹھ جائیں۔ بلکہ غریب بننے سے یہ مراد ہے کہ عادات اور معاشرت میں غریب بن جائیں اسی کو دوسرے لفظ میں کہا جاتا ہے کہ سادہ زندگی ہی میں محبت ہو سکتی ہے۔

آج کل کے جو فلسفی اور ہیومن رائٹس کے علمبردار جو ہمدردی ہمدردی پکارتے پھرتے ہیں اور امیری میں اور تکلف میں اعلیٰ درجے کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کو کون سمجھائے کہ دولتمندی اور مارت میں ہمدردی اور محبت جمع نہیں ہو سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ باہم محبت کے لیے ہم خیال ہونا ہی ضروری نہیں ہم حال ہونا بھی لازمی ہے۔

ماوراء

ایک عام خیال جسے آپ نے بار بار سنا ہے اور بار بار دہرایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ مجھے اپنے مقابلے میں دوسروں سے زیادہ محبت کرنا ہے دوسروں کا زیادہ خیال رکھنا ہے۔ لیکن یہ تصور کتنا ہی ارفع کیوں نہ نظر آئے حقیقت میں بہت ہی غلط ہے۔ اپنے آپ کو چھوڑ کر دوسروں سے محبت کرنے میں شخصیت دو نیم ہو جاتی ہے۔ دوصوں میں بٹ جاتی ہے اور روح کے خلاف جنگ شروع ہو جاتی ہے اور جہاں جنگ ہوتی ہے وہاں ہر شے مکروہ اور بد صورت ہو جاتی ہے۔ جنگ کا رستہ کبھی بھی نیکی کی طرف نہیں جاتا..... انسان کو اپنے خلاف جنگ نہیں کرنا ہے۔ اُسے اپنے آپ کو سمجھنا ہے۔ واقفیت میں

سچائی کی پہچان یہ ہے کہ دوسروں کو گزند نہ پہنچائے۔ جو سچائی دوسروں کو تکلیف دیتی ہے وہ سچائی نہیں لادینی ہے۔ کچھ لوگ سچ کو دبا کر اور چھپا کر بیٹھ رہتے ہیں کہ باہر نکلا تو اس کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔

سچ بھی دریا کی مانند ہے جس کے کسی مقام پر دو دھارے ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں دھاروں کے درمیان جو برقی پیدا ہو جاتی ہے اس پر بسنے والے لوگ عمر بھر ایک ہی جھگڑے میں مصروف رہتے ہیں کہ ہماری طرف کا دھارا ہی اصل دریا ہے۔

سچائی کو اپنی چکا چوند راڈھانپ کے کرنی چاہئے ورنہ لوگوں کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی اور انہیں کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ غلط راستہ اختیار کر لیں گے۔

سچ کہنے سے سچ ختم ہو جاتا ہے سچ کرنے سے سچ قائم رہتا ہے۔ کوئی سچ ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی سچ حاصل نہیں ہو سکا۔ کوئی سچ دلیل و برہان پر قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ جو بنانا یا اور ریڈی میڈ سچ آپ کو دیا جاتا ہے وہ آسانی کے لیے ہوتا ہے۔ اُسے ایک طرح کی خواب آور گولی سمجھئے۔

میرے خیال میں کسی بھی فانی انسان سے ایک خوشگوار ماحول اور سازگار حالات میں اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ سچ کو پورے کا پورا پکڑے یا کم از کم اس کے مرکز میں ہی ہاتھ ڈال دے۔ وہ شوخ و شنگ سچ جو ہر ایک کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے پر مصر ہو ایک طوائف کا سامراج رکھتا ہے کہ کبھی زک کر اس پر ٹھکر جھانڈنے لگتے ہیں۔

کچھ لوگ ہر وقت اور ہر گھڑی سچ بولنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور سچ کو ریزگاری کے طور پر استعمال کرتے رہتے ہیں ایسے لوگ لپائے ہوتے ہیں۔ سچ تو ایک بہت ہی بڑا دھن ہے۔ چھپا کے رکھنے والا یہ دولت تو سنیت کے رکھی جاتی ہے اور اشد ضرورت کے وقت استعمال میں لائی جاتی ہے۔

تعریف

تعریف کیا ہے۔ دوستی کا اور محبت کا اظہار ہے اور ہمیں اس اظہار کو اکثر و بیشتر عمل میں لاتے رہنا چاہئے۔ کسی نے کوئی اچھا کام کیا۔ کسی نے کوئی اچھی بات کی۔ بھلے شبد کا اچارن کیا۔ اس کو فوراً تعریف ملنی چاہئے۔

جب آدمی کو قبر کے اندر لٹا دیا اور اس پر مٹی ڈال دی تو اس وقت اس کی تعریف و توصیف سے کیا فائدہ! تعریف کی تو ہم سب کو ابھی اور اسی وقت ضرورت ہے۔ ہماری زندگی میں ہمارے ہوتے ہوئے۔ مرے پر کسی نے منہ چوما تو کیا فائدہ! آدمی چاہے بادشاہ ہو چاہے فقیر! استاد ہو شاگرد! گرو ہو چیل! شادی شدہ ہو یا کنوارا! دھقان یا فلسفی۔ اس کو تو تعریف کی اب اور اس وقت ضرورت ہوتی ہے اور سب کو ہوتی ہے۔

اس تعریف کا کوئی مزان نہیں جو ڈھونڈ کر کوشش کر کے اور گھیر گھار کے حاصل کی جائے (جیسے کتابوں کی رونمائی

اور حقیقت میں اترتا ہے۔ انسان کو اپنے آپ سے محبت کرنا ہے اپنے آپ سے پیار کرنا ہے۔ جو شخص اپنے نفس کی پکار پر ہر تقاضے کی طرف بھاگنے لگتا ہے۔ وہ بھی اپنا دشمن ہے اور جو اس پکار کے خلاف تھوڑا سا ایلتا ہے وہ بھی اپنا دشمن ہے۔ دونوں ہی اپنی ذات کے خلاف نفرت میں اترنے والے ہیں۔ اپنے آپ کو تباہ کرنے والے ہیں لیکن اپنے آپ سے صحیح انداز میں محبت کرنے والا ہی علم حاصل کر سکتا ہے۔

جو لوگ حق کی اور سچ کی باتیں کیا کرتے ہیں ان کی باتیں غور سے سنا کرو۔ وہ سچ کا بیان نہیں کرتے نہ ہی دو سچ سے آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ عام طور پر اس سچ کا تذکرہ کیا کرتے ہیں جس کے بارے میں انہوں نے کئی سنوں اور سے سن رکھا ہے کہ سچ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سچ ایک نظریہ ہے۔ ایک خیال ہے۔ ایک مقولہ ہے یا ایک ضرب المثل قسم کی شے ہے۔ اس لیے سچ کے بارے میں بول بول کر وہ لفظوں کے ہاتھوں ہلکان ہوتے رہتے ہیں..... لیکن میری نظر میں سچ تسلیم سے اور انکار سے ماورا ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں کبھی بھی وثوق سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ”یہ ہے“ اور اس کے بارے میں کبھی بھی وثوق سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ”یہ نہیں ہے“..... دراصل سچائی اندر کی نظر ہے جب یہ حاصل ہو جاتی ہے تو پھر ضائع نہیں ہوتی۔

حقیقت اور واقفیت

جب کوئی حقیقت ذہنی طور پر گرفت میں آجائے تو پھر اس کو روزمرہ زندگی میں عمل کی منڈی میں بھی لائیے۔ جب کوئی حقیقت عمل میں آتی ہے تو اس کو گویا غلیظ لگ جاتا ہے۔ اس سے دانش کی توپ چلتی ہے اور کئی مشاہدے حاصل ہوتے ہیں۔ جاوید کے سامنے ایک حقیقت تھی جو اس کے ذہن نے قبول کر رکھی تھی کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر دباؤ ڈالتا ہے اور جان بوجھ کر یا انجانے میں اس کو گرگڑاتا ہے تو اتنا ہی پریشاں پر بھی پڑتا ہے اور تقریباً اتنا ہی رگڑا اس کو چڑھتا ہے۔

جاوید کو علمی طور پر تو یہ تسلیم تھا لیکن یہ حقیقت اس کے وجود کا حصہ نہیں بنی تھی..... پھر ایک روز اس نے فرنیچر سپلائی کرنے والے بابو کو تاڑا جس نے سپلائی کے معاملے میں بڑی احمقانہ حرکت کی تھی اور اس سے کافی نقصان پہنچا تھا..... سرزنش کرتے وقت جاوید نے محسوس کیا کہ اس واقعہ کا اس پر بھی اتنا ہی بوجھ پڑ رہا ہے جتنا کہ فرنیچر بکھر کر پر۔

اس نے فوراً اپنی غلطی کا احساس کیا اور دباؤ چھوڑ دیا۔ عین اسی وقت وہ آزاد ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر ادھر ادھر دیکھا اور ہلے سے سلام علیکم کہہ کر دکان سے باہر نکل گیا۔

Yes+No

تمام انسانی زبانیں ہاں اور ناں میں منقسم ہیں۔ سیاہ اور سفید میں مٹی ہوئی ہیں لیکن زندگی نہ سیاہ ہے نہ سفید ہے۔

سر مٹی ہے..... دوسرے کے بغیر پہلا نامکمل ہے کیونکہ زندگی دونوں کے تال میل کا نام ہے۔ رات اور دن، گرمی اور سردی، سمندر اور پہاڑ، خدا اور انیس۔

اگر تم کو سچ سے اور حق سے روشناس کرایا جائے تو وہ حق ایک اعتقاد بن جائے گا اور اعتقاد زندگی کی راہ کا پتھر ہے۔ جو ذہن جتنا بند ہوتا ہے اسی قدر منطقی، استدلالی اور بحثی ہوتا ہے۔ وہ اس قدر بند ہوتا ہے کہ اس نے منطق، فلسفے اور دلیل بازی کے سوا اور کچھ دیکھا ہی نہیں ہوتا۔

تم آزادی کی اور خوشی کی اور محبت کی زبان کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ تم صرف خوف کی اور اندوہ کی زبان سمجھ سکتے ہو۔ آزادی تم سے کہی نہیں جاسکتی لیکن خوف تم سمجھ سکتے ہو۔ یہ تم پر طاری کیا جاسکتا ہے۔ موت تم اچھی طرح سے جانتے ہو لیکن زندگی سے ناواقف ہو۔

علم کا معاملہ بڑا ہی پیچیدہ ہے۔ سچ ہر مرتبہ دانش نہیں ہوتا اور سچ ہر وقت احمقانہ نہیں ہوتا۔

سچ اور حقیقت

اگر زندگی سے یہ پوچھا جائے اور ہزار برس تک پوچھا جائے کہ تم زندگی کیوں ہو اور زندہ کیوں ہو تو وہ یہی جواب دے گی کہ میں صرف زندہ رہنے کے لیے زندہ ہوں۔ اس کے علاوہ میرا کوئی اور مقصد نہیں۔

نامرئی، نامعلوم، مخفی، غیر محسوس

آپ کے اندر بھی ایک نامعلوم اور ایک مخفی قانون کام کر رہا ہے۔ یہ مخفی قانون آپ اپنی بزنس اپنی گھر بلو زندگی، اپنی ملازمت اور اپنے معاشرتی تعلقات پر وارد کر سکتے ہیں کیونکہ آپ کی زندگی کے جتنے بھی مظاہر ہیں اور جتنی بھی واردات نہیں وہ ساری کی ساری اس غیر محسوس قانون کے تابع ہیں۔

اگر آپ آرام سے اور چپ کر کے دیوار سے ڈھونڈ کر بیٹھ جائیں کہ جو کچھ ہوتا ہے ہونے دیں، وہ تو پھر یقیناً کئی واقعات رونما ہوں گے اور جو ہونا ہے وہ ہوتا بھی رہے گا لیکن ایسا کر کے آپ اپنے آپ کو ایک مخفی قانون کے تحت ڈھال رہے ہیں لیکن اس کے برعکس جب آپ ”خود“ کو اور اپنے آپ کو اور اپنی ذات کی نیچر کو سمجھنے میں لگ جاتے ہیں اور آپ کے بارے میں احسن التفویم کا جو اعلان کیا گیا ہے، اس کی تفصیلات میں اتر جاتے ہیں۔ پھر آپ اس مخفی قانون کے مثبت انداز کو اور مثبت جوش قدی کو جاننے لگ جاتے ہیں۔

وقت کی اہمیت

دنیا میں سب سے مشکل کام وقت کو define کرنا ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ وقت ایک گز ہے، ایک فنا ہے، ایک بیانہ ہے جس سے زندگی کو ناپا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا زمان کی پابندی سے ماورا ہے۔ وہ ازل سے ہے اور

ابد تک رہے گا اور ابد نام کی زندگی میں نہیں ہوگا اور وہاں کوئی خوشگلی کوئی خرابی نہیں ہوگی اور جہاں کوئی خوشگلی کوئی خرابی نہیں ہوگی، وہاں جانچنے کا کوئی آئندہ کار نہیں ہوگا، چنانچہ وقت نہیں ہوگا۔

میں تم کو جو سب سے عمدہ تحفہ دے سکتا ہوں، وہ میرا وقت ہے بلکہ یہ واحد تحفہ ہے جو میں کسی کو دے سکتا ہوں۔ اگر میں تم کو کچھ رقم تحفے کے طور پر دوں تو میں اصل میں تمہیں اپنا وقت ہی دے رہا ہوں۔ وہ وقت جس میں لگ پٹ کر یہ روپیہ کمایا تھا، کوئی تحفہ دوں تو وقت ہی دیا جس سے میں نے روپیہ کمایا، روپے سے تحفہ خریدا..... لا کر تمہیں دیا۔ اچھا جب میں تمہیں اپنا وقت دیتا ہوں تو گویا تمہیں اپنی زندگی عطا کرتا ہوں۔ دیکھو نا جب کوئی شخص کسی کو قتل کرتا ہے تو وہ اس سے اس کا نام ہی لیتا ہے نا۔ وہ سال وہ مہینے جو اس نے بسر کرنے تھے، وہ چھین لیتا ہے۔ وہ اٹھائیس سال تیس سال..... پچاس سال..... تو جب میں تم کو اپنا وقت دیتا ہوں تو گویا اپنی جان تم پر بچھا کر دیتا ہوں۔

میرا وقت تمہارے ساتھ ایک Investment ہے۔ تمہارا وقت میرے ساتھ ایک Investment ہے۔ آئیے ہم ایک دوسرے کی Investment کا دھیان رکھیں اور اسے عقلمندی سے صرف کریں۔

جب میں تم کو اپنا وقت دیتا ہوں تو ہر لمحہ، ہر ثانیہ اور ہر منٹ تمہارا ہو کر دیتا ہوں کہ وہ لمحہ پھر واپس نہیں آتا۔ نہ ہی لیا جاسکتا ہے اور تم کو دیا گیا لمحہ کسی اور کو نہیں دیا جاسکتا۔ چنانچہ جس نے مجھے اپنا وقت دیا، اس نے نہ صرف اپنی زندگی مجھے دی بلکہ ایسی چیزیں جو کسی اور کو دی ہی نہیں جاسکتی اور جو دوبارہ بھی نہیں دی جاسکتی (تم لڑکیاں قمیضوں کے ٹوٹے، اولٹی بدلتی رہتی ہوتاں) لیکن یہاں ایسا نہیں ہے۔ محدود کو دیا گیا ایک لمحہ محدود آگے صاف کو نہیں دے سکتی!

خدا نے ہم کو لاکھوں کروڑوں نعمتیں عطا فرمائی ہیں لیکن وہ بھی ہم کو وقت کا تحفہ نہیں دے سکتا کہ اس کے یہاں وقت ہے ہی نہیں۔ (وہ ازل ہے، وہ ابد ہے۔ سب چیزیں فنا ہو جائیں گی، صرف تیرے رب کا چہرہ رہ جائے گا) میرا عطا کردہ ایک منٹ تمہارے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے کہ جب ہم اکٹھے مل کر ایک لمحے کا تبادلہ کرتے ہیں تو اس وقت ہم دونوں نے اپنا اپنا لمحہ ساری دنیا سے لیا ہوا ہوتا ہے۔

”ساری دنیا سے کیا مراد ہوتا ہے!“

ساری دنیا سے Sorry مانگ کر لیا ہوتا ہے کہ سوری دینا! اس وقت میں یہ منٹ سلمیٰ کو دے رہا ہوں، تمہاری طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ تم بھی کہتی ہو، سوری دینا اس وقت میں اپنا منٹ سر کو دے رہی ہوں۔ تمہاری طرف توجہ نہیں دے سکتی!..... چنانچہ ہر ایک سے معافی مانگ کر ہم اپنا اپنا لمحہ، منٹ یا ثانیہ ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔

ملفوظات ارشادات

ملفوظات:

- (1) نامعلوم اور ناشائخہ کو جاننے کے لیے آسان ترین عمل یہ ہے کہ اس میں داخل ہو کر اس کا تجربہ اور مشاہدہ کیا جائے نہ کہ اس سے خوفزدہ ہوا جائے۔
- (2) ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے کہ اپنے ذہن کے ایک حصے کے زور پر جسے حافظہ یا یادداشت کہتے ہیں، زندگی بسر کی جائے یا ذہن کے پورے استعمال کے ساتھ۔
- (3) کچھ بالکل مختلف اور بہت ہی مختلف کرنے سے ہم مختلف نتائج کے حامل ہو سکتے ہیں۔
- (4) زندگی کے بنیادی حقوق کو اور عام سچائیوں کو بار بار پرکھنے اور ان کی روزمرہ زیارت کے عمل کو ترک کر دیں اور یہ بہانہ نہ کیا کریں کہ میں ان کے گہرے معانی تلاش کر رہا ہوں اور حقیقتوں کی تہ میں اتر رہا ہوں۔ اب آپ بڑے ہو گئے ہیں، اس لیے اس خود خوشنودی کو ختم کر دیں۔

تجربہ

اس وقت ہم عذاب میں ہیں۔ کیا ساری دنیا عذاب میں ہے لیکن اس کی وجہ کیا ہے؟ کارن کیا ہے؟ مگر اس وجہ کو ڈھونڈنے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ دماغ بالکل ٹھیک ہے اور اپنی جگہ چوکس ہے۔ فقط دل گھائے میں آ گیا ہے اور اپنے مقام سے ہل گیا ہے..... آگئی اور جانکاری کسی علم سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ تجربے سے ملتی ہے۔ وہ آنکھیں جو زندگی کی راہوں کو روشن کرتی ہیں، وہ دماغ کی آنکھیں نہیں ہوتیں بلکہ دل کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ اگر دل اندھا ہے تو زندگی کی راہ تاریک ہی رہے گی اور ساری عمر اندھیرے میں گزر جائے گی۔

حضرت شیخ اکبر کے ارشادات

شیخ اکبر کا ارشاد ہے کہ چونکہ ہم نبی نہیں، اس لیے انبیاء کے مذاق کا ادراک ہم نہیں کر سکتے۔ تہجد کے وقت آنکھ تو کھل جاتی ہے مگر کابلی کے مارے اٹھا نہیں جاتا۔ فرمایا کہ اس وقت جس دم کیا کرو کابلی

جاتی رہے گی۔ کثرت ذکر شدت ضرب کے ساتھ مفید ہوگی مگر اس کا خیال رہے کہ ضرب اسی قدر ہو جس کا تحمل ہو سکے۔ صحابہ کے کمال عقل کی ایک یہ بات ملاحظے کے قابل ہے کہ انہوں نے مختلف مقامات پر جتنی بھی مسجدیں بنائیں، سب کا قبلہ درست ہے۔ حالانکہ اس وقت نہ ان کے پاس قطب نما تھا، نہ جغرافیہ، نہ وہ منہدس تھے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی نقشہ موجود ہوتا تھا۔ بڑے بڑے عقلمدار، ماہر انجینئرز بعد کو پیدا ہوئے جن کا مشغلہ اور انتہائے سعی یہی ہے کہ اسلام میں نقص پیدا کریں اور اس کی کوئی خامی ڈھونڈیں۔

حضرت شیخ اکبر کا ارشاد ہے کہ قبول توبہ کی علامت گناہ کا بھول جانا ہے۔

فرمایا کہ اعمال اور اشتغال اور نوافل تو لوگ کثرت سے اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ یہ ایک وجودی شے ہے۔ دوسرے بھی اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس لیے نفس کو اس میں بڑا مزل ملتا ہے۔ اس میں طلب جاہ کے مواقع بھی ملتے ہیں لیکن ایسے گناہ جس میں گناہوں سے رک جانا ہوتا ہے، وہ نفس پر بڑے گراں گزرتے ہیں۔ مثلاً جھوٹ ترک کرنا یا غیبت سے باز رہنا چونکہ ایسے گناہوں کو ترک کرنے میں شہرت اور ناموری نہیں ہوتی، اس لیے ان کی طرف کوئی التفات نہیں کرتا۔ احادیث میں اس کا اہتمام زیادہ آیا ہے اور اس کو دور رکھتے ہیں۔

پوچھا کوئی ایسا فارمولہ بتائیے جس سے خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو۔ فرمایا دونوں ہاتھ آپس میں رگڑو۔ میں نے ایسا ہی کیا تو پوچھنے لگے، کچھ گرمی پیدا ہوئی۔ میں نے عرض کیا، جی ہاں ہوئی۔ فرمایا بس اسی طرح رگڑتے رگڑتے گرمی محبت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

فرمایا، خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر بغیر شریعت تقرب حاصل کرنا چاہے تو ہرگز حاصل نہیں کر سکتا۔ امت محمدیہ کا ادنیٰ شخص جو ان پڑھ ہے، جاہل ہے وہ ثواب اور جزا عطا میں ایک بڑے کامل عارف کے برابر ہے۔ مثال اس کی یہ ہے کہ پلاؤ دو مضمون کے سامنے موجود ہے۔ ایک تو اس کے اجزاء اور اس کو پکانے کی ترکیب کے واقف ہے اور دوسرے کو کچھ علم نہیں لیکن استعمال کے وقت جوتو جانے والے کو دی ہے، وہی دوسرے کو ہے۔

فرمایا کہ دراصل دنیا نام مال و دولت اور زن فرزند کا نہیں بلکہ دنیا کسی ذی اختیار کے ایسے مذموم فعل یا بد حالت کا نام ہے جو اللہ سے اعتراض کرادے خواہ کچھ ہو، اب اس شعر کا مطلب واضح ہو گیا کہ

حب دنیا از خدا غافل شدن

نے قماش و فقرہ و فرزند و زن

فرمایا کہ ایک عالم بادشاہ شاہجہاں کے ساتھ کسی کامل کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ کامل جس طرح پاؤں پھیلانے تھے، پھیلائے رہے۔ عالم ظاہر میں نے کہا کہ اتنا بڑا سلطان حاضر خدمت ہوا اور آپ نے کچھ بھی اس کی تعظیم نہ کی۔ فرمایا کہ میاں جب تک ہاتھ پھیلائے تھے، پاؤں سینے رہے۔ جب ہاتھ سمیٹ لیے تو پاؤں خود بخود پھیل گئے۔

فرمایا سالک کو کسی چیز کی ہوس نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی ذوق و شوق کا متنی ہے، کوئی رقت قلب کی خواہش کرتا

ہے۔ کسی کو کشف و کرامت کی آرزو ہے۔ کوئی جنت کا طالب بنا ہوا ہے۔ حالانکہ کسی چیز کی بھی ہوس اور طلب نہیں چاہیے۔ عبد کے معنی ہیں مالک کے سامنے سر جھکا دینے کے اور حکم کو بسر و چشم قبول کر لینے کے۔ عبد ہو کر کسی چیز کی ہوس کرنا دراصل فرمائش ہے اور وہ بھی مالک پر۔ پھر یہ کیونکر جائز ہوگا۔

فرمایا، دے کے قبول ہونے کی تین صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو کچھ مانگا جائے اور جس کی طلب کی جائے، وہ من و عن مل جائے۔ دوسرے یہ کہ کوئی بلا آنے والی ہو، وہ مل جائے، خواہ دعا مانگنے والے کو شہ ہی رہے کہ میری دعا قبول نہیں ہوئی اور تیسری صورت یہ ہے کہ چاہی جانے والے شے کا ذخیرہ جمع کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی لڑکا نادان اشرفی پاؤنڈ یا ڈالر مانگے تو اس کے نام کے یا تو تجارت میں لگا دیئے جاتے ہیں یا جمع کروادیئے جاتے ہیں کہ جب ہوشیار ہوگا، لے لے گا۔ حق تعالیٰ بھی اسی طرح کرتے ہیں کہ سوائی کے اچھی نعمت آخرت میں ذخیرہ فرمادیتے ہیں۔

فرمایا کہ انسان کو چاہیے کہ خود کو مستقل نہ سمجھے بلکہ یہ خیال کرے کہ میں دیار غیر میں ہوں اور یہ بھی بات دل میں نہ لائے کہ فلاں حالت میں ہوتا تو بہتر تھا۔ اس کے برعکس رضا و تسلیم اختیار کرنا چاہیے ورنہ پریشانی بڑھتی ہے جیسے تیل بندھا ہوا ہو، وہ اپنے آپ کو جس قدر کھینچے گا اور زور لگائے گا، گلا اور پھسنے گا اور جس قدر کھونٹے کے قریب ہوگا، راحت پائے گا۔ انسان کو بھی یہی خیال کرنا چاہیے۔

فرمایا کسی کام کو سہل سمجھ کر ترک نہ کرے بلکہ ہمیشہ کرتا رہے۔ اس کا نفع بعد کو معلوم ہوگا اور اس کا احساس بھی بعد ہی میں ہوگا۔

فرمایا خلاصہ دستور العمل کا یہ ہے کہ اول اسم ذات کا ذکر لسانی کرے۔ پھر قلبی یعنی شغل، پھر مراقبہ اور یہ سب اس کثرت سے کرے کہ مال ہو جاوے۔ ہمارے حاجی صاحب قبلہ کے یہاں قلب پر زیادہ توجہ مقصود ہے۔

فرمایا حق العباد کا ادا کرنا اور وظائف سے بدرجہا بہتر اور ضروری ہے۔ اس کے ترک سے مواخذہ ہوگا اور ترک وظائف سے کچھ مواخذہ نہیں۔

فرمایا کہ سر میں تیل ڈالنا اس نیت سے کہ یہ سر کا کل پرزہ ہے۔ اس کو تیل دے کر اسی سے کام لیا جائے، موجب اجر ہے۔ امید ہے حق تعالیٰ اس پر اجر عنایت فرمائیں گے۔

فرمایا کہ نئے خیال کے لوگ اسباب پر کچھ اس طرح سے تکیہ کر کے بیٹھ گئے ہیں کہ انہوں نے مسبب کو چھوڑ ہی دیا ہے۔ فرس کے اصولوں اور آثار کو لازم سمجھ کر تصرفات حق تعالیٰ کے منکر ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب آگ کا کام جلانا ہے تو پھر وہ حضرت ابراہیم کے لیے کس طرح سے گلزار ہو سکتی تھی۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے، گاڑی روکنے کے لیے سرخ جھنڈی دکھائی جاتی ہے۔ ایک نادان بار بار اس کو دیکھ کر اگر یہ سمجھنے لگے کہ اس جھنڈی ہی میں ایسا کوئی کمال ہے جس سے گاڑی رک جاتی ہے تو اس سے زیادہ احمق اور کوئی نہیں ہے۔ اس بچے کو کون سمجھائے کہ اصل روکنے والا ڈرائیور ہے، سرخ جھنڈی نہیں۔ یہ جھنڈی تو محض علامت ہے۔ اس میں کوئی اثر ذاتی نہیں، افسوس کہ منکرین نے repetitions سے ہوتا ضروری اعتقاد کر لیا اور تصرف حق کے منکر ہو گئے۔

فرمایا کہ ذکر کرنے والے پر لازم ہے کہ کھانے پینے میں کمی نہ کرے کیونکہ یہ مرطبی ہے کہ اگر کام اپنے نزدیک زیادہ کیا اور شمرہ بزم خود کم ملا تو وجدانہ یہ شکایت پیدا ہوتی ہے کہ منہم حقیقی کی طرف سے احسان کم ہوا اور میری جانب سے کام زیادہ ہوا۔ اگر خوب کھایا یا پیا ہو تو اس طرف کا خوب احسان مند ہوتا ہے اور کمی کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور یہی شان عبادت ہے۔

فرمایا کہ بعض لوگ یہ سوچتے ہیں اور اسی کو کمال سمجھتے ہیں کہ انسان میں کوئی رذیلہ باقی ہی نہ رہے۔ نہ اس کو شہوت ہو نہ غضب۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ کمال یہ ہے کہ شہوت اور غضب کا استعمال بے موقع نہ ہو۔ شہوت اپنی بیوی کے لیے محفوظ ہو اور غضب دین کی حفاظت کے لیے۔ بہت سے لوگ اکثر سوچتے ہیں کہ چونکہ ہمارے اندر ابھی شہوت باقی ہے، اس لیے اپنے شیخ سے اور اس کی تعلیم سے بدگمان ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ذکر سے ہم کو کوئی فائدہ تو ہوا نہیں، اس لیے ذکر چھوڑ دیتے ہیں۔

ایک صاحب کے پوچھنے پر کہ آیا اب مسلمانوں پر تبلیغ اسلام کی ضرورت ہے یا نہیں، فرمایا کہ جہاں اسلام پہنچ چکا ہو، وہاں تبلیغ اسلام واجب نہیں ہے۔ جیسا کہ بلوغ اسلام اکثر جگہ ہو چکا ہے۔ تبلیغ سے متعدد بلوغ اسلام ہے۔ اگر خود بلوغ ہو جائے تو فرضیت تبلیغ کی ساقط ہو جائے گی۔

فرمایا کہ بعض اوقات سالک کی طبیعت میں معیت کا تقاضا پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے نفس کو روکتا ہے اور روکنے سے نفس کو تقاضا اور بڑھتا ہے۔ اس وقت نفس اور شیطان مل کر یہ رائے دیتے ہیں کہ اگر اس وقت تم یہ کام جی بھر کے کر لو گے تو نفس تقاضے سے خالی ہو جائے گا اور پھر یہ معصیت صادر نہیں ہوگی۔ یہ سخت غلطی ہے بلکہ الحاد ہے۔ غلطی تو اس لیے کہ اس ارتکاب سے وہ رذیلہ جیلہ جکڑ لیتا ہے اور الحاد اس لیے کہ معصیت کو ذریعہ طاقت کا سمجھتا ہے۔ اس موقع پر نفس کو ہرگز اجازت ارتکاب نہیں دینی چاہیے اور کامل بہت سے روکا نا چاہیے۔ باوجود روکنے کے بھی اگر تقاضا نفس نہ سمجھتو اس کی کچھ پروا نہ کرے کیونکہ نفس تقاضا نفس پر مواخذہ نہیں ہوتا۔ مواخذہ ارتکاب جرم پر ہے۔ اس کے چند بار روکنے سے ہمیشہ کے لیے یہ عادت دب جاتی ہے۔

فرمایا کہ لوگ آج کل ان علوم کو زیادہ حق سمجھتے ہیں جو بذریعہ کشف اور الہام کے صادر ہوتے ہیں۔ اس لیے وظائف اور اشغال کا سلسلہ زیادہ جاری رکھتے ہیں اور اس کی طرف کم التفات رکھتے ہیں جو بذریعہ وحی وارد ہو چکی ہیں۔ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ کشف اور الہام سے وارد ہونے والی چیزوں میں کبھی تو رحمت ہے اور کبھی ابتلا لیکن جو چیزیں بذریعہ وحی نازل ہو چکی ہیں اور ہمارے حضور پر انور رحمت العالین کے وسیلے سے نازل ہوئی ہیں، وہ ہمیشہ رحمت محض ہیں۔

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات لاتعداد اور بے حساب ہیں۔ مثلاً صحت ایک ایسی چیز ہے کہ ساری سلطنت اس کی برابری نہیں کر سکتی۔ کھانے پینے کی سب چیزیں ایسی عام ہیں کہ ہر شخص استعمال کر رہا ہے۔ اگر کسی کو شدت کی پیاس لگی ہو اور پانی نہ ملتا ہو تو ساری دولت اور جمع جتھہ خرچ کر کے انسان ایک گلاس پانی خریدے گا۔

فرمایا کہ خطرہ شیطانی اور خطرہ نفسانی میں فقر و صوفی نے کا یہ فارمولہ ہے کہ اگر بری چیز کا خیال آیا، پھر اس کو دفع

کیا۔ پھر ایک اور بری چیز کا خیال آ گیا۔ اس کو بھی مارے باندھے دفع کیا تو ایک نئی مصیبت اور نئی معصیت کا خیال آ گیا، یہ خطرہ شیطانی ہے اور اگر بار بار ایک ہی بری چیز کا خیال ستا رہے تو وہ خطرہ نفسانی ہے کیونکہ نفس کو اصرار میں لذت ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر خیر کھس کا غلبہ کے بغیر خیال آیا تو وہ خطرہ ملکی ہے اور اگر خیر میں ایسا غلبہ ہو جائے کہ وہ اسے کرنے پر مجبور ہو جائے تو وہ الہامی ہے یعنی الہام حق ہے۔

فرمایا کہ صوفیا جو عمدہ لباس پہننے سے منع کرتے ہیں تو اس سے عمدہ لباس کو بلا واسطہ کوئی تعلق نہیں کیونکہ لباس پہننے کی کئی غرضیں ہوتی ہیں۔ (1) کبھی تو دفع ضرورت کے لیے لباس پہنا جاتا ہے۔ (2) کبھی اس کے ساتھ آسائش بھی مطلوب ہوتی ہے۔ (3) کبھی ان دونوں کے ساتھ آرائش بھی مطلوب ہوتی ہے۔ (4) کبھی ان تینوں کے ساتھ نمائش بھی منظور ہوتی ہے۔ پھر نمائش کبھی عزت کے حصول کے لیے کی جاتی ہے اور کبھی ذلت کو رفع کرنے کے لیے۔ اسی طرح عزت کبھی تو اپنی ذات اور اپنے نفس کے لیے مطلوب ہوتی ہے اور کبھی دوسرے کا اکرام مقصود ہوتا ہے۔ پس ناپسندیدہ لباس وہ ہے جو اپنی ذات میں عزت اور گھٹن پیدا کرنے کے لیے پہنا جائے اور اس سے دوسروں کو مرعوب کیا جائے۔

فرمایا کہ اکثر لوگوں میں تکبر ہوتا ہے مگر ان کا نفس ان کو یہ نہیں چلنے دیتا۔ چنانچہ اگر کوئی شخص ان کی مرضی کے مطابق نہ کرے اور اس پر ان کو عصر آئے تو وہ اس کی یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ چونکہ اس شخص پر میرا حق ہے اور اس نے حق ادا نہیں کیا اس لیے مجھے عصر آ گیا۔ اب کوئی ان سے یہ پوچھے کہ جن لوگوں کا آپ پر حق ہے اور آپ ان کے حقوق ادا نہیں کرتے تو پھر آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ حق تعالیٰ جن کا ایک ایک سانس میں آپ پر حق ہے، ان کے حقوق ادا کرتے وقت آپ کیا کرتے ہیں؟

فرمایا کہ انسان کو شش کرتا ہے کہ اس کے دل میں سوائے خیال محبوب کے یعنی خیال باری تعالیٰ کے اور کوئی خیال نہ آئے لیکن خیال آتا رہتا ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے۔ روتا ہے، دعائیں مانگتا ہے اور پھر گھبرا جاتا ہے لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ قلب کی حالت شارع عام کی سی ہے کہ اس پر سے بادشاہ بھی گزرتے ہیں اور چوڑے چمار بھی بلکہ بعض اوقات تو ایسے ہوتا ہے کہ کسی کم ذات اور میلے ٹھیلے کے گزرنے کی وجہ سے بادشاہ کی سواری روک لی جاتی ہے۔ اسی طرح قلب کی شاہراہ پر شاہی سواری کے ساتھ ساتھ ایرے غیرے بھی چلتے ہیں۔ ہجوم و ساوس سے گھبرانا نہیں چاہی بلکہ ذکر کو جاری رکھنا چاہیے۔ اس سے خیالات از خود دفع ہو جاتے ہیں۔

فرمایا کہ طلب انسان کے اختیار میں ہے اور وصول انسان طاقت سے باہر کی چیز ہے۔ اس لیے ثمرات پر ہر وقت نظر رکھنا تشویش کا باعث رہتا ہے۔ اس سے احتراز لازمی ہے۔

فرمایا کہ اگر کسی کے پاس چاکر ٹھو تو اس کی تحریرات کو نہ دیکھو بلکہ اس کے پاس اگر کوئی مطبوعہ کتاب بھی رکھی ہو اس کو بھی نہ دیکھو کیونکہ بعض اوقات انسان اس کی کوشش کرتا ہے کہ اس کتاب کا میرے پاس ہونا دوسروں کو معلوم نہ ہو۔ چنانچہ اس کی اس آرزو کا اہتمام ہونا چاہیے۔

فرمایا کہ اگر کوئی شخص کام میں مشغول ہو اور تم کو اس کا انتظار کرنا مقصود ہو تو اس کے سامنے بیٹھ کر انتظار نہ کرو بلکہ

دور بیٹھ کر اس کو بتائے بغیر انتظار کرو، جب وہ فارغ ہو جائے تو اس کے پاس جا کر جو کچھ بھی کہنا ہو کہو۔

فرمایا کہ امام غزالی نے لکھا ہے کہ مبتدی سلوک کو وعظ و غیرہ نہیں کہنا چاہیے کیونکہ تہذیب نفس ابتداء میں کامل نہیں ہوتی۔ اس سے نفس کے خراب ہونے کا احتمال ہوتا ہے اور اس سے حب و شہرت اور عجب پیدا ہونے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔

فرمایا کہ بعض مرتبہ منتہی اپنے لیے گوشہ عافیت تجویز کرتا ہے تاکہ ہر قسم کی آفات سے محفوظ رہے لیکن اس کو اس عافیت میں یا تو کوئی آفاقی آفت پیش آ جاتی ہے یا وہ کسی ایسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنا گوشہ عافیت ترک کرنا پڑتا ہے۔ پھر وہ اپنے لیے کچھ تجویز نہیں کرتا اور عوام سے جو کلمتیں پیش آتی ہیں ان کو برداشت کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کو اچھی طرح سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر برداشت نہ کروں گا اور عوام سے الگ ہو کر عافیت کو اختیار کروں گا تو اس سے زیادہ آفات میں مبتلا ہو سکتا ہوں۔

فرمایا کہ طلب مطلوب ہے نہ کہ وصول کیونکہ مطلوب وہ چیز ہو سکتی ہے جو اس کے اختیار میں ہے اور طلب اختیار عبد میں ہے اور وصول اس کے اختیار سے خارج ہے۔ مطلب یہ کہ ثمرات پر ہر وقت نظر رکھنا وقت کا زیاں ہے اور اس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

فرمایا کہ روشن خیال لوگ مولویوں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ دنیاوی ضرورتوں سے بالکل بے خبر ہیں۔ اول تو یہ درست نہیں۔ اگر مان بھی لیا جائے تو اس بے خبری کی زندگی اور وقفہ بہت قلیل ہے لیکن اعتراض کرنے والے جن ضرورتوں سے لاعلم ہیں، یعنی دین کی ضرورتیں، ان کی لاعلمی سے جو تکالیف ہوں گی، وہ بہت شدید اور طویل ہیں۔ پس روشن خیال لوگوں کو پہلے اپنی خبر لینی چاہیے۔

فرمایا کہ انسان کے اعمال سالہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کا ثمرہ اس دنیا میں مرتب ہوتا ہے اور اس سے لطف بھی خوب ملتا ہے جیسا کہ جہاد میں ہوتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جن کا ثمرہ غائب ہوتا ہے اور خود اس کی ہیئت بھی کچھ لطف افزا نہیں ہوتی۔ پہلی قسم کے اعمال نفس پر بہت آسان ہوتے ہیں لیکن دوسری قسم کے اعمال بہت کٹھن ہیں۔ ان میں نفس پر بہت بوجھ ہوتا ہے۔ ان کے آسان کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ ذکر سے کسی فوری شریک توقع نہ رکھے اور نہ ہی اس کا قصد کرے بلکہ ذکر اس خیال سے کرے کہ وعدہ فرمایا گیا ہے کہ تم میرا ذکر کرو، میں تمہارا کروں گا، اس کا ذکر کرنا سب سے عظیم طلب ہے۔ چنانچہ اگر دوسری لذت حاصل نہ بھی ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

فرمایا کہ کافروں کو بعض اوقات جو نعمتیں عطا فرمائی جاتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار نے جو نیکیاں، عدل اور رحم اور سخاوت کی ہوتی ہے، یہ ان کی جزا ہوتی ہے۔ مومن کو بعض گناہوں کی وجہ سے تکلیف دی جاتی ہے، کافر اللہ کے باغی ہیں۔ ایسے نیک کاموں کا صدور غیبت سمجھا جاتا ہے لیکن مومنوں پر کہ اطاعت کا اعلان کر چکے کے بعد اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے، سختی کا سلوک کیا جاتا ہے اور ان پر سختی کی جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کافروں کو صورت نعمت عطا فرمائی گئی ہے اور مومنوں کو حقیقت نعمت۔ اگر کسی کے پاس کروڑوں نعمتیں ہوں اور اس کو جیل کا حکم سنا دیا جائے تو سب بچ جیں بمقابلہ اس

مزدور کے کہ رزق میں تو کمی ہے مگر چونکہ جیل خانے کا حکم نہیں ہوا، اس لیے وہ کسی قدر راحت اور چین میں ہے۔ فرمایا کہ مظہر جان جاناں کا جو یہ قول مشہور ہے کہ ”عقیدہ تاج مستزیم کفر نیست“ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ قرآن کی دلالت اس پر مثل دوسرے عقائد کے مشہور نہیں لیکن جس شخص کو اس کا قرآن میں داخل ہونا نہ پہنچا ہو اور محض عقل کی راہبری اس کی سمجھ میں نہ آئے تو محض اس عقیدے کی بنا پر اس کو کافر نہیں کہیں گے۔

کسی کے درخواست کرنے پر کہ حضور کچھ ایسا کر دیجئے کہ قلب میں گناہ کا خیال ہی نہ آئے۔ فرمایا کہ دیوار ہونا کس کام کا۔ یہ بچاری دیوار کھڑی ہے۔ برسوں ہو گئے، چوری یہ نہیں کرتی، زنا اس نے نہیں کیا، حق اس نے کسی کا مارا نہیں لیکن ثواب کوئی نہیں مل سکا۔ ویسے کی ویسی ہی کھڑی ہے۔ انسان کا کمال تو یہی ہے کہ قلب میں گناہ کا تقاضا پیدا ہو اور گناہ نہ کرے۔ ان صاحب نے عرض کیا کہ بعض اوقات تو رک نہیں جاتا اور گناہ ہو ہی جاتا ہے۔ فرمایا خیر اگر گناہ ہو ہی جائے تو توبہ کر لے!

فرمایا کہ عیش رو پے پیسے کا نام نہیں ہے گود دولت عیش کا ذریعہ ضرور بن جاتی ہے۔ اگر کوئی امیر کبیر شخص ہو، کوٹھی، کاریں، بنگلہ دولت کی فراوانی اور کوئی فوجداری مقدمہ اس پر پڑ جائے (بھٹو مرحوم کا واقعہ) تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ کسی پل آرام نہیں ملتا، پتہ یہ چلا کہ عیش دولت کا نام نہیں بلکہ وہ قلب سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کا قلب مطمئن نہیں، وہ عیش بے محروم ہے۔ ایک شخص کو دو ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ اس سے زیادہ کا حقدار ہے تو وہ ہر وقت بے چین اور بے مراد رہتا ہے بمقابلہ اس شخص کے جس کو آٹھ سو روپے ملتے ہیں اور وہ خود کو اس کا حقدار بھی نہیں سمجھتا اور اس پر خوش رہتا ہے۔ اس اعلیٰ عیش یعنی غنائے قلبی آٹھ سو روپے کو حاصل ہے اور دو ہزار روپے کو نہیں۔

بدعت کے بارے میں فرمایا کہ اگر ظہر میں کوئی چار رکعت کے بجائے پانچ پڑھے تو یہ بدعت ہوگی۔ حالانکہ وہ شخص کہہ سکتا ہے کہ میں نے کوئی برا کام تو نہیں کیا، نماز ہی پڑھی ہے اور وہ رکعتوں میں اضافے کے ساتھ۔ بات یہ ہے کہ اس نے خلاف ضابطہ کام کیا ہے۔ جیسے کوئی لٹافہ پر اسی پیسے کے ٹکٹ کے بجائے کورٹ فیس کا چار روپے کا ٹکٹ لگا دے تو خط ہیرنگ ہو جائے گا۔ بات یہ ہے کہ چونکہ اس نے ٹکٹ کا استعمال بے محل اور خلاف ضابطہ کیا، اس لیے چار روپے کا ٹکٹ ضائع ہو گیا۔ اسی ٹکٹ کو موقع محل کے مطابق عدالت میں لگاتا تو کام کا ہوتا۔

فرمایا کہ بعض لوگوں میں قابلیت باطنی تو ہوتی ہے مگر تربیت کرنے والے نہ ملنے کی وجہ سے وہ فاسد ہو جاتی ہے جس طرح انڈے کو اگر مرغی سینے والی نہ ملے تو وہ گندہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض مرید خیر سے بڑھ جاتے ہیں جیسے مرغی کے نیچے اگر لٹخ کا انڈا رکھا جائے تو وہ لٹخ کا بچہ نکالے گی، جو مرغی سے قوی تر ہوگا۔

فرمایا کہ بعض کفار کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف اعلیٰ سے قلب میں کچھ گنجائش ہوتی ہے تو اس کی تعریف کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ مودت نہیں چاہیے۔

فرمایا کہ آج کل لوگوں نے علماء کی جماعت کو کم ہمت اور نا اہل کہنا شروع کر دیا ہے اور ان کے عجیب عجیب نام دھرتے ہیں۔ حالانکہ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ عربی پڑھنے سے دماغ میں ایک خاص جلاء ہو جاتی ہے۔ جو شخص عربی بھی

پڑھا ہوا اور وہ صرف انگریزی پڑھے ہوئے سے تقریر میں اور تحریر میں مقابلتا ضرور زیادہ ہوگا۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ کم ہمت لوگ ہیں اور بہت روپے نہیں کما تے، قبیل پر گزراں کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ جان لیجئے کہ اگر کوئی شخص آپ کے یہاں ملازم ہو اور صرف پانچ روپے ماہوار پاتا ہو اور کوئی دوسرا شخص اس کو بیس روپے دے لیکن وہ کہے کہ مجھے تو یہ پانچ ہی اچھے ہیں۔ میں اپنے آپ کا کوئی نہیں چھوڑوں گا تو کیا آپ اس کو کم ہمت اور بے کار کا خطاب دیں گے..... جن مولویوں نے دین چھوڑ کر دنیا کمانی شروع کی، وہ بڑے بڑے دنیا داروں سے بھی آگے نکل گئے۔

کسی نے عرض کیا کہ جی چاہتا ہے جلد ہی مقصود حاصل ہو جائے تو فرمایا کہ اگر کوئی یوں چاہے کہ آج ہی میرا بچہ دس برس کا ہو جائے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ دس برس کا تو دس برس کے بعد ہی ہوگا..... لیکن فرمایا کہ مرید کو فائدہ تو شرع ہی سے ہونے لگتا ہے گو محسوس نہ ہو، جس طرح بچہ روز کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے مگر اندازہ نہیں ہوتا۔

عرض کیا کہ کثرت تصور سے اللہ تعالیٰ کی حضور اور اللہ تعالیٰ کا قرب کفار کو اور جوگی کو بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا، ہاں یہ درست ہے لیکن اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک شخص تو بادشاہ کا مقرب ہے اور دوا بنے ہاتھ بیٹھا ہے اور ایک مجرم ہے جو بادشاہ کے سامنے حاضر ہے۔ اب حضور تو دونوں ہی کی ہے اور قرب دونوں کو حاصل ہے لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے..... پھر عرض کیا کہ جوگی وغیرہ کو بھی ایسی حضور اور قرب میں ویسا ہی لطف آتا ہوگا جیسا کہ صوفی کو..... فرمایا ایک شخص کے پاس پیتل کا ڈالا ہے اور وہ اس کو سونا سمجھ رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے۔ دوسرے کے پاس واقعی سونے کا ڈالا ہے اور وہ بھی خوش ہو رہا ہے۔ دونوں کی خوشی برابر ہے لیکن حقیقت اس وقت کھلے گی جب پیتل والے کی خوشی خاک میں مل جائے گی۔

فرمایا کہ عقیدت کے لیے محبت طبعی لازم نہیں البتہ محبت عقلی لازم ہے۔ محبت طبعی میں دل کھپتا ہے مگر محبت عقلی میں ضروری نہیں۔ اپنے بچے کو گود میں لیتے ہیں، چومتے ہیں، خوش ہوتے ہیں مگر عالم کے ساتھ یا پیر کے ساتھ یوں نہیں کرتے..... لیکن محبت عقلی میں اگر غور سے دیکھا جائے تو محبت طبعی بھی ہوتی ہے۔ ظاہر میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم سے طبعی محبت نہیں جیسے اپنے لڑکے سے لیکن اگر نعوذ باللہ وہی لڑکا حضور کی شان میں کوئی گستاخی کرے تو طبعت میں اتنا جوش ہوگا کہ وہی باپ اپنے بچے کا سرتن سے جدا کر سکتا ہے۔ یہاں اس کی محبت طبعی رکھی رہ گئی اور حقیقت یہ ہے کہ محبت طبعی مقبول نہیں۔ ابوطالب کو محبت طبعی تھی اور حضرت اویس قرنی کو محبت طبعی و محبت عقل دونوں حاصل تھیں۔

کسی نے اثنائے گفتگو میں عرض کیا کہ یہ آریہ بڑے دشمن ہیں۔ فرمایا کہ دوست کا ذکر کیجئے، دشمن کا نہ کیجئے۔ جس طرح صالحین کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی ہے، اسی طرح بدوں کے ذکر سے قلب میں ظلمت پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی خاص فائدہ مقصود نہ ہو تو بے ضرورت ذکر نہیں کرنا چاہیے۔

فرمایا کہ بزرگوں کے ساتھ لگے لپٹے رہنا چاہیے گو خود کچھ بھی نہ ہو کیونکہ یہ تو ممکن نہیں کہ انجن تو کراچی پہنچ جائے اور بوگیوں ادھر ہی کھڑی رہ جائیں۔

فرمایا کہ ممکن نہیں کہ بزرگ کے پاس بیٹھے اور اثر نہ ہو۔ ممکن نہیں کہ تنور کے پاس بیٹھے اور آٹھ محسوس نہ ہو۔

فرمایا تھوڑی دیر صرف پندرہ منٹ کی تنہائی میں بیٹھ کر اللہ اللہ کر لیا کیجئے۔ دیکھئے تو سہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ کھانا کا نام لینے میں نہ پانی بھرا آئے اور اللہ کا نام لینے سے قلب پر اثر نہ ہو، یہ ممکن ہی نہیں۔

فرمایا علم زیادہ مقصود نہیں البتہ اثر علم مقصود ہے اور یہ بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے۔ صحابہ کرام سب پڑھے لکھے نہ تھے لیکن ان کو حضور کی محبت نے اعلیٰ درجہ کمال پر پہنچا دیا تھا۔

فرمایا کہ لوگوں نے کثرت نوافل کو تصوف سمجھ رکھا ہے حالانکہ اصل چیز تصوف میں اخلاق ہے۔

فرمایا ایک مرتبہ مولانا یعقوب کے استاد ریلوے پلیٹ فارم پر کسی بچ پر جانیٹھے اور بیٹھے ہی لطائف ستر جاری ہو گئی۔ حیرت ہوئی کہ یا اللہ یہ کیا معاملہ ہے۔ معلوم ہوا کہ فلاں بزرگ ریل کے انتظار میں اسی جگہ بیٹھے تھے۔ یہ اس کا اثر تھا۔ بزرگوں کی برکت سے جگہ بھی با اثر ہو جاتی ہے۔

تحقیقات جدیدہ کے ذکر پر فرمایا کہ یہ کچھ کام نہ آئے گا۔ کچھری میں کوئی منصف اپنے منصبی کام کو چھوڑ کر اگر اس تحقیقات میں لگا رہے کہ یہ عمارت کب بنی، اس کا اندازہ تعمیر کو نہ آئے گا۔ اس پر کتنا خرچ اٹھا ہوگا۔ اس کی گارنٹی کب تک کی دی جا سکتی ہے۔ تو جب حکومت اس کے کام کی جانچ کر کے اس کے خلاف رپورٹ لکھے گی تو اس کا یہ رڈیہ دنیا اس کی برات کا باعث نہ ہوگا کہ جناب میں تو اس بلڈنگ کی تحقیقات میں لگا رہا۔ اس کو اس قصے سے کیا بحث! اس کو تو اپنے کام میں لگانا چاہیے تھا۔

فرمایا کہ ہم لوگوں کی اوروں کے چھوٹے چھوٹے عیوب پر نظر ہے اور اپنے بڑے بڑے عیوب دکھائی نہیں دیتے۔ اپنے بدن پر سانپ چھو لنگ رہے ہیں، ان کی پروا نہیں اور ہم دوسروں کی کھیاں اڑانے کی فکر میں ہیں۔

فرمایا کہ زمانے کے عجیب پلانا کھایا ہے۔ پچھلے لوگ عبادت چھپ کر اس لیے کرتے تھے کہ کہیں شہرت نہ ہو جائے اور اب اس لیے چھپا کر کرتے ہیں کہ کہیں لوگ مذاق نہ اڑائیں۔

فرمایا کہ مجھ کو نسبت عقیدت کے تحت زیادہ پسند ہے کیونکہ عقیدت خیالی چیز ہے اور راہ میں زائل ہو جاتی ہے اور محبت زائل نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک بزرگ کسی نصرانی کی لڑکی پر عاشق ہو کر نصرانی ہو گئے۔ ان کے عقیدت مندوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دوسرے مرید جو ان سے محبت کرتے تھے، یہ خبر پا کر بہت سے لوگوں کو لے کر ان کے پاس پہنچے اور رات بھر اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے دعا کی اور شیخ کی حالت درست ہو گئی۔ دیکھئے باوجود نصرانی ہونے کے اپنے شیخ کا ساتھ نہ چھوڑا اور ان کو نفع پہنچایا۔

فرمایا وغیرہ سے ملنا سنت ہے کیونکہ صلہ رحمی ہے۔ اگر وہ بد اعمال ہوں تو بھی اپنی جانب سے بغرض صلہ رحمی ملنے میں کوئی حرج نہیں۔ قطع تعلق اور اپنے آپ کو کھنچا ہوا رکھنا اچھا نہیں خواہ وہ امراء ہی کیوں نہ ہوں، ترک تعلق مناسب نہیں۔ اگر وہ غیرہ مسخر دین کا کریں تو چاہیے کہ ان کو سمجھائے اور تلا دے کہ آپ صاحبوں کے پاس یہ سلسلہ رشتہ داری آتا ہوں۔ آپ ایسا نہ کریں ورنہ میں نہیں آئے گا..... باقی اجنبی امراء سے ترک تعلق اچھا ہے۔ ہاں اگر وہ خود بلائیں تو چلا جائے یا وہ خود اپنے یہاں آئے تو ان کا اکرام کرے۔

فرمایا کہ لیاتہ القدر کی تمام رات میں فضیلت ہے اور اکثر حصہ شب میں عبادت کرنے سے کل رات کا ثواب ملتا ہے۔

فرمایا بہت سے فقرا صوفیوں کی صورت بنائے پھرتے ہیں میلے کپیلے اور نشہ کے شوقین ہیں اور گالیاں بکتے ہیں۔ لوگ ان کو پہنچا ہوا خیال کرتے ہیں حالانکہ اگر یہ وضع قطع اللہ کو پسند ہوتی تو انبیاء کو ایسی ہی وضع میں بھیجتے اور ان کے لیے ایسے ہی حالات رکھتے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ جس وضع قطع میں انبیاء آئے ہیں وہی مطلوب ہے۔

فرمایا کہ انسان حقیقت میں روح ہے نہ جسم۔ جسم روح کو اٹھائے ہوئے ہے جیسے پاکی گاڑی میں کوئی سوار ہو۔ اسی طرح جسم حامل روح ہے۔ جس چیز کو انسان انا کہتا ہے، وہ نہ روح ہے نہ جسم۔

فرمایا کہ بعض اصول ”فطرت پرستان“ پر ہیں:

حب جاہ و مال، دین کو ضائع کر کے (2) متمدن قوتوں کی باتوں کو تعلیم کرنا بہ مقابلہ شریعت کے۔ (3) سائنس پر ایمان اور اس کی وقعت اور احکام الہی کی بے وقعتی۔

احکام میں توجہات اور دلائل پیش کرنے کے بارے میں فرمایا، کہ دین کو لوگوں نے تختہ مشق بنالیا ہے اور علماء سے طرح طرح کے سوال کرتے ہیں کہ سود لینا کیوں حرام ہے۔ فلاں بات کس لیے منع ہے۔ اس سلسلے میں فرمایا کہ اگر کسی مکان میں ماہرین علوم جدیدہ بیٹھے ہوں اور انجینئر صاحب آکر کہیں کہ فوراً اٹھو یہ مکان گرنے والا ہے تو سبھاگ انھیں گے اور ایک بھی دلیل یا توجیہ نہیں مانگے گا۔ اگر ڈاکٹر یا سول سرجن کوئی دوا تجویز کرے یا آپریشن کا جانے تو بلا چون و چرا مان لیں گے کہ یہ اس علم کا ماہر ہے لیکن دین کے عالموں کی بات میں پس و پیش سے کام لیتے ہیں۔ اس پر ایک طالب علم نے عرض کیا کہ جناب لوگ کہتے ہیں کہ علماء کی بات میں اختلاف ہے، اب کس کی مانیں۔ فرمایا کہ خلاف کہاں نہیں اور کس میں نہیں۔ وکلاء حضرات ایک ہی واقعہ میں ایک دوسرے کے خلاف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹروں میں اختلاف ہوتا ہے۔ مگر وہاں کوئی نہیں کہتا کہ ان میں اختلاف ہے، ہم کس کا علاج کریں۔ سو وجہ اس کی یہ ہے کہ جو امر کسی کو کرنا ہوتا ہے اور اس کی ضرورت سمجھی جاتی ہے اس میں خلاف کی پروا نہیں کرتے۔ صحت جسمانی کی چونکہ قدر ہے۔ اس میں کسی کے خلاف کی پروا نہیں۔ دین کی پروا نہیں اور قدر نہیں، اس لیے حیلے تلاش کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جان جیسی عزیز ہے، اگر ایمان بھی ایسا ہی عزیز ہو تو علاج کی فکر کی جائے اور اس میں کسی قسم کی بہانہ سازی نہ ہو۔ اب مثال کے طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ ایک تو کوئی دوست برابر کا اور یار قدیم کوئی حکم کرے تو اس کی وجہ پوچھتے ہیں اور اگر حاکم کوئی حکم کرے تو ہرگز وجہ دریافت نہیں کرتے، من و عن تسلیم کر لیتے ہیں۔ چنانچہ جب خدا تعالیٰ کے احکام کی وجہ دریافت کی جاتی ہے تو شبہ یہ پڑتا ہے کہ ان کے دل میں حق تعالیٰ کی عظمت نہیں ہے اور وہ (نحوذ باللہ) خدا کو برابر کا جانتے ہیں۔ ہاں طالب علمی کی حیثیت سے بہ غرض تحقیق و فن دریافت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر وہ منصب صرف طالب علموں کا ہے۔ شاگرد اساتذہ سے بڑی بڑی جتیں کرتے ہیں سو اس کے لیے تعلیم فن کی ضرورت ہے۔ اگر انکم ٹیکس کا معمولی سائوٹس لانے والا چڑا اسی آکر سن دے تو اس کے ساتھ بحث نہیں کرتے مگر علماء کے ساتھ پیغام حق کی منادی کرتے ہیں۔ بحث کرنے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ پھر آپ لوگوں کو سمجھانا بھی تو ایسے ہی ہوا جیسے ایک سائیکس کو اقلیدس کی شکل سمجھانے لگیں تو وہ کیا سمجھے گا۔ اس کی تدبیر یہی ہے کہ پہلے اس کو اقلیدس سمجھائے، اس کے مبادیات بتلائے جائیں، پھر بات کرے۔

فرمایا کہ سہارنپور کے ایک صاحب جو مولانا ظلیل احمد صاحب سے بہشتی زیور کے ایک مسئلہ پر جھگڑا کر چکے تھے، مجھ سے سہارنپور میں ملے اور بولے کہ اس مسئلہ کی وجہ بتائیے۔ میں نے کہا کہ کیا آپ اور سارے مسائل کی وجہ سمجھتے ہوئے ہیں؟ اور اگر سمجھتے ہوئے ہیں تو مجھ سے فرمائیں تاکہ میں آپ سے پوچھوں کہ یہ وجہ کیوں ہے؟ یہ حضرت تو اٹھ کر چلے گئے اور ایک دوسرے جٹلمین ان کی طرف نداری کے لیے آئے اور بولے کہ بعض لوگ مسائل میں علماء کو برا کہتے ہیں اور ہم کو دکھ ہوتا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر ایک جلسہ کریں اور اس میں ان مسائل کو اچھی طرح سے سمجھائیں۔ میں نے عرض کیا کہ جناب ہمارے برا کہنے کو تو آپ جانے دیں اور ان لوگوں کو معاف کر دیں کیونکہ بہت سے لوگ صحابہ گو برا کہتے ہیں۔ ان کا بندوبست آپ نے ضرور کچھ کیا ہوگا اور بہت سے لوگ رسول کو اور بہت سے اللہ میاں کو برا کہتے ہیں۔ ان کا کیا تدارک کیا آپ نے؟ پہلے ان کا بندوبست کریں، بعد میں ہم آتے ہیں جو ان کی جوتیوں میں بیٹھنے کے قابل بھی نہیں۔ فرمانے لگے کہ وہ تو خیر ٹھیک ہے لیکن اگر آپ ایسا کر دیں جیسا کہ میں نے کہا ہے تو حرج ہی کیا ہے؟

میں نے کہا کہ اگر آپ بطور حکم کے فرماتے ہیں تو آپ کو حکم دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے اور اگر بطور مشورے کے فرماتے ہیں تو بس آپ مشورہ دے کر سبکدوش ہوئے، ہم آپ کا شکر یہ ادا کرتے ہیں اور آپ کے کمون احسان ہیں۔ ماننا نہ ماننا ہمارا فعل ہے۔ آپ بے فکر رہیے اور اپنا کام کرتے جائیے۔ وہ اٹھ کر چپ چاپ چلے گئے۔ اصل میں ہم علماء بوجہ اخلاق کے ان کا جواب ترکی بہ ترکی نہیں دیتے ورنہ ایسی جانوں کو تو ہم خوب سمجھتے ہیں کہ محض الجھنے کے لیے ایسی تاویلیں نکالتے ہیں۔

فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر سید احمد خاں نہ ہوتے تو مسلمانوں کا اب تک نام بھی نہ ملتا۔ میں کہتا ہوں کہ ہم نا انصاف نہیں ہیں، واقعی ان کی وجہ سے دینی ترقی اعلیٰ درجہ کی ہوئی، اس کا انکار ممکن نہیں مگر دین کو ضائع کر کے ایسا کیا اور دوسری بات یہ ہے کہ جو شخص ان میں رہتا ہے، اس میں یہودی کا مضمون پیدا ہوتا ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ قوم ہے کون سی؟ سو وہ ان کے نزدیک امراء ہیں اور وہ بھی انہیں کے جرگے کے امراء اور غرباء کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں جو کہ تعداد میں زیادہ ہونے کے باعث اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کو قوم کہنا چاہیے۔

سوال کیا گیا کہ اللہ میاں نے سلطنت مسلمانوں سے چھین کر کفار کو کس لیے دے دی حالانکہ مسلمان کچھ نہ کچھ اصول دین کے پابند ہیں۔ فرمایا کہ جو چیز نہایت صاف اور شفاف ہو، اس پر دھبہ ہونا نہایت ناگوار ہوتا ہے اور جو چیز خود میلی ہو اس پر ناگوار نہیں ہوتا جیسے ٹوپی پر چیٹ لگ جانے سے یا گندگی آلودہ ہوجانے سے اس کو اتار کر پھینک دیتے ہیں مگر جوتے پر لگ جانے سے کوئی ناگوار نہیں ہوتی۔ ایسے ہی مسلمان دعویٰ محبت کرتے ہیں، ان سے ذرا سی بے احتیاطی ناگوار گزرتی ہے۔ بخلاف دشمنوں اور غیر مسلموں کے کہ وہ جب بھی اصول پر عمل کر لیں تو اللہ میاں ان کو دے دیتے ہیں، اگرچہ وہ اللہ کے دشمن ہی کیوں نہ ہوں۔

فرمایا کہ حرص کے ساتھ مال حرام کبھی جمع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اگر جمع کر بھی لیا تو ممکن ہے کہ اتفاقاً بیمار ہو گیا کہ کھانے سے بھی معذور ہو گیا یا اس مال کو چور لے گئے فائدہ اتنا ہی ملا جتنا نقدیر میں تھا۔ افسوس یہ کہ کچھ لوگ اپنے ورثاء کے لیے حرام مال جمع کرتے ہیں۔ وہ خود تو دوزخ میں گئے اور آرام حاصل کیا دوسروں نے۔

فرمایا کہ میں نے جہاں تک غور کیا ہے، یہی پایا ہے کہ دنیا میں امراء اور دولت مند لوگ زیادہ پریشان رہتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات کوشش بھی کرتے ہیں کہ ہمیں اس مصیبت سے برائے چند نجات ملے لیکن ان کو نجات میسر نہیں ہوتی۔

فرمایا کہ صرف خدا تعالیٰ کے نزدیک ہی دنیا دار لوگ غضب کے مارے ہوئے نہیں بلکہ دنیا دار لوگوں کے نزدیک بھی دوسرے دنیا دار قابلِ نفرت اور قابلِ مذمت ہوتے ہیں کیونکہ دنیا داروں میں جب بھی دشمنی ہوتی ہے تو اسی دنیا کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن اہل اللہ اور تارکین دنیا کے ساتھ کسی کو دشمنی نہیں ہوتی۔ پھر فرمایا کہ دنیا دار جس طرح دین کے معاملات میں تارکین دنیا کے محتاج ہیں، اسی طرح دنیا کمانے میں بھی دیندار لوگوں کے محتاج ہیں۔ اکثر ان کے پاس تعویذ اور وظائف سینے اور دہلاؤں کا عمل کرانے کے لیے حاضر ہوتے رہتے ہیں اور یہ سب تعویذ اور عملیات مزید دنیا کمانے کے واسطے ہوتے ہیں۔

فرمایا کہ مال و دولت اور جاہ اور برتری سے محبت کی وجہ سے بعض اوقات دین میں بھی رخنہ پڑ جاتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مال کو فائدے کی خاطر بنایا ہے، اس لیے مناسب حد تک اس کے حصول کی کوشش جائز ہے لیکن جب ضرورت کے مطابق حاصل ہو جائے تو پھر زیادہ کوشش کرنا چھوڑ دے۔ اس طرح اللہ نے رہنے کو اور جاہ کو نقصان سے بچنے اور استہزاء سے محفوظ رہنے کا ذریعہ بنایا ہے لیکن ایسا جب حاصل کرنا جس سے دونوں کو نقصان پہنچنے یا ان کی زندگیاں خوف میں کشیں یہ حرام ہے۔ جاہ اور تہنہ صرف اسی قدر درکار ہے کہ فساد یوں سے محفوظ رہے۔

فرمایا کہ اگر انسان تین کام کر لے تو انشاء اللہ محروم نہیں ہوگا۔ خواہ چند بخدادی نہ بن سکے۔ اول یہ کہ گناہ کا ارتکاب ترک کر دے کیونکہ گنہگار اگر عبادت بھی کرتا رہے تو بھی اس کا نور تاریکی کے ساتھ گندھا ہوا ہوگا اور اس کو روشنی نہ مل سکے۔ دوسرے غلط خدا پر بدگمان نہ ہو کیونکہ یہ بدگمانی ہمیشہ کبر اور نخوت سے پیدا ہوتی ہے (اور کبر اور نخوت شیطان اور فرعون کی خصوصیت ہے) اور تیسرے جب بھی فرصت ملے تھوڑا بہت ذکر ضرور کر لیا کرے اور حضرات صوفیا کرام سے ملتا رہے۔

فرمایا کہ بزرگوں کے پاس صرف طلب دین کی غرض سے جانا چاہیے۔

فرمایا کہ اپنے حالات اور اسرار اور دریافت دوسروں پر ظاہر نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ اسرار ایسا ہے جیسا کوئی اپنے محبوب کو دوسروں سے چھپانا چاہیے۔ ایسا کون ہوگا جو اپنی بیوی کو دوسروں کی بغل میں دینا چاہیے۔

فرمایا کہ تمام اشتغال و اذکار کا مقصد یہی ہے کہ پابندی شرع نصیب ہو اور ان اذکار سے قلب میں گداہنگی پیدا ہو۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ کا ذکر کرنے سے سارے مرحلے طے ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ بچارے معاملات اور اخلاق کی درستگی کو کوئی چیز نہیں سمجھتے، اس لیے محروم رہتے ہیں۔

فرمایا ایسے شخص کی حالت پر نہایت افسوس ہوتا ہے جو قرآن اور حدیث پڑھ کر بھی جان اور مال کی محبت رکھے۔

فرمایا کہ اگر وعظ میں مضمون خشک ہو اور نگین اور لذیذ نہ ہو، پھر بھی اس میں دلچسپی ہونی چاہیے۔ اس کی حالت ایسی ہے جیسے حکیم اجمل کا نسخہ ہو کہ جس کو پڑھ کر نہ تو لذت ملتی ہے اور نہ ہی وجد طاری ہوتا ہے مگر اس کے استعمال سے فائدہ ضرور ہوتا ہے، ایسا فائدہ کہ اس پر ہزاروں وجہ قربان کیے جاسکتے ہیں۔

فرمایا کہ حدیث شریف ہے کہ ایک آدمی میں دو خوف جمع نہ ہوں گے یعنی جو شخص دنیا میں خاکف رہے گا اور اللہ

سے ڈرتا رہے گا وہ قیامت میں بے خوف ہوگا اور جو دنیا میں بے باک اور بے خوف ہوگا، وہ آخرت میں خوفزدہ ہوگا۔ انسان کو چاہیے کہ وہ خاکف اور امیدوار رہے۔

فرمایا کہ حضرت صوفیا کرام کے تذکرے میں لذت آتی ہے۔ بخلاف تذکرہ علماء کے کہ ان کے تذکرے میں لذت نہیں آتی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرت صوفیا اہل محبت میں ان کے تذکرے میں بھی محبت کا اثر ہوتا ہے اور اس سے روح لذت یاب ہوتی ہے۔

فرمایا کہ حضرت مولانا یعقوب صاحب کی جب کوئی تعریف کرتا تو آپ خاموش رہنے اور یوں فرمایا کرتے کہ اگر منع کیا جائے تو وہ اور زیادہ تعریف کرے گا اور اگر خاموش رہو تو تعریف کرنے والا یہ سمجھے گا کہ میری تعریف کی قدر نہیں کی۔ اس واسطے وہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور آسانی رہتی ہے۔

فرمایا کہ تجربے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ سکوت سے قلب میں جو بات پیدا ہوتی ہے، وہ گفتگو کے بعد باقی نہیں رہتی۔ اگرچہ وہ گفتگو مفید اور محمود ہی کیوں نہ ہو۔

قلندر اس کو کہتے ہیں جو ظاہری عبادت میں فقیل کرے یعنی جس پر ذکر و فکر نوافل و مستحباب سے زیادہ غالب ہوں۔ ملاستی وہ ہے جو اعمال میں کشمیر تو کرتا ہے مگر ان کے انخاف کا اہتمام کرتا ہے جس سے عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دوسروں سے زیادہ کچھ بھی نہیں کرتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے خضر علیہ السلام کا علم ایسا ہے جیسا واسرائیل کے علم کے سامنے کو توال کا علم کہ جزئیات و قائل کا علم تو کو توال کو زیادہ ہوتا ہے مگر اصول سلطنت اور کلیات قانون کے علم میں واسرائیل کے برابر کوئی حاکم نہیں ہو سکتا۔

ملفوظات

سر کچھ ایسا کر دیجئے کہ دل میں گناہ کا خیال ہی نہ آئے۔ دیکھو بھائی، یہ دیوار ہے۔ کتنے سال سے یہاں موجود ہے۔ برسوں ہو گئے، چوری یہ نہیں کرتی، حق اس نے کسی کا نہیں مارا۔ جھوٹ غیبت، بے ایمانی، رشوت ستانی سے عاری ہے لیکن ثواب کوئی نہیں مل سکا۔ ویسے کی ویسے کھڑی ہے۔ انسان کا کمال تو یہی ہے کہ دل میں گناہ کا تقاضا پیدا ہو اور گناہ نہ کرے۔

لیکن سر کچھ بھی تو ایسا بھوت چڑھتا ہے کہ انسان گناہ کا مرتکب ہو ہی جاتا ہے۔ خیر اگر گناہ ہو ہی جائے تو توبہ کر لے، آخر توبہ ہے کس لیے بھائی۔

کوئی اچھا سا وظیفہ بتا دیجئے۔ حقوق العباد کا ادا کرنا سب وظیفوں سے افضل ہے اور ضروری ہے۔ حقوق العباد کے ترک کرنے پر پکڑ ہوگی

لیکن وظیفہ نہ کرنے پر کوئی پوچھ گچھ نہیں۔

ارشاد صاحب کا آخری وقت

جب شہلا ارشاد کے پاس ان کا احوال پوچھنے جاتی ہے تو پلنگ سے ڈھولکا کر وہ ذرا اوپر ہو جاتے ہیں اور شہلا سے کہتے ہیں: ”میں نے زندگی میں کافی سفر کیے ہیں، لمبے لمبے چھوٹے چھوٹے۔ ملک کے اندر، ملک سے باہر۔ یونٹنگ کے اور Concord کے سفر لیکن اس سفر کا جھوٹا میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں لیا۔“

”کس قسم کا جھوٹا سفر؟“

”یہی جو میں اب لینے والا ہوں۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے یہ اپنی طرز کا ایک بڑا Adventure سفر ہوگا، پر لطف، مسور کن اور معلومات افزا۔ اس سے میرے علم میں اضافہ ہوگا۔ اس سفر سے میری زندگی مالا مال ہو جائے گی، پر باش ہو جائے گی۔ یہ سفر Dive ضرور ہوگا، Life چاہے ہونہ ہو۔“

”آپ کیسی باتیں کرتے ہیں سر؟“

”دیکھو شہلا میرا سوٹ کیس بیک ہو چکا ہے۔ میرے سارے مل ادا ہو چکے ہیں۔ زندگی کا ایک ایک پیرا تر چکا ہے۔ میں کسی کا مقروض نہیں ہوں۔ میرا پاسپورٹ تیار ہے۔ اس پر دینا الگ چکا ہے۔ نکلیں میری جیب میں ہیں اور میں اس سفر پر روانہ ہونے والا ہوں جس کے انتظار میں آج تک زندہ رہا اور جس کی میں اس وقت تک راہ نکلتا رہا۔“

”رمضان موبچی“

کوئی راہ بھی بس ایک راہ ہی ہے اور اس میں کوئی توہین نہیں، کوئی ہنک نہیں۔ نہ تمہاری نہ دوسروں کی۔ اگر تم نے اس راہ کو چھوڑ دیا۔ چھوڑ اس لیے دیا کہ تمہارے دل نے کہا چھوڑ دو۔ ہر راستے کو غور سے دیکھو۔ دھیان سے دیکھو اور اس کی جانچ کرو۔ اس کو آزمائو۔ چلو، گزرو، پرتاؤ۔ پھر اپنے آپ سے پوچھو۔ صرف اپنے آپ سے کسی اور سے نہیں۔ کسی اخبار رسالے یا کالم سے نہیں۔ بس ایک ہی سوال پوچھو کہ آیا اس راستے کا کوئی دل بھی ہے یا نہیں۔ اس کا قلب چالو ہے کہ نہیں (راہ تو چالو ہے) اگر اس راستے کا قلب ہے دل ہے تو پھر اسے فوراً اختیار کر لو۔ اگر نہیں ہے تو اسے چھوڑ دو، الگ ہو جاؤ۔

اب کو اٹھ تھیوری کو جانے بغیر اور فوٹان کی کیفیت سمجھتے بغیر یہ کیونکر جانو گے کہ حضرت غوث الاعظم نے فرمایا کہ جب موحد مقام توحید میں پہنچتا ہے تو وہاں نہ موحد رہتا ہے ناں توحید، نہ واحد نہ بسیار۔ نہ خودی نہ خدا، نہ عابد نہ معبود، نہ ذات نہ صفات، نہ ولی نہ ولایت، نہ صفت نہ موصوف نہ اسم نہ مسمی نہ ظاہر نہ باطن۔ نہ بہشت نہ دوزخ۔ نہ روشنی نہ تاریکی، نہ زمین نہ آسمان، نہ منزل نہ مقام، نہ طلب نہ طالب نہ کفر نہ اسلام نہ کافر نہ مسلمان۔۔۔۔۔

ہر انسان اپنے تجربات سے اور اپنی Genetic Coding سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے۔ اُسے زندگی بسر کرنے کا طریقہ، سلیقہ، وطیرہ ان ہی دو مکتبوں سے حاصل ہوتا ہے۔ میں نے بھی جو کچھ سیکھا ہے وہ فقط اتنا ہے کہ چونکہ ہر انسان زندگی گزارنے کے لیے خاص قسم کے اوصاف سے متصف ہے اس لیے کوئی شخص کسی دوسرے فرد کے فیصلوں کو سمجھ نہیں سکتا۔ اسی لیے روز قیامت کی شرط ہے۔ اُس روز اللہ تعالیٰ خود یہ بات طے فرمائیں گے کہ کس شخص کے اعمال کیسے ہیں؟ لیکن عجیب سی بات ہے کہ ہم پھر بھی اپنی Judgement کو اللہ پر نہیں چھوڑتے اور دائیں بائیں ملنے والوں کو اپنے ترازو پر تولتے رہتے ہیں۔ یہ بھی غیبت کی ایک شکل ہے۔

مشکل یہ آن پڑی کہ خاں صاحب اپنی کتاب ”بابا صاحب“ ختم کیے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس کتاب کے ساتھ ان کے کچھ نوٹس بکھرے بکھرے غیر مرتب شکل میں موجود تھے۔ نہ جانے وہ یہ مواد کس طرح استعمال کرنا چاہتے تھے۔ یہ پہلی اب طے نہیں ہو سکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ اس مواد کو بھی کتاب کے ضمیمے کے طور پر آپ کو پیش کر دوں تاکہ آپ اپنا فیصلہ خود کر لیں۔ خاں صاحب کے جو قارئین انہیں صوفی سمجھنے سے قاصر تھے کہ ایسا صوفی پھر گریست میں کیسے کامیاب ہو گیا۔ صوفی تو سب سے پہلے شادی کے جھیلوں سے نکل جاتا ہے۔ صوفی اگر دنیاوی طور پر خوشحال ہے تو یہ صوفی کے شایان شان نہیں کیونکہ دنیا چھوڑ کر اس کے جھٹھلوں سے فراغت پا کر ہی تو مابعد کا راستہ ملتا ہے۔

دوسری جانب وہ محنتی قارئین ہیں جن کا خیال ہے کہ خاں صاحب پیدائشی افسانہ نویس تھے۔ وہ سوچتے ہیں پھر انہوں نے ڈرامے کی لائن کیوں اختیار کی اور زاویے کی طرف کیوں مڑ گئے۔ ایسے ہی ایک چاہنے والے نے خاں صاحب سے ٹیلیفون پر بات کی اور اپنی طرز کی بیزاری کو طفر میں بڑے سلیقے سے پیش کیا۔ میں وہ فون کی گفتگو آپ کو دکھاتی ہوں۔ فیصلہ آپ کا اپنا ہے۔ بڑے لوگوں کو پورے طور پر سمجھنا کچھ ایسا آسان عمل بھی نہیں۔ یہاں پہنچ کر جس طرح زندگی خیران کر دیتی ہے ایسے ہی ہر بڑا آدمی بھی ہمیں محجوب چھوٹا جاتا ہے۔

”بھئی اشفاق صاحب ہیں؟“

”جی آپ کون بول رہے ہیں؟“

”میں انتظار حسین بول رہا ہوں۔“

”چلے گئے؟ اچھا کیا یہاں رکھا تھا انہوں نے آج۔“

”جی؟“

”میرا مطلب ہے آج وہ چٹون میں تھے یا کھد رکا کرتا پہن رکھا تھا۔“

بتانے والے نے بتایا کہ اشفاق صاحب نے جو گیا رنگ کا کھد رکا کرتا پہن رکھا تھا۔ تب میں نے ٹیلیفون بند کر دیا اور سوچا کہ اچھا ہی ہوا آج ملاقات نہیں ہوئی۔ دوسرے دن ٹیلیفون کیا تو پتہ چلا کہ اشفاق صاحب آج کھد رکا نیا کرتا پہن کر آئے تھے چلے گئے۔ میں نے پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ تیسرے دن ٹیلیفون کیا تو پتہ چلا کہ اشفاق صاحب آج سوٹ پہنے ہوئے ہیں اور نیچے سکوتر پہ آدھے بیٹھے آدھے کھڑے ایک گورے سے اطالوی لہجہ میں انگریزی بول رہے ہیں۔ میں بہت خوش ہوا کہ آج اشفاق صاحب اپنے اصل روپ میں ہیں۔ میں نے مخاطب سے کہا کہ جھپٹ کے جاؤ اور ٹیلیفون پر بلا لاؤ۔

اشفاق صاحب آدی مصروف ہیں اور ادبی معاملات پر قلم اٹھانے کی فرصت نہیں رکھتے۔ یوں بھی ان کی گفتگو گرم ہوتی ہے چنانچہ چھوٹے ہی انہوں نے جواب دیا ”میرے ہم عصر تم نہیں ہو۔ میں تو اے حمید کو اپنا ہم عصر سمجھتا ہوں۔“

”صحیح سمجھتے ہو مگر کیوں۔“

”یار! اے حمید کی تحریر میں ایک تازگی ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کی فکر میں تازگی نہیں۔“

”اور اس بنا پر تم اپنے آپ کو اے حمید کا ہم عصر سمجھتے ہو؟“

ٹیلیفون پر آواز گڑبڑ ہوگئی۔ کئی فخرے میں سن نہ سکا۔ جب آواز صاف آئی شروع ہوئی تو میں نے سنا کہ اشفاق صاحب بہت گرم ہیں اور پاکستان کے ادیبوں کو ڈانٹ رہے ہیں ”صاحب! پاکستان میں تو ادیب اب پیدا ہوگا۔ ابھی تو ایسے ادیب ہیں جو جیلہ الجزار کی پر لکھتے ہیں۔ پاکستان کی کسی شخصیت پر لکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں شہید ملت لیاقت علی خان ہی پر لکھیں، لکھیں تو سہی۔“

میں ان کی تقریر سن کر سہم گیا اور مجھے اپنا چار سال پہلے کا ایک گناہ یاد آ گیا۔ میں نے اشفاق صاحب سے صرف اتنا کہا تھا کہ ”یار! کچھ ادیب یوم الجزار منار ہے ہیں۔ آؤ ہم تم بھی کچھ لکھیں اور اس میں شریک ہو جائیں۔“ اور یہ وہ زمانہ تھا جب الجزار کے مجاہدوں اور مصر کے انقلابیوں کو یار لوگ کیونٹ کہا کرتے تھے۔ تو اشفاق صاحب نے مجھے جھڑک دیا۔ میں چپ ہو گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن اشفاق صاحب نے مجھے معاف نہیں کیا۔ خیر اس وقت تو مجھے ان سے شکایت تھی۔ اب کوئی شکایت نہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں ان کی پیاری پیاری کہانیاں پڑھتا تھا اور سوچتا تھا کہ کاش اشفاق احمد بھی کسی قومی مسئلہ پر بھی سوچیں۔ اب وہ پچھلے برسوں سے قومی مسائل ہی پر سوچ رہے ہیں اور اپنی سوچ میں اتنے تعمیری ہو گئے ہیں کہ الجزار کی مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کے ذکر کو خیر ہی حرکت سمجھتے ہیں اور پاک فی ہاؤس میں بیٹھ کر چائے پینے کو قومی عزائم سے بیزاری اور قومیت کا اعلان جانتے ہیں۔

میں آپ کو واضح طور پر نہیں بتا سکی کہ ان کی کس تلاش نے انہیں کئی بابوں کا دروازہ کھٹکھٹانے پر آمادہ کیا؟ غالباً وہ زندگی کا اصلی مفہوم سمجھنا چاہتے تھے۔ کیا بتانے والے نے ہمیں کسی خاص مقصد کے لیے تخلیق کیا ہے؟ کیا محض اپنی تفریح طبع کے لیے انسان کا کھلونا بنا کر اس کی اچھل کود فلا بازیاں چلاتے دیکھ کر محفوظ ہوتا ہے؟ کیا اُسے رتی بھر پرواہ نہیں کہ جس کھلونے کو اُس نے کھٹکھٹاتی مٹی سے خمیرے کے مانند بنایا ہے اس پھاند پھلانگ سے اس پر کیا بنتی ہے؟

اشفاق صاحب زندگی کے مفہوم کی تلاش میں اپنے تخلیقی عمل میں بھی کئی مقامات سے گزرے۔ کہانی... کہانی... کہانی... سے ڈراما اور بالآخر ڈرامہ۔

ایسے ہی کبھی ایک بابا کبھی دوسرا... کبھی ایک روحانی علم کبھی دوسرا۔ حجاب کے پردے... لیکن اتنی بات طے ہے کہ انہیں صاحب سے پہلے دھرم پورے میں ڈیرہ چلانے والے بابا جی کے دروازے پر صدا دینی پڑی۔ بابا جی فضل شاہ اتنی تھے۔ کئی سال جنگلوں میں سستی پہرہ کاٹ چکے تھے۔ کچھل گیا تو کھالیا نہ ملا تو جنگلی روئیدگی پر برسر کی۔ لوگوں سے کٹ کر جانوروں پرندوں، نباتات و جمادات کے قریب رہ کر انہیں عرفان ذات حاصل ہو گیا۔ جب وہ وہاں بشری زندگی میں لوگوں کے درمیان آئے تو انہیں علم ہو چکا تھا۔ اللہ سے اصل وابستگی خلق کی خدمت میں پنہاں ہے۔ ڈیرے پر روٹی کھلانے کی روایت اسی علم پر منحصر ہے۔ نہ خان صاحب ڈیرے پر جاتے۔ شاہ صاحب سے ملتے۔ وہ لمبی بات کرنے کے عادی نہ تھے۔ بہت کہتے ”نوٹ“ اور پھر کوئی مفلوطات میں سے ایک تھنے کے طور پر پیش کر دیتے۔ میں یہاں بابا جی نور والے کے وہ حالات اور فرمودات لکھ رہی ہوں جنہیں خاں صاحب آؤ گراف دیتے وقت استعمال کر لیتے تھے لیکن یہ نہیں وہ اس مواد کو اپنے بابا صاحب میں کیسے مربوط کر چکے؟

تعارف حضور فضل شاہ رحمۃ اللہ علیہ قطب عالم نور والے

ادارۂ قادریہ نور والوں کا ذریعہ انجمنی روڈ، مصطفیٰ آباد لاہور طالبان ہدایت کی جانی پہچانی جگہ ہے۔ حضور فضل شاہ قطب عالم کے مبارک قدموں نے اس جگہ کو ذریعہ پاک بنایا۔ رحمت برکت اور شفاء کو حضور نے ایسے تقسیم کیا کہ عالم خاص اور خاص الناس سب فیضیاب ہوتے رہے۔ حضور سے میل جول کی بدولت ملنے والوں کا قول پاک ہو جاتا ہے۔ لغو گوئی اور کذب سے انہیں کراہت ہونے لگتی۔ پھر خالص محبت کی بدولت وہ اپنے اعمال کی صحت کو اپنے محبوب کے اعمال کی روشنی میں دیکھنے لگتے۔ اس طرح جنہیں کو یکسوئی کی عظیم نعمت عطا ہوتی۔ پھر محبت نامہ سے یہ مقام بھی آتا کہ محبت محبوب کی خلوت اور محبوب محبت کی جلوت ہو جاتا۔ مقام دو ہوتے حقیقت ایک ہوتی۔ محبت ہر مقام پر اپنی خواہشات نفس کے خلاف

رہ کر اس مقام پر مہر کا ثبوت دیتا۔ ان تینوں مقامات پر پورا رہنے والوں پر اخلاص، حسن کی صورت سے برسنے لگتا۔ فلاح پانے والے یہ لوگ مطابق کے بھی مطابق رہتے، مخالف کے بھی مطابق رہتے۔ یہ نور والے حضرات یہ نہیں دیکھتے کہ لوگ ان کے ساتھ کیا کر رہے ہیں، یہی دیکھتے ہیں کہ انہیں لوگوں کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔ اس پاک اور روشن جماعت کے معمار کو ہدیہ عقیدت پیش کرنے کے لیے عاشق صادق بدھ 30 اگست 78ء کو آپ کے آستانہ عالیہ پر نماز عصر کے وقت جمع ہو رہے ہیں۔ جس ذات بابرکات کا قول، عمل، علم سب معیار حق ہوں اور جو عباد مخلصین میں سے ہو اس کا ماضی اور حال صراطِ مستقیم کی جستجو کرنے والوں کو ظلمات سے نور کی طرف آنے میں سہارا دیتا ہے۔

آپ کے آباؤ اجداد کبیریاں ضلع ہوشیار پور میں قیام پذیر تھے۔ بعد میں جالندھر تشریف لے آئے۔ آپ کے والد ماجد حضرت نبی بخش صاحب بڑے غریب نواز تھے۔ مساکین کی دل نوازی سے بڑھ کر کسی کام میں آپ کو دلچسپی نہ تھی۔ اس وقت سو روپیہ روز آمدنی تھی آپ کی۔ جب گندم ایک روپے کی تقریباً ایک من ہوتی تھی اور حال یہ تھا کہ گھر والوں کو صرف ان کے گزارے کے لیے ہی دیتے تھے باقی پیسے اپنے ہاتھ سے مستحقین کو عطا کر کے سوتے تھے۔ حضرت نبی بخش صاحب، حضرت شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ جب حضرت نبی بخش صاحب اپنے مرشد صاحب کی خدمت عالیہ میں اپنے بچے کو لے کر حاضر ہوتے تو آپ فرمایا کرتے کہ یہ بچہ اپنے وقت پر بڑے فیض کا قاسم ہوگا۔ عام خاص اور خاص خاص الخاص سب اس چشمہ فیض سے سیراب ہوں گے۔ آپ کی والدہ محترمہ نے آپ کو نوازنے کے لیے کبھی آپ کو دوستوں سے الگ نہیں کیا۔ بچپن سے لے کر آخر وقت تک آپ کے ساتھ مستانوں دیوانوں کا میلہ ہی لگا رہا۔ دیکھنے والے اس بات کی شہادت دیں گے کہ خلوت نشینی کی طلب آپ کو ہوئی ہی نہیں۔

بچپن میں بھی آپ کی حرکات و سکنات سے آپ کی شان واضح تھی۔ دوست پیار سے آپ کو دور اندیش کہا کرتے تھے۔

چودہ سال کی عمر میں مستانی کیفیت وارد ہوئی۔ بارہ سال اسی حالت میں رہے۔ کئی لوگ اس حال میں آپ سے ملے۔ جو زبان پاک سے نکلتا تھا قطعاً پورا ہوتا تھا۔ اللہ کے فضل سے حضرت میاں خدا بخش صاحب سر تاج اولیاء کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ آباد پورہ جالندھر میں قیام پذیر تھے۔ میاں صاحب نے پوچھا: عزیزم! تمہارا کیا نام ہے؟ عرض کیا: حضور جس نام سے مجھے پکاریں میرا وہی نام ہے۔ فرمایا: کیا کھایا کرو گے؟ عرض کیا: جو حضور کھلائیں گے میرے لیے وہی سب سے اچھا کھانا ہوگا۔ فرمایا: کیا پہنو گے؟ عرض کیا: جو لباس حضور میرے لیے پسند فرمائیں گے وہی بہترین لباس ہوگا۔ فرمایا: رہو گے کہاں؟ عرض کیا: جہاں حضور رکھیں گے وہی میرے لیے بہترین جگہ ہوگی۔ حضرت میاں صاحب نے خوشی سے فرمایا: ”عزیزم! طالب علم کی پوری شان تم میں جلوہ گری کر رہی ہے۔ معلم سے محبت ہو تو اس سے نور معرفت عطا ہوتا ہے۔“ آپ نے دعا فرمائی: ”اللہ تعالیٰ اس فیض کو ابد الابد تک جاری رکھے۔“ حضرت فضل شاہ چودہ برس تک اپنے مرشد کامل کی خدمت اقدس میں رہے۔ آپ نے کبھی خواہش کے تحت زبان نہیں کھولی۔ لوگ میاں صاحب سے کہتے: یہ بچہ خاموش ہی رہتا ہے۔ آپ فرمایا کرتے: ”یہ بچہ اپنے وقت پر بولے گا۔“

اس وقت اس کا بولنا سند کا درجہ رکھے گا۔“ حضور کو حضرت میاں صاحب سے چاروں مدارج عطا ہوئے۔ قول، عمل، علم اور اخلاص اور پھر حضرت میاں صاحب کے امر کے مطابق آپ نے دعوت فلاح دینی شروع کی۔ آپ روحانی امراض کے بھی طبیب تھے۔ جسمانی امراض کے بھی۔ جو آپ کی متعین کردہ حدود کا احترام کرتا۔ اسے یقیناً شفاء ملتی تھی۔ فرمایا کرتے تھے: ”جسمانی امراض پر ہیروزے جاتے ہیں روحانی امراض پر ہیروزگاری سے جاتے ہیں۔“

آپ نے قرآن پاک کی تفسیر فرمائی ہے۔ نمونے کے طور پر سورۃ فاتحہ کی تفسیر پیش خدمت ہے۔ یہ تفسیر طباعت کے مراحل طے کر رہی ہے۔ آپ مشاہدہ فرمائیں گے کہ یہ ترجمہ اپنے اندر بڑا حسن رکھتا ہے۔ تقابل سے اس کی تصدیق ہوگی۔ تفسیر انعام یافتہ حضرات کے حال کو منور کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ حاصل کے عنوان سے اس حق کو بیان فرمایا گیا ہے جو قارئین اور سامعین حضرات پر عائد ہوتا ہے۔ یہ حاصل جس کا بھی حال ہوگا وہ اللہ کے فضل سے انعام یافتہ حضرات میں شمار ہوگا۔ آپ کو اس تفسیر میں نہ تضاد نظر آئے گا نہ اختلاف۔

سورۃ الفاتحہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان بڑے رحم والا ہے

فرمایا: صاحبو! اللہ تعالیٰ پاک ہے۔ پاک ہی اسے پا سکتا ہے۔ یہ پاکی اللہ کے محبوب سے عطا ہوتی ہے اور اس کی بدولت مخلوق کے ساتھ پورا رہنے کا ذاتی اور صفاتی علم عطا ہوتا ہے۔ الرحمن کی شان یہ ہے کہ وہ رحم کرتا ہے اور جب کوئی مقصود سے دور ہو رہا ہو تو اسے قریب کرنے کے لیے سختی بھی کرتا ہے۔ مگر یہ وقتی ہوتی ہے۔ پھر اس کا رحم ہی ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ جس پر اللہ کا کرم ہو اس کے قریب کر دے۔ اس طرح بسم اللہ عمل سے ہو جاتی ہے۔ ورنہ قول کی نکرار سچا ثابت ہونے کے لیے درکار نہیں ہے۔ جس قول کا عمل شاہد نہ ہو وہ قول سچا ثابت نہیں ہوتا۔ حاصل: ہر کام میں بسم اللہ قول سے ادا کرنا حق ہے۔ عملاً یہ دیکھنا لازم ہے کہ ہم عباد مخلصین کی اتباع میں تجویز سے پاک رہیں۔

الحمد للہ رب العالمین: حمد اللہ ہی کی ہے جو عالمین کا رب ہے۔

تعریف کا تعلق تعین سے ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں ہے۔ حمد کی حقیقت شان ہے اور شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو پالتا ہے اور علم سے پالتا ہے۔ ابتدا سے انتہا تک ہر حال میں اس کے پالنے کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس پالنے میں کسی کی تجویز کا دخل نہیں ہوتا۔

شہادت: اللہ تعالیٰ نے سورۃ النحل میں فرمایا ہے۔

ان الذین لا یؤمنون بایة اللہ لا یہدیہم اللہ ولہم عذاب الیم: 16-104

بے شک جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اللہ انہیں ہدایت نہیں دیتا اور ان کے لیے المناک عذاب

آپ فرمایا کرتے تھے۔ دین کی دنیا کی کوئی پوچھو سب کو اجازت ہے۔ جو ہماری سن لے گا۔ اس کی اللہ سن لے گا۔ چند سوالات ملاحظہ فرمائیے۔ ان اہم سوالات کے جو جواب آپ نے عطا فرمائے ہیں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔

سوال: قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے۔ ومن یوق شح نفسه فاولئک ہم المفلحون۔ (اور جو نفس کی حرص سے بچایا گیا تو وہی فلاح پائے والے ہیں۔ 9:59) نفس کی حرص سے کیا مراد ہے؟ اور اس سے کیسے بچنا چاہیے؟

جواب: حال پر اللہ تعالیٰ کی عطا کو ناکافی جاننا اور مزید کی خواہش رکھنا حرص ہے۔ حرص جہاں ہوگی وہاں حرصی (خواہش) کے جھوٹے چلتے رہیں گے۔ حرص خلوت ہے حرصی اس کی جلوت ہے۔ حرص سے بچنے کی صرف اور صرف ایک ہی صورت ہے کہ اللہ کے محبوب کو اپنا محبوب بنالیا جائے۔

سوال: تاسمین سے محبت کا ثبوت کیسے ملتا ہے؟

جواب: محبت کا قول اس کے محبوب کا قول ہوتا ہے اس کا عمل اس کے محبوب کا عمل ہوتا ہے اس کا علم بھی اس کے محبوب کا علم ہوتا ہے۔ محبت اپنے محبوب کو ہر مقام پر سند جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوب کے حوالے سے مانتا ہے۔

سوال: بیعت کی افادیت کیا ہے؟

جواب: بیعت کی حقیقت شہادت ہے اور دعویٰ بغیر شہادت قابل سماعت ہی نہیں ہوتا۔

سوال: مردان حق (عباد تخلصین) کی پہچان بتادیتے؟

جواب: ان کا بولنا بھی علم سے ہوتا ہے خاموشی بھی۔ دونوں مقامات پر ماننے والوں کے لیے فلاح موجود ہوتی ہے۔ وہ تکیہ عطا کرنے کا شرف رکھتے ہیں۔ ان کی اتباع میں خوف و حزن سے نجات کی ضمانت موجود ہوتی ہے اور وہ اجر کے سوال سے پاک ہوتے ہیں۔

سوال: درویش فقیر اور صوفی میں کیسے امتیاز کیا جائے؟

جواب: جس کا لباس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہو درویش ہے۔ جسے فائدہ قناعت اور ریاضت کا شرف ہو وہ فقیر ہے اور جو خلوت و جلوت میں صاف ہوا اپنے ساتھ بھی اور اللہ کی مخلوق کے ساتھ بھی وہ صوفی ہے۔ یہ سب پاک جماعت کے افراد کے نام اور مقام ہیں۔

سوال: اصول تبلیغ کیا ہے؟

جواب: تبلیغ اس پر حق ہے جو کچھ دینے کا شرف رکھتا ہو۔ تبلیغ کرنے والے کی صداقت و امانت کا اعتراف ہو ساعین کو تو اس کی تبلیغ موثر ہوتی ہے ورنہ نہیں۔

سوال: غیر کے راستے پر ہننے والے شخص کو خبر کی طرف لانے کے لیے کیا کیا جائے؟

جواب: اس کی برائی کو قول سے، عمل سے، علم سے اور اخلاص سے بطریق احسن دفع کیا جائے۔ ماننے سے میل ہوتا ہے اور میل سے غیر کو خبر کی طرف آنے کا شرف ہوتا ہے۔

سوال: عشق کا مقام کیسے حاصل ہوتا ہے؟

جواب: عشق کی حقیقت پاکی ہے۔ ہر آواز کو اپنے لیے آواز حق ماننا اور اپنی صورت سے گزر جانا حصول عشق کا راستہ ہے۔

ملفوظات حضرت فضل شاہ قطب عالم

☆ کامیابی کی حقیقت صبر اور رضا والہی ہے۔

☆ تسکین صاحب تسکین سے ہی عطا ہوتی ہے۔

☆ دائمی حسن اور علم حقیقی لازم و ملزوم ہیں۔

☆ جو خیر کو قبول نہ کرے غیر اس کے گلے پڑ جاتا ہے۔

☆ شرافت موجود ہو تو شرف عطا ہوگا اور شرف ہو تو بلندی ہوگی۔

☆ جہاں مقصود دولت ہو جائے شجاعت وہاں سے رخصت ہو جاتی ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ سب حضرات کو خیر و برکت عطا فرمائے۔

اللہ

☆ دو سامان نہیں رکھنا چاہیے جو کام نہ آئے اور جسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جاسکے۔

☆ اللہ کے پیار و اللہ کا قرب چاہتے ہو تو اپنے اخلاق سنوار لو۔

☆ تم اللہ کے ہو جاؤ اللہ تمہارا ہو جائے گا۔

☆ جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی۔

احسان

☆ مطابق کے مطابق رہنا احسان کا بدلہ احسان ہے۔ مخالف کے مطابق رہنا مروت ہے۔

اولیاء

☆ اولیاء کا کوئی کام عادتاً نہیں ہوتا۔

بزرگان دین

☆ حق کو پانے کا طریقہ یہ ہے کہ بزرگان دین سے میل جول ہو ان سے محبت خالص ہو اور ان کی معیت مقصود ہو۔

☆ ہر مقام پر میل جول سے قول پاک ہو جاتا ہے۔ محبت ہو تو اعمال کی شرح شروع ہوتی ہے۔

☆ بزرگان دین محبت کے بیوپاری ہوتے ہیں۔ وہ نفرت کا کھونا سکھ لے کر محبت اور خلوص کا کھرا مال دیتے ہیں۔

مخالف کے مطابق رہنے کا علم صرف اس طرح عطا ہو سکتا ہے۔

☆ بزرگان دین کے ساتھ نماز ادا کرنی اولیٰ عمل ہے۔

☆ جو سب اور تعین سے پاک ہے وہی شرک سے پاک ہے۔

☆ بزرگان دین سب نہیں ہیں وسیلہ ہیں اور وصال کا دروازہ ہیں۔

☆ بزرگان دین کتاب و شنید سے نہیں ہیں۔ کتاب اور شنید بزرگان دین سے ہے۔ عام شنید کے ساتھ ہے۔

☆ خاص کتاب کے ساتھ ہے اور خاص الخاص ام الکتاب کے ساتھ ہے اور ام الکتاب اللہ تعالیٰ انہی کو عطا فرماتا

ہے تاکہ مخلوق یہ نہ کہہ سکے کہ اللہ تعالیٰ کا پیارا کتاب شنید سے بول رہا ہے۔ عام اور خاص لوگ پڑھی ہوئی اور

سنی ہوئی بتاتے ہیں۔ بزرگان دین اس لیے آئے ہوئے ہیں کہ جو ان پر عطا ہو رہی ہے حال پر وہ عطا کرنے

کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ اس عطا سے پورا پورا فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔

☆ زاہد مبتدی لوگوں سے بھگتا ہے اور زاہد منتہی لوگوں کو طلب کرتا ہے کیوں نہ کرے کہ اس کے پاس ان کی دوا

موجود ہے۔

☆ لوگ ایک دوسرے سے میل جول اپنے فائدے اور بھلائی کے لیے رکھتے ہیں لیکن بزرگان دین مخلوق سے میل

جول ان کے فائدے اور بھلائی کے لیے رکھتے ہیں۔

☆ نجات شاہدین کی معیت کی بدولت ہوتی ہے۔

☆ جیسے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو رکھنا چاہتا ہے ہر مقام پر چاہے رخ دنیا کا ہو یا دین کا ہو۔ جو اللہ تعالیٰ ان کے لیے

چاہتا ہے وہ وہی چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ چاہے جاتے ہیں۔

پرہیزگاری

☆ ساری کائنات راحت کی خواہاں ہے۔ راحت سوائے ڈہد کے کسی مقام پر نہیں ہے۔ نہ ساری کائنات میں کوئی

صاحب ثابت کر سکتا ہے کہ راحت سوائے ڈہد کے کسی مقام پر ہو۔

☆ جس کا ہاتھ پاک ہو جائے گا اس کی نیت درست ہو جائے گی۔ جس کی نیت درست ہو جائے گی اس کا عقیدہ

درست ہو جائے گا۔ جس کا عقیدہ درست ہو جائے گا اس کے اعمال درست ہو جائیں گے۔

☆ برے کی بری صفت سے بچنا ضروری ہے۔ اسے اس کی بری صفت سے بچنا بھی ضروری ہے۔ یہ علم صاحبان

حال ہی سے سیکھا جاسکتا ہے۔

☆ ”پورا“ ہاتھ سے تعلق رکھتا ہے اور ”سچا“ زبان سے۔ دونوں جہان کی رحمتیں پورے اور سچے کے لیے ہیں۔

☆ برے کی برائی سے دور رہنا پرہیزگاری ہے۔

☆ صالح وہ ہے جس کا حال برے کے عمل سے متاثر نہ ہو۔

توفیق

☆ جس درجے کی توفیق نہ ہو اس کا اقرار نہیں کرنا چاہیے۔

تزکیہ

☆ خلوت کے تزکیے سے اپنے آپ کو فائدہ پہنچتا ہے۔ جلوت کے تزکیے سے مخلوق اللہ کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔

جمال

☆ حقیقی حسن مخلص کو عطا ہوتا ہے اور سب بہاروں میں خزاں آتی ہے۔

☆ حقیقی حسن کی بہار قدیم ہے اور دائمی ہے۔

☆ حسن کیا ہے؟ گمان نیک رکھو۔

حق

☆ جو ذاتی تضاد سے پاک نہ ہو لطافت کا مشاہدہ اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔

☆ جس کی فضیلت شاہد کی معیت کی بدولت ہے وہ راہ حق پر ہے۔ جس کو اپنی فضیلت اپنے اعمال پر مبنی نظر آئے

وہ گمراہ ہے۔

☆ مال اہل توکل کی نذر کرو۔ اس سے تمہیں راہ حق پر خرچ کرنے کا علم بھی حاصل ہوگا اور اتفاق فی سبیل اللہ پر

شہادت بھی ہو جائے گی۔

☆ اپنے ساتھ زیادتی کرنے والے کو معاف کرنے کا حق ہمیں دیا گیا ہے۔ دوسروں کے ساتھ زیادتی کو معاف

کرنے کا حق ہمیں نہیں۔

☆ چھوٹوں کو صلاحیت عطا کرنا اور بڑوں سے صلاحیت لینا حق ہے۔

☆ جام تب پاک ہو جاتا ہے جب کسی حق دار کو جام دیا جائے۔

☆ حق کو پانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ درود پاک پڑھا جائے۔ یہ حق کا نشا ہے۔

حقیقت، طریقت، شریعت، معرفت

☆ طریقت کی بسم اللہ ادا دی غرض و عایت سے پاک ہونا ہے۔ پہلا درجہ شریعت ہے۔ دوسرا طریقت ہے۔ تیسرا

حقیقت ہے۔ چوتھا معرفت ہے۔

شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت

- ☆ شریعت دودھ ہے۔ طریقت دہی ہے۔ حقیقت مکھن ہے۔ معرفت گھی ہے۔ اگر دودھ نہ ہو تو نہ کچھ بن سکتا ہے۔ نہ کوئی بنا سکتا ہے۔

حکم

- ☆ پیارو! حکم کو جاننے کی کوشش نہ کرو مشقت میں پڑ جاؤ گے۔
☆ قرآن پاک حکم ہے اللہ تعالیٰ کا۔ حکم ماننا ضروری ہے جاننا ضروری نہیں۔
☆ تسلیم کیا ہے؟ بغیر جاننے کے ماننا۔ حکم میں اللہ تعالیٰ نے جاننے کی شرط ہی نہیں رکھی۔

حکمت

- ☆ حشر میں ہر شخص کا پہلا گواہ اس کا سایہ ہوگا اور دوسرا اس کا ہاتھ۔
☆ لڑکے کے کام اکثر اعمال نفس ہوتے ہیں اور لڑکی کے اعمال دین اس لیے کہ لڑکی امانت ہوتی ہے۔
☆ جاری کا لفظ جن مقامات پر استعمال ہوتا ہے ان میں فیض سب سے افضل ہے۔
☆ توبہ کے چار مقام ہیں۔ نام سے توبہ، جسم سے توبہ، قلب سے توبہ اور روح سے توبہ۔
☆ پیارو! سوال مت بنو جواب بنو۔
☆ زیادہ کھانے سے جسم اور روح دونوں برباد ہو جاتے ہیں۔
☆ بلند مرتبہ والے کے ساتھ رہنا اپنی مرضی سے وقت کو ضائع کرنا ہے۔
☆ عورت عارف دنیا ہے۔ اگر مرد عارف مولانا ہو تو عورت کی غلامی سے بچ نہیں سکتا۔

حقیقت

- ☆ جس عقل کی صداقت شاہد ہو وہ کامل ہے۔ عقل نہیں صداقت چرغ راہ ہے۔
☆ مشاہدہ کامل ہوتا ہے قیاس ناقص ہوتا ہے۔
☆ نور کی حقیقت ہدایت ہے۔
☆ جس وجود سے خیرات جاتی رہے وہ وجود بے حقیقت ہو جاتا ہے۔
☆ جب تم کسی میں کوئی عیب دیکھو تو اس کو اپنے اندر تلاش کرو۔ اگر اس کو اپنے اندر پاؤ تو اسے نکال دو۔ یہ حقیقی تبلیغ ہے۔ اسے بزرگان دین تلاوت الوجود کہتے ہیں۔

حفاظت

- ☆ جو حکم میں رہتا ہے وہ حفاظت میں رہتا ہے۔ حکم کی حقیقت ہی حفاظت ہے۔ اس لیے حکم ہے کہ امر کے کوٹ میں رہو۔
☆ جو آپ اپنی حفاظت نہیں کرتا اس کو کس کا ماننا فائدہ نہیں دے گا۔
☆ جو لوگ فلاح چاہتے ہیں انہیں چاہیے کہ مخلصین کے ساتھ مل جائیں کہ ان پر شیطان کا انگوٹھا نہیں ہوتا۔
☆ دل کو حاضر اور خیر کے لیے آمادہ رکھنا کہ اس میں غیر کا دخل نہ ہو۔

خیر اور غیر

- ☆ مومن کی بسم اللہ اللہ سے اور کافر کی ابتداء غرور سے ہوتی ہے۔ جس کا آغاز اللہ سے ہو وہ پاک ہے اور جس کی ابتداء غرور سے ہو وہ غیر ہے۔
☆ جو خیر کو قبول نہیں کرے گا غیر اس کے گلے پڑ جائے گا۔
☆ قرآن پاک کا علم مخلصین سے پاؤ گے تو رخ خیر ہوگا۔ ورنہ اپنی چاہت کے معنوں سے بچ نہیں سکو گے۔
☆ خیر ایک طرف کا نام ہے اور خیر دوسری طرف کا۔ جو انسان جس طرف کو تسلیم کر لے گا وہی اس کی طرف ہوگی۔
☆ خیر حال پر موجود ہوتا ہے۔ غیر کو دعوت دی جائے تو آتا ہے۔
☆ جن جن چیزوں سے منع کیا ہے ان ان چیزوں سے منع نہ رہنا اس کے معنی غضب ہیں۔

دعا

- ☆ دعا قلندر یہ ہے یا اللہ! شیطان اور شرارت سے محفوظ رکھو۔ رحمت سے محروم نہ رکھو۔

سائل اور سوال

- ☆ پیارو جان! سو سائل کے آنے سے پہلے اس کا مقصد موجود ہوتا ہے۔ جلوت میں نہ ہو تو خلوت میں رہتا ہے۔ اگر دونوں جگہ نظر نہ آئے تو سائل کے پلے میں بندھا ہوتا ہے۔ کھول کر اس کے ہاتھ میں دے دو۔ جان لو بھیجنے والا یہ علم مطلق ہے۔
☆ سائل کا سوال حتی المقدور پورا کرو اور ساتھ ہی اس کا شکر یہ بھی ادا کرو۔

عقل

- ☆ جو یائے حق کو عقل کے احاطہ سے شاید حق ہی نکال سکتا ہے اور کوئی نہیں۔

☆ عقل جب دکھاتی ہے اپنا گھر دکھاتی ہے اور عشق جب دکھاتا ہے محبوب کا گھر دکھاتا ہے۔

عطا

☆ جو بندہ اللہ کا مقبول ہو جاتا ہے اس کی زبان کو گویائی اور دل کو شفقتی کا انعام عطا ہو جاتا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کا فضل لا محدود ہے ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔

☆ بغیر دیکھے تسلیم نہ کرنے والا صدیق نہیں ہو سکتا اور جب تک صدیق نہ ہو اسے طالب کا درجہ عطا نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے طالب ہی کو مطلوب مل سکتا ہے۔

☆ ہر صورت کا احترام واجب ہے۔ سب صورتیں ہمارے رب کی طرف سے ہیں۔

☆ جس کی اپنی کوئی بات نہ رہے اللہ تعالیٰ اسے اپنی بات عطا کر دیتا ہے۔ وہی معنوں کے اعتبار سے بادشاہ ہو جاتا ہے۔

☆ مقام صاحب مقام سے عطا ہوتا ہے اور حال پر عطا ہوتا ہے۔

☆ عطا کا شکر یہ ادا نہ کیا جائے تو اس کی برکت برقرار نہیں رہتی۔

☆ کرم عمل کو نہیں دیکھتا احترام کو دیکھتا ہے۔ احترام خلوت میں ہو تو اسے نہیں دیکھتا۔ وہی خلوت جلوت کی صورت میں پذیر ہو تو اسے دیکھتا ہے۔

علم

☆ اللہ رب العالمین ہے۔ وہ پالتا ہے اور علم سے پالتا ہے۔

☆ معاف کیا جائے تو معاف کرنے کا علم عطا ہوتا ہے۔ سزا دی جائے تو سزا دینے کا علم عطا ہوتا ہے۔

☆ علم الہی ہی بندے کو ہر مقام پر پورا رکھ سکتا ہے اور پورا رکھتا ہے۔

☆ حجاب جہاں بھی آجائے ہوتا علم کی کمی ہی سے ہے۔

☆ جو صاحب علم کسب جانتا ہوا ہے صرف مشاہدہ ہوتا ہے۔ جو علم کسب نہ رکھتا ہوا ہے مشاہدہ بھی ہوتا ہے اور اس کے لیے عبارت بھی اترتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ اُنہی کے لیے۔ مشاہدہ اور عبارت دو مقام ہیں۔

☆ جہاں کا اثر جاہل پر ہی ہوتا ہے۔ عالم کا اثر اپنی ذات پر بھی ہوتا ہے۔ مخلوق اللہ پر بھی۔

☆ بولنے کے تین مقام ہیں۔ جب بھی سامعین کے فائدے کے لیے کلام ہوگا تو علم و حکمت سے ہوگا۔ بے فائدہ بولنا بے فائدہ ہے۔ نقصان کے لیے بولنے کا حکم ہی نہیں۔

☆ قرآن پاک کو جاننا ہو تو بزرگان دین کو جانو۔ اگر بزرگان دین کو نہ جانو گے تو قرآن پاک کا جاننا تمہارا اپنے علم سے ہوگا۔ انسان حادث ہے۔ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا علم ہے اور قدیم ہے۔ قدیم قدم سے بنتا ہے۔ قدم

☆ بزرگان دین کا نقش قدم جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم۔
☆ علم وہ ہے جو حقیقت کے ساتھ تعلق رکھتا ہو۔

علم اور عمل

☆ باحقیقت زندہ ہے اور بے حقیقت مردہ ہے۔ باحقیقت اللہ تعالیٰ پر انحصار کرتا ہے اور بزرگان دین کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور بے حقیقت اپنے عمل پر انحصار کرتا ہے۔

☆ عمل کو فضیلت نہیں ہے رخ کو فضیلت ہے۔ عمل اور فرقوں میں بھی ہو رہا ہے اور دین کی بنیاد محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا رخ۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں نقشہ کھینچ کے دکھایا ہے۔ ابلیس اللہ تعالیٰ کے ساتھ پہلے بھی مانوس تھا اس وقت بھی مانوس تھا اور اب بھی مانوس ہے۔ راندہ کس لیے گیا؟ محبوب کے رخ کی تعظیم نہیں کی۔

مومن

☆ مومن کا حال حضوری اور کافر کا حال دوری ہوتا ہے۔

عبداللہ اور محبوب

☆ انسان کے وجود میں دو مقام ہیں داتا اور سنگت۔ جو اللہ تعالیٰ کا بندہ ہو جاتا ہے وہ صورت کے اعتبار سے بھی داتا ہو جاتا ہے اور معنوں کے اعتبار سے بھی داتا ہو جاتا ہے۔ اس لیے بزرگان دین فرماتے ہیں صاحبو! سوال مت بنو جواب بنو۔

☆ جس طرح اللہ تعالیٰ رحیم ہے اپنی مخلوق کے ساتھ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بندے کو بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے رحیم رہنا چاہیے۔ جو صاحب رحیم رہے گا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے فائدہ اٹھا جائے گا۔

☆ بندگی کی شرط یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کا ہو جائے پھر اللہ تعالیٰ بندے کا ہو جاتا ہے۔

☆ بندگی کی شرط یہ ہے کہ جس کی بندگی کرنا چاہتا ہے اس کا بندہ ہو جائے تو بندگی ہے ورنہ نیک عادت ہے۔ نیک عادت کو خطرہ ہر مقام پر موجود رہتا ہے۔ جس طرح بکرا حلال ہے۔ نکیر ہو جائے تو طیب ہو جاتا ہے۔ جھٹکا ہو جائے تو ناپاک ہو جاتا ہے۔

☆ عبودیت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے نام کو بلند کیا جائے۔

غرض و غایت

☆ جو انسان غرض و غایت سے پاک ہو جاتا ہے وہ شرک سے پاک ہو جاتا ہے۔

- ☆ جھوٹ وہ ہے جس میں بولنے والی کی خواہش شامل ہو۔ سچ یہ ہے کہ اس میں بولنے والے کی خواہش داخل نہ ہو۔
- ☆ کسی بھائی کے بے غرض کام آنا مقام ولایت ہے۔
- ☆ مومن اس لیے پاک ہے کہ وہ کوئی ذاتی غرض و غایت نہیں رکھتا۔ وہ عطاء خداوندی کو رضا خداوندی پر لگاتا ہے۔
- ☆ غیر کا حاصل غرور ہے اور غرور کا حاصل خواہش اور غرض و غایت۔ خواہش اور غرض و غایت کا حجاب اٹھ جائے تو ہر جہد و جہد میں دین بن جاتی ہے۔
- ☆ عقل وہوش غرض و غایت کے اور غرض و غایت عورت کے ماتحت ہے اور عورت مونث ہے۔ بندہ مقصود کو پالے تو مرد ہے اور غرض و غایت کو پالے تو مونث ہے اور اگر اس کا عمل خطا چلا جائے تو مخنث ہے۔

قوم / معاشرہ

- ☆ جس قوم کا شعار سادگی نہ رہے شجاعت اس سے دور بھاگتی ہے۔
- ☆ جس معاشرے میں وعدے کو پورا نہ کیا جاتا ہو وہ معاشرہ بے جان ہوتا ہے۔
- ☆ جماعت عملاً ایک دوسرے کے کام آنے سے بنتی ہے ورنہ محض قول کے ایک ہونے سے حق نہیں ادا ہو جاتا۔
- ☆ اپنی ذات کے لیے صبر اور مخلوق کے لیے بھلائی ہے۔

قول اور عمل

- ☆ جس قول کا عمل شاہد نہ ہو سچا ثابت نہیں ہوتا۔
- ☆ جس عمل کی بنیاد محبت پر ہوگی وہ دائمی ہوگا اور جو کتاب و شنید پر مبنی ہوگا وہ عارضی اور وقتی ہوگا۔ جو عمل محبت سے ہوگا اس سے ٹھکن نہیں ہوگی۔
- ☆ قول کی حد تک نفس راضی رہتا ہے۔ جب عمل کی حد شروع ہو جاتی ہے تو نفس بھاگتا ہے۔ کیونکہ نفس خدمت کو قبول نہیں کرتا۔
- ☆ راستے کی باتیں کرتے رہنے سے راستہ طے نہیں ہوتا۔
- ☆ باحقیقت زندہ ہے۔ بے حقیقت مردہ ہے۔ عمل کی کوئی صورت ہو۔
- ☆ مبارک ہو ان لوگوں کو جنہیں یہ چار مقامات عطا ہوں: قول، اعمال، علم اور اخلاص۔ جب تک چاروں موجود نہ ہوں تبلیغ شوکت نفس کے لیے ہوگی۔
- ☆ قول عمل کے لیے دعوت ہے بذات خود علم نہیں۔ علم تو عمل کا حاصل ہوتا ہے۔

- ☆ قول، عمل اور علم یہ تین مقامات ہیں۔ اخلاص انعام ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔
- ☆ توبہ قول سے ہوتی ہے۔ عمل اس کا شاہد ہو تو سچی ثابت ہوتی ہے۔
- ☆ بھیجنے والے نے انسان کو کس عمل کے لیے بھیجا ہے۔ صرف پڑھنے پڑھانے کے لیے نہیں۔ جو لوگ پڑھنے پڑھانے کو عمل سمجھتے ہیں وہ عمل کے لیے دیا گیا وقت بھی قول ہی میں ضائع کر لیتے ہیں۔
- ☆ مجاز کی کھیتی کو چشمے کا پانی دیا جائے تو بار آور ہوتی ہے۔ اعمال کی کھیتی کو چشم کا پانی دیا جائے تو بار آور ہوتی ہے۔
- ☆ ساری کائنات کی ابتدا قول سے اور بزرگان دین کی بسم اللہ عشق سے ہوتی ہے۔
- ☆ جان لینا چاہیے عمل کو فضیلت نہیں ہے۔ رُخ کو فضیلت ہے۔ حکم کو جاننے میں فضیلت نہیں ہے ماننے میں فضیلت ہے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے رُخ کو فضیلت ہے۔
- ☆ قول سواری ہے جو حال تک پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے عنایت کی ہے۔
- ☆ صاحبِ اقبال کے دور دورے میں نہ رہو۔ قالی کا ہمیشہ ہاتھ خالی رہتا ہے۔

کتاب و شنید

- ☆ اہل کتاب و شنید کے پاس بیٹھو گے تو مخلوق میں کیڑے دکھائی دیں گے اور اگر اہل حق کے پاس بیٹھو گے تو اپنا حال روشن ہوگا۔
- ☆ کتاب ماضی ہے جو اسے مقصود بنا لیتا ہے وہ بھی ماضی ہو جاتا ہے۔

مومن

- ☆ قوم غرض و غایت کے انہو سے بنتی ہے۔ قرآن اور سنت سے قوم نہیں بنتی۔ قرآن اور سنت سے مومن بنتا ہے اور مومن ملت بناتا ہے۔ ملت سے وحدت تشکیل پاتی ہے۔
- ☆ مومن جہاں رہے خوشنودی اس کا مقام ہے اور خدمت اس کی شان ہے۔
- ☆ ساری کائنات کی ابتدا طلوع آفتاب سے ہوتی ہے۔ مومن کی ابتدا نماز فجر سے ہوتی ہے۔
- ☆ مسلمان کی زبان پاک ہوتی ہے۔ ہاتھ امین ہوتا ہے۔ ہاتھ امین ہو تو دل پاک ہوتا ہے اور دل پاک ہو تو سارا جسم پاک ہو جاتا ہے۔
- ☆ مومن جو بھی کام کرتا ہے اللہ ہی کے لیے کرتا ہے۔
- ☆ مومن دنیا میں دکاندار کی طرح رہتا ہے۔ ملک بھی سب اشیاء کا ہوتا ہے اور منتظر بھی رہتا ہے کہ طالب آئیں اور اپنا حق لے جائیں۔
- ☆ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ اللہ کے ہو کر رہنا یہ مومن کی شان ہے۔

محبت اور چاہت

- ☆ محبت ہر مقام پر ایسے تعین سے پاک رکھتی ہے جیسے ہندی کے پتے میں۔ رنگ رنگ پتے میں موجود رہتا ہے۔ پتا تعین رکھتا ہے لیکن رنگ جو اس کے رگ دریش میں سرایت کیے ہوئے ہیں تعین سے پاک ہے۔
- ☆ مشرک کو اپنی جان سے بڑھ کر کسی سے محبت نہیں ہوتی۔
- ☆ چاہت کے ساتھ خوشامد اور ندامت لازم ہے۔
- ☆ محبت وہ ہے جو حق کے ساتھ تعلق رکھتی ہو۔

محبت اور محبوب

- ☆ محبت کو ہر مقام پر پورا رہنا چاہیے۔ پورا رہنے ہی سے نعمت کا شکر یہ ادا ہوتا ہے۔
- ☆ محبوب کے ساتھ گلے کا مطلب لگن ہے اور لگن کا نتیجہ آگن ہے۔ آگن سے آگیا پیدا ہوتی ہے۔ آگیا کی حقیقت ہے آگنی۔
- ☆ محبت محبوب کی خلوت ہے۔ محبوب محبت کی جلوت ہے۔ محبت محبوب سے خلوت و جلوت میں اپنی کوئی صورت نہیں رکھتا۔ مقام دو ہیں حقیقت ایک ہے۔
- ☆ محبوب سے جو عطا ہو رہی ہے اس میں کوئی خطا نہیں ہے۔ اگر اس میں خطا نظر آئے تو یہ اپنی نظر کا قصور ہوتا ہے۔
- ☆ اللہ تعالیٰ تعین سے پاک ہے لہذا اس کا کوئی رخ نہیں ہے۔ محبوب کا جس طرف رخ ہو اسی رخ کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔
- ☆ جس کی پریت ہے اس کی جیت ہے۔ جس کا پیا اس کا جیا اور وہی جیا۔
- ☆ اللہ تعالیٰ نے جو بھی بنایا ہے محبوب سے محبت کو روشن کرنے کے لیے۔ محبوب کے صدقے بنتے رہے ہیں اور قیامت تک بنتے رہیں گے۔
- ☆ محبت ہر مقام پر محبوب کو دیکھتا ہے اور اس کے ساتھ رہتا ہے۔
- ☆ غوث قطب اور ابدال سب درجات سے تعلق رکھتے ہیں۔ عاشق درجات والے سے تعلق رکھتے ہیں۔
- ☆ محبت کسی عمل سے نہیں بنتا محبت سے بنتا ہے۔ جو لوگ اربعہ عناصر سے تعلق رکھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب کو بھی اربعہ عناصر کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور جو صاحب محبوب کی عطا کی ہوئی صفت سے دیکھتے ہیں انہیں عشق کی آنکھ عطا ہو جاتی ہے۔ وہ نظر بصیرت سے دیکھتے ہیں۔ جو صاحب نظر بصیرت سے دیکھتے ہیں انہیں اولیٰ صفیں عطا ہو جاتی ہیں۔

- ☆ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو میرا گنہگار ہوگا اسے بخشوں نہ بخشوں یہ میری مرضی ہے اور جو منافق ہے اس کو نہیں بخشوں گا۔ کیونکہ کافر میرا گنہگار ہے اور منافق میرا بھی گنہگار ہے اور میرے محبوب کا بھی گنہگار ہے۔
- ☆ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے محبوب کو ہمیں بھی چاہنا چاہیے تاکہ ہم بھی چاہے جائیں۔

محبت

- ☆ عقیدہ ایک مقام کا نام ہے جو نا صمیمین کی حب سے عطا ہوتا ہے۔
- ☆ محبت صرف محبت سے بنتا ہے اور کسی عمل سے نہیں بنتا۔

ماضی حال اور مستقبل

- ☆ متوکل حال پر حاوی ہوتا ہے۔ غیر متوکل پر حال حاوی ہوتا ہے۔
- ☆ جس ماضی کا حال شاہد نہ ہو اس کی نفی ہو جاتی ہے۔
- ☆ جو حال پر جتنی ہے مستقبل میں بھی وہی جتنی ہوگا کیونکہ اس حال کا مستقبل بننے والا ہے۔
- ☆ بے خبر ماضی کی یاد میں رہتے ہیں اور مستقبل کی تلاش میں رہتے ہیں۔
- ☆ جو حال پر راضی نہیں ہے وہ ماضی کی یاد اور مستقبل کی تلاش میں بے چین رہے گا۔
- ☆ جس کا ماضی پاک ہے وہ انسان ہے۔ جس کا حال محبت ہے وہ صاحب ایقان ہے اور جس کا مستقبل شریعت ہے وہ اہل ایمان ہے۔
- ☆ اللہ کے پیار و اوہ کہتے کیوں ہو جو ابھی تمہارا حال نہیں۔

مشقت

- ☆ اللہ کے حضور سے جو چیز مانگ کر لی جائے اس میں مشقت ہوتی ہے اور جو بن مانگے ملے اس میں مشقت نہیں ہوتی۔
- ☆ مومن کا مستقبل بنا بنایا آتا ہے۔ کافر کا مستقبل تجویزی ہوتا ہے لہذا مومن مشقت سے پاک ہے اور کافر مشقت کو دعوت دیتا ہے۔

پہلے تو خاں صاحب اکیلے باباجی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے لیکن مجھے حیرت میں ڈالنے کے لیے لنگر کے جلوے دکھانے کے لیے ساتھ لے جانے لگے۔ مغرب میں مستعمل ڈیج سسٹم کو تو میں سمجھتی تھی کہ درست کھانے کے بعد اپنا اپنا بل خود ادا کرتے تھے لیکن یہ طریقہ کہ جو آئے وہی پائے میرے لیے مسلک ابراہیمی کا یہ نظام عجیب تھا۔ میں نے خاموشی سے اس کا معائنہ ضرور کیا اور جب خاں صاحب بچوں کو P.W.R. کے سوئنگ پول میں سوئنگ کے بعد لنگر کھلانے کبھی کبھی لے جاتے تو مجھے تعجب نہ ہوتا!

سوال:- اکثر بزرگان دین حاضری دینے والوں کے لیے کھانے پینے کا بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:- یہ شاہدین کی طریقت ہے۔

سوال:- وہ کوئی بات یا حکمت ہے جو کھانے پلانے بغیر لوگوں تک نہیں پہنچ سکتی؟

جواب:- حاضر ہونے والے کو جسمانی خوراک حاصل ہو تو اس کے اندر روحانی خوراک کے حصول کی طلب پیدا ہوتی ہے۔

سوال:- کھلانے پلانے کے اہتمام کا ماخذ کیا ہے؟

جواب:- حکم خداوندی۔

سوال:- کھلانے پلانے کے لیے روپیہ پیسہ کہاں سے آتا ہے؟

جواب:- مخلصین متوکل ہوتے ہیں اور اللہ کے محبوب ہوتے ہیں۔ خزانے اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ قاسم اس کے محبوب ہیں۔

سوال:- عموماً کس قسم کا کھانا تقسیم کرنے کا بزرگان دین اہتمام کرتے ہیں؟

جواب:- بزرگان دین کے ہاں ہر کھانا تقسیم کے لیے ہوتا ہے۔ قاسم چمکتا بھی اس لیے ہے کہ وہ کسی شے کی فی سبیل اللہ

Presentation کا شاہد ہو۔

سوال:- بزرگان دین بیک وقت لوگوں کی ضرورت کے مطابق کھانے پینے کا بندوبست کرتے ہیں۔ اتنا بڑا اہتمام کس

طرح ممکن ہے؟

جواب:- بھیجنے والا عظیم مطلق ہو تو اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ آنے والے کا مقصود اس کی آمد سے پہلے پہنچ چکا

ہے۔

سوال:- بعض اوقات کئی دن بزرگان دین ایک ہی قسم کا کھانا پکا کر تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ اس میں کیا حکمت ہوتی ہے؟

جواب:- اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عطا ہو اس کی قدر کرنا بزرگان دین کی شان ہے۔ مخلصین کی اپنی کوئی پسند نہیں ہوتی

اس لیے اپنی تجویز ہی نہیں ہوتی۔ جو عطا ہو اس کی تقسیم میں تساہل نہ کرنا بزرگان دین کی شان ہے۔

سوال:- کیا کبھی بزرگان دین پر ایسا مقام بھی آتا ہے جب مخلوق خدا کو کھانا پیش کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ اس

وقت وہ کیا کرتے ہیں؟

جواب:- مقصود ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ اگر جلوت میں نہ نظر آئے تو خلوت میں ہوتا ہے۔ وہاں بھی سائل کا مقصود نہ ہو تو

سائل کے پلے میں بندھا ہوتا ہے۔ کھول کر اس کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے۔

سوال:- کھانے کا اہتمام کرتے وقت بزرگان دین کی نیت کیا ہوتی ہے؟

جواب:- اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا مقصود ہوتی ہے۔

سوال:- بزرگان دین خود تو دوسروں کے لیے کھانے پینے کا اہتمام بڑے ذوق شوق سے کرتے ہیں لیکن دوسروں کو اس

ضمن میں کہتے بڑا کم سنا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:- اہتمام کرنا حکم خداوندی ہے۔ اپنے لیے اہتمام کرنے کا حکم نافذ کرنا خواہش کی اتباع ہے اور یہ منع ہے۔

سوال:- بزرگان دین کے نزدیک کھانے پینے کی تعریف کیا ہے؟

جواب:- بزرگان دین کے نزدیک وہی کھانا پینا حلال ہے جو شاہدین کے قرب کا باعث ہو۔

سوال:- کھلانے پلانے کی صفت کا درجہ و مقام کیا ہے اور نیکی کی کن کن صفات پر اسے فوقیت حاصل ہے؟

جواب:- یہ درجہ ربوبیت ہے۔ تمام نیکیاں اسی چشمے سے سیراب ہوں تو زندہ رہتی ہیں۔

سوال:- اکثر بزرگان دین کا زیادہ تر وقت کھانے پینے کے اہتمام پر گزرتا ہے اور باقی امور پر کم وقت دیا جاتا ہے۔ اس

کی کیا وجہ ہے؟

جواب:- سب سے بڑے کام کے لیے سب سے زیادہ وقت ہونا چاہیے۔ یہ دائمی کام ہے باقی وقتی کام ہیں۔

سوال:- اگر بیک وقت دو شخص کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ایک کھانے کی دعوت دے اور دوسرا دعا کے لیے

چلے کو کہے تو وہ کس شخص کے ساتھ جانا پسند کریں گے اور کیوں؟

جواب:- بزرگان دین کی دعا کی حقیقت کسی کا راستہ آسان کرنا ہے۔ کھانے کی دعوت دینے والے کو ساتھ لے کر دعا

کرنے کے لیے چلے جائیں گے۔ دعا کر کے دعا کرانے والے کو ساتھ لے کر دعوت دینے والے کے گھر

آجائیں گے۔

سوال:- قرآن پاک میں چند ایک مقامات پر کھانے پینے کے بارے میں حکم دیا ہے اور باقی چیزوں کے بارے میں

متعدد بار ارشاد فرمایا ہے مثلاً نماز رکوع وغیرہ لیکن بزرگان دین ان کے بارے میں تو لوگوں کو کہتے نہیں اور

کھانے پینے پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ آخر کیوں؟

جواب:- کھانا پینا نفس کو پسند ہوتا ہے کھانا پلانا ناپسند ہوتا ہے کہ یہ خدمت ہے اور خدمت سے نفس بہت بھاگتا ہے۔

اس لیے نفس پر حاکم ہونے کے لیے کھانا پلانا ضروری ہے۔ عبادت کو نفس قبول کر لیتا ہے۔ عہدِ بیت سے گریز

کرتا ہے۔

سوال:- کھانا تقسیم کرتے وقت بعض لوگوں کو دال، بعض کو گوشت اور بعض کو چینی سے روٹی کھانے کو دی جاتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ اس تقسیم پر بعض لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔ کیا اس سے بزرگان دین اور لوگوں کے درمیان دوری کی دیوار کھڑی نہیں ہو جاتی؟

جواب:- طبیب جسمانی کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ کسی کے لیے اس کی بھلائی کی خاطر کسی شے کو منع کر دے۔ اس کی مقرر کردہ حد کا احترام بھی حکم خداوندی ہے۔ بزرگان دین کسی کو اس کی خواہشات کے مطابق نہیں کھلاتے۔ اس کی فلاح کے لیے کھلاتے ہیں اور علم سے کھلاتے ہیں۔ چہ میگوئیاں کی علم کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ جس کو قاسم کے اخلاص اور حسن رفاقت کا علم ہو وہ شک میں کیسے مبتلا ہو سکتا ہے۔ مبتدی کو نفس کی شد سے بچنے کے لیے اپنے مشاہدے کو کسی محبت کے مشاہدے کے تابع رکھنا چاہیے ورنہ بھسلا بیٹھتی ہو جاتا ہے۔

سوال:- کیا بزرگان دین بعض مقررین و جنمیں کے لیے کھانے کا خاص اہتمام بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر کرتے ہیں تو کیوں؟

جواب:- جو اہل اہتمام نہیں کرتے ان کے لیے خاص اہتمام ہوتا ہے۔
سوال:- اکثر بزرگان دین کھانا کھلاتے وقت خود کھانا نہیں کھاتے۔ کیوں؟
جواب:- کسی ایک کے ساتھ ہی کھانا ممکن ہوتا ہے اور پھر کھانے کے بعد اس کے عضم کے لیے وقفہ بھی علم سے ہوتا ہے۔

سوال:- بزرگان دین کی اپنی خوراک کیا ہے اور وہ کیا کھانا پسند کرتے ہیں؟
جواب:- بزرگان دین کی خوراک تجویز سے پاک ہوتی ہے اس لیے اس میں ان کی پسند کو دخل نہیں ہوتا۔ جو عطا ہو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہی پسند کرتے ہیں اور وہی کھاتے ہیں اور کھلاتے ہیں۔

سوال:- کیا بزرگان دین کے دربار میں آنے والے غیر مسلموں، چرند پرند اور حیوانات کے لیے کھانے کا علیحدہ اہتمام کیا جاتا ہے یا نہیں؟ ہاں یا نہ دونوں صورتوں میں حکمت عطا فرمادیں۔

جواب:- ہر آنے والے کو سیراب کیا جاتا ہے اور راضی کیا جاتا ہے۔ باسی روٹی کے بھورے کر کے پرندوں کو ڈالے جاتے ہیں۔ غیر مسلموں کے لیے علیحدہ اہتمام نہیں کیا جاتا کہ اہتمام کا منشا بہر حال ایک ہوتا ہے۔

سوال:- غیر مسلموں کو کھلانے کے لیے کون سے برتن استعمال کیے جاتے ہیں؟

جواب:- برتن مخصوص کر لینا کسی مخصوص مریض کے لیے ہوتا جائز ہے۔

سوال:- عموماً کس قسم کے برتنوں میں بزرگان دین کھانا کھانا پسند کرتے ہیں؟

جواب:- جن کا بدل ہل المصوب اور سستا ہو۔

سوال:- بزرگان دین کو کھانا کھلانے کے لیے کس قسم کا اہتمام کرنا پڑتا ہے؟

جواب:- ایسا اہتمام کرنا پڑتا ہے کہ لوگوں کی پسند رضا الہی کا رخ کرے۔

سوال:- اکثر بزرگان دین خود کھانا تقسیم کرتے ہیں۔ اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب:- جس کا علم پورا ہو اس کی تقسیم پوری ہوتی ہے۔ جو اپنی ذات سے فارغ نہ ہو اس کو قاسم بنانے کے معنی لوگوں کو اذیت دینے کے ہوتے ہیں۔

سوال:- اکثر بزرگان دین خود کھانا پکاتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:- کھانا پکانا یا پکوانا بڑا علم ہے۔ کچ پکا کھانا جسم کو تقویت دیتا ہے۔ جلدی میں پکا یا گیا کھانا جسم کو کمزور کرتا ہے۔

سوال:- بزرگان دین کے دربار میں کچے ہوئے کھانے اور عام شخص کے گھر میں کچے ہوئے کھانے کی لذت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:- پکانے والے کو کھانے والے سے جو تعلق ہوگا اسی سے کھانے کے مرتبے کا تعین ہوگا۔

سوال:- جو راحت بزرگان دین کے دربار میں یا قریب بیٹھ کر کھانے میں ملتی ہے وہ گھر میں نہیں ملتی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:- راحت پاک لوگوں کے قدم سے لگی ہوتی ہے۔ جو قدم بہ قدم ہو جائے اسے ہی حاصل ہوتی ہے۔ دسترخوان خدائی ہومیزبان مخلصین ہوں تو خدائی مہمان کو جو عافیت اور قدر و منزلت ملتی ہے اس کا بدل کہیں بھی نہیں ہو سکتا۔

سوال:- بزرگان دین کھانے پکانے کا علم کہاں سے سیکھتے ہیں؟

جواب:- حال پر نظر رکھنے سے سیکھتے ہیں۔

سوال:- بزرگان دین دوسروں کو کھانے پینے کا علم کس طرح سکھاتے ہیں؟

جواب:- اشیاء کے جسم پر اثرات بتاتے ہیں۔ حصول صحت کے لیے مقدار خوراک بتاتے ہیں۔ ترکیب تیاری بتاتے ہیں۔ پرہیز بتاتے ہیں اور اس طرح لوگوں کو اپنی خواہشات پر حادی ہونے میں مدد دیتے ہیں۔

سوال:- بزرگان دین کے نزدیک کھانے پینے اور کھلانے پلانے کے آداب کیا ہیں؟

جواب:- کھانے پینے کے آداب یہ ہیں کہ جو شاہدین سے عطا ہوا اس کی قدر کی جائے۔ اس کو باعث شفا جانا جائے۔ میزبان کی پسند کا احترام کیا جائے اور تقدیم و تاخیر اسی کی روشنی میں ہو۔

کھلانے پلانے کے آداب یہ ہیں کہ لوگوں کو خواہشات پر حادی ہونے میں مدد دی جائے۔ ان کے لیے بند و بست فی سبیل اللہ ہو اور ان کے ساتھ نرمی و درگھی جائے اور انہیں خوفزدہ ہونے سے بچایا جائے۔

پتہ نہیں کیوں باباجی کے ڈیرے پر خاں صاحب کی گاڑی کا تبادلہ مگی اور انہوں نے نئی رازی صاحب کو بھی اپنی تلاش میں شامل کر لیا۔ نئی رازی صاحب سندھ سے آئے تھے اور نہر کے پار ایک چھوٹا سا ڈیرہ انہوں نے بنا رکھا تھا۔ ان کے ڈیرے کی شکل باباجی کے ڈیرے سے مختلف تھی۔ لنگر یہاں بھی کھلاتے تھے لیکن جو کچھ ان کے مرید گاؤں سے پکا کر لے آتے وہی پیش کر دیتے۔ کچھ نہ ہوتا تو لٹسی چائے مل جاتی۔ یہاں سوال جواب بھی کم کم پوچھے جاتے۔ بس نئی رازی صاحب اپنی سادگی اور ضرورتوں کی کمی سے زندگی کے سفر کو گزارنے کا سبق سکھاتے۔ جس قدر ضرورت کم ہوگی... خواہش کم جائے گی اور خواہش کم ہوگی تو نہ پورا ہونے کے مقام پر مایوسی بھی تھوڑا سا ستائے گی۔ آدمی اللہ کا شاکی اور گلہ گزار نہ رہے گا۔ پہلے وہ نئی رازی صاحب کے مزار پر تنہا جاتے رہے۔ پھر کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جانے لگے۔ وہ یقیناً رازی صاحب کے خاموش فلسفے سے کسی بدھ بھکشو کی طرح متاثر تھے۔

باباجی کے وصال کے بعد یکدم خاں صاحب کی زندگی میں واصف علی واصف آ گئے۔ وہ ایک سکول میں عشاء کی نماز کے بعد لیکچر دیا کرتے تھے۔ بنیادی طور پر شاعر، مقرر اور مفکر تھے۔ خاں صاحب اور انیق بیٹا ان کے پاس قریب ایک ہزار راتیں روحانی سمت نمائی اور رہنمائی کے لیے جاتے رہے۔ ان کے کئی ٹیپ بھی ریکارڈ کیے۔ بہت سارے نوٹ بھی لیے۔ چونکہ اب واصف صاحب کی بہت سی کتابیں شائع ہو گئی ہیں اس لیے ان کی بصیرت اور بصارت کے کوئی اقتباسات پیش نہیں کر رہی۔

چلتے چلاتے ہوتے ہواتے خاں صاحب بابا عرفان الحق سے ملے۔ یہ بینک سے گولڈن ہینڈ شیک لے کر جہلم میں ڈیرہ کھولے ہوئے تھے۔ یہاں ان سے ملنے کے لیے ان کے سیکرٹری ظفر صاحب سے وقت مقرر کرنا پڑتا۔ ڈیرہ گھر سے علیحدہ اور تعلیم یافتہ مینکر کی طرح بڑا منظم تھا۔ لنگر کی روایت یہاں بھی موجود تھی۔ دوسرے شہر سے آئے مسافروں کے طعام کے علاوہ قیام کا انتظام بھی تھا۔ خاں صاحب اشیر کے ہمراہ جہلم جایا کرتے تھے جہاں خاں صاحب کے سوالات پھر کناراہ تلاش کرتے رہے۔

ان کا نام خاں صاحب بہت احترام سے لیتے تھے اور جب عرفان صاحب لاہور میں لیکچر دیتے تو خاں صاحب یہ لیکچر سننے جاتے۔ یہ عہد میری بیماریوں کا دور تھا۔ اس لیے نہ تو مجھے جہلم جانے کا اتفاق ہوا نہ لاہور میں ان کے روحانی لیکچروں کا۔ ان ہی دنوں پروفیسر رفیق اختر کا چرچا گھر میں ہونے لگا۔ وہ بنیادی طور پر پروفیسر تھے اس لیے لیکچر دینا ان کا بائیں ہاتھ کا فن تھا۔ ان سے میری ملاقات صرف ایک بار اسلام آباد میں مفتی جی کی بیٹی سوریہ کے گھر پر ہوئی۔ لنگر کا انتظام سوریہ نے کر رکھا تھا اور اس کا شوہر مقبول جو ایک یونی بینک میں اچھے اونچے عہدے پر تھا خدمت گزار کی ڈیوٹی بجالا رہا تھا۔

ان دنوں شاید خاں صاحب عورت کے متعلق کچھ تصور پال چکے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ عورت اللہ کے راستے پر نہیں جاسکتی اس کے لیے چادر اور چادر یواری اصل قلعہ ہے۔ مجھے کبھی انہوں نے یہ بات اعلانیہ نہ کی لیکن اب مجھے وہ گھر سے باہر زیادہ رابطے بنانے پر بھی نہا کساتے تھے اس لیے رفیق اختر صاحب سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔

ان مہمن گھیریوں میں وہ رنگ رنگ کے صوفیوں کے تعاقب میں بھی رہے۔ وہ مجھ سے بابا رتن ٹھنڈا کے فقیر کی باتیں بڑی دلچسپی سے بتایا کرتے تھے۔ حاجی رتن کا مزار تحصیل پیالہ میں ٹھنڈا کے اسٹیشن سے تین میل دور گوند گڑھ کے ریلوے اسٹیشن سے تین میل دور ہے۔ اس فقیر کے ساتھ کی معجزے وابستہ ہیں۔ انہیں جب کشف ہوا کہ عرب میں وہ نبی آچکا ہے جس کا نام محمد ہے اور جس کا معجزہ شش القمر ہے وہ فوراً ٹھنڈا سے چل پڑے اور مکہ شریف پہنچے اور نبی کی خدمت میں پورے تین سال رہے اور وہیں مسلمان ہوئے۔ ہندو تو اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ رتن ناتھ جو ہاں راجپوت تھے اور وہ آخری وقت تک ہندو رہے اسی لیے انہوں نے بابا رتن ناتھ کے قریب ہی ان کی سادھی تیار کر لی۔

روایت یہ بھی کہتی ہے کہ بابا رتن نے سات سو سال عمر پائی اور اپنا فیض بانٹتے رہے۔ جب شہاب الدین غوری نے ان کے معجزات کے متعلق سنا تو دنیاوی بادشاہ کشاں کشاں روحانی تاجدار کے ہاں پہنچا۔ بابا رتن کے ہاتھ میں پانی کا آخری گلاس تھا۔ پیاسے بادشاہ نے پانی کا سوال کیا۔ سنا جاتا ہے کہ اس گلاس کے اندر بابا رتن نے اپنا ہاتھ ڈالا اور شہاب الدین غوری کو پیش کر دیا۔ بادشاہ نے پہلے اپنی پیاس بجھائی پھر اس کے سارے پیاسے لشکر نے اسی گلاس سے پانی پیا اور خوب سیر ہو کر پیا۔ بادشاہ نے عرض کی کہ ”میں آپ سے فتح کی استدعا کرتے آیا ہوں۔ دعا فرمائیے میں پر تھوڑی راج کو ہرا سکوں۔“

حاجی رتن نے کہا ”ایسا ہی ہوگا لیکن تمہیں اپنے لشکر میں ایسے دوست تلاش کرنے ہیں جن کی نظر کرم سے دشمن کے تمام خیمے گر جائیں گے لیکن تمہاری فوج کے خیموں کو کچھ نہیں ہوگا۔“ جب بادشاہ نے سید تلاش کر لیے تو ان کو حاجی رتن کی بات بتائی۔ سید حضرات بولے ہو جائے گا لیکن ہم دونوں زندہ نہیں بچیں گے۔ عین جنگ کے روز پانسہ پلٹا۔ دشمن کے تمام خیمے ڈھے گئے لیکن دونوں سید بادشاہ بھی حاجی رتن کی پیش گوئی کے مطابق ختم ہو گئے۔

جس طرح حیرت سے خاں صاحب مجھے بابا رتن ناتھ کی باتیں بیان کرتے تھے میں اس طرح تو ان کا ذکر پیش نہیں کر سکتی اس لیے میں وہ لٹریچر آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ اب آپ اسے صوفی رتن سمجھیں یا سادھو رتن یہ آپ کی مرضی ہے۔

حاجی رتن کی روایت برصغیر میں کچھ نئی نہیں۔ یہ اس وقت سے موجود ہے جب محمد بن قاسم نے دہلی میں قدم رکھا۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے متصادم بھی تھے اور ایک دوسرے کے متحرف بھی۔ دوائے مختلف النوع گردہ جن کی اپنی اپنی روایات اس قدر مضبوط تھیں ان کے لیے مشکل تھا کہ وہ ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں اور جداگانہ حیثیت کو بھول جائیں۔ اس مقام پر صوفیاء نے سادھو سنتوں نے برصغیر کو لبرل ہونے کی جو تعلیم دی اس کا لب لباب مولانا اشرف نے کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ”اپنا مسلک چھوڑ نہیں کسی کا مسلک چھیڑ نہیں۔“ بابا رتن ناتھ کی روایت

سارے صوفیائے مزاروں پر پائی جاتی ہے۔ ذیروں پر ہندو ماننے والے سادھوؤں کے حضور مسلمان عقیدت مند ہمیشہ نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی خاں صاحب کی کردہ انہیں جگہ جگہ بھانکنے پر آکسانی۔ ایک خط جو ان کے کاغذات سے برآمد ہوا ہے، کرپال سنگھ نارنگ کا امرتسر سے آیا تھا۔ رادھا سواہی سنگ کا ایک خاص طریق نام کی بخشش تھی اور مرشد کا ست سنگ بھنڈارہ سے تین دن پہلے شروع ہو جاتا تھا۔ جو لوگ نام دان کے خواہشمند ہوتے تھے عموماً بھنڈارہ سے تین دن پہلے سے حاضری دینا شروع کر دیتے۔ اس خط کی زبان و بیان آپ پر یہ بات واضح کرے گی کہ برصغیر کی صلح جو فضا کو کن حضرات نے پروان چڑھایا۔ کرپال سنگھ کا خط ملاحظہ کیجئے۔

پیارے بھائی اشفاق احمد صاحب

تقسیمات! آپ کا خط مورخہ 13 اپریل موصول ہوا۔ ہمارے لیے جانے مسرت ہے کہ ہماری ارمال کردہ کتب کے مطالعہ سے آپ کو بہت سے سوالوں کے جواب مل گئے ہیں اور کافی حد تک آپ کے شکوک رفع ہو گئے ہیں۔ نام دان کے لیے ایسے اشخاص درخواست کر سکتے ہیں جنہوں نے اس سے پیشتر کم از کم چھ ماہ تک شراب نوشی سے پرہیز کے علاوہ ہنریاتی خوراک پر زندگی بسر کی ہو۔ ہنریاتی خوراک میں گوشت، مچھلی انڈے سے قطعی پرہیز لازم مانا جاتا ہے۔ بیعت ہو چکے شخص کے لیے تمام زندگی پرہیز لازمی ہے۔ دیگر ضروری شرائط یہ ہیں کہ وہ پاک ازدواجی زندگی بسر کرے اور حق حلال کی کمائی پر گزارہ کرے۔ کلمہ یا نام کی عبادت و ریاضت کے لیے عموماً دن رات کا دسواں حصہ (اڑھائی گھنٹہ) روزانہ وقت دینے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اس سے زیادہ وقت دینا ممکن ہو سکے تو اور بھی اچھا ہے۔

نام کی بخشش کے لیے دوران سال سات روحانی اجتماع ہوتے ہیں جن کو بھنڈارہ سے کہا جاتا ہے۔ ان کی مخصوص تاریخیں یادیں یہ ہیں:

الف:- فروری/مئی جولائی/ستمبر اور اکتوبر مہینوں کے آخری اتوار

ب:- 12 اپریل اور 29 دسمبر (مستقل تاریخیں)

نام کی بخشش بھنڈارہ کے اگلے دن سے شروع ہوتی ہے اور اس کا حصول کل مالک کے مہر و کرم پر مبنی ہے جو مرشد کی معرفت عمل پذیر ہوتا ہے۔ مرشد عالی کا ست سنگ عموماً بھنڈارہ سے تین روز پہلے شروع ہو جاتا ہے۔ نام دان کے خواہشمند کے لیے یہ فائدہ مند رہتا ہے کہ وہ مرشد عالی کے چاروں ست سنگ سے تاکہ یہ روحانی فلسفہ جسے اُس نے زندگی میں اپنانا ہے اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے اور شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔

یہ سمجھ لینا بہت ضروری ہے کہ درویشوں یا سنسٹوں کا یہ طریق جو رادھا سواہی طریق کہا جاتا ہے، کوئی الگ مذہب یا فرقہ نہیں ہے۔ یہ ایک طریق عبادت ہے جو خود آگاہی اور خدا آگاہی کے لیے محض ایک فلسفہ ہی نہیں، عملی سائنس بھی ہے لیکن یہ انسانی نسل کی مجبوری سمجھیں یا بد قسمتی کہ ہم ہر اچھے فلسفہ پر لیبل چسپاں کرنے کے عادی ہو گئے ہیں جس کے نتیجے کے طور پر اسے تنگ دائرہ میں محدود کر دیتے ہیں اور ان دائروں کی قید و بند میں پڑ کر، محض ناموں کی آڑ لے کر تنگ نظری اور باہمی دشمنی کا شکار ہو جاتے ہیں ناموں کی تہ میں چھپی حقیقت کو دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ (جسے دکھانے کا مجاز

فقط مرشد کامل ہی ہوتا ہے)۔

یہ ہر ایک منظم و معین مذہبی جماعت (Organised and institutional religion) کا حال ہے جو

ابتداء میں ہر ایک مذہب اس نقص سے بری تھا اور ایک خالص طریق عبادت کی صورت میں رائج ہوا تھا۔

مندرجہ بالا حالات کے پیش نظر بلا شک اس راہ پر چلنے والے کو کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس طریق

میں عبادت سے متعلقہ شرعی رسوم رواجوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ البتہ معاشرتی رواجوں (Social Customs)

میں کوئی دخل نہیں دیا جاتا۔ یہ قطعی طور پر رواج عشق ہے جس میں خدا اور اُس کے بندہ کا سیدھا تعلق ہے۔ عشق کوئی بندھن تسلیم

نہیں کرتا۔ اس نکتہ کو جیسا کہ آپ کے خط سے ظاہر ہے آپ نے بخوبی سمجھ لیا ہے۔ شریعت کے پہلو کو نظر انداز کرنے سے

کئی اشخاص کو جھجکاؤ محسوس ہوتا ہے لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ جب معمولی دنیاوی چیزوں کے حصول کے لیے اُن

کے مطابق کم و بیش قیمت ادا کرنی پڑتی ہے تو خیال کرنا چاہیے کہ جو خداوند کریم دنیا کے اس بے ہمال و متاع کا مالک ہے

اُسے پانے کے لیے کس قدر قیمت ادا کرنی ضروری ہے۔ زمانہ ماضی میں بادشاہوں نے اُسے پانے کے لیے اپنی سلطنتیں

ترک کر دیں۔ اُس کے عشق میں متوالے لوگوں نے اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ سچا قدر دان اس کے لیے بڑی سے

بڑی قیمت بھی بیچ سمجھتا ہے اور بعد خوشی اسے قابل ادا نیگی سمجھتا ہے۔

آپ نے آخر میں سوال کیا ہے کہ کیا باطن کا مسافر خوفناک شعلوں میں گھری اس دنیا کی بھی کوئی مدد کر سکتا

ہے؟ جواب بالکل عیاں ہے۔ اس راہ کا ہر تنہا پیروکار ایک بہتر انسان بن جاتا ہے جو بنیادی طور پر ایک بہتر دنیا کی تعمیر

کے لیے ضروری ہے۔ جتنے بھی مذہب ہیں اُن کے عظیم راہبروں نے اپنی شخصی زندگی کی مثال پیش کر کے دنیا کو بدل دیا اور

اوپر اوتارہات میں جکڑے لوگوں میں زندگی کی نئی لہرواں کر دی لیکن اُن کے جانے کے بعد لوگوں نے اصلیت کو بھلا دیا

اور پھر گمراہ ہو گئے۔ دل و جان سے اس راہ پر چل کر عملی زندگی بنانے والا شخص ایک متناطبی شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ اس

کی صحبت کرنے والے شخص پر اُس کے باطن سے نکلنے والی روحانی توانیں (Spiritual Vibrations) اثر انداز ہوتی

ہیں اور اُسے ایک نیا انسان بننے میں مدد دیتی ہیں۔ ایسا شخص بھلے ہی خاموش رہے اُس کی محض موجودگی اثر پذیر ہوتی ہے

بمصدق فارسی کے اس قول کے:

خاموشی معنی دارد کرد گفتن نمی آند

ایسا شخص ہر فرد بشر سے بے لوث پیار کرتا ہے اور عالمی یکسانیت کا علمبردار بن جاتا ہے۔ اس طرز زندگی میں

اُس کے اخلاق میں سب سے پہلے سدھار ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی درویش اور فقرائے ہمیں بتاتے ہیں کہ اس دنیا کا

مکمل سدھار کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ بنیادی طور پر اس کی ہستی میں برائی کا خمیر گوندھا گیا ہے جو نیکی اور بدی کی بچ اور جھوٹ

پیاد اور نفرت وغیرہ مثبت اور منفی کی دوئی کی صورت میں کارگر ہو کر اس کا وجود قائم رکھ رہا ہے۔ وقتاً فوقتاً دنیا میں بڑی بڑی

روحانی شخصیتیں آتی رہی ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی عظیم راہبر سوائے کچھ محدود لوگوں کے دنیا کو راہ راست پر نہیں لاسکا

اسی لیے سب مذہبی کتب میں یہ بات کہی گئی ہے کہ وہی انسان حقیقت سے شناسا ہو سکتا ہے جس کا ایسا ہونا اللہ کے رحم و کرم

been inconsistent with their theological teachings and conceptions. And if the new religion as preached by the theologians condemned it altogether, the masses of its professors at least did not part with this inheritance, that formed a strong connecting link with their past, although in the course of many centuries it very often shrank into a heap of now meaningless traditions and observances.

However hostile the official relations were between the various religious systems that shared between themselves the masses of the worshippers in the land, the worship of the saints formed a bond of union between the otherwise hostile groups. Partly because this worship was felt to have once been the common property of all, but also because those who acquired the reputation of a saint gained it through a mode of life-real or imaginary-that conformed with the moral ideals of each of the contending creeds and made them therefore likely in the eyes of all to be powerful intercessors at the throne of God, the saints found, followers in all the camps. Thus it is not rare in Western Asia or Northern Africa that the tomb of one saint is visited by Christians, Jews and Moslems, just as in India both Hindus and Moslems make pilgrimages to the same shrine. In India of course Islam having remained in the minority against the overwhelming majority of Hinduism, it does not stand in the same relation, that of the principal heir, to Hinduism, which it maintains in more western countries with regard to other creeds⁽¹⁾. As Islam and Indian religions have been in existence side by side for centuries, the process, especially amongst the lower strata of society, was more one of mutual giving and taking. The number of saints, whose tombs attract both Hindu and Muhammadan pilgrims, is very large especially in the Punjab, and the saint to whom this paper is devoted is one of them; he is an indigenous Indian saint, but one of the few whose fame has spread far beyond

کے ذریعہ مقصود ہے۔ اس لیے حقیقت کے متلاشی کو بغیر دنیا کی زیادہ پرواہ کیے اپنی نجات کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے بعد وہ دوسرے لوگوں کو بھی نجات کی راہ دکھانے میں اپنا رول ادا کر سکتا ہے اور اس طرح اپنے اس دائرہ میں ایک حد تک دنیا کی بھلائی کر سکتا ہے جیسے کہ دوسرے روحانی راہبر کرتے رہے ہیں۔ خود آگاہی کے لیے کوشاں ہونا خود غرضی ہرگز نہیں ہے کیونکہ اگر کوئی دنیا کی بھلائی کرنا چاہتا ہے تو پہلے اس کا خود بھلا بننا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص بیماروں کا علاج کرنا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ پہلے وہ خود ڈاکٹر بنے۔

آپ کا خط مرشد عالی کی خدمت میں پیش کر دیا گیا تھا اور جواب بھی ان کی زیر ہدایت لکھا گیا ہے۔
پُر خلوص محبت اور نیک تمناؤں کے ساتھ۔

آپ کا بھائی
کرپال سنگھ نارنگ

Baba Ratan, the Saint of Bhatinda.

J. Horovitz, Ph.D.

[Paper read-October 5th, 1911].

There is no history without legend and particularly there is no history of a saint without his legends. In so far as the psychological conditions are the same in men inhabiting the various parts of the globe, the data of hagiology are identical or similar in many respects, whatever their origin may be geographically; but very frequently the similarity is due also to a survival of identical ancient traditions or borrowing from a neighbouring creed. Wherever rationalism has not as yet destroyed the creative power of primitive popular imagination, legends of saints are still springing into existence daily and growing; but even where the creative power has been checked by destructive tendencies, the retentive organs of popular belief have at least very often successfully withstood these influences and been able to protect the creation of a former period from falling into oblivion or discredit. Willingly or unwillingly the great religious systems that inherited the realm of their more primitive predecessors have had to extend this protection to the legacy of heroic and mythological lore in not a few cases, however much it may have

Ratan a saint. But it contains an unmistakable reference to an historical event, viz. the conquest of the Fort of Tabarhind by Muhammad Ibn Sam, better known as Shihabuddin Ghori, an event described by contemporary authors such as Minhajud-din in his *Tabaqat-i-Nasiri* ⁽³⁾ which took place in 587 H. Now Tabarhind is the ancient name of Bhatinda ⁽⁴⁾, and we shall see later on that according to other accounts also Baba Ratan lived at Tarbinda (Tabarhind). If Cunningham's short version is lacking in the miraculous, ⁽⁵⁾ this cannot be said of a more detailed form of the popular version of the legend still current at the shrine of Bhatinda, which came to my knowledge in 1911. Baba Ratan-so the story goes-belonged to the class of Chauhan Rajputs. His knowledge of astrology told him that a prophet called Muhammad would be born in Arabia, who would spread the religion of Islam. In order to be favoured with the sight of the Prophet he practised the art of restraining the breath, and after the Prophet had performed the miracle of splitting the moon in two, a miracle witnessed by Ratan, ⁽⁶⁾ he set out to Arabia in order to meet him. In Mecca he embraced Islam and lived with the Prophet for thirty years, so that he was numbered among his "ashab" or companions. Later on he returned to India by order of the Prophet and stayed at the place where his shrine is now and devoted himself further to the practice of restraining his breath. When Shihabuddin Ghori proceeded towards Bhatinda to fight Prithivi Raj, he went to pay a visit to the Hajji. During this visit the King asked for some water to drink; the saint had only a jug of water with him, but by putting his hand into it, was able to quench the thirst of the King and all his followers, without the water in the jug diminishing. ⁽⁷⁾ When the King saw that he was endowed with the power of working miracles, he asked him to pray for the conquest of the fort of Bhatinda, whereupon the saint replied, that the fort would be conquered by the help of two Sayyids, who belonged to his

the confines of India over almost the whole territory of Islam.

Hajji Ratan's shrine is situated three miles from Bhatinda railway station in the Govindgarh tahsil of Patiala State; it is a large building in the Pathan style with a mosque and a gateway and surrounded by a wall on all sides. On the back wall of the shrine a few inscriptions are visible, which however are of no particular importance. The earliest of them is dated 1005 H. and they all refer to repairs made in the shrine. The annual fair (*'urs*) is held from the 7th to the 10th Dhul-Hijja and is attended by both Hindus and Muhammadans from Ferozpur, Alwar, Rawalpindi and Bikaner. Amongst the visitors there is also a large sprinkling of Sadhus. A number of documents are preserved at the shrine, which throw some light on its later history and will be dealt with further on. They do not teach us anything about Hajji Ratan himself, for whose legend we have to rely on the accounts that are still current with the people at Bhatinda and other places; but apart from these there is also a literary tradition extant, that can be gathered from various Arabic, Persian and even Turkish sources. We have a Muhammadan as well as a Hindu version of his story, and both these are also represented in the literary tradition. The earliest version accessible to us of the legend as told locally is the one recorded by General Cunningham in 1883 ⁽²⁾. According to this version Ratan's name was originally Chaukar, which he changed into the one by which he is now known at the time of his conversion to Islam. This happened at the time of Shihabuddin Ghori's invasion, at which he as the minister of Raja Vena Pal connived, rendering the Moslems every assistance in their entry into the fort and putting his master with his family to the sword. He afterwards performed the pilgrimage to Mecca and was henceforth called Hajji Ratan. The story as told by Cunningham does not include any miraculous element, and there is little in it which would justify calling Hajji

Bhatinda. Hajji Rattan, it asserts, was really a Hindu whose name was Ratan Nath. He was a Sadhu of the Nath clan and the Darshana branch,⁽⁹⁾ who had the power of performing miracles. He had travelled to many places and had even visited the Ka'ba where no Hindu is admitted. In Mecca Ratan Nath manifested his miraculous powers and thus gained the respect and confidence of the Muhammadans. He then came to Bhatinda and stayed at the place where his tomb is now, for the rest of his life. When Mahmud of Ghazna came to Bhatinda, he managed to provide drinking water for the whole of his army from his *tunbi*. As he was a Nath he was buried after he had died and his *samadh* was built. Both Hindus and Muhammadans had faith in his superhuman powers, and the latter replaced the *samadh* by a *khanqah* and instead of calling him Nath called him Hajji because he had been to Mecca.

This Hindu version agrees with the Muhammadan in so far as it makes the saint visit Mecca and also makes him perform the water-miracle, which however took place in Mahmud's, not in Shihabuddin's time. It maintains that he remained a Hindu and knows nothing of his meeting the Prophet.

All these versions, both Hindu and Muhammadan, come from Bhatinda, but Baba Ratan's fame is not confined to the place in which he is buried. That he is not a stranger in Punjabi folklore outside Bhatinda we see from the very remarkable part he plays in the legend of Guga, of which Sir Richard Temple has published a very interesting version.⁽¹⁰⁾ The passage to which I refer occurs towards the end of the story. Two cousins of Guga try to kill him in the forest, but he is invulnerable and kills them both. He then brings the two heads to his mother Queen Bachhal, and here my quotation from the published text begins :

Guga :--- "Look at it, recognize it, mother mine, and delay not ;

I stand before thee with joined hands, receive my greeting." She saw it

army. The sign by which he would be able to recognize them would be that the storm that would throw down all the other tents in the camp would not hurt their tents, in which they would be found reading the Quran. When the King had found the two Sayyids, they declared themselves ready to undertake the task in which however, they foretold, they would lose their lives. The fort was conquered and the two Sayyids fell as martyrs ; their tombs are to be found to the north of Baba Ratan's shrine. Ratan himself died not much later at the age of seven hundred years.⁽⁸⁾

This version of the legend then agrees with the one quoted before, that Baba Ratan was instrumental in bringing about the fall of the fort. He is however not the minister of the King, but a Muhammadan saint and therefore a natural ally of the Muhammadan invader. The stain of treachery towards his master is thus removed from him, and if we could be sure about the chronological order of the two versions, we should be inclined to say that this change was due to a higher moral conception of sanctity. The episode of the two Sayyids looks very much like an etiological element, invented in order to explain the origin of the two tombs, of whose real history nothing was remembered.

A third version, also received from Bhatinda, looks in some respects like an attempt to reconcile the two versions quoted: according to it Baba Ratan " came from Medina to Bhatinda in 668 Samvat which corresponds to 24 A.H. and became the prime minister of Raja Vena Pal; later on he turned a Faqir and went to Mecca on pilgrimage." Here Raja Vena Pal, who in the first version is defeated by Shihabuddin Ghorî, turns out to be a contemporary of the Prophet, or at least is supposed to have lived not much later than the Prophet.

Very different from this sounds the Hindu version, also still current at

As I mourn for these twins so mayest thou know sorrow ? ' My mother cursed me, who shall put it aside ? "

Mother Earth:- " My son, go quickly : I have shown thee. Go now, my son, and worship in Ajmere. My son, go now and worship, make no delays. He (the saint) is as full of honour as Khwaja Khizar : go to him. Say nothing (false) with thy lips : tell him the whole tale. Thy hope will be fulfilled ; repeat the creed and come."

Guga :- " O mother, thy true words have entered into my heart. I will go now in a minute : the fears of my heart have departed. I will make ready to go at once. I will go onwards to Ajmere and my hope will be fulfilled."

When he saw Ratan Hajji and Khwaja Khizar he stood before them with joint hands and said :

" Hear ye my words. Many days have I waited to see you. Teach me the creed ! Alas ! my mother's words have slain me."

Ratan Hajji :- " My friend, who art thou ? Why is thy mind upset? What is thy name ? Tell me the truth."

Song :- Tell me the truth, friend;

Why dost make such delay ?

What is thy name and caste ?

What misfortune hath encompassed thee ?

NOTES

(1) Two very excellent monographs have lately been published on Christian hagiology, the one by Pêre Delchaye, *Les légendes hagiographiques*, 2nd edition, Brussels, 1906), the other by Professor Guenter (Die Christliche Legende des Abendlandes, Heidelberg, 1910) both of which contain also frequent references to legends of other religions, but curiously enough no reference has been made in any of them to Muhammadan hagiology, a subject which has received a masterly treatment at the hands of Professor Goldziher in the second volume of his *Muhammedanische Studien* (pp. 275-378).

and began to weep as soon as she recognized it.

In her grief she fell on the ground, nor did any life remain in her body.

Nor did any life remain in her body.

Queen Bachhal :--- " Ah, my son , what wickedness have you done ?

Why did you stretch your hands to slay a wretched sinner ?

Such a crime as you have committed my eyes cannot bear !

See me no more, nor let me see you again."

Guga:- "O mother, I tell thee, know the truth in thy heart!

Thou spakest the word; it goes not back; we are the sport of the Guru.

We are the sport of the Guru, mother; thou hast spoken the word.

Know me for a Rajput warrior, it is law to me. Bhagwan is my witness that I will never see thee again. May I live seven lives in hell if I disobey the command of my father- and mother !

With joined hands I pray thee, O mother Earth! Take me into thyself, or else I will kill myself now! Or else I will take my own life now. I have no friend in the world. I beseech thee, for death hath encompassed me. Delay not, but take me to-day. I have thrice vowed that I will see my mother no more. If thou will take the curse on thee, I will go whither thou sendest me. Tell it me and I will fetch and bring it thee."

Mother Earth:- " Ay, my son, I tell thee how is it that thou dost not know ? Musalmans are buried below, Hindus go to the pyre, my son, I tell thee. Go to Ratan Hajji and learn the Musalman's creed. When thou hast done this I will take thee to myself. Siriyal, Raja Sanja's child (the mother of the two killed) will curse me."

Guga :- " My mother spoke most wicked words to me! How can I tell them thee ? Hear, mother Earth! Hear, mother Earth, why dost thou always put me off! She said : The curse of Guru Gorak Nath be upon thee if thou return!

خاں صاحب حق کی تلاش میں بڑی تحقیق کرنے والے تھے۔ یہ تو نہیں بتایا جاسکتا کہ اس تحقیق کے نتائج میں وہ کسی حتمی فیصلے پر پہنچے کہ نہیں لیکن اتنی بات ضرور ان کے رویے سے نظر آتی تھی کہ وہ سوئی کوریت میں سے تلاش کر رہے ہیں۔

اس کا رگداری کے دوران ان کی نظر دُور دُور کے ممالک اور رنگ رنگ کے مسلمانوں کی چھان بین میں لگی رہی۔ امریکہ نیا ملک ہے اور سیکولر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ خاں صاحب کو بڑی حیرت ہوئی جب انہیں بادامی الدین کا سراغ لگ گیا لیکن ان کے مزار تک رسائی انیق بیٹے کی وساطت سے ہوئی۔ دوسری مرتبہ جب ہم نوکی اور غزل سے ملنے امریکہ گئے تو ایئر پورٹ پر انیق نے ہم سے کہا ”ابو! میں آپ کو میری لینڈ بعد میں لے جاؤں گا پہلے بادامی الدین کے مزار پر حاضر ہو جائیں گے۔ نیویارک سے ہٹا دو کے مزار پر پہنچے تو یہاں عجیب سا دیکھا۔ امریکی مرد عورتیں باورچی خانے میں لنگر کے برتن دھو رہے تھے۔ کچھ ڈیرے پر جھاڑو پھیرنے میں مشغول تھے۔ کچھ سنگ مرمر کے مزار کو چکانے، صیقل کرنے میں مشغول تھے۔

”بابا جی سری لنکا سے آئے تھے۔ اب انہیں انگریزی کا ایک لفظ نہیں آتا تھا۔ وہ کیا کرتے تھے کہ اگر ”میں“ کے حوالے سے بات نہ کی جائے تو اللہ کی بات کسی زبان میں کی جائے دل تک پہنچ جاتی ہے۔ مزار ان کے مریدین نے بنایا۔ دُور دُور سے لوگ یہاں حاضری دیتے آتے تھے۔ بابا جی ہمیشہ تامل میں بات کرتے اور سننے والوں تک یہ بات پہنچ جاتی۔“

ہم نے مزار کو تحیر سے دیکھا۔ انیق نے ہمارے لیے جولوٹر پیر جمع کیا وہ حاضر خدمت ہے۔ آپ میں سے جو کبھی امریکہ جائے اور بادامی الدین سے مزید واقفیت کرنا چاہے اُسے اس مزار کا راستہ مل جائے گا۔

Muhammad Raheem Bawa Muhaiyaddeen was a revered Sufi saint from the island of Sri Lanka who for more than fifty years selflessly shared his knowledge and experience with people of every race and religion and from all parts of the world. He first came to the United States in 1971 and established the Bawa Muhaiyaddeen Fellowship of North America in Philadelphia. Since

(2) *Archaeological Survey of India*, vol. xxii, p. 5 seq.

(3) Ed. Calcutta, p. 118; see Raverty's notes in his translation, pp. 457 seq. and 460 seq.

(4) See Raverty l. c.

(5) See also the version given in the Patiala State Gazetteer.

(6) Similarly the King of Malabar embraced Islam when he heard of this miracle. See Arnold, *Preaching of Islam*, p. 217; and also the Raja of Kanauj's conversion, that forms the subject of a Mathnawi, formerly much recited, was brought about through the same miracle. This Raja must be identical with Sarbatak, the King of Kanauj, who accepted the Prophet's invitation to embrace Islam. Ibn Hajar, *Isaba*, ii, p. 354.

(7) This type of miracle, so common in Jewish and Christian legend, is also well represented in Islamic hagiology; the earliest biographies of the Prophet contain instances of it. See e.g. Ibn Hisham ed. Wuestenfeld, pp. 671-2.

(8) I am indebted for this version to Ghulam Qadir, photographer in the Archaeological Department, who visited Bhatinda in September 1911. Another account of the Muhammadan version was very kindly supplied through the Khan Zulfiqar 'Ali Khan of Maler Kotla. It agrees with the one quoted above in all the essential parts, although it adds some details. Thus e.g. we are told, that Hajji Ratan after having embraced Islam at Mecca, became minister of the King of Islambul (= Stambul), but later on left his post and returned to Bhatinda.

(9) See Ibbetson, *Census Report*, 1883, p. 286; MacLagan, *Census Report*, 1891, p. 115.

(10) Vol. I, p. 203 seq. On Guga see also MacLagan, *Census Report*, p. 104;

THE PURPOSE OF THE FELLOWSHIP

When asked What is this Fellowship, Bawa Muhaiyaddeen answered:

"God has given His kingdom to all His creations, so that each can live in freedom. All the animals in the jungle, all the creations in the ocean, and all the birds in the sky live in freedom. The sun, the moon, and the stars live in freedom where they are positioned. Man alone lives having lost his freedom because of his selfishness, his desires, his greed; his arrogance, and his pride; because of his trickery and treachery; and because of the separation of 'you' and 'I'.

To man who has lost his freedom the Fellowship says, "All other lives live in freedom. O man, why not you? Why do you seize the freedom of other lives? God has given you a kingdom of freedom. Realize this, O man. Give up your selfishness. Give up your jealousy. Give up your ignorance. Imbibe wisdom and live like a true human being so that all mankind can live as one life. Then this place in which we live can be changed into heaven, into the kingdom of God. Mankind should resolve to live in this state."

The Fellowship says,

"Act with the qualities of God, and live in the state of God's peacefulness. Show the compassion of God to all lives, so that all lives can live in freedom and unity. We must all live in the state of love, compassion, freedom and equality, regarding all lives as one life."

"O man, you have been born beautiful. God has given you a beautiful heart. God has given you a connection to Him. Your life is within Him, and He lives within you as your life. Your secret is within God and God's secret is within you, O man."

"To all lives you should be a representative, a king, and a friend. God has given you abilities by which you can protect others. O man, having

then branches have spread throughout the United States and Canada, as well as in Sri Lanka, Australia and the U.K.

Further Information:

- What is the Purpose of the Fellowship?
- History
- The Founder
- Come for a Visit
- Branches Around the World
- Schedule of Activities
- Fellowship Calendar of Events
- Online Membership Form
- Fellowship Website E-mail Newsletter
- Fellowship Guestbook

The Fellowship serves as a "pond" where individuals can gather to contemplate the truth and unity of God. Outwardly, this is done by studying the teachings and example of M. R. Bawa Muhaiyaddeen through the countless hours of audio and video cassettes of his discourses, many of which have also been compiled into books. Inwardly, this is done by slowly cleansing oneself through prayer and by bringing these teachings into one's daily actions.

For more information about these and other activities email, write or call:

The Bawa Muhaiyaddeen Fellowship

5820 Overbrook Avenue Philadelphia, PA 19131-1221, USA

Phone: 215-879-6300 (24 hour answering machine)

Fax: 215-879-6307

M. R. Bawa Muhaiyaddeen is no longer physically with us. He passed away December 8, 1986. However, the real essence of M. R. Bawa Muhaiyaddeen is alive and very well. To find a teacher who is a true and absolutely pure guide is to find the rarest of the rare, one who is completely surrendered to God's qualities, one in whom there is no gap between what he is and what he says, one who is the truth about which he speaks. To find such a one is to find a pure mirror through whom we can see and be transformed into our true selves. Such a perfect Guide lives in his connection to God throughout all time. This connection is never born and can never die. This connection is the Sheikh and the teachings of God's Truth.

The living presence of M. R. Bawa Muhaiyaddeen is very much here and at his resting place at the Fellowship Cemetery which is about an hour outside the city. In Philadelphia there are thousands of video and audio tapes which can be helpful to one's growth. And also there is the loving support of the Fellowship family. The people who are here now had years of close personal access to M. R. Bawa Muhaiyaddeen--formally during the discourses which were open to the public, and informally during the numerous spontaneous song or question and answer sessions, during cooking, farming, construction, or just relaxed chatting of the "children" with the Father of their Wisdom.

ABOUT THE FELLOWSHIP > VISITORS ARE WELCOME

All who seek the Truth are welcome to come and drink from this pond of wisdom. There is no charge. Truth by its very nature can only be free. Students of M. R. Bawa Muhaiyaddeen are honored to serve all who come.

The Bawa Muhaiyaddeen Fellowship is a "Reservoir of Wisdom" for all who are seeking God's Truth. It is a place where individuals may gather to study the Truth of God -- outwardly through the teachings and example that His Holiness has given us and inwardly through listening with greater clarity

received this power, you have left your beauty and your true state, and you have taken on the faces of animals and demons. You have lost the qualities of God and the qualities of man. You have completely uprooted the truth of God and the truth of man. You have lost your true abilities."

"O man, try to understand this. Try to change into a true human being and live as a true human being. Try to perform duty toward all lives. Let your inner qualities match your outer behavior. Show the way to live in equality, peace, and tranquillity in the kingdom of God. That is a life of freedom. Know this, O man."

This Fellowship shows the way to realize and avoid the faults of man. This Fellowship explains what a life of human freedom truly is. Here, the qualities of God are taught and illustrated. That is the work of the Fellowship.

HISTORY

Little is known of the personal history of M. R. Bawa Muhaiyaddeen prior to his emergence from the jungles of Sri Lanka over fifty years ago at which time he was asked to teach. He rarely spoke of himself in any way, never deviating from his focus on the one God.

Since Truth has no limits or boundaries or compartments, it can never be confined to or owned by any religion. Thus, although totally unlettered, to a Hindu he would talk about God in detailed terms of Hinduism; to a Jew or Catholic he would talk about God in detailed terms of Judaism or Catholicism, to a Muslim in terms of Islam. But to an atheist who was a car mechanic, he might talk about God in terms of cars - in whatever terms the individual could best grasp the explanation. His actions were a living example of the Truth about which he spoke. He was the example of that Truth, in whatever form might be needed for the moment. He sometimes described himself as an "ant man," or as a being tinier than the tiniest ant.

Saturday - Evening

General Meeting

M. R. Bawa Muhaiyaddeen (*Ral.*)

Muhammad Raheem Bawa Muhaiyaddeen, a Sufi mystic, can best be remembered for his efforts to bring unity through understanding to the faithful of all religions.

Little is known of his early personal history. Records of his life began in the early 1900's when religious pilgrims traveling through the jungles of Sri Lanka first caught glimpse of a holy man. They were overwhelmed by the depth of divine knowledge that he imparted. Sometime later a pilgrim invited him to a nearby village, and with that began his public life as a teacher of wisdom.

Throughout Sri Lanka, people from all religious and ethnic traditions would listen to his public discourses. Many consulted him on how to conduct life's affairs, including public figures, politicians, the poor, and the learned.

In 1971 Bawa Muhaiyaddeen accepted an invitation to visit the United States. Here, once again, people from all religious, social and ethnic backgrounds would join to hear him speak. Across the United States, Canada and England, he won recognition from religious scholars, journalists, educators and world leaders. The United Nation's Assistant Secretary General, Robert Muller, asked for Bawa Muhaiyaddeen's guidance on behalf of all mankind. Time Magazine turned to him for clarification during the hostage crisis in 1980. Thousands more were touched by his wise words when interviewed in Psychology Today, the Harvard Divinity Bulletin, the Philadelphia Inquirer, and the Pittsburgh Press. Wherever he went, he tirelessly answered the many personal and mystical questions that people brought to him until his death on December 8th, 1986.

and determination, to that Truth within one's self which exists as the conscience of man.

Vegetarian meals are served here, and you are welcome to share this food during any visit. The Fellowship is run purely on a donation basis.

ABOUT THE FELLOWSHIP > SCHEDULE

Public meetings are held at the central meeting house in Philadelphia throughout the week and weekends. The Sunday morning meeting starts at 10:00 a.m. Other meetings are scheduled around the five times prayer. Please call to obtain exact starting times. All meetings are free of charge. Morning Dhikr is held every day in the Mosque starting at 4:30 a.m.

General Weekly Schedule

- Sunday - 10:00 a.m.
General Meeting
- Monday - Evening
Dhikr
- Tuesday - Evening
Readings from Unpublished Material
- Wednesday - Evening
Video Tape
- Thursday - Evening
General Meeting
- Friday - 1:30 p.m.
Jum'ah in the Mosque
- Friday - Evening
Dhikr
- Saturday - 10:00 a.m.
Children's Meeting

New Zealand and the U.K. Please call (1-888-786-1786) or e-mail info@bmf.org for specific addresses and meeting schedule information.

Weekly Fellowship and Sufi Study Circle meetings are held in:

- Boston, MA
- Des Moines, IA
- Detroit, MI
- Toronto, Canada
- New York City, NY
- Stamford, CT
- Unionville, PA
- Washington, DC

Monthly meetings are held in:

- Berkeley, CA
- Sacramento, CA
- Madison, WI
- London, England
- Colombo, Sri Lanka

Other meetings and events are conducted periodically in various locations.

Editor's Introduction

Muhammad Raheem Bawa Muhaiyaddeen, may Allah be pleased with him, was an Islamic Sufi from Sri Lanka who dedicated much of his lifetime to instructing people on the true meaning of Islam and the path of Sufism. Though he himself was unlettered, the depth of his understanding of the Qur'an and the traditional stories of Islam has been recognized by Muslim scholars throughout the world.

For fifteen years, M. R. Bawa Muhaiyaddeen authored over twenty books and the Fellowship he founded recorded thousands of hours of audio and video discourses. The Bawa Muhaiyaddeen Fellowship now serves as a thriving community dedicated to studying and disseminating the vast treasury of his teachings. You are warmly invited to attend meetings at the central branch in Philadelphia on Sundays at 10 a. m. , or call 215-879-6300 for details on branch meetings nearest you.

The name Muhaiyaddeen literally means 'the giver of life to the true belief.' And indeed Bawa Muhaiyaddeen did spend his life awakening and strengthening faith in God within people's hearts. Though he was an unlettered man, he was able to guide and inspire people from all walks of life. Many scholars and leaders from the Islamic, Judaic, Christian, Hindu and communities considered him to be a true saint.

FELLOWSHIP BRANCHES

Established by the Sufi Saint Muhammad Raheem Bawa Muhaiyaddeen in 1971, the Bawa Muhaiyaddeen Fellowship Center is located at 5820 Overbrook Avenue in Philadelphia, Pennsylvania. The Mosque which was built in 1984 is also located on the property.

- Public meetings, study sessions, classes, five-times prayer (*salat*) and Remembrance of God (*dhikr*) are conducted on a regular schedule here throughout each week.

- The resting place of M. R. Bawa Muhaiyaddeen, may God be pleased with him, is located in the countryside near Philadelphia. It is enclosed in a *Mazar* or shrine which receives thousands of pilgrims from all over the world each year.

Branches of the Bawa Muhaiyaddeen Fellowship are located throughout the United States and Canada, as well as in Sri Lanka, Australia,

Foreword

Among the great religions of the world, Islam is no doubt the one that is least known and least appreciated by the non-Muslim world. The recent resurgence of military and militant groups inside Islam has caused a renewal of feelings and sentiments that have been harbored for centuries and a new spirit of crusade against the only major religion that appeared in history after Christianity. This has caused many Western laymen and intellectuals to ask, "What do 'the Islams' have in mind now?" (A horrible form used by many instead of the correct term, *Muslims*.)

Real Islam is a deep and unquestioning trust in God, the realization of the truth that "There is no deity save God" and of the threefold aspect of religious life: that of islam, complete surrender to God; iman, unquestioning faith in Him and His wisdom; and ihsan, to do right and to act beautifully, because one knows that God is always watching man's actions and thoughts. For fourteen hundred years the Muslims have practiced these virtues, and the great mystics of Islam have taught them to millions of faithful who have survived the most difficult times, the greatest hardships because of their unshakable faith in the loving kindness of God, the creator, sustainer and judge of everything created.

Sufism, the mystical current inside Islam, developed logically out of the serious study of the Qur'an, according to Muslim belief the uncreated word of God, and of the constant direction of all faculties toward God. The Sufi masters taught their disciples that their duty is the fulfillment of God's will, not out of a feeling of duty but rather out of love - for could there be anything greater than the unconditional love which man offers his Lord? And in order to be able to love God and, through Him, His creatures, the heart has to be purified by constant remembrance of God and by constant struggle against

It is appropriate that *Islam and World Peace: Explanations of a Sufi* should be his first book published posthumously, for during the last decade of his life, Bawa Muhaiyaddeen repeatedly expressed concern about the unfavorable image of Islam in the world today. He proclaimed an Islam of mercy and compassion, an Islam of peace and unity.

Opening with a plea that we must do more than just talk about peace, the book follows with a letter to world leaders, boldly calling upon them to unite. From there, the reader is guided to a view of the present day political crisis, then on to a Sufi application of the traditions of Islam, and finally to an esoteric understanding of the path of the innermost heart. Out of every page there emerges the wisdom of a contemporary mystic, blending the ancient oral tradition of Sufism with modern-day issues.

These talks, originally spoken in a mixture of Tamil and Arabic, were simultaneously translated into English, and later edited into a written format.

For the benefit of the Western reader, the customary honorific phrases have not been used following the names of prophets and angels. For example, the phrase *Salla Allah 'alayhi wa-sallam*, God bless him and grant him peace, is traditionally spoken after mentioning the name of Prophet Muhammad. Since the reverence inherent in this phrase is evident within every page of the book, we hope that this omission will not offend anyone. For the reader familiar with Arabic, the translated Islamic terms have been footnoted. And finally, since there is no single accepted system for transliterating Arabic into English, we have selected the one recommended by the Library of Congress, which can be found in the glossary.

This book is a unique plea for peace and unity, and if God so wills, perhaps those who read it will find some guidance in the timeless wisdom of Bawa Muhaiyaddeen.

Many people go to Mecca to receive titles, but a man of wisdom will be different. For him the *hajj* is a journey to meet God, and when he goes the world will have died within him. He is not dead. The world is dead, his base desires (*nafs*) are dead, and his attachments are dead. He will make all the sins he has committed die by making supplication (*du'a'*) to Allah.

To Die Before Death: The Sufi Way of Life

Even if I am not here, the statements that I have made or what I have taught could come from the mouths or the hearts of the children. If those words are uttered with the 'I', they will be of no benefit. But if the listeners listen to them without the 'I', then those words will be of great use. From wherever those words come, the ones who strive should extract the inner meaning.

God, His Prophets, and His Children

My younger brother, you must love all lives as your own. You must show compassion, pity, charity, kindness, and amiability toward all lives. If you shine with these qualities, your inner heart and your body will become resplendent like gold and the whole world will be yours. You will become the friend of the recluse who lives without any attachments. The Primal One will be yours. You will glitter everywhere with your resplendence. You will become the brother of all lives on earth. Realize this, my son, clarify and redeem yourself, gem of my eyes.

The Pearl of Wisdom (Guru Mani)

There is so much to learn, so many hidden meanings, and mere book learning is inadequate. The clarity, the understanding we must attain is not to be found in books, it is not something we can read about. To understand we

one's lower qualities, the so-called *nafs*, which are, according to the word of the Prophet of Islam, "the greatest enemy of man." This struggle against one's lowly and base qualities is indeed the "greater Holy War," for outward enemies can disappear and are not as dangerous as the inner, satanic forces, which try to incite man into evil, disobedience, and forgetfulness. It is this "Holy War" which in the following pages forms the center of the teaching of one of the masters of Sufism in our day, Bawa Muhaiyaddeen, who hails from Sri Lanka and stands in the age-old tradition of wisdom and love.

The reader will learn from these pages, which are written, or rather recited, in a simple, almost childlike style, that the inner dimensions of Islam are very different from those which he usually associates with this religion; that there is a wealth of love, of patience, of trust in God, and, last but not least, of gratitude; for the qualities of patience in affliction and gratitude belong together. The true lover of God knows that even in affliction it is the hand of the Divine Beloved that he feels, and he trusts that whatever befalls him is for his best, for God knows what is good for the soul's growth and for the spirit's purification.

I hope that many people read the warm, loving words of Bawa Muhaiyaddeen and understand that indeed the words *islam* and *salam*-peace-belong to the same root and that a true understanding of the inner dimensions of Islam will help them to find peace for themselves, insha'Allah, God willing.

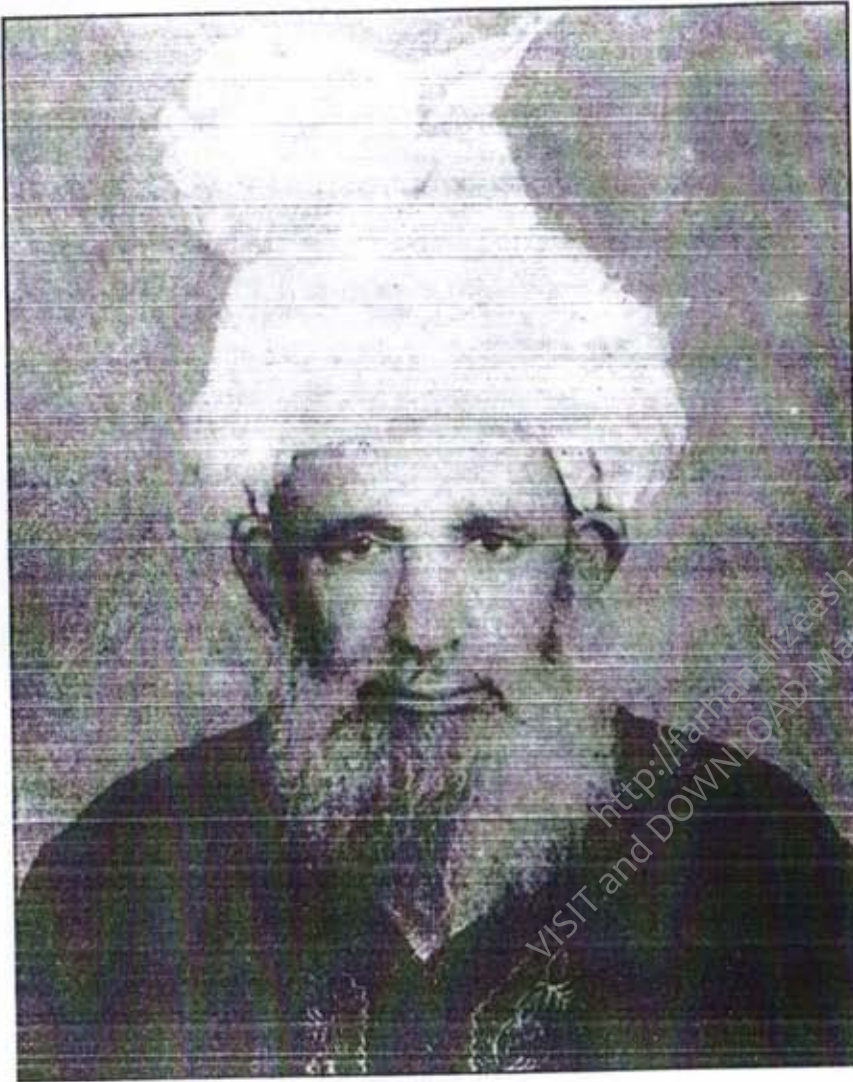
Annemarie Schimmel

Professor of Indo-Muslim Culture

Harvard University

Cambridge, Massachusetts

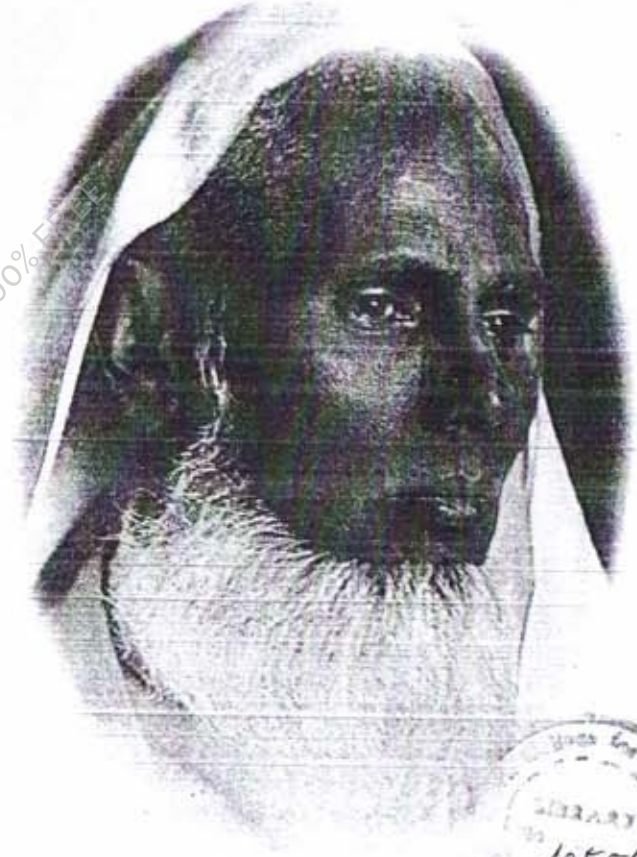
must go beyond words into our hearts where He has revealed everything. We must live within Him and discover the tongue that reveals Him. If we are proud and think, "I know so much already I am indeed learned," nothing will be revealed. We can only attain wisdom if we reach out for God and hold on and hold on saying, "I surrender, I surrender, I surrender."



بابا جی فضل شاہ
قطب عالم، نور والے

<http://farhanulzeeshan.blogspot.com/>
VISIT and DOWNLOAD many more E-BOOKS 100% FREE

<http://farhanalzeeshan.blogspot.com/>
VISIT and DOWNLOAD Many more E-BOOKS 100% FREE



Muhammad Raheem
Bawa Muhaiyaddeen